من کہ مکتوب الیہ

چھنڈی گڑھ

۱۵ جنوری ۱۹۸۲ء

محترم المقام سرور صاحب

آداب

"شانِ ہند" کا نومبر کا شمارہ موصول ہوا۔ جناب گوپال متل کا خط اور اُس کے جواب میں آپ کا شذرہ پڑھ کر طبیعت محظوظ ہوئی بحث و تکرار اور نوک جھونک کا معیار ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ کسی کی دل شکنی یا کردار کشی نہ ہو، ایک دوسرے کے محاسن کا فراخدلی سے اعتراف کیا جائے اور وسیع القلبی سے کام لیتے ہوئے اپنی کمزوریوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ دونوں تحریریں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ٹکر کے پہلوانوں میں سے اور مقابلہ میں دونوں ہی برابر رہے ہیں۔

جناب گوپال متل ممتاز محقق اور نقاد، بلند پایہ شاعر اور اعلیٰ نثر نگار ہیں لیکن ایک صحافی کی حیثیت سے وہ مجھے زیادہ بلند و بالا نظر آتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اپنا منفرد اسلوبِ نگارش تھا۔ آغا شورش کاشمیری نے بحسن و خوبی ان کی تقلید کی۔ مولانا آزاد کے ساتھ نثر میں شاعری کا جو دَور شروع ہوا تھا وہ اُس دن ختم ہو گیا جس دن شورش زندگی سے منہ موڑ کر ابدیت کی وادیوں میں روپوش ہو گئے۔ ان دونوں کا طرزِ نگارش اب کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن ان کے بعد کسی کی تحریر نے متاثر کیا تو وہ مولانا عبدالمجید سالکؔ کی نثر تھی۔ شاہد احمد دہلوی "ساقی" کے تو صرف نام کا دیر یہ تھا کہ ان کا تعلق دلی اسکول سے تھا۔ سالکؔ صاحب کا اندازِ تحریر ان سے کہیں پُر لطف تھا ان دونوں نے بڑی شخصیتوں کے جو خاکے تحریر کئے ہیں ان کا مطالعہ کیا جائے تو سالکؔ کے خاکے شاہد احمد دہلوی کے خاکوں سے کہیں بھاری نظر آتے ہیں۔ کئی بار سوچا کرتا تھا کہ کیا سالکؔ کے پائے کی نثر لکھنے والا کوئی نہیں۔ لیکن جب گوپال متل کی کتاب "لاہور کا جو ذکر کیا" پڑھی تو وہی لطف آیا جو سالکؔ کی "یارانِ کہن" پڑھ کر آیا کرتا تھا۔ "لاہور کا جو ذکر کیا" ادبی صحافت کا شاندار نمونہ ہے اور اسے بار بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔

آپ نے دُرست لکھا ہے ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں گوپال متل کی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ سرحد کے اُس پار ان کی مقبولیت ہمارے ہاں سے کہیں زیادہ ہے۔ ربع صدی قبل مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو مرزا ادیبؔ، ظہیر کاشمیری، سیف الدین سیفؔ، عقیل ہوشیار پوری وغیرہ حضرات سے ملاقات ہوئی۔ اور ان سب نے جناب گوپال متل، لالہ کرم چند پارسؔ اور خوشتر گرامی صاحب کا ذکر بڑے احترام سے کیا۔ آغا شورش کاشمیری نے جناب جگن ناتھ آزاد، رنگینؔ اور متل صاحب کی خیر و عافیت اور سرگرمیوں کے بارے میں دریافت کیا اور ان تینوں کی انسانیت نوازی کی بہت ستائش کی۔ ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں گوپال متل کے مداح موجود ہیں۔

"یہ کوچہ یار بہ اندازِ محرمانہ گزر" میں آپ نے سردار دیوان سنگھ مفتوںؔ کی عادات کو اپنانے کا ذکر جس بے باکی اور جرأت سے کیا ہے اُس کی مثال کم ہی ملے گی۔ الحاج محمد یوسف صاحب مدیرِ اعلیٰ "شمع" کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے وہ اُن سے آپ کی بے پناہ محبت اور عقیدت کا ثبوت ہے۔ واقعی حافظ صاحب کی بلند شخصیت کا بدل ملنا مشکل ہے۔ دُنیا نیک اور مخلص انسانوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔ اللہ حافظ صاحب کو خضر کی حیات دے کہ وہ شرافت اور وضعداری کا نشان ہیں اور دلی شہر کی آبرو ہیں۔

احقر

دشوا ناتھ طاؤس

منگلور ٹاؤن

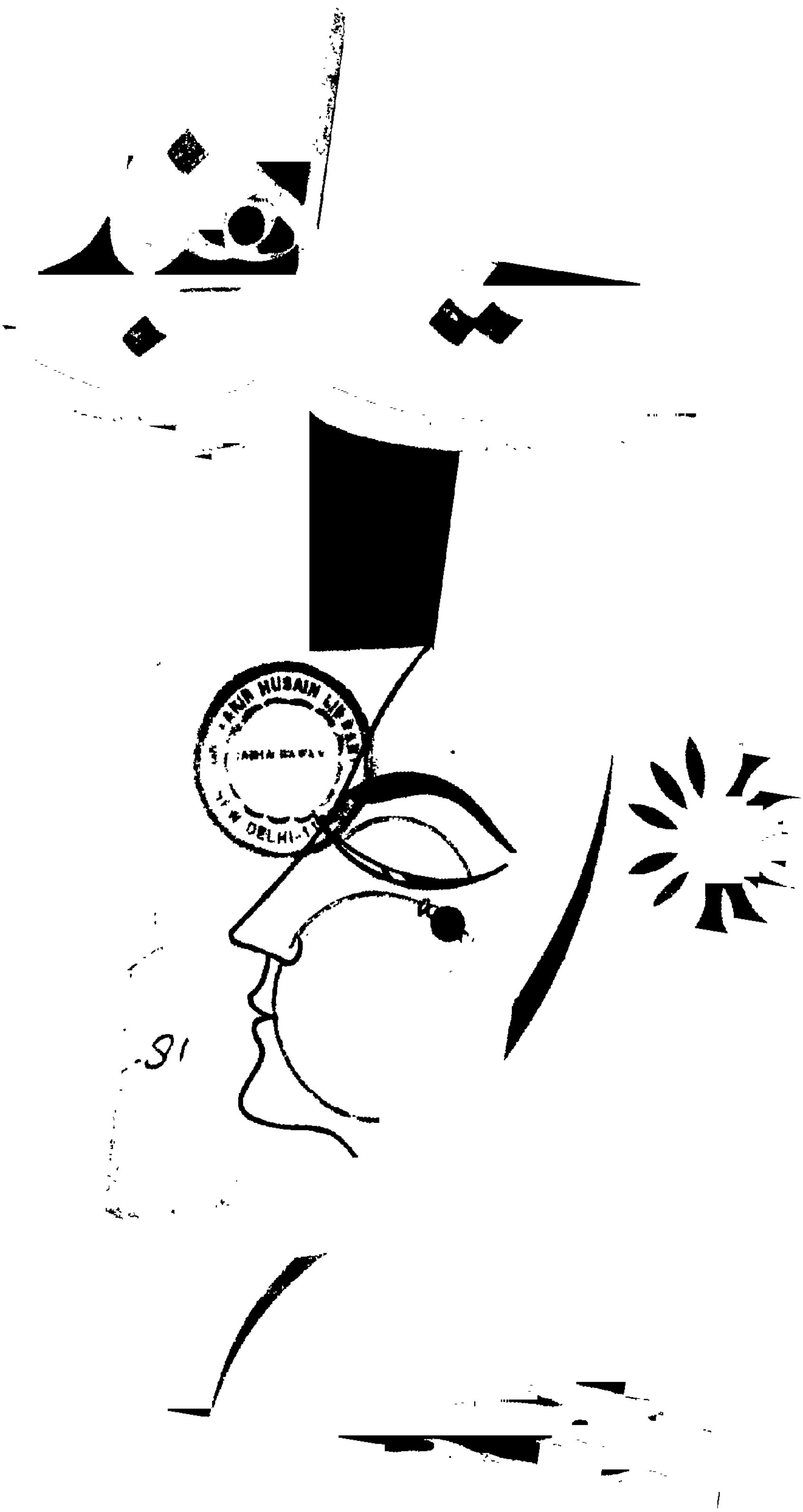
سہارنپور۔ یو۔ پی

گرامی قدر جناب محترم سرور صاحب

سلام مسنون

حسب الحکم سعید اختر صاحب کا بیان انہیں کی تحریر میں ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ یقین ہے کہ آپ حق اور ناحق تک پہنچنے میں کامیاب ہوں گے انشاءاللہ۔

سعید اختر نے مجھے یہ بھی بتایا کہ چندہ کی رسید کٹوانے کے چند ہی دن بعد تو حسن اتفاق سے ان کی ملاقات ہوئی۔ نومبر کو چندہ کی بابت پتہ چلا



تو انہوں نے سعید اختر سے رسید لے کر اپنے پاس رکھ لی۔ سعید اختر کو تنویر کے پلان کا علم نہ تھا۔ چونکہ ہم لوگ دو چار دن چندہ وصول کرنے کے بعد محترم ڈاکٹر نسیم الزماں صاحب کے مشورہ کے مطابق بہ علت برسات مشاعرہ اور چندہ کے التوا پر آمادہ ہو گئے تھے اس کا علم تنویر کو بھی تھا اور یقیناً انہوں نے سعید اختر سے رسید لے کر یہ پلان بنایا ہوگا کہ اگر برسات بعد ہم لوگوں نے مشاعرہ کرا دیا تو خیر، ورنہ کم از کم مجھے بدنام کرنے کا موقع تو مل ہی جائے گا۔ ادھر برسات گزرنے پر ہم لوگوں نے مشاعرہ کا خیال ہی ترک کر دیا اور جتنی رقم وصول کی تھی خود میں نے اپنے ہاتھ سے نہایت دیانتداری کے ساتھ جملہ چندہ دہندگان کو واپس کرنا شروع کر دی اور بلحاظ ستمبر کے پہلے سے دوسرے ہفتے تک میں نے فراغت پالی۔ میرے پاس واپسی چندہ کی وہ فہرست موجود ہے جس پر تمام چندہ دہندگان کے دستخط موجود ہیں۔ والسلام

قاضی سید عرشی کاظمی

● محترمی جناب سرور صاحب

سلام مسنون

جس چندے کی رسید کا ذکر آپ نے شان ہند میں کیا ہے وہ رسید عرشی صاحب نے میرے نام سے کاٹی تھی اور بہت عرصہ ہوا کہ میرے چندے کے مبلغ ۲ روپے واپس مل گئے تھے۔ میں نے یہ رسید مسٹر تنویر چشتی کو دیکھنے کے لئے دی تھی آگے میرے علم میں نہیں کہ آپ تک یہ کیونکر پہنچ گئی۔

والسلام

سعید اختر

محلہ قلعہ۔ منگلور ٹاؤن۔ سہارنپور۔

آل انڈیا میر اکاڈمی لکھنؤ کو انعامات کیلئے اُردو کتابیں مطلوب

میر اکاڈمی لکھنؤ ہر سال اُردو کے کسی ایک ممتاز ادیب کی خدمات اور کارناموں پر "اعزاز میر" اور اُردو کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو "امتیاز میر" اور اُردو کے مصنفوں کو ان کی مطبوعہ تصانیف پر "میر ایوارڈ" پیش کرتی ہے۔

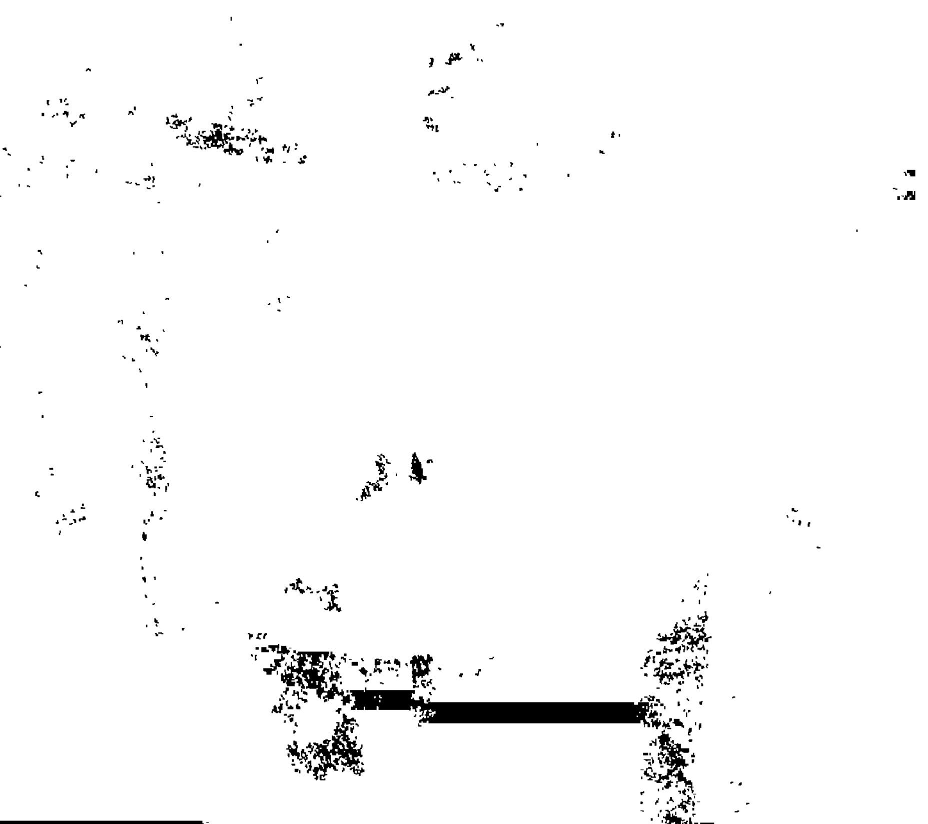
اکاڈمی نے اپنی روایات اور خدمات کے مطابق ۱۹۸۲ء میں پیش کئے جانے والے انعامات کے لئے اُردو کے مصنفوں سے اُن کی ۱۹۷۸ء، ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۱ء کی مطبوعہ تصانیف کی پانچ پانچ جلدیں طلب کی ہیں جن کو سکریٹری آل انڈیا میر اکاڈمی، اقبال منزل۔ وزیر گنج۔ لکھنؤ کے پتے پر ۱۵ فروری ۱۹۸۲ء تک پہنچ جانا چاہیئے۔ ایسی کتابیں بھی داخل کی جا سکتی ہیں جن پر سرکاری یا غیر سرکاری انعامات مل چکے ہوں یا مالی تعاون سے شائع ہوئی ہوں۔

میر اکاڈمی منتخب کتابوں کو انعامات اور توصیفی اسناد ایک مخصوص تقریب میں پیش کرتی ہے جس کی اطلاع اخبارات میں شائع کر دی جاتی ہے اور تفصیلی پروگرام اور دعوت نامہ براہ راست انعام یافتگان حضرات کو مناسب وقت پر بھیج دیا جاتا ہے اور تاخیر سے بھیجنے کے لئے اس بات کی گنجائش رکھی جاتی ہے کہ اگر انعام پانے والے حضرات بذاتِ خود اس تقریب میں تشریف نہ لا سکیں تو اپنے کسی نمائندہ کے ذریعہ اپنا انعام و اعزاز حاصل کر لیں۔

(منظور احمد لاری) سکریٹری۔ آل انڈیا میر اکاڈمی۔
اقبال منزل۔ وزیر گنج۔ لکھنؤ۔

بقیہ باب انتقاد اداروں میں عموماً انگلینڈ اور امریکہ کی لکھی ہوئی کتابیں کام میں لائی جاتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ عام طور پر مفید ہیں۔ پھر بھی ہمیں خاص طور سے ہندوستانی حالات کے پیش نظر لکھی ہوئی کتابوں کی ضرورت ہے اس نقطۂ نظر سے معلمانہ حلقوں میں اس کتاب کے خیر مقدم کی توقع کی جاتی ہے۔

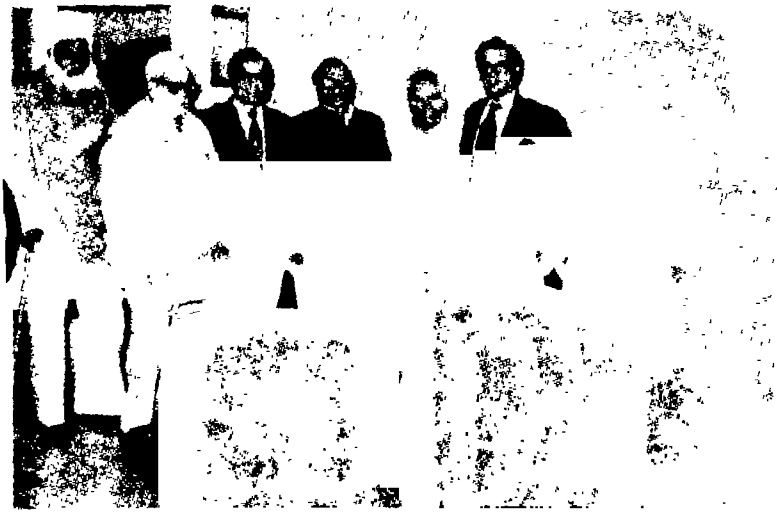
سرکاری یا نیم سرکاری ادارے ترجمے کے فرائض عام طور پر ایسے اصحاب کو سونپ دینے کے لئے مجبور یا بد دیانت ہوتے ہیں جنہیں مالی فائدہ پہنچانا مطلوب ہوتا ہے۔ مگر اس کتاب کے لئے خواہ سفارش یا دوست نوازی کے تحت ہی مترجم کو یہ کتاب سونپی گئی ہو مگر یہ مسلّم امر ہے کہ مترجم کا تعلق براہ راست درس و تدریس سے رہا ہے اس لئے ان کا انتخاب کسی حد تک مناسب ہی ہے اور ترجمہ بھی بس مناسب حد تک ہی ہے۔ صرف ایک سطر کو ہی ملاحظہ فرمائیے "کوئی سکول اپنے طلبہ کی صحت مند نشو و نما میں برخوردار کی توقع نہیں کر سکتا۔" یہ لفظی ترجمہ تو کہا جا سکتا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ اسے رواں دواں بامعنی اور بامحاورہ ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر فی زمانہ اساتذہ جس علمی استعداد کے حامل ہیں ان کے لئے یہ ترجمہ برا نہیں۔ یہ کتاب بھی ناشر یا دفتر شان ہند سے دستیاب ہے۔



چاند سا چہرہ مگر مہاسوں اور گرمی دانوں سے ایسا بھر گیا ہے کہ آئینہ دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے لیکن یہ مہاسے
یا گرمی دانے خود بخود تو دور نہیں ہوں گے۔ انہیں دور کرنے کا آسان اور سہل طریقہ ہے خون سیر۔ یہ ایک یونانی دوا
ہے جس کا ایک چمچہ صبح شام لیا جاتا ہے۔ کریم، لوشن وغیرہ تو صرف اوپر اوپر سے مہاسوں اور گرمی دانوں کو کچھ دیر کے
لئے دبا دیتے ہیں مگر ختم نہیں کر پاتے۔ اسی لئے ان تیز دواؤں سے آپ کی نازک اور ملائم جلد جل بھی جایا
کرتی ہے۔ خون سیر تو خون کے اندر پہنچ کر تمام گندگی دور کرتی ہے۔ خون کو صاف بنائے رکھنے میں مدد دیتی ہے
اور ان تمام وجوہات کو دور کرتی ہے جن سے مہاسے، گرمی دانے، داغ، دھبے اور کھجلی وغیرہ پیدا ہوتی ہے اور
پھر آپ کا چہرہ چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ خون سیر کے برابر استعمال سے رنگ بھی خود بخود صاف ہونے لگتا ہے۔

قیمت: چھ روپے

شرع لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶



۳ فروری ۱۹۸۱ء کو انجمن افغان دوستاں کی طرف سے افغان پناہ گزینوں کے لئے کمبلوں کی پہلی قسط (چار گانٹھیں) سفیر پاکستان جناب عبدالستار صاحب کو پیش کرتے ہوئے انجمن ہٰذا نے پاکستان کے صدر سے اس غرض کے لئے ایک لاکھ کمبل دینے کا وعدہ کیا ہے۔

دائیں سے بائیں:۔ عارف بیگ صاحب۔ سفیر پاکستان جناب عبدالستار صاحب۔ آچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب جنرل سیکریٹری انجمن افغان دوستاں۔ جے۔ پی۔ ماتھر صاحب ایم پی۔ ڈاکٹر پرشانت ویدالنکار۔ مولانا امداد صابری۔ شیر میوات علی محمد صاحب۔



۹ فروری ۱۹۸۱ء کو کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں غیر منسلک ممالک کی آزادی کی حفاظت کے سلسلے میں منعقدہ سیمنار میں آچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب سفیر پاکستان کا استقبال کر رہے ہیں۔



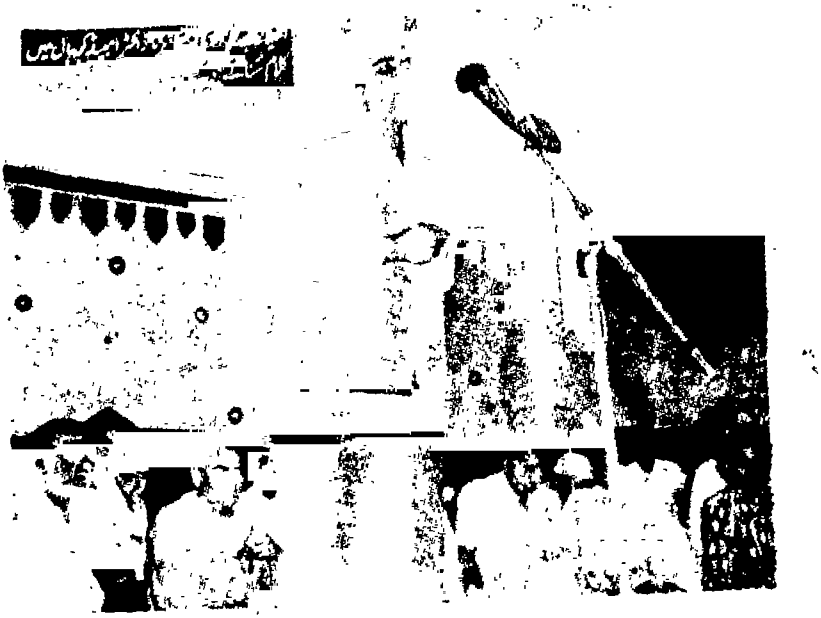
غیر منسلک ملکوں کی آزادی کی حفاظت کے سلسلے میں منعقدہ سیمنار میں آچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب سیمنار کے صدر جناب کلدیپ نیئر کا استقبال کرتے ہوئے ۔



غیر منسلک ملکوں کی آزادی کی حفاظت کے سلسلے میں منعقدہ سیمنار میں آچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب تقریر فرماتے ہوئے ۔



"CHARKH" CHINYOTY



ٹیلیفون نمبر ۲۶۵۲۲۴ رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۲۴۴۴/۵۷ رجسٹرڈ نمبر DN/۳۷

ہر ذرہ وطن ہے فیاض مجھ کو پیارا
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
(فیاض گوالیاری)

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ شانِ ہند

ایڈیٹر:
سرور تونسوی

زرِ سالانہ ۱۵/- روپے
فی پرچہ ۱/۵۰ روپے

جلد نمبر ۴۲ جنوری سنہ ۱۹۸۱ء شمارہ نمبر ۱

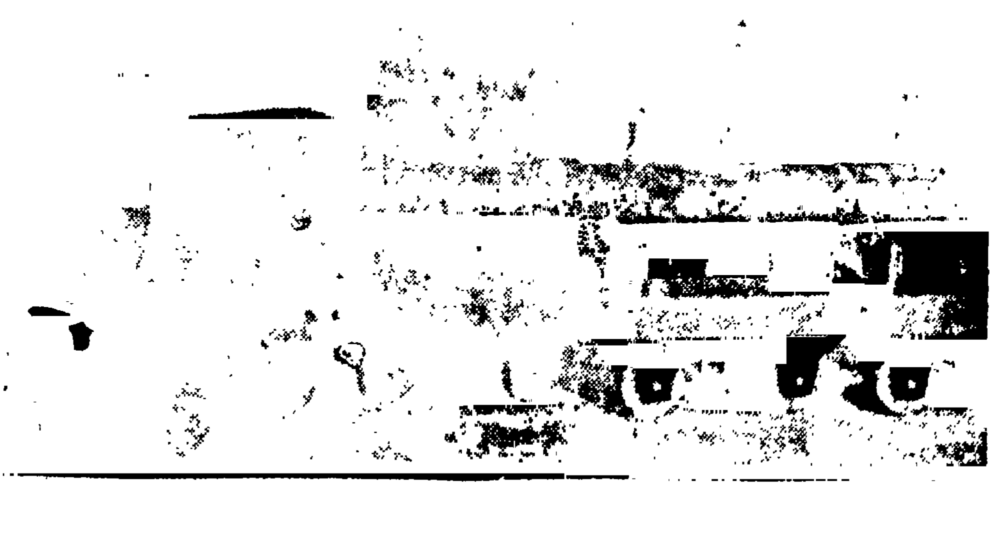
[illegible] پرنٹر پبلشر [illegible] نے خواجہ پریس چتلی قبر جامع مسجد دہلی اور سٹرق پائلٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ نمبر ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

ریل گاڑیاں آپ کی اپنی ہیں

جس طرح یہ ریل گاڑی اس بچے کی اپنی ریل گاڑی ہے

- ☐ انہیں صاف رکھیں
- ☐ کسی آفت کی صورت میں ہی زنجیر کھینچیں
- ☐ کم سامان کے ساتھ سفر کریں
- ☐ ریلوے کا سامان نہ چوری کریں
- ☐ بے ٹکٹ سفر نہ کریں۔

ناردرن ریلوے



بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

مشاعرہ جشن جمہوریت لال قلعہ

مشاعرہ لال قلعہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۸ء تک ایک مثالی مشاعرہ رہا اور اس کا آنکھوں دیکھا حال لکھنا ایڈیٹر شانِ ہند اس لئے ضروری سمجھتا تھا کہ یہ ادبی دستاویز اردو مشاعروں کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے مفید ہوں گی۔ اس کے بعد اس مشاعرہ میں گروہ بندی کا مظاہرہ ہونے لگا اور یہ مشاعرہ بقول "بدستِ طفلاں" ہو کر رہ گیا۔ یا یوں کہئے کہ جب تک اس مشاعرہ کی انتظامیہ کمیٹی میں ملٹری والوں کا عمل دخل رہا تب تک یہ مشاعرہ اپنی روایات کو زندہ رکھتا رہا اور اسی وجہ سے ۶۸ء کے بعد ایڈیٹر شانِ ہند نے مشاعرہ لال قلعہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھنا ترک کر دیا۔

پچھلے کچھ سالوں سے تو یہ مشاعرہ مچھلی مارکیٹ کے مناظر پیش کرتا رہا۔ اس سال دہلی انتظامیہ میں کسی سیاسی پارٹی کا عمل دخل نہ ہونے کے باعث لیفٹننٹ گورنر جناب جگ موہن صاحب حکومت کے سربراہ ہیں اور جناب جگ موہن صاحب بذاتِ خود سیاسی حرام زدگیوں کا شکار رہ چکے ہیں اس لئے انھوں نے دلی انتظامیہ کو کافی حد تک کسی قسم کی بھی سیاسی چالوں سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ لہٰذا اس بار لال قلعہ کا مشاعرہ کئی سالوں کے بعد پوری طرح سے تو نہیں مگر خاصی حد تک اپنی سابقہ روایات کا آئینہ دار تھا۔ اس مشاعرہ کی صدارت جناب لیفٹیننٹ گورنر نے فرمائی اور عزت مآب ایم ہدایت اللہ صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند نے مشاعرہ کا افتتاح فرمایا۔ نظامت جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے ذمے تھی۔

عالی جناب ایم ہدایت اللہ صاحب نے افتتاحی تقریر عالمانہ انداز میں فرمائی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صاحب موصوف اردو شاعری سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں اور شاید آپ میں سے اکثر اصحاب یہ نہ جانتے ہوں کہ نائب صدر جمہوریہ ہند کے والدِ محترم اردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔ اس لئے اردو شاعری سے دلچسپی انھیں وراثت میں ملی ہے۔

مشاعرہ میں شریک ہونے والے شعراء کا انتخاب زبانِ حال سے پکار رہا تھا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی کرم فرمائیوں کا سوتا کس طرح سے رواں دواں ہے۔ گورنر صاحب نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ ہوٹنگ کے رسیا اپنی من مانی نہ کر سکیں۔ کچھ باذوق حضرات نے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو پہلے ہی خطوط سے آگاہ کر دیا تھا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ مشاعرہ میں ہوٹنگ نہ ہو تو فلاں فلاں شعراء کو شروع شروع میں پڑھوا دیجئے تاکہ عوام کے ان غیر پسندیدہ شعراء سے جلد گلو خلاصی ہو سکے چنانچہ کنور صاحب نے جمہور کی آواز پہ لبیک کہا اور ایسے شعراء کو پہلے ہی پڑھوا دیا جن کے کلام اور نام سے ہوٹنگ کرنے والوں کو انگیخت ہو سکتی تھی۔

صلاح کار سب کمیٹی مشاعرہ ہذا کی فہرست پڑھی تو ایسے اسمائے گرامی کی بہتات تھی جو اپنے آپ کو صرف دلی ہی نہیں بلکہ ہندو پاکستان میں اردو کی بقا و حیات کا ضامن سمجھتے ہیں مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ان میں سے کوئی بھی صاحب مشاعرہ کمیٹی کی کسی بھی میٹنگ میں موجود نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان اصحاب نے اپنی عدم موجودگی سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہو کہ وہ موجودہ انتظامیہ یا حکومت کو پسند نہیں کرتے۔ صرف جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جناب گلزار دہلوی اور عقیل ناروی ہی غیر سرکاری ممبر ایسے تھے۔ جو ہر میٹنگ میں موجود تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب ڈبلیو شیزا چیف سکریٹری دلی انتظامیہ، جناب ڈی۔ پی سنہا۔ سکریٹری۔ ساہتیہ کلا پریشد نے مشاعرہ کو کامیاب بنانے میں ہر ممکن تعاون دیا۔

اس سلسلے میں ہم گورنر صاحب سے گذارش کریں گے کہ مشاعرہ یا کسی عوامی کمیٹی میں بڑے بڑے ناموں کی بجائے ایسے حضرات کو لیا جائے جو واقعی کام کرنے والے ہوں۔ خصوصی طور پر اردو کے سلسلے میں تو شعبہ ہائے اردو کے سربراہوں یا دوسرے نامی گرامی پہلوانوں کی بجائے عقیل ناروی صاحب ایسے فعال اصحاب کو لیا جانا چاہئے۔

جب مشاعرہ صلاح کار کمیٹی میں عقیل ناروی صاحب کا انتخاب کیا گیا تھا تو اکثر حضرات نے ناک بھوؤں چڑھاتے ہوئے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ مگر مشاعرہ کے لئے دن رات بھاگ دوڑ جس قدر عقیل ناروی صاحب نے کی کسی دوسرے کو یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی۔

اب اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے جس سے ہمارے خود ساختہ دل بد لو لیڈروں کی خود غرضی اور جناب لیفٹننٹ گورنر کی سوجھ بوجھ کا پتہ چلتا ہے۔ کانگریس سے بھاگ کر جن سنگھ میں "پرورش" کرنے اور پھر جن سنگھ سے کانگریس (آئی) میں وارد ہونے والے (محض مطلب براری کے لئے) جناب انور دہلوی پچھلے دنوں جناب لیج کے ایل عگبت۔ ایم پی نیز صدر دہلی کانگریس (آئی) کی "مہتر مہابا" میں لیفٹننٹ گورنر صاحب سے ملے اور ان سے شکایت کی کہ اردو مشاعرے کے پاس حاصل کرنے کے لئے جماعتِ اسلامی کے اخبار کے دفتر کو تو معلوم سمجھا گیا ہے مگر ان لوگوں کو فراموش کر دیا گیا ہے جو عوام میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں (انور دہلوی جیسے) کہا جاتا ہے کہ جناب ڈاکٹر پی سنہا بھی اس وقت موجود تھے لہٰذا انھوں نے بتایا کہ میں تو اردو زبان سے ناواقف ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ جماعتِ اسلامی کا بھی کوئی اخبار ہے یا جن سنگھ کا کون سا اخبار ہے اور کون صحافت عوام میں زیادہ اثر رکھتے ہیں ہم تو سرکار کا رندے ہیں اور اپنی ڈیوٹی سرکاری پالیسی کے مطابق ایمانداری سے ادا کرتے ہیں۔ اس پر لیفٹننٹ گورنر صاحب نے فیصلہ کن لہجے میں فرمایا سنہا صاحب انور صاحب کو ان کے اخبار کیلئے ایک اشتہار دے دیجئے۔ گورنر صاحب کے اس فیصلے کے بعد انور دہلوی کی شکایت دور ہو گئی تھی اور وہی اشتہار جس میں مشاعرے کے پاس جماعتِ اسلامی کے اخبار کے دفتر سے ملنے کی اطلاع تھی ان کے اخبار میں چھپا بہ حیثیت مجموعی لال قلعہ کا مشاعرہ اس بار کامیاب رہا۔ لیفٹننٹ گورنر خود اردو زبان سے اچھی طرح شناسا ہیں لہٰذا ان کا صدارتی خطبہ اور اچھے شعروں پر داد دینے کا انداز اس کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ اردو زبان سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

ترقی اُردو بیورو اور مرکزی وزیر تعلیم

پچھلے دنوں عالیجناب شنکر راؤ چوہان مرکزی وزیر تعلیم نے حیدرآباد اور ناندیڑ اور مقامات پر ترقی اردو بیورو اور ہاستی اردو اکاڈمیوں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس پر وہ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اردو پرست عوام کے لئے وزیر تعلیم کے یہ فرمودات یقیناً حوصلہ افزا، اور اردو دانشوروں (خود ساختہ) کے لئے قابلِ ندامت ہیں جن کی کارکردگی پر وزیر تعلیم نے یہ خاموشی کی ہے شانِ ہند کی آئندہ اشاعت میں وزیر تعلیم کے ان فرمودات پر تفصیلی طور پر مدیر شانِ ہند اداریے میں روشنی ڈال رہا ہے۔ مگر اس وقت یہ کہنا ضروری ہے کہ وزیر تعلیم ایک طرف تو ترقی اردو بورڈ کو ایک مردہ قرار دے رہے ہیں۔ اور دوسری طرف ترقی اردو بیورو کے کام اور اس کے پروگرام کی مستقل اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس ادارے کو ایک مستقل دفتر قرار دے رہے ہیں۔

اگر تو وزیر تعلیم کے یہ فرمودات محض ان حضرات کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے ترقی اردو بورڈ کے ذمہ داران سے ناراض ہیں۔ یا محض مسلمانوں کی ووٹیں محفوظ رکھنے کے لئے ہیں تو دوسری بات ہے۔ ورنہ ہزار خامیوں کے باوجود یہ ادارہ اتنا ناکارہ مردہ نہیں ہے جتنا کہ وزیر تعلیم نے قرار دیا ہے۔ اس ادارہ نے کچھ ایسی کتابیں ضرور شائع کی ہیں جن کا اردو ادب میں یقیناً مخصوص مقام ہے۔ اور آئندہ جن بہترین کتابوں کی اشاعت کا پروگرام ہمارے سامنے ہے وہ یقیناً اچھا ہے۔

اور اگر وزیر تعلیم کا یہ فرمان صحیح ہے تو پھر مرکزی وزیر تعلیم بھی محض باتوں کے شیر ہیں ایک سال سے وہ بورڈ کا یہ مردہ پن دیکھ رہے ہیں تو کونسی رجہ تھی جس کے باعث وہ خاموش رہے؟ اپنی بورڈ کی بے راہ روی کو دور کرنے میں کیا رکاوٹیں ہیں؟ اس کا تو صاف طور پر یہی مطلب لیا جا سکتا ہے کہ ہمارے وزیر تعلیم سب جانتے بوجھتے ایک سال سے کچھ نہیں کر سکے تو کیا اس میں بھی سابقہ جنتا پارٹی حکومت کا دوش ہے۔

جشن جمہوریت کے مبارک موقع پر

ہر ہندوستانی کیلئے دل کی گہرائیوں سے

نیک خواہشات

یہ کوئے یار یہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

ہم دیہاتی علاقے کے رہنے والے ہیں۔ ایک دفعہ میں اپنی بہن کے ہاں کافی رات تک بیٹھا رہا اور باتیں ہوتی رہیں کہ رات کے دس بجے کے قریب کوئی چودہ پندرہ آدمی بہادر پور ضلع گڑگانوہ سے آگئے جو میرے بہنوئی کے شناسا تھے۔ اتفاقاً میرے بہنوئی نے دریافت کیا کہ آپ لوگوں نے ابھی کھانا تو کھایا نہیں ہوگا انہوں نے کہا کہ کھانا تو ہم کھائیں گے۔ اتنا یہ کہنا تھا کہ میری بہن کی آنکھیں سرخ ہوگئیں اور وہ نہایت غصے کے عالم میں اندر چلی گئی اور اپنے خاوند کو بلا کر کچھ کہا۔ دو منٹ بعد میرے بہنوئی نے ان مہمانوں سے کہا کہ کھانا تیار ہے کھانے کے لئے ہاتھ دھو لیجئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ تنور کی روٹیاں، ثابت ماش کی دال، آلو گوبھی کی سبزی، بینگن کا بھرتہ، چاول وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ ان دیہاتی مہمانوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا اور میں حیران کہ کیا اس بد حالت کے لئے پہلے ہی سے میری بہن نے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ میں نے رسوئی میں جاکر بہن سے اشارے سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے تو وہ مسکرائی اور کہنے لگی کہ بے وقت آنے والے اچانک مہمانوں کے لئے اپنے آپ ہی کھانا آگیا ہے۔

ہم دونوں بھائی کسی کام سے اپنی بہن کے گھر گئے میرے بہنوئی کی قمیض کوئی کیل وغیرہ لگ جانے کے باعث پیچھے سے تھوڑی سی پھٹی ہوئی تھی میرے بھائی نے ازراہِ مذاق کہا لوک ناتھ جی آپ کو کیا پڑا ہے پھٹی ہوئی قمیض کیوں پہن رکھی ہے۔ ستیا سے کیوں نہیں کہتے کہ جو اس کے سر پر ہیں ان سے آپ کو قمیض منگوا دے۔ ابھی یہ بات بھی پوری نہ ہوئی تھی کہ اوپر سے ایک بنڈل گرا۔ کھولا تو اس میں دو قمیضیں تھیں اور ان پر ہانگ کانگ کے کسی دوکان کی چٹ لگی ہوئی تھی۔ اب میرے بھائی کی بچکانہ دلیل جواب دے چکی تھی اور اس نے بھی اس معاملہ کو سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ آخر اس کا کیا علاج ہو۔

مجھے جناب بشیر احمد صاحب سابق وزیر اعظم ریاست مالیر کوٹلہ (جن کا اب انتقال ہو چکا ہے) نے لکھا کہ مالیر کوٹلہ میں ایک صاحب ہیں جو آسیب وغیرہ اتارنے کا کام کرنے میں اس علاقہ میں مشہور ہیں اگر آپ مناسب خیال کریں تو ان سے بات کر دیکھئے۔ میں خط ملتے ہی مالیر کوٹلہ گیا جناب بشیر صاحب اور میجر فرحت صاحب (مرحوم) نے دو دن مجھے اپنا مہمان رکھا اور ایک شام کو ہم بازار میں جا رہے تھے کہ [illegible] ہنگامہ دیکھا۔ ایک لالہ جی ان سے کہہ رہے تھے کہ مولوی صاحب اگر گرم گرم دودھ کی کڑھائی جو کہ حلوائی کی دکان پر چولہے پر رکھی ہوئی تھی ساری پی جاؤ تو سارے دودھ کی قیمت میں دوں گا اور بیس روپے انعام بھی دوں گا۔ ملا جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنا کمبل سا جو انہوں نے اوڑھ رکھا تھا اسے اتارا اور بھٹی کے قریب ہی بیٹھ کر اس کمبل کو اپنے منہ اور سر کے علاوہ کڑھائی پر اس طرح ڈال لیا کہ وہ نظر نہ آئے اور نہ ہی کڑھائی کا منہ نظر آئے۔ اور بسم اللہ کی آواز سنائی دی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد ملا جی یا اللہ کہتے ہوئے اٹھے تو دیکھا کہ گرم گرم دودھ کی کڑھائی جس میں کم از کم ۲۰ سیر دودھ یقیناً ہوگا بالکل خالی تھی کڑھائی کے نیچے دہکتے ہوئے کوئلے بدستور موجود تھے اور خالی کڑھائی سے دھواں اٹھ رہا تھا ہم سب حیران رہ گئے۔ شرط لگانے والے لالہ جی نے بیس روپیہ ملا جی کو دیئے اور حلوائی کو دودھ کی قیمت ادا کی۔

اس واقعہ سے میرے دل نے گواہی دی کہ یہ صاحب واقعی میری بہن کا علاج کر سکیں گے اور میں ان مولوی صاحب کو دہلی اپنے ساتھ لے گیا ہم مالیر کوٹلہ سے رات کو سوار ہوئے اور صبح دہلی آگئے۔ دریا گنج والے اپنے فلیٹ میں ہم تھے اور ملا جی نے نہا دھو کر ناشتہ کیا اور دس بجے کے قریب میں ان کو لے کر کشمیری گیٹ اپنی بہن کے ہاں پہنچا۔ میری بہن اپنے کوارٹر کے باہر ہی صحن میں کھڑی تھی ہمیں دیکھتے ہی اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور شکل بگڑ گئی۔ میری بہن کسی بھی عالم میں ہوتی میرا احترام ضرور کرتی مگر آج اس کا لب و لہجہ بہت حد تک بدلا ہوا تھا اور پنجابی زبان میں ہذیانی کیفیت کے عالم میں کہنے لگی کہ تو روز روز کسی نہ کسی کو میرے علاج کے لئے لے آتا ہے۔ بس یہ کہنا تھا کہ میری بہن نے بھاری بھرکم مولوی صاحب کو اٹھا کر صحن میں پٹخ دیا۔ مولوی صاحب کی پگڑی اور کلاہ ادھر ادھر گر گئے۔ اور مولوی صاحب پگڑی اور کلاہ اٹھا کر یہ جا اور وہ جا اور میں ان کو بھاگتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

وہیں چندرہ منٹ کے بعد جب میری بہن کا غصّہ کچھ کم ہوا تو مجھے کمرہ میں لے جاکر چارپائی پر بٹھا دیا (یہ بھی یاد رہے کہ میری بہن میرے علاوہ کسی کو بھی کمرے میں داخل نہیں ہونے دیتی تھی) اور نہ کسی کو چارپائی پر بٹھاتی تھی۔ پانی کا گلاس لا کر مجھے دیا۔ کہنے لگی گنگا جل ہے ابھی ابھی ہردوار سے آیا ہے۔ میں نے چٹکی لیتے ہوئے کہا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ گنگا جل ہے۔ یہ سنتے ہی اس کی آنکھیں چڑھ گئیں اور ترشی کے لہجہ میں کہنے لگی ہم لوگ جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ اور راستے میں ایک ہردواری لوٹا گنگا جل سے لبالب سامنے اپنے آپ میز پہ آگیا اور میری بہن کہنے لگی کہ اس کی پہچان یہ ہے کہ نلکے کے پانی میں کلورین کی بو ہوتی ہے جو اسے صاف کرنے کے لئے ڈالی جاتی ہے۔ یہ گنگا جل ہے اس میں کلورین کی بو نہیں ہے۔ میں نے گنگا جل کا ایک گلاس پیا ہی تھا کہ ایک تھیلا کہ جس میں ہردوار کا گرم گرم چاٹ دھائیں سے آئے بھی کھایا۔ اب میری بہن کا غصّہ کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگی اور کیا کھاؤ گے۔ آئندہ ایسے آدمیوں کو میرے پاس نہ لایا کرو۔ اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے تم تو اپنی بہن کے علاج کے لئے خرچ کرکے علاج کرنے والے کو لاتے ہو اور مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے اس لئے آئندہ ایسا نہ کرنا۔

مجھے مولوی صاحب کا فکر تھا۔ اس لئے میں بہن سے یہ کہہ کر مہمان حلوائی کی جلیبیوں اُٹھا کر گھر آنے لگا تو میری بہن کہنے لگی کہ وہ تو مالیر کوٹلہ کی گاڑی پر سوار ہو کر بہادر گڑھ بھی پہنچ گیا ہے۔ اس کا فکر نہ کرو اور اب کھانا یہیں کھا کر جانا۔ کہنے لگی کہ تم تو کھانا ایک بجے کھاتے ہو اب ساڑھے بارہ تو بج ہی گئے ہیں۔ اگر ابھی کھانا ہو تو ابھی کھالو ورنہ اپنے مقررہ وقت پر ایک بجے کھا لینا تمہارے بہنوئی بھی تیس ہزاری کچہری سے آجائیں گے۔

کھانے میں مرغ، گوشت، زردہ، تندوری پراٹھے۔ رائتہ، دہی آم وغیرہ اس افراط سے تھا کہ میری بہن ان اخراجات کی متحمل نہ ہوسکتی تھی۔ میں نے ذرا سا سوچا تو بہن کہنے لگی سوچتے کیا ہو کھاؤ تم نے سب چیزیں ایسی منگائی ہیں جو تمہیں پسند ہیں۔ میں سب سمجھ چکا تھا۔ مگر کھانے میں میں نے کوئی کمی نہ کی تین بجے دریا گنج آگیا۔ بیوی کہنے لگی کہ کھانے میں اتنی دیر کر دی جلدی کرو مجھے بڑی بھوک لگی ہے میں نے اسے بتایا کہ ستیا کے یہاں یہ گزری اور اس کی ناراضگی دور کرنے کے لئے کھانا وہیں کھا لیا آس پاس ٹیلیفون نہ ہونے کے باعث تمہیں اطلاع نہ دے سکا کہ تم میرا انتظار نہ کرو اور کھانا کھالو۔

اب میں نے بھی خیریت اسی میں سمجھی کہ بہن کا علاج نہ کرایا جائے اس عرصے میں یہ چار بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ ایک دن میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ میری بہن بڑی سہمی ہوئی آئی اور کہنے لگی کہ فوراً میرے ساتھ چلو میری بیوی نے پوچھا کہ ستیا کیا ہوا تو کہنے لگی پوچھو مت تم بھی میرے ساتھ چلو۔ چنانچہ ہم دونوں میاں بیوی ستیا کے ساتھ ہو لئے بس پر کشمیری گیٹ پہنچے اور وہاں سے حسن بلڈنگ سرکاری کوارٹر تک پیدل گئے۔ میری بہن نے تالا کھولا تو دیکھا کہ دھوپ اگربتی وغیرہ کے دھوئیں سے کمرہ بھرا پڑا ہے جب دھواں کم ہو گیا تو سارے کمرے میں مسحور کن خوشبو اس کثرت سے آرہی تھی جیسے کسی نے سینٹ کا کنستر چھڑک دیا ہو۔ دیکھا تو کمرے کے ہر جگہ بچھی ہوئی ہے۔ اس پر بڑا ہی بہترین کپڑے کا ٹکڑا بچھا ہوا ہے اور اس پر گلاب اور دیگر کئی قسم کے پھول پڑے ہوئے ہیں۔ اصلی گھی سے آٹے کے بڑے دیئے میں جوت جل رہی ہے اور آس پاس اتنی چھوٹی اور بیسے وافر تعداد میں رکھے ہوئے ہیں میری بیوی نے میرے کان میں کہا کہ یہ سب کچھ اس نے خود کیا ہوگا اور ہمیں سچی بننے کے لئے دکھانے آئی ہے میری بیوی کا یہ کہنا تھا کہ ہماری موجودگی میں سینٹ کی بوچھار ہمارے مونہہ پر پڑی اور پھولوں کا ایک گلدستہ دھڑام سے گرا۔ ہم دونوں خاموش رہے اور شام کو جب میرے بہنوئی اپنے دفتر سے تیس ہزاری سے اور بچے اسکول سے آگئے تو ہم دریا گنج آگئے۔

اب محلے کی عورتوں نے میری بہن کو "پیرنی" سمجھنا شروع کر دیا اور اس سے دریافت کرنے لگیں کہ میرا یہ کام ہو جائے گا یا نہیں وغیرہ وغیرہ اور میری بہن نے واقعی اپنے آپ کو پیرنی سمجھنا شروع کر دیا اس کی کوئی کوئی بات سچ ہو جاتی ورنہ اکثر و بیشتر جھوٹی ثابت ہوتیں۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ یہ جسے بیمار کرنا چاہتی یا اس کا مالی نقصان کرنا چاہتی وہ ہو جاتا تھا۔ لہٰذا میری بہن نے اپنے رشتہ داروں سے گن گن کر بدلے لئے اور کئی حرکات ایسی کیں جن کے اثرات اب تک موجود ہیں اور ان برائیوں کا نتیجہ خود میری بہن کو مل رہا ہے۔

قبلہ صولت صاحب جن کا پورا نام سید محمود الحسن تھا۔ عرب النسل تھے ان کے والد صاحب عرب سے ٹونک تشریف لائے تھے والیٔ ٹونک نے جاگیر عطا کی اور انھوں نے ایسے روحانی کمالات دکھائے کہ اہلِ ٹونک اور والیٔ ٹونک ان کے والہ و شیدا ہو گئے۔ عرب صاحب کے انتقال کے بعد ان کی فرزندِ ارجمند جناب سید محمود الحسن صولتؒ روحانی کمالات میں اپنے والد محترم کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ شاعری تو ان کے گھر کی باندی تھی اور روحانی طور پر ان کے کمالات میں بھی ان کا ثانی مجھے کوئی نہ ملا۔

اپنی بہن کے بارے میں کئی بار سوچا کہ مفصل حالات قبلہ صولت صاحب کی خدمتِ اقدس میں تحریر کروں مگر یہی فیصلہ کیا۔ جب ان سے ملاقات ہوگی تو بالمشافہ گزارش کروں گا اور اب وہ گھڑی آ گئی تھی ایک روز شام کے چار بجے ہوں گے گرمی اپنے شباب پر تھی۔ ان دنوں میری رہائش اور دفتر ایک ہی جگہ نہیں تھے لہٰذا میں دفتر کے دروازے بند کرکے ایک چٹائی بچھا کر دوپہر کو سو گیا۔ نیند کے خمار میں باہر کا دروازہ کھٹکھٹانے کی مسلسل آوازیں محسوس ہو رہی تھی۔ مگر میں سنی ان سنی کرکے لیٹا رہا۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ میرے دفتر سے ملحقہ فلیٹ کا ایک ملازم دیوار پھاند کر صحن میں آیا اور کمرے کے دروازے میں لگے شیشوں سے جھانکتے ہوئے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ طوعاً و کرہاً میں اٹھا دروازہ کھولا تو وہ صاحب کہنے لگے کہ ٹونک سے صولت صاحب تشریف لائے ہیں آپ کی سیڑھیوں والا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے مگر آپ کی آنکھ نہیں کھلی تو وہ آدھ گھنٹے سے ہمارے ہاں بیٹھے ہیں۔

میں آنکھیں ملتا ہوا ان کے پاس گیا تو میاں حسبِ عادت مسکرا رہے تھے کہنے لگے بیٹا خوب گھوڑے بیچ کر سوئے۔ دل نہیں مانا اور تمہیں جگوا دیا میں نے معذرت کرتے ہوئے اپنے ہاں چلنے کو کہا تو فرمانے لگے حضور نے چائے منگائی ہے پی کر چلتے ہیں۔ قریباً پانچ بجے ہم اپنے فلیٹ میں آئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں میں نے بڑے مایوسی کے لہجے میں کہا میاں میری بہن پر کسی روح کا سایہ ہے اور آپ کے ہوتے وہ ٹھیک نہ ہو تو میری بدقسمتی ہی ہو سکتی ہے۔ ابھی میں ساری تفصیل سنا ہی رہا تھا کہ میری بہن وہ اپنے شوہر کے آ گئی۔ میں نے صولت صاحب کو بتایا کہ یہ میری بہن اور بہنوئی ہیں۔ ابھی صولت صاحب کہنے ہی والے تھے کہ میری بہن خاصی ناہموار زبان میں کہنے لگی ہاں ہاں مجھے وہیں پتہ لگ گیا تھا کہ تم کسی بڑے مولوی سے میرے بارے میں بات کر رہے ہو اسی لئے تو میں خود یہاں آ گئی ہوں۔

اتنے میں سامنے والے چھوٹے کمرے میں کتابوں سے بھری ہوئی الماری اپنے آپ دھڑام سے گری جس کے دھماکے سے نیچے مارکیٹ والے چار پانچ دوکاندار بھاگے بھاگے اوپر آئے کہ کیا ہو گیا ہے۔ میاں خوب قہقہے لگاتے رہے اور میری بہن مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ آج پانی بھی نہیں پلاؤ گے۔ میں نے ٹیلیفون سے نیچے دوکاندار سے کہا کہ چار لیمن کی بوتلیں بھجوا دے۔ ان دنوں گولی والی بوتل ہوتی تھی۔ دو تین منٹ بعد دوکاندار کا آدمی چار بوتلیں لے کر آیا۔ ہم سب نے ایک ایک پی تو میری بہن کہنے لگی میں اور پیوں گی۔ میں نے دوکاندار کے آدمی سے کہا کہ جلدی سے دو بوتلیں اور لے آؤ مگر میری بہن نے چیخ کر کہا کہ دو سے کیا ہوگا۔ دو درجن منگاؤ۔ دوکان کا آدمی دو بوتلیں ہی لایا۔ اور میری بہن نے ایک ہی سانس میں انھیں پی کر کہا کہ اور لاؤ۔ مجھے صولت صاحب نے اشارہ کیا کہ اور منگا دو میں نے دوکاندار کے ملازم سے کہا دس بوتلیں اور لے آؤ۔ ان بوتلوں کے ساتھ بھی میری بہن نے یہی سلوک کیا اور کہنے لگی کہ ابھی میری پیاس نہیں بجھی ایک درجن بوتلیں اور منگاؤ۔ اب صولت صاحب فرمانے لگے بس اور ایک بوند بھی نہیں ملے گی۔ ایک درجن بوتلیں تو پی گئیں۔ اتنا سننا تھا کہ میری بہن کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور میں یہ توقع کر رہا تھا کہ اب یہ صولت صاحب سے الجھ جائے گی مگر کیا دیکھتا ہوں کہ صولت صاحب نے بائیں پاؤں سے باٹا کا کپڑے والا جوتا اتارا اور زور سے کمرے کے فرش پر مارتے ہوئے کہا۔ خبردار۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم سید ہیں اور حضور رسول اللہ کی اولاد ہیں قبلہ کا اتنا کہنا تھا کہ میری بہن نے نظریں نیچی کر لیں سر پر دوپٹا کیا اور کرسی پر بیٹھنے لگی ہی تھی کہ صولت صاحب نے فرمایا خبردار ہمارے سامنے یہ جرأت کہ تم کرسی پر بیٹھو۔ کھڑے رہو اور اگر بیٹھنا چاہو تو نیچے بیٹھ جاؤ۔ میری بہن دو منٹ تو کھڑی رہی اور پھر نیچے بیٹھ گئی۔

صولت صاحب کا پارہ جب کچھ اترا تو مسکرا کر کہنے لگے بیٹا ذرا نیچے سے کسی دوکان سے تھوڑی روٹی تو منگانا۔ میں نے اپنے بہنوئی ہی سے کہا کہ نیچے سندھی کے ہاں سے روٹی لے کر آؤ۔ جب میرے بہنوئی روٹی لے کر آئے تو صولت صاحب نے کہا کہ اپنی بیوی کے ہاتھ میں دے دو اور میری بہن سے کہنے لگے کہ اسے سونگھو اور بتاؤ کہ اس میں سے خوشبو آ رہی ہے یا بدبو۔ میری بہن نے روٹی کو سونگھا اور مسلسل اس طرح سونگھتے گئی جیسے کوئی بہترین عطر سونگھ رہا ہو۔

(باقی آئندہ)

گوشۂ عقل منطقی

بسمل نقشبندی رتلامی

مشاعرۂ قومی یکجہتی بانسواڑہ

حالانکہ آج کل مشاعروں میں زیادہ تر ایسے شعراء کو بلایا جاتا ہے جو سنگیت کی دیا میں شالاؤں کے سند یافتہ ہو چکے ہیں یا اسٹیج پر اداکاری کے جوہر دکھا سکتے ہوں۔

اس کے باوجود مشاعرے اُردو کی ترقی اور اشاعت کے حق میں اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ جبکہ اُردو اس وقت نازک دور سے گزر رہی ہے۔ مشاعروں کی مقبولیت اُردو کے ہر دلعزیز ہونے کا بین ثبوت ہے۔

مشاعروں کا انعقاد جہاں زبان و ادب کی ترقی کا ضامن ہے وہاں قومی یکجہتی اور ملکی تہذیب کا بھی آئینہ دار ہے۔ آج کا یہ مشاعرہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ بانسواڑہ کے دانشوروں نے قومی ایکتا کمیٹی کے تحت اس مشاعرے کا انعقاد کیا ہے۔ کمیٹی کے قابلِ ذکر حضرات یہ ہیں۔

جناب آر۔ کے سکسینہ کنور لکھنوی اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف ایگریکلچر، شری رمن لال پروہت۔ جناب عبدالرشید خان تھانیدار اور آتم لوجی۔ اخبار کے سمپادک شری کیلاش کوشل۔ ان حضرات کی ہی انتھک کوشش و کاوش کا نتیجہ یہ مشاعرہ ہے۔

اسٹیج پر مقامی اور مہمان شعراء تشریف لا چکے ہیں۔ پنڈال کافی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ فرش کا بھی معقول انتظام ہے سردی زیادہ ہونے کے باوجود سامعین کے جمِ غفیر کا یہ عالم ہے کہ پنڈال سے باہر بھی صاحبِ ذوق حضرات کھڑے ہوئے ہیں۔

سیٹھ رمن لال جی پروہت نے صدارت کے لئے جناب ایس۔ ڈی۔ او۔ صاحب کا نام پیش کیا ہے۔ اور موصوف سے درخواست کی ہے کہ وہ مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہوں جس کی پُرزور تائید کی گئی ہے۔ صاحبِ صدر مسندِ صدارت پر تشریف لائے تو رشید خاں صاحب تھانیدار نے صدر صاحب کو پھولوں کا ہار پہنایا ہے۔ نظامت کے لئے جناب ہوش نعمانی رامپوری نے مائک سنبھال لیا ہے۔ اور بیرونی شعراء کا مختصر سا تعارف کرانے کے بعد مشاعرے کا آغاز مقامی شاعر جناب محشر افغانی کو کلام سنانے کی دعوت سے کیا ہے۔

محشر صاحب کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

جنہیں ذرا بھی سلیقہ نہیں ہے پینے کا
اُنھیں کے ہاتھوں میں جام شراب پاتا ہوں

ہوش صاحب شاید اہلِ بانسواڑہ کی خوش ذوقی اور ادب نوازی سے متاثر ہو کر فرما رہے ہیں ؎

بانسواڑہ ترے صدقے ترے قربان ہوں میں
بدنصیبی تھی یہاں میں جو نہ آیا ہوتا

داد[1] کے دھماکے کے ساتھ تالیوں کا شور بلند ہوا ہے۔ اب ہوش صاحب فرما رہے ہیں کہ ؎

برائے راہبری سامعینِ محفل کے
جنابِ حضرتِ رہبر کو میں بلاتا ہوں

سنئے رہبر رتلامی غزل سرا ہیں۔ ایک شعر آپ بھی ملاحظہ فرما کر لطف لیجئے۔

پیار کے نام پہ بسایا تھا جو پیدا ہم نے
پیرہن اس کا کوئی گر جلائے تو خط لکھ دینا

ہوش صاحب فرما رہے ہیں کہ ؎

جب کوئی بزم سجائے ہمیں خط لکھ دینا
یادِ مضطر کی جب آئے ہمیں خط لکھ دینا

یہ شعر سنتے ہی جناب مضطر کوٹوی مسکراتے ہوئے مائک پر تشریف لے آئے ہیں اور چند قطعات ارشاد فرمانے کے بعد ایک غزل سنا رہے ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ کیجئے۔

ہر ہر قدم پہ ظلم و حوادث ہیں خندہ زن
ان مشکلوں میں آج غزل کس طرح کہوں
اے دوست میں ازل سے حقیقت پسند ہوں

[1]: صرف داد کے دھماکے سے کیا ہوتا ہے [illegible]

اک جھونپڑے کو تاج محل کس طرح کہوں

مظفر صدیقی صاحب مناسب داد پانے کے بعد جب مائیک سے
ہٹے تو ہوش صاحب نے مظفر صاحب کی زمین ہی میں یہ شعر عنایت
کیا سہ
کوئی جب مضطرب ہوتا ہے عشق کوچۂ جاناں میں
خراشِ ہجر سے اس کو درد دل آواز دیتا ہے

یہ شعر سنتے ہی درد ہوشیارپوری مائک پر آکر ایک قطعہ ارشاد فرمایا
ہے اور پھر غزل شروع کی ہے۔ مطلع پر ہی اکتفا کیجئے۔ سہ

شعلہ سا لپکتا ہوا ساغر سے نکالوں
یا خود کو شب و روز کے چکر سے نکالوں

ہوش صاحب حسبِ سابق اشعار میں تعارف کرا رہے ہیں سہ

دل ہی کے نہیں روح کے اندر سے نکالوں
اب میں حسنِ وقت کو منظر سے نکالوں
شب کہتے ہیں ہم کس کو اور رنگِ سحر کیا ہے
آ، اے حسنِ دوراں بتلا دے ہنر کیا ہے

پھر تالیوں کے شور میں جناب حسن نعیم پوری مائک پر تشریف
لائے ہیں اور ترنم میں نغمہ سرائی شروع کی ہے سہ

اپنے حنائی ہاتھوں میں لیکر وہ میرا ہاتھ
یادوں کی پالکی میں بٹھا لے گئے مجھے
کمرے میں اپنے سو یا تھا تنہائیں رات کو
بستر سے تیرا خواب اٹھا لے گیا مجھے

کلام ختم کر کے حسن صاحب مائک سے ہٹنا چاہتے ہیں۔ مگر
سامعین ایک غزل اور ایک غزل اور کی آوازیں بلند کر رہے
ہیں۔ لیجئے ان کی غزل کے دو شعر آپ بھی سن لیجئے سہ

تمہارے شہر میں کچھ بھی نیا نہیں لگتا
یہ آج گزرا ہوا کل دکھائی دیتا ہے
بڑھا کے ہاتھ زمانے سے اپنا حق چھینو
ہر اک سوال کا یہ حل دکھائی دیتا ہے

اس غزل پر حسن صاحب کو اچھی داد ملی ہے اور اب اناؤنسر نے
یہ شعر سنا کر اثر اندوری کو زحمتِ سخن دی ہے۔ سہ

آئے اثر ہی کہا جائیگا اثر کی قسم
جو تپتی دھوپ میں بادل لگا کے بیٹھا ہے

اثر اندوری نے حالاتِ حاضرہ پر چند قطعات سنانے کے بعد
ایک نظم سنائی ہے۔ جس کے ٹیپ کا مصرع تھا میرے وطن سے
ابھی کوئی زمیں نہیں ہے۔ اثر صاحب کا ایک قطعہ پیشِ خدمت
ہے سہ

پھونک دیتی ہے یہ جلتے ہوئے پھولوں کا لباس
مشعلِ بغض و کدورت کو بجھا دو یارو
آپ ہو جائیں گے تعمیرِ محبت کے محل
پہلے نفرت کی یہ دیوار گرا دو یارو

اثر اندوری داد لے لے کر چندے واپس جا رہے ہیں اور
اناؤنسر کی زبان پر یہ اشعار ہیں سہ

ہے یہ وہ شاعرِ فطرت کہ جو بیتا ہی نہیں
آج اختر کو محبت سے بلا دو یارو
جس نے کیا ہے پیدا اختر سے خوش نوا کو
میرے وطن سے اچھی کوئی زمین نہیں ہے

تالیوں کی جھنکار میں اچھے استقبال کے ساتھ جناب اختر گوالیاری
مائک پر تشریف لائے ہیں اور ہوش صاحب کا شکریہ ادا کرنے
کے بعد ارشاد فرما رہے ہیں سہ

لوگ جب درد کی منزل سے گزر جاتے ہیں
خود بخود گیسوئے حالات سنور جاتے ہیں
جو تلاطم سے لڑیں پار اتر جاتے ہیں
بے عمل لوگ کناروں پہ ہی مر جاتے ہیں

داد پانے کے بعد نغمہ سرا ہیں سہ

دل نے اک چیز بڑی بیش بہا مانگی ہے
حسنِ مغرور کی فطرت سے وفا مانگی ہے
مصلحت ہے کہ توجہ ہے کہ یہ سازش ہے
ایک دشمن نے مرے حق میں دعا مانگی ہے
گردشِ وقت کی تلخی سے پریشاں ہو کر
کتنا کم ظرف ہے وہ جس نے قضا مانگی ہے

لہ ۔ ہوش صاحب آپ تو جانے پہچانے شاعر ہیں پھر ایسے گھٹیا اور مہمل فی البدیہہ اشعار سے اپنا بھرم کیوں کھو رہے ہیں (ایڈیٹر)

سہ ۔ غالباً سامعین "ہاتھوں میں لیکر" لئیے بیٹھیو بہانہ فکر لطیف " سے دوبارہ مستفید ہونا چاہتے ہوں گے (ایڈیٹر)

اختر صاحب کی یہ غزل بہت پرانی ہے چونکہ اختر صاحب
بانسواڑہ کئی سال کے بعد آئے ہیں اس لئے سامعین نے قندِ مکرر کا
مزا لیا ہے۔ معقول داد پاکر اختر صاحب واپس ہوئے تو اناؤنسر صاحب
فرما رہے ہیں کہ

اے سخنور آؤ پینے شعر و سخن آ جاؤ
بزم نے شامِ اودھ کی ہی صدا مانگی ہے

قومی ایکتا کمیٹی کے صدر جناب اندر کمار سنگھ کنور لکھنوی نے
مائک پر تشریف لاکر قطعات سنانے شروع کئے ہیں۔ ایک قطعہ
آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

تیز طوفان کے دھاروں کو موڑ سکتے ہیں
سنگِ ذوالفقار کا سینہ پھوڑ سکتے ہیں
اے ہمالہ تری عظمت کے لئے ہندی جواں
موت کا آہنی پنجہ مروڑ سکتے ہیں

شعراء اور سامعین[1] سے خاصی داد پاکر کنور صاحب اپنی جگہ
گئے تو جناب ہوش عثمانی بذاتِ خود مائک پر جلوہ افروز ہیں
سامعین نے تالیاں بجاکر ہوش صاحب کا خیر مقدم کیا ہے۔ ہوش
صاحب سے کئی غزلیں، گیت اور قطعات سنے گئے۔ آپ بھی ان
کے کچھ اشعار سے لطف اٹھائیے ؎

ہزاروں طنز و ملامت کے تیر کھاتے ہیں
گناہگار بڑی نیکیاں کماتے ہیں
جو پُرسکون ہو پانی تو خودکشی نہ کرو
عمارتیں نہ سہی عکس جگمگاتے ہیں

دھوپ ہر تالاب کا پانی اڑا کر لے گئی
اب کے موسم کو لہو کس کا پلایا جائیگا

ہوش صاحب نہایت کامیابی کے ساتھ تحسین و ستائش کے کیف آگیں
ماحول میں سرشار اپنی جگہ آگئے ہیں اور اب زحمتِ سخن دی جا
رہی ہے۔ جناب ممتاز راشد صاحب کو۔ ممتاز راشد بانسواڑہ پہلی
مرتبہ تشریف لائے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

کچھ تو ہو بنجر زمینوں کے سلگنے کا صلہ
دشت کے سر پہ کوئی کالی گھٹا باقی رہے
کچھ تو ہو لوگوں کے پتھریلے سوالوں کا جواب
اس کے ہونٹوں پہ مری طرزِ نوا باقی رہے

شدتِ گرمیٔ احساس سے جل جاؤں گا
برف ہوں ہاتھ لگایا تو پگھل جاؤں گا
میں ترے ہاتھ کی ریکھا ہوں مجھے چھو کے پرکھ
کم ہوا تیرا تجسس تو بدل جاؤں گا

ممتاز راشد صاحب خوب بلکہ خوب تر داد پاتے ہوئے اپنی جگہ
تشریف لے گئے ہیں اور اناؤنسر صاحب فرما رہے ہیں کہ ؎

بھائی راشد نے کہا موہوم سے الفاظ میں
شاعری کے لب پہ دانش کی صدا باقی رہے
آپ بیٹھیں سماعت رکھئے خود لطفِ سخن
تاکہ دانش کی غزل کی ہر ادا باقی رہے

اور اسی دعوت کے ساتھ جناب دانش علی گڑھی مائک پر آکر
بہت ہی اچھے انداز میں غزل سرا ہیں ؎

آنکھوں میں نہاں ہوں کبھی ہونٹوں سے عیاں ہوں
میں خون کی طرح آپ کی رگ رگ میں رواں ہوں
جس نے تری محفل کو نیا حسن دیا ہے
اس پیار سے جلتے ہوئے دیپک کا دھواں ہوں
تو ڈھونڈنا چاہے تو مجھے ڈھونڈ لے اے دوست
میں تو ترے ہاتھوں کی لکیروں میں نہاں ہوں

دانش صاحب اس کامیاب غزل پر بھرپور داد پاکر مائک سے واپس
ہوئے تو دعوتِ سخن دی گئی۔ جناب پروفیسر شاہد میر کو۔
شاہد صاحب اپنی متفرق غزلوں کے کچھ منتخب اشعار سنا رہے
ہیں۔ کچھ اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

کب تلک رات کی چوکھٹ پہ تنہائی دے گا
صبح سے پہلے تو سورج نہ دکھائی دے گا
اٹھاتا ہے مرا قاصد غلط فہمی کی دیواریں

۱؎ شعرا اور سامعین اگر اس قطعہ پر داد نہ دیتے تو ان کی "سخن فہمی" پر حرف نہ آجاتا؟ (ایڈیٹر)

یہاں کچھ اور کہتا ہے وہاں کچھ اور کہتا ہے
معصوم طائروں کا شکاری تھا چالباز
آزادیوں کے نام پہ تقسیم دے گیا
خوابوں کی انجمن میں ہر اک سے حسین تھی
جاگے تو اپنے پاؤں کے نیچے زمین تھی

شاہد صاحب کو کافی نوازا گیا۔ بھرپور داد پاکر واپس ہوئے تو راقم الحروف کو حکم ہوا ہے۔ آیئے آپ بھی ان اشعار کو برداشت کیجئے۔

کہیں لہو کہیں خنجر ہوا میں اڑتا ہے
یہاں تو روز کوئی سر ہوا میں اُڑتا ہے
تم ایک قطرۂ شبنم کی بات کرتے ہو
یہ وہ صدی ہے کہ پتھر ہوا میں اُڑتا ہے
یہ کیسی آندھی ہے ساکت ہے ہر شجر لیکن
بگولہ بنکے مرا گھر ہوا میں اُڑتا ہے
یہاں تو اندھوں کو دعویٰ ہے خضر ہونے کا
یہاں پرندہ بے پر ہوا میں اُڑتا ہے

۱ اس وقت رات کے تین بجکر ۵۳ منٹ ہو رہے ہیں سردی اپنے پورے شباب پر آچکی ہے مگر سامعین کی خاصی تعداد اب بھی مشاعرہ گاہ میں دکھائی دے رہی ہے اور صدر مشاعرہ کی اجازت سے ہوش صاحب مشاعرے کے اختتام کا اعلان فرما رہے ہیں۔

کیا لوگ تھے جو پڑھ گئے پوری کتاب زیست
اے دوست ہم تو حصۂ اوّل میں کھو گئے

(بقیہ، چرخ چنیوٹی .... صفحہ ۱ سے آگے

جوانی کا زمانہ ہے، ستم کر لو، کرم کر لو
تمہیں ہر بات زیبا ہے کہ دنیا میں حسین تم ہو
چمن میں مہکا مہکا سا دماغ لالہ و گل ہے
کہ پھیلائے ہوئے شانوں پہ زلفِ عنبریں تم ہو (جلوۂ انجم)

زلف کھلتی ہے، رات کھلتی ہے + حسن کی کائنات کھلتی ہے
آنسوؤ، تم نہ آؤ پلکوں پر + اس طرح دل کی بات کھلتی ہے
داستانِ دل کی کہہ تو دوں لیکن + آپ کی بات کھلتی ہے
(حسن نظر)

نیاز و عجز کی دنیا نثار کی میں نے + سکھائے حسن کو انداز دلبری میں نے
تمام رات سسکتے رہے ستارے بھی + غم و الم کی کہانی جو چھیڑ دی میں نے
خدا تو جلوؤں کو مستور کرکے بیٹھا تھا + خدا کے جلوؤں پہ ڈالی ہے روشنی میں نے

دامن تمہارا چھوڑ دوں، یہ تم نے کیا کہا (حسن ادب)
رُخ زندگی کا موڑ دوں، یہ تم نے کیا کہا
جس میں کھنک رہی ہیں محبت کی چوڑیاں
میں وہ کلائی چھوڑ دوں، یہ تم نے کیا کہا
جس میں مچل رہا ہے تمہاری نظر کا کیف
اُس ساغرِ دل کو توڑ دوں یہ تم نے کیا کہا (حسن ادب)

ظاہر ہے کہ ان پچیس برسوں میں چرخ نے ایک بڑا فاصلہ طے کر لیا ہے اور بڑی مستعدی سے اس منزل کی طرف گامزن ہیں جو خود انھوں نے اپنے لئے اور قدرت نے ان کے لئے متعین کر رکھی ہے۔ معصومیت کی جگہ پختگی نے لے لی ہے۔ بہت کم ایسے شاعر ہیں جو اپنی آواز سے پہچانے جاتے ہیں اور یہ خوشی کا مقام ہے کہ رنگوں کا شاعر چرخ چنیوٹی ان شاعروں میں سے ایک ہے

چرخ نے بڑے پیارے اور خوبصورت قطعات کہے ہیں۔ ان قطعات پر ان کی انفرادیت کی چھاپ ہے۔ یہ مضمون نامکمل رہ جائے گا اگر یہاں ان کے چند قطعات پیش نہ کئے گئے۔

نگاہیں اُٹھتے اُٹھتے جھک گئی ہیں + تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا ہے
حیا کا پاس رکھ کر چرخ کوئی + کہانی اپنے دل کی کہہ گیا ہے

غم بھرے آنسوؤں کو پی لوں گا × میں تو اپنی زبان بھی سی لوں گا
دیکھ لو تم بھی توڑ کر رشتہ + مجھ میں ہمت ہوئی تو جی لوں گا

روئے روشن پہ بال بکھرے ہیں + آرزوؤں کے جال بکھرے ہیں
اک جوانی نظر اٹھا دیکھو + ہر طرف کچھ سوال بکھرے ہیں

دن کو کرتے ہیں رات کا وعدہ + شب کو دن کا فریب دیتے ہیں
ان کے وعدوں کا کچھ یقیں تو نہیں + آج کا دن بھی دیکھ لیتے ہیں

۱؎ نوازا گیا کے تو یہ معنی ہوئے کہ داد بطور احسان دی گئی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شاہد صاحب کے یہ اشعار حاصلِ مشاعرہ ہیں (ایڈیٹر)
۲؎ آپ نے اپنے اشعار پر دار کی کیفیت کا ذکر کسر نفسی کے طور پر نہیں فرمایا تو پھر میری طرف سے ایسے مقصدی اشعار پر مبارکباد قبول فرمایئے (ایڈیٹر)

دی بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس :۔ مرکنٹائل کوآپریٹو بینک بلڈنگ، ۷۸، محمد علی روڈ، بمبئی۔ 493003

بینک کاری کے تمام امور بشمول غیر ملکی زر مبادلہ کا لین دین انجام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کا معیار زندگی بلند کرنے میں آپ کی ہمت افزائی کرتا ہے اور جملہ اقسام کے گھریلو استعمال کے سامان کے حصول میں آسان شرائط پر آپ کی مدد کرتا ہے۔

یکم اکتوبر ۱۹۷۹ء سے سود کی شرحیں

۱۔ سیونگ ڈپازٹس پر

سیونگز اکاؤنٹس پر (چیک سہولت کے ساتھ) چھ فیصد سالانہ

۲۔ فکسڈ ڈپازٹس پر ۱۳ ستمبر ۱۹۷۹ء

۱۔ ۱۵ سے ۴۵ دن تک ½۳ فیصد سالانہ
۲۔ ۴۶ سے ۹۰ دن تک ۴ فیصد سالانہ
۳۔ ۹۱ سے زیادہ مگر ۶ ماہ سے کم ۵ فیصد سالانہ
۴۔ ۶ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ۹ ماہ سے کم ۵ر۵ فیصد سالانہ
۵۔ ۹ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ایک سال سے کم ½۶ فیصد سالانہ
۶۔ ایک سال اور اس سے زیادہ مگر بشمولہ ۳ سال تک ۸ فیصد سالانہ
۷۔ ۳ سال اور اس سے زیادہ مگر بشمولہ ۵ سال تک ½۹ فیصد سالانہ
۸۔ ۶۱ ماہ اور اس سے زیادہ عرصہ پر ۱۱ فیصد سالانہ

دہلی برانچ

3655 نیتا جی سبھاش مارگ، دریا گنج، نئی دہلی - 110002

فون :۔ 264374 - 268266

منیجنگ ڈائریکٹر
زین جی رنگون والا

دہلی نوڈل منیجر
شمیم کاظم

چرخ چنیوٹی اُردو ادب کے آئینہ میں

(سراجِ سخن جناب ضیاء فتح آبادی)

۱۹۶۹ء میں قیامِ حضرتِ سیماب دہلی کے بعد جب میری ملاقات چرخ چنیوٹی سے ہوئی تو مجھے کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا کیونکہ ایک مدت سے رسائل و اخبارات خاص طور سے بیسویں صدی لاہور میں ہم دونوں برابر چھپتے رہے تھے اور ان کا کلام اکثر میری نظر سے گزرتا رہا تھا۔

چرخ ۳ جنوری ۱۹۱۹ء کو چنیوٹ میں پیدا ہوئے۔ یہیں انہوں نے دسویں کا امتحان پاس کرکے اُردو اور فارسی آنرز کے امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۳۴ء میں جب جناب خضر تمیمی ملازمت سے مستعفی ہو کر چنیوٹ میں وکالت کرنے لگے تو چرخ ان کے پاس بطور کلرک ملازم ہوگئے۔ مئی ۱۹۳۸ء میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو کنبہ کی کفالت کا بار چرخ کے کندھوں پر آپڑا۔ اُن کی شاعری کا آغاز ۱۹۲۵ء سے ہو چکا تھا۔ اب انہوں نے مشقِ سخن اس خیال سے بھی جاری رکھی کہ اس سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ جلد ہی ان کو سرکار کے پنچایتی محکمے میں ملازمت مل گئی۔ جہاں وہ پنچایت افسر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ مگر یہ کام دیر تک ان کو راس نہ آیا اور ۱۹۴۴ء میں انہوں نے گراموفون کمپنی میں ملازمت کرلی اس کمپنی میں وہ ۱۹۵۲ء تک مختلف شعبوں میں کام کرتے رہے۔ تقسیمِ ملک کے بعد ان کی تعیناتی لکھنؤ میں ہوگئی تھی وہاں سے فارغ ہو کر وہ دہلی پہنچے جہاں انہوں نے ایک فنانس کمپنی کی بنا ڈالی اور اب تک اسی سلسلے میں مستقلاً دہلی میں مقیم ہیں۔

جس زمانے میں چرخ کی شاعری کا آغاز ہوا وہ زمانہ اُردو شعر و ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے سیاسی اور سماجی اقدار بدل رہی تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ ادبی اور فنی اقدار بھی۔ قدیم روایات کی بوسیدہ زنجیروں کو توڑ کر شاعری کھلی ہوا میں آکر اپنے قریبی ماحول کے تناظر میں خود کو پہچاننے کی کوشش میں مصروف تھی۔ عربی اور فارسی کی جگہ یورپی زبانوں بالخصوص انگریزی کے اثرات اُردو زبان و ادب پر غالب آرہے تھے۔ شاعری میں غزل کے بجائے نظم کی تخلیق پر زیادہ توجہ دی جارہی تھی۔ تخیلی شاعری پر مشاہداتی یا عینی شاعری کو ترجیح مل رہی تھی۔ اور مقامی رنگ پر زور دیا جارہا تھا۔ ڈاکٹر اقبال، حالی پانی پتی، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی اس وقت پنجاب اور اس سے ملحق علاقوں کے ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ایک نئی پود میں تھی ڈاکٹر تاثیر، ن م راشد، میراجی، فیض احمد فیض احمد ندیم قاسمی اور ساحر لدھیانوی پیش پیش تھے۔ "ادب برائے زندگی" کا نعرہ بلند کرتی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شاعری کو مفید اور صحت مند بنانے پر زور دیا جارہا تھا۔ چرخ چنیوٹی کا ان رجحانات سے متاثر ہونا قدرتی امر تھا اور وہ ہوئے مگر اختر شیرانی کے قرب کی وجہ سے ان پر زیادہ اثر انداز اس رومانی شاعری کا رنگ ہوا جو اختر سے منسوب تھا۔ اس شاعری میں روحانیت کا وہ وسیع تصور نہیں ملتا جو شیلے، کیٹس اور بائرن کا موضوعِ سخن تھا کیوں کہ یہ رومان کم و بیش عشقیہ جذبات اور حسن پرستی یعنی جمالیاتِ محض کا مترادف بن کر رہ گیا تھا چنانچہ اُردو لغات میں لفظِ رومان کا اضافہ بھی اسی حیثیت سے ہوا۔ چرخ کے جوان ذہن و دل نے اس رومانی تصورِ شاعری کو بخندہ پیشانی قبول کیا۔ جمالیاتی حِس اُن کو فطرت سے ودیعت ہوئی تھی اور آزادہ روی کو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا یہی سبب ہے کہ یہ رومانی فضا انھیں پوری طرح راس آگئی اور اگر اہلِ نظر انھیں بھی اختر شیرانی کی طرح شاعرِ رومان کہتے ہیں تو کوئی گناہ نہیں کرتے حالانکہ اختر اور چرخ کی شاعری کی زیریں لہریں ایک دوسرے سے الگ الگ پہچانی جاسکتی ہیں۔ اختر کے یہاں بیشتر وہی عشقیہ شاعری ہے جو اُردو غزل کی روایت رہی ہے۔ وہ سلمیٰ سے پیار کرتا ہے اس کے ساتھ خوشگوار زندگی گذارنے کے خواب دیکھتا ہے اور اسی کوشش میں کبھی اسے نغمے سنا کر خوش کرنا

جاتا ہے اور کبھی سایہ نشاط کا۔ اختر کے یہاں عشق کا نشاطی پہلو نمایاں ہے مگر غم کی جو دھیمی دھیمی آنچیں بین السطور میں محسوس ہوتی ہیں انھیں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ غم و نشاط کے ملے جلے جذبات کی صحیح ترجمانی ہی اختر شیرانی کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے مگر چرخ کے یہاں زندگی کا طربیہ رخ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ فٹز جیرالڈ کے عمر خیام کی طرح مے و ساقی اور رقص و نغمہ ہی کو زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ وہ فطرتاً خوش مزاج اور حاضر جواب واقع ہوئے ہیں اور اُن کی باغ و بہار طبیعت کی شادابی ان کے لب و لہجہ کے نشاطیہ رنگ کی ذمہ دار ہے وہ خاموش رہنا تو جانتے ہی نہیں اس لئے انھوں نے اپنے کلام کو بھی بولتے ہوئے الفاظ سے سجایا ہے۔ انکی تربیت اور پرورش قدیم ماحول میں ہوئی ہے چنانچہ وہ فن سے آگاہ اور فنی اقدار کا احترام کرتے ہیں۔ آزادہ روی کے قائل مگر بے راہ روی سے محترز ہیں۔ ان کی سادگی میں پرکاری ہے۔ ان کے کلام کی جو خصوصیت بیک نظر قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے بڑی حد تک مقامی رنگ کو برتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری اسی دھرتی کی پیداوار ہے جس نے ان کو جنم دیا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ یہ مقامی رنگ انھوں نے کہیں معنویت اور کہیں لفظیات کی مدد سے حاصل کیا ہے جو ان کی سوجھ بوجھ اور فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت ہے وہ شعر بہت اہتمام سے کہتے ہیں اور اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک اس کی نوک پلک ہر طرح درست نہیں کر لیتے۔ عام طور سے زبان و بیان کی صحت و صفائی کا خیال رکھتے ہیں۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن نظم غزل، رباعی، قطعہ وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ ہر جگہ کامیاب رہے ہیں۔ ان کی کئی نظموں اور غزلوں کے گراموفون ریکارڈ بن چکے ہیں اور انھیں گانے والوں کے ناموں میں مشہور نام ہیں ہیمنت کمار، سی ایچ آتما، محمد نیازی اور دینا ناتھ سیٹھ۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ چرخ کے کلام میں وہ غنائیت موجود ہے۔ جو رومانی شاعری کے لئے ضروری ہے۔

ایشر داس چرخ چنیوٹی کے کلام کے ابتک چار مجموعے زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلا مجموعہ "آہیں" بالکل نایاب ہے۔ یہ ۱۹۴۱ء میں چھپا تھا اور جب تقسیم ملک کے بعد چرخ کو انتقالِ مکانی کرنا پڑا تو انکو اس کا کوئی نسخہ اپنے ساتھ نہیں لا سکے۔ باقی تینوں مجموعے "جلوہ انجم" (۱۹۵۸ء) "مہر نیمروز" (اگست ۱۹۶۷) اور "حسن ادب" (جنوری ۱۹۷۰) تقسیم کے بعد اس وقت اشاعت پذیر ہوتے جب چرخ مستقلاً دہلی کے ہو چکے تھے۔

اُدھر چند برسوں سے چرخ نے نظموں کی نسبت غزلیات زیادہ کہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ نظم زیادہ وقت، فرصت کی متقاضی ہے۔ جبکہ غزل ایک ایک شعر کر کے بھی مکمل کی جاسکتی ہے اور کشاکش کے اس دور میں اطمینان، فرصت فکرِ روزگار کی نذر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دہلی کی ادبی انجمنوں میں طرحی مشاعروں کا رواج آج بھی باقی ہے چنانچہ ان میں شرکت کے خیال سے غزل کہنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ "حسن سخن" کے نام سے چرخ نے جو اپنا نیا مجموعۂ کلام ترتیب دیا ہے اس میں بیشتر حصہ غزلیات ہی کا ہے۔ جنہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چرخ طبعی طور پہ غزل سے زیادہ قریب ہیں اور جو نظمیں انھوں نے کہی بھی ہیں وہ حالاتی اور ہنگامی ہیں۔ چرخ کا لہجہ مردانہ ہے گو اس میں وہ گھن گرج نہیں جو جوش ملیح آبادی کے کلام کا حصہ ہے تو بھی وہ شبابی کیفیت جو شروع سے ان کے کلام کی خصوصیت رہی ہے آج بھی بیشتر اشعار میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ زندگی کی اکسٹھ بہاریں دیکھنے کے بعد ان کے دل کی دھڑکنوں اور خیال کی اڑان میں کوئی کمی نہیں آنے پائی وہ اپنے ہم نام چرخ کی طرح سدا جوان اور ارجمند ہیں۔ یقیناً یہ بات اردو شاعری کے لئے ایک فالِ نیک ہے کیونکہ شاعری کا جو راستہ ان کو مل گیا ہے اس میں کانٹے کم، پھول اور کلیاں زیادہ ہیں۔ انھوں نے اردو کو بہت کچھ دیا ہے اور بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ آگے چل کر وہ انسان کے لئے اس سے بھی زیادہ مفید اور صحت مند ماحول کی نشاندہی کر سکیں گے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں موازنہ کی توقع سے اور یہ دکھانے کے لئے کہ گذشتہ پچیس برس میں چرخ کی غزلیہ شاعری نے کیا ترقی کی ہے ان کے تینوں مطبوعہ مجموعوں اور زیر ترتیب مجموعے سے غزلوں کے چند برجستہ اشعار یہاں نقل کر دیئے جائیں۔

مرے دل میں، مری آنکھوں میں، رگ رگ میں مکیں تم ہو
مری دنیا کی وسعت میں تجلی آفریں تم ہو ۔۔۔ "آہیں"

(باقی صفحہ ...)

تیر و نشتر

توصیف علوی عاصی کیرانوی

گر ہو انسان تو انساں کو مٹاتے کیوں ہو
خود سفینوں کو تلاطم میں ڈبوتے کیوں ہو

کل جو تعمیر کیا تم نے تھا خوابوں کا محل — آج خود ہی اُسے پھر آگ لگاتے کیوں ہو
خونِ دل جس کی بہاروں میں نمایاں ہے ابھی — اس چمن زار میں شعلوں کو جگاتے کیوں ہو
وہ جسے صدیوں کی تاریخ کی بخشش کہیے — ہو کے مدہوش وہ سرمایہ لٹاتے کیوں ہو
جن سے بنتے ہیں اخوت کے ہمیشہ سنگم — ان ہی دھاروں کو نئے رخ پہ لگاتے کیوں ہو
پاک کرنی تھی تمہیں جن سے ہر اک راہِ حیات — اپنی راہوں میں وہی کانٹے بچھاتے کیوں ہو
بات جب تھی کہ رفو چاک زمانہ کرتے — دھجیاں اپنے ہی دامن کی اُڑاتے کیوں ہو
امن و قانون کا ہاتھوں میں اُٹھا کر پرچم — رقص شیطاں کا زمانہ کو دکھاتے کیوں ہو
وہ نشیمن جو امانت ہیں بہارِ گل کی — بجلیاں روز نئی اُن پہ گراتے کیوں ہو
مدتوں خون ہوئے جس کے لئے قلب و جگر — اپنی ہی پھونکوں سے وہ شمع بجھاتے کیوں ہو
ہے ابھی تشنۂ تکمیل جو روداد بہار — اس کا ہر ورق ہواؤں میں اُڑاتے کیوں ہو
جس کی تعظیم فرشتوں پہ بھی لازم ٹھہری — خونِ انساں کا وہ راہوں میں بہاتے کیوں ہو

آؤ ہر ربط کا ہر اک تار ملا لیں عاصیؔ
بانٹ کر نغمے زمانے کو ہنساتے کیوں ہو

غزل

ضیا فتح آبادی
۱-۱۴۳ راجوری گارڈن
نئی دہلی

پردہ پہرے سے اُٹھا رکھا ہے
کھلی آنکھوں پہ گرا رکھا ہے

اب دلوں میں ہے نہ بازاروں میں
نام جس شے کا وفا رکھا ہے

میری آنکھوں میں بھی آنکھیں ڈالو
آئینہ خانے میں کیا رکھا ہے

تم نے جو چھیل کے پھینکا تھا زخم
ہم نے سینے سے لگا رکھا ہے

برق کی آنکھ کا تنکا ہے وہی
جو نشیمن میں چھپا رکھا ہے

آمدِ حشر ہے کیا، آنگن میں
شور کوّوں نے مچا رکھا ہے

جھوٹ کے شہر کی خوش فہمی نے
سچ کو سولی پہ چڑھا رکھا ہے

کون پہچانے کسے، سب نے یہاں
چہرہ، چہرے پہ لگا رکھا ہے

ان دھڑکتے ہوئے شعروں میں ضیاؔ
اور کیا دل کے سوا رکھا ہے

رُباعیات

ڈاکٹر ایس پی تفتہ
کوروکشیتر

گنگاپ ایم آبد سرہندی

دو روز کے مہمان کی حقیقت یہ ہے
ہاں خاکِ پریشان کی حقیقت یہ ہے
الحاد کا مرکز ہے تو تخریب کی جڑ
اس دور کے انسان کی حقیقت یہ ہے

⁂

کعبہ ہو کہ کاشانہ غرض اس سے نہیں
مسجد ہو کہ میخانہ غرض اس سے نہیں
رندوں کا تو مذہب ہے فقط مے نوشی
شیشہ ہو کہ پیمانہ غرض اس سے نہیں

⁂

نغمات کا محور بھی ہے غم خانہ بھی
جنت بھی ہے گلشن بھی ہے ویرانہ بھی
مجموعۂ اضداد ہے یارب یہ جہاں
سوچو تو حقیقت بھی ہے افسانہ بھی

⁂

اے تفتہ! حالات بدل سکتے ہیں
غم میں بھی جذبات مچل سکتے ہیں
کیا غم ہے اگر سازِ شکستہ ہے ترا
اس پر بھی تو نغمات اُبل سکتے ہیں

⁂

مجموعۂ اوراق ہے تکوینِ جہاں
گنجینۂ اسباق ہے تکوینِ جہاں
کثرت میں بھی وحدت کا ہے انداز آبد
آئینۂ خلّاق ہے تکوینِ جہاں

⁂

آیت ہوں کہ تفسیر ہوں معلوم نہیں
سپنا ہوں کہ تعبیر ہوں معلوم نہیں
ہوں شاملِ کاروانِ ہستی لیکن
رہبر ہوں کہ رہگیر ہوں معلوم نہیں

⁂

نادم ہو گنہگار یہ کم دیکھا ہے
غم خوار ہو عیار یہ کم دیکھا ہے
جذبات میں ہیجان سے انکار نہیں
احساس ہو بیدار یہ کم دیکھا ہے

⁂

آسودہ ہو انساں بہت مشکل ہے
پایاب ہو طوفاں بہت مشکل ہے
حالات بگڑتے ہی چلے جاتے ہیں
اصلاح کا امکاں بہت مشکل ہے

⁂

غزل

خلیق انجم

نقدِ جاں لے جائے گا جنسِ نظر لے جائیگا — کیا خبر تھی عشق سامانِ سفر لے جائیگا
منزلِ تسکین بھی شاید آخری منزل نہیں — دیکھنا ہے اب دلِ مضطر کدھر لے جائیگا
آپ تو ہر بات کا دیتے ہیں خنجر سے جواب — آپ کی محفل سے کوئی کیا اثر لے جائیگا
اے غمِ دوراں نہ کر اہلِ محبت کی تلاش — کس کو فرصت ہے جو تجھ کو اپنے گھر لے جائیگا
اس قدر انجمؔ خیالِ مال و زر اچھا نہیں — قبر میں تجھ کو خیالِ مال و زر لے جائیگا

لیلائے غزل

حکیم شبیر علیخاں شبیر کانپوری

میری لیلائے غزل اے مری شہنازِ غزل
نغمہ زن ہے تری چاہت سے مرا سازِ غزل

ایک اک پھول ہے عنوانِ تکلم تیرا
غنچے غنچے سے نمایاں ہے تبسم تیرا
میرے نغموں میں چھلکتا ہے ترنم تیرا
تیری انگڑائی کا پرتو مری پروازِ غزل

میری لیلائے غزل اے مری شہنازِ غزل
نغمہ زن ہے تری چاہت سے مرا سازِ غزل

یہ ترا رنگِ بدن صبح کا آنچل جیسے
یہ سراپا ہے کہ جلتی ہوئی مشعل جیسے
تیرا لہجہ ہے کھنکتی ہوئی پائل جیسے
تیری رفتار کا جادو ہے کہ اعجازِ غزل

میری لیلائے غزل اے مری شہنازِ غزل
نغمہ زن ہے تری چاہت سے مرا سازِ غزل

مست آنکھیں ہیں تری یا کہ چھلکتے ساغر
تیری شاداب جبیں ہے کہ شفق کا منظر
یہ ترا جسم کہ ترشا ہوا سنگِ مرمر
تجھ پہ سو جاں سے صدقے مرا اندازِ غزل

میری لیلائے غزل اے مری شہنازِ غزل
نغمہ زن ہے تری چاہت سے مرا سازِ غزل

ساری دنیا ہے ترے عکسِ ادا سے روشن
جگمگاتا ہوا آکاش ہے تیرا درپن
لہلہاتی ہوئی دھرتی ہے کہ تیرا جوبن
آ گلے سے لگا لوں وہی ہمرازِ غزل

میری لیلائے غزل اے مری شہنازِ غزل
نغمہ زن ہے تری چاہت سے مرا سازِ غزل

میری تخلیق کے گھونگھٹ کو سرکنے دے ابھی
میرے اشعار کے پھولوں کو مہکنے دے ابھی
فکرِ شبیر کے شعلوں کو بھڑکنے دے ابھی
ڈھل تو جائے تری گفتار میں آوازِ غزل

میری لیلائے غزل اے مری شہنازِ غزل
نغمہ زن ہے تری چاہت سے مرا سازِ غزل

گیت

بشیر احمد جنتابہ صادق آباد (پاکستان)

اس نگری کی ریت نہ جانوں میں پگلا [illegible]
شور مچائیں زخم لگائیں بیری ہر [illegible]

دھیرے دھیرے نیر بہائے کالی سگری رینا
برہا کے ساگر میں آخر ڈوب گئے دو نینا

جیون چاہت اور بڑھائیں ان کے میٹھے [illegible]
لیکن وہ بھی ملتے ہیں اس دیس میں [illegible]

تجھ بن او من موہن سیاں رو رو ہارے نیر
کیسے کٹے گی ناگن جیسی برہا کی یہ رینا
کس کے رخ کا سندر سورج نس نس آگ [illegible]
لٹ کسی کی بن کے ناگن من کو ڈستی [illegible]
من مندر میں آگ لگائے ٹھنڈی مست [illegible]

مورکھ اک دن ٹوٹ گرے گی سانسوں کی دیوا[ر]

اب تو آجا مورے پریتم میں تیرے بلہار [illegible]
تیری خاطر او من موہن او گھٹ دین گزارا

غزلیات

غازی سرگودھوی

لوگ محبت کو اک دیر سمجھتے ہیں
نوں کو، خدا جانے کیوں؟ غیر سمجھتے ہیں

ے حسنِ ازل! تیری تصویر کے دو رُخ ہیں
وکعبہ سمجھتے ہیں، کچھ دیر سمجھتے ہیں

ہیں سر بہ گریباں ہیں؟ محفل میں خدا جانے
لوگ جو لفظوں کے سر پیر سمجھتے ہیں

ن حسنِ تعلق کو کیا نام دیا جائے
ں اپنا سمجھتا ہوں، وہ غیر سمجھتے ہیں

چھا ہے، نہ کھلواؤ، محفل میں زباں یارو
خاموش ہی رہنے میں ہم خیر سمجھتے ہیں

وہ برہنہ پا، شاید، کانٹوں سے نہیں گزرے
شن کے نظاروں کو جو، سیر سمجھتے ہیں

رندوں کو سرِ محفل، چڑ کے نہ ڈرائے واعظ
ہم بھی تیری باتوں کا سر پیر سمجھتے ہیں

ہم اگلے زمانے کے فنکار نہیں غازی
لفظوں کے قرینہ کو جو شعر سمجھتے ہیں

○

اے جانِ چمن، جب بھی ترے ہونٹ ہلے ہیں
اُمید کے صحرا میں بھی کچھ پھول کھلے ہیں

جیتے ہیں یہی سوچ کے، اس دورِ خزاں میں
کچھ لوگ بہاروں سے بچھڑ کر بھی ملے ہیں

یہ انجمنِ ناز ہے، محشر تو نہیں ہے؟
یارو یہی بہتر ہے مرے ہونٹ سلے ہیں

وہ زخم نہ دیکھ کہ، جو پھولوں نے دیئے ہیں
وہ چاک نہ پوچھو کہ جو کانٹوں سے سلے ہیں

کچھ مجھ سے ہی، برہم نہیں، یارب تری دنیا
بے درد زمانے کو تو تجھ سے بھی گلے ہیں

اے بادِ صبا، تازہ اسیروں سے نہ کہنا
گلشن کی بہاروں سے اجر پیغام ملے ہیں

وہ لوگ بھی بیٹھے ہیں سرِ محفل بیٹھے غازی
ہونٹ سلے ہیں

○

یہ الگ بات ہے، وہ مجھ سے خفا لگتے ہیں
پھر بھی اک پیکرِ اخلاص و وفا لگتے ہیں

قافلہ دل کا ہر گام لٹا ہے لیکن
"راہ زن" اب بھی مجھے "راہنما" لگتے ہیں

مختلف ہوتا ہے۔ اربابِ محبت کا مزاج
مہرباں ہو کے بھی کچھ لوگ خفا لگتے ہیں

میرے نغمات کا انداز نیا ہے پھر بھی
جانے کیوں اگلے زمانے کی صدا لگتے ہیں

شیخ بھولے سے چلے آتے ہیں میخانہ میں
دیکھنے میں تو وہ اک مردِ خدا لگتے ہیں

مرے افکار پریشاں بھی، بعنوانِ غزل
بوئے گل، سازِ طرب، موجِ صبا لگتے ہیں

میر کے شعر، نہ نشتر ہیں نہ خنجر یارو
ہم سے خاموش فقیروں کی صدا لگتے ہیں

حسن والوں کا یہ عالم، کہ الٰہی توبہ
بت سمجھتا ہوں، مگر پھر بھی خدا لگتے ہیں

آج کے دور میں الفاظ کے تانے بانے
کسی مزدور کی بوسیدہ قبا لگتے ہیں

یاد پڑتا ہے، کہ غازی کو کہیں دیکھا ہے
یہ وہ دیوانے ہے، جو سب سے جدا لگتے ہیں

○

غزلیں

نسیم شاہ جہاں پوری

مجھے یوں فوقیت حاصل ہے عصرِ نو کے انساں پر
کسی کے خون کے دھبے نہیں ہیں میرے داماں پر

کروں کیا تبصرہ اب خندۂ گلہائے خنداں پر
کہ شبنم مستقل تنقید ہے نظمِ گلستاں پر

کبھی یہ طنز کرتے ہیں، کبھی یہ مسکراتے ہیں
بڑے احساں ہیں اپنوں کے مرے حالِ پریشاں پر

ملیگا ہر ورق رنگیں ہماری داستانوں سے
جہاں تک تم نظر ڈالو گے تاریخِ گلستاں پر

میں نکلا بھی تو نکلا قیدِ ہستی سے رہا ہو کر
اسیری میری، اک احسان ہے تاریخِ زنداں پر

فریبِ اعتبار اپنا مقدر بن گیا شاید
یقیں آنے لگا ہے پھر کسی کے عہد و پیماں پر

ہوئی پامال جب بھی کوئی حسرت دل تڑپ اٹھا
نشیمن جب جلا کوئی تو آنچ آئی گلستاں پر

فنا ہو کر ہی اہمیت فنا کی ہوتی ہے ظاہر
کھلا کرتی ہے یہ زندہ حقیقت مر کے انساں پر

کسی کا اے نسیم انعام و بخشش تو بڑی شے ہے
مرے اشکوں کا بھی احساں نہیں ہے میرے داماں پر

٥

اخلاق سہسوانی

مجھے اب کوئی نہ دیکھے بہ طریقۂ یگانہ
کہ فریب کھا چکا ہے مرا جذبِ مخلصانہ

تمہیں اپنے درد و غم کا میں سنا تو دوں فسانہ
یہی ڈر ہے رک نہ جائے کہیں گردشِ زمانہ

یہ کرشمۂ نظر ہے کہ کمالِ حسن جلوہ
جہاں اک نگاہ دیکھا وہیں بن گیا فسانہ

میں دعائیں دے رہا ہوں رہ و رسمِ ضبطِ غم کو
مجھے ہنسنے کا کم از کم یہ ملا تو اک بہانہ

میں اسے دکھاؤں کتنا ہے سکوں مرے قفس میں
ذرا اس طرف سے گزرے تو بہار کا زمانہ

یہیں اے جبیں جھکی ہے تری منزلِ تقدس
یہ ہے دیر یہ حرم ہے یہ ہے اُن کا آستانہ

ترا چہرۂ حسیں بھی کچھ اداس لگ رہا ہے
کہیں یہ بھی ہو نہ شاید مرے غم کا شاخسانہ

تم اٹھا و رخ سے پردہ ہم اڑائیں ہوش اپنے
چلو آج پھر سنائیں وہی طور کا فسانہ

نہ وہ شاعری کا جذبہ نہ وہ شاعری کا مقصد
نہ خلوصِ شاعرانہ نہ وقارِ شاعرانہ!

٥

دین محمد درد
ساہیوال (پاکستان)

ہم سے اگر خفا ہو تو ہم سے نہ بولئے
نکہت ملے ہواؤں کو زلفوں کو کھولئے

تیری گلی سے دور، تری زلف سے پرے
دیکھو تو آج درد کی بانہوں میں سو لئے

کچھ ایسے بھی گزرتا ہے عرصہ فراق کا
گلشن میں جتنے خار تھے دل میں چبھو لئے

مرنے کے بعد بھی تو وہی سلسلہ رہا
میری لحد پہ آئے ہیں اغیار کو لئے

عکسِ جمیل بخشے تھے جلتے سموں نے جو
ہم نے وہ درد آنکھ میں منظر سمو لئے

غزل

خسروی ناظم آباد کراچی

بولنا چاہا اُسے تو اور یاد آنے لگا
کہ طلب جب بھی سکوں کی اور تڑپانے لگا
روکنا چاہا کبھی آنکھوں نے گر سیلابِ غم
ساحلِ دل سے نیا طوفان ٹکرانے لگا
دل کو بہلانا اگر چاہا کبھی تصویر سے
جانے کیا کیا یاد آیا، اور گھبرانے لگا
ہم نے لکھا تھا کہ صورت ہی دکھا جائے کبھی
یہ جواب اس کا ملا، خط سے بھی ترسانے لگا
راہ میں اغیار سے ملنے پہ ٹوکا تھا اُسے
تو جلانے کو ہمیں وہ اُن کے گھر جانے لگا
اور اگر اس کا گلہ ہم نے کیا اُس سے کبھی
کس ڈھٹائی سے ہماری ہی قسم کھانے لگا
آرزوئے قرب کا اظہار کر کے یہ ملا
دُور سے بھی دیکھ لے ہم کو تو کترانے لگا
خسروی ہم پر وہی اسکا کرم ہے آج تک
جب کبھی سنبھلے ذرا، تازہ ستم ڈھانے لگا

غزل

جگرؔ بستوی
ہنومان پرشاد سریواستو

یہاں کون و مکاں سہمے ہوئے ہیں
حرم کے آستاں سہمے ہوئے ہیں
یہ دُنیا آج کی سہمی ہوئی ہے
زمین و آسماں سہمے ہوئے ہیں
تجلّی طور کی دیکھی ہے جب سے
خرد کے پاسباں سہمے ہوئے ہیں
بڑی پُر سوز ہیں اب شاہ راہیں
امیرِ کارواں سہمے ہوئے ہیں
گیا ہے چاند پر جب سے یہ انساں
فلک پہ کہکشاں سہمے ہوئے ہیں
کوئی گلچیں چلا ہے سُوئے گلشن
گلُوں کے راز داں سہمے ہوئے ہیں
ہوئے جب رُوبرو اس شوخ کے ہم
مرے طرزِ بیاں سہمے ہوئے ہیں
کبھی آہوں کبھی سوزِ جنوں کے
جگرؔ اب درمیاں سہمے ہوئے ہیں

غزل

نور جہاں نورؔ بنت حبیب بجنوری

بزمِ تصوّرات میں آنے لگے ہیں وہ
آنکھوں کے راستے سے حسیں خواب کی طرح
پہلے نظر ملا کے تھا چھینا سکونِ دل
مجھ کو فریبِ حُسن میں لانے کے واسطے
کل تک جنہیں سکھاتے تھے اندازِ حسن کے
جن کو ہماری یاد سے رہتا تھا واسطہ
اے نورؔ بے سبب نہیں یہ اُن کی بے رُخی
رگ رگ میں روح بن کے سمانے لگے ہیں وہ
ذرّہ ذرّہ کے قلب و ذہن پہ چھانے لگے ہیں وہ
راتوں کی نیند اب تو چُرانے لگے ہیں وہ
کس کس ادا سے پیار جتانے لگے ہیں وہ
آدابِ عشق ہم کو سکھانے لگے ہیں
اب ہم کو اپنے دل سے بھلانے لگے ہیں
شاید کسی سے دل کو لگانے لگے ہیں

غزلیں

بسمل نقشبندی رتلامی بانسواڑہ

یسے کچھ گوہر نایاب مرے ہاتھ میں تھے
ں جدھر سے بھی گیا لوگ مری گھات میں تھے
م سواران وفا بزم خیالات میں تھے
ن دل پچھلے پہر شغل مناجات میں تھے
دور رہ کر یہ کھلا رازِ حقیقت مجھ پر
تیری چاہت کے مزے رمز و کنایات میں تھے
عالم وجد میں جو بات کہی تھی اُس نے
سارے ادراک کے پہلو اسی اک بات میں تھے
چاک کر ڈالا جنہیں آپ نے ہنستے ہنستے
ہم بھی عنوان کی صورت انھیں صفحات میں تھے
میں تہی جام رہا تم رہے پیمانہ بکف
رنگ ایسے تو نہ تصویر مساوات میں تھے
صبح نے زندگیٔ نو کا دیا ہم کو پیام
رات ہم دائرہ مرگِ مفاجات میں تھے
اہل ہمت رہے ہر بندشِ اوقات سے دور
پست ہمت جو تھے وہ پنجۂ اوقات میں تھے
میرے تاریک مقدر کے لئے چاند بنے
جو ستارے تری بھیجی ہوئی سوغات میں تھے
کیوں نہ ہوتا ہمیں حاصل شرفِ پابوسی
ہم تری راہ کے بکھرے ہوئے ذرات میں تھے
کیوں نہ کرتے مری تعظیم فرشتے بسمل
جتنے اوصافِ حمیدہ تھے مری ذات میں تھے

بزمی عباسی چھپا کھٹی

احوال غم دل کا کیا آپ نے پوچھا بھی
خود آپ کو جب دل نے ہر غم میں پکارا بھی
ساحل پہ کھڑے رہ کر ڈوبوگے نہ اُبھروگے
طوفاں سے جو ٹکرایا طوفاں میں وہ اُبھرا بھی
ہم پر ہی ستم اُس کے ہم پر ہی کرم اُس کے
قاتل جو ہمارا ہے وہ خود ہی مسیحا بھی
یہ سچ ہے زمانے میں تم سا تو نہیں کوئی
تم سارے زمانے میں ڈھونڈو کوئی مجھ سا بھی
دنیا نے ہمیں رکھا محروم اُجالوں سے
ہم سے ہی زمانے میں پھیلا ہے اُجالا بھی
سینچا ہے جسے ہم نے خود اپنا لہو دے کر
لازم ہے وطن والو ہر ذرّے کو سجدہ بھی
سودا ہے دل و جاں کا ہر سانس محبت میں
راس آیا نہیں لیکن سب کو تو یہ سودا بھی
دشمن کو جو کہتے ہیں دشمن وہ نہیں سمجھے
انساں ہے بہر صورت ہو آدمی کیسا بھی
ٹوٹی ہے گھٹاؤں میں سو بار مری توبہ
تیری ہی طرح ناصح خود ہے مری توبہ بھی
کچھ لوگ محبت کو آساں نہ سمجھ بیٹھیں
پھولوں کا یہ بستر بھی اور آگ کا دریا بھی
چھپتے ہو نگاہوں سے رہتے ہو مگر دل میں
ہے پردے کا پردہ بھی اور جلوے کا جلوہ بھی
دیکھا ہے بہت ہم نے پیمان وفا بزمی
جو عہد کیا تم نے اُس عہد کو توڑا بھی

صابر کرتھلوی

ڈھونڈ لے راہ اب سفر کے لئے ہے یہ پیغام تو ہر نظر کے لئے
زندگی ہے کھلی کتاب مگر اک معمّہ ہے بے خبر کے لئے
ہر زمانہ میں آئینہ ہوگا اک بشر دوسرے بشر کے لئے
آج بھی در بدر بھٹکتی ہیں کیوں دعائیں مری اثر کے لئے
منتظر کب تلک رہے آخر جاں بلب کوئی چارہ گر کے لئے
رات اور دن کا اہتمام ہوا شمس کے واسطے قمر کے لئے

افغان پناہ گزینوں کی مدد کے لئے

ایک اپیل

اس حقیقت سے آپ یقیناً واقف ہوں گے کہ افغانستان پر سوویٹ قبضے کے نتیجے میں افغان وطن پرستوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان میں پشاور کے قریب بے سروسامانی کے عالم میں پناہ گزینوں کے کیمپوں میں پڑی ہے۔ ان پناہ گزینوں کی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کرنا جذبۂ انسانیت کا تقاضا ہے، سیاست سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ عالمِ انسانیت کے اس ستم رسیدہ طبقے کی خبرگیری اور کفالت کے لئے دنیا کی ساری مہذب قوموں کو اپنا عطیہ دینا ہے۔

ہماری آپ سے دردمندانہ اپیل ہے کہ نقد یا جنس کے رُوپ میں اس نیک کام کے لئے دل کھول کر عطیات دیں۔ سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ان پناہ گزینوں کو کمبل اور لحاف، گدے فراہم کئے جائیں تاکہ وہ موسم سرما کی سختیوں کا مقابلہ کر سکیں۔ آپ کے فراخدلانہ عطیہ کا انتظار ہے۔

عطیات کے چیک / بینک ڈرافٹ براہ کرم

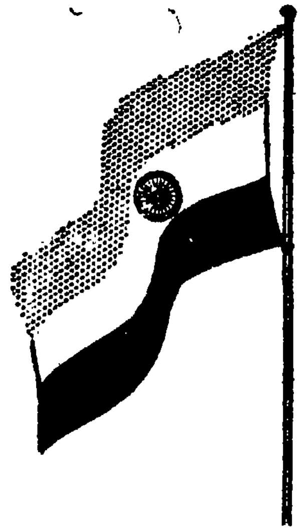
فرینڈس آف افغانستان ایسوسی ایشن

۱۰، ڈاکٹر راجندر پرساد روڈ، نئی دہلی

کے نام بھوائیں۔

رام جیٹھ ملانی، سکندر بخت
جے۔ پی۔ ماتھر، عارف بیگ
اچاریہ دھرمیندر ناتھ

اچاریہ دھرمیندر ناتھ
نے اس اشتہار کے لئے جگہ کا عطیہ دیا



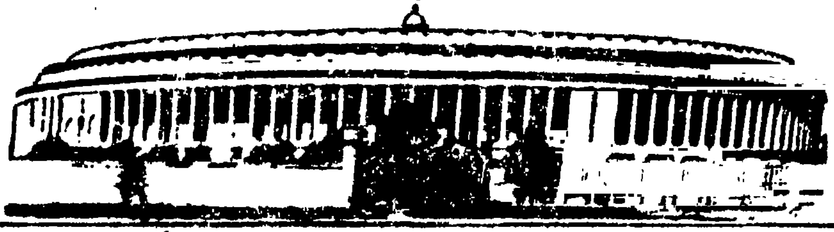
یوم جمہوریہ پر دلی مبارکباد

26 جنوری 1950ء کو بھارت کے لوگوں نے ایک خود مختار سوشلسٹ سیکولر جمہوری ریپبلک کی بنیاد رکھی تھی۔
گزشتہ 31 برسوں میں ہم نے بہت سے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔

- ہم نے جمہوریت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا ہے۔
- عرصے سے چلی آرہی خوراک کی کمی پر قابو پایا ہے۔
- ہم سرکردہ زیادہ صنعت یافتہ ملکوں میں گنے جاتے ہیں۔
- ہم سائنس اور ٹکنالوجی میں صف اوّل کے ممالک میں شامل ہو گئے ہیں۔
- ہم نے تین بیرونی حملوں کا منہ موڑا ہے۔ اور
- بین الاقوامی اجتماعوں میں ہماری آواز معنی رکھتی ہے۔

مگر سب کے لئے سماجی انصاف اور عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کی خاطر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

یہ صرف قومی اتحاد کے مضبوط رشتے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔



ترقی اور تحفظ کی خاطر قومی یکجہتی کو پکا کیجئے اور سیکولر جماعتوں کو مضبوط بنایئے۔

davp 80/324

سنجوگ

الحاج انجم وزیرآبادی (لاہور)

ماتا جی سلام ۔ ہائے لاگن ۔ کیا حال ہے ماتا جی ؟

میری بہنیں اور میرے بھائی کیسے ہیں ؟

یہ الفاظ امرناتھ عرف ناتھا کے تھے۔ ناتھا وزیرآباد گلی مہراں والی میں پرچون کی دوکان کیا کرتا تھا۔ یہ بات میرے مشاہدہ میں بچپن سے آرہی تھی کہ میری ماں جب بھی ناتھے کی دوکان کے سامنے سے گزرتی وہ لپک کر کھڑا ہو جاتا۔ گدی سے نیچے آکر میری ماں کے پاؤں چھونے کی کوشش کرتا اور ماں اسے دعائیں دیکر پیچھے ہٹا دیتی۔ نہ بیٹا مجھے گنہگار نہ کرو۔ رام نام لو۔ ایشور کا جاپ کرو۔ احترام عاجزی صرف اللہ میاں کے حضور ہی دیا ہے۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنی پڑھائی ختم کرلی اور اپنے آبائی پیشہ کی طرف رجوع کیا۔ ملٹری کنٹریکٹ کے سلسلہ میں میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر رہا۔ ان دنوں پاکستان اور ہندوستان ایک ہی ملک تھا۔ جب بھی میں چھٹی پر گھر آتا امرناتھ کی دوکان ہمارے گھر کے سامنے ہی ہوتی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی دوڑ کر آگے بڑھتا اور مجھ سے بغلگیر ہو جاتا۔

جانی بابو بھائی کیسے ہو ؟ خیر خیریت رہی ۔ آج کل کونسی چھاؤنی میں ہو۔ کام دھندا کیسا ہے۔ آؤ بیٹھو جل پانی پیو۔ میں تو ہمیشہ ماتا جی سے پوچھتا رہتا ہوں۔ میرے بھائی کہاں ہیں۔ گھر کب آرہے ہیں؟ خیر خیریت سے ہیں۔ امرناتھ ہمارے گھر والوں کے ساتھ اس قدر مخلصانہ طور سے پیش آتا کہ اپنے قریبی عزیزوں سے بھی سبقت لے جاتا۔

میں بفضل خدا صاحب اولاد ہوں۔ والدہ صاحبہ کی زندگی میں ہی میں تین بچوں کا باپ تھا۔ مگر میری عادت تھی کہ جب بھی گھر ہوتا تو میں رات کو اپنے ماں کے پاؤں دبائے بغیر نہ سوتا۔ یہ میرا معمول تھا۔

ایک رات پاؤں دباتے ہوئے میں نے ماں سے استفسار کیا ماں آج مدت ہوگئی۔ مجھے کبھی خیال نہیں رہتا مگر اکثر اس بارے میں سوچا ہے۔

کس بارے میں ؟ والدہ صاحبہ نے سوالیہ انداز میں کہا ؟

یہی کہ امرناتھ سے ہمارا کیا رشتہ ہے ؟ اور اسے ہمارے ساتھ اس قدر انسیت کیوں ہے ۔ وہ آپ کا احترام ہم سے بڑھ چڑھ کر کرتا ہے۔ ماں بولی ۔ بیٹا ۔ وہ بھی آپ کا بھائی ہے ۔ میں اس کی منہ بولی ماں ہوں اور وہ میرا منہ بولا بیٹا ہے۔ رہا احترام اور ادب ولحاظ تو بیٹا یہ اس کا اخلاق ہے وہ احسان فراموش نہیں اور یہ ایک اعلیٰ ظرف انسان کی علامت ہے ۔ اس کی شادی اللہ کی مہربانی سے میرے ہاتھوں سرانجام پائی۔ وہ کیسے ماں ؟ میں نے پوچھا۔

دیکھو بیٹا وہ جو سامنے حویلی ہے نا یہ لالہ سائیں داس کی ہے وہ تمہارے باپ کا دوست تھا۔ اور ان کا بہت احترام کرتا تھا بیچارے کی نرینہ اولاد نہ تھی صرف ایک ہی لڑکی تھی " روحیل " وہ بچی میرے ہاتھوں میں پلی اور پروان چڑھی ۔ اس کی رنگت دودھ کی طرح سفید تھی ۔ اور وہ دودھ کی طرح پوتر بھی تھی۔ بڑی بھولی بھالی اور نیک اطوار لڑکی تھی ۔ روحیل ۔

اس کی شادی رچی ۔ برات آگئی ۔ باجے گاجے ۔ ڈھولک ۔ لوک گیت ۔ سب کچھ ہوا ۔ اب یہ سماں تھا کہ دلہا دلہن لگن منڈل کی طرف بڑھے۔ لڑکی کے پتاجی نے اسے سہارا دیکر لگن منڈل پہ کھڑا کر دیا۔ پنڈت وہاں موجود تھا۔ اگربتیاں ۔ لوبان وغیرہ سلگ رہا تھا۔ آگ روشن تھی ۔ دلہا نے لگن منڈل پر پاؤں رکھا تو اس کے ایک دوست نے اس سے کہا جگل ذرا ٹھہرو ۔ صرف ایک منٹ سنو اگر مجھے اپنا مربی حقیقی دوست اور خیرخواہ خیال کرتے ہو تو لگن منڈل سے اتر آؤ اور برات خالی لیکر واپس لوٹ جاؤ۔ لڑکی جو تمہاری استری بنے گی اس کا چال چلن مشتبہ ہے۔ میں نے پوری پوری تحقیق کرلی ہے ۔

جگل کشور اس کی بات پر ایمان لے آیا ۔ اور بغیر کچھ پوچھ گچھ کئے وہ اپنے باپ کو بولا پتاجی یہ شادی نہیں ہو سکتی ۔

کیوں؟ اس کا باپ بولا۔

لڑکی [illegible] کی سوہنے گی آوارہ ہے۔ ماں باپ کے سمجھانے اور ساس [illegible] سسر کی آہ و زاری نیز منت سماجت کے باوجود [illegible] ایک چٹان بنا رہا۔ اس کے ارادہ میں جنبش نہ آئی اور ملا سائیں داس کے گھر سے اس کی بیٹی کی برات کی واپسی کا نظارہ تمام نگر واسیوں نے دیکھا۔ چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ مگر سائیں داس نے ہمت نہ ہاری وہ شیر کی طرح لگن منڈل کی طرف لپکا۔ اور لڑکی کو بولا۔ پتری یہاں ہی کھڑی رہو لگن منڈل سے نیچے نہ اترنا۔ تاوقتیکہ میں تمہارے لئے دوسرا دولہا نہ لے آؤں اور میں لے کر آؤں گا۔ ضرور لاؤں گا۔ میری پتری گنگا جل کی طرح پوتر ہے۔

بیٹی سے یہ کہہ کر سائیں داس ہمارے گھر آیا۔ رات کا عالم تھا۔ سائیں داس روتے ہوئے بولا۔ ماتا جی ماتا جی۔ سائیں داس بیٹا۔ کیوں؟ خدا کا شکر کرو تمہاری بیٹی عزت و آبرو سے اپنے سسرال گئی۔ بیٹی تو ہوتی ہی پرایا دھن ہے۔ ماتا جی رونا تو اسی بات کا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تمام واقعہ من و عن میری ماں سے بیان کر دیا۔ میری ماں بولی سائیں داس تم گھر چلو بیٹی کو اور گھر والوں کو سہارا دو۔ اور تسلی اور تشفی میں اللہ کی مہربانی سے بھگوان کی کرپا سے جو بچن تم اپنی پتری سے کر کے آئے ہو پورا کروں گی۔ ماں کے دل میں تھا امرناتھ کا خیال آیا۔ وہ بالکل فرد واحد تھا۔ نہ ماں نہ باپ نہ کوئی بھائی نہ بہن۔ ہم کا دم ماں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ بیٹا میں امرناتھ کی دوکان پر اسے بلانے اور یہ خوشخبری سنانے کے لئے گئی۔ تمہارا بڑا بھائی میرے ساتھ تھا۔ اس وقت امرناتھ دنیا و مافیہا سے بے خبر خواب خرگوش میں تھا۔ اور ریل کے انجن کی طرح خراٹے بھر رہا تھا۔ میں نے اسے جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور بیٹھ گیا ماتا جی آپ اور اس وقت خیر تو ہے۔ ماں گھر میں تو ہر طرح آنند ہے نا؟ اس وقت کیسے پدھارے امرناتھ بیٹا وقت ضائع نہ کرو۔ اٹھو منہ دھو لو۔ تمہاری شادی ہے۔ ماں میری شادی میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ تمہارے بھائی سے کہنے لگا کہ مجھے دانت سے کاٹو۔ بھلا میں ہوش میں ہوں۔ یا عالم رویا میں۔ ماں نے کہا بیٹا یہ وقت مذاق کا نہیں [illegible] آؤ آج خدا نے کسی کی لاج رکھ لی ہے۔ اب عزت کس کی [illegible] ہاتھ میں ہے۔

ناتھ کو لے کر میں سائیں داس کے گھر آئی۔ [illegible] ایک پتھر کی مورتی بنی لگن منڈل پر کھڑی تھی۔ سائیں داس اور اس کی بیوی سہاگ بھری ان کے رشتہ دار گھر [illegible] مجھے اور امرناتھ کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ سمجھ گئے [illegible] معاملہ بھانپ گیا۔ اس نے نعرہ لگایا دولہا [illegible] ماتا جی آ گئے اور دولہا کا ورسی لے کر آ گئے۔ پنڈت [illegible] پڑھو اور میری پتری کا ہاتھ اس کے سوا کسی کے ہاتھ [illegible] شادی کی رسم ادا ہو گئی۔ محلہ بھر کے لوگ ایک منہ ہو کر [illegible] مائی برکت بی بی زندہ باد۔ ماں نے آج ایک گھر کا [illegible] واپس دیا۔ سائیں داس بولا۔ بیٹا امرناتھ [illegible] جاؤ۔ ماتا جی کے قدم چھوؤ۔ مگر پہلے ماتا برکت [illegible] یہ سب کچھ ان کے طفیل ہوا ہے۔ اس کے بعد اپنی ساس [illegible] پاؤں چھونا۔

ناتھ میرے پاس آیا اور بولا۔ ماتا جی اب میں [illegible] کہاں۔ میرا تو گھر نہ گھاٹ میری دوکان ہی میرا گھر ہے۔ [illegible] میں کھاٹ کچھ گھر ہے۔ اور [illegible] پاس چارپائی بھی ایک ہی ہے۔ یہ بات [illegible] وہ بولا۔ سنو جی۔ سہاگ بھری وہ ہمارا مکان [illegible] میں خالی ہوا تھا۔ کیا وہاں کوئی کرایہ دار آ گیا ہے یا [illegible] وہ ابھی تک خالی ہے۔ پھر وہ مکان [illegible] بھی پتری کو جہیز میں دیا۔ چھیڑ چھاڑ ہوئی اور [illegible] استر کا بھی حل گھڑی۔ اور مکان بھی ہو گیا۔ اب اپنی [illegible] مکان میں لے جاؤ اور پتری کی بستر لگا جاؤ۔ خدا [illegible] سکھی رکھے۔

میں آج بھی خیال کرتا ہوں۔ [illegible]

ضمیر فروش

ڈاکٹر اُڈمے سرن ارمانؔ بلاری

سیٹھ گوپی چند متفکرانہ انداز میں کسی کا انتظار کر رہے تھے سمندری مدوجذر کی طرح ان کے پریشان دل و دماغ کے نقوش ان کے چہرے پر بُری طرح اُبھر آئے تھے۔ گھسٹتا ہوا ایک بھکاری ان کے دروازے پر رُکا۔ یہ بھکاری آئے دن اسی محلے میں بھیک مانگتا تھا۔ زیادہ تر اہلِ محلہ اس سے شناسا ہو گئے تھے اس کا اصلی نام تو کوئی جانتا نہیں تھا۔ مگر یہ کھچیڑا پکارنے سے وہ اپنے مخاطب سے ہم کلام ہوتا تھا اس لئے سب محلے والے اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ بچپن میں اس کی دونوں ٹانگیں پولیو نے مار دی تھیں جبھی سے یہ کھچیڑ کھچیڑ کر چلتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر تیس سے اوپر تھی۔ کبھی کبھی یہ بھکاری قصبے کے اس محلہ سے باہر بستی کی طرف چلا جاتا تھا تاہم علاقے کے کچھ رحم دل لوگ اُس کے پیٹ بھرنے کو کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔ مگر آج سویرے ہی سے رم جھم رم جھم بوندیں پڑ رہی تھیں جس کی وجہ سے وہ زیادہ گھسٹ نہیں سکتا تھا۔ بھوکا ہونے کے باعث اس نے سوچا کہ یہ ایک امیر کا گھر ہے پیٹ بھرنے لائق کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔ لہٰذا اس نے بڑی عاجزی سے صدا لگائی۔

"سیٹھ صاحب صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ بہت بھوکا ہوں کچھ کھلا دو تو بڑا اپکار ہوگا۔"

"میرے یہاں لنگر کھل رہا ہے کیا؟ جا آگے ایک مندر بھی ہے اور دھرم شالا بھی ہے وہاں کھانا بھی ملتا ہے اور رہنے کو جگہ بھی۔" سیٹھ نے بڑے روکھے انداز سے کہا۔

"سیٹھ صاحب اس کیچڑ اور بارش میں مجھ پر رحم کیجئے۔ وہ مندر بھی تو آپ جیسے [illegible] ہے۔"

"دماغ [illegible] کچھ تو تیرے نصیب میں لکھا ہے۔ میں کیا کروں۔" بے التفاتی سے [illegible] کہا۔

"سرکار صرف دو روٹیاں دلا دیجئے [illegible]"

"اپنی ہی بات کہے جاتا ہے۔ ارے یہ کوئی روٹی کا وقت ہے چھ بج رہے ہیں۔ نو بجے تک کھانا بنتا ہے ہمارے گھر میں اب تجھے کہاں سے روٹی دلا دوں؟"

"سرکار اتنے بڑے گھر میں دو روٹیاں نہیں نکلیں گی کیا کئی روٹیاں تو بچوں کی جوٹھن ہی بچ رہتی ہوں گی۔ جوٹھن ہی دلا دو میں اس اس سے پیٹ بھر لوں گا۔"

"ہمارے یہاں بچا ہوا کھانا فوراً گائے کو کھلا دیا جاتا ہے۔"

"تو ایک روپیہ ہی دیدو کہیں سے کچھ لے کر کھا لوں گا۔" بارش کے چھینٹوں سے تر بالوں کو جھاڑتے ہوئے کھچیڑا نے کہا۔

"ایک روپیا۔ تو تو ایسے مانگ رہا ہے جیسے تیرا کچھ ہم پر آتا ہے کیا زمانہ آگیا ہے کبھی فقیر ایک پائی سے خوش ہو جاتا تھا۔ پھر پیسہ مانگا جانے لگا۔ پھر پانچ پیسے دس پیسے کا سکہ طلب کیا جانے لگا اب روپیہ مانگا جا رہا ہے۔ شرم بھی تو نہیں آئی روپیہ مانگتے ہوئے۔"

"سرکار دان دینے سے برکت ہوتی ہے ہمیں ایک دو گے تو بھگوان نہ جانے کتنا نفع کرائیں گے۔"

"بھکاریوں کو دان دینے سے کیا برکت ہوگی۔ سرکار نے تو جگہ جگہ یہ لکھوا دیا ہے کہ مہربانی کر کے بھکاریوں کو بھیک دے کر ان کی ہمت نہ بڑھایئے۔"

"سرکار جو کام کرتی ہے ٹھیک ہی کرتی ہے جو کچھ لکھا ہے ٹھیک ہی لکھا ہے۔ مگر اس نے بھکاریوں کو دینے سے منع کیا ہے محتاجوں کے لئے نہیں۔ اگر محتاجوں کی مدد کرنا بُرا ہوتا تو وہ خود سرکاری محتاج خانے کیوں کھلواتی۔"

"جا جا بکو مت رے روپیہ بڑی محنت سے پیدا ہوتا ہے یوں ہی لٹانے کیلئے نہیں۔ ہم کسی دعا بددعا کی چنتا نہیں کرتے یہ برکت ورکت کچھ نہیں ہوتی ان پرانی کہاوتوں کے ہم قائل نہیں ہیں۔ جو کچھ نصیب میں لکھا ہے ضرور ہوگا۔"

"ہوسکتا ہے سیٹھ جی جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہ ٹھیک ہو میں آپ سے بحث نہیں کرتا۔ لیکن دعا بددعا بھی ایک چیز ہے۔"

"ہم اس سے نہیں ڈرتے اور صرف بھگوان سے ڈرتے ہیں۔"

"آپ بھگوان سے بھی نہیں ڈرتے سیٹھ صاحب۔ من موجی ہیں من موجی۔ اس روز چوبے کی را ابد کے پاس تو ایک روپیہ بغیر مانگے ہی دیدیا تھا۔ آج مانگنے پر نہیں دے رہے ہو۔ مت دو آپ کی مرضی۔ مگر سیٹھ جی کسی کی بددعا نہ لینا اس سے تو عرش بھی ہل جاتا ہے۔ ویسے سیٹھ جی غرور اچھا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اونچے مکانوں میں رہنے والوں نے نیچا دیکھا۔ یہ کہتا ہوا کچھیڑا گیٹ سے آگے بڑھ گیا اور چلتے سے یہ بھی کہا کہ زمین پر کچھڑنے والا یہ محتاج ہی تمہیں بھگوان کے حکم سے نیچا دکھانے کے لئے کافی ہے۔ مگر سیٹھ کو کچھ رحم نہ آیا۔ اس وقت سیٹھ صاحب اور ہی کسی دھن میں ہے۔ کچھیڑا لکڑی کی ٹال کی طرف بڑھ گیا جہاں ایک لکڑی کے تنے پر ایک پاگل بیٹھا ہوا تھا اس نے کچھیڑا کی طرف غور سے دیکھا اور انگلی کے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔ "یہ تو پاگل ہے جو بہت دنوں سے اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ کیا پتہ پاس بلا کر اینٹ پتھر ہی مار دے۔ مگر کچھیڑا حوصلہ کر کے پاگل کے قریب گیا۔

"لو کچھ کھا لو۔ تم بہت بھوکے ہو۔" کہتے ہوئے اس پاگل نے پھٹی پرانی میلی کچیلی جھولی میں سے چار تنوری روٹیاں جن سے دیسی گھی کی مہک آ رہی تھی۔ اس کی طرف بڑھائیں جن پر مرغ کا بھنا ہوا گوشت بھی تھا۔ کچھیڑا نے دونوں ہاتھ پھیلا دئے بلکہ یوں کہئے بھوک نے پھیلوا دئے روٹیاں ہاتھوں پر رکھی تھیں اور سوچ رہا تھا "یہ پاگل ہے مگر اتنا اچھا کھانا سنبھالے کیسے پھر رہا ہے۔ دوسرے اسکو کیا پتہ کہ میں بھوکا ہوں۔ بات کرنے کا یہ انداز پاگلوں کا تو ہو نہیں سکتا۔ پھر کون ہے" اس نے بہت کوشش کی مگر وہ کچھ نہ سمجھ سکا زبان منہ ہی منہ میں ناگن کی طرح گھوم رہی تھی منہ میں بھر بھر کے پانی آ رہا تھا۔ جس کو بار بار نگلنے کی آواز صاف سنائی دیتی تھی ایک نظر روٹیوں پر ڈال کر کچھیڑا نے پاگل کے چہرہ کو دیکھنا شروع کیا۔ پاگل کی مونچھوں اور داڑھی پر بلغم اور ریم لگی ہوئی تھی اور تار تار گندے پائجامے کے پیچھے بول براز سا لگا ہوا تھا۔ جس پر سینکڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ جس سے کچھیڑا کے من میں گھن پیدا ہو گئی۔ اور ہاتھوں پر رکھی ہوئی روٹی کو واپس کرتے ہوئے بولا "شکریہ آپ نے روٹی دیدی اور میں نے کھا لی۔" کچھیڑا نے بھوک برداشت کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔" پاگل نے نہایت اطمینان سے پوچھا۔

"مجھے کچھیڑا کہتے ہیں۔"

"کچھیڑا بھائی اگر تم بھوکے نہیں ہوتے تو میری روٹیاں اپنے ہاتھ میں نہیں لیتے۔ سیٹھ صاحب کے گھر دو روٹیاں نہیں مانگتے۔ تم جھوٹ کیوں بولتے ہو کہ بھوک نہیں ہے۔ میں تمہارے دل کی بات سمجھ رہا ہوں۔ تم میرے ظاہرہ گندے ڈھنگ کو دیکھ کر گھنیا گئے ہو۔ میں پاگل نہیں ہوں ایک بہروپیا ہوں۔ میری داڑھی مونچھیں نقلی ہیں۔ اور ان پر لگی ہوئی گندگی بڑی ملائی کے ریشے ہیں۔ میرے پائجامے پر شیرا اور لکڑی کا برادہ ملا کر لیپا گیا ہے جس پر مکھیاں بھنک رہی ہیں تم اور سوچ رہے ہو گے۔ تم کھانا کھا لو میں گندہ نہیں ہوں۔ تمہاری طرح صاف شفاف آدمی ہوں" پاگل نے کہا۔ اب کچھیڑا سمجھ گیا اور کھانا کھانے لگا۔ بہروپئے نے پانی لا کر دیا۔ کھانا کھا کر اور پانی پی کر اس کی جان میں جان آئی اور آنکھیں کھل گئیں۔ کچھیڑا نے بے ساختہ کہا۔

"میں تمہیں بہت دنوں سے اسی بھیس میں دیکھ رہا ہوں اور وہ بھی اسی علاقے میں گھومتے ہوئے۔ ایسا کیوں ہے بہروپئے تو کئی مختلف روپ بھرتے ہیں اور مہینوں ایک جگہ نہیں رہتے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو کچھیڑا بھائی مگر مجھے یہی پارٹ پسند ہے اور میں اسی ایک روپ میں بہت سا دھن کما لیتا ہوں۔ اچھا ایک بات بتاؤ" اس نے بات کا پہلو بدلا۔

"پوچھئے" دانت کریدتے ہوئے کچھیڑا نے کہا۔

"تم نے سیٹھ سے یہ بات کس بل بوتے پر کہی تھی کہ زمین پر کچھڑنے والا محتاج تمہیں مٹی میں ملانے کو کافی ہے۔"

یہ سن کر کچھیڑا کچھ دیر تو مسکرایا اور چپ رہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم یہاں بہت دیر سے بیٹھے تھے اور میری ساری باتیں سن رہے تھے۔ سنو یہ کالا دھندا کرتا ہے صبح تھانے میں جا کر اس کی شکایت داروغہ جی سے کر دوں گا۔ بس پھر کیا ہے اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کی کالی کرتوتوں سے واقف نہیں ہوں۔

"کالے دھندے تو بہت سے ہیں یہ کون سا دھندہ کرتا ہے"

"افیون اور گانجے کا کام کرتا ہے؟
خود بیچتا ہے یا بکواتا ہے؟"

"میں یہ تو نہیں جانتا لیکن اتنا پتہ ہے کہ اس کے پاس منوں افیون اور گانجا جمع رہتا ہے۔"

"کہاں رکھتا ہے؟"

"یہ تمہیں کیوں بتاؤں یہ تو پولس کو بتانے کی بات ہے۔"

"کھجیڑا بیٹا میں سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی ہوں نہ پاگل ہوں نہ بہروپیا صرف اسی بھید کو جاننے کے لئے مہینوں سے پاگل بنا پھر رہا ہوں مجھے اتنا تو پتہ تھا کہ نگینہ سے پورب میں ایک کلومیٹر کے فاصلے پر جنگل کے قریب آدھا بیگھہ زمین سڑک کے کنارے بائیس ہزار روپے میں خریدی گئی ہے اتنی مہنگی زمین تو شہر میں بھی نہیں ہے پھر یہ زمین اتنی مہنگی کیوں خریدی گئی اور پھر اتنی مہنگی زمین میں کوئی اچھا اونچا کام بھی نہیں کیا گیا چاروں طرف اینٹوں سے دیوار بنا کر راکھ اور چونے کا کام کیا جا رہا ہے۔ اس ڈھنگ سے تو یہ ظاہر ہے کہ کوئی راز کی بات ہے اسی مسئلہ کو سمجھنے اور سلجھانے کے لئے میں یہاں گھومتا پھرتا رہا۔ لیکن منزل مقصود پر نہیں پہنچا آج تم نے یہ گتھی سلجھا دی۔"

"بڑے گہرے ہوتے ہو تم لوگ بھی" کھجیڑا نے کہا

"تم بھی کم گہرے نہیں ہو کھجیڑا۔"

"ہمارا گہرا اتھلا کیا ہے مالک۔ غریب آدمی امیر آدمی کے خلاف چل کر زندہ نہیں رہ سکتا اس لئے سب کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش تھا۔ لیکن آج اس کنجوس نے مجھے ایسے چوٹ دی ہے کہ اس سے ٹکر لینے کو تیار ہو گیا ہوں۔ چلو اس کے گودام اور افیون کی جگہ دکھا دوں۔"

یوں کہتے ہوئے کھجیڑا سڑک کی طرف منہ کر کے گھوما پاگل نے رکشا روکا اور دونوں سیٹھ گوپی چند کے گھیر پر چل دیئے وہاں پہنچ کر وہ دونوں گھیر کے پیچھے گنے کے کھیت میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ کھجیڑا نے دھیرے سے کہا "یہاں روز ایک فیٹ کار آتی ہے۔ چھ کے بعد۔ ڈالڈا گھی کے خالی ڈبوں میں افیون اور گانجا بھر کے راکھ اور چونے کے گودام میں چھپا دیا جاتا ہے نکال کر کب لے جاتے ہیں۔ اس کا پتہ نہیں۔" پاگل کو اس بات میں کچھ وزن معلوم ہوا وہ بڑی غور سے سڑک کی طرف دیکھتا رہا اور ٹوہ لیتا رہا۔ بوندیں بھی تیز ہو گئی تھیں اور ہوا بھی سنسنانے لگی تھی تھوڑی دیر میں ایک کار کے رکنے کی آواز آئی "کار آ گئی" فوراً کھجیڑا نے کہا۔

"تمہیں اتنی پہچان ہے اس کی کار کی۔ کوئی اور بھی تو ہو سکتی ہے"

"اسی کی کار ہے مجھے خوب پہچان ہے میں نے کئی بار اس کار کو یہاں آتے جاتے دیکھا ہے۔ دیکھو دھیمی پڑ گئی" سی آئی ڈی نے دیوار کے روزن سے جھانکا وہ رک گئی۔ "کوئی [illegible] باہر نکلا" کھجیڑا نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ پاگل جھانکتا رہا۔ "ٹھیک کہتے ہو کوئی کار کی ڈگی میں سے ڈبے نکال رہا ہے اور ادھر بڑھ رہا ہے۔ اس نے راکھ میں دبانے کے لئے جگہ ڈھونڈنی شروع کر دی" پاگل کھجیڑا سے پھسر پھسر کہہ رہا تھا۔ اسی وقت باہر کھڑے آدمی نے کہا "اسے کہیں بھی دبا دے یہاں بارش میں کون دیکھ رہا ہے" اندر والے آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا اور ڈبوں کو سنبھال کر راکھ میں دبا دیا گیا۔ کار چلی گئی۔

"تمہاری بات صحیح نکلی کھجیڑا تم تو بڑے کام کے آدمی نکلے میرے مہینوں کے کام کو منٹوں میں پورا کر دیا۔ اس کام کے لئے میں زندگی بھر احسان مند رہوں گا تم نے اتنی بڑی مدد کی ہے کہ میں شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ بھی نہیں رکھتا۔ دیکھو میرے پاس ایک بیس روپئے کا نوٹ ہے بطور انعام کے تم کو دینا چاہتا ہوں کیا تم یہ معمولی سی بھینٹ منظور کرو گے۔"

"بھینٹ کوئی معمولی نہیں ہوتی ہے کیونکہ اس کے پس پردہ عزت افزائی کا جذبہ ہوتا ہے مگر بھوکے کو پیٹ بھر کے کھلانے سے بڑھ کر کوئی انعام نہیں ہو سکتا جو تم پہلے ہی مجھے دے چکے ہو میں تو ایک بیکار آدمی ہوں آپ کے کام آ گیا یہ میری خوش نصیبی ہے کوئی اور سیوا ہو تو بتائیے" نوٹ واپس کرتے ہوئے کھجیڑا نے کہا۔

"تم تھوڑی دیر یہیں بیٹھو میں ابھی آیا" کھجیڑا کو گود میں اٹھاتے ہوئے پاگل نے کہا اور باہر سڑک کے کنارے پیپل کے پیڑ کی چھایا میں بارش سے بچانے کے خیال سے لا کر بٹھا دیا۔ اور خود تھانے چلا گیا اور کھجیڑا بیٹھا بیٹھا سی آئی ڈی کی نشیب و فراز پر نظر دوڑاتا رہا تھوڑی دیر بعد داروغہ جی کی جیپ وہاں آ کر رکی سی آئی ڈی بھی اسی میں تھا۔ کھجیڑا نے عالم تصور سے چونک کر ادھر دیکھا "دس پانچ منٹ اور ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں ایک سپاہی بھی یہیں چھوڑتا ہوں پھر تمہیں کہیں اچھی جگہ پہنچا دوں گا" سی آئی ڈی نے کہا اور جیپ تیز رفتاری سے چلی گئی۔

"مجھے اچھی جگہ تو موت ہی پہنچا سکتی ہے بابوجی" سی آئی ڈی کی بات کا جواب دیتے ہوئے کھجیڑا نے کہا سپاہی نے تو کھجیڑا کی یہ بات سنی لیکن سی آئی ڈی اس جواب کو کم ہی سن پایا تھا۔

سیٹھ گوپی چند کے دروازے پر پولیس کا جیپ رُکا۔ لوگ چونکے۔ چوکیدار باہر آیا۔ "کیا بات ہے صاحب"؟

"سیٹھ جی سے ملنا ہے کہنا داروغہ جی ملنا چاہتے ہیں۔" چوکیدار اندر گیا اور سی آئی ڈی سے داروغہ جی بولے "وہ اپاہج کون تھا سر"۔

"میرا مخبر۔ اسی نے تو سیٹھ جی کے کالے دھندے کا پردہ فاش کیا ہے۔ کبھی کبھی فٹ پاتھ کے لوگ بھی بڑے کام کے ہوتے ہیں"۔

"آخر ہیں تو وہ بھی اسی دیس کے باسی"۔ داروغہ جی نے کہا اس کے بعد سیٹھ جی باہر نکل آئے "آیئے داروغہ جی باہر کیوں کھڑے ہیں آپ"۔

"آ گیا۔ چلئے"۔ ہتھکڑیوں کو پیچھے چھپاتے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ سیٹھ صاحب نے ناشتہ پانی کے انتظام کے لئے نوکر کو آواز دی داروغہ جی فوراً بول اٹھے "آج ہم آپ کے گھر ناشتہ نہیں کریں گے بلکہ اپنے گھر آپ کو ناشتہ کرانے کے لئے یہ لیتے آئے ہیں۔ یہ پہن لیجئے اور چلئے"۔ ہتھکڑیاں آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"کس خطا کی یہ سزا دی جا رہی ہے صاحب"۔

"یہ سی آئی ڈی صاحب ہیں ان کا کہنا ہے کہ آپ کے یہاں افیون اور گانجے کا کالا دھندا ہوتا ہے شہر سے باہر سڑک کے کنارے جنگل میں راکھ اور چونے کے ڈھیر میں آپ مال چھپا کر رکھتے ہیں۔"

"کیا آپ کو وہاں کچھ ملا بھی ہے؟"

"جی ہاں وہاں سے افیون اور گانجا برآمد ہوا ہے"۔

"جنگل کی جگہ ہے صاحب کوئی چھپا کر بھی تو رکھ سکتا ہے ہمیں پکڑوانے اور بدنام کرنے کے خیال سے بھی تو ایسا کر سکتا ہے"۔

"بک بک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے سیٹھ" سی آئی ڈی نے کہا۔ سیٹھ جی نے داروغہ جی کو ایک طرف بلا کر کچھ کان میں کہا۔ داروغہ جی نے یہ بات سی آئی ڈی سے بھی کھول دی "سیٹھ جی بیس ہزار روپے دے رہے ہیں دس ہزار مجھے اور دس ہزار آپ کو اگر یہ رقم لے لی جائے تو کیا برا ہے کیس یہیں ختم کر دیا جائے۔ آپ ہم دونوں گرہستی ہیں دنیا اولاد کے لئے کمائی ہے۔"

"داروغہ جی نوٹوں کے لالچ میں فرض کو مت بھولئے آپ پولیس انسپکٹر ہیں مجرموں کی طرح ضمیر فروش کیوں بنیں۔ یہ رشوت نہیں ہے نمبر ایک نمبر کی ڈکیتی ہے۔"

"کیسے سر"

"ڈکیت رات کے اندھیرے میں گھر میں گھس کر لوٹتے ہیں آپ دن دہاڑے ہی سب کے سامنے لوٹ رہے ہیں اور بے غرت ہو کر پہلے نمبر کی ڈکیتی"؟

"سر ہم اور آپ دونوں ہی سرکاری ملازم ہیں نوکری سے زیادہ عزیز اپنی جان اور اپنی عزت ہے یہ لوگ ظاہر میں اپنی بچت کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اس وقت دولت عزت اور جان تینوں ہی مل رہے ہیں۔ ایسا نہ کرنے پر تینوں ہی ہاتھ سے چلے جائیں گے"۔

"اس کا یہ مطلب ہے کہ میں بھی تمہاری طرح بزدل بن جاؤں اور قانون طاق پر رکھ کر فرض کا گلا گھونٹ دوں۔ اس عہدے پر مقرر ہونے سے پہلے وفاداری کی جو قسم کھلائی جاتی ہے۔ اس کو بھول گئے۔ جلدی جلدی اس سمگلر کو لیکر" سی آئی ڈی نے سختی سے کہا داروغہ جی چپ چاپ سیٹھ جی کو گرفتار کر کے جیپ کی طرف لے چلے۔ سیٹھ جی کے منہ سے آتش فشاں پہاڑ سے نکلتے ہوئے لاوے کی طرح سخت سست الفاظ نکلتے رہے مگر کسی نے ان کی جلی کٹی باتوں کی پرواہ نہیں کی سیٹھ جی کہہ رہے تھے "کسی عزت دار کو اس طرح بغیر جرم گرفتار کر کے لیجانا ٹھیک بات نہیں ہے۔"

"صحیح کہتے ہیں۔ آپ مگر آپ تو عزت دار نہیں ہیں آپ تو سمگلر ہیں مجرم ہیں دیش کے غدار ہیں کہتے ہوئے سی آئی ڈی نے سیٹھ جی کو جیپ میں بٹھا لیا۔ دھائیں کی آواز آئی سب چونک گئے۔ جیپ جلدی سے گھیر کی طرف روانہ ہوئی زیادہ دیر تک رکنا خطرناک تھا۔ وہاں پہنچے تو گھبرائے ہوئے سپاہی نے جواب دیا۔

"میں تو بچ گیا صاحب مگر وہ محتاج مارا گیا۔"

"کیسے؟" سی آئی ڈی بولا

"ایک موٹر سائیکل پر دو آدمی آئے پل بھر کو پیپل کے پیڑ کے نیچے ٹھہرے اور یہ کہتے ہوئے کہ اس حرام زادے نے ہی ہمارا بھید کھولا ہے آگے گواہی بھی دے گا۔ اس لئے سب سے پہلے اسے ٹھکانا لگانا ضروری ہے اور اس محتاج کو گولی مار دی۔ میں اندر گھیر میں تھا وہ ادھر بڑھے۔ میں فائر ہوتے ہی چونک گیا تھا اور ہوشیاری سے پوزیشن سنبھالے ہوئے کھڑا تھا جیوں ہی انھوں نے اندر قدم رکھا میں نے کڑک کر کہا خبردار آگے بڑھے تو بھون دوں گا۔ ان کو میرے اندر ہونے کا اندازہ نہیں تھا۔ اچانک میری بات سنتے ہی گھبرا گئے اور

بھاگ کھڑے ہوئے میری جان بھی بچ گئی اور راکھ میں دبا ہوا مال بھی"

"پھر ان کو ظالموں کی جیت منظور نہیں ہوتی۔ نکالو سب تین"
سی آئی ڈی نے کہا۔ سارے سپاہی رائفلوں پر لگی سنگینوں سے کرید کرید کر انیوں اور گانجے کے تین نکالنے لگے۔ اٹھائیس کلو افیون اور سینتیس کلو گانجا برآمد کر کے سب لوگ تھانے جا پہنچے۔ سیٹھ جی بیٹھے بیٹھے سب تماشا دیکھ رہے تھے اور من ہی من گھٹ رہے تھے کاغذی کارروائی پوری کرنے کے بعد سیٹھ جی کو حوالات میں بند کر دیا گیا سی آئی ڈی صاحب الگ کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔ اس کے بعد سیٹھ جی کے پاس حوالات میں ملنے داروغہ جی پہنچے: "سیٹھ جی اب کیا کر سکتا ہوں۔ یہ سی آئی ڈی تو کسی طرح مانتا ہی نہیں" داروغہ جی نے عاجزی سے کہا۔

"ہندوستانی پولیس کا افسر کیا کچھ نہیں کر سکتا داروغہ جی"

"سیٹھ جی آپ ہی بتائیے کہ اب میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"پولیس کے آدمی ہو کر مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ کیا کرنا ہے۔ بیس ہزار روپے اپنی جیب میں رکھو اور تلوار کی دھار اس خبیث کی گردن پر۔ لاش کو راتوں رات جیب میں رکھ کر کہیں باہر لے جا کر کسی ندی میں پھینکوا دو روز کتنے قتل ہوتے ہیں ایک یہ بھی سہی۔ ورنہ اپنی موت کے لئے تیار ہو جاؤ تم مجھ کو مروا سکتے تو نہیں جیل سے چھوٹ کر کبھی نہ کبھی تو واپس آؤں گا ہی تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا ہو سکتا ہے میرے چیلے چانٹے اس سے پہلے ہی تمہارا کام کر دیں۔ خوب اچھی طرح سوچ لو۔"

"اچھا میں اس پر سوچ وچار کر لوں" یہ کہہ کر داروغہ جی واپس آ گئے اور سی آئی ڈی کے کمرے کے سامنے برآمدے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے اُن کے جوتوں کی کھٹ پٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ سی آئی ڈی کو اسطرح چہل قدمی کرنے پر اور وہ بھی رات کے دس گیارہ بجے شک ہو گیا اور وہ فوراً یہاں سے نکل کر باہر چلا گیا۔ داروغہ جی یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ کسی اور ضرورت سے باہر جا رہا ہے ابھی آ کر سو جائے گا۔ مگر سی آئی ڈی تھانے واپس ہی نہ آیا اور نگینہ کی ایک دھرم شالا میں جا سویا۔

●●●

غزل

امتیاز جے پوری

(بلا انتخاب)

آ کر تو دیکھو کون مری چشمِ تر میں ہے
تیرا خیال تیرا تصور نظر میں ہے

کیسے نظر میں تاب ہو کیوں نہ نظر اُٹھے
تیرا مقام بھی تو مری رہ گزر میں ہے

صحرا میں گلستاں میں خزاں میں بہار میں
میں جس کو ڈھونڈتا تھا وہی میرے گھر میں ہے

تم بے وفا ہو، تم کہاں اور بارِ غم کہاں
یہ حوصلہ تو صرف ہمارے جگر میں ہے

اے امتیاز کس نے صدا لا مکاں سے دی
کہہ دو کہ آ رہا ہے ابھی وہ سفر میں ہے

غزل

بے چین شفائی دھول پوری

(بلا انتخاب)

لب خاموش آنکھیں پُرنم
لرزیدہ لرزیدہ قدم

درد مسلسل غم پیہم
ایک ہے دل اور لاکھ ستم

کشتیٔ دل اور بحرِ الم
طوفانوں کے زیر و بم

سُن کے مرا افسانۂ غم
رُک گئی نبضِ دو عالم

نقشِ وفا مبہم مبہم
خواب بہت بیداری کم

میں ہی بہت تھا رونے کو
تم تو نہ کرتے آنکھیں نم

حال مرے بربادی کا
سُن لیجئے از راہِ کرم

رُک بھی ذرا بے تابیٔ دل
سانس تو لے لوں کم سے کم

دور ہے منزل اے بے چین
دیکھ سنبھل کے رکھنا قدم



چاند سا چہرہ مگر مہاسوں اور گرمی دانوں سے ایسا بھر گیا ہے کہ آئینہ دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے [illegible]
[illegible] گرمی دانے خود بخود تو دُور نہیں ہوں گے۔ انہیں دُور کرنے کا آسان اور سہل طریقہ ہے خون سیر۔ یہ ایک [illegible]
ہے جس کا ایک چمچہ صبح شام لیا جاتا ہے۔ کریم، لوشن وغیرہ تو صرف اوپر اوپر سے مہاسوں اور گرمی دانوں کو [illegible]
[illegible] دبا دیتے ہیں مگر ختم نہیں کر پاتے۔ اسی لئے ان [illegible] دواؤں سے آپ کی نازک اور [illegible]
[illegible] کرتی ہے۔ خون سیر تو خون کے اندر پہنچ کر تمام گندگی دور کرتی ہے۔ خون کو صاف بنا [illegible]
اور ان تمام وجوہات کو دُور کرتی ہے جن سے مہاسے، گرمی دانے، داغ، دھبے [illegible]
اور آپ کا چہرہ چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ خون سیر کے برابر استعمال سے رنگ بھی خود بخود صاف ہونے [illegible]

قیمت: [illegible] روپے

[illegible]

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲   رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷   DN/[illegible]

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرّۂ وطن سے ہے نیازؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
(نیاز گلبرگوی)

ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی

زرِ سالانہ ۱۵/ روپے
فی پرچہ ۱/۵۰ روپے

ایڈیٹر: سرور تونسوی

جلد نمبر ۴۲   فروری ۱۹۸۱ء   شمارہ نمبر ۲

ہندی کے مسلمان شعراء

۱۔ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد پر ایسی مفید کتاب آج تک نہ تو اردو میں شائع ہوئی ہے نہ ہندی میں۔

۲۔ اس کتاب کو پڑھنے سے اردو اور ہندی کے وہ خود ساختہ نام نہاد دانشور جو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اردو اور ہندی کی بقا و حیات کے ضامن بنے بیٹھے ہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے جو کام سرکار سے ہتھیائے ہوئے لاکھوں روپیہ سے نہ ہو سکا اور جو کام اردو اور ہندی کے یہ نام نہاد دانشور آج تک نہ کر سکے وہ ایک فردِ واحد نے اپنی لگن کے باعث پورا کر دیا۔

۳۔ اس کتاب نے ہندی مسلمانوں کا سر اونچا کر دیا ہے اور وہ ثبوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی زبان کی نشوونما اور ترقی میں جو کردار مسلمانوں نے ادا کیا ہے اُسے ہندی زبان فراموش نہیں کر سکتی۔ اور ہندی کا مسلمان اس سلسلے میں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے کوسوں آگے دکھائی دیتے ہیں۔

۴۔ اس کتاب کو پڑھنے والا ہر ہندی دان ایک ایک کا گن گان کرے گا اور ہر اردو دان مصنف کو دعائیں دے گا کہ جس نے اردو ادب کو ایسی بیش بہا تصنیف سے مالا مال کر دیا۔

۵۔ ترقی اردو بیورو، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی، انجمن ترقی اردو ہند اور ریاستی اردو اکادمیوں کے ذمہ دار ارکان میں شاید غیرت کے جراثیم اپنا اثر دکھانے لگیں اور وہ ندامت محسوس کریں کہ انہوں نے سرکار کا یعنی عوام کا کروڑہا روپیہ اردو کی غیر مفید اور غیر ضروری کتابیں شائع کر کے محض اپنوں کو فائدہ پہنچایا اور ہندی کے مسلمان شعراء ایسی بیش بہا اور خالص ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار تصنیف کو شائع کرنے کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

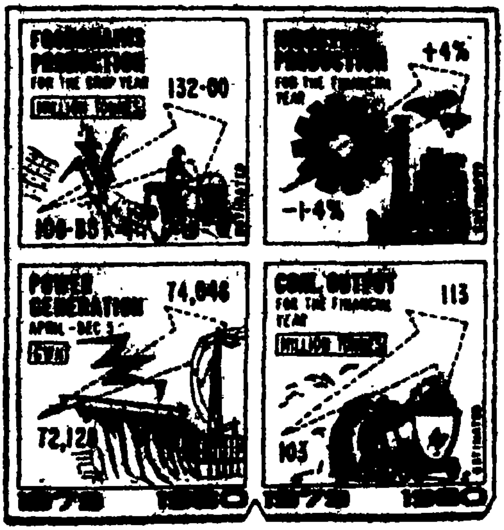
۶۔ آپ ہمارے اس دعوے کی صداقت کی جانچ کے لئے یہ کتاب پڑھئے اگر آپ ہمارے اس تحریر کی حرف بحرف تائید نہ فرمائیں تو کتاب واپس کر کے اس کی پوری قیمت واپس لے لیجئے۔ حضرت رتن پنڈوری نے اپنی زندگی کے عزیز ترین دو سال اس کتاب کی تالیف پر صرف کئے اور اپنی زندگی بھر کا سرمایہ اس کتاب کے لئے مواد فراہم کرنے پر لگا دیا اور اس کتاب کو ہر پہلو سے مستند بنانے کے لئے فاضل مؤلف نے ہزاروں کتابوں کا مطالعہ کیا [illegible] کو قلم بند کر دیا [illegible] ہندی شعراء [illegible] قیمت اکیاون روپے۔

مزید معلومات کیلئے، دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲ سے رجوع کیجئے

پرنٹر پبلشر سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ٹائٹل کے صفحات خواجہ پریس، چتلی قبر، جامع مسجد دہلی اور سرورق پائلٹ پریس دہلی سے چھپوا کر شانِ ہند بلڈنگ نمبر ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

1980ء میں ہم نے
جو بنیادیں ڈالی تھیں
آیئے، 1981ء میں
اُن پر عمارت تعمیر کریں

1980ء میں سرپٹ بھاگتے سکّے کے پھیلاؤ کو روکا گیا اور کوئلے، بجلی، صنعتی اشیاء نیز اناج کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا۔



اب وقت ہے کہ ان بنیادوں کو مضبوط کریں اور اس سے پیشتر کہ سماج کا کوئی طبقہ قومی خزانے میں سے زیادہ حصہ طلب کرے پیداوار کو مزید بڑھائیں۔

سخت محنت اور خود پر قابو
ہمارا مقولہ ہونا چاہیے

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ صبا چہ کرد؟

ہندو ادیب چاپلوس کیوں ہوتا ہے؟

جناب رام لال صاحب لکھنؤ میں کل ہند غیر مسلم اردو ادیبوں کی کانفرنس ۱۸ اور ۱۹ اپریل کو منعقد کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں شاید اپنا پنے لیاقت کے مطابق اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں کوشاں ہے۔ چنانچہ ذاتی طور پر مدیر شاہراہ نے بھی غیر مسلم اردو ادیبوں کی خدمت عالیہ میں عریضے لکھے کہ وہ بھی اس کانفرنس میں شریک ہوں اور کوشش کریں کہ یہ کانفرنس ہر لحاظ سے کامیاب ہو۔

محترم جناب ڈاکٹر تاراچند رستوگی جو گوہاٹی (آسام) میں اقبال سنٹرل سینٹر کے سربراہ ہیں لکھتے ہیں کہ رام لال صاحب کے موقف کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا ہے۔ ہندو ادیب چاپلوس کیوں ہوتا ہے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلے تو محترم ڈاکٹر رستوگی صاحب سے ہی نیاز مندانہ گزارش ہے کہ وہ خود ایک ہندو ادیب ہیں کیا وہ اپنے آپ کو چاپلوس سمجھتے ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ سو فیصد ایسا نہیں ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے مؤدبانہ التماس ہے کہ خدا کے فضل سے اردو کے ہندو ادیبوں اور شعرا کی مالی حالت بہتر ہے۔ اور وہ مسلمان ادیبوں اور شعرا کے مقابلہ میں اردو کے لئے زیادہ قربانیاں دے سکتے ہیں۔ اور دل سے چاہتے ہیں کہ اردو زبان زندہ رہے اور پھلے پھولے۔ مسلمان اد [illegible] راہی کی واز [illegible] حکومت کے پھیلے ہوئے گھٹا ہائے تیرہ پر جس بڑی طرح سوچ رہی ہے۔ ہندو ادیبوں اور شعرا نے اردو کے نام پر اس قسم کی [illegible] میں حصہ دار بننے کے لئے کبھی کوشش نہیں کی۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ ہندو ادیبوں میں دو ایک . . ادیب اور شاعر ایسے ہیں جو محض دکھاوے کے طور پر اردو کے لئے شور مچا کر مسلمانوں اور حکومت کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مگر یہ قطعی نا انصافی ہے کہ دو ایک ایسے حضرات کی حرکات کو دیکھتے ہوئے

کسی غیر مسلم ادیبوں کے بارے میں اس قسم کا بیان دیتا [illegible] ایڈیٹر شاہراہ ہند [illegible] سمجھتا ہے کہ ڈاکٹر رستوگی نے رام لال صاحب پر بے جا نکتہ چینی کی ہے۔ اس علاوہ ڈاکٹر صاحب کو یہ حقیقت (حالانکہ وہ راقم الحروف سے زیادہ واقف ہیں) کے لئے یہ عرض کرنا [illegible] ہے کہ اردو کے مسلمان دانشوروں کی اکثریت نے حکومت کے اس موقف کی تائید کی ہے کہ اردو زبان صرف [illegible] ہے اور حکومت ایسا اس لئے چاہتی ہے کہ اسے مسلمانوں کی [illegible] ہیں لہٰذا اس سیاسی مطلب براری کے لئے یہ [illegible] دھارت کو دے رہا ہے اور اردو کے مسلمان دانشور بھی حکومت کی طرف سے پھینکے ہوئے ٹکڑوں کے حصول کے لئے اردو کو اس [illegible] پہنچانے کے لئے آمادہ ہو رہے ہیں کہ خود حکومت اردو کو [illegible] اس طرح نہ کر سکتی تھی۔

راقم الحروف جانتا ہے کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے [illegible] جشن [illegible] کو یہ بھی اختیار نہیں کہ وہ انجمن کی [illegible] میں تجویز پاس کر سکیں کہ انجمن کی دفتر [illegible] غیر مسلم کو [illegible] جائے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حکومت ہند کی [illegible] گرانٹ ملتی ہے [illegible] جو سرکار [illegible] میں یہ مسئلہ ہے کہ انجمن کے [illegible] عہدے پر کسی غیر مسلم کو [illegible] جائے۔ ہر ریاستی اردو اکادمی ہر سال [illegible] انعامات کی بارش برساتی ہے ان کا چند ہندو غیر مسلم ادیبوں اور شعرا کے حلق میں ٹپکا دیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ ندیاں [illegible] کہا جانے لگے۔ اسی طرح حکومت۔ اردو اکادمیوں [illegible] اردو رابطہ [illegible] ترقی بیورو اور نیشنل بک ٹرسٹ کے بارے میں کچھ شرمناک باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ اور جن کی تردید ممکن نہیں۔

ان سب حقائق کے باوجود غیر مسلم اردو ادیبوں اور شعرا کا [illegible] جو اردو کے لئے کوشاں ہے قابل [illegible] ہے۔ خلوص اور احساس

پیاری زبان سے دلی عقیدت رکھنے کے باعث۔ اور ان کا [illegible] تعریفی جذبات کو "چاپلوسی" ایسے گھٹیا الزام سے ملوث کرنا [illegible] ناانصافی [illegible] زیادتی ہے۔

[illegible] غیر مسلم ادیب اور شعرا [illegible] خود ڈاکٹر [illegible] شامل ہیں) خلوص دل سے چاہتے ہیں کہ اُردو ایسی پیاری زبان زندہ رہے پھلے پھولے اور اس کے تحفظ کے لئے معقول کارنامے ہو۔

غیر مسلم اُردو ادیبوں کا یہ اجتماع جو لکھنؤ میں رام لال صاحب کی کوشش سے ہو رہا ہے۔ یہ مطالبہ کرنے کے لئے ہے کہ اُردو کو اُتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان بنایا جائے۔ کیا غضب ہے کہ بہار میں تو ایسا تسلیم کیا گیا ہے۔ (خواہ وہ جزوی طور پر ہی سہی) اور اُتر پردیش جہاں کا چپہ چپہ اُردو کا رہین منت ہے وہاں یہ جائز مطالبہ کسی نہ کسی بہانے سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ اس لئے ڈاکٹر رستوگی صاحب سے مودبانہ التماس ہے کہ نہ صرف وہ اس اجتماع میں خود شرکت فرمائیں بلکہ اس موقف پر تقریر بھی فرمائیں۔

اور ڈاکٹر صاحب یہ بھی ذہن نشین فرمالیں کہ مسلمان ادیبوں اور شعرا کے خون میں حکومت کے لقمہ ہائے تر کے باعث اُردو کے تئیں بے حسی کے جراثیم پیدا ہوگئے ہیں۔ اس لئے ان کی بلا سے اُردو رہے یا نہ۔ انھیں تو حکومت کی عطا کردہ سہولتیں درکار ہیں۔ اور حکومت کو ان کے ووٹ۔ اس لئے اُردو کی احیاء حیات کے لئے ہم غیر مسلم اُردو ادیبوں اور شعراء کو ہی آگے آنا ہوگا۔ لہٰذا آپ رام لال صاحب کو "چاپلوس" نہیں بلکہ اُردو کا ایک باعمل خدمت گار سمجھئے۔

[illegible] کلا پریشد دلی انتظامیہ کے اردو ادبی انعامات

[illegible] اطلاع کے مطابق اس سال ساہتیہ کلا پریشد دلی انتظامیہ نے اُردو نثر کا انعام محترمہ انیس قدوائی اور اُردو شاعری کا انعام جناب دوارکا پرشاد شعلہ۔ [illegible] دیئے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ محترمہ انیس قدوائی کو انعام دیئے جانے کی تحریک محترمہ صالحہ عابد حسین نے اور شعلہ صاحب کا نام [illegible] صاحب [illegible] نے پیش کیا۔ در پردہ ہمیں معلوم ہوا کہ انعام [illegible] قریب قریب سب ممبران اس فیصلہ کے خلاف تھے [illegible] اگرچہ بھی ممبران حضرات مشاورتی کمیٹی کے ممبر بھی ہیں مگر مشاعرہ کمیٹی میں ان ممبران نے تشریف لانے کی قطعاً تکلیف نہ فرمائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جناب جاوید وششٹ صاحب نے شعلہ صاحب کو انعام دیئے جانے کے خلاف ایسے ایسے دلائل دیئے کہ جن کی معقولیت میں کسی کو شک نہیں ہوسکتا تھا چونکہ اس تجویز کے محرک جناب مالک رام تھے اس لئے یہ تجویز خاصی مخالفت کے باوجود منظور ہوگئی۔ محترمہ انیس قدوائی صاحبہ کی بھی دبے الفاظ میں مخالفت کی گئی کیونکہ [illegible] تصنیف کو وجہ انعام قرار دیا گیا۔ اس کتاب کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ ہماری ذاتی رائے میں دونوں انعامات سو فیصد غیر مستحق ہستیوں کو دیئے گئے ہیں۔ ہمیں جناب جاوید وششٹ صاحب کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے یہ اُردو نثر کا انعام جناب ظفر ادیب کو دیا جانا چاہئے تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ جناب مالک رام بیچارے ظفر ادیب کے نام کی سفارش کیسے کرسکتے تھے کیونکہ ظفر ادیب کی حالیہ تصنیف جو غالب سے متعلق ہے اور جسے پہلے حکیم عبدالحمید صاحب نے غالب اکیڈمی کی طرف سے شائع کرنے کے لئے جناب مالک رام سے رائے طلب فرمائی تھی۔ تو انھوں نے اس کتاب کو ناپسند قرار دیا تھا۔ اور اب جب کہ ظفر ادیب صاحب نے اپنے اہل و عیال کا پیٹ کاٹ کر یہ کتاب شائع کرکے غالبیات کے ماہرین کو نئی راہیں سجھائی ہیں تو مالک رام صاحب ظفر ادیب کو انعام دیئے جانے کی سفارش کس طرح کرسکتے تھے۔ اور رہی محترمہ انیس قدوائی صاحبہ تو ان کی اپنی اور ان کے خاندان کی جو خدمات ہیں ان کے پیش نظر بڑے سے بڑا انعام بھی ان کے لئے حقیر ہے مگر حکومت چاہتی تو انھیں پدم شری کا اعزاز دے سکتی تھی۔ ایک ہزار روپیہ کا حقیر انعام نہ تو ان کی خدمات کا صحیح اعتراف ہے اور نہ ہی ان کے شایان شان۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے اردو کے دانشوروں نے انعامات کا غلط فیصلہ کر کے کوئی اچھی مثال قائم نہیں کی ہے۔ یہ معلوم صاحب کو بھی ایک ہزار روپیہ کے انعام کا حق نہ تھا۔ ادارے کو یہ بات سے کہ اب ان کا نام انہیں یہ اعزاز بخشے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ انعامی کمیٹی کا ہر غیر سرکاری ممبر صاحب بھی اپنے بزرگ یا مداح کو انعام دلانے کا خواہشمند رہتا ہے۔ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے اس دلی ارادہ کو کامیاب کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اکثر ممبران کو اپنے فرض اور سچائی کا خیال نہیں ہوتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ اعزاز غیر مستحق لوگوں کو دیئے جاتے ہیں۔ اس سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ یہ سلسلہ ہی بند کر دیا جائے۔

اُردو کے دانشوروں میں "منافقانہ پن"

آپ کسی بھی خود ساختہ یا مسلمہ اُردو ادیب یا شاعر کے کردار پر نظر ڈالیے تو آپ اکثر و بیشتر حضرات کو منافقانہ پن میں بُری طرح ملوث پائیں گے۔ ہمارے ایک ادیب اور شاعر عزیز نے دریافت کیا ہے کہ اُردو تعلیم کا یہ فطری نتیجہ ہے کہ اسے پڑھنے والوں میں منافقت عود کر آتی ہے یا اُردو کے ادیبوں اور شاعروں میں احساسِ کمتری کے باعث منافقانہ پن پیدا ہوتا ہے۔ اس مسئلہ پر ہم نے کبھی دھیان نہیں دیا تھا مگر اس استفسار پر سوچتے سوچتے اُردو کے کئی مشہور اور نامور ادیبوں اور شعراء کے کردار پر نظر دوڑائی تو اپنے عزیز کی یہ بات بہت زیادہ وزن دار معلوم ہوئی۔ اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اُردو کا جو بھی ادیب یا شاعر جس قدر اپنے آپ کو بڑا اور نامور ادیب یا شاعر کہلانے کا متمنی ہوگا، اتنی ہی زیادہ منافقت اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہو گی۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ منافقت کے پودے کو احساسِ کمتری تناور درخت بنا دیتا ہے اور بدقسمتی یہ ہے کہ اُردو کے ۹۵ فیصد ادیب اور شاعر احساسِ کمتری کے بہت بُری طرح سے شکار رہے ہیں اور یہ حضرات

اپنے احساسِ کمتری کو احساسِ برتری کی جھوٹی نمائش میں چھپانے کے لئے منافقت کے ایسے ایسے مسحور کن گُر ایجاد کرتے ہیں کہ لغات میں درج منافق، منافقت اور منافقانہ الفاظ بھی ان بدبختوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔

جعلی پاکستانی ویزا بنانے والا گرفتار

۲۶ فروری کو پاکستان کے سفارت خانہ میں ایک ریٹائرڈ پولیس کانسٹیبل شوکت علی ولد محمود ساکنہ نائی کی منڈی توپ خانہ۔ آگرہ کو پولیس کی حراست میں دے دیا گیا کیونکہ شخص مذکورہ فیروز آباد ضلع آگرہ کے محمد شبیر اور اس کی بیوی کو جعلی پاکستانی ویزا تیار کرنے کے جرم کا مرتکب پایا گیا۔

اس سے پہلے بھی کئی حضرات جعلی ویزا کے باعث بارڈر پر پکڑے گئے۔ پالی راجستھان کے دو اشخاص جعلی ویزا کے باعث اٹاری جیل میں بند رہے اور بال سے ان کے ورثا اور قانونی مشیر امرتسر جا کر زرِ کثیر ضائع کرنے کے بعد ان جعلی ویزا والوں کی ضمانت کرا کے لائے ہیں۔

ہر وہ شخص جو جائز طور پر پاکستان جانے کا قانونی ویزا حاصل کرنا چاہتا ہے وہ کسی بھی ایجنٹ۔ ٹائپسٹ یا فارم پُر کر کے دینے والا یا ہوٹلوں کے دھوکہ بازوں سے بچیں جو آناً فاناً ویزا لے دینے کی ذمہ داری لیتے ہیں اور اس کے لئے معقول معاوضہ مانگتے ہیں۔ بلکہ پاکستانی سفارت خانہ میں حسبِ قاعدہ ضروری کارروائی کی تکمیل کر کے ویزا حاصل کریں مگر ویزا حاصل کرنے کی وجوہات معقول اور سچائی پر مبنی ہونا ضروری ہیں۔ جامع مسجد کے تاج ہوٹل۔ آزاد ہند۔ ناز ہوٹل اور اسی قسم کے دوسرے ہوٹلوں میں قیام کرنے والے بیرونی مسافروں کو خاص طور پر اسی قسم کے دھوکا بازوں سے بچنا چاہیے جو انہیں اپنے اثر و رسوخ سے فوری طور پر معقول معاوضہ کر ویزا لے دینے کی [illegible] کرتے ہیں۔ جامع مسجد کے بعض بدنام ہوٹلوں میں کچھ بدقماش عورتیں بھی مسافروں کو اس قسم کی یقین دہانی کراتے ہوئے کئی جیبوں کو صاف کر رہی ہیں۔ لہٰذا بیرونی حضرات کو ان سب باتوں سے چوکنا رہنا چاہیئے اور پاکستانی ویزا کے حصول کے لئے براہِ راست پاکستان کے سفارت خانہ سے رجوع کرنا چاہیئے۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

مسرور تونسوی

صولت صاحب نے پھر خفیف سی خفگی سے کہا کہ جلدی بتاؤ خوشبو ہے یا بدبو کہ میری بہن نے بڑی خفیف ہلکی سی آواز میں جواب دیا خوشبو ہے۔ صولت صاحب فرمانے لگے اسے اپنے دوپٹے کے ایک کنارے میں باندھ لے اور صبح کو دیکھنا کہ یہ سوئی کوئی گھول کر لے گیا ہے یا بدستور موجود ہے اس کے بعد میری بہن کی حالت ایسی ہو گئی جیسے وہ ادھ مری ہو گئی ہو اس سے چلا نہ گیا تو صولت صاحب نے تحکمانہ لہجہ میں کہا جاؤ دوسرے کمرہ میں چٹائی پر لیٹ جاؤ۔ میں نیچے گیا۔ دوکاندار کو ہدایات دیں کہ وہ ہمارے لئے چائے عام طور پر جیسی وہ بناتا ہے ویسی ہی بنائے مگر قبلہ کے لئے شکر حد سے زیادہ ڈالے اور کڑک بنائے۔ پندرہ منٹ تک چائے آئی ہم سب نے چائے پی اور صولت صاحب نے میری بہنوئی سے کہا کہ تم لوگ اپنے گھر جاؤ کل تم تو نوکری پر جاؤ گے۔ اسے یہاں بھیج دینا۔

دوسرے دن میری بہن جب آئی تو اس نے آتے ہی صولت صاحب کے پاؤں چھوئے اور ان کے قدموں کے پاس نیچے ہی بیٹھ گئی۔ صولت صاحب نے بڑے ولار سے اسے کرسی پر بٹھایا اور رات کی کیفیت دریافت کی تو میری بہن روتے ہوئے کہنے لگی کہ کل جو کچھ میں نے کیا یا آپ کو کہا وہ میرے اختیار کی بات نہ تھی اس کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ صولت صاحب نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ تو میرے بیٹے کی بہن ہے تو میری بھی لڑکی ہی ہے۔ تو گھبرا نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

میری بہن نے جو حالات بتلائے انھیں سننے کے بعد صولت صاحب فرمانے لگے بیٹا کوئی اچھی روح ہے باقی باتیں ہم رات کو کریں گے۔

رات کو مجھے صولت صاحب نے بتایا کہ یہ ایسی روح ہے جو تمہاری بہن کو مالا مال بھی کر سکتی ہے۔ مگر میں گزشتہ حالات سے اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ میں نے قبلہ سے کہا کہ ہمیں مال و دال کی ضرورت نہیں آپ اسے ٹھیک کر دیجئے۔ دوسرے دن میرے بہنوئی آئے قبلہ نے انھیں تمام حالات بتلائے تو وہ ہاتھ باندھ کر کہنے لگے میاں جی

اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو میں نوکری چھوڑ کر اپنی ٹیکسی چلانا چاہتا ہوں اور دیگر اسی قسم کی کئی باتیں انہوں نے صولت صاحب سے کہیں۔ جنہیں میں خاموشی سے سنتا رہا۔

رات کو جب میرے بہنوئی کشمیری گیٹ ... اپنے گھر جانے لگے تو صولت صاحب نے ان سے کہا کہ دیکھو لوگ نا کہ جی روپیہ جس قدر تم کو ملے آئیگا مگر اس کے تین حصے کرنے ہوں گے۔ ایک حصہ تمہارا دوسرا میرے بیٹے سرور کا اور تیسرا حصہ راہِ خدا میں خیرات کرنا ہوگا۔

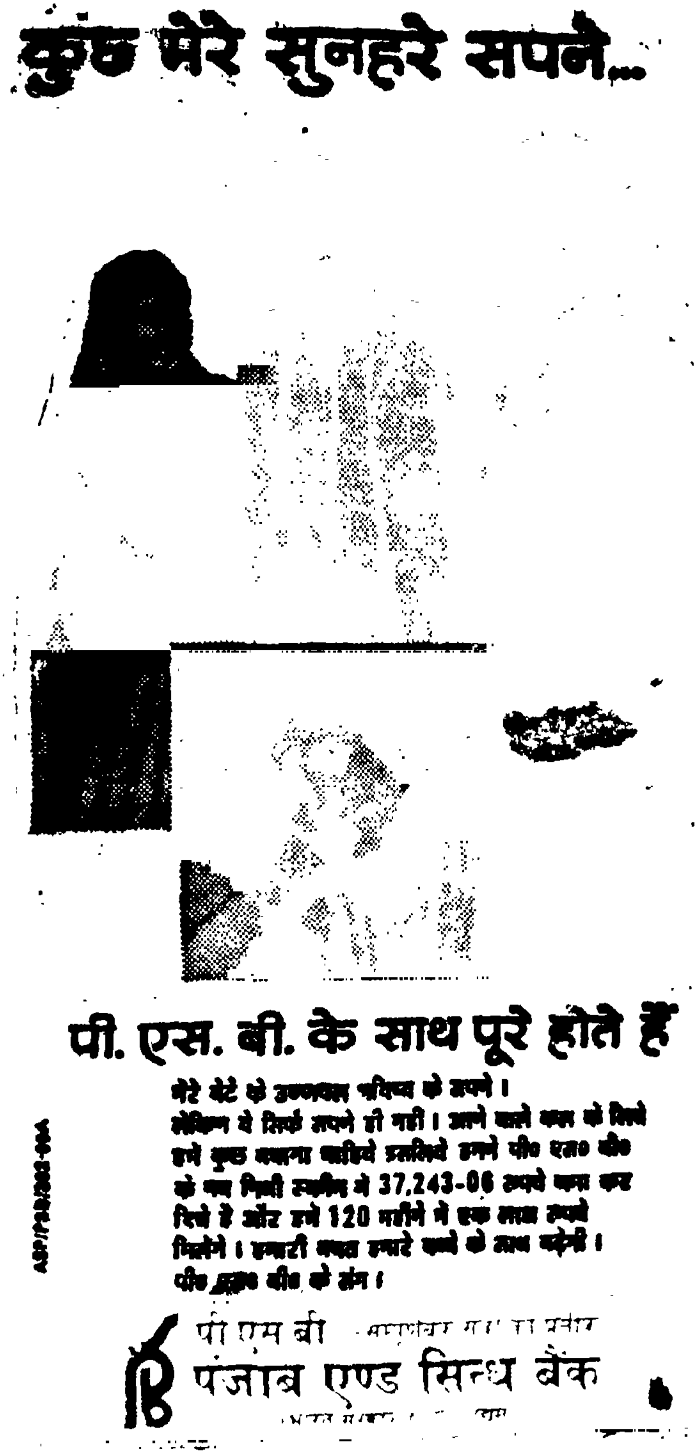
میرے بہنوئی یہ بات سن کر کہنے لگے اچھا میاں جی آپ کے فرمان کا میں کل سوچ کر جواب دوں گا۔ میں نے رات کو صولت صاحب سے کہا کہ آپ نے اس سلسلے میں میرا ذکر کیوں کر دیا۔ فرمانے لگے تمہیں دکھانے کے لئے کہ تمہارا بہنوئی تمہارے حصہ پر ہی اعتراض کرے گا۔ میں چپ ہو رہا دوسرے دن شام کو میرے بہنوئی اپنے دفتر تیس ہزاری سے سیدھے ہمارے ہاں تشریف لائے۔ اور صولت صاحب کو اشارہ سے باہر لے گئے تقریباً رات کے ۹ بجے صولت صاحب واپس آئے مگر میرے بہنوئی ساتھ نہیں تھے۔ صولت صاحب قہقہے لگاتے ہوئے فرمانے لگے سرور بیٹا میں نے کہا تھا کہ تمہارا بہنوئی تمہارے حصہ پر مخالفت کرے گا اور وہی ہوا۔ اس نے کہا ہے کہ باباجی جس قدر روپیہ آئے تیسرا حصہ ہم خدا کے نام پر دے دیا کریں گے اور باقی ہم سب رکھیں گے ہاں اگر آپ چاہیں تو تیسرا حصہ لے لیجئے مگر تیسرا حصہ سرور صاحب کو کس بات کا دیں۔ بات پرشتہ داری کے علاوہ اصول کی بھی تھی کہ آخر مجھے تیسرا حصہ کیوں دیا جائے میں اس معاملہ میں بالکل خاموش رہا اور رات کو بات چیت میں قبلہ سے گزارش کی کہ آپ ان کا کام کر دیجئے میری فکر چھوڑیئے مگر میری لوک ناتھ کے اس بیان نے صولت صاحب اس قدر ناخوش تھے کہ جس کا اظہار ان کی زبان سے نادانستہ طور پر کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا تھا۔

قریباً ایک ماہ صولت صاحب میرے یہاں اس بار رہے بعد میں میری بیوی انھیں بتلاتی رہا آج سنیما کے ہاں اتنی عورتیں آئی ہوئی تھیں، کل اتنا ہجوم تھا اور وہ سب کو بتا رہی تھی تمہارا کام ہو

جائے گا ... [illegible] تم ایسا کرو کہ ... [illegible]
... حقیق ... دیکھنے آ رہے ہیں۔ حضرت ... [illegible]
تو اسے معلوم کیا سمجھتی ہیں۔ اس ... پاؤں کو ہاتھ لگاتی ہیں ... [illegible]
کرتی ہیں۔ یہ باتیں سن کر میاں جی کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور وہ خاموش
ہو جاتے۔

ایک دن فرمانے لگے بیٹا کسی سے موٹر منگاؤ۔ آج قطب صاحب
حضرت نظام الدین صاحب اور دوسری درگاہوں پر چلیں گے۔ عرض کیا کہ
ٹیکسی ہر وقت مل سکتی ہے کسی سے موٹر مانگنے کی کیا ضرورت ہے قہقہہ
لگا کر فرمانے لگے ارے اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں تھا میں سمجھا کہ
ٹونک میں بیٹھا ہوں وہاں تو نواب صاحب کا موٹر آہی جاتا تھا
طے پایا کہ شام کے چار بجے دریا گنج سے روانہ ہوں گے اور شام کے
ساڑھے سات بجے تک واپس آجائیں۔ ان دنوں ٹیکسی کا کرایہ
آٹھ آنے فی میل تھا۔ قطب صاحب حضرت خواجہ نظام الدین اولیا
امیر خسرو وغیرہ کے مزاروں پر حاضری دے کر واپس دریا گنج آ رہے
تھے کہ صولت صاحب فرمانے لگے ستیہ کے گھر چلنا چنانچہ ٹیکسی کشمیری
گیٹ حسن بلڈنگ کے پاس پہنچی ٹیکسی والے کا حساب کر کے اسے رخصت
کیا گیا اور ہم دونوں شری لوک ناتھ کے گھر گئے۔ ستیہ نے چائے بنائی
ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ صولت صاحب نے لوک ناتھ سے کہا کہ
میاں ایک بوتل تو لاؤ۔ لوک ناتھ اندر سے ایک بوتل اٹھا لائے۔ فرمایا کہ
اسے اچھی طرح دھو کر لاؤ اور وہاں رکھ دو نصف گھنٹہ تک صولت
صاحب باتیں بھی کرتے رہے اور گاہے گاہے اس بوتل کی طرف
بھی دیکھتے رہے۔ منا اٹھے اور بوتل اٹھا کر اس کے مونہہ میں اپنی انگلی
دے کر فرمانے لگے چلو سرور صاحب گھر چلیں۔ کشمیری گیٹ تک لوک ناتھ
چھوڑنے آئے وہاں سے ہم نے اسکوٹر لیا اور دریا گنج کے لئے روانہ
ہوئے۔ راستے میں فرمانے لگے سرور صاحب کہیں سے بوتل کا کاگ
لاؤ میری تو انگلی درد کرنے لگی ہے۔ پٹرول پمپ پر اسکوٹر کھڑا کر کے
پٹرول دینے والے سے بوتل کا کاگ لے کر صولت صاحب کو دیا ہو انہوں
نے بوتل کے مونہہ سے اپنی انگلی نکال کر لگا دیا۔ سوئی والان گھر پہنچے
تو بجلی کی روشنی میں مجھے بوتل دکھا کر کہنے لگے کہ دیکھو اس میں کیا ہے
میں نے بوتل کو غور سے دیکھا تو اس میں دھواں سا نظر آیا۔ میں نے
عرض کیا اس میں دھواں سا ... قہقہہ لگاتے ہوئے فرمانے لگے تمہاری

بہن کے سر پہ جو مہاری تھا اسے اس بوتل میں بند کر دیا ہے اب تمہاری
بہن کے سر پر کوئی روح وغیرہ نہیں ہے اس بوتل کو حفاظت سے
الماری میں بند کر دو۔ رات کو میں اس شریف روح سے پوچھ لوں گا۔
کہ اگر وہ تمہاری بہن کا پیچھا چھوڑ دے تو اسے آزاد کر دیا جائے گا ورنہ
اس زمین میں گاڑ دیا جائے گا۔ بوتل کو الماری میں رکھتے ہوئے میرے
ہاتھ کانپنے لگے تو صولت صاحب فرمانے لگے۔ بیٹا میرے ہوتے ہوئے
تمہیں ایسی چیزوں سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ اگر میں تمہارے ساتھ ہوں گا
تو اگر شیر بھی سامنے آجائے گا تو خدا اور اس کے رسول کے حکم سے وہ
بھی چپ چاپ چلا جائے گا۔ صبح ہوئی تو دیکھا میاں نماز پڑھ کے واپس
نہیں آئے تھے۔ معمول سے کچھ زیادہ وقت لگ گیا تو میں خود مسجد میں
چلا گیا میاں وہاں موجود نہیں تھے۔ ایک گھنٹے بعد تشریف لائے تو
دریافت کرنے پر فرمانے لگے جامع مسجد چلا گیا تھا۔ وہاں سے آس پاس کے
مزارات پر چلا گیا تھا تو جاننے کی جلدی تھی کہ رات کو بوتل میں بند حضرت
سے کیا فیصلہ ہوا۔ فرمانے لگے وہ اپنے آپ آ کر عرض کریں ہم ان سے کیوں
پوچھیں قید وہ ہیں ہم نہیں۔ رہائی وہ چاہتے ہیں۔ وہ اپنی غرض سے آئیں
نہیں آتے تو نہ آئیں تم فکر مت کرو بوتل کو الماری میں پڑے رہنے
دو۔ دو تین دن گزر گئے میرے دل کا کھٹکا جا نہیں رہا تھا۔ میں ہر روز
میاں سے دریافت کروں کہ اس کا کیا ہوا اور قبلہ قہقہہ لگا کر کہیں
کہ ابھی کچھ نہیں ہوا۔ جمعرات کی صبح کو فرمانے لگے کہ آج رات کو اس
کا فیصلہ ہو جائے گا یا تو وہ کل ہمارے ساتھ جامع مسجد نماز پڑھنے
جائے گا اور یا دریا برد کر دیا جائے گا۔ جمعہ کی صبح کو ہی صولت صاحب مسجد
سے آ کر فرمانے لگے۔ بیٹا وہ بوتل تو نکالو۔ میں نے الماری کو بوتل رکھنے کے
بعد ڈر کے مارے کھولا ہی نہیں تھا۔ اب جو الماری کھولا تو وہ بوتل رکھی
ہوئی پڑی تھی۔ اسے ڈرتے ڈرتے اٹھایا تو وہ اتنی وزنی تھی کہ مجھ سے
نہ اٹھ سکی میں بے اختیار ہو کر پیچھے ہٹ گیا دیکھا تو میاں قہقہے لگاتے
ہوئے الماری کے پاس گئے اور بوتل کو لپک کر اٹھا لیا جیسے وہ خالی بوتل
ہی ہو مجھے دکھاتے ہوئے فرمانے لگے کہ دیکھو ابھی اس میں اسی طرح
وہ دھواں موجود ہے اس نے رات کو درخواست کی ہے کہ اس کے لئے
دعا کی جائے کہ اسے اللہ میاں معاف کریں اور اس نے وعدہ کیا ہے
کہ اب وہ کبھی کو نہ ستائے گا اور ... تمہاری بہن کے ہاں جائے گا۔
جمعہ کی نماز کے لئے جب میاں جامع مسجد تشریف لے گئے تو وہ بوتل بھی



कुछ मेरे सुनहरे सपने...
पी. एस. बी. के साथ पूरे होते हैं
पी एस बी
पंजाब एण्ड सिन्ध बैंक

کُل ہند مُشاعرہ رُڑکی

رپورٹ: یحییٰ الانسانی ---

آیئے آپ کو آج نہر گنگ (رُڑکی) کے مشرقی کنارے میونسپل بورڈ کے گراؤنڈ میں لئے چلتا ہوں جو اس برفیلی اور یخ بستہ شب میں شامیانہ اور قناتوں سے اس درجہ ڈھانپ دیا گیا ہے کہ ہوا کا بھی گزر نہیں ہے۔ پنڈال برقی قمقموں، ٹیوب لائٹس سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ صدر نشینِ سخن فہم اور ادب نواز جمے بیٹھے ہیں اسٹیج پر اور کرسیوں پر صرف مدعو حضرات و شعرا کرام تشریف فرما ہیں ان شیدائیوں میں ہر مکتبِ خیال کے سامعین نظر آرہے ہیں یہ مشاعرہ جو کہ قومی ایکتا کے لئے منعقد کیا جارہا ہے واقعی یک جہتی کا منظر پیش کر رہا ہے سامعین جوق در جوق ٹولیوں کی صورت میں چلے آرہے ہیں اس ڈر سے کہ کہیں جگہ نہ ملے تو پنڈال سے باہر کھڑا نہ ہونا پڑے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ خواتین کے بیٹھنے کے لئے جگہ مختص کر دی گئی ہے۔ یہ اُردو کا جادو ہے کہ اس برفیلی رات میں فدایانِ اُردو گرم بستروں کو چھوڑ کر اس پنڈال میں آجمے ہیں۔ اُردو زبان سب کی زبان۔!

آج ۲۷ر دسمبر ۸۰ء ہے رات کے ۱۰½ ہوا چاہتے ہیں لیجئے اس مشاعرہ کے جوائنٹ سیکریٹری انیس میرٹھی صدارت کے لئے سری رام سنگھ ایم۔ ایل۔ اے کا اسمِ گرامی پیش کر رہے ہیں تالیوں کی جھنکار میں آپ کا خیر مقدم کیا جارہا ہے اور سالگرہ پھولوں کا ہار پیش کیا جارہا ہے اور انور جلال پوری ملک زادہ منظور احمد صاحب سے درخواست کر رہے ہیں کہ قومی یک جہتی پر اپنے [illegible] کا اظہار فرمائیں اس اعلان پر بہار بپا تالیوں کے شور میں ملک زادہ محفل کا جائزہ لیکر فرما رہے ہیں:-

آج کا یہ مشاعرہ قومی یک جہتی کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔ صاحب صدر اپنے منصب سے نیچے اتر کر کیوں سیاست میں آگئے وہ ایک کالج میں پرنسپل بھی ہیں کہاں یہ معزز منصب اور کہاں یہ وقتی اور ہنگامی سیاست۔ سماج کا سب سے زیادہ طبقہ یعنی شعرا کرام کیا کہتے ہیں ان کے احساسات اور خیالات کو بھی دیکھنا چاہئے۔ پھر نہایت مختصر مگر جامع اور دلپذیر تقریر کر کے تالیوں کی جھنکار میں جارہے ہیں اور حفیظ صاحب رُڑکی رام [illegible] ایم ایل اے سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ بھی کچھ فرمائیں ایم۔ ایل۔ اے صاحب تالیوں کے شور میں آکر فرما رہے ہیں۔

میں آپ لوگوں کا خیر مقدم کرتا ہوں آج ہمارے ملک میں ایسے عناصر پیدا ہوگئے ہیں جو ہماری قومی ایکتا کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ ہم سب یہیں پیدا ہوئے اور اسی میں [illegible] رہے ہیں۔ یہاں سب مذاہب کے رہنے والوں کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے یہ بھی صحیح ہے کہ آپ لوگوں نے یہ دکھلا دیا ہے کہ ہم سب ایک ہیں اور سب ہی مل جل کر رہنا چاہتے ہیں میری مادری زبان اُردو ہے ۔۔ تالیاں ۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو زبان کو ہماری حکومت کو ترجیح دینا چاہیے ۔۔ تالیاں ۔۔ مجھے کبھی اس خیال سے اتفاق نہیں رہا کیونکہ یہ سب نعرے بازی ہے آخر حکومت کو منع کون کرتا ہے کہ وہ اُردو کو نہ مانے یا ترجیح نہ دے لہٰذا یہ روایتی تسلی ہے یہ زبان سب ہی کی زبان ہے میں سب شعرا کا خیر مقدم کرتا ہوا اور مبارک باد دیتا ہوں جے ہند۔ صاحب صدر تالیوں کے شور میں اپنی جگہ آگئے ہیں اور حفیظ صاحب انور جلال پوری سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ اس مشاعرہ کی نظامت فرمائیں [illegible] تالیوں کے شور میں انور صاحب نے مائیک سنبھالتے ہوئے تقریر فرما کر الحاج شمسی مینائی سے درخواست کلام فرمائی ہے۔ شمسی صاحب حسبِ روایت دینی نہ [illegible] بعد ایک طویل نظم سنا کر تالیوں کے شور میں جارہے ہیں اور انور صاحب [illegible] مترنم شاعر زار الٰہ آبادی کو یاد فرما رہے ہیں زار صاحب کا نام سن کر تالیاں جاگ اٹھی ہیں اور آپ غزل سرا ہیں ؎

لذتِ غم بڑھا دیجئے ۔ آپ پھر مسکرا دیجئے
قیمتِ دل بتا دیجئے ۔ خاک لیکر اُڑا دیجئے
چاند کب تک گہن میں رہے ۔ رُخ سے زلفیں ہٹا دیجئے
میرا دامن بہت صاف ہے ۔ کوئی تہمت لگا دیجئے

زار صاحب اُمد باد ۔ لازم و ملزوم لہٰذا محفل کو گرما کر تالیاں [illegible]

میں مائک سے جُدا ہوا چاہتے ہیں کہ ایک اور ایک اور مکسشور و غل سے اب! مائک سے ہٹنے نہیں دیا۔ فوٹوگرافر تصویر لینا چاہتا ہے آپنے فرمایا تصویر گھر میں لیجاکر دکھلائیں گے کہ دراصل کو کہتے ہیں اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے اور آپ ایک پُرانی غزل سنا کر داد وصول کئے چلتے بنے ادھر انور صاحب رنگِ محفل بدلنے کے لئے ایک ابھرتے ہوئے گر شاعر نرگس سہسوانی کو دعوتِ طنز و مزاح دے رہے ہیں۔ نرگس صاحب اپنی پرواز کے یوں جواہر دکھانے چلے ہیں سے

مے جب بڑھ گئی جرأت میکشی
مجھ کو دیر و حرم دیکھتے رہ گئے
ایک ہی سانس میں پی گیا اک گھڑا
واعظِ محترم دیکھتے رہ گئے

پنڈال میں ایک غُل غپاڑہ ہے اور آپ اس اُم الخبائث کے انجام سے آگاہ کر رہے ہیں سے

پی کے جھجلی سے جو اک رندِ بلا نوش چلا
جب ہوا ہوش سے بے ہوش تو نالی میں گرا
منہ میں کُتّے نے جو پیشاب کیا تو بولا

ایسا لگتا ہے کہ سامعین چوتھا مصرعہ سننے کے موڈ میں نہیں یا یہ شور خوشگوار کم ہوا تو فرمایا کہ ۔

ساقیا اور پلا اور پلا اور پلا

پھر محفلِ شعر و ادب پر کسی ہڑبونگ کا گمان ہو رہا ہے کہ نرگس صاحب اس قطعہ کو کئی بار دہرا کر ایک طویل نظم کا اگر کام لیں پلٹ رہے ہیں اور اب انور صاحب بزرگ شاعر گوہر عثمانی (مرادآبادی) کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں گوہر صاحب قومی یکجہتی پر غلا کر رہے ہیں سے

تم تو اک نسل کے اک قوم کے اک دیش کے ہو
خون بھی ایک ہے اس کو تو نہ تقسیم کرو!
خون مسلم کا ہو ہندو کا کہ عیسائی کا
غور سے سوچو تو ہے اپنے ہی اک بھائی کا
یہ فرقہ تو تباہی کی علامت ہوگا
...... اصولوں سے بغاوت ہوگا
تم تو اک نسل .... !

ایک ہی باغ کے دو پھول ہو سوچا تم نے
ایک ہی آنگ کے دو کھاگے ہو سمجھا تم نے
جان دیکے جو سکھائی تھی تمہیں باپو نے
چھوڑ دی آج وہ افسوس! اہنسا تم نے
تم تو اک نسل .... !
آپسی دنگوں کا یہ خوں مداوا تو نہیں
اختلافات پہ مل جل کے کوئی بات کرو
زخم تلوار کے باتوں سے بھی بھر سکتے ہیں
سامنے بیٹھو محبت سے ملاقات کرو
تم تو اک نسل .... !

قبلہ گوہر صاحب خوب خوب داد و تحسین وصول کئے شادماں جا بیٹھے ہیں اور پھر اس رنگ کو بدلنے کے لئے ہلال سیوہاروی آکر گرج اور برس رہے ہیں سے

جو مر گئے سو مر گئے ملکِ عدم گئے
باقی جو بچ رہے ہیں وہ زخموں سے چور ہیں
پھر یہ کہ اس فساد کے مجرم ہیں جانور
انسان کہہ رہے ہیں کہ وہ بے قصور ہیں

شامیانہ شکن داد کا ایک بھونچال سا آیا ہے کئی بار دُہرا کر ارشاد ہوا ہے سے

آج مندر سے کچھ گانجا برآمد ہو گیا
یہ بھی ممکن ہے کہ کل اس میں رم بکنے لگے
ہندو و مسلم اب عبادت کیلئے جائیں کہاں
مسجدوں میں بھی یہ سنتے ہیں کہ بم بننے لگے

پھر ہاہو اور ایک غل سا غل اور شور سا شور ہے اور آپ فرما رہے ہیں سے

بہت دنوں سے بند پڑے تھے خیر سے ان کے نام تو آئے
دین دھرم کے ان جھگڑوں میں مندر مسجد کام تو آئے

اور پھر ایک طویل نظم سنا کر بے ہنگم تالیوں کے شور میں مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور اس ہڑبونگ میں جرأت انور جلال پوری فرما رہے ہیں۔ کلام ملاحظہ فرمائیے سے

دوستوں کو دیں دعائیں آج رُسوا ہو گئے

تھے بہت احباب جن کے وہ تنہا ہو گئے
خود پسندی تو کمی لیکن عاجزی جن میں نہ تھی
وقت کی چکّی میں وہ گیہوں کا دانا ہو گئے
سازشوں کا جال بُننے میں جو ماہر تھے بہت
امتحانِ زیست میں مکڑی کا جالا ہو گئے

انور صاحب خوب خوب داد و تحسین وصول کر کے اپنی جگہ آکر درخواستِ کلام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر سے۔ بدر صاحب تالیوں کی جھنکار میں آکر عطا کر رہے ہیں ؎

وہ چاندنی کا بدن خوشبوؤں کا سایا ہے
بہت عزیز ہمیں ہے مگر پرایا ہے
اُتر کے آؤ کبھی آسماں کے زینوں سے
تمہیں خدا نے ہمارے لئے بنایا ہے
اُسے کسی کی محبت کا اعتبار نہیں
اُسے زمانے نے شاید بہت ستایا ہے

ڈاکٹر صاحب خوب داد پا کر مائک سے کھسک رہے ہیں اور انور صاحب نہایت ادب و احترام سے درخواست کر رہے ہیں۔ ملک زادہ منظور احمد منظور سے۔ منظور صاحب عطا کر رہے ہیں ؎

بستی بستی ظلم فراواں کل بھی تھا اور آج بھی ہے
امن و سکوں اک خوابِ پریشاں کل بھی تھا اور آج بھی ہے
اہلِ ہوس میں جشنِ بہاراں کل بھی تھا اور آج بھی ہے
اہلِ وفا کا چاک گریباں کل بھی تھا اور آج بھی ہے
محفل محفل دار کا چرچا مجلس مجلس ذکرِ رسن
مقتل مقتل عرسِ شہیداں کل بھی تھا اور آج بھی ہے

منظور صاحب تالیوں کے شور میں اپنی جگہ آ رہے ہیں ادھر انور صاحب ایک انداز ایک منفرد لہجہ وسیم بریلوی کو مائک پر آنے کی دعوت دے رہے ہیں لیجئے پھر تالیاں جاگ اٹھی ہیں اور آپ غزل سرا ہیں ؎

اِک اِک کر کے ہر ایک چہرہ چھپا جائے ہے
سارا منظر ہی کوئی خواب ہوا جائے ہے
بدگمانی کی نگاہوں پہ لگے ہیں پہرے
تیرا یہ شہر اک اندیشہ ہوا جائے ہے
میں اندھیروں کے سفرنامے کا عنوان ٹھہرا

مجھ سے کیوں شمع جلانے کو کہا جائے ہے
ہم تو کیا ڈوبتے ہاں اچھا ہے اس کو بھی وسیم
اپنے طوفانوں کا اندازہ ہوا جائے ہے

ایک گیت اور سنا کر تالیوں کے شور میں شاداں پلٹ رہے ہیں اور پھر اس عالم تشنگی میں الحاج شمیم جے پوری تالیوں کے ہنگامہ میں آکر غزل سرا ہیں ؎

کس قدر شدّتِ احساس لئے بیٹھا ہوں
دور رہ کر بھی تجھے پاس لئے بیٹھا ہوں
غیرتِ تشنہ لبی نے میری عزت رکھ لی
لبِ دریا ہوں مگر پیاس لئے بیٹھا ہوں

اور واہ کا شاعرانہ تشنگی دھکہ ہوا ہے اور حضرت احسان دانش صاحب کا یہ شعر آپ بھی سنئے ؎

میں سمندر سے پلٹ آیا ہوں لیکر خشک ہونٹ
کوئی رکھے تو وقارِ تشنگی میرے طرح

آج شمیم صاحب مہدی حسن بنے سنانے کے موڈ میں ہیں اسی دلکشی سے لہرا رہے ہیں ؎

تشنگی پھونک نہ ڈالے ترے میخانے کو
آج ساقی میں بڑی پیاس لئے بیٹھا ہوں

ہر چند کی غزل پرانی ہے لیکن شمیم صاحب محفل کو گرما کر اپنی جگہ کامران آ رہے ہیں اور اُدھر شاعرِ تلنند عالم فتحپوری مائک پر آکر کچھ تو دو یکجہتی کے سلسلے میں بڑا مایوس کن باتیں کر رہے ہیں مثلاً ہم پچیس تیس سال سے اس موضوع پر لکھ رہے ہیں اور برابر اسی طرح سوچ رہے اور سناتے آ رہے ہیں لیکن اب محسوس ہوا کہ اس کا کچھ بھی تو اثر نہیں ہوا اب اس موضوع پر کیا پڑھا جائے۔ شاید عالم صاحب بھول رہے ہیں جو پودا آج لگایا جاتا ہے کیا وہ آج ہی پھل دے دیتا ہے … ضرورت ہے کہ یہ پودا۔ یہ درخت یہ پیڑ آنے والی نسلوں ہی کو پھل دے گا … عالم صاحب اس درجہ بددل اور مایوس ہونے سے کچھ حاصل نہیں … آپ تو صدا لگاتے رہئے کبھی اثر نہیں ہو گا ارشاد ہوا ہے ؎

عصمتِ مریم و سیتا کے محافظ بن کر
نوجواں … گئے … قدر یہ رہزن کیسے
… کے بچار … یہ …

صفحہ … کو … صاحب … آپ کو درخواستِ کلام … اور تالیوں کے شور سے والہانہ انداز …

دیکھتے دیکھتے ہی ہو گئے راون کیسے

پڑے گا۔ عالم صاحب رواں دواں سنا رہے ہیں لہٰذا میں نے سُننے پر انتخاب کیا اور آپ بھی داد وصول کیجئے۔ چلتے چلتے اور اب مشیر جھنجھانوی صاحب بھی ایک پرانی غزل عنایت کر رہے ہیں ؎

ایک تو ہم کو ڈراتا ہے قاتل کس پر کوئی الزام لگائے
قتل تو دنیا محفل میں ہوا ہے خون کے چھینٹے سب پر آئے
میں نے کسی کی یاد میں اپنے آنگن میں دو پیڑ لگائے
جیسا تو کیا ان پیڑوں پہ آتے جن میں اب تک پھول نہ آئے
چاند کی جانب پاگل پنچھی مرتے دم تک اُڑتا جائے
حُسن ہے چلتا پھرتا سایہ پیچھے بھاگو ہاتھ نہ آئے
ناگن ڈس کر جھوم رہی ہے اس سے کہو پھر ڈسنے کو آئے
زہر ابھی پھیلا ہی نہیں ہے نیم کے پتے کون چبائے

مشیر صاحب بھی داد میں ڈوبے کاغذ الٹ پلٹ رہے ہیں فہرست شعرا سے مراد آباد کے ایک شاعر منصور عثمانی کا نام غائب تھا لہٰذا نہایت معذرت کے ساتھ انور صاحب ان سے درخواست کلام کر رہے ہیں منصور صاحب فرما رہے ہیں ؎

مسافت منزلوں کی جب ہمارے سر پہ رکھی تھی
فلک کاندھوں پہ رکھا تھا زمیں ٹھوکر پہ رکھی تھی
ہمارے پیار کی شہرت ہوئی تھی یوں زمانے میں
ورق سڑکوں پہ بکھرے تھے کہانی گھر پہ رکھی تھی
کیا ہے صرف حق ہم نے ادا کچھ اس قرینے سے
نظر قاتل پہ رکھی تھی زباں خنجر پہ رکھی تھی

منصور صاحب بھی داد لوٹتے پلٹ رہے ہیں۔ اور پونے دو بجے پہلا دور نہایت کامیابی سے ختم ہو رہا ہے۔ !

دوسرا دور بس یہ سمجھئے صبح ہی تک جاری رہا زندہ باد زندہ دلان رُڑکی نے ایک ایک شاعر کو چُن چُن کر خوب سُنا گیا۔ رُڑکی کی یہ روایت رہی ہے کہ یہاں اچھے اور بُرے مترنم اور غیر مترنم شاعر کو سُنا جاتا ہے۔ لہٰذا اہلِ رُڑکی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

خدا حافظ۔

ضروری ۱ع - جنوری ۸۱ء کے شمارہ ہند میں جناب خلیل [illegible] [illegible] کے نام سے شائع ہو گئی ہے۔ اس غلطی کے لئے ہم معذرت [illegible]

گیت

ڈاکٹر اے سرن ارمان بلاری

ہر محفل میں ہار پہنتے دیکھے ہیں دھنوان
دولت ہی کا ہوتا ہے اس دُنیا میں سمّان
مفلس کی بے لوث محبت آج بھی ہے مجروح
کبھی کسی نے کہا نہ اس بیچارے کو ممدوح
شاعر بھی کرتے آئے دھنوانوں کا گُن گان
دولت ہی کا ہوتا ہے اس دُنیا میں سمّان

پریوں کی تصویر بناتے محلوں میں نقاش
مداحوں کو دیتے آئے شہنشاہ شاباش
راج گھرانوں ہی میں جنمے جب جنمے بھگوان
دولت ہی کا ہوتا ہے اس دُنیا میں سمّان

محنت کش کی بھوک سیوا پر چُھپے ہے اتہاس
مزدوروں سے الگ تھلگ ہے شاہوں کی بو باس
جام جم کو ہوا نہ اب تک جھونپڑیوں کا گیان
دولت ہی کا ہوتا ہے اس دُنیا میں سمّان

گائے ہوتے ان لوگوں نے اچھائی کے گیت
نیکی ہی کی ہوتی پھر تو اس دُنیا میں جیت
لیکن سچ پر پردہ ڈالے رہا سدا انسان
دولت ہی کا ہوتا ہے اس دُنیا میں سمّان

افغان پناہ گزینوں کی مدد کیجئے

ایک اپیل

اس حقیقت سے آپ یقیناً واقف ہوں گے کہ افغانستان پر سوویت قبضے کے نتیجے میں افغان وطن پرستوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان میں پشاور کے قریب بے سروسامانی کے عالم میں پناہ گزینوں کے کیمپوں میں پڑی ہے۔ ان پناہ گزینوں کی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کرنا جذبۂ انسانیت کا تقاضہ ہے۔ سیاست سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ عالمِ انسانیت کے اس ستم رسیدہ طبقے کی خبر گیری اور کفالت کے لئے دنیا کی ساری مہذب قوموں کو اپنا عطیہ دینا ہے۔

ہماری آپ سے دردمندانہ اپیل ہے کہ نقد یا جنس کے رُوپ میں اس نیک کام کے لئے دل کھول کر عطیات دیں۔ سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ان پناہ گزینوں کو کمبل اور لحاف گدّے فراہم کئے جائیں تاکہ وہ موسمِ سرما کی سختیوں کا مقابلہ کر سکیں۔ آپ کے فراخدلانہ عطیہ کا انتظار ہے۔

عطیات کے چیک / بینک ڈرافٹ براہِ کرم

فرینڈس آف افغانستان ایسوسی ایشن

۱۰، ڈاکٹر راجندر پرساد روڈ نئی دہلی ــــ کے نام بھیجیں۔

رام جیٹھ ملانی ۔ سکندر بخت

جے۔ پی۔ ماتھر ۔ عارف بیگ

اچاریہ دھرمیندر ناتھ

اچاریہ دھرمیندر ناتھ

نے اس اشتہار کے لئے جگہ کا عطیہ دیا۔

بابِ تنقید

(ادارہ)

کلیاتِ اعظم: حکیم ترلوک ناتھ صاحب اعظم جلال آبادی جہاں ایک طبیبِ حاذق۔ مسلّمہ صحافی۔ ہندی۔ اُردو اور فارسی زبانوں کے شعری سرمایہ سے بخوبی واقف ہیں وہاں ایک اعلیٰ پایہ کے ایسے شاعرِ خوش نوا ہیں جنہیں اپنے اسلاف کے نقوشِ قدم پر چلنے میں فخر ہے۔

"کلیاتِ اعظم" اعظم جلال آبادی صاحب کے کلام کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں شاعری کے مختلف اصناف پر اُستادانہ اشعار کہے گئے ہیں۔ کلیاتِ اعظم کو پڑھنے والا کوئی بھی قاری یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کلیات کے مطالعہ سے اس کے ذوقِ شعری کی سیری نہیں ہوئی غزلیات تو ایسی شگفتہ زمینوں میں کہی گئی ہیں کہ جنہیں پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جناب اعظم جلال آبادی ۸۵ سال کی عمر میں بھی کسی جوانِ رعنا سے بہتر انداز میں حالِ دل کی کیفیتِ اشعار میں ڈھال رہے ہیں۔

اگر آپ واقعی اچھے اشعار کے قدر دان ہیں تو "کلیاتِ اعظم" کو اپنی ذاتی لائبریری میں ضرور رکھئے ویسے ہر ایسی لائبریری جس میں اُردو زبان کی کتابیں رکھی جاتی ہوں اس میں "کلیاتِ اعظم" کا رکھا جانا ایک نعمت سے کم نہیں ہوگا۔ ۲۲×۱۸/۸ سائز کے تین سو صفحات پر پھیلا ہوا یہ شعری سرمایہ۔ نول پبلی کیشنز۔ دریبہ کلاں۔ دہلی ۶ یا دفترِ شاہراہِ ہند سے خرید اجا سکتا ہے۔ کاغذ۔ کتابت۔ چھپائی بہتر۔ قیمت مجلد -/۳۰ روپیہ۔

جگن ناتھ آزاد (ایک مطالعہ): جناب آزاد صاحب کے ایک مداح محمد ایوب واقف صاحب نے یہ کتاب ۱۹۷۸ء میں ترتیب دی جسے ۱۹۸۰ء میں علمی مجلس دلی نے شائع کیا ہے۔ فاضل مرتب نے دیباچہ میں یہ عجیب و غریب انکشاف فرمایا ہے کہ ... شاہدہ اور مطالعہ کے ... اکثر ... چند ... ہوئی ... موصوف کے

باوجود آزاد کے ساتھ اُردو کے ادیبوں اور نقادوں نے کیوں بے التفاتی برتی اور کون سے وہ اسباب تھے جنہوں نے اس بے التفاتی کو جنم ... میں نے ان سوالات پر ایک دفعہ بار نہیں بلکہ بار بار غور کیا۔ اِس غور و فکر کے نتیجے میں مجھے بہت ساری وجوہات سمجھ میں آئیں۔ واقف صاحب نے اپنے اس انکشاف کے بارے میں جو وجوہات دی ہیں وہ بالکل بلکہ سو فیصد غلط ہیں۔ جناب جگن ناتھ آزاد کے ساتھ کسی بھی اُردو کے ادیب یا نقاد نے بے التفاتی نہیں برتی۔ بلکہ ادارہ "آجکل" کا رکن ہونے کی حیثیت میں تو انہیں اُردو کے ہر ادیب اور نقاد کا تعاون حاصل رہا۔ کیونکہ آخر اُردو کے ان ادیبوں اور نقادوں نے "آجکل" میں اپنے مضامین شائع کرا کے معقول معاوضے بھی تو حاصل کرنے تھے تو ایسی حالت میں وہ آزاد صاحب سے بے التفاتی کیسے برتتے۔

دوسرے آزاد صاحب میں ایسی ... حیت۔ لچک اور سماجی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ تجارتی سوجھ بوجھ بھی موجود ہے کہ ان کے ساتھ کوئی اُردو ادیب یا نقاد بے التفاتی کا سلوک کر ہی نہیں سکتا رہا آزاد صاحب کا "بڑا شاعر" ہونا تو ملاقف صاحب غالباً "بڑا" اور "چھوٹا" پیمائش کے لحاظ سے کہہ رہے ہوں گے ورنہ انہیں "اچھا شاعر" کہنا چاہیئے تھا۔ واقف صاحب "مداحی" یا دوسرے الفاظ میں "عقیدت" کے جذبے میں آزاد صاحب کے بارے میں کہیں کہیں اپنے دیباچہ میں اس انداز سے لکھ گئے ہیں کہ جس پر ہجوِ ملیح کا گمان ہونے لگتا ہے۔

اس کتاب میں ۲۵ مضامین تو ایسے ہیں جن میں لکھنے والوں نے آزاد صاحب کی شاعری پر لکھا ہے اور تین مضامین ایسے ہیں جن میں آزاد صاحب کی نثر نگاری پر خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ان ۲۸ لکھنے والوں میں سے (ایک مرتب کو چھوڑ کر) باقی ۲۷ ملک کے ایسے مستند لکھنے والے ہیں کہ جن کے اسمائے گرامی نقادانِ اُردو کی ضمانت ہیں۔ اور ان سب لکھنے والوں نے اپنے اپنے موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف ... ہے ...

واقعی قابلِ مطالعہ ہے۔ کتاب کے شروع میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد، سفیرِ پاکستان جناب عبدالستار صاحب کے ہاتھوں حکومت پاکستان کی طرف سے اقبال میڈل لیتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ اور آخر میں آزاد صاحب کی تصانیف کی فہرست دی گئی ہے۔ جو سترہ شعری مجموعوں اور گیارہ نثری [illegible] پر مشتمل ہے۔ کاغذ۔ لکھائی۔ چھپائی علمی مجلس کی سابقہ روایات کے مطابق۔ قیمت مجلد اٹھارہ روپیہ پچاس پیسے۔ مکتبۂ [illegible] یا دفترِ شانِ ہند سے دستیاب ہے۔

صبح کا ساقی: مہاراشٹر کے مشہور شاعر جناب خلیل شارق نیازی جو ملک کے بہترین شعرا میں اچھا مقام رکھتے ہیں کا مجموعۂ کلام "صبح کا ساقی" اُردو اکاڈمی مہاراشٹر کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ عام طور سے اُردو اکاڈمیوں کے ذمہ دار حضرات تو "ماں بیٹی میں گم" کے مصداق اندھے کی روایتی ریوڑیوں کی طرح آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ ہاں اشک شوئی کے طور پر کچھ پس خوردہ اِدھر اُدھر پھینک دیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خلیل شارق نیازی صاحب کو بھی "پس خوردہ" پر ہی ٹال دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ صرف ۹۶ صفحات پر مشتمل یہ مجموعۂ کلام شائع کر سکے۔ زیادہ اچھا ہوتا کہ خلیل شارق نیازی اپنا تمام کلام شائع فرما سکتے یہ مختصر مجموعۂ کلام یقیناً ہماری اُردو شاعری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ قیمت پانچ روپیہ مصنف سے چرچ روڈ، امراوتی کیمپ، مہاراشٹر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

رنگ و نور: جناب ضیا فتح آبادی کا نام نامی اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ہر وہ اُردو داں جو اُردو کے اشعار پڑھ سکتا ہے وہ ضیا فتح آبادی کے نام اور کلام سے واقف ہے۔ حال ہی میں جناب جگدیش بھٹناگر حیات نے ضیا صاحب کی ۱۵۶ غزلوں کا انتخاب ترتیب دیا ہے جسے "رنگ و نور" کے نام سے جناب رادھا کرشن صاحب سہگل سکریٹری بزم سیماب دہلی نے شائع کیا ہے۔ ایک تو کلامِ ضیا، پھر نظرِ انتخابِ جگدیش بھٹناگر حیات کی جو اپنے "لب و لہجہ" کے باعث دنیائے شاعری میں جانے پہچانے شاعر ہیں اس لئے "رنگ و نور" واقعی ایک ایسا مجموعہ ہے جسے رفیقِ تنہائی کہا جا سکتا ہے۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ قیمت ۱۲ روپے بزم سیماب بی ۱۲ راجوری گارڈن نئی دہلی سے یا دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے مل سکتا ہے۔

کرچیاں: شمیم صادقہ صاحبہ لکچرار و صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ ویمنس کالج، اگروتی باغ۔ پٹنہ کے سولہ افسانوں کا مجموعہ کرچیاں بظاہر ایک سادہ سی کتاب نظر آتی ہے۔ مگر اس مجموعہ کی اہمیت اس میں شائع شدہ افسانوں کے پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ کچھ افسانے اچھے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور کچھ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ "کرچیاں" میں محترمہ شکیلہ اختر نے مصنفہ کے افسانوں اور مصنفہ پر جو تبصرہ فرمایا ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ کی آپ بیتی نے ان افسانوں کا روپ دھار لیا ہے۔ اور اسی لئے بقول شکیلہ اختر صاحبہ یہ تہہ دار افسانے گہری نفسیات لئے ہوئے ہیں۔ اور ایسی خوبصورت زبان میں لکھے گئے ہیں کہ قاری ۱۳۴ صفحات کے اس افسانوی مجموعہ کو ختم کئے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ قیمت پانچ روپے جو یقیناً بہت کم ہے مصنفہ سے یا دفتر شانِ ہند، نئی دہلی ۲ سے طلب فرمائیں۔

برگِ زرد: حضرتِ طالب چکوالی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اور مدیر شانِ ہند کے مخلص مہربانوں میں سے ہیں ۱۹۵۰ء میں جب پہلی بار جشنِ جمہوریت کا مشاعرہ لال قلعہ میں ہوا تھا تو طالب چکوالی صاحب نے اس مشاعرہ کی روداد نظم میں لکھی تھی۔ جو مشہور اخبار ریاست میں شائع ہوئی اور اس نظم کو ایسی شہرت ملی کہ طالب چکوالی اُردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں میں پہچانے جانے لگے۔ گزشتہ تیس سالوں میں ان کی شاعری ایسی نکھر گئی ہے کہ طالب چکوالی صاحب کا شمار مشہور اساتذہ میں ہونے لگا ہے۔ آپ کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "برگِ زرد" تازہ ترین مجموعۂ کلام ہے۔ جس کا مطالعہ یقیناً اُردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ ۲۰۸ صفحات کے اس مجموعہ کی قیمت پندرہ روپے ہے۔ ناشر منوہر پرکاش بی ۔ ۳۲ ۔ لاجپت نگر ۳ نئی دہلی ۲۴ سے یا دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے طلب فرمایا جا سکتا ہے۔

جرنل خدابخش لائبریری پٹنہ

کون ایسا اردو داں ہے جو خدابخش لائبریری پٹنہ کے نام سے واقف نہ ہو۔ ۱۹۷۷ء میں اس لائبریری کے بورڈ کے فیصلے کے مطابق یہ سہ ماہی جرنل شائع ہو رہا ہے۔ اس جرنل کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے مندرجات کا کسی نہ کسی طرح کا تعلق خدابخش لائبریری سے ہی ہے۔ لہٰذا اس جرنل میں اردو کے علاوہ انگریزی، فارسی اور عربی کے ایسے مضامین شائع ہوتے ہیں جو خدابخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہیں یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہیں۔

شمارہ اوّل میں انگریزی کا پہلا مضمون صلاح الدین خدابخش کا بانی کتب خانہ سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر سید حسن عسکری نے ۱۹۷۶ء میں تین خدابخش لکچر (انگریزی میں) دیئے تھے۔ پہلا لکچر اس شمارہ میں دیا گیا ہے۔ اسی طرح پروفیسر نذیر احمد نے ۱۹۷۷ء میں خدابخش لکچر اردو میں دیئے تھے ان کے تینوں لکچر بھی اسی شمارے میں شامل ہیں۔ غزالی مشہدی کی مثنوی کلیاتِ غزالی کے معلوم نسخوں میں نہیں ہے۔ مگر اس کتب خانے کے ایک مجموعہ میں موجود ہے جو اس شمارے میں شائع کی گئی ہے۔ فالنامۂ حافظ شیراز ایک مختصر سا رسالہ عنایت خان راسخ کی تالیفات سے ہے۔ مرزا جان طپش دہلوی غالب تیسرے ریختہ گو شاعر ہیں جنہوں نے اپنی کلیات کا دیباچہ خود لکھا۔ گارساں دتاسی نے اپنی تاریخ ادبیاتِ ہندوی و ہندوستانی کے مقدمہ میں جو اپنے ماخذ کی فہرست دی ہے۔ اس میں یہ دیباچہ بھی ہے۔ یہ کلیات کمیاب ہے اس لئے یہ دیباچہ بھی شمارہ اول میں شائع ہوا ہے۔

ایک عربی مقالہ "طبقات و مولفہا" اور "کشمیر درپن" اردو ماہنامہ کا تعارف۔ یو پی پراونشل کانگریس کمیٹی کی پہلی کانفرنس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو کا خطبہ صدارت جو کشمیر درپن سے لیا گیا ہے بھی شریکِ اشاعت ہے۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے والے حضرات کی اکثریت ہندو تھی۔ مگر خطبۂ صدارت کا آغاز ایک فارسی شعر سے ہوتا ہے اور جس کی ابتدا ایک عربی جملے سے ہوتی ہے۔ "مطبوعاتِ جدیدہ" کے تحت رہبرِ تحقیق کا تبصرہ ہے۔

نوادر کے تحت مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک خط کا عکس اور وزیٹرس رجسٹر کے چند اقتباسات ہیں۔ ۱۸×۲۲ سائز کے تقریباً تین صد صفحات پر مشتمل جرنل کا شمارہ اوّل ہر لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے اور ہر لائبریری میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ قیمت پندرہ روپیہ۔

دوسرے شمارے میں ہر طرح کے ۳۱۷ صفحات میں باغِ معانی تذکرۂ شعرائے فارسی سدۂ دوازدہم مؤلفہ نقش علی شائع کیا گیا ہے جس کی تصحیح و ترتیب خدابخش لائبریری کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کتب خانہ خدابخش جناب عابد رضا بیدار نے فرمائی ہے۔ عہد ہمایونی کی ایک نادر و نایاب عربی مخطوطہ "عصمت الانبیاء" ملا احمد مخدوم الملک، ملا عبداللہ سلطان پوری کی تصنیف ہے) سے متعلق سید عبدالباری کا تحقیقی مقالہ بھی اس شمارے میں شریک ہے نوادر میں میر مومن کا ایک قطعہ۔ مطبوعاتِ جدیدہ پر فرہنگِ آصفیہ کا تبصرہ اور دیوانِ انوری کے بارے میں تصحیح و اضافہ جناب قاضی عبدالودود کے عطیات ہیں لائبریری کے وزیٹرس رجسٹر سے ماخوذ رابندر ناتھ ٹیگور۔ علی اصغر حکمت (ایران) لیاقت علی خان (پاکستان) سر ظفر اللہ خان (پاکستان) اور اے۔ کے۔ فضل الحق (بنگلہ دیش) کی عکسی تحریریں شائع کی گئی ہیں۔ اور مرحوم ونسینٹ کلارنس اسکاٹ او کونر کا لکھا ہوا ایک تعارف خدابخش لائبریری انگریزی میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ شمارہ بھی تین صد صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس کی قیمت بھی پندرہ روپیہ ہے۔

تیسرا شمارہ زیادہ تر فارسی، عربی اور انگریزی کے بیش بہا مضامین پر مشتمل ہے۔ مجمع النفائس تذکرہ شعرائے فارسی سدہ دوازدہم مؤلفہ سراج الدین علی خان آرزو۔ تصحیح و ترتیب از عابد رضا صاحب "رسالۃ الشعاعات للکندی" عربی مقالہ ڈاکٹر مختار الدین احمد کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ فرہنگِ آصفیہ کی جلد نمبر ۲ کا تبصرہ۔ تصحیح و اضافہ (فہرستِ مخطوطات اردو جلد نمبر ۱) اور دیوان گرامی شاملو جناب قاضی عبدالودود صاحب کی نگارشات کے اعلیٰ نمونے ہیں نوادر کے تحت لائبریری کے وزیٹرس رجسٹر سے ماخوذ عکسی تحریریں ذیل کے سرکردہ حضرات کی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ سیدنا طاہر سیف الدین سیدنا برہان الدین، ہمایوں کبیر اور شانتی کبیر، ڈاکٹر بروس لارنس کا عہدِ سلطنت میں صوفی لٹریچر کا ایک جائزہ اور ڈاکٹر سجاد نالہ سرکار "خدابخش، ہندوستانی بوڈلے" انگریزی مقالات اپنے لکھنے والوں کی شہرت ناموری کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اس شمارے کی ضخامت تقریباً ۲۲۵ صفحات۔ قیمت ہر

سہیل عظیم آبادی بحیثیت افسانہ نگار

ڈاکٹر شعیب راہی
ڈالٹن گنج (بہار)

جیسا کہ مورخینِ اردو ادب کا خیال ہے۔ اردو افسانہ نگاری انگریزی ادب کے اثرات سے پیدا ہوئی۔ اس کی وجہ جو بھی رہی ہو، لیکن مختصر افسانہ جو آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدائی زندگی کی پیداوار ہے۔

ابتدا میں اردو افسانہ زیادہ تر یا تو عربی، فارسی اور انگریزی سے ترجمہ کر کے پیش کیا جاتا تھا۔ یا اسی قسم کے افسانے لکھے جاتے تھے جو خیالی، رومانی اور مناظرِ فطرت کی عکاسی کرتے تھے۔ ایسے افسانہ نگاروں کی فہرست بہت طویل نہیں۔ تاہم چند کے نام گنائے جا سکتے ہیں مثلاً نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھپوری، راشد الخیری، امتیاز علی تاج، وغیرہ۔

مختصر افسانے کے اس رومانوی اور تخیلی دور کے بعد اردو افسانے میں پریم چند کا زمانہ آتا ہے جس سے افسانے کو ایک نیا رخ ملتا ہے اور اردو افسانہ زندگی سے قریب اور حقیقت سے نزدیک آجاتا ہے۔ یہیں سے افسانے کا وہ دور بھی شروع ہوتا ہے جو افسانہ نگاروں کو کئی خانوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایسے افسانہ نگار جنہوں نے مزدوروں اور کسانوں، نچلے متوسط طبقے اور متوسط طبقے کے لئے افسانے لکھے، اسی دور کے پیداوار ہیں، انہیں میں سہیل عظیم آبادی کا نام بھی آتا ہے، سہیل صاحب یوں تو بہار کے رہنے والے تھے لیکن اردو افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا شمار ہندوستان کی صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، جس میں کرشن چندر اختر اورینوی، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی آتے ہیں۔

سہیل صاحب اسی صف میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کے افسانوں میں جو بنیادی چیزیں پائی جاتی ہیں اور مجموعی طور پر ان کے افسانوں کا جو مزاج ہے۔ اس کی شناخت آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ سب سے پہلی چیز جو سہیل صاحب کے افسانوں میں ہے وہ ان کا انداز بیان ہے۔ ان کے افسانہ کا موضوع عام طور پر وہی ہوتا ہے جو عام افسانہ نگاروں کا موضوع ہے۔ لیکن سہیل صاحب نے اپنے افسانے کو موضوع کے اعتبار سے دیہات کے کسانوں اور شہر کے مزدوروں، معمولی طبقہ کے انسانوں، روزمرہ کمانے والے اور سڑک پر چلنے والوں تک خاص طور پر محدود رکھا، دیہات میں کسانوں اور زمینداروں کی کشمکش، آپس کی لڑائی مقدمہ بازی، ان تمام باتوں کا تذکرہ سہیل صاحب کے افسانوں میں پایا جاتا ہے جہاں انہوں نے شہر کے مزدوروں کا تذکرہ کیا ہے وہاں مزدوروں کی جد و جہد ان کی ٹریڈ یونین اور ٹریڈ یونین تحریکوں کا خاص طور پر ذکر ہے۔ جہاں اسٹرائک ہوتی ہے اور مزدور حالات کو بدلنے کی جد و جہد میں مصروف نظر آتے ہیں۔ سہیل صاحب کے افسانوں میں امیر اور غریب دونوں ہی اپنے اپنے حال میں مست تو نظر آتے ہیں۔ لیکن غافل نہیں ہیں اور انہیں کے حال میں انہیں بیان کرنے میں سہیل صاحب کے یہاں فن کی جو سادگی پائی جاتی ہے وہ ان کے ہم عصروں کے یہاں مشکل سے ملے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس طرح دیکھتے ہیں اسی طرح کرداروں کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔

ان کے افسانہ الاؤ کے طوفانی میاں اور دلتو الگ الگ نسل سے کردار ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سہیل صاحب نے طوفانی میاں کے احساسات، جذبات اور خیالات کو من و عن بیان کر دیا ہے۔ طوفانی میاں جو سوچتے ہیں وہ بولتے ہیں اور سہیل صاحب انہیں کے الفاظ کو دہرا دیتے ہیں۔ دلتو میں جو باغیانہ خیالات پائے جاتے ہیں انہیں بھی سہیل صاحب نے اپنے افسانے میں اسی طرح پیش کر دیا ہے۔ جس طرح دلتو محسوس کرتا ہے اور بولتا ہے۔ اپنے کرداروں کو اپنے افسانے میں اپنے نقطۂ نظر سے نہیں پیش کرتے اور نہ انہیں مثالی بناتے ہیں۔ بلکہ جو کردار جس نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کو اسی نوعیت میں پیش کرنے میں ہچکچاہٹ نہیں

محسوس کرتے، یہی ان کے فن کی سادگی اور ان کے فنِ کردار نگاری کی صفت ہے۔

سہیل صاحب نے چند ایسے کردار بھی پیش کیے ہیں جن کی حیثیت دیرپا ہے۔ جو پڑھنے والوں کو متاثر کر کے اپنے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر "الاؤ" کا "دتو" "بدصورت لڑکی" کی "چندرا" "ساوتری" کی "ساوتری" افسانہ "کانچ" کی "کانچی" "گرم راکھ" کی "رودھیا" بھلا دینے والے نہیں بلکہ جیتے جاگتے کردار ہیں۔ ان میں انسانی اوصاف کے جوہر جھلکتے ہیں، ان میں تہہ داری اور پیچیدگی کے ساتھ ساتھ جذبہ کی حرارت بھی پائی جاتی ہے، ایسے متحرک اور زندہ کرداروں کی تخلیق کے ذریعے انھوں نے اردو افسانہ نگاری کو کردار نگاری کی ایک نئی راہ عطا کی ہے۔ گرم راکھ کی ہیروئن رودھیا اردو افسانہ نگاری کے چند معروف کرداروں میں ایک کردار شمار کی جائے گی، رودھیا کے بارے میں خود سہیل صاحب لکھتے ہیں۔

"ایک [illegible] رودھیا ایک ساتھ دوہری زندگیاں گزار رہی تھی، ایک زندگی [illegible] ایک وہ [illegible] ہو سکتی تھی اور نہ جسے [illegible] " گرم راکھ "

دوہری زندگی گزارنے والے کردار کی تخلیق سہیل صاحب کے اعلیٰ فنِ کردار نگاری کا ثبوت ہے۔

زندہ و تابندہ کرداروں کی اسی پیش کش نے ان کے طرز و اسلوب [illegible] اسلوب سادہ اور صاف ہے رودھیا کہتی ہے۔

"پتی پریم کی یادگار بھی پارمیتا [illegible] پالن پوسن، بیاہ اور خوشی ......"

یہ "پالن پوسن" "گھر آنگن" کے الفاظ ہیں، ان میں جو سادگی اور شائستگی ہے، وہی ان کے طرزِ تحریر کی شانِ امتیاز ہے۔ [illegible] ان کے افسانے میں ہر جگہ رواں دواں ہے۔ وہ اپنے کرداروں [illegible] میں جھانک کر ان کے احساسات [illegible] نشوونما، [illegible]

کے ساتھ منعکس ہوتی ہے، افسانہ نگار کے آئینۂ الفاظ میں [illegible]

سہیل صاحب کے افسانوں میں ان کے واقعات اور کردار بالکل صاف اور سادہ ہیں۔ ان میں کسی طرح کا الجھاؤ نہیں پیچیدگی اور انتشار نہیں، وہ بالکل پاک و صاف ہیں۔ ان کے افسانہ الاؤ میں پٹواری اور آکلو دو مختلف کیفیتوں کے حامل کردار ہیں، پٹواری زمیندار کا آدمی ہے، اس کے کردار میں چالاکی اور چالبازی ہے آکلو اور دتو انقلابی تحریکات کے ترجمان ہیں۔ ان کے کرداروں میں جوش، ولولہ اور حرارت ہے، یہ کردار بالکل صاف [illegible] میں بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہی صفائی، سیدھا پن، آئینے کی سی کیفیت ان کے افسانے کے پلاٹ میں بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے افسانے کے پلاٹ کا نصف حصہ منظم اور مربوط ہوتا ہے مگر نصف حصہ غیر منظم اور غیر مربوط گویا آدھا افسانہ پلاٹ کا پابند ہوتا ہے اور آدھا پلاٹ کی بندشوں سے آزاد۔ پلاٹ اپنے آپ میں کوئی چیز نہیں، وہ واقعات اور کردار کا پابند ہے۔ واقعات اور کردار کا بہاؤ پلاٹ کو اپنے ساتھ ساتھ لیے چلتا ہے۔ جس سمت واقعات اور کردار مڑتے ہیں پلاٹ بھی اسی جانب مڑ جاتا ہے۔ ان کی کہانی آگے بڑھتے بڑھتے اپنا رخ موڑ دیتی ہے [illegible] چلتی چلی جاتی ہے [illegible] آتا ہے کہ قاری کا ربط نہیں ٹوٹتا اور افسانے کا [illegible] رہتا ہے، ماجرا فرازی کا یہ فن سہیل صاحب کی [illegible] کی دلیل ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس زندگی کو پیش کرتے ہیں خواہ وہ شہری ہو یا دیہاتی جس طرح دیکھتے ہیں [illegible] اپنے افسانے [illegible] پیش کرتے ہیں، گویا ان کا افسانہ زندگی کا آئینہ [illegible] وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو اپنے افسانوں میں [illegible] ہیں۔ ان کے افسانے میں جو اندازِ بیان [illegible] ہوتا ہے۔ مگر تلخی نہیں۔ افسانہ نگار یا فنکار اپنے فن [illegible] استحصال کے نقطۂ نظر [illegible] محبت نہیں اور ہر بڑے فنکار کو دشمنی سے [illegible] اور بلاشبہ [illegible] عظیم آبادی ایک عظیم فنکار ہیں۔

●●●

محنت اور عبادت

(ڈاکٹر او پی سرن آرمان بلاری)

ہے بھگوان تو سب کی مدد کرتا ہے آج میری بھی مدد کر دے میرے کھیت میں شام تک کا ہی کام رہ گیا ہے۔ اگر آج رات کو بارش ہو گئی تو پتہ نہیں یہ کپاس کب نرائی جائے۔ شکورہ جب بھی اذان کی آواز سنتا ہے کھرپا چھوڑ دیتا ہے یہ نہیں سوچتا کہ کسان کے کاموں میں وقت کی پابندی نہیں چلتی۔ دیر سویر کام چلتا ہی رہتا ہے۔ ہاں اگر اذان کی آواز نہ آئے تو سارا کام پورا ہو جائے۔ ہے بھگوان اتنی تیز ہوا چلا دے کہ آواز پورب کو اڑ جائے یا اذان کے وقت زور زور کی گرج ہونے لگے۔ جیسے ہی ہوا اذان کی آواز نہ آنے پائے یا ملا کو بخار ڈال دے مگر ملا کے بیمار پڑنے سے تو یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا ہندوؤں میں تو صرف برہمن ہی پوجا پاٹھ کرتے ہیں لیکن مسلمانوں میں تو اکثر نماز پڑھتے ہیں۔ اور اذان دینے والے بھی اور لوگ ہو سکتے ہیں۔ ارے میں تو بہک ہی گیا اور بھگوان کو ترکیبیں بتانے لگا۔ ہے بھگوان معاف کرنا۔ دل ہی دل میں بھیکا سوچ رہا تھا اور پاس نرانے کے لئے کھرپا چلانے میں اتنا محو ہو گیا کہ اس سے کپاس کے دو پودے کٹ گئے اور اس کو پتہ بھی نہ چلا شکورہ نے دیکھ کر ٹوکا۔

"یوں بھیکا کر دیئے دو پودے قتل کہاں ہے تیرا دھیان پتہ کٹ جاتے تو آسمان سر پہ اٹھا لیتا" یہ سنتے ہی بھیکا چونکا اور بڑبڑائے ہوئے آدمی کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ "واقعی دو پودے کٹ گئے" اس کے منہ سے نکلا اور کپاس کے دو والا لال پودے گھاس پھوس کے ساتھ اس کے ہاتھ میں دکھائی دے رہے تھے۔ بتلاؤ ہونے کی وجہ سے پودے کمہلائے نہیں تھے اور کسی انسانی کے کھلے ہوئے پنجے کی طرح کپاس کے پتے چمک رہے تھے دونوں پودوں کے کٹنے کا اتنا ملال تھا کہ شاید شہروں میں ہندو مسلمان فسادوں میں کٹنے والے انسانوں کا بھی نہیں ہوتا ہوگا تو ہم بھی نہیں سکتے۔ اس نے جھکے سے کہا اور پودوں کی جڑیں دیکھنے لگا۔ ارے ذرا سی جڑیں رہ گئی ہیں۔ شاید انہی کے سہارے پر پھر یہ ہرے ہو جائیں، خوش ہو کر کہتے ہوئے اس نے جلدی دونوں پودوں کو پھر الگ الگ گاڑ دیا اور اپنے پینے کا پانی ان کی جڑوں میں انڈیل دیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا پچھتانے سے بھی کیا ہوتا ہے رام مالک ہے وہ چاہے تو مُردے کو بھی جلا سکتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے جلدی سے کھرپا اٹھا لیا اور بیکار گئے وقت کو پورا کرنے کی نیت سے پھر تیزی سے کام کرنے لگا جیسے جنگ میں سپاہی دشمن کو ختم کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

"اب پودے اکھڑ گئے تو آج نہ ہرے ہوں گے نہ کل بھیکے" کا کر کے کہتے ہوئے "نہ آج ہرے ہوں گے نہ کل" شکورہ نے جھڑکی سنا کے ہوئے کہا۔ بھیکا کے من پر یہ جملہ ہتھوڑے کی طرح ٹکرایا کئے ہوئے پودے نہ آج ہرے ہوں گے نہ کل۔ یہ جملہ کہتے جسم میں زہریلے سانپ کے زہر کی طرح دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔

"دھیان تو دکھاتا ہے شکورہ بھگوان کے ہوتے پودوں کا کال تو ڈرے ہی چلا جاتا ہے کل پرسوں انہیں آکر پھر دیکھنا کہ ہرے ہوتے ہیں یا نہیں" کہتے ہوئے اس نے اپنی پیچان کے لئے ایک لکڑی گاڑ دی اور کہنے لگا "اگر یہ پودے ہرے نہیں ہوئے تو بہت ہی ملال ہوگا کیونکہ ان دو پودوں پر اتنی کپاس آتی کہ دو نیتاؤں کی ٹوپیاں بن سکتی تھیں۔"

"تم کو ان کی ٹوپیوں کی فکر ہے۔ نیتاؤں کو اپنی کرسی کی فکر ہے در دھال بھی تو بن سکتے ہیں" شکورہ نے کہا

"میں تو پیٹ کی روٹی اور سر کی ٹوپی کی بات کرتا ہوں اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے" اطمینان سے بھیکا بولا۔

"ٹوپی تو صرف سر ہی ڈھکتی ہے مگر رومال کی کھوروں میں گٹھری کے ٹکڑے کو پیچھے پھینکتے ہوئے شکورہ نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے مگر دنیا کے کام ان دھیمی کے لئے کئے جاتے ہیں۔" ہانپتے ہوئے بھیکا نے بات پوری کی۔

"کیسے؟" شکورہ اپنی بات کٹتے ہوئے چونک کر بولا۔

"سارندھا۔ چمپت رائے۔ رانا پرتاپ۔ رانی لکشمی بائی۔ ادھم سنگھ نے صرف ٹوپی کے لئے جان نچھاور کی تھی۔"

"ٹھیک ہے بھیکا مگر وہ اگلے زمانے کی بات تھی۔ اب تو ٹوپیوں کا رواج ہی گھٹتا جا رہا ہے لوگوں نے الفاظ کے معنی ہی بدل دیئے ہیں۔ کیسی ٹوپی کیسی عزت۔ آسٹریلیا میں ایک کلب تیار ہوا ہے جس میں نوجوان اپنی بیویوں کو ایک دوسرے کی بیویوں سے بدل لیتے ہیں اور رات بھر ایک دوسرے کی بیوی ایک دوسرے کے گھر پورے رات گزارتی ہے بھارت میں بھی کئی نوکر اپنے افسر کو خوش کرنے کے لئے اپنی دلہنیں پیش کر دیتے ہیں۔ کہاں رہی ٹوپی (عزت) کی بات۔ روٹی کی بات بھی غلط ہے کلنگ۔ پانی پت۔ ترائن اور پلاسی کی جنگیں کرنے والوں کو روٹی نصیب بھی نہیں کیا۔ اب آئی سمجھ میں کہ بات روٹی اور ٹوپی ہی تک نہیں ہے بلکہ ان سے آگے بھی کوئی اصل چیز ہے جس کے لئے یہ عالم رواں دواں ہے۔"

"ہاں شکورہ بات ٹھیک ہی ہے کہ سی روٹی اور ٹوپی کے علاوہ بھی میں مان گیا مگر" اس کے علاوہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا نہ جانا اس کی نظر ایک چوہے پر پڑی اور اس نے کہا۔ "شکورہ ذرا سامنے سے چوہا بھاگ گیا تو نے اس کو کھڑے سے مار کیوں نہیں دیا۔"

"میں نے دیکھا نہیں کدھر ہے" شکورہ بولا۔

"وہ جا رہا ہے۔" بھیکا نے اشارہ سے بتایا۔ وہ جانتے کہ تھا ہی تھا کہ کہیں تاک میں بیٹھی چیل آ کے پنجوں میں دبا کر ادھر ادھر اڑان کی آواز پیدا کرتی تھی۔ اس طرف اڑ گئی، جب کسی کی موت آتی ہے۔ تو ایسے آتی ہے" بھیکا نے سر ہلا کر ہنستے ہوئے شکورہ نے بھی اپنے کام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"چیلیں بھی کتنے چوہوں کو ماریں گی کھیت کے کھیت بے پڑے ہیں چوہوں سے۔" شکورہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

آدمیوں کو ہلاک کرنے کیلئے طرح طرح زہر اور گیاس کے ہتھیار بنا ڈالے ہیں۔ مگر اس نقصان دہ جنوز ختم کرنے کے لئے کوئی کامیاب قدم نہیں اٹھایا۔ کاش ان چوہوں کا نام و نشان مٹا دیتے اس کو بھی مٹا دیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"زنک فاسفیٹ چوہوں کو ختم کرنے کے لئے بنا تو دی ہے کوئی کسان اس کا استعمال نہ کرے تو سائنسدانوں کی کیا خطا ہے۔"

"یہ کچھ نہیں۔ اب چوہے ایسے ہو گئے ہیں کہ زنک فاسفیٹ کی بنی ہوئی گولیاں سونگھ کر بھاگ جاتے ہیں کوئی ایسا زہر یا کھاد بنانا چاہئے تھا جس کو آبپاشی کے وقت پانی میں ملا دیا جاتا تاکہ بلوں میں بھر جاتا جس سے کوئی چوہا نہ بچتا۔"

"سائنسدانوں نے توجہ ہی نہیں دی ورنہ کچھ بھی غیر ممکن نہیں ہے۔"

"کیا کہا کچھ بھی غیر ممکن نہیں ہے؟ کیا اولوں کو بھی گرنے سے روکا جا سکتا ہے؟" شکورہ نے سوال کیا۔

"تو گھرا یا چلا تارہ یہ بھی ممکن ہے سچ میرا لڑکا سائنس پڑھتا ہے وہ بتایا کرتا ہے کہ ایسی کرنوں سے موٹے سے موٹا تیل بھی کاٹا جا سکتا ہے۔ ہر ستارے تک سائنسدان کو بھیجا جا سکتا ہے اگر سائنسدان چاہیں تو ان کی مدد سے ایسی مشینیں بنا سکتے ہیں کہ جس کے اندر سے فوارہ کی طرح زمین نکل کر آسمان میں بکھر جائیں اور اپنی گرمی سے بادلوں کے اس ماحول کو بدل دیں جس سے اولے تیار ہوتے ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر آگ برسانے والے بم طاقت کا استعمال ادھر بھی کر سکتے ہیں۔"

"بھیکا تو شیخ چلی کی سی باتیں کرتا ہے بھلا خدائی میں دخل کون دے سکتا ہے۔"

"شکورہ ایک بتا حضرت ایوب کا کوڑھ بد دعا کے ٹھیک ہو گیا تھا۔ پیغمبر کی ایک انگلی اٹھانے سے چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے حضرت یونس مچھلی کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ کیا یہ خدائی کے خلاف نہیں ہے جب یہ ہو سکتا ہے تو وہ کیوں نہیں ہو سکتا۔" بھیکا نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے بھیکا علم سے سب کچھ ممکن ہے۔ آج بہت دیر ہو گئی اذان نہیں ہوئی۔" بات بدلتے ہوئے شکورہ نے کہا۔

ہو جائے گی اذان فکر کیوں کرتا ہے جب تک اذان نہ ہو تب تک تو ہی اٹھا کر کام کر۔ اذان کی ٹوہ میں رہا کر کپاس کے پودے مت کاٹ دینا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بھیکا نے کہا۔

"نہیں بھائی مجھ سے کپاس نہیں کٹ سکتی میں بہت سنبھل کے کام کرتا ہوں۔" پھر بیڑی سلگاتے ہوئے شکورہ نے کہا۔

"شکورہ تو بہت بیڑی پیتا ہے۔ صحت خراب کرتی ہے اور جو صحت کو نقصان پہنچائے وہ سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے اور کوئی اپنے دشمن سے محبت نہیں کرتا پھر تو اس کو منہ سے لگائے کیوں پھرتا ہے۔"

"بھیا کہہ تو ٹھیک رہے ہو سرکار نے یہی بات سگرٹوں کی ڈبیوں تک پر لکھوا دی ہے مگر یہ چھوٹتی ہی نہیں بہو نے بھی کئی بار ٹوکا ہے۔"

"روزے رکھتے ہو"؟

"ہاں پورے روزے رکھتا ہوں"!

"تو پورے سارا دن کیسے رہتے ہو بنا بیڑی پئے۔ اب جبکہ ایک ہی گھنٹے میں دو مشغلیں۔"

"اس وقت تو نیت بنائی جاتی ہے۔"

"تم اسی طرح نیت بنا کے اس کو چھوڑ سکتے ہو۔ شروع شروع میں کچھ وقت ہوگی پھر ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ بیڑی پینے والے بھی برے لگنے لگیں گے۔ مضبوط ارادے سے ہر کام آسان ہو جاتا ہے۔"

"تمہارا بات تو صحیح ہے" شکورہ۔

کپاس بانٹنے کو آرام مل رہا ہے۔ حقیقتاً ہندوستان عام بات کہہ رہا ہوں۔ ایک دن میں نے پانچ مزدور ایک کھیت میں بھیجے تھے۔ اور خود بارش ٹیکس کے سلسلے میں کچہری چلا گیا۔ لوٹتے وقت دور سے دیکھا تو سب کھڑے گنے چوس رہے تھے۔"

"وہاں گنے کہاں سے آگئے" شکورہ نے کپاس کے پودے کی جڑ میں سے گھاس کو چٹکی سے اکھاڑتے ہوئے تعجب سے کہا۔

"زمین میں بوئے ہوئے گنوں کو نکال نکال کے چوس رہے تھے۔"

"ان میں تو انکھوے نکل آتے ہیں"

"میں نے بھی ان کے پاس جا کر یہی کہا تو بولے جس پینڈے میں کوئی بھی انکھوا نہیں ہوتا اسے چوس لیتے ہیں۔ میں نے کہا تم کو کیا پتہ کہ زمین میں دبے ہوئے کون سے پینڈے میں انکھوے نہیں ہیں تو بولے دیکھتی مار سے پر کم گہرے دبے پینڈے سے انکھوے آتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہی تو دبا تے ہیں۔ دن میں سے جو سلا ہوتا ہے۔ اسے چوس لیتے ہیں۔ اس کو [illegible] کا تو ہے نہیں۔ میں نے کہا کہ تمہیں پچھلا کوا ایک [illegible] مل گئے ہیں؟ تو بولے اکٹھے کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کی [illegible] اندازہ لگا لیا اور دریافت کیا کہ کام کم کیوں ہوا ہے۔ تو بولے زمین سخت ہو گئی ہے کل کو کام زیادہ ہو جائے گا۔ یہ سن کر میں خاموش ہو گیا اور دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ جب آج زمین کو سخت بتا رہے ہیں تو کل اور سخت ہو جائے گی۔ جب زمین کی سختی کی وجہ سے آج کام کم ہوا ہے تو کل کو زیادہ کیسے ہو جائے گا۔

میں خاموش ہو رہا اور ان کے سر تو کام پر لگ گیا اور اس راز کو سمجھنے کے لئے کام پر چھوڑ دیا۔ شام ہو گئی سب لوگ چلے گئے دوسرے دن میں نے جا کر بوجھ کر کچھ دیر سے گیا کام سچ مچ امید سے زیادہ ہو [illegible] کو لوگ دن رہتا تھا زمین پر بھی مٹی ہٹا [illegible]

" ٹھیک کہتے ہو بھیکا تم آج دوپہر کھانا کھانے گھر نہیں گئے "
بات کا پہلو بدلتے ہوئے شکورہ نے کہا۔

" ہاں بھیا آج کھانا کھانے گھر نہیں گیا صبح گڑ اور چنے کھا کر آیا تھا۔ دوپہر کو کھانا خود بنانا پڑتا اس لئے نہیں گیا۔ اب شام ہوتے کو بنا کر کھاؤں گا یہ کپاس میری جان کو آرہی ہے آج اس کی نلائی ہو جائے گی تو ایک بوجھ اتر جائے گا۔"

" کیا تم دونوں میں لڑائی ہو گئی ہے جو کھانا خود بناتے ہو " شکورہ بولا۔

" وہ لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ وہاں کے زمیندار نے اپنا مکان چوکور کرنے کے خیال سے اس کے باپ کو اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور گاؤں کے کنارے بستی سے باہر اپنے باغ میں جو زمین ہے کچھ سامان اور کچھ روپے بھی دیئے ہیں مگر بیچارہ ناکافی تھی۔ زمیندار کا بول بالا ہے دنیا میں کتنی دیکھا انصاف ہوتا ہے غریب کا کوئی نہیں سنتا بیچارہ چپ چاپ چھوڑ آئے بس چھوڑتے تو کیا کرتے خربوزے اور چھری کا ساتھ ہو تو ہر حال میں خربوزے ہی کا نقصان ہوتا ہے چاہے چھری خربوزے پر گرے چاہے خربوزہ چھری پر۔"

" بھیکا ایسی بات مت کہو اللہ تعالی کے یہاں سب کا انصاف ہوتا ہے "

" ہاں سنتے تو یہی ہیں " ٹھنڈی سانس بھر کر منڈیر پر نظر ڈالتے ہوئے کہ کتنا کام باقی ہے گھر سیدھا کرتے ہوئے بھیکا نے کہا۔

" سنتے نہیں ہیں سچ ہے وہ ظالم کو مہلت دیتا ہے پر نظر رکھتا ہے تم دیکھنا یہ زمیندار ہی کسی دن غارت ہو جائیں گے ظلم زیادہ دن تک رنگ نہیں دکھاتا ہے " شکورہ نے کہا۔

" کہیں آگ لگتی ہے تو ہوا اس کی لپٹوں کو اور تیز کر دیتی ہے اسی طرح گاؤں کے لوگوں نے زمیندار کی ہاں میں ہاں ملائی کسی خدا کے بندے نے یہ نہیں کہا کہ اس برسات میں اسکو مت نکالو تو اس کا نیا گھر تم اس جیسا تو بنا کر دے ہی دو مجبور تھا آج سر پر چھپر ڈال کر ان کی عدت کے لئے بہو کے ہاتھ بیچے ہیں۔"

" اس گاؤں کو چھوڑ کر اپنے گاؤں میں آ کر کیوں نہ بس گئے۔"

" کاشت کاری کی زمین کا کیا ہوتا۔"

" آپ یہاں سے کرتے رہتے " شکورہ نے سمجھایا۔

" ایسا ہو تو سکتا تھا مگر زمیندار فصل کو اجڑوا دیتا کیونکہ وہ اس طرح گاؤں سے چلے جانے پر چڑ جاتا " بھیکا نے بات پوری کی

" ابا " پیچھے سے کسی لڑکی کی آواز آئی دونوں نے مڑ کر دیکھا

" کیوں بیٹی تو یہاں کیوں آئی ہے " شکورہ سے پہلے بھیکا نے کہا

" اماں نے بھیجا ہے کہ آج سات بج گئے لیکن ابا کام سے واپس نہیں آئے۔ یہ معلوم کرنے آئی ہوں اور روز تو اذان ہوتے ہی چلے آتے تھے۔"

" ابھی اذان ہوئی ہی کہاں ہے بیٹی " شکورہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" اذان تو کبھی کی ہو گئی آپ کو آواز نہیں آئی ہو گی کیوں کہ آج مسجد کا لاؤڈ اسپیکر خراب ہو گیا ہے۔ وہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہو پایا ہے۔ کوئی چیل کہیں سے پنجوں میں بچہ دبائے آئی تھی اور مسجد کے برج پر آ بیٹھی تھی بچہ اس سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور لاؤڈ اسپیکر کے تار کے پاس جا کر گھس گیا جو چیل اسکے پاس وہ پہنچا یا ہی نہیں۔ تو وہ زندگی تو خدا کو جب تک اس کی جان بچانا ہوتا ہے تو اپنے آپ ہے وہاں پیچھے پیچھے چڑھے نے اسکو کتر دیا اذان کے وقت اس کا بھید کھلا اب دوسری اذان تک وہ ٹھیک ہو پائے گا۔۔"

" اللہ تعالی کو یہ کام کرانا تھا بیٹی " یہ سنتے ہی لڑکی خاموش ہو گئی اور گھر کو لوٹ گئی۔ بھیکا نے کہا " آج میری عبادت نے خوب کام کیا۔"

شکورہ اس روز یہ نہ سمجھ سکا کہ بھیکا اپنی کس عبادت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ گھر یا چلاتا رہا۔۔

بقیہ۔ بہ کوئے یار .... ص۔۔ سے آگے

ہمراہ لے گئے جب دو بجے واپس آئے تو مفتی عتیق اللہ ساتھ تھے فرمانے لگے بیٹا ساتھ مل گیا ہے اب ہم کل ٹونک جائیں گے ہماری تیاری کر دو مگر بابا اس بوتل کا کیا ہوا قہقہہ لگاتے ہوئے فرمانے لگے اسے ہم نے معاف کر دیا اللہ تعالی سے دعا بھی کر دی کہ اسے سکون ملے۔ اب بھی میری بہن اپنا بھرم رکھے اور اپنی پیری چلانے کیلئے ڈھونگ بنائے ہوئے ہے مگر حقیقتاً اب کوئی بھی نہ تو اس کے سر پر ہے اور نہ اس کے قبضہ میں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ تمام رشتہ داروں کو اس ڈھونگ کے ذریعے الو بنائے ہوئے ہے۔ ●●●

شعرائے کرام کی خدمت میں

(حاجی نعمت اللہ ۔ نعمت جلال آبادی)

آج کی فرصت میں اپنے شعرائے کرام کی خدمت میں وہ ابتدائی باتیں پیش کی جاتی ہیں کہ جن کی اوّل اوّل ان کو خاص طور پر ضرورت پڑتی ہے خصوصی طور پر ان حضرات کو شعر کی اہمیت اور ماہیت سے آگاہ کرنا ضروری اور لابدی ہے۔

دوستو دُنیا میں جو کچھ رونق و چہل پہل دکھائی دے رہی ہے۔ وہ سب اپنے جذبات کی بدولت ہے۔ اگر غم و راحت محبت و عداوت۔ نفرت و ہمدردی یہ سب جذبات اگر ناپید ہو جائیں تو دُنیا میں سناٹا چھا جائے اس عالم گزران و فساد کا کام درہم برہم ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ انسان کو حیوان پر جو فضیلت ہے وہ صرف عقل ہی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ جذبات ہی انسان کو حیوانیت سے ممتاز بناتے ہیں۔ یہی جذبات جب الفاظ کے جامہ میں چھپ جاتے ہیں تو شعر کہلاتے ہیں۔ بعض نافہم کندہ ناتراش شاعری کو ایک بیکار شغل خیال کرتے ہیں۔ مولانا صفی لکھنوی نے کس قدر مختصر اور جامع الفاظ میں ان کج فہموں کو جواب دیا ہے ؎

شاعری کیا ہے ؟ دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

ہماری شاعری میں رنج و غم کی کثرت بعض قدرتی اسباب کا لازمی نتیجہ ہے اور اب ایسے شعرا کی ضرورت ہے جو جھوٹی ہنسی ہنس کر قوم کے رنج و غم کے مضامین مٹا کر جوش و مسرت کی شاہراہیں بنائیں سے دلیری و جانبازی کے جذبات کو بھڑکائیں ہمدردی اور رواداری کے خیالات اُبھاریں۔ ملک میں حُبِّ وطن اور قوم پرستی کی رُوح پھونکیں۔

شعر کی تعریف:۔ اب آپ اپنے ذہن میں شعر کی یہ تعریف محفوظ کر لیں کہ اہلِ عروض کے نزدیک شعر ایک موزوں کلام ہے اور منطقیوں کے نزدیک شعر وہی ہے جس سے اپنے یا سننے والے کے دل پر کوئی خاص اثر۔ رنج و مسرت، غصہ یا غضب، محبت و نفرت پیدا ہو جائے گویا اگر کلام صرف موزوں ہو تو اہلِ عروض کی اصطلاح میں شعر ہوگا اور اگر صرف مؤثر ہو تو منطقیوں کے نزدیک شعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔ باقی شعر کی کامل تعریف یہ ہے کہ کلام موزوں اور پُر تاثیر ہو۔

شعر کی معنوی خوبیاں :۔ (۱) اصلیت (۱) واقعہ نگاری

یعنی جس چیز سے وہ خیال متعلق ہے اس کا وجود حقیقت میں ہو یا عقل و اعتقاد کی رُو سے ممکن مان لیا گیا ہو۔ واقعات کے بیان میں شاعر پر اصلیت کی پابندی لازمی ہے۔ ورنہ اس کا کلام دل پر اثر انداز نہ ہوگا۔

انیسؔ مرحوم فرماتے ہیں ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

۲۔ سادگی ۔ شاعر کے کلام میں پیچیدگی اور انجھن نہ ہونا چاہئے
ذکرِ رُخصت بھی کوئی بات ہے
پھر چلے جانا کہ اپنی رات ہے
ہجر کی شب میں کوئی اپنا نہیں
ایک میں ہوں اور خدا کی ذات ہے (بیانؔ)

۳۔ بلندیٔ خیال ۔ شعر کا مفہوم رکیک اور عامیانہ نہ ہونا چاہئے ؎
بجائے گُل میری تُربت پہ ہوں خار
الجھتا ہی رہے دامن کسو کا (بیانؔ)
ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں (سوداؔ)

۴۔ باریکی ۔ شعر میں خیالات کا ہجوم سطحی نہ ہونا۔ الفاظ معنی

نے بہت مطالعہ اور کائنات کے وسیع مشاہدہ کا نتیجہ ہو سے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے (غالب)

جنہیں اُن کی نگاہیں بخش دیں عرفانِ سرمستی
وہ دیوانے فریبِ ہوش میں آیا نہیں کرتے (اسد)

حرم ہو دیر ہو کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے
خلوصِ دل کے سجدے رائگاں جایا نہیں کرتے
حضورِ حسن با حالِ پریشاں جانے والے سن
خزاں کو لے کے نزدیکِ چمن جایا نہیں کرتے

۵۔ تڑپ ۔ شاعر کے خیالات کے ساتھ جذبات بھی شامل ہوں۔ شاعرانہ خیال کے لئے جذبات کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ خیال بے جذبات حکیمانہ پند اور واعظانہ نصیحت سے زائد نہ ہوگا ؎

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
[illegible] کتنا ہو اسے ساقی مری نیت نہیں بھرتی
جب تک کہ چھلکتا ہوا ساغر نہیں ہوتا (غالب)

شعر کی لفظی خوبیاں :۔ حقیقت میں شاعر کو یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اپنے اظہارِ مطلب میں پیچیدہ الفاظی نہ کی جائے بلکہ کسی طرح بھی سادگی کا دامن نہ چھوٹے۔

۱۔ سادگی : ایسے الفاظ میں شاعر کو اظہارِ مطلب کرنا چاہئے جس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ سادگی کا انحصار کئی چیزوں پر ہے

ا۔ سلاست : ان الفاظ سے کام لیا جائے جن سے زبان مانوس اور کان آشنا ہوں۔ ورنہ شعر بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ ؎

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی (غالب مرحوم)

شبِ غم بہت مختصر ہو گئے
آنسو رونے والو سحر ہو گئی (ساقی سکرروھوی)

رہیں [illegible] تقدیر کی گردشیں
شبِ ہجر ڈھلنے سحر ہو گئی ״
رہا [illegible] ان کی آمد کا شوق
[illegible] سحر ہو گئی ״

ب۔ لفظوں کی ترتیب : قواعد، زبان اور اصولِ بیان کے مطابق ہو یعنی اگر شعر کی نثر کی جائے تو بھی الفاظ اپنی جگہ سے [illegible] نہیں۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو (غالب)

ج۔ مضمون کا کوئی بھی ضروری جزو چھوٹنے نہ پائے۔ لیکن اگر شعر میں ایسے الفاظ موجود ہوں جو ذہن کو چھوٹے ہوئے لفظ تک پہنچا دیں۔ تو یہ سادگی بیان کے خلاف نہ ہوگا۔ بلکہ اس میں شاعرانہ انداز کی جان پیدا ہو جائے گی ؎

اسد موقع ملے تو کیا ملے عرضِ محبت کا
ہم اُن کو پا کے اپنے آپ کو پایا نہیں کرتے

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں (غالب مرحوم)

د۔ کلام میں ایسی تشبیہیں اور استعارے نہ لائے جائیں جن تک ذہن کی رسائی مشکل ہو بلکہ قریب الفہم تشبیہوں سے کام لیا جائے

نازکی اُن کے لب کی کیا کہئے ۔ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے ۔ (میر)

ہ۔ شاعر کا یہ فرض ہے کہ شعر میں کسی غیر مشہور امر کی طرف اشارہ نہ کیا جائے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا (غالب مرحوم)

بھلا ہندوستان میں کاغذی پیرہن کو کون جانے۔ یہ تو ایران کی ایک رسم کسی موقع پر استعمال کی جاتی تھی۔ اسی لئے یہ شعر عوام کی نگاہوں میں سادگی کے درجہ سے گر گیا۔

۲۔ اختصار : جہاں تک ممکن ہو مختصر الفاظ میں اپنا نفسِ مطلب پیش کیا جائے۔ شعر کے اندر ڈھونسا ڈھونسی کرنے سے شعر کا حسن کم ہو جاتا ہے ؎

مقام ہر کلہ ہے جس کی نگاہ مرقی ہے
حضور کے درِ دولت پہ خاک اُڑتی ہے (موتی)

۳۔ زورِ کلام :۔ عموماً اکثر شعراء کا یہ طریق پایا گیا ہے کہ وہ اپنے کلام میں کسی کیفیت کو یا کسی جذبہ کو شدت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ذوق مرحوم فرماتے ہیں ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

۴۔ مناسبتِ الفاظ : شاعر کے نزدیک اس کی تین صورتیں ہیں۔

ا۔ لفظ کی مناسبت خیال سے باعتبارِ آواز ہونا چاہئے ؎

کہا زیر نے بم سے بہرِ سکوں
کہ دوں، دوں غوغی کی خبر کیوں نہ دوں (حسن)

ب۔ لفظ کی مناسبت خیال سے باعتبارِ معنیٰ ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا (غالب)

ج۔ لفظ کی مناسبت لفظ سے۔

مری قدر کرائے زمینِ سخن انیس
تجھے بات میں آسماں کر دیا

۵۔ جدّتِ ادا ۔ معمولی معمولی باتوں اور پائمال شدہ مضامین میں طرزِ ادا کی جدّت سے وہ لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سننے والے وجد کرنے لگتے ہیں ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں (سودا)

شکایت کیا لبوں پہ آہ بھی لایا نہیں کرتے
محبت کرنے والے غم سے گھبرایا نہیں کرتے (اسد مرحوم)

●●●——●

بقیہ: من کہ مکتوب الیہ ص ۳۲ سے آگے

کا پیار و محبت کے جذبات سے لبریز خط پڑھ کر سنایا جس میں ٹوٹتے ہوئے انسانی رشتوں کو پھر سے استوار کرنے پر زور دیا گیا تھا اس کے فوراً بعد اختر صاحب انگلینڈ چلے گئے اور میں انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عاملہ کے سالانہ اجلاس کی تیاری میں مصروف ہو گیا جس کے باعث اس تنظیم کا سرگرمیاں آگے نہ بڑھ سکیں اختر صاحب تین چار مہینہ کا پروگرام بنا کر انگلینڈ گئے تھے خیال تھا کہ اختر صاحب کی واپسی پر انڈو پاک پریم سبھا کو متحرک بنایا جائے گا اور مجھے پورا بھروسہ ہے کہ آپ کی اعانت ہمیں حاصل ہوگی دم توڑتی ہوئی انسانیت پر جناب رئیس امروہی کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس غیر سیاسی جماعت کی شاخیں پورے پاکستان میں قائم کر دی ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ وہاں پاک ہند پریم سبھا اور رشی کلب اور سائنٹفک کلب کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے اور جنرل ضیاء الحق کی سرکار اس کی سرگرمیوں کو تحسین کی نظر سے دیکھتی ہے۔ امید ہے ہمارے ملک میں شریمتی اندرا گاندھی کی حکومت انڈو پاک پریم سبھا کے فروغ میں پوری مدد دے گی۔ کیونکہ شریمتی گاندھی مذہبی تعصبات سے بالاتر ہیں اور ان کے دل میں عالمِ اسلام کے لئے ہمیشہ ایک نرم گوشہ موجود رہا ہے۔

گذشتہ دنوں میں یہاں کل ہند انجمن ترقی اردو کے سالانہ اجلاس ہوا تھا۔ انجمن کی ۷۵ سال کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی مجلس عام کے اراکین ہیڈ کوارٹر سے باہر چنڈی گڑھ میں یکجا ہوئے۔ اردو کے دانشوروں کا اتنا بڑا اجتماع ہو اور اس میں آپ کا اور "شانِ ہند" کا ذکر نہ آئے یہ ممکن نہ تھا۔ میں نے انجمن کے بعض اراکین سے تبادلہ خیال کے بعد اندازہ لگایا کہ اصولی اور نظریاتی اختلافات ہونا الگ بات ہے لیکن آپ کے قلم کی طاقت اور "شانِ ہند" کی عظمت کا سب کو اعتراف ہے۔ ایک روز ناشتے کی میز پر ڈاکٹر جاوید وششٹ، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی حضرت صباح الدین عبدالرحمٰن، حضرت سہیل عظیم آبادی (افسوس کہ اب سہیل صاحب اس دنیا میں نہیں رہے) اور احقر بیٹھے تھے کہ شانِ ہند میں شائع شدہ میرے اور سہیل صاحب کے خطوط کا ذکر چھڑ گیا۔ سب خوش تھے کہ ان خطوط کی اشاعت سے غلط فہمی دور ہو گئی اور کسی قسم کی تلخی باقی نہیں رہی۔ میں نے ان حضرات کو تفصیل سے بتایا کہ کس طرح پانچویں دہائی میں آپ نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مجھے "شانِ ہند" کا فلم ایڈیٹر نامزد کیا اور میدانِ ادب میں قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ آج مجھے انجمن کے فاضل اور ممتاز اراکین کی زیارت اور قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا ہے۔ میں نے ان معزز مہمانوں کو یہ بھی بتایا کہ سرور صاحب ہی تھے جو "تیج" کے دفتر میں مجھ جیسا ادنیٰ اختر ایسے عظیم قلمکار کے سپرد کر آئے تھے کہ میں ان سے صحافت کا درس لے سکوں۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ نے بڑے فخر کے ساتھ بتایا کہ عزیز بھی ان کے شاگرد رہے ہیں۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے بھی آپ ... کا اظہار فرمایا۔

قومی یکجہتی پر

آل انڈیا مشاعرہ

شاعر کے محسوسات

جناب توصیف علوی غازی
کیرانوی

عوام اور حکومت کو بے وقوف بنا کر ذاتی مفادات کے حصول کے لئے آجکل "قومی یکجہتی مشاعرہ" ایک موثر اور اچوک ذریعہ بن گیا ہے۔ ایسے نام نہاد مشاعروں کے منتظمین قومی یکجہتی کے معنوی اور اخلاقی مفہوم کی نسبت ذاتی مفاد اور شہرت کے معانی سے زیادہ شناسا ہوتے ہیں۔ اور ایسے مشاعروں میں جن پیشہ ور شاعروں کو بلایا جاتا ہے ان کے نزدیک غزل ہی ہر مرض کی دوا ہے کیونکہ وہ بیچارے علمی اور ادبی لحاظ سے قومی یکجہتی کے معنی صرف زادِ راہ ۔۔۔ وغیرہ۔ شراب اور اپنے گھر کی نسبت بہتر کھانا ہی سمجھتے ہیں۔ نتائج بیشتر شعرا کے پاس اس موضوع پر کلام ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اس اہلیت کے مالک ہی نہیں ہوتے۔

جناب توصیف علوی صاحب عاصی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ وطن پرستی اور ہندو مسلم اتحاد پر ان کی نظمیں اپنی نظیر آپ ہیں۔ آجکل کے قومی یکجہتی مشاعروں پر ان کے احساسات [illegible] میں ملاحظہ فرمایئے (ایڈیٹر)

یار لوگوں کو جو سوجھی قومی یکجہتی کی بات
پہنچی آل انڈیا مشاعرہ پر نگاہِ التفات
کچھ حکومت کا بھی منشا اس میں شامل ہو گیا
پھر تو منصوبہ ہر اک طرح سے کامل ہو گیا
[illegible] منتظمہ [illegible] تشکیل بھی
دوسرے کچھ [illegible] تکمیل بھی
[illegible] اقسام کے ممبر بنے
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کوئی حاکم پرگنہ تھے کوئی تحصیل دار تھے
کوئی صاحب ایس۔ پی۔ تھے کوئی تھانیدار تھے
ہو گئے ڈی۔ ایم بھی راضی صدارت کے لئے
کچھ پیش پردہ رہے افسر نظامت کے لئے
پھر سوال اٹھا کہ اس کا کون کنوینر بنے
منتظر ایک "ماہرِ فن" اسکے پہلے ہی سے تھے
بولے اس خدمت کو میں ہر طرح حاضر جناب
تجربے اس کے کئے ہیں میں نے حاصل بے حساب
پھر سوال اٹھا کہ کیسے شعراء مدعو کریں
کس کو شرکت کے لئے دعوت دیں اور کس کو نہ دیں
طے ہوا کہ کوئی بھی ہو لیکن ترنم ساز ہو
ہو سخنور یا نہ ہو۔ پر صاحبِ انداز ہو
ہو وہ تھوڑا خوش گلو بھی اور کچھ کچھ نام بھی
خوبروؤں میں بھی ہو وہ اور خوش اندام بھی
نام ہو اس کا کوئی پر شہرۂ آفاق ہو
ہو کسی زمرہ میں لیکن تالیوں میں طاق ہو
اور گر آجائیں اس میں شاعرات خوش گلو
پھر تو یہ بزمِ سخن بنجائے بزمِ رنگ و بو
جو بھی مدعو ہوں وہ سارے ایک ہی مشرب کے ہوں
ایک ہی ہو سب کا لہجہ ایک ہی مکتب کے ہوں
ہو زباں بھی ایک ان کی ایک ہو ان کا کلام
ایک ان کا میکدہ ہو ایک ہو مینا و جام
یہ بھی طے پایا مقامی کوئی بھی شامل نہ ہو
غیر تو آجائیں [illegible] اپنا کوئی [illegible]

ہاں مگر ایسے مقامی کو اجازت ہو ضرور
جس کو خدمت کا ہو جذبہ جسکو خدمت کا شعور
اس کو بھی دعوت دو جو کہ صاحبِ شہرت بھی ہو
ہاتھ میں جس کے سیاست بھی ہو اور طاقت بھی ہو
اس کو بھی پوچھو کہ جو حاضر کرے "نذر و نیاز"
ان کو بھی لاؤ جو ہیں اس دور کے "بندہ نواز"
الغرض جب ہو گیا سارا مکمل اہتمام
آگئی بزمِ سخن کی وہ حسیں رنگین شام
بزم میں رونق فزا ہونے لگے پھر شائقین
آگئے پھر مہماں "اہلِ ادب" اور سامعین
ان میں کچھ فنکار بھی تھے اور سخن پرداز بھی
شاعرانِ نامور بھی صاحبِ اعجاز بھی
کچھ پرستارانِ مے تھے کچھ پرستارانِ جام
"شیشہ و مینا" سے ہو کر آئے تھے کچھ شادکام
پھر ہوئیں جلوہ نما کچھ شاعرات دل نواز
ساتھ میں ان کے نظر آتے تھے کچھ اہلِ نیاز
بزم کا آغاز ہوا کچھ افتتاح شاندار
شاعروں کی باری باری سے لگی ہونے پکار
افتتاح کے واسطے ایک نوجواں چھانٹا گیا
جس کا شعر و شاعری سے کچھ نہیں تھا واسطہ
تھا مگر وہ خوش گلو، گاتا تھا کچھ سُر میں ضرور
اور کنوینر صاحب کا تھا پرانا "جی حضور"
اس طرح آغاز جب بزمِ سخن کا ہو گیا
رفتہ رفتہ پھر تو رنگ و نور کا نقشہ جما
پھر ترنم ساز اٹھے کچھ اٹھے سحر البیاں
کچھ نئے فنکار آئے کچھ نئے شیریں زباں
غرض یہ اس نے پڑھا اور اس نے گایا ساز سے
اہلِ دل لوٹے گئے غرضیکہ ہر انداز سے
پھر تو نعرہ بازیاں تھیں کچھ گلے کا زور تھا
ہر طرف سے داد اور بیداد کا ایک شور تھا

ہاں مگر تھی سب کی بوتل میں پرانی ہی شراب
وہ ہی فرسودہ غزل تھی وہ ہی فرسودہ کتاب
وہ ہی سُر تھا وہ ہی سرگم اور وہ ہی بھیروی
وہ ہی پہلا راگ تھا اور وہ ہی پہلی راگنی
پیش کر پایا نہ کوئی بھی "غرض" تازہ کلام
دے سکا نہ قومی یکجہتی کا کوئی بھی پیام
بات یکجہتی کی تھی انداز تھا کچھ اور ہی
رابطہ باہم کا تھا نغمہ ساز تھا کچھ اور ہی
نیک تھا مقصد مگر کھینچی گئی تصویر اور
خواب تو خوش رنگ تھا دیکھی گئی تعبیر اور

اس طرح عاصی ہوا بزمِ سخن کا اختتام
"جشن" تو پورا ہوا "مقصد" رہا پھر نا تمام

غزل

ڈاکٹر ہنومان پرشاد
جگر بستوی

زد پر ہوائے مرگ کی شمعِ حیات ہے
دردِ نہاں بتا کہ ابھی کتنی رات ہے

اس دورِ اضطراب میں یکجائی مری
شاید مرے گناہ کی شرحِ حیات ہے

ظاہر وہی ہے جو مرا باطن ہے اے ندیم
مری زبان کی بات مرے دل کی بات ہے

وہ اشک آ کے جو سرِ مژگاں ٹھہر گیا
تصویرِ داستانِ مکمل حیات ہے

احساس مٹ چکا ہے مرے دل سے اے جگر
خوشیوں کی بات ہے نہ کوئی غم کی بات ہے

من کہ مکتوب الیہ

سفارت خانۂ پاکستان، نئی دہلی
مورخہ ۹ فروری ۱۹۸۱ء

جناب ایڈیٹر صاحب

سلام مسنون!

آپ نے اپنے رسالے کے جو دو تراشے بھجوائے ہیں اور جن اچھے خیالات اور جذبات کا اظہار آپ نے ان میں کیا ہے ہم اس بات کے لئے آپ کے شکر گزار ہیں۔ وہ تحریر جو محبت پیدا کرے اور غلط فہمیاں دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ تعریف کئے جانے کے قابل ہے۔ پاکستان جانے کے لئے ویزا حاصل کرنے والوں سے سفارت خانہ کے اہلکار تعاون کرتے ہیں۔ ہم بساط بھر کوشش کرتے ہیں کہ قاعدے اور قوانین کے مطابق آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔ اگرچہ بدنظمی اور دوسرے پریشان کن مسائل اور وجوہات کے ذمہ دار خود وہی لوگ ہوتے ہیں۔ جو ویزا لینے کے بہانے آتے ہیں اور ہجوم کا حصہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ افسوسناک امر ہے کہ بے بنیاد قسم کی باتیں سفارت خانہ اور ان کے اہلکاروں کے نام منسوب کی جاتی ہیں۔ آپ نے بدنظمی اور غلطیوں کی جو بالکل ٹھیک نشاندہی کی ہے اور اصلی وجوہات کو تلاش کر کے ضبطِ تحریر میں لائے ہیں ہم اس کے لئے آپ کے ممنونِ احسان ہیں یہ صحافتی دیانتداری ہے۔ اسے دوسروں کو بھی مثال بنانا چاہئے

انجمن انقلاب دوستان کے بارے میں جو تراشہ بھجوایا ہے وہ بھی قابلِ قدر ہے۔ والسلام

نیاز مند
منیر احمد شیخ
کونسلر پریس

● مکرمی آداب و نیاز۔ ماہ نومبر کا رسالہ ملا گیا معمول کے مطابق رسالہ دلچسپ ہے مشاعروں میں شریک ہوئے تو برسوں گزر گئے لیکن گھر بیٹھے آپ کے رسالوں میں مشاعروں کی کمنٹری پڑھ کر لطف اٹھا لیتے ہیں اس مرتبہ مشاعرہ کی کمینٹری پڑھ کر افسوس ہوا کہ آپ کے وقیع رسالہ میں ایسا کیسے ہوا اور آپ کی نظر بھی چوک گئی مختصراً کچھ اشارات پر آپ کی توجہ مبذول کرانی ہے۔ امید ہے کہ آپ اسے تنقید نہیں سمجھیں گے اور معاف فرمائیں گے اور رسالہ کی محبت پر محمول کریں گے۔ صفحہ ۲۰ پر بسمل نقشبندی صاحب نے حسن صاحب کے اس شعر پر " وہ جس میں شوق تو شامل ہو پر خلوص نہ ہو

خدا کے واسطے ایسی نماز رہنے دے "

فرماتے ہیں کہ حسن صاحب کو غالباً علم نہیں کہ "پہ" بمعنی لیکن متروک ہے۔ "پہ" کے متروک ہونے پر تو بسمل صاحب کی نظر پڑ گئی حالانکہ "پر" تو یہ لوگ کلک بمعنی تک بھی لکھنا فخر سمجھتے ہیں۔ اور میر کی روح کو ثواب پہنچا رہے ہیں۔ لیکن ان کی نظر ان اشعار پر نہیں پڑی جو وزن سے بھی آزاد ہیں اور ان کے پسندیدہ ہیں۔ صفحہ ۲۱ پر بسمل گیاوی کے وہ اشعار جو پسند فرما کر کمینٹری میں لکھے ان کی ردیف کو نہیں دیکھا جن کی ردیف۔ ہو جاتا ہے۔ ہو جاتا ہے۔ میں ہو میں ہاتے ملفوظ ہے جس کا وزن سے ساقط ہونا قطعی غلط ہے بسامعین تو سب عروضی نہیں ہوتے ان کی داد سے بسمل صاحب کیوں مرعوب ہو گئے اس کے علاوہ ص ۲۲ پر شاہد صاحب کی غزل کا مطلع ملاحظہ فرمائیے

بستیاں چھوڑ کے جب شہر میں بس جاؤ گے
دیکھنا اک دن ہنسنے کو ترس جاؤ گے

ہنسنے کی ہ وزن سے ساقط ہونے پر بد رہی ہے۔ اس شعر پر بھی [illegible] سامعین سے داد دی اور بسمل صاحب بیخود ہو گئے اور اس غزل کو مرصع فرما رہے ہیں۔ ایک شعر اسی غزل کا اور ملاحظہ فرمائیے۔

میں اس وقت کہوں گا تمہیں ابرِ باراں
جب تمناؤں کے صحرا میں برس جاؤ گے

ہمارے خیال میں "تو" میں کے بعد لکھنے سے رہ گیا ہے صحیح یہ ہے

میں تو اس وقت کہوں گا تمہیں ابرِ باراں

اس کے بعد کاوش صاحب کا مطلع ملاحظہ فرمایئے۔

وہ آرہے ہیں تو کچھ ایسا اہتمام کریں
کہ شمس و قمر کو چراغِ شام کریں

آخر کا مصرع بے وزن ہوگیا۔ اسی صفحہ پر بسمل صاحب خود اپنی غزل فرما رہے ہیں۔ اس غزل کا مطلع ملاحظہ فرمایئے۔

فریب کاروں کی نگر سے کیسے رہوں
قصور واروں میں بے قصور کیسے رہوں

ہمارے خیال میں قصور واروں میں کے بعد ایک میں لکھنے سے رہ گیا ہوگا صحیح یہ ہے۔ قصور واروں میں میں بے قصور کیسے رہوں تنافرِ لفظی کی کتنی عمدہ مثال ہے دو میں ادا کرنے میں زبان کو بھی حیران ہے اگر ردیف رہیں ہوتی تو اس طرح ہوتا۔

فریب کاروں کی نگری سے دور کیسے رہیں
قصور واروں میں ہم بے قصور کیسے رہیں

مکرمی طبیعت ناساز ہے اس وجہ سے کہیں کہیں لکھنے میں گڑبڑ ہو گئی ہے آپ کے رسالہ میں ایسی خرابیاں دیکھنے کو دل نہیں چاہتا اس لئے چند سطریں سپردِ قلم کر دیں اتفاق سے اس صفحہ پر آپ کا بھی نوٹ ہے لیکن آپ نے بھی غور نہیں فرمایا ہماری طرف سے آپ کی بے اعتنائی پر افسوس تو ہے لیکن شکایت کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

زیادہ والسلام۔ نیاز مند ثروت میرٹھی

- بیرو ہارشی۔ گوپائی

مشفقی سرور صاحب، مزاجِ گرامی

رشا کر ہونے پہ خلوت نشیں ہو جانا کسی طرح قیامت سے کم نہیں، ہر چند کہ میں قیامت کے دینیاتی تصور کو بالکل درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ بھلا ہو شانِ ہند اور دوسرے اُردو جرائد کا جن کے ملتے ہی میرے لمحات جلوتِ آشنا ہو اُٹھتے ہیں۔ آپ کے موقر رسالے کے دو فیچر یعنی "بلبل چہ گفت، گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟" اور "بکوئے یار بہ اندازِ مجرمانہ گزر" اتنے ہر دلعزیز ہو گئے ہیں کہ ان کا ہر کوئی تعریف کرتا ہے۔ مرحوم سہیل عظیم آبادی کو بھی یہ دو نوں فیچر بہت پسند تھے۔ غالباً آپ کو یاد ہوگا اقبال عالمی سمینار۔ کے دوران ایک دن میں بھائی جان (سہیل عظیم آبادی مرحوم) کے ہمراہ شانِ ہند کے آفس میں آیا تھا۔ آپ کے یہاں سے ہم دونوں جناب آنند نرائن ملا کے دولت کدے کی طرف چل دیئے۔ راستے بھر ٹیکسی میں بھائی جان آپ کے بیباکانہ اندازِ بیان کی تعریف کرتے رہے اور متعدد بار یہ کہا کہ سرور اگر افسانہ نگاری کی طرف رجوع کرے تو اس کا شمار بہترین افسانہ نگاروں میں ہونے لگے، واقعی آپ جو کچھ لکھتے ہیں، خوب لکھتے ہیں۔ حقیقت بیانی آپ کا شیوا ہے آپ کی ذہنیت یا انداز ذہنیت نہیں ہے۔ آپ نے اپنے رسالے کے ذریعے اُردو کی جو خدمت کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ شانِ ہند نے بہت سے گمنام شعراء اور ادیبوں کو پیش کر کے ان کی ہمت افزائی کی ہے اور ان میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا ہے شانِ ہند کا راجستھان نمبر یادگاری دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا اس خصوصی نمبر کو کتابی شکل میں شائع کرنا اُردو کی خدمت نہ ہوگی۔ غالباً راجستھان اکیڈمی بھی دستِ تعاون بڑھائے۔

اپریل، مئی اور جون ۸۰ء کے شماروں میں وجے لکشمی پنڈت کے سوانحِ حیات کی چند جھلکیاں بہ عنوان "انکشافات ہی انکشافات" شاملِ اشاعت تھیں۔ ایسا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ مشہور و معروف تصنیفات کے قابلِ توجہ حصوں کے لئے شانِ ہند میں ایک اور فیچر کا اضافہ کر دیا جائے۔

شانِ ہند جنوری ۸۰ء میں آل انڈیا مشاعرہ برسی حضرت آبر گنوری مرحوم کی رپورٹ جس کو ان کے شاگرد رشید متین بدایونی نے قلم بند کی شامل تھی۔ روئیداد ہذا سے بہت سی یادوں کے نقوش جگمگا اُٹھے۔ کچھ دیر کے لئے تصور نے متین کو میرے سامنے لا کھڑا کر دیا۔ متین بہت اچھا طالبِ علم تھا اور وہ اکثر و بیشتر میرے ہاں آتا رہتا تھا۔ خوش مزاج و اطوار متین اقتصادی پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہوئے بھی ثابت قدمی سے اچھے مستقبل کی طرف گامزن نظر آتا تھا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا اور متین مجھے کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے۔ آج مقام و حیثیت کا حامل ہے۔ آبر صاحب کو متین جیسا شاگرد ملا یہ ان کی خوش نصیبی تھی ورنہ آبر صاحب بحیثیت شاعر جو مقام و مرتبہ رکھتے تھے اس کو آپ بھی جانتے ہیں۔ اور میں بھی۔ غالباً آپ کو یاد ہوگا میرے دو مضامین آبر سے متعلق شانِ ہند میں شائع ہوئے تھے: "آبر کی حب الوطنی"

اور "ابر ابریات" ۔ بہائی مذہب سے مشرف ہونے کے بعد اثر صاحب مرحوم ہوگئے ۔ آپ نے اپنے ایک اداریہ میں مقتول کا بڑا اچھا جائزہ پیش کیا تھا ۔ بقول نیاز فتح پوری اثر اور ناطق گلاوٹھی نے ایک مصرع بھی ایسا نہیں کہا جس کو شاعرانہ خصوصیات کا حامل سمجھا جاسکے ۔ میں ان کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں جس کی وضاحت میرے مذکورہ مضامین سے بھی ملتی ہے ۔ اثر صاحب سے متعلق ایک بات اور یاد آئی ۔ ایک دن چندوسی میں حکیم صدیق احمد صاحب نامی سہسوانی کے مطب میں حضرت اثر جب وہ رامپور سے ایک رسالہ نکالتے تھے اور میرے دوست "کتب در بغل" وارد ہوئے ۔ حکیم صاحب بیّن احمد متین صاحب کے ایک رشتہ دار اور میرے دوست مولانا بنے خان مرحوم مطب میں بیٹھے ادبی امور پر تبادلہ خیالات کررہے تھے ۔ اثر صاحب نے سیماب اکبرآبادی کی ... ح سے متعلق ایک تصنیف پر ایک گھٹیا قسم کی کتاب لکھ ڈالی تھی جس کی کتب فروشی کے لئے وہ چندوسی بھی آئے تھے کئی باتوں پر بحث چل پڑی اور نتیجۃً حضرت کی معرکہ آرا کتاب کی بہتیری خوبیاں "واشگاف طور پر سامنے آنے لگیں ۔ اثر بس ایک معنی میں خوش نصیب تھے ان کے کئی شاگرد خاصے مشہور و معروف ہیں ۔ مگر ان کی شہرت، مقام و مرتبہ میں اثر کا دستِ مبارک نظر نہیں آتا ۔ ان سب کی شہرت ان کی اپنی استعداد سے عبارت ہے ۔ خیر ۔ ع
اپنا اپنی اپنی خیال اپنا اپنا ۔ اقبال، یگانہ چنگیزی، چکبست فراق گورکھپوری ۔ سیماب اکبرآبادی ، علی سردار جعفری وغیرہ کے علاوہ اس دور نے اچھے اور بڑے اردو شاعر پیدا نہیں کئے ۔

یادوں کے ہجوم میں، کہاں سے کہاں پہنچ گیا ۔ شانِ ہند کا گوشۂ عقیل بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے ۔ اگست ۸۰ و شمارے میں انجمن افغان دوستان کے پہلے جلسے کا ذکر ہے ۔ جلسے کی قرار دادیں رجعت پسندانہ ہے ۔ پاکستانی سازش کا رول، چین کی ریشہ دوانیوں ، سی آئی اے نیز بیرٹرو ڈالر پٹور نے والے تخریب کاروں کا سدباب کرنے کے لئے روس کو افغانستان میں مداخلت کرنا پڑا ۔ تخریب کاری کے پسپا ہوتے ہی روسی افواج افغانستان سے ہٹ جائیں گی ۔ افغانستان ہی کیا یولیس کے خلاف یوپی کے کچھ شہروں اور دہلی کے کچھ حصوں میں رونما ہوئے ۔ ... کے پسِ پردہ وہی تخریب کار تھے جو افغانستان میں سرگرم عمل ہیں ۔

شانِ ہند خوب سے خوب تر کی جانب کوشاں رہا ہے امید ہے کہ آپ جلد رو بصحت ہوجائیں گے ۔

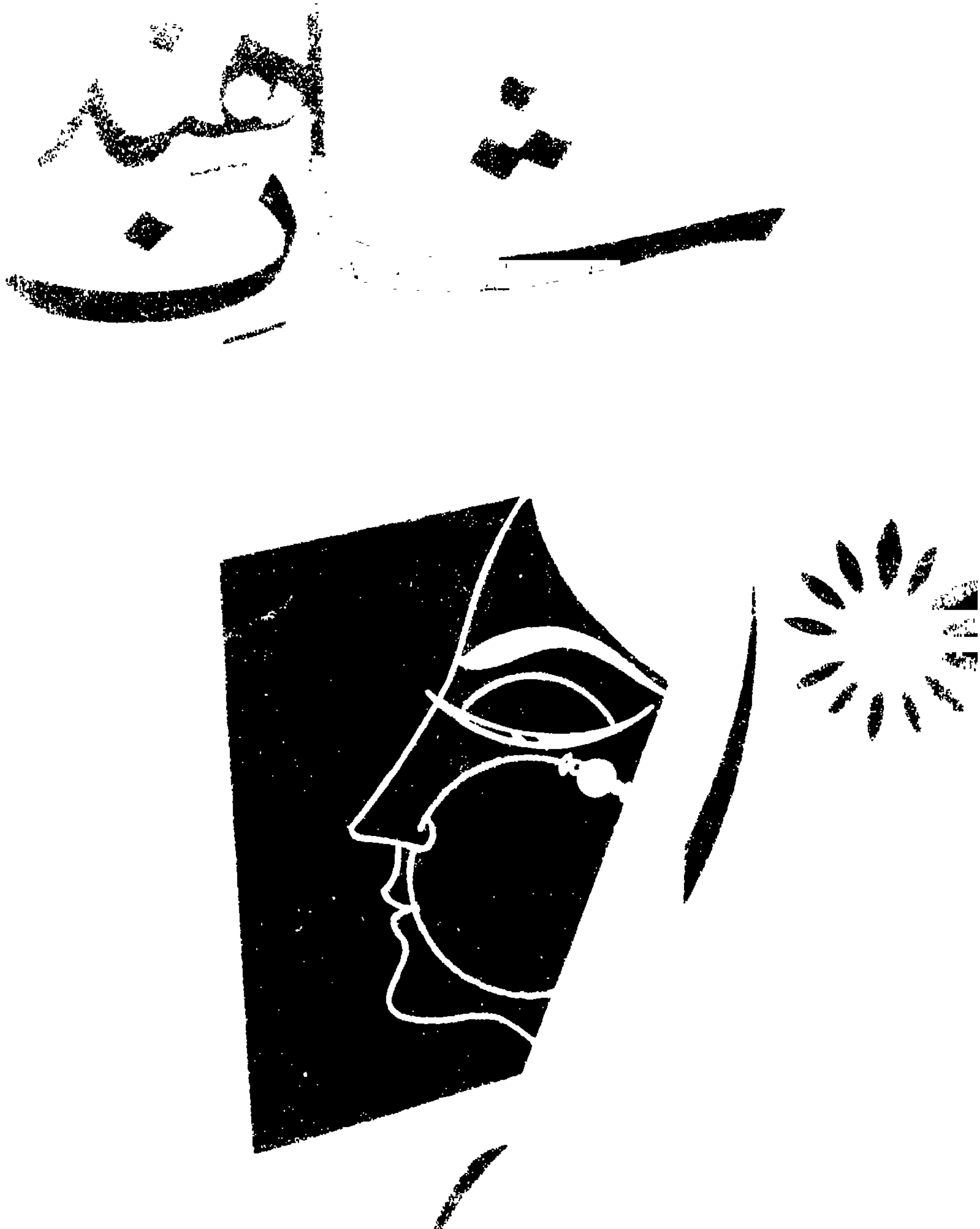
آپ کا ۔ تاراچرن رستوگی

● قابلِ صد تعظیم سرور صاحب ۔ آداب

"شانِ ہند" کے دسمبر کے شمارہ میں آپ کا اداریہ پڑھا شکر گزار ہوں کہ آپ نے انڈو پاک پریم سبھا کے اغراض و مقاصد کی حمایت کی ہے ۔ اور مجھے اپنے فرض کا احساس دلایا ہے آپ کی سرپرستی بھی حاصل ہو جائے اور "شانِ ہند" کے کچھ کالم پریم سبھا کی سرگرمیوں کے لئے وقف کردیئے جائیں تو اس تنظیم کو فعال بنانے میں بڑی مدد ملے گی ۔ ہمارے آس پاس کے ممالک میں جو حالات رونما ہو رہے ہیں ۔ ان کی روشنی میں ہند و پاکستان کے مابین دوستانہ مراسم کو مستحکم بنانے کی اشد ضرورت ہے اور یہ فریضہ اردو والوں سے بہتر اور کوئی انجام نہیں دے سکتا ۔ ہمارے درمیان رشتہ کی سب سے مضبوط کڑی اردو زبان ہے ۔ اور ہندوستانی اور پاکستانی عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کو صرف ہم محسوس کر سکتے ہیں ۔

انڈو پاک پریم سبھا کے قیام کا اعلان جناب جمنا داس اختر نے گزشتہ برس مارچ میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے حیدرآباد اجلاس کے دوران کیا تھا ۔ جناب رضوان احمد ایڈیٹر "عظیم آباد ایکسپریس" کو بہار کے لئے مسٹر کریم رضا مونگیری مدیر "عکاس" کو بنگال کے لئے ، جناب سعید احمد ایڈیٹر روزنامہ "اردو ٹائمز" کو مہاراشٹر کے لئے ، جناب فوق کریمی ایڈیٹر "ترجمان" اور عزیز تجالسوی صاحب مدیر "انکشاف" کو یوپی کے لئے اور ناچیز کو پنجاب ، ہریانہ اور یونین ٹیریٹری چنڈی گڑھ کے لئے کنوینر مقرر کیا گیا تھا ۔ اس کے دو ماہ بعد چنڈی گڑھ میں انڈو پاک پریم سبھا کی پہلی شاخ باقاعدہ طور پر قائم کی گئی اور یہاں پہلا اجلاس پیپسو کے سابق وزیراعلیٰ بابو برش بھان کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں جناب جمنا داس اختر نے حضرت رئیس امروہی

(باقی صفحہ ۲۷ پر)



[illegible] مگر مہاسوں اور گرمی دانوں سے ایسا بھر گیا ہے کہ آئینہ دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی [illegible]
[illegible] خود بخود تو دُور نہیں ہوں گے۔ انہیں دُور کرنے کا آسان اور سہل طریقہ ہے [illegible]
[illegible] کا ایک سپرچہ صبح شام لیا جاتا ہے۔ کریم، لوشن وغیرہ تو صرف اوپر اوپر سے مہاسوں اور گرمی [illegible]
[illegible] میں مگر ختم نہیں کر پاتے۔ اسی لئے ان [illegible] سے آپ کی نازک [illegible]
[illegible] سیر [illegible] کے [illegible] تمام گندگی [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] تمام وجوہات کو دُور کرتی ہے جن سے مہاسے اگر [illegible] اور [illegible]
[illegible] چمکتا دمکتا [illegible] ہے۔ [illegible] سیر کے برابر [illegible]

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷ رجسٹرڈ نمبر ڈی ایل ۱۲۵۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے نیاز مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
(دنیا ناتھ گوالیاری)

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر: سرور تونسوی
(منشی پریم چند ایڈیشن)

زرِ سالانہ ۱۵/ روپیہ
فی پرچہ ۱/۵۰ روپیہ

جلد نمبر ۴۲ مارچ سنہ ۱۹۸۱ء شمارہ نمبر ۳

ہندی کے مسلمان شعراء

۱۔ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد پر ایسی مفید کتاب آج تک نہ تو اُردو میں شائع ہوئی نہ ہندی میں۔

۲۔ اس کتاب کو پڑھنے سے اُردو اور ہندی کے خود ساختہ نام نہاد دانشور جو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اُردو اور ہندی کی بقا و حیات کے ضامن بنے بیٹھے ہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے جو کام سرکار سے ہتھیائے ہوئے لاکھوں روپیہ سے نہ ہو سکا اور جو کام اُردو اور ہندی کے یہ نام نہاد دانشور آج تک نہ کر سکے وہ ایک فردِ واحد نے اپنی لگن کے باعث پورا کر دیا۔

۳۔ اس کتاب نے ہندی مسلمانوں کا سر اونچا کر دیا ہے اور وہ ثبوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی زبان کی نشو و نما اور ترقی میں جو کردار مسلمانوں نے ادا کیا ہے اسے ہندی زبان فراموش نہیں کر سکتی۔ اور ہندی مسلمان اس سلسلے میں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے کوسوں آگے دکھائی دیتے ہیں۔

۴۔ اس کتاب کو پڑھنے والا ہر ہندی داں لیکھک کا گن گان کرے گا اور ہر اُردو داں مصنف کو دعائیں دے گا کہ جس نے اُردو ادب کو ایسی بیش بہا تصنیف سے مالا مال کر دیا۔

۵۔ ترقی اُردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اُردو اکادمی، انجمن ترقی اردو ہند اور ریاستی اُردو اکادمیوں کے ذمہ دار ارکان میں شاید غیرت کا جذبہ اپنا اثر دکھانے لگیں۔ اور وہ ندامت محسوس کریں کہ انھوں نے سرکار کا عوامی کروڑ ہا روپیہ اُردو کی اکثر غیر مفید اور غیر ضروری کتابیں شائع کر کے محض اپنوں کو فائدہ پہنچایا اور ہندی کے مسلمان شعراء ایسی بیش بہا اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار تصنیف کو شائع کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

۶۔ آپ ہمارے اس دعوے کی صداقت کی جانچ کے لئے یہ کتاب پڑھئے اگر آپ ہماری اس تحریر کا حرف بحرف تائید نہ فرمائیں تو کتاب واپس کر کے اس کی پوری قیمت لے لیجئے۔ حضرت رتن پنڈوری نے اپنی زندگی کے عزیز ترین پچاس سال (۵۰) اس کتاب کی تالیف پر صرف کئے اور اپنی زندگی بھر کا سرمایہ اس کتاب کے لئے مواد فراہم کرنے پر لگا دیا اور اس کتاب کو ہر پہلو سے مستند بنانے کے لئے فاضل مؤلف نے ہزارہا کتابوں کا مطالعہ کرنے میں اپنی آنکھوں کو قربان کر دیا۔ یہ نادر روزگار کتاب ہندی کے مسلمان شعراء شائع ہوئی ہے۔ پہلی فرصت میں منگائیے۔

قیمت ۱۵/ روپے۔ مزید معلومات کیلئے۔ دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے رجوع کیجئے۔

دوبالا پرکاش سرور تونسوی پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی اور سرورق [illegible] میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ شانِ ہند انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ صبا چہ کرد؟

ذلیل الرحمن

آکاش وانی اور دور درشن کے اکثر پروگراموں میں بعض اناؤنسرز اور پروگراموں میں حصہ لینے والے اکثر اصحاب ہندی اور اردو تلفظ بعض اوقات اس قدر مضحکہ خیز ہوتا ہے نہ دل چاہتا ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو سنا اور دیکھا ہی نہ جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریڈیو سے بعض اوقات اچھے پروگرام سنوائے جاتے ہیں۔ اور دور درشن بھی اپنی کارکردگی کے اچھے نمونے پیش کرتا ہے۔ مگر جب کوئی اناؤنسر یا پروگرام میں حصہ لینے والا الفاظ کا تلفظ نہ صرف بگاڑتا ہے بلکہ اسے مضحکہ خیز بھی بنا دیتا ہے تو ان دونوں عوامی پسند محکموں کے کارکنان کی غیر ذمہ داری ابھرتی ہے۔ دو چار دن ہوئے کہ پارلیمانی امور کے وزیر جناب بھشیم نارائن سنگھ کو ٹی وی پر خبروں کے دوران کسی اہم موضوع پر کچھ بولتے ہوئے دکھایا گیا انہوں نے قریباً چار منٹ تک کچھ کہا مگر حرام ہے کہ صرف دو الفاظ آسا (آشا) اور دسک (دیا) کے سوا ان کا ایک لفظ بھی سننے والوں کی سمجھ میں آیا ہو۔ وہ ایسی زبان میں بول رہے تھے کہ جو ان کے خیال میں ہندی ہوگی مگر سننے والوں کے لئے وہ ایسے ملک کی بھاشا معلوم ... ہوتی تھی جہاں ذی ہوش اور سلیم الطبع انسان نہ بستے ہوں۔

مگر انتہائی مضحکہ خیز عالم اس وقت دیکھنے میں آیا جب دسندر سما چار میں ایک معزز خاتون سنا رہی تھیں۔ تو انہوں نے سہ پارلیمانی بحث میں حصہ لینے والوں کے نام گنواتے ہوئے ایک معزز ممبر پارلیمنٹ کا نام ذلیل الرحمن پڑھا۔ دیکھا آپ نے ہندی کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ کہ "جلیل" کو ذلیل بنا کر رکھ دیا گیا (جناب جلیل الرحمن ممبر پارلیمنٹ سے معافی کے ساتھ)

اتفاق ہوگیا اگر دور درشن کی تین لیڈی اناؤنسرز شریمتی پوری۔ محترمہ سلمیٰ سلطان اور شریمتی گیتا سری واستو کے صحیح تلفظ ادا کرنے کا ذکر نہ کیا جائے۔

پٹنہ میں اردو جرنلزم پر سیمینار

"پہلے اخبارات میں چھپی ہوئی کی یہ خبر پڑھئے۔

"پٹنہ ۱۱ مارچ۔ ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے سرکردہ اردو ایڈیٹروں اور جرنلسٹوں نے کل قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ میل پیدا کرنے میں اردو پریس کے رول پر تبادلۂ خیال کیا۔ یہ لوگ یہاں بہار اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام اردو جرنلزم کے موضوع پر ایک سیمینار میں حصہ لے رہے تھے۔ عظیم آباد ایکسپریس کے ایڈیٹر ان چیف شری رضوان احمد نے کہا کہ اردو کے بیشتر اخبارات کا معیار گھٹیا ہے اور ان کی اشاعت باقاعدہ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ گزشتہ ہفتہ پارلیمنٹ میں پیش کی گئی رجسٹرار آف نیوز پیپرز کی رپورٹ براستہ ... گمراہ کن ہے اور حقیقت کی ترجمانی نہیں کرتی۔"

عظیم آباد ایکسپریس کے ایڈیٹر انچیف شری رضوان احمد کا فرمان سو فیصد صحیح اور ایماندارانہ ہے مگر کیا وہ خود اپنے آپ کو ان الزامات سے بری سمجھتے ہیں جن کا ذکر انہوں نے اپنے نا محمود فرمان میں کیا ہے؟

۱۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ہے کہ انہوں نے اپنے اخبار کی اشاعت بڑھانے کے لئے منشی پریم چند کے خلاف نااہل اور مفسدہ پرداز جنونی قسم کے فرقہ پرست (جو سیکولرازم کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں) لکھنے والوں کی خرافات اور بکواسیات کو اپنے اخبار کا طرۂ امتیاز بنا رکھا ہے۔

۲۔ کیا وہ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ انہوں نے خواجہ احمد عباس جیسے ناکام کوششیں میں جو "میر انعوذ" فیچر شروع کیا ہے وہ ان کے اندرونی مسلم لیگی اور فرقہ پرست ہونے کا منہ بولتا اشتہار نہیں ہے؟

۳۔ کیا وہ ایمان سے کہہ سکتے ہیں کہ فسادات علی گڑھ۔ سنبھل اور

مراد آباد وغیرہ میں ہندوؤں کا قتل یا مالی نقصان نہیں ہوا ؟ اور انہوں نے اپنے اخبار کے سینکڑوں صفحات مسلمانوں کے قتل اور مالی نقصان کے افسوس میں مگرمچھ کے آنسو بہا بہا کر اپنا بیلنس برقرار رکھنے کی کوشش نہیں کی ۔ ؟ اور کیا انہوں نے اپنے اخبار میں ایک سطر میں بھی کسی غیر مسلم کے قتل اور مالی نقصان پر اظہار افسوس کیا ۔ ؟

۴۔ رہبرانِ آف نیوز پیپرز کی رپورٹ گمراہ کن اور حقیقت سے دور تو ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ جب خود را میاں فضیحت دیگرے را نصیحت کے مصداق خود عظیم آباد ایکسپریس کی تعداد اشاعت بتانے میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے ۔ مندرجہ بالا حقائق سے عظیم آباد ایکسپریس کے ایڈیٹر انچیف کو اعتراف کرنا چاہئے کہ اُن کا خود اپنا اور ان کے اخبار کا معیار گھٹیا ہی نہیں افسوسناک بھی ہے ۔ اور رہبرانِ آف نیوز پیپرز کی رپورٹ کو گمراہ کن اور حقیقت سے دور رکھنے میں خود ان کا بھی مجرمانہ حصہ ہے ۔

کیا پاکستان ایک خود مختار اور آزاد مُلک نہیں ؟

اگر حکومتِ ہند ملک کے دفاع کے سلسلے میں جنگی ہتھیار کسی دوسرے مُلک سے خریدے ؟ تو کیا آپ یہ تسلیم کر لیں گے کوئی دوسرا ملک ہمیں اپنی حفاظت کی کوششوں سے باز رہنے کی تلقین کرے یا ان ممالک کے سربراہوں سے درخواست کرے یا ان پر دباؤ ڈالے کہ ہندوستان کو جنگی ہتھیار نہ دیئے جائیں ۔ ؟ یقیناً اور سو فی صد یقیناً آپ یہی کہیں گے کہ یہ ہمارے اندرونی معاملات میں دخل اندازی ہے ۔ اور ہمیں ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے یہ اختیار ہے کہ ہم اپنے ملک کے دفاع کے لئے ہر ممکن کوشش کریں ۔

تو پھر اگر پاکستان اپنے دفاع کے لئے (جبکہ روس افغانستان پر دستک دے رہا ہے) امریکہ یا کسی دوسرے ملک سے جنگی مہلک ہتھیار فراہم کر رہا ہے تو کسی دوسرے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اس کے اس اقدام پر کوئی اعتراض کرے یا اس کوشش کو غیر مناسب قرار دے جبکہ پاکستان بھی ایک خود مختار اور آزاد ملک ہے ۔ رہا یہ کہ پاکستان ان مہلک جنگی ہتھیاروں کو ہندوستان کے خلاف استعمال کرے گا تو اس کا علاج واویلا نہیں ہے بلکہ اس کا مناسب علاج اور اصل حل یہ ہے کہ ہم اپنے دفاع کو مضبوط اور بہتر بنائیں کہ پاکستان یا کسی دوسرے کو ہم پر حملہ آور ہونے کی جرأت ہی نہ ہو سکے ۔

قومی ۔ بین الاقوامی ۔ ذاتی اور سیاسی پیش گوئیاں

پنڈت رام لکھن مشرا اٹن کشن گنج (پورنیہ) (بہار) بین الاقوامی ذاتی اور سیاسی پیش گوئیاں کرنے میں یا بنی ز رکھتے ۔ اس سے پہلے اُن کی پیش گوئیاں شانِ ہند میں شائع ہو چکی ہیں ۔ وہ اکثر و بیشتر صحیح ثابت ہوئی ہیں ۔ حال ہی میں اُنہوں نے ۲۴ر مارچ ۱۹۸۱ء کو بہت سی پیش گوئیاں کی ہیں اُن میں سے بطور نمونہ چند پیش گوئیاں شائع کی جا رہی ہیں ۔ باقی پیش گوئیاں کچھ مجبوریوں کے تحت شائع نہ ہو سکیں ۔

۱۔ [illegible] ، کرناٹک ، گجرات ، بنگال ، تامل ناڈو اور کشمیر کے وزرائے اعلیٰ کے اختیارات میں فوری تبدیلی ہو گی ۔

۲۔ اگست تا نومبر مرکزی وزارت کے ڈھانچے اور ساخت میں تبدیلی ہو گی ۔ شریمتی راجیندر کماری باجپائی اور شری پہاڑیا مرکزی منڈل میں حلف اٹھائیں گے ۔

۳۔ روس اور امریکہ کے درمیان ، ۲ر جولائی ۱۹۸۱ء سے ۱۰ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کشیدگی پیدا ہو جائے گی ۔

۴۔ امریکہ ایران سے انتقام لے گا ۔

۵۔ لوک دل اور جنتا (ایس) دونوں پارٹیوں کا خاتمہ یقینی ہے ۔

۶۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۸۲ء کو عبوری انتخاب کی تکمیل لازمی ہے ۔

۷۔ فلمی دُنیا کے دو مشہور فن کار ، ۷ر جولائی سے ۲ر دسمبر ۱۹۸۱ء تک آنکھ سے اوجھل ہو جائیں گے ۔

۸۔ ۲۱ر جون سے ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء تک طوفان ، زلزلے ، قحط سالی ، ہوائی جہاز کے حادثے ۔ مُلک کے جنوبی مشرقی ریاستوں میں آسمانی بلا اور شمالی مغربی علاقوں میں خود ساختہ بدسلوکیاں متوقع ہیں ۔

۹۔ شری للت وجے سنگھ ڈی آئی جی [illegible] میں بے قصور ثابت ۔

۱۰۔ شری کملاپتی ترپاٹھی کو ۲۷ر جولائی ۱۹۸۱ء تک نیا عہدہ حاصل ہو گا ۔

۱۱۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۱ء سے پہلے ہندوستان کا جھنڈا دو بار جھکایا جائے گا ۔

۱۲۔ مغربی ممالک اور ایشیائی ممالک میں آتش جنگ بھڑک اٹھے گی ۔

۱۳۔ شری یشونت راؤ ۔ بہوگنا ۔ اور آل بہاری باجپئی سیاست میں اہم کردار ادا کریں گے ۔ اگر کوئی صاحب ذاتی طور پر مشرا جی سے خط و کتابت کرنا چا

कुछ मेरे सुनहरे सपने...



पी. एस. बी. के साथ पूरे होते हैं

मेरे बेटे के उज्ज्वल भविष्य के सपने ।
लेकिन ये सिर्फ सपने ही नहीं । आने वाले कल के लिये हमें कुछ बचाना चाहिये इसलिये हमने पी० एस० बी० के नव निधी स्कीम में 37,243-06 रुपये जमा कर दिये है और हमें 120 महीने में एक लाख रुपये मिलेंगे । हमारी बचत हमारे बच्चे के साथ बढ़ेगी ।
पी० एस० बी० के संग ।

ASP/PSB/302-00A

पी एस बी ... प्रतीक

पंजाब एण्ड सिन्ध बैंक

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کے چھوٹے کنور زادے کی شادی خانہ آبادی اپنے انداز کی ایک بے مثال شادی تھی۔ کنات سرکس کے نزدیک ہی ایک کوٹھی مستقلاً تقریبات کے لئے عارضیتاً حاصل کی گئی جس میں سات دن تک شادی کا وہ جشن رہا کہ پھر ایسا شاہانہ جشن کسی اور شادی میں دیکھنے میں نہ آیا۔

برات چڑھنے سے قبل ایک رات دعوتِ عام تھی حضرتِ عالیجاں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور جنرل، وزراء، سفراء کے علاوہ ہزاروں امرا اعلیٰ حکام کے ساتھ ساتھ پہلوانوں، مرغ لڑانے والوں، بٹیر لڑانے والوں، پتنگ بازوں، موسیقاروں، قوالوں، شعرائے کرام اور فلمی اداکاروں کا ایک ایسا ہجوم غفیر تھا کہ پھر کسی دوسری شادی میں ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز کا ایسا منہ بولتا منظر دیکھنے میں نہ آیا۔ شراب نوشی کا یہ عالم تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایسے محترم چند انگلیوں پر گنے جانے والے حضرات کے علاوہ ہر کوئی اپنی پیاس بجھا رہا تھا۔ تقریباً ایک صد بیرے خوبصورت TRAYS میں قرینے سے رکھے ہوئے وسکی کے گلاس اور سوڈے کی بوتلیں لئے بھاگے پھر رہے تھے۔ اور یار لوگ تھے کہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ شاید پھر ایسی محفل نصیب ہو کہ نہ ہو۔ یا زندہ رہیں یا نہ آج تو وسکی کی حسرت پوری کر ہی جائیے۔ مرحوم سلام مچھلی شہری، عزیز وارثی اور کئی دوسرے شعرائے کرام ٹرے میں رکھے چار پانچ گلاسوں کی وسکی اپنے اپنے گلاسوں میں انڈیل لیتے تو بیرے چپ چاپ بیدوں سے یوں دیکھتے کہ کیا ایسے بلانوش بھی اس دنیا میں رہتے ہیں۔

مرحوم ملہوترہ صاحب ثاقبؔ رتلامی بھی مدعوئین میں سے تھے اور ساتوں دن وہ میرے ہی ساتھ اس جشن میں شریک ہوتے رہے۔ اس جشن میں ہم دونوں نے شراب تو بہت کم پی مگر یار لوگوں کی حرکات کا نظارہ خوب خوب کیا۔ ایک شاعر تھا ادیب نہ معلوم گھر سے ہی کوٹ کی اندرونی جیب میں خالی چپٹا ادھا لے کر آئے تھے یا کسی بیرے سے حاصل کیا جو بھی کوئی بیرا ٹرے میں وسکی کے گلاس لاتا تو وہ جھٹ دو تین گلاسوں کی وسکی اپنے گلاس میں انڈیل لیتے مگر سوڈا نہ ڈلواتے اور یہ کہتے کہ میں نیٹ (بغیر سوڈا یا پانی ملائے) ہی پیتا ہوں۔ اور نظر بچا کر ادھا کوٹ کی جیب سے نکالیں اور وسکی کا اکثر حصہ اس میں ڈال کر پھر جیب میں رکھ لیں اور ایک آدھ گھونٹ پی کر پھر کچھ دیر رہ کر کھڑے ہو جاتے تاکہ کسی دوسرے بیرے کی ٹرے پر شب خون مار سکیں۔ یہ صاحب اب بھی ایک روزنامے میں کام کرتے ہیں مگر انہوں نے مجھے قسم دے رکھی ہے کہ ان کا نام ظاہر نہ کیا جائے آپ کو بھی قسم ہے کہ ان کا نام دریافت کرنے کی ضد نہ کیجئے گا۔

حضرت جوشؔ ملیح آبادی معہ اپنے برادرِ خورد جناب رئیس احمد خاں اور کئی لبستہ برداروں کے ساتھ تشریف لائے۔ ظاہر ہے کہ حضرتِ جوشؔ کو تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (ان دنوں آپ نائب صدر جمہوریہ ہند تھے) ایسے سرکردہ حضرات کی صف میں جگہ ملی اور ان کے بھائی اور دیگر حضرات جن کے جہاں سینگ سما سکے وہیں احباب میں گھل مل کر شراب کی پیاس بجھانے لگے۔ جناب جوشؔ اور ان کے بھائی شراب کے معاملے میں اگر اپنی زرِ خرید ہو تو انتہائی کنجوس تھے اور گھڑی رکھ کر مقررہ مقدار میں پیتے تھے اور اگر مفت کی ہو تو دونوں بھائی بڑے فراخ دلی کا مظاہرہ فرماتے اور گھڑی کیا بقول مجازؔ مرحوم گھوڑا سا منے رکھ کر پینے میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ یہ محض پروپیگنڈا ہے کہ جوشؔ صاحب ایک گھنٹے میں صرف چار پیگ ہی پیتے تھے مگر میں نے خود اور دہلی کے کئی احباب نے بچشمِ خود دیکھا ہے کہ اکثر مشاعروں اور پارٹیوں میں وہ آٹھ آٹھ پیگ تک پی گئے۔ رئیس احمد خاں شراب نوشی کے سلسلے میں پیچھے رہنے والے نہیں تھے مگر اس دعوتِ عام میں انہوں نے جس کثرت

اور بیئر سے پیگ نشہ اُنہوں نے تیز رفتاری سے مرغ و ماہی سے بھی لطف فرمایا۔ نتیجتاً ان کے ایک طرف جاکر گلی کی نالی اور سوڈے سے کلا کرکے پھر پینے لگ گئے۔ عزیز وارثی تو خیر ہر بار مفت کی شراب پینے کے بعد اُلٹی کرتے ہی ہیں۔ مگر اس دعوتِ عام میں تو انہوں نے کئی بار اُلٹی کی اور ہر اُلٹی کے بعد پہلے سے زیادہ شراب پی۔

ایک صاحبہ جو دہلی کے ادبی حلقوں میں ان دنوں شباب شعر اور شراب کی تثلیث سمجھی جاتی تھیں۔ اس دعوتِ عام میں پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہوکر تشریف لائیں۔ ملہوترہ صاحب بلکے حسن پرست اور حسن شناس بھی فرماتے گئے۔ یار سرور یہ آفتِ جان کون ہے۔ میں نے تعارف کرایا۔ تو ملہوترہ صاحب نے جھٹ سے اپنی قیام گاہ ہوٹل نرولا میں دوسرے دن دوپہر کے کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ چونکہ دوسرے دن رات کا کھانا نوراتوں کے ساتھ دولہن والوں کے ہاں تھا۔ میں کچھ وقت تک جناب وی۔ شنکر صاحب سے بات چیت میں مصروف رہا۔ چند منٹ کے بعد جناب وی شنکر سے اجازت لے کر واپس لوٹا تو ملہوترہ اور ان صاحبہ کو غائب پایا۔ ہزاروں کا مجمع۔ طویل و عریض کوٹھی کا لمبا چوڑا لان قریباً نصف گھنٹہ تک تلاش کرنے پر بھی ان دونوں کا پتہ نہ چلا تو میں دوسرے دوستوں کے ساتھ محمد رفیع کے گیت سنتا رہا۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ یہ دونوں متوالے دوسرے دن کا انتظار کئے بغیر اسی وقت نرولا ہوٹل چلے گئے تھے۔

آخر کچھ فاقہ مزدوریاں بھی تو ہوتی ہیں انسان کی۔ ایک دوسرے شاعر اور ادیب جو کچھ عرصہ فلمی شاعر بھی رہے ہیں کا یہ واقعہ تو دلی بلکہ بمبئی کے اکثر شعرا اور ادیبوں میں ایک عرصہ تک موضوعِ سخن رہا تھا کہ انہوں نے اشوکا ہوٹل کی ایک پارٹی میں ایک فلمی مہمان کے کمرے کے غسل خانے کی نالی کی جالی چوری کر لی تھی تاکہ وہ اپنے زیرِ تعمیر مکان کے غسل خانے کی نالی پر لگوا سکیں۔ یہ جالی چور حضرت بھی اس دعوتِ عام میں تشریف فرما تھے جس قدر بہتر شراب پی رہے تھے اتنے ہی اچھے اشعار بھی سنا رہے (اپنے نہیں) ایک فلمی اداکار مرحوم کے سرونٹ صاحب پارٹی کے بعد ان حضرت کی تلاشی لینے کے لئے بیروں سے ضرور کہہ دیں گے

وگرنہ کم از کم ایک درجن چمچوں کی خیر نہیں ہے آخر ان صاحب کو اپنے تعمیر ہونے والے مکان کے لئے چمچوں کی بھی ضرورت ہوگی یہی اس پر ایک طویل قہقہہ لگا مگر یہ صاحب شراب کی کیتلی ختم کرنے پینے میں مصروف رہے۔

محمد رفیع (مرحوم) اپنے کمال کا مظاہرہ کر رہے تھے بہنے والا شراب اور مرغ و ماہی کی کمی نہیں تھی میں جماعت کا کھانا مفت کی شراب میں ویسے بھی مستی زیادہ ہوتی ہے اس پر رفیع کی مسحور کن آواز۔ لہٰذا موسیقی کی یہ محفل ایسی رہی کہ میں نے پھر کبھی رفیع صاحب کو ایسی مستی میں گاتے ہوئے نہیں سُنا۔ یار لوگ مستی کے اس عالم میں کچھ پیتے کی باتیں بھی کہہ جاتے تو تکلف دو بالا ہو جاتا۔ دہلی کے ایک نئی پیسہ کے مالک ایڈیٹر جو ان دنوں صحافت کے لفظی معنوں سے بھی نا آشنا تھے کہنے لگے رفیع ہے تو نائی بچہ نہ معلوم اس کی تان میں ربڑ کی سی لچک کہاں سے آجاتی ہے۔ رفیع صاحب کے انتقال پر ان صاحب نے بھی اپنے رسالے کا "رفیع نمبر" شائع کیا ہے۔ وہی نائی بچہ مرنے کے بعد بھی اس نا اہل کے لئے خاصی آمدنی کا انتظام کر گیا۔ نہ معلوم شراب پینے کے بعد اکثر پینے والے بعض اوقات کیوں بھول جاتے ہیں۔ چلتے چلتے اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی سُن لیجئے۔ شادی میں شریک ہونے والے سیکڑوں حضرات جب تنبول اور شگن کے طور پر نقد روپیہ کنور صاحب کو پیش کرنے لگے تو کنور صاحب نے کچھ احباب کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ شگن دینے والوں کے نام اور روپیہ کی مقدار لکھتے جائیں۔ کنور صاحب روا روی میں ایک شاعر کو بھی اس خوشگوار اور مفید ڈیوٹی پر تعینات کر گئے۔ کنور صاحب کو روپیہ پیسہ کے معاملے میں ولیسے ہی بہت کم یاد رہتا ہے اور شادی کے اس ہنگامے میں تو انہیں یہ کہاں یاد رہتا کہ انہوں نے کس کس صاحب کی ڈیوٹی تنبول یا شگن کا روپیہ وصول کرنے اور اس کی تفصیل لکھنے پر لگائی ہے۔ اس ڈیوٹی پر فائز باقی سب ذمہ دار احباب نے اپنا فرض ایمانداری سے نبھایا مگر شاعر صاحب شگن دینے والوں کے ناموں کی تفصیل معہ روپیہ جیب میں ڈال چپکے سے چلتے بنے۔ یہ راز کی بات ہم دو چار دوستوں کو ہی معلوم ہے۔

[illegible]

اس پر بھی آپ کو شکوہ ہے کہ سرکار تو سو کہنے شاعروں کو [illegible]

ہوشیار! موذی ملیریا گھات میں ہے

کیا آپ کے کنبے میں کسی کو بخار ہے؟ اسے نظر انداز نہ کیجئے۔ ممکن ہے یہ ملیریا ہو۔ جو صحت مند شخص پر اچانک حملہ کرتا ہے اور اسے نڈھال کر کے رکھ دیتا ہے۔ نیز یہ پیچیدگیاں بھی پیدا کر دیتا ہے اور اگر یہ بڑھ جائے تو پورے گاؤں، شہر یا علاقہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

علامتیں:

ملیریا کی علامتیں ہیں:

- اچانک لرزے اور کپکپی کے ساتھ تیز بخار چڑھ جاتا ہے اور عام طور پر یہ حالت چند گھنٹوں تک جاری رہتی ہے۔
- جسم پھٹکنے لگتا ہے اور سر میں شدید درد ہوتا ہے۔
- آخر میں بہت زیادہ پسینہ آ کر حرارت کم ہو جاتی ہے اور مریض بہتر محسوس کرتا ہے۔

علاج:

بخار کے ہر کیس میں فوراً خون کی جانچ کروائیے اور اس کے بعد کلوروکوئین کی مقررہ مقدار کے ساتھ ابتدائی علاج کروائیے۔ اگر خون کی جانچ سے ملیریا کی تصدیق ہو تو پانچ یوم تک باقاعدہ ملیریا دافع ادویات سے علاج کرائیے۔

بہت تیز بخار، بے ہوشی یا ہذیان کی حالت طاری ہونے کی صورت میں مریض کو نزدیکی پرائمری ہیلتھ سنٹر، ڈسپنسری یا ہسپتال لے جائیے جہاں ہر ایک کو طبی مشورہ اور علاج مفت دستیاب ہوتا ہے۔





ملیریا سے بچاؤ کے لئے

- اپنے گھر میں یا آس پاس گندہ پانی جمع نہ ہونے دیجئے۔ اس سے مچھر پیدا ہوتے ہیں جو کہ ملیریا کی جڑ ہیں۔ اگر ایسا ناگزیر ہو تو پانی کی سطح پر مٹی کا تیل چھڑکئے۔
- گاہے بگاہے کیڑے مارنے والی دواؤں کا چھڑکاؤ کرنے والی ٹیموں کی امداد کیجئے اور دوسروں سے بھی امداد کرنے کے لئے کہئے۔
- دھیان رکھئے کہ آپ کے گھر میں اچھی طرح مچھر کش چھڑکاؤ ہو جائے۔ باورچی خانہ، عبادت گاہ، اسٹور اور مویشی خانہ میں بھی چھڑکاؤ ضرور کروائیے۔
- چھڑکاؤ کے دوران کھانے پینے کی چیزوں اور مویشیوں کا چارہ ڈھانپ کر رکھئے۔

انسان اور مچھر کا تسلسل توڑ دیجئے

انسداد ملیریا کا قومی پروگرام
(وزارت صحت و خاندانی بہبود)
22، شام ناتھ مارگ، دہلی 110054

davp 88/28

अफगानिस्तान मैत्री संघ انجمن افغان دوستاں

FRIENDS OF AFGHANISTAN ASSOCIATION

بمبئی چلو

بتاریخ 3 مئی ۱۹۸۰ء، بمقام مستان ٹینک، بمبئی

برادرانِ وطن

افغانستان میں روسی فوجوں کے داخلے سے اس برصغیر کے لئے تاریخ کا شدید ترین خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ روس کی بھارت پر بری نظریں ایک مدت سے رہی ہیں۔ اور افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد نے ہندوستان کے لئے بھی خطرے کی گھنٹی بجادی ہے۔ آج افغانستان کل پاکستان اور پھر ہندوستان اس کے ناپاک ارادوں کا شکار ہوسکتا ہے۔

لہذا روس کے ان ناپاک ارادوں کو ناکام کرنے کیلئے دیش کی جنتا کو بیدار ہونے کی ضرورت ہے اس مقصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بمبئی میں انجمن افغان دوستاں کی طرف سے ایک عظیم قومی اجتماع منعقد ہورہا ہے۔

اس اجتماع میں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ صاحب وزیرِ اعلیٰ جموں و کشمیر، جناب اٹل بہاری باجپئی صدر بھارتیہ جنتا پارٹی، جناب رام جیٹھ ملانی ممبر پارلیمنٹ، جناب سکندر بخت، جناب جے۔ پی۔ ماتھر ایم۔ پی، جناب آچاریہ دھرمیندر ناتھ، جناب عارف بیگ وغیرہ وغیرہ حضرات ملک کے عوام کو اس ضمن میں ایک نئی راہ دکھائیں گے۔

آپ سے التماس ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں بمبئی تشریف لائیں اور اپنے نیتاؤں کا پیغام سنیں اور اسے گھر گھر پہنچائیں۔ فقط:

مہیش جیٹھ ملانی۔ چیئرمین مہاراشٹر پردیش

انجمن افغان دوستاں

گوشۂ عقیل صدیقی

آل انڈیا مشاعرہ کٹیسرہ

کریمی الاحسانی

مشاعرہ کی یہ روداد لکھنے میں کریمی صاحب کو نہ معلوم کس قدر وقت صرف کرنا پڑا ہوگا مگر اس کی نوک پلک سنوارنے میں مجھے دس گھنٹے ضائع کرنے پڑے۔ کریمی صاحب کو مشاعروں کی روداد قلم بند کرتے چوتھائی صدی سے زائد عرصہ ہوگیا مگر افسوس کہ وہ اُس اندازِ نگارش کو اختیار کرنے سے قاصر رہے جو کہ مشاعروں کی رُوداد کے لئے مخصوص ہے۔ کریمی صاحب کو چاہیئے کہ وہ مجو نیاز مند اور جناب شمس کنول ایڈیٹر فن کی تحریر کردہ مشاعروں کی کارروائی بغور مطالعہ کریں تاکہ انہیں علم ہوسکے کہ اس قسم کی کارروائیوں کو لکھتے وقت کانوں سُنے اور آنکھوں دیکھے واقعات کو ہی قلم بند کرنا چاہیئے اور ذاتی رائے کو محفوظ رکھنا چاہیئے۔ دوسرے شعراء کی بے جا تعریف اور غیر شناسا شعراء سے خدا واسطے کا بیر رُوداد کی دلچسپی اور حقیقت حال کو ختم کردیتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کئی باتوں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شاعر کا مصرع خارج از بحر ہے یا کسی شعر میں فنی سُقم ہے تو رُوداد لکھنے والے کو اپنی علمی استعداد کا سکہ بٹھانے کی کوشش یوں نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ خود اُس فنی سُقم کی نشان دہی کرے بلکہ دوسروں کی زبان سے ایسے فنی اسقام کو روشنی میں لایا جاتا ہے۔

اس وقت ملک بھر سے کوئی پچیس مشاعروں کا آنکھوں دیکھا کانوں سُنا حال مختلف حضرات نے برائے اشاعت بھجوایا ہے مگر انتہائی معذرت کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے ایک بھی رُوداد ایسی نہیں ہے جو قابل اشاعت ہو۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ایڈیٹر شانِ ہند ان شعری داستانوں کو خود قلم بند کردے مگر میری صحت اس بار کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ (سرور تونسوی)

کٹیسرہ مظفر نگر اور دیوبند سے تقریباً دس کلومیٹر دوری پر واقع ہے نہایت ہی پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ گاؤں ہے یہاں جانے کے لئے مظفر نگر سے بسیں ملتی ہیں اور شاید دیوبند سے شام کے وقت تانگے ملتے ہیں یہ تو ہے اس گاؤں کا مختصر جغرافیہ۔ یہاں کی آبادی سو فیصدی کاشتکاروں پر مشتمل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں کے باشندے تعلیمی میدان میں بڑے شہروں یا قصبات سے پیچھے ہیں یہاں کے نوجوان علم و ادب شعر و شاعری اور سیاست و حکمت ایسے فنونِ لطیفہ سے پوری طرح واقف ہیں۔ آج یکم نومبر ۸۰ء کی شب میں ۹½ بجے گاؤں کے ایک جانب سردار سنگھ کے کارخانہ میں یہ محفل شعر و سخن منعقد ہو رہی ہے چونکہ بجلی کا کوئی اعتبار ہے نہ بھروسہ کب آئے اور کب چلی جائے لہٰذا منتظمین مشاعرہ نے ایک جنریٹر کا انتظام بھی کر دیا ہے جس کی وجہ سے پنڈال بقعۂ نور بنا ہوا ہے پر ایک بینر لگ رہا ہے جس پر جلی حروف میں لکھا ہے:

آل انڈیا مشاعرہ، کٹیسر ضلع مظفر نگر

پنڈال مخلصانِ اردو، شائقینِ مشاعرہ، فدایانِ شعر اور ہمدردانِ انسانیت دوستوں، بزرگوں، عورتوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے گویا جائے تنگ است مردماں بسیار کا منظر ہے سامعین میں خالص دیہاتی خلوص سادگی اور پیار نمایاں طور پر جھلک رہا ہے ان میں اکثریت ایسے حضرات کی ہے جو زندگی میں آج پہلی بار مشاعرہ سُن اور دیکھ رہے ہیں نہ جانے عورتیں مشاعرہ کو کیا سمجھ رہی ہوں گی جو پنڈال سے باہر بھی کھڑی ہیں پنڈال میں وہ شور و غل اور ہلڑ بازی نہیں ہے جو شہروں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ عرصہ سے کہ اب حاضرین بڑی بے چینی سے مشاعرہ کے شروع ہونے کا انتظار کر رہے ہیں چونکہ بڑی دیر سے آئے ہوئے دیہاتی اب بیزار ہو کر اُٹھنے کے منتظر ہیں لیجئے ڈاکٹر رام ناتھ پریمی اس طرح دیہاتیوں کو بہلا رہے ہیں:-

آپ لوگوں نے اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں جو تعاون دیا

ہم سب اس کے لئے شکر گذار ہیں ۔ اس علاقہ میں یہ مشاعرہ
پہلی بار منعقد کیا جا رہا ہے ۔ توصیف دیوبندی صاحب اس مشاعرہ
کی نظامت فرمائیں گے تھوڑی دیر میں ہی ڈی ۔ ایم صاحب
مظفر نگر بھی تشریف لانے والے ہیں اب توصیف صاحب وقار
انداز سے فرما رہے ہیں ۔

ہم سب کے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ اس بستی میں آج پہلی
بار آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہو رہا ۔ یہاں کے نوجوانوں کو میں مبارکباد
پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ مشاعرہ کامیاب ہو ۔ تالیاں
آج آپ کی بستی میں جو شعرائے کرام تشریف لائے ہیں اُن کا شمار مُلک
کے مشاہیر شعراء میں سے ہے ۔ شعراء کے اسمائے گرامی سُنا کر
توصیف صاحب مشاعرہ کا آغاز کر رہے ہیں ۔ چونکہ ابھی مجوزہ صدر
صاحب تشریف نہیں لائے لہذا بے صدارت مشاعرہ شروع کرایا
جا رہا ہے ۔ لیجئے ایک نوعمر دھان پان سے شاعر کلیم دیوبندی کھوتی
ترنم سے غزل سرا ہیں ان کا مطلع سن لیجئے ۔

کیا ہے پس و پیش آخر برق کو جلانے میں
چار تنکے باقی ہیں اور آشیانے میں

کلیم صاحب مائیک سے ہٹے تو پدر نتواند پسر تمام کند کی تفسیر
یعنی ڈاکٹر رام ناتھ کے صاحبزادے دیپک تاج علیگ چرتھاولی
کلام سنا رہے ہیں ۔

کیا جنوں تھا جو کڑی دھوپ کو سایہ سمجھا
راہِ پُر خار کو پھولوں کا بچھونا سمجھا
ریگِ صحرا پہ تڑپتی رہیں زندہ لاشیں
ظالمِ وقت[1] نے کچھ بھی تو نہ سوچا سمجھا
وہ کوئی شخص تھا دیوار سا ہمراہ مرے
ہر قدم پر میں جسے اپنا ہی سایہ سمجھا

دیپک ان اشعار پر داد لوٹتے جا رہے ہیں اور اب وہاب
چرتھاولی غزل کا مطلع سنا رہے ہیں ۔

صحرائے تخیل میں اکثر گلشن میں بھی کھوئے رہتے ہیں
ہنستے تو ہیں ہونٹوں سے مگر پلکوں کو بھگوئے رہتے ہیں

مطلع پر ہی اکتفا کیجئے ۔
جناب سبھاش چندر چترویدی کلکٹر مظفر نگر تشریف لے آئے ہیں ۔
جن کا خیر مقدم تالیوں سے کیا جا رہا ہے ۔ توصیف صاحب نے ان سے
درخواستِ صدارت کی ہے اور تالیوں کی گونج میں آپ شعراء
کے ساتھ ہی جلوہ افروز ہو گئے آپ کو ایک طلائی ہار پہنایا گیا ہے
پنڈال میں مکمل سکوت طاری ہے اور توصیف صاحب حق کانپوری
سے درخواستِ نظامت کر رہے ہیں چونکہ ابھی ڈاکٹر بشیر بدر
صاحب تشریف نہیں لائے ہیں حق صاحب معذرت فرما رہے ہیں،
لیکن پیہم اصرار پر وہ اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے فرما
رہے ہیں :

میں اس فن سے ناواقف ہوں اور یہ کہکر پھر توصیف صاحب
کو مائک سپرد کر کے چلتے بنے اور توصیف صاحب کلکٹر صاحب
اور اراکین مشاعرہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ یہ
مشاعرہ انجمن ترقی اُردو گنگیسرہ کی جانب سے پہلی بار قومی یکجہتی
کے لئے منعقد ہو رہا ہے میں اس بستی کی دو ایک ضروریات کلکٹر صاحب کے
گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں ـــ کلکٹر صاحب مُسکرائے
ہیں ـــ گاؤں کے لوگوں کو چینی اور تیل نہ ملنے کی شکایت ہے
ـــ تالیاں ـــ یہاں ایک ہائی اسکول کی بھی اشد ضرورت ہے
تالیاں ـــ اور پھر دیوبند ہی کے ایک نوعمر شاعر ماجد صدیقی
کو دعوتِ غزل گوئی دے رہے ہیں ماجد صاحب غزل سرا ہیں کہ
پیدا عجیب طرح کے حالات ہو گئے + اب پیار کے بجائے فسادات ہو گئے
جن کو یقین دلوں کی محبت پہ تھا بہت + وابستۂ گمانِ سیاسیات ہو گئے
کچھ ماجد صاحب بے دلی سے کلام سنا رہے ہیں اور کچھ سننے
والوں نے بے اعتنائی برتی ۔ لہٰذا ماجد صاحب اپنی جگہ واپس چلے
گئے ہیں ۔ لیجئے حق کانپوری نعت شریف پیش کر رہے ہیں ۔

مری جبیں کو اگر ان کی خاکِ پا مل جائے
زمیں سے عرشِ معلیٰ کا سلسلہ مل جائے
دُعا ہے یہی شب و روز زاہدِ ناداں
تجھے بہشت ملے مجھ کو مصطفیٰؐ مل جائے
رسولِ پاک کا کردار سامنے ہو اگر
مقامِ عبد سے معبود کا پتہ مل جائے
جو صدقِ دل سے کوئی ڈھونڈنے پہ آ جائے
مجھے یقین ہے اسے حق اسے خدا مل جائے

[1] کھوتی صاحب یہ ظالمِ وقت کون ہے ؟ کیا کسی گروہ کا نام ہے ۔ (ایڈیٹر)

حقی صاحب کو نعت پر خوب داد ملی ہے اب دوبارہ دعوتِ غزل ماجد صدیقی سے کی جارہی ہے ماجد صاحب پھر اُسی پژمردہ ترنم سے غزل چھیڑ رہے ہیں۔ ماجد اب بڑے شاعر ہو چلے ہیں لہذا انہیں ذرا پہلے پڑھوانا چاہئے تھا ان کا چہرہ اس حق تلفی پر خفگی کی غمازی کر رہا ہے سماعت فرمائیے ؎

جب نالہ و فریاد سے ہم کام لیتے ہیں
اثر اُن پر بھی ہوتا ہے وہ دل کو تھام لیتے ہیں

یہ نُوری والا ترنم ہے ——— ایک آواز ——— اسپر کلکٹر صاحب بھی شکر یہ ہیں اور ماجد صاحب بھی۔

نہ جانے دستِ بستہ روکتی ہے کس لئے توبہ
جب اپنے ہاتھ میں پینے کی خاطر جام لیتے ہیں

شعر سُنانے کے بعد اپنی جگہ چلے گئے ہیں۔ دیکھا تو ڈاکٹر شمیم احمد مسرور ساہی۔ ڈاکٹر بشیر بدر۔ وسیم بریلوی اور کرشن بہاری نور لکھنوی آرہے ہیں ڈاکٹر شمیم صاحب مشاعروں کے لئے دامے درمے قدمے کرم فرماتے ہیں آج اس مشاعرہ میں مظفر نگر اور دیوبند سے اہلِ ذوق سپیشل بسوں میں آئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اتنی چھوٹی بستی میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کرانا بہت بڑی بات ہے لیجئے توصیف صاحب ڈاکٹر بشیر بدر صاحب سے درخواستِ[1] نظامت کر رہے ہیں اس پر تالیوں سے اظہارِ خوشنودی کیا گیا ہے چونکہ مشاعرہ شروع ہو چکا ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب نے تقریر نہ کرتے ہوئے مظفر نگر کے ایک نوعمر شاعر عبدالحق سحر کو دعوتِ غزل دی ہے لیجئے سحر صاحب غزل سرا ہیں ؎

شیشہ کی بات ہے کہیں پتھر کی بات ہے
حالات کی زباں پہ ستمگر کی بات ہے
اک کارواں جو راہ میں لٹوا دیا گیا
مشہور اس لئے نہیں کہ رہبر کی بات ہے
یہ کیسی تشنگی ہے ہر اک زباں پر
اک بیکراں لہو کے سمندر کی بات ہے
پہرے لگے ہوئے ہیں خیالوں پہ بھی سحر
کیسے کہوں جو شہر کے منظر کی بات ہے

سحر صاحب اپنے ترنم سے محفل کو گرما کر خوب داد سمیٹے اپنی جگہ آرہے ہیں اور ڈاکٹر بدر صاحب شمیم دیوبندی کو یاد فرما رہے ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ شمیم صاحب قطعی ان پڑھ ہیں لیکن بہت اچھا کہتے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

گر بیخودی میں چاک گریبان کر دیا
جوشِ جنوں پہ کون احسان کر دیا
دھندلا سا عکس بھی مجھے شیشے نہ دے سکے
ہاں پتھروں نے حوصلہ چٹان کر دیا

مناسب داد پاکر فرما رہے ہیں ؎

ہم سے کبھی ادا نہ ہوا اُن کے رُوبرو
ہونٹوں کی دسترس میں رہا حرفِ آرزو
وہ شعر واعظوں نے پڑھے اپنے وعظ میں
جو شعر کہہ رہے تھے کبھی ہم نے بے وضو

شمیم صاحب داد پاکر مائک سے کھسک رہے ہیں اور اب شمیم احسن شمیم اکبر آبادی بغیر مطلع غزل سُنا رہے ہیں ؎

بکھری ہوئی زلفوں میں کیا حسین چہرہ
گنگا میں نہاتا ہو سورج کا کنول جیسے
کیا خوب مصوّر نے تصویر بنائی ہے
مدہوش جوانی میں سوئی ہو غزل جیسے
للٰہ شمیم ان سے کہہ دو کہ چلے آئیں
پھر پیار کی نگری میں بن ٹھن کے دلہن جیسے

شمیم صاحب بھی مناسب داد لئے اپنی جگہ آرہے ہیں اور اب رنگِ محفل بدلنے کے لئے سید اعجاز الدین پاپولر میرٹھی محفل کو قہقہہ زار بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ؎

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو
کس کا یہ مصرع ہے مت پوچھو میاں جانے دو
صرف یہ دیکھو کہ کس شان سے پڑھتے ہیں غزل
واہ[2] شعر جس کے بھی یہ فرماتے ہیں فرمانے دو

پھر ایک گلِ عنبارہ ہے اور آپ فرما رہے ہیں۔

کسی شاگرد نے بھی لب نہ کھولے داد کی خاطر

---

[1]. درخواستِ نظامت نہ ہوئی شیطان کی آنت ہوگئی (ایڈیٹر) [2]. کریمی صاحب گُلِ عنبارہ جی آپ یہ : سمجھ لیجئے کہ پوچھا اور دیکھ رکی۔ واہ شاعر سامعین اور آپ سب کے ذوقِ سلیم پر خاموش ہیں (ایڈیٹر)

ہزار افسوس خود اپنے بھی پتھر کے صنم نکلے
کسی نے بھی نہیں پوچھا ترنم کے نہ ہونے سے
بڑے بے آبرو ہو کر ترے محفل سے ہم نکلے

پالپوری صاحب ہلڑ بازی کے شور میں جا رہے ہیں اور انور میرٹھی فرما رہے ہیں ؎

حوصلہ دار تک نہیں پہنچا + عشق معیار تک نہیں پہنچا
میری شہرت کا اشتہار ابھی + اُس کی دیوار تک نہیں پہنچا

داد کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

مجھ سے مل کر ہر ایک شخص ہنسا
کوئی آزاد تک نہیں پہنچا

انور صاحب مناسب داد وصول کئے چلتے بنے دیکھا تو نسیم میرٹھی کئی بار [illegible] کی غزل الاپ رہے ہیں ؎

قدر مجھ پہ کرم اہلِ کرم رہنے دو
بارِ احساں سے نکل جائے نہ دم رہنے دو
میرے سجدوں کے لئے نقشِ قدم رہنے دو
یہ شوالے یہ کلیسا یہ حرم رہنے دو
سر اٹھانے کو تو ہیں اور بھی دنیا میں مقام
کم از کم ظالمو یہ صحنِ حرم رہنے دو

نسیم صاحب دادِ ترنم لئے پلٹ رہے ہیں اور سلیم کھتولوی صاحب نہایت شاہانہ شکستہ ترنم سے غزل سرا ہیں ؎

خود کو جو تھکتے نہیں جادو بیاں کہتے ہوئے
میں جھجکتا ہوں انھیں اہلِ زباں کہتے ہوئے
دہشتِ صیاد طاری ہے دلوں پر اس قدر
لوگ ڈرتے ہیں خزاں کو بھی خزاں کہتے ہوئے

داد اور سلیم صاحب لازم و ملزوم لہٰذا سلیم صاحب داد وصول کئے اپنی جگہ لائے جا رہے ہیں اور پھر ذائقہ بدلنے کے لئے چاند بدایونی کو کلام سنانے کی دعوت دی گئی ہے۔ مگر چاند صاحب کا مزاحیہ کلام محض مسخرہ پن تھا اور بس۔ چنانچہ چاند بدایونی کے اس مسخرہ پن سے محفل کے ماحول میں غل غپاڑہ کا دَور دورہ رہا۔ ڈاکٹر بشیر بدر صاحب نے مُلک کے مشہور مترنم غزل گو شاعر حق کانپوری کے نام کا اعلان فرمایا ہے۔

حق کانپوری فرمائشوں کو نظر انداز کر کے یہی داد دی میں غزل سرا ہیں ؎

دنیا نے کچھ ایسی کروٹ بدلی انساں کو ہی انساں بھول گئے
افسانہ تو سارا یاد رہا افسانے کا عنواں بھول گئے
کلیوں کی تمنا بھول گئے ہر پھول کے ارماں بھول گئے
صد حیف کہ گلشن والوں کو گلشن کے نگہباں بھول گئے
ہم نے جو کئے اُن پر احساں ہر اک وہ احساں بھول گئے
جب فصلِ بہاراں آئی تو ہمیں احبابِ گلستاں بھول گئے
اللہ کے ہماری کشتی سے ہر موج بلا ٹکراتی ہے
حالانکہ ایسا لگتا ہے شاید ہمیں طوفاں بھول گئے
موقع کی نزاکت تو دیکھو اس وقت کی حالت تو دیکھو
میرا تمہیں دامن یاد رہا تم اپنا گریباں بھول گئے

ترنم اور غزل اس داد کے مستحق ہیں جو حق صاحب کو دی گئی ہے اب آپ کو ایک اور غزل سنانے پر مجبور کیا گیا ہے ارشاد ہوا ہے ؎

تاریکیوں کا جشن منانے لگے ہیں لوگ
جلتے ہوئے چراغ بجھانے لگے ہیں لوگ
حیرت یہ ہے کہ فرقہ پرستی کے جوش میں
اپنے ہی گھر کو آپ جلانے لگے ہیں لوگ
شاید پھر آ گیا ہے وہی دورِ خاک و خوں
خنجر پھر آستیں میں چھپانے لگے ہیں لوگ
اس درجہ بڑھ گیا ہے جنونِ خود آگہی
خورشید کو چراغ دکھانے لگے ہیں لوگ

ایک اور ایک اور کی آوازوں اور تالیوں کے شور میں سنی ان سنی کر کے حق صاحب مائک سے کھسک آئے ہیں اور اناؤنسر نے صداقت دیوبندی سے کلام سنانے کو کہا ہے مگر کچھ تو صداقت صاحب کا کلام ہی ایسا تھا اور زیادہ تر حق صاحب کی غزلوں اور اُن کے مسحور کُن ترنم کا اثر اہلِ محفل پر چھایا ہوا تھا۔ لہٰذا صداقت صاحب بھی حق صاحب کے ترنم کی بھینٹ چڑھ گئے۔

لیجئے اس نیاز مند کے یہ اشعار سن کر ممنونِ کرم فرمایئے ؎

سلہ کریمی صاحب کئی بار کی سُنی ہوئی غزل کے یہ اشعار اُن اشعار سے تو یقیناً بہتر ہیں جو آپ کے قول کے مطابق داد کے شور و پرسی ہنگامے کا گمان ہوتا تھا (ایڈیٹر)

بید شکِ خُلد جہنم میں ڈھل گیا کیسے
سوال یہ ہے کہ یہ شہر جل گیا کیسے؟
جو دن میں بچ گئے وہ لوگ شب کو سوچتے ہیں
ہمارے سر سے ہر اک خطرہ ٹل گیا کیسے؟
ابھی حمارِ شکِ بہاراں ابھی ہے راکھ کا ڈھیر
چمن کا آج یہ نقشہ بدل گیا کیسے؟
امینِ قوم یہ مانا کہ لاکھ خائن تھا
وہ قوم کی کبھی امانت نگل گیا کیسے؟

آئیے اب ایک غزل مظفر نگر کے شاعر نجم صاحب سے سن لیجے سہ

ہیں یہ غم ہے کہ زمانہ ہے کیوں خفا مجھ سے
یہ فکر ہے کہ نہ روٹھے مرا خدا مجھ سے
خیالِ ترکِ تعلق سے دل لرزتا ہے
نہ چھین لے مرے جینے کا آسرا مجھ سے
سمجھ رہا ہوں بخوبی یہ خامشی کیوں ہے
چھپایئے نہ شبِ غم کا ماجرا مجھ سے

نجم صاحب مناسب داد پاکر اپنی جگہ تشریف لے آئے ہیں اور اب تمنا جمالی صاحب غزل سرا ہیں سہ

درد حد سے گزر جائے گا + غم کا احساس مر جائے گا
آج ہی ڈوب جاؤ کہیں + کل یہ دریا اُتر جائے گا
اور کچھ دل کو الفاظ دے + زخم ہے زخم بھر جائے گا

پنڈال میں ایک عجیب کیف و سرور کا عالم ہے اور آپ اسی سج دھج سے دوسری غزل چھیڑ رہے ہیں سہ

بدن تو شیشہ کے دل پتھروں سے سخت ملے
زبان پھول سی لہجے مگر کرخت ملے

سامنے والے من چلے اور نوجوان زیادہ اُچھل کود کر رہے ہیں اور کلکٹر صاحب پیچھے سے اُٹھ کر جو چلے تو تمنا صاحب التجا کی کہ حضور صرف تین شعر سُن لیجے — پیشاب کرنے جا رہے ہیں — ایک آواز — اسی لئے تو جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر طلبیر ہدر — ایک قہقہہ۔ اور کلکٹر صاحب بیٹھ گئے ہیں۔ تمنا صاحب تین اشعار سُنا رہے ہیں سہ

نہ مل سکا کہیں سایہ بھی سر چھپانے کو

وفا کی راہ میں سوکھے ہوئے درخت ملے
مرے نصیب میں زنداں کی تیرگی لکھ دو
اگر یہ دل میں ہوس ہو کہ تاج و تخت ملے
ہمارے دل کی تمنا یہی تمنا بھی
مزاج شاہوں کا اور باغباں کا بخت ملے

تمنا صاحب مناسب داد پاکر مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور اب ڈاکٹر محمد معروف عارف لے گئینہ سے دیوبند تک ملبی بحر میں غزل سُنانی شروع کی ہے جس پہ کہیں کہیں سے داد ملی ہے عارف صاحب کے بعد مائک پہ تشریف لائے ہیں جناب کرشن بہاری نور لکھنوی جو محفل کا جائزہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے عطا کر رہے ہیں:

حق بولنے کا جن کو نہ تھا بولنے لگے
حد ہے ہمارے سامنے لب کھولنے لگے
اس عہد کا وہ سب سے بڑا معجزہ بنے
کھدر پہن کے کوئی جو سچ بولنے لگے

وہ دیکھئے داد کا ایک بھونچال سا آیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں اس شعر کو آج کے مشاعرہ میں کیا مقام دیا جائے گا؟ جس طرح داد دینے والے والہانہ تالیوں پر اُتر آئے ہیں اسی طرح عالمِ وارفتگی میں نور صاحب اس شعر کو دہرا کر عطا کر رہے ہیں سہ

کانٹے چبھے ہیں جسم میں کتنے کسے خبر
شاید وہ لوگ پھولوں میں بس تولنے لگے
فن کو سنوار دیں جو کہیں دل کی دھڑکنیں
پتھر بھی آئینہ کی طرح بولنے لگے

نور صاحب محفل کو نور میں ڈبو کر شاداں پلٹ رہے ہیں اور داد دیجے تدبر صاحب کو اس وقت انھوں نے کسی ایسے ویسے شاعر کو قربانی کا بکرا بننے سے بچا لیا اور مظفر رزمی کو دعوتِ نغمگی دی ہے رزمی صاحب غزل سرا ہیں سہ۔

کسی اور آستاں پہ نہ جھکا نہ جھک سکے گا
مرا سر وہیں ملے گا جہاں ان کا نقشِ پا ہے
وہی مضمحل اندھیرا وہی مضطرب اُجالا
نہ چراغ بجھ رہا ہے نہ چراغ جل رہا ہے
اُسے کیا ملے گی منزل رہِ زندگی میں رزمی
جو قدم قدم پہ پوچھے ابھی کتنا فاصلہ ہے

رزمی صاحب کو ہر شعر پر داد دی گئی ہے۔ آپ مائک چھوڑ رہے ہیں اور اب دیو بند کے گوشہ نشیں شاعر مولانا قمر عثمانی پُر وقار انداز سے عطا کر رہے ہیں ؎

نہ محبت نہ محبت کی ادا ہے یارو
نہ شکایت نہ ملامت نہ جفا ہے یارو
غم کی تلخی ہے مگر کتنا مزا ہے یارو
عالمِ شوق کا عالم ہی جُدا ہے یارو
دل میں زخموں کی دُکھن ہونٹوں پہ آہوں کا دھواں
زندگی سے عمر کی وفاؤں کا صلہ ہے یارو
اب نہ ارمان نہ حسرت نہ الم ہے نہ خوشی
ہم سے دُنیا نے ہمیں چھین لیا ہے یارو

مولانا قمر صاحب داد لوٹتے اپنی جگہ آگئے ہیں دیکھا تو عالم صاحب ڈاکٹر بشیر بدر صاحب کا نہایت موزوں الفاظ میں تعارف کرا کر اُن سے درخواستِ کلام کر رہے ہیں تالیوں کی جھنکاریں بدر صاحب آکر فرما رہے ہیں پہلے ترنم سے پڑھوں گا۔ پھر تحت آپ تو مجسم ترنم ہیں — ایک آواز — ایک قہقہہ — اور آپ غزل سرا ہیں ؎

کبھی یوں بھی آمری آنکھوں میں مری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک رات نواز دے مگر اس کے بعد سحر نہ ہو

داد نے ہنگامہ کا رُوپ دھار لیا ہے دوسرے مصرعہ کو کئی بار دہرا کر ارشاد ہوا ہے ؎

وہ بڑا رحیم و کریم ہے مجھے یہ صفت بھی عطا کرے
تجھے بھولنے کی دُعا کروں تو مری دُعا میں اثر نہ ہو

ایک ہنگامہ سا ہنگامہ ہے پنڈال انگڑائیاں سی لے رہا ہے اور آپ بانکپن سے گاؤں کے سادہ لوح لوگوں کو یوں لوٹنے کی ٹھان رہے ہیں ؎

کبھی دن کی دُھوپ میں جھوم کے کبھی شب کے پھولوں کو چوم کے
یُونہی ساتھ ساتھ چلیں سدا کبھی ختم اپنا سفر نہ ہو

پھر داد کا دھماکہ ہوا ہے اور آپ اسی دلکشی سے اونگھتے سامعین کو جو نکانے چلے ہیں ؎

وہ کنیزی پلکوں کی اوٹ سے کوئی تارا چمکا قطارات میں

مری بند مُٹھی نہ کھولئے وہی کوہ نور ہے ہات میں
ترے ساتھ اتنے بہت سے دن تو پلک جھپکتے گزر گئے
ہوئی شام کھیل کھیل میں کٹی رات بات ہی بات میں
کبھی سات رنگوں کا پھول ہوں کبھی دھوپ ہوں کبھی دھول ہوں
مَیں تمام کپڑے بدل چکا ترے موسموں کی برات ہوں

ڈاکٹر صاحب ہر شعر پر داد و تحسین پاکر تالیوں کے ہنگامہ میں اپنی جگہ آکر ملک کے منفرد غزل گو اور خوش گلو شاعر حفیظ میرٹھی سے درخواستِ غزل کر رہے ہیں حفیظ صاحب تالیوں سے کہے گئے خیر مقدم کے بعد غزل سرا ہیں ؎

بے ضمیروں کو بتلانے جائیں کیا + وہ تو سمجھیں گے انھیں سمجھائیں کیا
التجائیں تو کوئی سُنتا نہیں + اب ذرا کچھ بے ادب ہو جائیں کیا
بے ادب ہو جائیں کیا پر داد کا سابقہ ریکارڈ بھی ٹوٹ چکا رہ گیا

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے ؎

آپ کے وعدے بہت بدنام ہیں + آپ کے وعدوں سے دل بہلائیں کیا
بے عصا اپنی کلیمی ہے تو ہو + وقت کے فرعون سے ڈر جائیں کیا

پھر یہ محفل شعر و ادب داد کے بھونچال کی نذر ہو چلی ہے دوسرے مصرعہ پر شعراء ہی نہیں بلکہ سامعین بھی جھوم رہے ہیں اور حفیظ صاحب محفل کو گرما رہے ہیں ؎

خیر سے مقتل میں نعارے بھی ہیں + دُور تک چھینیں ہماری جائیں کیا
شیخ قاتل کو مسیحا کہہ گئے + محترم کی بات کو جھٹلائیں کیا
چھوڑ کر دامانِ خودداری حفیظ + اپنی نظروں سے بھی ہم گر جائیں کیا

حفیظ صاحب تالیوں کے شور میں اس سادہ پُر خلوص شاعر کے محبوب اور محترم بنے شادماں کچھ تشنگی بڑھا کر جا رہے ہیں اور ڈاکٹر بدر صاحب نہایت ادب سے درخواستِ کلام کر رہے ہیں وسیم بریلوی سے۔ جو وسیم صاحب تالیوں سے کئے گئے خیر مقدم کے بعد مائیک پر آئے تو فرمائشوں کا ایک غل غپاڑہ ہے اور آپ سب کو نظر انداز کرکے فرما رہے ہیں

یہ زندگی کا سفر بھی عجیب ہی نکلا
سفر میں سب ہیں مسافر کوئی نہیں لگتا
وہ صبح تری طرح مجھ سے رُوٹھ کر گئی
یہ شام میری طرح ترے انتظار میں ہے

وہ میری پیٹھ میں خنجر ضرور اُتارے گا
مگر نگاہ ملے گی تو کیسے مارے گا

سامعین کے صحیح اندازِ داد سے وسیم صاحب حیران ہیں کہ اس گاؤں میں اس قدر سخن فہم اور شعرا نواز ہیں۔ غالباً وسیم صاحب کو یہ علم نہیں ہے کہ حضرت ذوق۔ وجاہت جھنجھانوی۔ احسان دانش کاندھلوی۔ مولانا الم مظفر نگری۔ شوکت تھانوی شباب کیرانوی۔ نظیر کھتولوی۔ ارشد تھانوی۔ ڈاکٹر تنویر علوی منشی متقی کیرانوی۔ مشیر جھنجھانوی اسی ضلع نے آسمانِ شعر و ادب کو درخشاں و تاباں آفتاب و ماہتاب دیئے اور آج بھی اس ضلع میں بہت اچھا کہنے والے شعرائے کرام ہیں توصیف علوی کیرانوی سلیم کھتولوی۔ مظفر رزمی کیرانوی۔ تمنا جمالی بڈھانوی۔ نجم مظفر نگری۔ شمیم ادرک جلال آبادی۔ قمر و عارف و محفوظ و شاہد لوی مظفر نگری۔ محمد علی فانی کھتولوی[1] کا ایک مقام و شہرت و مقبولیت اظہر من الشمس ہے پھر یہاں کے سامعین سخن فہم کیسے نہ ہوں گے۔ دیکھئے وسیم صاحب فرما رہے ہیں۔

اسے سمجھنے کا کوئی تو راستہ نکلے
میں چاہتا بھی یہی تھا وہ بیوفا نکلے
کتابِ ماضی کے اوراق اُلٹ کے دیکھو ذرا
نہ جانے کون سا صفحہ مُڑا ہوا نکلے
میں تجھ سے ملتا ہوں تفصیل میں نہیں جاتا
مری طرف سے ترے دل میں جانے کیا نکلے
یہ دیکھنے میں بہت ہی قریب لگتا ہے
اسی کے بارے میں سوچو تو فاصلہ نکلے

داد کا ایک ایسا ریلا ہے کہ اس گاؤں کی جامع مسجد کے مینار سے جو چار پانچ کلومیٹر کی دوری سے نظر آتے ہیں آج سوچتے ہوں گے کہ یہ کیسا ہنگامہ ہے اور آپ مقطع عطا کر رہے ہیں سہ

تمام شہر کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے ہیں
وسیم گھر سے اب ایسے میں کوئی کیا نکلے

وسیم صاحب ایک گیت اور سنا کر داد و تحسین کے شور میں مائک چھوڑ رہے ہیں اور ڈاکٹر ہند صاحب ملک کے قلندر شاعر عالم فتحپوری سے درخواستِ کلام بلاغت نظام کر رہے ہیں۔ عالم صاحب شانِ استغنائی سے مائک پہ آ گئے ہیں اور فرما رہے ہیں کلکٹر صاحب تو بہت دیکھے لیکن ایک ذمہ دار کلکٹر آپ ایسے نہیں دیکھے جو تمام رات مشاعرہ میں تشریف فرما رہے ہوں یہ بہت بڑی بات ہے۔ پھر تالیوں کی گونج میں عطا کر رہے ہیں سہ

قافلے والوں کی کیا اس میں خطا ہے یارو
رہنما راستہ گر بھول گیا ہے یارو
دل نے کھائے ہیں مری نظروں کے پتھر برسوں
تب کہیں جا کے یہ آئینہ بنا ہے یارو

داد کا شور کم ہوا تو آپ نے ایک طویل نظم پیش کی ہے جو پسند کی گئی اور میں نے صرف سننے پر اکتفا کیا تالیوں کی گونج میں آپ مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور اب تالیوں کی جھنکار میں آ رہے ہیں الحاج شمیم جے پوری۔ جو یوں غزل سرا ہیں سہ

بے نیازی کی ادا پانے لگا ہوں تجھ میں
بے وفا دوست یہ کیا دیکھ رہا ہوں تجھ میں
میرا دعویٰ ہے کہ تو نے بھی نہ دیکھے ہوں گے
ایسے جلوے کہ میں دیکھ رہا ہوں تجھ میں
بے وفا تیری زباں پر یہ وفا کی باتیں
ایسا لگتا ہے کہ میں بول رہا ہوں تجھ میں

دوسرے مصرعہ پہ پنڈال میں داد کا ایک بھونچال سا آیا ہے اور شمیم دو اور غزلیں سنا کر محفل پہ وجدانی کیفیت طاری کر کے تالیوں کے شور میں اپنی جگہ آ رہے ہیں آپ کے ساتھ ہی سوا تین بجے نہایت کامیابی کے ساتھ یہ تاریخی۔ یادگار، شستہ اور لاجواب محفلِ شعر سخن برخاست کی جا رہی ہے اور کلکٹر صاحب شکریہ ادا کر کے فرما رہے ہیں اگر شاعر چاہیں تو انقلاب لا سکتے اور بغاوت کرا سکتے ہیں اگر چاہیں تو اتفاق و اتحاد کی فضا بنا سکتے ہیں۔ شاعری بڑی طاقت رکھتی ہے وغیرہ۔ ہر چند کہ سامعین شعرائے کرام کو سننے کے موڈ میں ہیں لیکن شعرائے کرام تھک کر چور ہو گئے

باقی صفحہ ۱۴۱ پر

[1] کریمی صاحب آپ نے اپنا نام لکھنے میں کسرِ نفسی سے کیوں کام لیا ہے (ایڈیٹر)

دی بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس: مرکنٹائل کوآپریٹو بینک بلڈنگ، ۷۸، محمد علی روڈ، بمبئی 400003

بینک کاری کے تمام امور بشمول غیر ملکی زرِ مبادلہ کا لین دین انجام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کا معیارِ زندگی بلند کرنے میں آپ کی ہمت افزائی کرتا ہے اور جملہ اقسام کے گھریلو استعمال کے سامان کے حصول میں آسان شرائط پر آپ کی مدد کرتا ہے

یکم اکتوبر ۱۹۷۹ء سے سود کی شرحیں

۱۔ سیونگ ڈپازٹس پر

سیونگز اکاؤنٹس پر (چیک سہولت کے ساتھ چھ فیصد سالانہ)

۲۔ فکسڈ ڈپازٹس پر ۱۳ ستمبر ۱۹۷۹ء سے

۱۔ ۱۵ سے ۴۵ دن تک ۳ فیصد سالانہ
۲۔ ۴۶ سے ۹۰ دن تک ۴ فیصد سالانہ
۳۔ ۹۱ سے زیادہ مگر ۶ ماہ سے کم ۵ فیصد سالانہ
۴۔ ۶ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ۹ ماہ سے کم ۵ر۵ فیصد سالانہ
۵۔ ۹ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ایک سال سے کم ۶ فیصد سالانہ
۶۔ ایک سال اور اس سے زیادہ مگر بشمول ۳ سال تک ۸ فیصد سالانہ
۷۔ ۳ سال اور اس سے زیادہ مگر بشمول ۵ سال تک ۹ فیصد سالانہ
۸۔ ۶۱ ماہ اور اس سے زیادہ عرصہ پر ۱۰ فیصد سالانہ

دہلی برانچ

3655 نیتا جی سبھاش مارگ، دریا گنج، نئی دہلی-110002

فون: 264374 - 268266

میننگ ڈائرکٹر	دہلی زونل منیجر
زین جی رنگون والا	شمیم کاظم

ڈاکٹر عبید اللہ خان

پریم چند کی افسانہ نگاری

(اہم خصوصیات)

کچھ سستی شہرت حاصل کرنے والوں نے (جن میں ابو محمد شبلی پیش پیش ہیں) منشی پریم چند کے خلاف قلمی جہاد شروع کر رکھا ہے۔ جس محاذ کی بنیاد خود غرضی، ذاتی شہرت اور غلط بیانی نیز مذہبی تعصب پر مبنی ہو گی وہ کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔ بلکہ ایسے محاذ کے بانی اور حامی مزید قعرِ مذمت میں ایسے گرتے ہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گوشۂ گمنامی میں چلے جاتے ہیں اور ان کی رہی سہی ادبی ساکھ بھی ختم ہو جاتی ہے۔

منشی پریم چند کے خلاف ایک عرصہ سے کچھ ناکام ادیبوں نے شر پسندانہ محاذ قائم کر رکھا ہے مگر صورتِ حال یہ ہے کہ منشی پریم چند کی عزت و توقیر میں تو دن دونی اضافہ ہو رہا ہے اور یہ بزعم خود تیس مار خاں حضرات اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگائے ہدفِ ملامت بنے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق بکواس کئے ہی جا رہے ہیں۔ حالانکہ اُردو کے یہ ناخلف نام لیوا بخوبی جانتے ہیں کہ جس ٹب میں منشی پریم چند پیشاب کرتے تھے انھیں اس ٹب میں منہ دھونے کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔

• ماہِ نو، لاہور کے حالیہ شمارے میں جناب ڈاکٹر عبید اللہ خان کا ایک مضمون پریم چند کی افسانہ نگاری (اہم خصوصیات) شائع ہوا ہے۔ ماہِ نو کے شکریہ کے ساتھ یہ مضمون آپ کے مطالعہ کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ کاش کہ منشی پریم چند کے یہ خود غرض اور مذہبی تعصب میں جلے بھنے مخالفین (خصوصاً ابو محمد شبلی) اس مضمون کو پڑھیں تو شاید انھیں مضمون لکھنے کا سلیقہ آ سکے۔ (ایڈیٹر)

پریم چند اُردو افسانہ نگاری کے نہ صرف امام اور پیشرو ہی ہیں بلکہ رہنما بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں اور بعد میں آنے والوں کے لئے ایسی روایات قائم کی ہیں جو آج بھی اُردو افسانہ کی پوری صدی گزر جانے کے باوجود افسانہ لکھنے والوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو رہی ہیں بلکہ قدم قدم پر ان کی رہنمائی کرتی نظر آتی ہیں۔ اُردو افسانہ ترقی کی کتنی ہی منزلیں کیوں نہ طے کرلے لیکن وہ پریم چند کی قائم کردہ روایات سے انحراف نہیں کر سکتا جب تک یہ نظامِ کائنات قائم ہے اور جب تک کائنات میں انسان موجود ہے اور انسانوں کے مسائل موجود ہیں تب تک پریم چند کی روایات اور افسانہ کی بنیادی خصوصیات نئے لکھنے والوں کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوتی رہیں گی۔ جب تک زمین اور زمین والوں کے مسائل ہیں، جب تک سرمایہ غلط ہاتھوں میں ہے اور سرمایہ دار اپنی من مانیاں کر رہا ہے جب تک کارخانہ دار اپنے جبر و استبداد سے باز نہیں آتا اور مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اسے اس کی جائز مزدوری دینے پر آمادہ نہیں ہوتا، جب تک ریاستی سیاست دنیا میں پروان چڑھ رہی ہے، جب تک سرکاری اہل کار اپنی چیرہ دستیوں سے باز نہیں آتے، جب تک کسان اور مزدور کو اس کا جائز مقام نہیں مل جاتا، جب تک پسماندہ اقوام کی درگت بن رہی ہے جب تک معاشرتی زندگی میں چھوٹے بڑے کا امتیاز باقی ہے، جب تک چھوت چھات کی لعنت سے بعض قومیں نجات حاصل نہیں کر لیتیں، جب تک حق دار کو اس کا حق اور انصاف چاہنے والے کو انصاف نہیں مل جاتا، جب تک معاشرہ میں بری رسوم کا دور دورہ ہے، جب تک نمود و نمائش کی زندگی پروان چڑھ رہی ہے جب تک مشرقی اور ایشیائی روایات اور خصوصیات سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے، جب تک

[illegible] استحصال اور ناانصافی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک پریم چند کے افسانے نہ صرف ہماری رہنمائی ہی کرتے رہیں گے بلکہ ہمیں ایک حوصلہ اور نئے عزم سے ہمکنار کر کے باطل کی قوتوں سے ٹکرانے کا درس دیتے رہیں گے۔

پریم چند کے ان افسانوں کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ابتدائی یعنی وطن پرستی کا دور۔
۲۔ اصلاحی اور تاریخی دور۔
۳۔ سیاسی دور۔

پریم چند کے افسانوں کا پہلا دور بہت مختصر ہے یعنی ۱۹۰۷ء سے ۱۹۰۹ء تک کے عرصہ پر مشتمل ہے اس تین سال کے عرصہ میں انھوں نے پانچ کہانیاں لکھ کر ایک مجموعہ کی شکل میں "سوزِ وطن" کے نام سے شائع کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر پاک و ہند کا گوشہ گوشہ آزادی کے نغموں سے گونج رہا تھا، پریم چند ایک دردمند دل اور حب الوطنی کے جذبات لے کر دنیا میں آئے تھے، چنانچہ وہ آزادی کے ان نغموں سے اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکے انھوں نے دوسرے محبِ وطن لوگوں کی ہمنوائی کرتے ہوئے آزادی کے نغموں کو اپنا ایمان اور حبِ وطن کو اپنا مسلک قرار دے کر اپنی کہانیوں کے ذریعے حب الوطنی کے جذبہ کو ابھارنے اور وطن پرستی کا سبق دینے کا بیڑا اٹھایا اس خدمت کے بجا لانے میں ان کا خلوص ہی انھیں انجام سے بے خبر کر کے دعوتِ عمل دے رہا تھا اسی لئے "سوزِ وطن" کی کہانیوں میں ان کے خلوص کی چنگاریاں جا بجا کسی نہ کسی شکل میں روشن ہوتی دکھائی دیتی ہیں، یہ وہ زمانہ تھا جب حبِ وطن کے دشتِ پرخار میں قدم رکھتے ہوئے اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا رہے تھے لیکن پریم چند نے تو حبِ وطن کو نہ صرف اپنا مسلک اور مشن بلکہ اپنے عقیدہ کا جزو بنا لیا تھا اسی لئے آگے چل کر "سوزِ وطن" کی ضبطی اور حکومت کی عائد کردہ پابندیاں انھیں جادۂ مستقیم سے نہ ہٹا سکیں بلکہ ایک نئے ولولہ اور جذبہ کے ساتھ وہ اس راستے پر چل پڑے اور بہت جلد وہ ایک محبِ وطن ادیب اور عوامی فنکار کی حیثیت سے ابھر کر ہمارے سامنے آگئے۔

پریم چند کے افسانوں کا دوسرا دور یعنی اصلاحی اور تاریخی دور ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۰ء کی مدت پر محیط ہے۔ اس دور میں انھوں نے تاریخی اور نیم تاریخی واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنانے کے علاوہ بہت سے ایسے مسائل کو بھی افسانہ کا موضوع بنایا ہے جو مشرقیت اور وطنیت کو گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے، انھوں نے محسوس کیا کہ اگر ان کی اصلاح نہ کی گئی تو وہ متعدی بیماری کی شکل میں پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس سے ان کی عظمت، روحانیت اور خلوص چھین لیں گے۔ اس طرح کے افسانوں میں رانی سارندھا، راجہ ہردول، راجپوت کی بیٹی وغیرہ بڑے اچھے افسانے ہیں یہ افسانے انھوں نے اس وقت لکھے جب وہ مہوبا ضلع ہمیرپور میں سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے، وہاں انھیں راجپوتوں کی شجاعت اور بلندیوں کی بہادری کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور ان کے آن بان اور خودداری سے بہت سے متاثر ہوئے تھے اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان بہادروں اور جانبازوں کی داستانوں اور ان کے کردار و عمل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنائیں کیونکہ اس زندگی میں انسانی اقدار کے بہت سے جوہر چھپے ہوئے ہیں۔ اس طرح وہ ہمیں اپنے پُرعظمت اور تابناک ماضی کی یاد دلا کر پھر سے ایسی جانبازی، ایثار اور قربانی کے لئے تیار کرتے ہیں۔ جس کی بدولت پھر سے ہم وہ مقام حاصل کر سکیں جو انگریزی تہذیب و معاشرت نے ہم سے چھین لیا ہے۔

اس دور میں پریم چند اپنے افسانوں کو صرف تاریخی واقعات اور عظمت تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ وہ معاشرہ میں بہت سی غلط رسوم اور نامناسب طریقوں نے جو گھر کر لیا ہے اس کی بیخ کنی بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہ رسوم اور غلط اطوار ہی ان روحانی اقدار کو برباد کر رہی تھیں جو مشرق اور ہندوستان کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھیں۔

پریم چند نے اس دور کے افسانوں کے ذریعے ملک و قوم کی جو خدمت انجام دی ان کی ہمسری کوئی دوسرا افسانہ نگار نہیں کر سکتا۔ جہیز کا مسئلہ ہو یا بے جوڑ شادی کی بات، جہیز کی رسم کا ذکر ہو یا چھوت چھات جیسی غیر انسانی حرکت کا بیان ہو، ساس بہو اور نند بھاوج کی باہمی کشمکش ہو یا سوتیلی ماں اور بچوں کے حسرتناک انجام کی بات چیت ہو، مذہب کے ٹھیکہ داروں کی بیہودگی یا ساہوکاروں اور

سرمایہ داروں کے مظالم کی داستان اعزوں نے اس طرح کے مسائل کا بڑی باریک بینی اور فنکاری سے تجزیہ کرتے ہوئے ہمیں اصلاحات کی جانب توجہ دلاکر ان سے بچنے کا سبق دیا ہے اس طرح کے افسانوں میں کفن، بکس، مجبوری، حسرت، قربانی، عار، مہر، حب، ایک آواز، منتر اور تالیف اُن کے نمائندہ اور مثالی افسانوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ جب تک یہ دنیا قائم ہے، اس میں اس طرح کے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے شر اور خیر کی قوتیں آپس میں ٹکراتی رہیں گی اور ان مسائل کی اصلاح کی ضرورت بھی محسوس ہوتی رہے گی۔ پریم چند کے اس طرح کے افسانے ہمیشہ پڑھنے والوں کی رہنمائی کرتے رہینگے چنانچہ اس تاثیر اور گیرائی نے ان افسانوں کو ابدیت اور آفاقیت سے ہمکنار کر دیا ہے۔

پریم چند کے افسانوں کا تیسرا دَور جسے سیاسی دَور کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی مدت ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۶ء تک کی ہے۔ اس دَور کی دو کڑیاں ہیں۔ ایک کڑی ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء کی مدت پر حاوی ہے دوسری ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۶ء پر مشتمل ہے۔ ان عہدوں میں پریم چند کے دو سیاسی نظریے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں جب وہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوئے تو اُن پر گاندھیائی فلسفہ کا اثر تھا وہ گاندھی جی کے اہنسا (عدم تشدد) کے نظریہ کے بڑی سختی سے پابند تھے اور اس نظریہ کو نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس وقت وہ اس نظریہ کو ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لئے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کو اہمیت دیتے تھے اور گاندھی جی کی سودیشی کی تحریک، گرام سدھار تحریک، ہوم رول تحریک اور دوسری ان تحریکوں کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے افسانوں میں ایسے موضوعات پیش کیا کرتے تھے جن سے ان تحریکوں کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکے۔ اس دَور میں وہ ستیاگرہ، سول نافرمانی، جلسہ جلوس، پکٹنگ، بائیکاٹ اور دوسری چیزوں کو آزادی کے لئے ضروری اور لازم سمجھتے ہیں۔ آشیاں برباد، جیل، آخری تحفہ، ریاست کا دیوان، سوا سیر گیہوں وغیرہ اس زمانے کی نمائندہ کہانیاں کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یعنی ۱۹۳۰ء سے پریم چند کے سیاسی نظریات میں ایک زبردست تبدیلی واقع ہوئی اور انھوں نے محسوس کیا کہ گاندھی جی کا عدم تشدد کا فلسفہ اب نہیں چل سکتا۔ جیل جانا پولیس کے تشدد کا نشانہ بننا، گھربار تباہ کرنا اس وقت کام نہیں آسکتا اب تو اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا، جلوس نکالنے اور جلسہ کرنے کا وقت گزر گیا اب تو دہشت پسندی اور انارکی کے نظریہ کو اپنانا ہوگا چنانچہ اب "قاتل کی ماں" اور "قاتل" جیسے افسانے ان کے قلم سے نکلتے ہیں۔ اور وہ دہشت پسندی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے نظر آتے ہیں۔

پریم چند کے ان تینوں ادوار کا مطالعہ کرنے اور جائزہ لینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان کے فن نے کتنی تیزی سے ارتقاء کی منزلیں طے کی ہیں۔ وہی پریم چند جو ۱۹۰۷ء میں "دنیا کا سب سے انمول رتن" جیسی کہانی لکھتے ہیں جس میں ایک داستانوی رنگ ہونے اور ایک عالم جذباتیت اور مقصدیت کے سہارے آگے بڑھنے کے سوا کوئی خوبی نظر نہیں آتی جس کی زبان و بیان ایک مبتدی کی کوشش نظر آتا ہے۔ چند سال بعد ہی فنکار "بوڑھی کاکی" اور "پوس کی رات" جیسے افسانے لکھ کر حقیقت نگاری کا ایک نیا معیار قائم کرتا ہے اس حقیقت نگار کا قلم جب اور آگے قدم بڑھاتا ہے تو اس کی حقیقت نگاری ترقی پسندی سے ہمکنار ہو کر "کفن" جیسا شاہکار پیش کرتی ہے۔ جسے نہ صرف اردو کے افسانوی ادب ہی میں ایک خاص مقام حاصل ہے بلکہ اس کا شمار دنیا کے چند معیاری افسانوں میں ہوتا ہے۔

ان افسانوں کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی کے ابتدائی پچاس برس کی ہندوستانی زندگی کو اپنے افسانوں میں سمو دیا ہے۔ انہوں نے ان افسانوں کے ذریعے ایک مخلص فنکار کی طرح قدم قدم پر ہماری رہنمائی کی ہے اور ان افسانوں سے مثالیت پسندی اور حقیقت پسندی کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ جہاں انھیں مشرقیت عزیز ہے اور اپنے وطن کی چیزیں عزیز ہیں۔ وہاں وہ غیروں اور دوسروں کی خوبیوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے فن میں عظمت پیدا کرتے اور ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے کے لئے ہر چیز سے مدد لیتے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں کے مختلف ادوار پر جب تنقیدی نگاہ

ڈالی جاتی ہے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ انھوں نے کتنی تیزی سے اپنے فن کو ارتقار کی منزلوں سے گزارا ہے۔ اپنے افسانوں کے پہلے دَور میں وہ رُومانی تصورات اور تاریخی روایات تک محدود نظر آتے ہیں اور ایک داستان گو کی طرح اپنی ہر بات گہرے جذباتی انداز میں کہتے ہیں۔ اس وقت ان کی زبان و بیان دونوں پر داستانوی رنگ غالب ہے ان کے پہلے افسانے "دُنیا کا انمول رتن" میں پورا ماحول داستانوی ہے اس کی فضا، کرداروں کے نام، اس کے در و بام، اس کے سبز پوش رہنما سب چیزوں پر داستانوی اثرات چھائے نظر آتے ہیں

ان ابتدائی افسانوں میں زبان کی بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں۔ جابجا الفاظ کی غلط ترتیب، غیر مانوس الفاظ کا استعمال اُردو اور ہندی کی غلط آمیزش۔ "سوزِ وطن" کی سبھی کہانیوں میں نظر آتی ہے۔ مثلاً "جو کوہ و بیاباں میں سر ٹکراتے اور نالہ و فریاد مچاتے پھرتے ہیں" یا "قاضی شان تحکم سے بیٹھے ہوئے ہم کچھ غور فکر کر رہے تھے" یا دلفگار کا حیاؤ چھوٹ گیا" یا ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے ہیں اور پھولوں کی برکھا کر رہے ہیں۔ یا اس کی آنکھوں سے فکر برس رہی ہے یا شاید مہینوں سے حجامت دُرست نہیں کی یا سفلی مذاق سے طبیعت نفور ہوتی" اس طرح کی مثالوں سے اس عہد کی زبان کی خامیاں صاف نظر آتی ہیں۔

لیکن اپنے افسانوں کے دوسرے دَور میں داخل ہوتے ہی انھیں خود اپنی غلطیوں کا احساس ہوا اور اب اُن کی زبان و بیان میں نکھار پیدا ہوا۔ اب وہ تخیل اور رومان کی داستانی فضا سے باہر قدم رکھ کر حقیقت کا دامن تھامے نظر آتے ہیں بہت سے واقعات و مسائل کا گہرا مشاہدہ کر کے انھیں اپنے افسانوں کا موضوع بنا رہے ہیں۔ اب وہ کسی جوش یا جذباتیت سے کام نہیں لیتے بلکہ زندگی کے ٹھوس حقائق سے ہمیں روشناس کراتے ہیں۔ اب ان کے فن میں ایک زبردست تغیر نظر آتا ہے۔ اب وہ ایک حقیقت نگار کے رُوپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس دَور کے افسانوں کی زبان اور موضوع پر داستانوی رنگ غالب نہیں۔ بلکہ بڑی تیزی سے پریم چند نے زبان کو سادہ سلیس اور شُستہ بنانے کی کوشش کی ہے اب فارسی اور ہندی کے الفاظ کی غیر مانوس ترکیب نظر نہیں آتیں۔ موقع اور محل کے مطابق ضرب الامثال اور محاوروں کا استعمال بھی بڑی خوبی سے کیا گیا ہے اور مناسب تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیا گیا ہے۔ ان کی اس فنی کوشش نے انھیں ایک انفرادیت بخشی ہے۔ اب ان کا اسلوب ایسا افسانوی اسلوب بن گیا ہے جس میں سادگی ہے سلاست ہے اور حلاوت بھی ہے ان خصوصیات نے ان کے افسانوں میں ایسی تاثیر پیدا کی ہے جو قاری کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اب ان کے قلم سے اس طرح کے جملے نکلتے ہیں:

" برندا نے یہ گیت بڑے دلکش انداز میں گایا۔ اس کے میٹھے سروں میں میرا کا انداز پیدا ہو گیا تھا"

(وکرما دت کا تیغہ)

" لیکن جب وہ دلفریب نغمے سُنتی اور دلکش مناظر دیکھتی تو یہ اندیشناک خیالات فراموش ہو جاتے اسے اپنی زندگی نہایت پُرلطف معلوم ہوتی" (فتح)

" ٹھاکر درشن سنگھ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے اس نظارے کو بہت غور اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے مذہبی عقائد میں چاہے راسخ ہوں یا نہ ہوں لیکن تمدنی معاملات میں وہ کبھی پیش قدمی کے خطاوار نہیں ہوتے تھے" (صرف ایک آواز)

پریم چند کے افسانوں کا جب تیسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ تو اس میں نہ صرف فن ہی پورے عروج پر نظر آتا ہے بلکہ زبان و بیان کی تمام خوبیاں بھی جابجا ان کے افسانوں میں نظر آتی ہیں اب وہ ایک عظیم فنکار کی طرح موضوع اور فن کے رشتوں کو بڑی خوبی سے قائم رکھتے ہیں۔ اب وہ فن کی نزاکتوں سے بھی واقف ہیں اور زبان و بیان کی مزید لطافت سے بھی۔ اب وہ ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جس میں نہ تو فارسی عربی کے مشکل الفاظ ہیں نہ ہندی سنسکرت کے غیر مانوس اور ادق الفاظ۔ اب وہ ایسی سہل عام فہم اور سلیس زبان استعمال کرتے ہیں جسے سب سمجھ سکیں اور وہ اپنی بات اس زبان کے ذریعے عوام تک پہنچا سکیں۔ اس فنی بصیرت کی وجہ سے اب قاری ان کے افسانوں کو

خیالی چیز سمجھنے کی بجائے ایک حقیقت سمجھنے پر مجبور ہے۔ ان کی یہ فنی خوبی ان کے افسانوں کو زندگی اور اس کے مسائل کا ترجمان بنا دیتی ہے۔ اب ان کے قلم سے اس طرح کے عام فہم سلیس اور سادہ جملے نکلتے ہیں۔

"یوں دل کو مضبوط کر کے وہ شام کو دکان پر پہنچے۔ دیکھا تو پانچ رضاکار پکٹنگ کر رہے تھے اور دکان کے سامنے سڑک پر ہزاروں تماشائی کھڑے ہیں۔" (آخری تحفہ)

"سال گزر گیا۔ درختوں میں نئی نئی کونپلیں نکلیں۔ پھول کھلے۔ پھل لگے۔ کالی گھٹائیں آئیں، بجلی چمکی۔ یہاں تک کہ سرما بھی گزر گیا اور مسافر نہ لوٹا مگر منی کو اب بھی اس کے آنے کی امید تھی۔" (خودی)

"رامیشوری سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے۔ ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بھی بے کسی کے ساتھ رونے والا نہ دیکھ کر اس کا ساتھ دیتی ہوں۔" (قاتل کی ماں)

پریم چند کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان میں ایک اچھے افسانہ نگار کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ انھوں نے زندگی کے ایک ایک پہلو کا بڑی شدت اور گہرائی سے مطالعہ کر کے اسے اپنے فن میں جگہ دی ہے۔ ان کے افسانوں میں کہانی کہنے کا انداز بڑے سیدھے سادے اور سچے انداز میں ملتا ہے یہی وہ حقیقی انداز ہے جو ہمیں کہانی کی روایات سے ملا ہے۔ اب بھی جب دیہات کے لوگ کسی چوپال میں بیٹھ کر یا کسی الاؤ کے گرد جمع ہو کر کسی سے کہانی سنتے ہیں تو جو مزہ انھیں اس وقت ملتا ہے وہی لطف ہم پریم چند کے افسانے پڑھ کر حاصل کرتے ہیں۔ اور ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے بیٹھے ہمیں اپنا کوئی افسانہ سنا رہے ہیں۔ مثلاً ان کا افسانہ "سوا سیر گیہوں"، اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"کسی گاؤں میں شنکر نامی ایک کرمی کسان رہتا تھا۔ سیدھا سادہ غریب آدمی تھا۔ اپنے کام سے کام۔ نہ کسی کے لینے میں نہ کسی کے دینے میں۔ چھکا پنجا نہ جانتا تھا۔ چھل کپٹ کی اس کو چھوت بھی نہ لگی تھی۔ ٹھگے جانے کی فکر نہ تھی۔ ودیا نہ جانتا تھا۔ کھانا ملا تو کھا لیا۔ نہ ملا تو چربن پر قناعت کی۔ چربن بھی نہ ملا تو پانی پی لیا اور رام کا نام لے کر سو رہا۔"

پریم چند کے افسانوں میں تین رجحانات شدید طور پر نظر آتا ہے، اصلاحی، معاشرتی اور سیاسی۔ وہ اپنی افسانہ نگاری کے ہر دور میں ان رجحانات کا عکس پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری کے زمانے میں ہوا کے ہر رُخ کو دیکھا۔ جوں جوں وہ رفتارِ زمانہ سے آشنا ہوتے گئے ان کے طرزِ فکر و احساس میں تبدیلی آتی گئی انھیں افسانہ کے فن پر اتنا ہی عبور حاصل تھا۔ جتنا کسی سیاح کو دنیا کے مختلف شہروں سے یا کسی ڈاکٹر کو جسم کے ایک ایک عضو سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں جس چیز کو بھی جگہ دیتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس پر پوری پوری قدرت حاصل ہے کسی کی معاشی حیات ہو یا کسی دفتر کے بابو کی زندگی کا نقشہ۔ کسی بیوہ کی داستان ہو کسی تعلقہ دار کے جبر و تشدد کا ذکر۔ وہ زندگی کے ایک ایک پہلو کو ایسی خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ اس کردار یا اس گروہ کی کوئی بات ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں رہتی۔

پریم چند سینکڑوں اعلیٰ درجہ کے افسانوں اور کرداروں کے خالق ہیں۔ وہ مافوق الفطرت عناصر سے کام لے کر اپنے افسانوں کے لئے مواد تلاش نہیں کرتے بلکہ زندگی میں روزمرہ پیش آنے والے واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند انسانی فطرت کے بہت بڑے نباض اور نفسیات کے بہت بڑے ماہر ہیں ان کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے جس کی وجہ سے وہ غریبوں پر سرمایہ داروں کے مظالم۔ دولت کی غلط تقسیم، مذہب کے نام پر انسانیت کا استحصال، دیہاتوں کی خستہ حالت، جہالت، غربت اور غلط رسم و رواج کو برداشت نہیں کر سکتے ان تمام باتوں کے خلاف نبرد آزما ہو کر وہ ایک سپاہی کی طرح اپنے قلم سے ہتھیار کا کام لیتے ہیں اور قدم قدم پر ہماری اصلاح اور رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں میں نہ صرف حسن کاری ہے نہ سطحی جذباتیت ہے بلکہ وہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسے پوری صداقت خلوص اور ہمدردی سے ہمارے سامنے رکھ دیتے

...، وہ بے جا رنگ آمیزی سے اپنے فن میں حسن پیدا کرنا
...ں چاہتے کیونکہ ان کا خلوص اور سادگی ہی اپنے جلو میں
تاثیر لئے ہوئے ہے جو قاری کا پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔
...ی یہ خصوصیت ان کی ہر تخلیق میں جھلکتی ہے اور کسی نہ
شکل میں انسانوں کے دکھ درد کا احساس اور پسماندہ
...ام کے مسائل سے دلچسپی ان کی تخلیقات میں نمایاں طور پر
...آتی ہے۔ وہ شدتِ احساس کی بدولت جذبات کی رو
...ں بہہ کر کبھی واقعیت اور حقیقت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے
... واقعات کے ہلکے ہلکے اتار چڑھاؤ میں موت رلا کو بھی اپنا
...رکیے سفر بنا کر اپنی حقیقت کی رو میں بہائے جاتے ہیں پھر
...سی شدتِ احساس میں وہ سنجیدگی کا دامن بھی نہیں چھوڑتے
...ں کی بدولت یہ واقعاتی رنگ اور پختہ ہو جاتا ہے۔ جس کے
... میں وہ تاثرات قلب و دماغ کی گہرائیوں میں اتر کر غم
...غم، حزن و ملال، مسرت و انبساط یا ہمدردی کی ایک ہلکی
...ایک چنگاری چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف مسائل
...ر ان کے نتائج کا ایک ماہرِ فن کی طرح تجزیہ کرتے ہیں
...رجی عوامل کا جو اثر انسانی دماغ پر ہوتا ہے پھر اس قسم کے
اثرات انسانی دل پر ہوتے ہیں ان کی تصویر کشی پر انھیں
...ری قدرت حاصل ہے۔ ہمارے معاشرتی زندگی میں
...تبدیلیاں جس وجہ سے نمو نما ہوتی ہیں۔ پریم چند کسی
...کسی طرح ان کا کھوج نکال لیتے ہیں۔ واقعات کی حقیقت
...ے پہنچنے کی گہری جستجو ان کو واقعیت سے بھٹکنے نہیں دیتی
...ن کا یہ تجزیاتی انداز پورے طور پر ان کے فن پر حاوی ہے
پریم چند کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ
زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس کی اقدار کا تجزیہ
...ے زندگی کے روشن اور تاریک دونوں ہی پہلوؤں کو ہمارے
...سامنے رکھ دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی یہ
...کوشش بھی ہوتی ہے کہ اچھائیوں کا بول بالا ہو اور
...برائیوں کا خاتمہ ہو جائے۔ مثلاً وہ جب جنسیات کے موضوع
اپنے قلم کو جنبش دیتے ہیں، تو وہ اس نفسیاتی حقیقت
انکار نہیں کر سکتے لیکن وہ اس کی آلودگیوں اور برائیوں

سے دامن بچانے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں اور
اس راستہ پر بڑی احتیاط سے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے
ہیں۔ ان کے نزدیک محبت ایک ایسا پاکیزہ جذبہ ہے جس سے بڑے
بڑے کام لئے جا سکتے ہیں۔ اس پاکیزہ جذبہ کے ذریعہ ذہنی
رفاقت قائم ہو سکتی ہے اور یہ جذبہ انسان کو ان رفعتوں
اور بلندیوں تک پہنچا سکتا ہے۔ جہاں اس کی کوئی برابری نہیں
کر سکتا۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں اس سستی رومانیت
کے لئے جگہ نہیں جو بلبلہ کی طرح دل میں اٹھتی اور جلد ہی جوش
سرد ہو جانے پر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتی ہے۔ وہ انسانوں کو
محبت کی ایسی لذتوں سے آشنا کرنا چاہتے۔ جو سدا بہار ہیں
جسے دوام اور ابدیت حاصل ہے اور جو خزاں کی دست برد
سے محفوظ رہتی ہے۔ ان کے نزدیک محبت ایک ایسی حقیقت
ہے جس کی آغوش میں انسانیت پروان چڑھتی ہے اور اخلاقی
قدروں کی پرورش ہوتی ہے۔

پریم چند نے اپنے افسانوں میں اس عہد کے معاشرتی پہلو
نہایت سادگی اور سچائی سے بیان کئے ہیں۔ وہ خیالی رنگینیوں
کی بجائے انسانی زندگی میں پیش آنے والے واقعات ہی کو اپنے
افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔ اس زندگی میں خوشی بھی ہے اور
رنج و غم بھی، نیکی کی رجحانات بھی ہیں اور بدی کے تصورات
بھی، پیدائش کے مسرت کن واقعات بھی ہیں اور موت کے
پریشان کن مناظر بھی۔ اس میں جنگ کے خونخوار دیوتا بھی ہیں
اور صلح و آشتی کے علمبردار بھی۔ اسی لئے ان کے کردار اسی
دنیا کے بسنے والے غریب فاقہ کش کسان مزدور، متوسط درجہ
کے ملازمت پیشہ انسان۔ جابر و ظالم سرکاری کارندے
غریبوں کا خون چوسنے والے مہاجن، ساہوکار اور زمیندار
وطن پر قربان ہونے والے جانباز اور سچائی کا علم بلند کرنے
والے افراد ہیں۔ انھوں نے اس دنیا سے منہ موڑ کر اپنی کردار
نگاری کے لئے دوسری دنیا کے افراد نہیں چنے۔ ان کے یہ کردار صرف
نیکی کے فرشتے اور بدی کے مجسمے نہیں ہوتے بلکہ اس دنیا میں
بسنے والے دغاباز، بے ایمان، جرائم پیشہ، نفس کے غلام اور
جنسیت کے شکار انسان بھی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کرداروں

کی بدولت ان کے افسانے ہماری زندگی کے ترجمان اور حالات و سماجی کشمکش کا حقیقی عکس معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے یہ کردار مصنوعی معلوم نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ افسانے پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ان کرداروں سے مدتوں سے واقف ہیں جنہیں ہم ایک لمحہ کے لئے فراموش نہیں کر سکتے ان کرداروں کا یہ قول خوبی ہے کہ ان کی انفرادی زندگی ہی ہمارے سامنے نہیں آتی بلکہ ان کی بدولت اس سوسائٹی کا نقشہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے جس میں ان کی تخلیق ہوئی ہے۔ "شطرنج" کہانی میں میر اور مرزا کے کردار جب ہمارے سامنے آتے ہیں تو ان کے ذریعے ہم اس زوال پذیر زندگی سے آشنا ہو جاتے ہیں جس میں عیاش لوگ اپنی خرمستیوں اور عیاشیوں پر سلطنتوں کو داؤ پر لگا رہے تھے۔

پریم چند کے فن میں ایسے ظاہری حُسن کے لئے کوئی جگہ نہیں جو معنویت کی گہرائیوں سے ہمکنار نہ ہو۔ انھیں فنی حسن کی نزاکتوں اس کی تاثیر اور اس کے طلسم کا بڑا شدید احساس ہے لیکن وہ فن برائے فن کو ایک غلط چیز سمجھتے ہیں ان کے نزدیک فن میں جبھی نکھار پیدا ہو سکتا ہے۔ جب وہ زندگی کا ترجمان اور اس کا خدمت گزار ہو۔ انھوں نے ابتدائی دور کی چند کہانیوں کے علاوہ کبھی زندگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ انھوں نے اس نکتہ کی اہمیت کا صحیح طور پر اندازہ لگا لیا تھا کہ زندگی ہی حقیقت میں ادب اور خصوصیت سے افسانہ کا موضوع بن سکتی ہے۔

پریم چند کا فنی خلوص جا بجا جلوہ گر نظر آتا ہے، یہی خلوص ان کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں شہری اور دیہاتی زندگی کے جو مرقع دکھائی دیتے ہیں۔ ان پر حقیقت کا بڑا گہرا چھاپ نظر آتی ہے۔

مناظرِ فطرت کی تصویریں کھینچنے پر بھی انھیں پوری قدرت حاصل ہے انھوں نے اپنے افسانوں میں لہلہاتے کھیتوں، برسات کے خوشگوار موسموں اور دیہات کے حسین مقامات کے مناظر کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ ان مناظر کو پیش کرنے کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کی وجہ سے وہ مناظر ایک لمحہ کے لئے ہماری آنکھوں کے سامنے رقص کرتے نظر آنے لگتے ہیں۔

پریم چند کو اپنے ملک کے عوام سے بڑا محبت اور گہرا لگاؤ ہے۔ وہ جب کسانوں اور اچھوتوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جیسے "پوس کی رات" اور "کفن" وغیرہ میں تو ان کی یہ محبت اور تعلق صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے فن کو ایک لمحہ کے لئے بھی اس خصوصیت اور صداقت سے علیحدہ نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ اصل میں ان کی کہانیوں کے موضوعات ہی ان طبقوں کی زندگیاں ہیں۔ وہ کسانوں اور اچھوتوں کے افلاس، ناداری یا اوہام پرستی کو ہی افسانوں کا موضوع نہیں بناتے بلکہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اتنی تاریکی میں بھی انسانیت کا چراغ کس طرح جل رہا ہے اس ناداری، افلاس اور غریبی کے باوجود ان غریبوں میں آن پر مر مٹنے دوسروں کے لئے قربانی دینے اور خلوص سے پیش آنے کا کتنا پاکیزہ جذبہ موجود ہے۔

مقامی رنگ، پریم چند کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت ہے وہ اپنے افسانوں کی دکان کو بدیشی مال سے آراستہ نہیں کرتے بلکہ انھیں سرزمینِ وطن کا ذرہ ذرہ دیوتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے مقامی رنگ کو اردو کے دوسرے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ برتا ہے اور ایسے خلوص سے اپنے فن میں جگہ دی ہے کہ وہ ان کے فن کی منفرد خصوصیت بن گیا ہے۔ اس وجہ سے ان کے افسانوں میں ہمیں بیسویں صدی کے ابتدائی ۳۵ سالوں کی شہری اور دیہاتی زندگی کی دل کی دھڑکنیں صاف صاف سنائی دیتی ہیں۔ اس خصوصیت نے ان افسانوں کو تاریخی، تہذیبی اور مقامی رنگ کی روایات کا سرچشمہ بنا کر کسی خاص عہد کی نہیں بلکہ ابدی اور آفاقی چیز بنا دیا ہے۔

اچھی کہانیوں کے لئے دو چیزوں کو ضروری قرار دیا گیا ہے ایک تو موضوع کی اہمیت اور دوسرے افسانہ نگار کا زندگی سے تعلق پریم چند میں یہ دونوں باتیں فنکارانہ انداز میں موجود ہیں۔ ان کی کہانیوں میں قاری کو اپنی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہر طبقہ کے لوگ جو کسی نہ کسی طرح ظلم کا شکار ہیں وہ افسانہ نگار پریم چند کی ذات میں ایک اچھے دوست اور اچھے مشیر کی طرح ان کے افسانوں میں بہت سی خوبیاں پا کر رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ صرف یہی لوگ

نہیں بلکہ پریم چند نے جن کا برائی سے بھی ذکر کیا ہے وہ بھی ان افسانوں کے آئینہ میں اپنی اصلی شکل دیکھ کر رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

پریم چند کے فن کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی بات کو دہراتے نہیں۔ ان کے پاس موضوعات کی اتنی کثرت ہے کہ وہ ہندو مسلم، مہاجن اور ساہوکار، کسان اور مزدور، عورت اور مرد، شہری اور دیہاتی، بچہ اور بڈھا، پولیس کا سپاہی اور پٹواری اسکول کا ماسٹر اور دفتر کا بابو سب پر یکساں قدرت کے ساتھ لکھ سکتے ہیں۔ گویا ان کے افسانے ہماری معاشرتی زندگی کی مکمل تصویریں ہیں۔ ان میں زندگی کی شگفتگی اور زندہ دلی کے ساتھ ساتھ اس کی سختیوں کا بھی بڑا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کی باکمال مصوری، زبان پر ان کی قدرت، انسانی ذہن اور نفسیات سے ان کی واقفیت اور ہر وقت نئے موضوعات تلاش کرنے کی لگن ایسی چیزیں ہیں جو انھیں غیر فانی افسانہ نگار بنا دیتی ہیں۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ ان کی دردمندی، خلوص، قومی زندگی کے جذبات اور عوام سے سچی محبت نے ان افسانوں میں غضب کی تاثیر پیدا کر دی ہے۔

پریم چند کے افسانوں کی بنیادی خصوصیت ان کی مثالیت پسندی ہے۔ انھوں نے بے شمار مثالی کردار تخلیق کئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ارد گرد جو ماحول ہے وہ مثالی بن جائے۔ معاشرہ میں جو برائیاں جڑ پکڑ چکی ہیں اور جو جنم لے رہی ہیں وہ سب کی سب مٹ جائیں اور ان برائیوں کی جگہ اچھائیاں لے لیں تاکہ ایک مثالی معاشرہ معرض وجود میں آ سکے۔ وہ مثالیت کے ذریعہ ایسی زندگی پیش کرنا چاہتے ہیں جس میں شرافت ہو، نیکی ہو، انسانیت کا احترام ہو اور ایک دوسرے سے ہمدردی ہو تاکہ خیر کی قوتوں کا بول بالا ہو اور شر کی قوتوں کا قلع قمع کیا جا سکے۔

مثالیت پسندی کو اپنے فن کی بنیاد بنانے کے باوجود وہ حقیقت نگاری کا دامن تھامے رکھنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقت نگاری مثالیت کی عمارت بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جب تک معاشرہ کا کوئی فرد زندگی کے کسی پہلو سے واقف ہی نہ ہوگا تو وہ اسے مثالی کس طرح بنا سکے گا۔ اس لئے مثالیت اور حقیقت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پریم چند نے اس سلسلہ میں اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا۔

"حقیقت نگاری اگر ہماری آنکھیں کھول دیتی ہے تو مثالیت پسندی ہمیں ایک دلکش مقام پر پہنچا دیتی ہے۔ اس لئے مثالیت پسندی کو موثر بنانے کے لئے حقیقت نگاری کا استعمال ہونا چاہئے۔"[1]

پریم چند نے اپنے افسانوں میں متانت اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس متانت میں وضعداری اور مشرقی اخلاقی اقدار کا عمل دخل نظر آتا ہے۔ کیونکہ انھیں چھچھورا پن اور گھٹیا انداز پسند نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ زاہد خشک قسم کے افسانہ نگار تھے۔ بلکہ ان کے افسانوں میں متانت کے ساتھ ساتھ مزاح کی ہلکی سی چاشنی بھی پائی جاتی ہے وہ ہنسنے ہنسانے والے انسان تھے اس لئے اس پہلو کا اثر ان کی کہانیوں پر پڑنا بھی لازمی تھا۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں صاف اور کھل کر کہتے ہیں۔ اس لئے وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتا ہے جس سے اس پر خاص اثر ہوتا ہے۔

پریم چند کو زبان پر بھی پورا عبور تھا۔ ان کے پاس جس طرح افسانے کے لئے موضوعات کی کمی نہیں اور وہ ہر افسانہ کے لئے نئے سے نیا موضوع تلاش کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ان کے پاس الفاظ کا بھی ذخیرہ موجود ہے۔ انھیں عمدہ سے عمدہ ترکیبوں اور محاوروں کے استعمال پر قدرت حاصل ہے۔ وہ نہایت سلیس اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان بالکل نرالا اور دلکش ہے۔ اچھوتی تشبیہات اور استعارے برجستہ محاورے اور خوشنما الفاظ جتنے ان کے یہاں نظر آتے ہیں اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملتے۔ ان کے مکالموں کی یہ خوبی ہے کہ ہر کردار اپنی حیثیت کے مطابق زبان استعمال کرتا ہے۔ ان کے اسلوب میں وہ جادو ہے کہ ان کا لکھا ہوا ایک جملہ بھی بیکار معلوم نہیں ہوتا۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر

[1] ساہتیہ کا ادیشیہ (ہندی)، صفحہ ۵۷

کہ پریم چند کو ایک ایسا عظیم فنکار، ماہر افسانہ نگار بنا دیا ہے جو دُنیا کے اچھے افسانہ نگاروں اور فنکاروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے ہمعصروں کے علاوہ بعد میں آنے والے افسانہ نگاری کے ہر عہد میں اچھے لکھنے والے اُن کی قائم کردہ روایات کا سہارا لیتے دکھائی دیتے ہیں اور ہر افسانہ نگار کی تخلیقات میں کسی نہ کسی طرح پریم چند کے فن کا پرتو نظر آتا ہے ●●●

بقیہ: مشاعرہ

ہیں۔ ان کی ہمت بھی جواب دے گئی ہے۔ لہٰذا بادلِ ناخواستہ سامعین تشنگی لئے اپنے اپنے گھروں کا رُخ کر رہے ہیں اور میں سب کی طرف سے شعرائے کرام کا اس طرح شکریہ ادا کرتا ہوں کہ

سلامت رہی و باز آئی

اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں جہاں پردھان بندو خان، رشید احمد پردھان پارٹی۔ بابو سعید احمد سید پور کلاں۔ جے پرکاش، ڈاکٹر نظام ہاشم پرتی، ضمیر احمد امین۔ شمیم علی بی۔ اے۔ محمد مصطفےٰ ایڈووکیٹ۔ محمد یوسف ایم۔ اے۔ محمد کامل ہاشمی بی اے ایل ایل بی، کنوینر مشاعرہ بلا نانہ شب و روز انتہائی جد و جہد کی وہاں جناب الحاج محمد مظہر مظفر نگری۔ قمر مظفر نگری اور توصیف صاحب (دیوبند) والے بھی اپنی مصروفیات کے باوجود اس مشاعرہ کے لئے اپنا قیمتی وقت دیا اور اراکینِ مشاعرہ کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کیا اور اس ننھی سی بستی میں ایک عظیم مشاعرہ کو ملک کے بڑے بڑے مشاعروں کے مقابلہ میں پیش کیا اس مشاعرہ کی ایک یادگاری اور تاریخی حیثیت بنا دی۔ ہم سب ہی مشاعرہ کمیٹی کے شکرگذار ہیں کہ جنہوں نے اس گاؤں میں مشاعرہ منعقد کرا کے یہاں کے مخلص دیہاتیوں کو مشاعرہ سے روشناس کرایا اور کلکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ ہی نہیں ہیں۔ انھوں نے مشاعرہ کی صدارت فرما کر اور چار چاند لگا دیئے ان کا بھی اہلِ قصبہ کی طرف سے شکریہ ادا کرنا ضروری ہے اور اب مجھے بھی اجازت دیجئے خدا حافظ

میں گھر تک نہیں جاؤں گا ہمسایہ پھر آ بھی نہ سکوں گا۔

●●●

بقیہ: سچی عدالت صفحہ ۳۰ سے آگے

اس زمانے میں مرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ کہتا ہوا دھرم باہر کار کے ڈرائیور کو بلانے چلا گیا اور چار عدد سلسل کرپالی کار کے پاس لے گئے اور چارپائی سے اٹھا کر دیونیا کو کار میں لٹا رہے تھے کہ نانی ہانپتا ہوا آیا۔

- بابوجی غضب ہو گیا دُرجن کے ساتھی نے اس کا قتل کر کے سارا روپیہ چھین لیا اور بھاگ گیا:

دیونیا نے دھاڑ مارتے ہوئے کہا غضب تو اس روز ہوا تھا جب دُرجن کی ماں نے مجھے جیتے جی مُردہ دکھا کر ساری جائیداد ہڑپ لی تھی۔ بھگوان کی عدالت واقعی سچی عدالت ہے۔ ●●●

بقیہ: من کہ مکتوب الیہ صفحہ ۳۱ سے آگے

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
(غالب)

رہِ عشق کے کج و پیچ میں جو رفیق تھے سو جدا ہوئے
مگر ایک نالۂ آہ کو مرے دم سے ہمسفری رہی (رفیق)

نازکی اُن کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے (میر)

حالانکہ ثروت صاحب کو جناب حسن فتحپوری کی وکالت ہی کرنی تھی تو "یہ" بمعنی۔ لیکن "کے" استعمال کی مثالیں دورِ حاضر کے اساتذہ حضرات کے اشعار سے دیکر حسن صاحب کو بچا لیتے۔ مگر بقول شخصے "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" والا مضمون لکھ کر اپنا بھرم بھی کھویا

سچی عدالت

(ڈاکٹر اودے سرن ارمان۔ بلاری)

۱۸۵۷ کے غدر میں حیدر بخش خاں نے تین انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں۔ جن کے بدلے میں انہیں ایک گاؤں انعام میں ملا تھا۔ جس کا نام تن شکھ پور تھا۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے اس کا نام حیدر پور رکھ دیا۔

اسی حیدر پور میں ۱۹۰۲ میں چندن نامی ایک دھینور نے رات کے چار بجے اکیلے ہی گیارہ ڈاکوؤں کو جہنم رسید کر دیا۔ کہیں .... ڈاکہ ڈالنے کے بعد یہ ڈاکو ریلوے لائن سے ملحق کھڈ میں اس لئے چھپے بیٹھے تھے کہ وہاں سے گزرنے والی ریل گاڑی کی روشنی میں انھیں کوئی دیکھ نہ لے۔

چندن ریلوے کراسنگ پر آتی جاتی ریل گاڑیوں کو ہری اور لال جھنڈی دکھانے پر ملازم تھا۔ چنانچہ جونہی وہ آنے والی گاڑی کو ہری روشنی دکھانے کے لئے لالٹین لیکر چلا تو اس نے کھڈ میں سے کھسر پھسر کی آوازیں سنیں۔ ڈاکو مالِ غنیمت اچھا خاصا بانٹنے اور اپنی کامیابی پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

چندن ڈاکوؤں کی بات چیت کچھ لمحے تو سنتا رہا۔ پھر اسے یکایک نہ جانے کیا سوجھی کہ گاڑی گزرنے کے فوراً ہی بعد لالٹین ایک طرف رکھ بلّم اٹھا کر اوپر ہی سے وار پر وار کرنے شروع کر دیئے۔ جو اٹھتا اسے گرا دیتا جو سنبھلتا اسے پچھاڑ دیتا کیونکہ سب ڈاکو نچان میں تھے اور ایک کھڈ میں تھے جو بھی بھاگنے یا مقابلہ کے لئے کھڈ سے نکلنے کی کوشش کرتا اس کے سر پر چندن کا بھرپور وار پڑتا اور بلّم ایک آدھ ڈاکو کو ختم کر دیتی۔ کچھ ہی وقت میں سب ڈاکو اپنی کرنی کا پھل پا چکے تھے۔ جب کھڈ میں سے ڈاکوؤں کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ تو چندن نے لالٹین اٹھائی اور کھڈ میں جھانک کر دیکھا تو لالٹین کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ سب کے سب مردہ پڑے ہیں تاہم اس نے بڑی چوکسی سے یہ اطمینان کر لیا کہ شاید ان میں سے کوئی دم سادھے پڑا ہو اور دھوکے سے اس پر وار نہ کرے۔ چندن کے اس غیر متوقع اور بہادرانہ اقدام کا چرچا چاروں طرف جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ ان دنوں بڑے افسر بھی عام طور پر انگریز ہی ہوتے تھے لہٰذا موقع کا معائنہ کرنے پی ڈبلیو آئی مسٹر جون براؤنٹ آئے۔ ہر لاش سے خطرناک ہتھیار اور لوٹ کا مال برآمد ہوا۔

ایک ہندوستانی نے گیارہ ڈاکوؤں کو مار دیا کمال کر دیا۔ مسٹر براؤنٹ کے دماغ میں رہ رہ کر چندن کی بہادری کا خیال آ رہا تھا لہٰذا اس نے چندن کی کمر تھپکی اور دو ہزار پچیس روپے (چاندی کے) انعام میں سرکار سے دلوائے۔ اس واقعے کے بعد چندن اس علاقے کا ایک معتبر اور بہادر شخص سمجھا جانے لگا اس کی بہادری کے چرچے گھر گھر ہونے لگے۔ کچھ دنوں بعد چندن کی بہادری کے سبب لوگ حیدر پور کو چندن پور کہنے لگے۔ ہوتے ہوتے اس گاؤں کو سرکاری کاغذوں میں بھی چندن پور عرف حیدر پور لکھا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ حیدر پور فراموش کر دیا گیا اور چندن پور ہی سرکاری طور پر اس گاؤں کا نام تسلیم کر لیا گیا۔ وقت گزرتا گیا۔ چندن سنگھ کی اکلوتی بیٹی دیویتا کی دو لڑکیاں تھیں ایک انیتا، دوسری نیتا۔ دونوں لڑکیاں وقت آنے پر الگ الگ گاؤں میں بیاہی گئیں۔

نیتا کے شوہر کے پاس گزارے کے بارہ بیگھے زمین تھی اور اس کے چار بچوں میں صرف ایک لڑکا دھرم سنگھ زندہ بچا تھا۔

انیتا کے شوہر کے پاس تیس بیگھے زمین تھی اور چودہ بچوں میں سے اس کا بھی نام لیوا صرف ایک ہی لڑکا ڈھرمی سنگھ زندہ رہا۔ ڈھرمی سنگھ دیہاتی ماحول کے باعث پڑھ لکھ نہ سکا لیکن نیتا جو ایک رئیس زمیندار کے یہاں برتن صاف کرتی تھی۔ اس نے وہاں کے تعلیم یافتہ ماحول سے متاثر ہو کر اپنے لڑکے کو بی۔ اے تک پڑھا دیا جو مہذب اور سمجھدار تھا۔ لہٰذا زمیندار نے اپنے اثر و رسوخ سے اس کو بینک میں نوکر کرا دیا۔ اور ماں کی خوبصورت ممیری تعلیم یافتہ

لڑکی سے شادی بھی کرا دی۔ جہیز بھی ملا سب سالا۔ اس طرح دھرم
سنگھ خوش حال ہوتا چلا گیا۔

دُرجن ایک معمولی دکان دار رہا۔ اس نے دہیان جی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ دُرجن نے بھی کاروبار بھی کیا مگر اس کے باوجود اس کی مالی حالت ... وہ مطمئن تھی لہذا بہن کی خوشحالی سے جلتی تھی کبھی کبھی دل ہی دل میں اس کی ترقی پر جلتے ہوئے حقارت ... کیا فائدہ جو ... حاصل ہو ... بات نہیں ہے تو زمیندار نے دھرما کو پڑھایا کیوں۔ اس کی شادی کیوں کرائی بینک میں نوکری کیوں دلائی ... شادی میں اپنی کار کیوں بھیجی۔ نیتا بن تو ہی نہیں زمین داری کی تالیں بھی ملتی ہوں گی۔ ضرور کوئی بات ہے اس زمانے میں کون بغیر مطلب کسی کا کوئی کام کرتا ہے۔ خاک پڑے ایسی ترقی پر۔ مگر اتنا کہنے پر بھی اس کے من کو سکون نہ ملتا اور وہ بہن اور بہنوئی کی ترقی پر دل ہی دل میں کُڑھتی رہتی جس کے اثرات اس کے چہرے پر بارہ بج گئے۔ جیسے پھانسی کا حکم کسی کے چہرے پر صاف صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔

ماں کی یہ مسلسل اُداسی دُرجن سنگھ سے دیکھی نہ گئی اور بڑی پہیلیوں ... پہیلیوں کو الگ کرتے ہوئے اس نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔ "ماتا جی تمہیں کوئی تکلیف ہے کیا؟"

"کوئی تکلیف نہیں ہے بیٹا" ماں نے اصلیت کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر حقیقت چھپائے نہیں چھپتی ہے۔ "ماں تمہیں کوئی نہ کوئی دُکھ ضرور ہے۔" دُرجن نے ماں کی گری ہوئی حالت سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ "پتا جی کو گزرے ہوئے کئی سال ہو گئے مگر تم میں جو تبدیلی کچھ دنوں سے دیکھنے میں آ رہی ہے وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

"تیرے بیاہ کی چنتا ہے۔"

"اس چنتا میں تو میری صحت گرنی چاہیے۔"

"بیٹے۔ اندرونی جذبات کی اصلیت کو ایک لمبی آہ کے نکالتے ہوئے ... لینا شروع کیا۔ بیٹا میں رات دن اس چنتا میں رہتی ہوں کہ ... تیری حالت کیسے اچھی ہو۔"

"ماں جو آگے نکل گیا وہ پیچھے رہنے کے ہاتھ کیسے آ سکتا ہے۔ اگر مزدور لوگ ہوش رہے تبھی تو اکثر لوگ ترقی کی منزل پر پہنچ کر غفلت کی نیند میں سو جاتے ہیں۔"

"ماتا جی دھرم مجھ سے کون سی باتوں میں اتنا آگے ہے کہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا؟"

"یہ میں سب سمجھتی ہوں بیٹا پھر بھی میں تجھے مالی حالت میں اس سے آگے ہی نکال کر مانوں گی۔"

"علاءالدین کا چراغ ہاتھ لگ گیا ہے کیا؟"

"تیری نانی کی ساری کی ساری زمین تیرے نام کرا دوں گی۔"

"وہ تو سو بیگھے زمین میرے نام ہونے کے بعد میرے پاس چھیاسی بیگھے زمین ہو جائے گی یعنی میں چھیاسی ہزار روپے کی ملکیت کا مالک ہو جاؤں گا۔ مگر نانی جی کے ہوتے ہوئے یہ یک طرفہ فیصلہ ہوگا کیسے؟ کیا وہ ہم دونوں نواسوں کو برابر برابر نہ بانٹیں گی۔"

"اسی اُدھیڑ بن میں تو میں پریشان ہوں مگر یہ ہوگا اور اس کے جیتے جی ہوگا۔ کچھ کام دھن سے ہوتے ہیں کچھ بل سے ہوتے ہیں کچھ دونوں سے نہیں ہوتے بلکہ عقل سے ہوتے ہیں۔"

"ذرا مجھے بھی تو بتائیے یہ کشمیر کا مسئلہ کیسے حل ہوگا۔"

"... تحصیل میں مردہ دکھا دوں گی اور تمہارے نام جائیداد چڑھوا دوں گی۔"

"زندہ کو کیسے مردہ ثابت کرو گی" سڑی ہوئی مچھلی کو کتے کے آگے پھینکتے ہوئے اس نے کہا۔

"گرام پردھان کی جیب گرم کر کے اس کے فوت ہونے کا ساٹیفکٹ بنوا لوں گی اس کی بنا پر پٹواری۔ قانون گو نائب تحصیلدار اور پھر تحصیلدار لکھ دیں گے بس ہو گیا کام۔"

"تمہاری ترکیب تو ٹھیک ہے لیکن کسی نے نانی کو بھری عدالت کھڑا کر دیا تو کیا ہوگا" مچھلی کو سوار سے الگ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں عدالت کو بتاؤں گی کہ دلہینا تو مر گئی ہے یہ میرے باپ نے رکھیل رکھ لی تھی۔ دُرجن کی ماں جس کی لڑکی ہے وہ اس کی جائیداد کی قانونی وارث نہیں ہے۔ کوئی بھی جھوٹ ہو سو بار بولنے پر سچ ہو جاتا ہے۔"

"سرتو ماتا جی کام ہو کر کا ہے ... کو ثابت کرنا وہ بھی عدالت میں معمولی کام نہیں ہوتا ہے۔"

...وہ بھگوان کی ہے، دنیا کی عدالت میں تو جھوٹ کو سچ ثابت کیا جاتا ہے روز سینکڑوں کیس دیکھنے میں آتے ہیں۔ دیکھتے نہیں پولیس ایک سو نو (۱۰۹) کے کتنے کیس عدالت میں بھیجتی ہے جب کہ ایک بھی کیس سچا نہیں ہوتا ہے۔ کوئی قاتل کھلے عام قتل نہیں کرتا چھپ کر ہی مارتا ہے مگر چشم دید گواہ ہوں گے بغیر ہر کیس جھوٹا ہوتا ہے [illegible] موجود ہوتا ہے یعنی گواہ زیادہ تر جھوٹے ہوتے ہیں۔ [illegible] بڑی طاقت ہے [illegible] ہزار کی زمین ملی ہے۔ اگر [illegible] پانچ ہزار روپے اور لگ جائیں تو کیا بات ہے۔ [illegible] لوں گی کوئی بات وہاں مشکل ہوتی ہے جہاں [illegible] تو نوٹوں سے جیبیں بھرو اور جو چاہو کرالو۔"

یہ سن کر دھرم جی چپ ہو گیا جیسے اس کو [illegible] پر پورا پورا بھروسہ ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لوگ [illegible] پانی میں ایمان کو ڈبو دیتے ہیں مگر پیٹ میں اخلاق کو پھونک دیتے ہیں، ہاں میں زبان بگاڑ لیتے ہیں تو پھر کیا کچھ نہیں ہو سکتا [illegible] وقت کا سیر تمک آگے بڑھتا گیا انیتا نے جو سوچا تھا وہی کیا [illegible] کی نوازش تک تعمیل نہیں ہونے دیئے [illegible] جواب ہو گیا۔ ایک دن دیوینا کو گنگا نے لات ماری [illegible] گر گئی اور کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی جس سے اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا۔ اب وہ پڑوسیوں کے رحم و کرم پر دن گننے لگی اور اسے اب زیادہ دن زندہ رہنے کی امید نہ رہی۔ تب ہمت کرکے اس نے گاؤں کے پردھان کو بلا کر کہا۔

"بیٹا کسی وکیل کو بلا دے کیونکہ اب میرا آخری سمے قریب ہے۔"

"چاچی تم گھبراتی کیوں ہو تمہاری دو لڑکیاں جس دو نواسے ہیں خوب سیوا کریں گے۔ علاج کرائیں گے ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ہاری تھکی باتیں کیوں کرتی ہو [illegible] ہے..."

"نہیں بیٹا مجھے زیادہ دنوں تک جینے کی امید نہیں ہے اور اب میں اپنی جائیداد کی وصیت کرنا چاہتی ہوں تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو۔"

"چاچی تمہاری جائیداد تو انیتا نے اپنے لڑکے دھرم جی کے نام کرا لی ہے۔ اب کاہے کی وصیت کرو گی" پردھان نے ساری داستان سنا دی۔ دیوینا یہ سن کر چونکی اور کہنے لگی

"مذاق کر رہے ہو"

"چاچی تم سے میں مذاق کروں گا کیا؟" یہ سچ ہے

"ہے بھگوان یہ کیا ہوا میرے جیتے جی انیتا نے مجھے مار دیا اور میری ساری جائیداد ہڑپ لی۔ مجھے معلوم بھی نہیں ہونے دیا۔ یہ کیسا انصاف ہے۔ کیا قانون ہے۔ کیسی عدالت ہے بھگوان نے بھی آنکھیں موند لیں کیا۔ [illegible] تو سچ بھی یہ کیا تھا کوئی بات نہیں، میرے دل کو دکھانے والی بھی نہیں رہے گی۔ دھرم جی کو یہ جائیداد پھلے گی نہیں۔ یہ انصاف بے انصافی ہی ہوتی ہے یہ کبھی پھلتی نہیں ہے دھرم سنگھ کو بلوا دو" آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے دیوینا نے پردھان سے کہا۔ "بہت اچھا چاچی ابھی لو" کہتے ہوئے پردھان چلے گئے اور ایک نائی کے ہاتھ خبر بھجوا دی زمیندار کی کار میں بیٹھ کر انیتا دھرم سنگھ اور اس کی بہو آگئے جس وقت تینوں آئے تو دیوینا کے الگ الگ پیر چھوئے اور اس نے مسکرا کے آشیرواد دی۔

"ماتا جی تم بیمار ہو جاتی ہو تو خبر کیوں نہیں کرتی ہو کیا ہو گیا؟"

"خبر کر تو دی بیٹی کہ میری کمر ٹوٹ گئی ہے"

"کیسے؟" انیتا نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"بھگوان کی بے انصافی سے"

"بھگوان کی بے انصافی سے تمہاری کمر ٹوٹ گئی میں بھی یہ سن کر ماں چپ رہی اور اصلیت ظاہر نہیں کی۔ جب ماں نے کچھ نہیں کہا تو انیتا پھر بولی: "تم کو تکلیف ہو گئی تھی تو میرے گھر چلی آتیں یہاں کیوں پڑی رہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے تم اتنا دکھ اٹھا رہی تو دھتکار ہے ہمارے جیون پر تم نے ایسا کر کے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ ماں باپ کی سیوا لڑکوں کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا"

"نہیں بیٹی تجھ پر تو کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا تھا تو میرا خیال ہمیشہ سے رکھتی آئی ہے کئی بار پہلے بھی اپنے گھر لے جانے کو کہہ چکی ہے۔ میں ہی نہیں گئی تھی کیونکہ تیرے گھر میرا رہنا اچھا نہیں لگتا ہے تو بیٹی ہے میں ماں۔"

"ماتا جی تم پرانی باتوں کو مانتی چلی جاؤ" دیوینا بہت آگے نکل

بچی ہے داماد تو بیٹے کے برابر ہوتا ہے اور بیٹے کے پاس رہنا کیا برا ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹی میں بھی کچھ نئی باتوں کو اپناؤں گی" مسکراتے ہوئے دیو نیا نے کہا اور انیتا کی کرتوت سنادی اور بولی۔ "بیٹی میرے باپ مرتے وقت انگریز کے دیئے ہوئے انعام کے دو ہزار پچیس روپے مجھے دے گئے تھے۔ میں نے بہت سنبھال کے رکھے ہیں دودھ کی بڑوسی کے نیچے دبے ہوئے ہیں کھود کر نکال لو اور لے جاؤ چاہتی تو یہ تھی کہ دونوں کو برابر بانٹتی مگر اس بے ایمان سے میرا دل پھٹ گیا ہے اور اب ان میں سے ایک روپیہ بھی اس کو نہیں دوں گی۔"

"ماں جی آپ بدلے کی بھاؤنا کو تیاگ کر دونوں کو بلالو اور روپیہ برابر بانٹ دو اس کی چالاکی اور مکاری اس کے ساتھ ہے بھگوان اس کا انصاف کرے گا بندے کو اس کا قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے۔"

"اچھا بیٹی تیری ہی بات بڑی سہی۔ کلو نائی کو بھیج کر اسے بھی بلالو۔"

انیتا خود تو نہیں آئی کیوں کہ وہ ماں کے سامنے کس منہ سے آتی مگر اس نے اپنے لڑکے اور ایک بدمعاش کو اس کے ساتھ بھیج دیا جس نے مقدمے کے دوران اس کا ساتھ دیا تھا۔ دیو نیا نے دھرم اور درجن کو پاس بیٹھا کر کہا۔ "میرے جیون بھر کی یہی پونجی ہے تم دونوں یہ روپیہ گن کر بانٹ لو۔" انیتا کے کالے کارناموں پر بغیر انگشت نمائی کئے دیو نیا نے کہا۔ "انہیں گننے کا کام دھرم بھائی کریں گے میں نہیں۔" درجن نے کہا۔

"یہ مجھ سے بھی نہیں ہوگا" دھرم نے کہا

"تم دونوں نہیں کرو گے تو کلو نائی تو محمدی بھٹیارا کو بلالا وہ اس گاؤں میں سب سے زیادہ غریب ہے اس کام کو وہی ٹھیک کریگا۔"

"بیٹیک کا کام بھٹیارن کو سونپا جارہا ہے۔" کلو نائی بولا۔

"ہاں بیٹا ایمان اور — غریب ہی کے پاس رہتا ہے۔ بھٹیارا کالا اور روپے گن گن کر بیس بیس کی ڈھیریاں ترتیب سے لگادیں تو دیو نیا نے دھرم سنگھ سے کہا۔

"ان میں سے پچیس روپے اٹھا کر مجھے دے" یہ سن کر نائی بھٹیارا اور وہ بدمعاش تینوں ہی چونکے۔ اس نے بہو کو اشارے سے بلایا اور ان روپیوں کو اس کے سر پر نچھاور کر کے بھٹیارن کو دیدیئے اور بولی۔ "بیٹی میرے ہنسوں کے اس جوڑے کو دعائیں دیتی ہوئی جانا۔"

بھٹیارن نے خوشی خوشی دامن پھیلا دیا اور روپے لے کر دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ دھرم سنگھ نے یہ دیکھ کر نانی سے کہا۔

"نانی جی اس میں سے آدھے روپے درجن کے اوپر نچھاور کرنے چاہئے تھے کیوں کہ یہ بھی تو تمہارا نواسہ ہے۔"

"بیٹے درجن اور اس کی ماں کو میرے دھن کی ضرورت ہے اور نہ دعا کی۔ درجن جا اندھیرا ہو رہا ہے۔" یہ سن کر درجن نے دس سیر چاندی (ایک ہزار روپے) اٹھائی اور روانہ ہو گیا۔ نانی نے دھرم سے پھر کہا میری قمیص میں ایک نوٹ پڑا ہے ذرا نکال تو۔" یہ سنتے ہی دھرم نے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی قمیص کی جیب سے نوٹ نکال کر دیا۔ "کیا کرو گی؟" نانی سے پوچھا۔

"اس نائی نے میری بہت خدمت کی ہے اس کو خالی ہاتھ تھوڑے ہی جانے دوں گی۔" یہ سنتے ہی دھرم سنگھ نے نوٹ پیچھے کھینچ لیا اور روپیوں کی ڈھیری میں سے پچیس روپے اٹھا کر نائی پر سے نچھاور کر کے نائی کو دے دیئے۔ نانی کہتی ہی رہ گئی "کیا کر رہا ہے کیا کر رہا ہے؟" وہ نچھاور کرتا رہا اور کہتا رہا "ایسی نانی کسی کو بھی نصیب نہیں ہوگی۔ اس صدقے سے اور نائی کی دعا سے تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔

نائی روپے رومال میں باندھتے ہوئے بولا۔ "مہاراجہ ہو یا شہنشاہ نائی کے آگے سب کے سر جھک گئے ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے خدا کے آگے بھی سر نہیں جھکائے ہیں لیکن نائی کے آگے ان کے سر بھی جھک گئے غرض یہ کہ نائی کے آگے ہر ایک کا سر جھک جاتا ہے آج میں آپ کے آگے سر جھکا کر اللہ سے آپ کی خوش حالی خوش اقبالی کی دعا کرتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا نائی چلا گیا۔

"نانی جی آپ کو ہم اپنے ساتھ لے چلیں گے۔" دھرم بولا۔

"کیا کرو گے وہاں لیجا کے میری بڑھاپے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اب میں جلدی مر جاؤں گی۔"

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

من کہ مکتوب الیہ

مورخہ ۲۲ مارچ [illegible]

از سبل نقشبندی ۱

کشم روڈ، بانسواڑہ

مکرمی و محترمی ناصر ساحر صاحب

سلام مسنون!

فروری [illegible] کا "شانِ ہند" دستیاب ہوا۔ "من کہ مکتوب الیہ" میں جناب ثروت میر ٹھی صاحب کا گرامی نامہ پڑھ کر ثروت صاحب کی علمی اور عروضی لیاقت کا اندازہ ہوا۔

موصوف نے جناب حسن فتحپوری کی وکالت فرماتے ہوئے جس بھونڈے پن سے جناب شاہد رتلامی کا وش قادری۔ بیکل اپنی اور راقم الحروف پر اعتراضات کئے ہیں۔ وہ ان کی ناشناسئی علم و فن کا بہترین نمونہ ہیں!

شاید یہی "شانِ ہند" کی عظمت اور آپ کی بالغ نظری پر بھی حملہ کیا ہے۔ جب کہ آپ جیسے باریک بین اور بالغ نظر ایڈیٹر ہندوستان میں چند ہی ہوں گے۔ خیر...

بہت ہی مختصر طور پر موصوف کے اعتراضات کا جواب عرض کر رہا ہوں براہ کرم میرے اس عریضہ کو "شانِ ہند" کی قریبی اشاعت میں شائع فرما کر علم و فن کے چراغ کو روشن رکھنے میں میری مدد کریں!

شاہد رتلامی کے "بہنے" کی "ے"۔ اور بیکل صاحب کے "ہو" کی "و" وزن سے ساقط ہونے پر ثروت صاحب معترض ہیں جب کہ اصولِ عروض و تقطیع کے تحت عربی اور فارسی کا کوئی حرف تقطیع میں نہیں گرایا جاتا ہے بالخصوص اس کے ہندی اور اُردو کے حروف تقطیع میں بلاشبہ گرا دیئے جاتے ہیں۔

اس کی مثال بھی ملاحظہ فرمایئے!

وہ خط نہیں لکھتا تو ہو کیوں دل تنگی
تازہ یہ زمانے کی نہیں نیرنگی

ہم نے بھی کیا نامے کا لکھنا موقوف
اب اپنے قلم کو بھی ہے عذرِ لنگی (ناسخ)

تقطیع: وہ خط ن - ہِ لکتا تُ - ہُ کو دل تن - گی
مفعول - مفاعیل - مفاعلین - فع

تازہ یہ - زمانے ک - نہی نیرن - گی
مفعول - مفاعیل - مفاعلین - فع

ہم نے ب - کیا نام - ک لکنا مو - قوف
مفعول - مفاعیل - مفاعلین - فاع

اب اپن - قلم کُ بی - ہ عذر ے لن - گی
مفعول - مفاعیل - مفاعلین - فع

(بحر الفصاحت صفحہ ۲۷۸)

ناسخ کے ان دو قطعہ شعروں میں ہندی اور اُردو کے کتنے حروف تقطیع میں گرائے گئے ہیں۔ خود دیکھ لیجئے!

شاہد صاحب کے دوسرے شعر میں "تو" کاوش صاحب کے مطلع میں "اور" میرے شعر میں "میں" چھپنے سے رہ گیا ہے۔ اسے ہر باشعور اور موزوں طبیعت انسان مصرع پڑھتے ہی سمجھ لے گا۔

بیکل صاحب کی غزل میں ردیف "ہو جاتا ہے" نہیں ہے بلکہ صرف "ہو جاتا" ہی ہے۔ براہ کرم ایک بار پھر نومبر [illegible] کا "شانِ ہند" دیکھ کر اپنی اصلاح کر لیجئے!

فریب کاروں کی نگری ہے بے قصد کیسے رہوں
قصور واروں میں یکسر بے قصور کیسے رہوں

میرے اس مطلع پر موصوف کا اعتراض ہے کہ مصرعہ ثانی میں دوبار لفظ "میں" آنے سے تنافر پیدا ہو گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ثروت صاحب نے عیوب و محاسن کے فقط نام ہی سنے ہیں۔ اس سلسلے میں حقیقت قطعی نہیں رکھتے!

تکرار لفظی کے ثبوت میں مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کر لیجئے۔

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

بیٹے والے ذرا سوچیں...

"جو لوگ بیٹیوں کے بیاہ کی کٹھنائیوں کو بھوگ چکے ہوتے ہیں، وہی اپنے بیٹوں کی شادی کے موقع پر بالکل بھول جاتے ہیں کہ ہمیں کتنی ٹھوکریں کھانی پڑی تھیں۔ ذرا سی ہمدردی ظاہر نہیں کرتے، بلکہ لڑکی کی شادی میں جو تاوان اٹھایا تھا اسے سود مرکب کے ساتھ بیٹے کے بیاہ میں وصول کرنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ کتنے ماں باپ اس چنتا میں گھل گھل کر بے وقت موت کا شکار ہو جاتے ہیں، کوئی سنیاس اختیار کر لیتا ہے، کوئی بوڑھے کے گلے اپنی بیٹی کو منڈھ کر اپنا گلا چھڑاتا ہے۔ اہل اور نااہل کے بارے میں سوچنے کا موقع کہاں؟ ٹھیلم ٹھیل ہے؟"

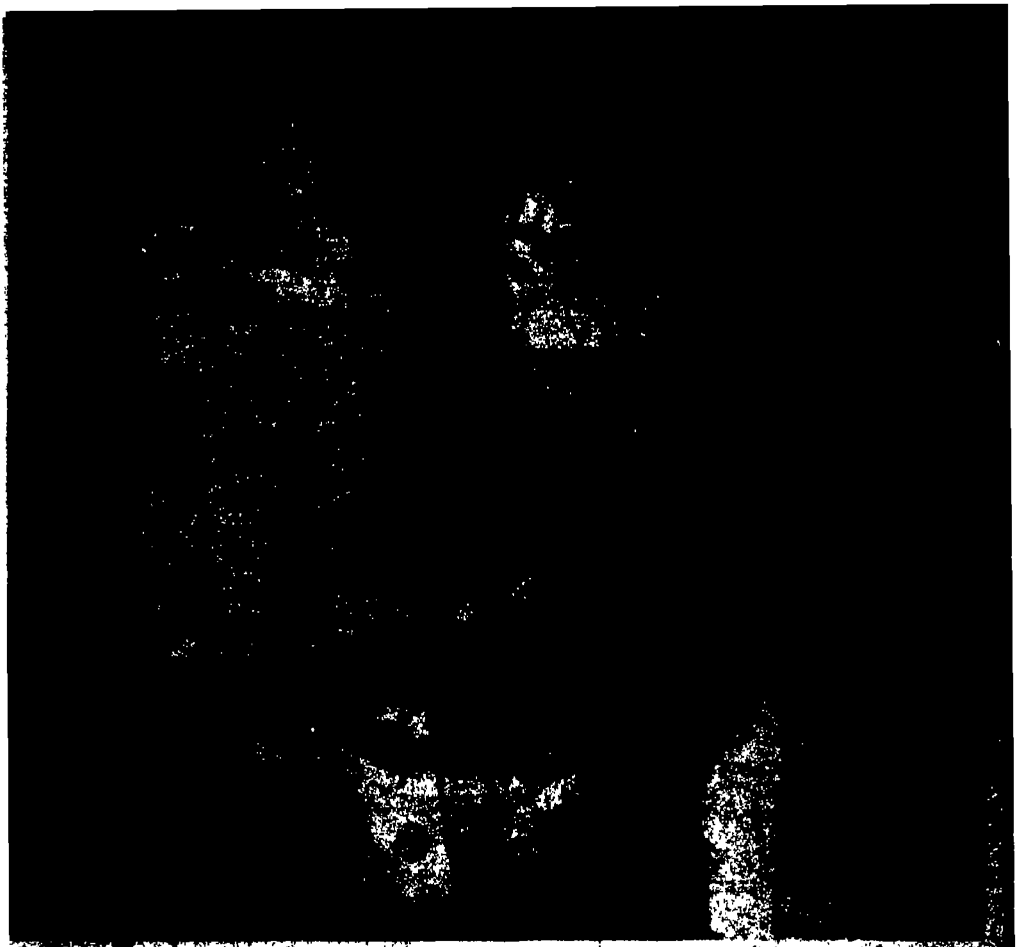
—— منشی پریم چند (نرملا کہانی میں سے)

کیا یہ سب آج بھی سچ نہیں، بلکہ جہیز لینے دینے کی بدعت اور بھی گھناؤنی صورت اختیار نہیں کر گئی؟



شاذ





شانِ ہند دہلی

ایڈیٹر: سرور تونسوی

جلد نمبر ۲ شمارہ [illegible] ۱۹۷[illegible]

ہندی کے مسلمان شعراء

۱۔ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد پر ایسی مفید کتاب آج تک نہ تو اردو میں شائع ہوئی ہے نہ ہندی میں۔

۲۔ اس کتاب کو پڑھنے سے اردو اور ہندی کے خود ساختہ نام نہاد دانشور جو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اردو اور ہندی کی اجارہ داری کے دامن سے چمٹے بیٹھے ہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے جو کام سرکار سے [illegible] نہ ہو سکا اور جو کام اردو اور ہندی کے یہ نام نہاد دانشور آج تک نہ کر سکے وہ ایک فرد واحد نے اپنی لگن کے باعث پورا کر دیا۔

۳۔ اس کتاب نے ہندی مسلمانوں کا سر اونچا کر دیا ہے اور وہ ثبوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی زبان کی نشوونما اور ترقی میں جو کردار مسلمانوں نے ادا کیا ہے اسے ہندی زبان فراموش نہیں کر سکتی اور ہندی مسلمان اس سلسلے میں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے کوسوں آگے دکھائی دیتے ہیں۔

۴۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہر ہندی داں [illegible] گن گان کرے گا اور ہر اردو داں مصنف کو داد دیئے [illegible] کہ جس نے اردو ادب کو [illegible] تصنیف سے مالا مال کر دیا۔

۵۔ ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی، انجمن ترقی اردو ہند اور ریاستی اردو اکادمیوں [illegible] غیرت کے [illegible] اثر دکھاتے [illegible] کتابیں شائع کر کے [illegible] ہندی کے مسلمان شعراء [illegible] تہذیب و تمدن کی آئینہ دار تصنیف کو شائع کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

۶۔ آپ پہلے اس [illegible] کی صداقت کو جانچنے کے لئے یہ کتاب پڑھئے [illegible] اس کی پوری قیمت لے لیجئے۔ حضرت [illegible] چودھری نے اپنی زندگی کے عزیز ترین پچاس سال اس کتاب کی تالیف پر صرف کئے [illegible] زندگی بھر کا سرمایہ اس کتاب کے [illegible] کرنے پر لگا دیا اور اس کتاب کو [illegible] مستند بنانے کیلئے [illegible] کتابوں کا مطالعہ کرنے میں اپنی آنکھوں کو قربان کر دیا۔ [illegible] ہندی کے مسلمان شعراء شائع ہو گئی ہے [illegible]

قیمت ۱۲/ روپیہ — مزید معلومات کے لئے دفتر شان ہند [illegible] نئی دہلی [illegible] سے رجوع کیجیے۔

[illegible]

اُردو بیورو کی مطبوعات

فرہنگِ آصفیہ

مولفہ سید احمد دہلوی

یہ اُردو زبان کی وہ مشہور اور مستند لغت ہے جو عرصہ سے نایاب تھی۔ اس لغت میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی کے وہ الفاظ شامل ہیں جو اُردو زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ اس کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں:

- عدالتی الفاظ
- بیگماتی محاورات۔
- اہل پیشہ و اہل حرفہ کی ضروری اصطلاحات۔
- داخل روز مرہ، ضرب الامثال
- اشارات و کنایات۔
- تاریخی واقعات
- مناسب حال ماتے۔
- علم زبان کے رموز و نکات
- اُردو صرف و نحو کے قاعدے
- ملک کی متداولہ رسمیں۔
- قدیم و جدید تحقیقات کے اختلافات مع نظائر
- نظم و نثر میں لفظوں کے کثیر المعانی استعمال کی مثالیں اور وجہ تسمیہ
- تمام اولیا اور فقرائے ہند کے اسمائے گرامی مع حالات۔
- علمائے کرام کے نام اور مختصر سوانح عمریاں۔

علاوہ ازیں دیگر امور کی تشریحات بھی اس لغت میں درج ہیں۔ چار جلدوں پر مشتمل یہ لغت 55 ہزار سے زائد الفاظ کا بے مثال ذخیرہ ہے۔ زنکو آفسٹ سے شائع کردہ اس فرہنگ میں پہلی ایڈیشن کی بعض غلطیوں کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔

سائز $\frac{20 \times 30}{4}$ ڈھائی ہزار سے زائد صفحات:

قیمت: مکمل چار جلدیں 150 روپے

انیس کے مرثیے (جلد دوم)

مرتبہ صالحہ عابد حسین

میر انیس کے بہترین مراثی کا یہ مجموعہ کلام کی سادگی و پرکاری، فصاحت و بلاغت، فنکاری و صناعی کا بے مثل نمونہ ہے۔ کتاب کے آخر میں اختلاف نسخ کی تشریحات اور فرہنگ کی شمولیت کی وجہ سے یہ کتاب اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔

سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ صفحات 576

قیمت: 38 روپے

★★

انشا کا ترکی روزنامچہ

ترجمہ، ترتیب، تحشیہ: ڈاکٹر سید نعیم الدین

اس نادر و نایاب روزنامچے سے اُردو کے عظیم شاعر و عالم انشا کی شخصیت و سیرت کے علاوہ اس عہد کے ایسے واقعات کی تصویر سامنے آجاتی ہے جن کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں خالی ہیں۔

اس نادر و نایاب روزنامچے کو اُردو میں پہلی بار ترقی اُردو بیورو نے شائع کیا۔ ترجمہ براہ راست ترکی زبان سے کیا گیا ہے۔

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ صفحات 68

قیمت: 4 روپے 50 پیسے

قدیم ہندی فلسفہ

رائے بہادر موہن لال ماتھر

اس کتاب میں مصنف نے وید اپنشد، بھگوت گیتا، بدھ مت، نیائے ویشیشک، سانکھیہ یوگ، میمانسا درشن، ویدانت اور ادویت کے طرز ہائے فکر اور فلسفوں سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ فلسفہ جیسے خشک موضوع کو مصنف نے نہایت شگفتہ انداز میں پیش کیا ہے۔

سائز $\frac{18 \times 22}{8}$: صفحات : 376

قیمت: 15 روپے 50 پیسے

ہندوستانی گاؤں

مصنف: شیاما چرن دوبے

مترجم: عبد القادر عمادی

ڈاکٹر دوبے کی یہ کتاب اپنے اچھوتے موضوع کی وجہ سے نہایت اہم ہے۔ اس میں ہندوستان کی دیہی زندگی اپنے اصل رنگ میں پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب دیہی معاشرے سے متعلق بے بہا معلومات فراہم کرتی ہے۔

سائز: $\frac{18 \times 22}{8}$

صفحات: 256

قیمت: 10 روپے 75 پیسے

فراہمی کتب اور دیگر امور کے لیے پتہ:

شعبۂ فروخت و نمائش، بیورو فار پروموشن آف اُردو

منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ کلچر، ویسٹ بلاک 8، آر کے پورم، نئی دہلی - 110022

davp 88/463

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ صبا چہ کرد؟

کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس

۱۸، ۱۹ اور ۲۰ اپریل ۱۹۸۰ء اردو کی تاریخ میں تین ایسے دن ہیں جو مدتوں یاد رہیں گے۔ ان دنوں میں مشہور افسانہ نگار جناب رام لعل صاحب نے تن تنہا دوسری غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کا لکھنؤ میں انعقاد فرمایا۔ اور اس قول کو سچ کر دکھایا کہ لگن ہو تو ہر مشکل سے مشکل کام بھی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

حکومت چاہتی ہے (محض ووٹوں کے لئے) کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اردو کے نام پر چند لقمہ ہائے تر پھینکے جائیں تاکہ منہ کی واہ واہ بھی ہو جائے اور مسلمانوں کے ووٹ بھی محفوظ ہو جائیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں کہ کانگریس نے اس بار اپنے الیکشن مینی فیسٹو میں اردو کو مراعات دیئے جانے کا وعدہ کیا ہے ۱۹۴۷ء کے بعد کانگریس کے ہر الیکشن مینی فیسٹو میں اس وعدہ کا اعادہ کیا جاتا رہا مگر یہ وعدہ کسی وقت بھی ایفا نہ ہو سکا۔ اور یہی کہا جاتا رہا کہ یہ مسئلہ صوبائی حکومتوں کے زیر تحت ہے لہذا اگر کوئی صوبائی حکومت اپنے صوبہ میں اردو کو ثانوی زبان کا درجہ دینا چاہے تو مرکز کا کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بظاہر یہ قانونی ارشاد بالکل درست تھی مگر مرکز یہ جانتا تھا کہ نہ کوئی صوبہ ایسا مطالبہ کرے گا اور نہ اسے اس سلسلے میں کسی قسم کی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ جنتا حکومت آئی تو اس نے صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا کہ اردو والے [illegible] ایسا [illegible] نہیں ہو سکتا جنتا حکومت [illegible]۔ اور اب کانگریس کی حکومت آئی۔ مگر اس [illegible] ہند مسلم [illegible] ہیں [illegible]

ہے۔ حالانکہ ان [illegible] سے جائزہ لیا جائے تو حالات پھر اسی [illegible] پیش کریں گے۔ تاہم حکومت نے سمجھ لیا کہ مسلمان اس سے بدظن ہو رہا ہے اور اس بدظنی کو دور کرنے کے لئے سیاستدانوں نے اردو کا نسخہ تجویز فرمایا اور کہا یہ جانے لگا کہ کانگریس نے اپنے الیکشن مینی فیسٹو میں اردو کے بارے میں کئے گئے وعدے کو نبھانے کی غرض سے اردو کو [illegible] دینے کی تحریک شروع کر رہی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ مسلمانوں کے تمام تر مسئلے اردو کی اس نقلی حمایت میں غرقاب کرنے کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور کریڈٹ یہ لیا جا رہا ہے کہ ہم بات کے دھنی ہیں جو وعدہ کیا تھا اب اسے پورا کرنے کے لئے اقدامات کرنے لگے ہیں حالانکہ کانگریس (ا) نے الیکشن مینی فیسٹو میں تو اور بھی کئی وعدے کئے ہیں اور ایسے وعدے کہ جن کا اثر ملک کے ہر فرد پر پڑتا ہے مگر ان کی تکمیل کے لئے اس انداز میں جلدی نہیں دکھائی جا رہی۔

تاہم کسی بہانے سہی اردو کے لئے یہ فال نیک تھی کہ حکومت اس کے لئے جائز مراعات دینے کے لئے تیار ہو رہی ہے مگر حکومت کا یہ طرز عمل اردو کے لئے مہلک زہر سے کم نہیں کہ وہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان تسلیم کرتے ہوئے اس کے لئے کچھ مراعات حق کے طور پر نہیں بلکہ بخشش کے طور پر [illegible]۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں کوئی [illegible] ہو یا [illegible] مسلمان [illegible] ہوتا ہے کہ اردو صرف اور صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ لہذا اردو کے نام پر جو بھی [illegible] حکومت [illegible]

مسلمانوں کی منافرت کا سبب ہے۔ حکومت مسلمانوں کی اس اُردو فہمی
پالیسی سے بے خبر نہیں ہے اور اسی لئے اس نے یہ پابندی
لگا دی کہ ہندوستان کی انجمن ترقی اُردو ہند کے دفتر میں
غیر مسلم تنخواہ دار چپراسی تک بھی نہیں رکھا جا سکتا اور
ہاں اگر مفت کا معاملہ ہو تو بے شک عالی جناب جسٹس
آنند نرائن ملا کو اس کا صدر بنایا جا سکتا ہے۔ بہار تو
اور حیدرآباد کو چھوڑ کر ہندوستان کے جن صوبوں میں
اُردو اکاڈمیاں موجود ہیں۔ ان میں بھی کسی غیر مسلم کو تنخواہ دار
ملازم نہیں رکھا جاتا۔ اُردو اکاڈمی۔ حیدرآباد میں فقط ایک
عہدہ دار تنخواہ دار ہے اور وہ بھی کسی خاص وجہ کے باعث
ہے۔ ان حالات میں محض زبانی لفاظی کا جادو کب تک چل
سکتا ہے۔ لہٰذا غیر مسلم اُردو دانشوروں نے اس حق تلفی
کو محسوس کرنا شروع کیا مگر ہر ہندو ادیب یا شاعر نہ تو بیکار
ہے اور نہ ہی مالی طور پر قلاش۔ اس لئے اس حق تلفی کو عام
طور پر درگزر کیا جاتا رہا۔ اور ہندو ادیبوں اور شاعروں
نے بے لوث طور پر جو اُردو کی خدمت کی ہے ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو
کے ہندوستانی مسلمان دانشور اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔

۱۹۴۷ء کی طرح جناب رام لال صاحب نے اب پھر یہ محسوس
کیا کہ بہار کے مسلمان اُردو دانشور اُردو کے ہندو ادیبوں
اور شاعروں کو نظر انداز کرتے ہوئے حکومت کے اس نظریے
کو عملی طور پر تسلیم کرتے جا رہے ہیں کہ اُردو زبان صرف مسلمانوں
کی ہی ہے تو دوسری غیر مسلم اُردو مصنفین کانفرنس کے
انعقاد کا اعلان کر دیا گیا جس پر یار لوگوں نے یہاں تک کہا
کہ یہ کانفرنس حکومت کے اشارے پر ہو رہی ہے۔ جب
کہ حکومت نے اس کانفرنس کے لئے ایک پیسہ تک کی مالی
امداد نہیں دی۔ کانفرنس کے جملہ اخراجات سوینیر میں شائع شدہ
اشتہارات دینے والے حضرات نے۔ کچھ اُردو اکاڈمیوں کے مالی
تعاون سے پورا کیا گیا۔ تمام مندوبین نے آنے جانے کے
اخراجات خود اٹھائے۔ ڈیلی گیٹوں، مہمانوں اور ڈیلی گیٹوں
سے زیادہ ہمت مردوں کے کھانے اور رہنے تک کی ذمہ داری
شفقت ... صاحب نے اٹھائی۔ ... مسلم مسافر خانہ کو ...

... کر ہمارا فیصلہ کر لیا۔ اس کے باوجود ... خدمت ...
کا یہ کیا ہے کہ رام لال صاحب نے قید و بند ... لیا ہے۔
کچھ بھی کہہ لیجئے۔ گیا کانفرنس اس قدر کامیاب
تھی کہ آج تک کوئی اُردو کانفرنس ایسی کامیاب نہیں ہوئی۔
نام تو اس کا تھا غیر مسلم اُردو مصنفین کانفرنس مگر حقیقتاً
میں یہ سب کی اُردو کانفرنس تھی۔ اور ایسی جمہوری کامیاب
کانفرنس کہ اس کے بعد کوئی عالمی اُردو کانفرنس یا کسی دوسری
اُردو کانفرنس کا انعقاد محض منہ چڑانے والی بات ہوگی۔ یا
عوام کا روپیہ برباد کرنے کا موجب۔ کونسی ایسی بات باقی
رہ گئی جو اُردو سے متعلق ہو اور اس کانفرنس میں زیر بحث
نہ لائی گئی ہو۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھئے اور آیئے کل ہند
دوسری غیر مسلم اُردو مصنفین کانفرنس کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ
فرمایئے۔

۱۔ ۱۸ اپریل کی صبح کو لاری ہال مسلم مسافر خانہ میں سبجیکٹ
کمیٹی کا اجلاس جناب راج بہادر گوڑ کی صدارت میں ہوا
ڈاکٹر نرلیش کنوینر تھے۔ جناب جمنا داس اختر مہمان خصوصی اور
اس اجلاس کا افتتاح آچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب نے
فارسی تقریر سے فرمایا۔ جناب رام لال صاحب نے تمام مندوبین
کا خیر مقدم کیا۔ اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جو تقریر دل
پذیر فرمائی وہ اس قدر دلائل و براہین کو جلو میں لئے ہوئے تھی
کہ تقریر کا ایک ایک لفظ دل میں اترتا گیا۔ ڈاکٹر نرلیش، ایس
کے چھتلی، راجندر ورما، سوز برکتیش بترا، ڈاکٹر مدنا منظر
جوزنت اکبر احمد آباد، سرون کمار گپتا، ڈاکٹر رفیقی، اکیشی
صغرا جمنا داس اختر نے بھی اپنے اپنے صوبہ کی نمائندگی کرتے
ہوئے قرار دادیں ترتیب دینے کے سلسلے میں تقاریر فرمائیں
گلزار دہلوی نے خالص سیاسی انداز تقریر اختیار کرتے ہوئے
جذبات سے لبریز تقریر کی اور کئی بار تالیوں کے شور میں
انھیں تقریر میں مزید ... رنگ کی آمیزش کرنی پڑی
(تحریک آزادی کے ... تقریر ... سکتے تھے) آخری
جناب شیام کرشن نگم (دہلی) کی تقریر (...)
کے بعد یہ اجلاس ... ایک بجے ختم ہوا ...

شروع میں ڈاکٹر نریش نے قرارداد تعزیت پڑھی کہ گزشتہ اردو کانفرنس کے بعد اردو زبان کے جو خادم۔ مربی اور سرپرست انتقال فرما گئے ہیں ان کی یاد میں دو منٹ کی خاموشی اختیار کی جائے۔ جناب چودھری عابد علی [illegible] نے ان مرحومین کے اسمائے گرامی کی فہرست پڑھی جو اس عرصہ میں ہم سے جدا ہو چکے تھے۔

ڈنر کا کھانا جسے آپ چاہیں لنچ کہیے یا لکھنؤ کے لحاظ سے ظہرانہ کہہ لیجیے۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی کی جانب سے تھا لہٰذا تمام مندوبین اور ان کے یار دوست بذریعہ بسیں قیصر باغ اردو اکاڈمی کے دفتر پہنچائے گئے۔ کھانا واقعی لذیذ اور پر تکلف تھا۔ (عام طور پر میزبان کے سامنے کھانے کی تعریف کی جاتی ہے چاہے کھانا بدمزا ہی کیوں نہ ہو) اور بیشمار لوگوں نے (خصوصاً بن بلائے حضرات نے) ایسے ڈٹ کر کھایا کہ دیکھنے والوں تک کو مزا آ گیا۔ کانفرنس میں تشریف لانے والے مندوبین کی تعداد ۱۲۵ سے زائد نہیں مگر کھانے پر کم و بیش پانچ سو حضرات تھے۔ مفت خوروں کا یہ عالم تھا کہ جناب گجرال اور دہلی کی دربارداری میں بھی دو درجن سے زائد حضرات ان کے ہمراہ تھے۔ مگر کھانا اس قدر وافر تھا کہ چھینا جھپٹی کی نوبت نہیں آئی اتر پردیش اردو اکاڈمی کے ناخداؤں نے واقعی فراخ دلی سے کھانا تیار کرایا۔ اور کھانا لذت کے لحاظ سے لکھنؤ کی روایات کا حامل تھا۔

ساڑھے تین بجے سہ پہر کو وال رام بند ہال میں ڈیلی گیشن سیشن شروع ہوا۔ جس کی صدارت گجرال کمیٹی کے چیرمین جناب مجتبیٰ فتح آبادی نے فرمائی۔ جناب ملک رام صاحب مہمان خصوصی تھے۔ اور کنوینر جناب رام لال صاحب تھے۔ عالی جناب پنڈت آنند نارائن ملا نے اس اجلاس کا افتتاح اپنی جاندار تقریر سے فرمایا۔

میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے لہٰذا میں نے اپنی قیام گاہ کی راہ لی مگر شام کو اکثر احباب یہ شکایت فرما رہے تھے کہ اس اجلاس میں جو قرارداد پیش کی گئیں ان پر کسی ڈیلی گیٹ کو بولنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ یہاں تک کہ جب جناب اسلم اختر صاحب کوئی قرارداد پیش کر رہے تھے تو کسی مندوب نے اس قرارداد پر کچھ بولنے کے لئے احتجاج کیا تو اسے اس کی اجازت نہ دیئے جانے پر اختر صاحب نے بے بسی کے عالم میں کہا کہ میں کیا کروں مجھے یہ قرارداد لکھ کر دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ اسے آپ نے پیش کرنا ہے۔ یہ عام شکایت تھی کہ یہ کیسی کانفرنس ہے کہ قراردادیں محض پڑھ کر ہی سنائی گئیں اور ان کے حسن و قبح پر کسی مندوب کو بھی بولنے کی اجازت نہ دی گئی۔ بس ڈاکٹر نریش ہر قرارداد کے بعد یہ کہتے تھے کہ جو حضرات اس قرارداد سے اتفاق رکھتے ہیں وہ ہاتھ کھڑا کر دیں اور اس طرح چند منٹوں میں تمام قراردادیں متفقہ طور پر منظور ہو گئیں۔

شام کی چائے گجرال کمیٹی صاحب کی جانب سے دی گئی میں اس میں شریک نہ ہو سکا۔ اور ساڑھے سات بجے رابندرالیہ میں جناب پرنس انجم قدر صاحب کی دعوت پر ان کا تیار کیا ہوا اردو ڈرامہ بیگم حضرت محل دیکھنے کے لئے اچاریہ [illegible] کے ساتھ حاضر ہوا۔ اس کا افتتاح عالی جناب گورنر صاحب اتر پردیش نے فرمایا۔ اس ڈرامہ کے تمام اداکار غیر مسلم ہیں۔ ڈاکٹر عمار رضوی وزیر اتر پردیش مہمان خصوصی تھے۔

ڈرامہ کیا ہے پرنس انجم قدر صاحب نے ملک کو قومی یکجہتی کا ایک ایسا تحفہ پیش کیا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک قومی یکجہتی کے لئے جو کوششیں کی گئی ہیں یہ ڈرامہ ان سب میں اولیت رکھتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد۔ بھائی چارے اور خلوص و یقین کے ایسے حقیقی اور تاریخی واقعات کو اس ڈرامے میں سمویا گیا ہے کہ اس ڈرامے کو جو ایک بار دیکھ لے وہ اگر واقعی حلال کی اولاد ہے تو ہندو مسلم فساد تو کیا اس کے تصور سے بھی کانپ اٹھے گا۔ ہماری حکومت اور سیاسی لیڈران اور [illegible] حاصل کرنے والے حضرات آئے دن قومی یکجہتی کے نعرے لگاتے رہتے ہیں۔ ڈرامہ بیگم حضرت محل ایک ایسا ڈرامہ ہے کہ اگر حکومت [illegible] تو اس سے بہتر قومی [illegible]

[illegible] کوشش کے لئے پرنس انجم قدر واقعی قابل مبارک باد ہیں۔ اگر حکومت واقعی قومی یکجہتی کی خواہش مند ہے تو پرنس انجم قدر صاحب کو اس عوامی خدمت پر ایک شایانِ شان قومی اعزاز دیا جانا چاہئے۔ گورنر یوپی۔ وزیر اعلیٰ یوپی کا فرض ہے کہ وہ راشٹرپتی کو اس سلسلے میں سفارش کریں۔

رات کا ڈنر بھی راوینڈر یالہ کے سبزہ زار پر جناب پرنس انجم قدر صاحب کی طرف سے دیا جانا ہے۔ مگر ڈرامہ کے خاتمے ہی تیز ہوا اور بارش کا طوفان آیا اور سارا انتظام درہم برہم ہو کر رہ گیا چونکہ طوفان آناً فاناً آیا جس سے بچے ہوئے کھانے کا بھی خاصا نقصان ہوا۔ مگر پرنس انجم قدر کے انتظام کی تعریف کی جانی چاہئے کہ انھوں نے ڈرامہ ختم ہونے تک راوینڈر یالہ کے برآمدوں میں کھانے کی میزیں لگواکر اس کا بہترین انتظام کرا دیا گیا تھا۔ مگر کھانے والوں نے بے صبری اور لوٹ کا وہ مظاہرہ کیا کہ جس کی تفصیل لکھتے ہوئے اُردو کے ان بہی خواہوں کی سماجی اور اخلاقی قدریں مجروح ہونے کا خیال آ جاتا ہے۔ بس یہ سمجھئے کہ ہر کوئی یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے لئے کھانا بچے گا ہی نہیں لہذا اسے تہذیب و اخلاق کے تمام حدیں پار کر کے کسی نہ کسی طرح چھین جھپٹ کر کھانا حاصل کر ہی لینا چاہئے۔ مندوبین کے علاوہ جس قدر حضرات ڈرامہ دیکھنے آئے ان سب نے اپنے آپ کو کھانے کے لئے بھی مدعو سمجھا چنانچہ کم و بیش ایک ہزار اشخاص نے کھانا کھایا۔ تاہم اس سلسلے میں بھی پرنس انجم قدر کے حسنِ انتظام کی داد دی جانی چاہئے کہ کھانے کی کمی محسوس نہ ہونے دی گئی۔

۱۹ اپریل صبح نو بجے سمینار کی پہلی نشست راوینڈر یالہ میں شروع ہوا۔ موضوع تھا ہماری قومی زندگی میں اُردو کا حصہ۔ جس کا افتتاح ڈاکٹر عمار رضوی صاحب نے فرمایا۔ جناب پنڈت آنند نرائن ملا صاحب مہمانِ خصوصی تھے اور پروفیسر حکم چند نیر اس کے کنوینر تھے۔ صدارت مختلف اصحاب کی تھی۔ اس سمینار میں بہت سے حضرات [illegible]

[illegible] مگر اکثر [illegible] صاحب کی تقاریر موضوع سمینار کو اس طرح احاطہ کئے ہوئے تھیں کہ موضوع بھی اپنی خوش نصیبی پر اظہارِ مسرت کر رہا تھا دیگر حضرات کی تقاریر بھی مناسب تھیں مگر زیادہ تر حضرات موضوع سے مناسب تعلق نہ رکھ سکے۔

دوپہر کا کھانا محترمہ حامدہ حبیب اللہ صاحبہ ایم پی کے دولت کدہ حبیب اسٹیٹ حضرت گنج پر تھا۔ بسوں کے ذریعہ مندوبین کو وہاں پہنچایا گیا۔ کھانے کا یہاں بھی پر تکلف انتظام تھا مگر بن بلائے مہمانوں کے باعث یہاں بھی وہی حالت تھی جو گزشتہ رات پرنس انجم قدر صاحب کے ڈنر میں تھی۔ یہاں لوگوں نے کھانا لوٹنے یا مرغ کی ٹانگ کھینچنے کے وہ وہ کرتب دکھائے کہ جناب حکم چند نیر صاحب بڑی مشکل سے روٹی [illegible] کا ایک ٹکڑا لے کر ایک کونے میں بغیر کسی سالن کے کھا رہے تھے اور بن بلائے حضرات اپنی پلیٹوں میں یکبارگی دو دو مرغ رکھے ہوئے تھے۔ کھانا لکھنوی روایات کا حامل تھا مگر کھانے والوں کی اکثریت نے اپنی پشتینی بھوک کا مظاہرہ کر کے کافی حد تک بے تعلقی کا ماحول بنا دیا تھا۔ حالانکہ کھانے کی کوئی کمی نہیں تھی مگر اکثر کھانے والوں کی بے صبری نے بد نظمی کر رکھی تھی۔

سمینار کا دوسرا اجلاس شام کے پانچ بجے رویندر یالہ میں جناب مالک رام صاحب و دیگر حضرات کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کنوینر تھے۔ اور مہمانِ خصوصی بہار کے چیف منسٹر جناب ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا تھے۔ اس اجلاس میں عالی جناب آنند نرائن ملا کی تقریر ایسی تھی کہ جسے اس سمینار کی جان کہا جا سکتا ہے۔ جناب [illegible] صاحب اختر۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی تقاریر بھی موضوع کے عین مطابق تھیں اور خوب تھیں۔ ملک زادہ منظور احمد صاحب کی تقریر کئی لحاظ سے [illegible] پہلوؤں کو لئے موضوع کو چار چاند لگا رہی تھی۔

ڈاکٹر عبد المغنی (بہار) نے بتایا کہ بہار میں اُردو کو [illegible] ثانوی زبان کی حیثیت دی گئی ہے اس کی تفصیل [illegible] انتظامیہ کے عہد بہار کے چیف منسٹر ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا [illegible] کے [illegible] جناب [illegible]

تشریف لائے [illegible] کے
ہمراہ تھیں۔ اور صوبہ بہار کے ایک وزیر [illegible] اعلیٰ اور
بھی اپنے وزیر اعلیٰ کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ وزیر اعلیٰ بہار
کی تشریف آوری پر ڈاکٹر حبیب المغنی پہلی صف سے لپک کر
سٹیج پر پہنچ گئے ہیں۔ ان کی یہ کوشش تھی کہ وہ وزیر
اعلیٰ بہار کی نظروں میں کسی طرح آسکیں مگر ان کی اس کوشش کا
سے وہ مغنی سے مجنوں بن کر رہ گئے تھے۔ اس سیشن میں مہمان
خصوصی یعنی وزیر اعلیٰ بہار نے جو تقریر فرمائی وہ ان کی
نیک نیتی کی آئینہ دار تھی۔ اترپردیش کے وزیر اعلیٰ جناب
وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی تقریر ان کے دلی جذبات، نیک
نیتی کی ایک ایسی سچی آواز تھی کہ جسے سننے سے یہ اندازہ ہوتا تھا
کہ وزیر اعلیٰ یوپی ابھی سیاسی سوامی گھاگ سے کوسوں
دور ہیں۔ ان کا ایک ایک لفظ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے
آبا و اجداد کی روایات کی طرح وعدہ نبھانے والے اور اپنے
قول کے سچے ہیں۔ وہ وزارت اعلیٰ چھوڑ سکتے ہیں مگر اپنے
قول سے نہیں پھر سکتے۔ اترپردیش واقعی خوش نصیب
ہے جسے وشوناتھ پرتاپ سنگھ ایسا مخلص، سچا، قول کا
پکا، وعدہ ایفا کرنے والا۔ اور جھوٹ سے نفرت کرنے والا
وزیر اعلیٰ نصیب ہوا۔ ورنہ ہمارے ملک میں کچھ ایسے
وزیر اعلیٰ بھی موجود ہیں کہ اگر وہ وزیر اعلیٰ نہ ہوتے تو شاید
انہیں کوئی چپراسی رکھنا بھی پسند نہ کرتا مگر یہ صرف اپنی سیاسی
اکھاڑ پچھاڑ کے بل بوتے پر ایسے ایسے سیاسی کرتب دکھاتے
ہیں کہ ان کی کرسیاں محفوظ ہیں۔

وزیر اعلیٰ یوپی نے بتایا کہ یہاں جو کچھ اردو کے لئے کیا
جا رہا ہے وہ یہاں بغیر کسی قانون بنانے کے فی الحال کیا جا رہا
ہے۔ مگر سال کے اختتام تک اسے قانونی حیثیت حاصل ہو جائے
گی۔ بہرحال یہ یقینی امر ہے کہ وزیر اعلیٰ یوپی اپنا قول نبھائیں گے۔
آخر میں بیگم حامدہ حبیب اللہ صاحبہ نے ووٹ آف تھینکس
کے بعد جب سیمینار کا یہ اجلاس ختم ہوا تو [illegible]
[illegible] ہال [illegible] میں ریاستی انجمن ترقی اردو اترپردیش
کی طرف سے [illegible] ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا وزیر اعلیٰ بہار کو

سپاس نامہ پیش کیا جانا تھا اور [illegible]
کے منتظمین نے [illegible] چونکہ [illegible] کی دعوت دی گئی
تھی یہ تقریب بھی کامیاب رہی۔ محترمہ سلطانہ حیات صدر
انجمن نے سپاس نامہ پیش کیا اور انجمن کے [illegible] ماڈل
سکولوں کے بچوں نے اپنے شو بھی پیش کئے۔ کامیاب طلبا کو
اسناد تقسیم کی گئیں۔

اب مندوبین کو بس کے ذریعے میر اکاڈمی اقبال منزل
نروسنگھ اسٹیشن پہنچایا جا رہا ہے کیونکہ میر اکادمی کی طرف
سے گزشتہ تین سال کے میر اکادمی ایوارڈ تقسیم کئے جانے ہیں
اور اردو کانفرنس کے مندوبین کا میر اکادمی کی طرف سے خیر مقدم بھی
کیا جانا ہے۔ اس تقریب میں میر اکادمی کے ایوارڈ جناب
وزیر اعلیٰ بہار ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا تقسیم فرمائیں گے۔

اردو کی خدمت جس خلوص انداز میں عالی جناب اقبال احمد
صاحب لاری فرما رہے ہیں۔ اس کا ایک اپنا مقام ہے۔ اردو
میر اکادمی کی جملہ ذمہ داریاں لاری صاحب تن تنہا اپنے کندھوں
پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی شعرا و ادبا کی
جو خلوص مالی امداد انہوں نے کی ہے اس کی تفصیل میں جانا
اس وقت مناسب نہیں ہے۔ پیچھے اقبال منزل کا وسیع
و عریض صحن دلہن بنا ہوا۔ اس تقریب میں شرکت فرمانے
کی ہر کسی کو دعوت عام دے رہا تھا۔ جس طرف بھی نظر اٹھے
اردو کے سرپرست جناب ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا وزیر اعلیٰ
بہار کی تقریر سننے کے لئے ہر صاحب ذوق چلا آرہا ہے۔
مجھے اور ضیا صاحب کو کہیں بیٹھنے کو نظر نہیں آئی تو ہم نے
اس میں عافیت سمجھی کہ میر ایوارڈ پانے والوں کے لئے
جو گوشہ ریزرو رکھا گیا ہے اس میں بیٹھنے کی کوشش
کی جائے۔ بڑی مشکل سے اسی گوشہ عافیت تک پہنچے
تو مالک رام صاحب اور دیگر کئی دوسرے شناسا چہرے
نظر پڑے ہیں اور کسی نہ کسی طرح بیٹھنے کی جگہ مل ہی گئی تو کچھ دیر
بعد وزیر اعلیٰ بہار، اترپردیش کے وزیر اعلیٰ کے ساتھ
تشریف لائے تو ان معزز حضرات کا شاہانہ استقبال کیا
وزیر اعلیٰ بہار نے جو تقریر [illegible] میں فرمائی تھی

[illegible] ہیں جو ہمیں [illegible] اتر پردیش کی حکومت نے اعلان
[illegible] کر [illegible] اپنے خیالات کا اظہار فرمایا جو روئیندِ یلیہ
ہی فرما چکے تھے۔ دونوں حضرات کی تقاریر کے ایک ایک
لفظ پر [illegible] کے غیر خواہوں نے خوب خوب تالیاں
بجا کر داد دی۔ ملک زادہ منظور احمد صاحب اناؤنسر
کے فرائض اپنی روایات کے مطابق خوب خوب ادا فرما رہے
تھے۔ میر اکاڈمی کے خالق جناب مقبول احمد لاری نے
معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور میر اکاڈمی کے بارے
میں کچھ تعارفی کلمات بھی کہے۔

قریباً اسی حضرات کو میر اکاڈمی کی اعزازی ۳
سندات اور نقد انعامات دیئے جانے تھے۔ تین تین ہزار
کے تین اور باقی پانچ پانچ سو روپیہ کے تھے اکثر حضرات
بہ نفس نفیس تشریف فرما تھے۔ اور کچھ موجود نہیں تھے۔

تقسیم اسناد و انعامات کے بعد کھانے کا
آغاز ہوا۔ پانچ ہزار سے زائد حضرات کھانے والے
صحن۔ کمرے۔ چھتوں۔ غرضیکہ ہر موزوں جگہ پر کھانے
کی میزیں لگائی گئی تھیں مگر کھانے والوں نے ایسی بدنظمی
پھیلائی کہ سارے انتظامات دھرے کے دھرے رہ
گئے۔ کھانا پُرتکلف تھا اور کھانے والوں نے بھی کوئی
تکلف نہ فرمایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میدانِ حشر ہے اور
ہر کوئی کھانا چھیننے کے لئے کوشاں ہے۔ بھلا ہو محترمہ یادگارِ
دہلوی کا کہ اس نے سلیقے سے کچھ شعرا و ادیبوں کو کھانے کے
لئے ایک گوشۂ عافیت کا انتظام کرا دیا۔ آئس کریم کے لئے تو وہ
بھگدڑ مچی کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ حالانکہ کھانا اتنا وافر مقدار
میں موجود تھا کہ وہ ہزار مزید مہمان بھی کھا سکتے تھے ایک
اندازے کے مطابق پچاس ہزار روپیہ کھانے پر صرف ہو گئے
ہوں گے اور انعامات کے سلسلے میں بھی کم و بیش پچاس ہزار
روپے تقسیم ہوئے۔ گویا اس تقریب پر جناب لاری صاحب
نے ایک لاکھ روپیہ صرف کیا۔ کل سعید میر اکاڈمی کے
ناظم جناب مقبول احمد صاحب لاری کو خدا عمر طویل دے
تاکہ یہ سلسلہ مدتوں جاری رہ سکے۔
(جاری ہے)

بہ کوئے یار بانداز محرمانہ گزر

سرور دہلوی

ضلع مظفر گڑھ (پاکستان) میں ایک قصبہ دائرہ دین پناہ ہے۔ جہاں حضرت "دین پناہ" کا مزار شریف ہے۔ جہاں تک تونسہ شریف جانے کے لئے دو راستے تھے ایک براستہ غازی گھاٹ دریائے سندھ کشتیوں کے پل یا سٹیمر سے عبور کر کے بذریعہ موٹر لاری ڈیرہ غازی خاں ہو کر اور دوسرا بذریعہ ریل کوٹ سلطان یا دائرہ دین پناہ کسی ایک ریلوے اسٹیشن پر اتر کر پیدل یا اونٹ کی سواری سے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پہنچ کر بذریعہ کشتی دوسرے کنارے جا کر پھر پیدل یا اونٹ کی سواری تونسہ شریف پہنچنا۔

میرے والد صاحب ضلع لائل پور (فیصل آباد) میں سکول ماسٹر تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں یا کسی شادی غمی کے موقع پر ہمیں تونسہ شریف (ہمارا آبائی گاؤں ہیرو غربی تونسہ شریف سے تین میل کے فاصلہ پر تھا) جانا ہوتا تو عام طور سے کوٹ سلطان یا دائرہ دین پناہ ریلوے اسٹیشن پر جانا ہوتا۔ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر بھی ایک قصبہ دائرہ دین پناہ آباد تھا اور اس قصبہ میں بھی حضرت دین پناہ صاحب کا مزار تھا۔ مشرقی کنارے سے کشتی میں بیٹھ کر دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر پتن (کشتیوں کی روانگی اور آمد کی مقررہ جگہ) یہی قصبہ دائرہ دین پناہ ہی تھا۔ دریائے سندھ کا مغربی کنارہ ضلع ڈیرہ غازی خان میں ہے۔ دو اضلاع میں ایک ہی نام کے دو قصبات اور دونوں جگہ ایک ہی بزرگ کا مزار اور دونوں مقامات پر ان مزارات پر کسی بھی منت مانی جاتی دیکھا جا سکتا ہے۔ بچپن میں یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ دو مقامات پر ایک ہی بزرگ کا مزار؟ اور لطف کی بات یہ کہ ہر مذہب و ملت کے عوام ان مزارات پر حاضری دیتے اور منتیں مانتے تھے۔ دونوں مقامات پر مزار کا فن تعمیر اور نقاشی کے اعلیٰ نمونے تھیں۔ میرے والدین اور دوسرے رشتہ دار بھی مغربی کنارے والی درگاہ پر جاتے تھے اور ہر سال عرس میں حصہ لیتے اور اپنی توفیق کے مطابق خدمت کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب حضرت دین پناہ کا انتقال ضلع مظفر گڑھ والے قصبہ دائرہ دین پناہ میں ہوا تو مشرقی اور مغربی کنارے پر مقیم عوام میں جھگڑا ہوا۔ دونوں فریق حضرت دین پناہ کو اپنے اپنے علاقہ میں دفنانا چاہتے تھے۔ جب کسی طور پر فیصلہ نہ ہوا تو جھگڑنے والوں نے دیکھا کہ حضرت کی میت (جسد خاکی) موجود ہی نہیں ہاں میت کی جگہ پھولوں کا ڈھیر لگ رہا تھا۔ چنانچہ دونوں فریقوں نے آنسو بہاتے ہوئے آدھے آدھے پھول بانٹ لئے اور دونوں مقامات پر پھولوں کو دفنا کر مزار تعمیر کرائے۔ اپنے والدین کے ساتھ میں بھی مغربی کنارے والے درگاہ دین پناہؒ مزار پر جاتا۔ اور اپنے دل کی بات درگاہ کے کسی ستون پر لکھ آتا۔ درگاہ کے ستونوں پر بڑا ہی اصحاب کی دلی خواہشیں لکھی ہوتی تھیں کچھ لوگ تو اپنا نام اور پتہ بھی لکھ دیتے تھے۔ کثرت ایسے لوگوں کی ہوتی جو اپنی دلی خواہش لکھنے کے بعد شکستہ خط میں دستخط کر دیتے مگر یہ سو فیصد ٹھیک تھا کہ جو بھی دلی خواہش لکھی جاتی وہ پوری ہو بھی جاتی تھی۔ اس زمانے میں لوگ لاٹری یا انعامی بانڈ کی رقم پانے یا جنگ کو جیتنے میں کامیابی کی دعائیں نہیں مانگا کرتے تھے بلکہ بہت تھوڑا ہوتا تھا روزگار میں، آسودگی، صحت، بارش کے ہونے یا آفات سماوی سے دریا کے ویرانے سے بچاؤ ہونے کے لئے دعائیں مانگی جاتی تھیں اور خدا کے فضل سے یہ سب مانگیں قبول بھی ہو جاتی تھیں۔

کل الجزائر اور جیریشی میں بیشتر حصہ احسان کا ہے جا رہا ہے جو کسی نہ کسی طرح روحانی طور پر اس معاملے میں جڑتا ہے

[illegible] تمام عبادات میں سب سے
افضل سمجھا جاتا تھا۔ اب آخری عبادت کا امتحان پورا کا امتحان تھا
جہاں کسی قسم کی سفارش یا رعایت کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ یہ
حقیقت ہے کہ منکر نکیر کے امتحان میں ان دونوں مضامین
کے پرچے اس قدر کمزور ہوئے تھے کہ مجھے سو فیصد فیل ہوتا
نظر آتا تھا۔ اب وطن گیا اور حضرت دین پناہ کے مزار کے
[illegible] پر گیا کہ میں آخری کے امتحان میں پاس ہو جاؤں
میں اتنا طویل سفر طے کر کے محض اس غرض سے آپ کے یہاں
حاضری دینے آیا ہوں۔ کرنا خدا کا جب نتیجہ آؤٹ ہوا تو میرے
اپنے گھر والوں اپنے استادوں اور خود اپنے کئے ہوئے پیپرز
کے برعکس توقع پاس تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ ہر مذہب و
ملت کے علاوہ کا جھگڑا ان دونوں مزارات پہ کیوں لگا رہتا
ہے اور کس لئے ہر طرح پہ ہندو حضرات بالخصوص مزار پر چڑھاوے
چڑھاتے ہیں۔

امتحان میں پاس ہونے کے باعث میرا اعتقاد اس قدر پختہ ہو
گیا کہ میں اپنے غائبی دل میں اس مزار شریف کا تصور کرتا رہتا اور
رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ میں نے کسی بھی وقت اور کسی بھی مقام پر
حضرت دین پناہؒ کی درگاہ کا تصور کیا اور اپنی دلی خواہش کا اظہار
بھی دل ہی دل میں کر دیا اور خدا کا کرنا یہ ہوتا کہ مجھے کامیابی
ہوتی۔ مگر خدا شاہد ہے کہ میں نے کوئی ایسی خواہش کبھی نہیں
کی کہ جو ذوق سلیم پر گراں گزرے۔

دریائے سندھ کا مغربی کنارہ ۴۰ فٹ اونچا تھا برسات
کے موسم میں جب دریائے سندھ طغیانی پر ہوتا تو پانی کی بے شمار
تند لہروں نے مغربی کنارے کو آہستہ آہستہ گرانا شروع کیا
اور دیکھتے ہی دیکھتے دس بارہ سال میں دائرہ دین پناہ کا
قصبہ دریا برد ہو گیا۔ باشندگان وہ نے دو ایک میل [illegible] کی
پر نیا گاؤں بسا لیا۔ اب حالت یہ تھی کہ مزار شریف کے تین طرف
تو دریا تھا صرف ایک طرف سے اتنا راستہ تھا کہ لوگ مزار پر جا سکیں
[illegible] اس عجیب و غریب نظارے کو دیکھنے کے لئے [illegible] دائرہ دین
پناہ آیا۔ دیکھا تو واقعی عجیب و غریب حالت تھی۔ دریائے سندھ کا پانی
اب قریب قریب چاروں طرف سے مزار کو گھیرے ہوئے تھا صرف اتنی [illegible]

[illegible] سے متصل ہی آ رہا تھا کہ ایک دن
یہ خبر مشہور ہو گئی کہ خادمین مزار نے مزار شریف کے اندر سے صندوق نکال
لیا ہے اور دائرہ دین پناہ کی نئی بستی میں صندوق کو دفنا دیا گیا ہے مگر
اس کا کوئی عینی شاہد نہ تھا صرف خادمین مزار کا ہی یہ کہنا تھا کہ رات
کی خاموشی میں یہ کام کیا گیا ہے۔

اس کے کچھ دنوں بعد یہ حالت ہو گئی کہ مزار شریف کے ارد گرد
چاروں طرف دریا کا پانی تھا یہ حالت قریباً تین چار سال تک رہی گرمیوں
کے موسم میں دریا کی طغیانی اپنے پورے جلال میں ہوتی اور مزار کی بنیاد
سے زور آزمائی کرتی اور سردی کے موسم میں جب دریا کی چوڑائی دو
تین فرلانگ رہ جاتی تو بھی پانی تیز رفتاری سے مزار سے ٹکراتا ہوا
بہتا۔

درگاہ سے دلی لگاؤ رکھنے والوں کو یقین تھا کہ خادمین مزار
جھوٹ کہتے ہیں کہ انہوں نے مزار شریف سے صندوق نکال لیا ہے
اس لئے مجھ جیسے ہزاروں ہندو مسلمانوں کا یہ طریقہ رہا کہ دریا
کے کنارے کھڑے ہو کر مزار شریف کو سلام کر لیا اور دور کھڑے ہو کر ہی
اپنا مدعائے دل بیان کر دیا۔ میں جب بھی وطن جاتا ہفتہ عشرہ
کے بعد واپس لائل پور آ جاتا۔ مگر میرے دل کے تار اس مزار کی طرف
رہتے۔ ایک رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ مزار شریف میری
آنکھوں دیکھتے دریا برد ہو گیا ہے۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا مگر واہمہ سمجھ کر
پھر سونے کی کوشش کی مگر دل یقین دلا رہا تھا کہ مزار شریف واقعی
دریا برد ہو گیا ہے۔ صبح کو اپنے وطن خط لکھا کہ رات کو خواب میں مزار
شریف کے دریا برد ہو جانے کے بارے میں دیکھا ہے۔ پانچ چھ
دن کے بعد جواب آیا کہ ہاں جس رات کا تم نے ذکر کیا ہے اسی
رات کو مزار شریف دریا برد ہو گیا اور کسی شخص نے بھی مزار
کو دریا برد ہوتے نہیں دیکھا۔ صبح کو پتہ چلا کہ مزار دریا برد ہو گیا ہے
اس کے بعد کئی بار وطن جانے کا اتفاق ہوا مگر دل نے یہی کہا کہ
خادمین مزار نے اپنی روزی کے لئے نیا مزار بنا لیا ہے۔ اصل
مزار تو اب دریائے سندھ کے مشرقی کنارے والے دائرہ دین پناہ میں
ہی ہے۔ مگر اس وقت تک [illegible] تونسہ
شریف پہنچ کر [illegible] آسان ہو گیا [illegible]
[illegible] والے دائرہ دین پناہ میں جانے کا اتفاق

(باقی صفحہ [illegible] پر)

[illegible] صدیقی

گھاٹا کھنڈی کا مشاعرہ

کریمی الاحسانی

گھاٹا کھنڈی سہارنپور سے جانب شمال تیس کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے اس گاؤں تک جانے کے لئے تین کلومیٹر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ تجرباتی مشاعرہ جناب ڈاکٹر ایم۔ یاسین اور محمد ساحل سہارنپوری کی مسلسل کوششوں اور بھاگ دوڑ سے ۲ بجے دن ہی میں شروع کرا دیا گیا ہے اور یہ اس لئے تاکہ دیہات کے لوگ اس مشاعرہ کو سن سکیں اور شام تک شعرا اور سامعین اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔

جونیر ہائی اسکول کے میدان میں گاؤں سے جانب غرب ڈھمولہ ندی کے کنارے گاؤں کے سادہ لوح اور مخلص کارکنان نے پنڈال شامیانہ۔ فرش اور اسٹیج کا شاندار انتظام کر رکھا ہے۔ دو بجے یہ مشاعرہ شروع ہونا تھا لیکن شعرا کو کھانا کھلانے میں کسی قدر تاخیر ہو گئی ہے لیجئے صدارت کے لئے جواں سال جواں ہمت ہر دلعزیز ایم۔ پی۔ رشید مسعود صاحب کا اسم گرامی پیش کیا جا رہا ہے جس پر تالیوں سے پرتپاک استقبال اور اظہار خوشنودی کیا جا رہا ہے رشید صاحب فرما رہے ہیں۔

معزز حضرات اور شعرا کرام

جب آپ بس میں سفر کرتے ہیں تو آپ کی گفتگو ہر کوئی سمجھ لیتا ہے کیونکہ جس زبان میں یہ گفتگو ہوتی ہے وہ اردو ہی تو ہوتی ہے لہٰذا اسے بھی اس کا جائز مقام دیا جائے۔ ایم پی صاحب تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں شعرا کی صف ہی میں بیٹھ گئے ہیں اور ساحل صاحب ناظم مشاعرہ کیر انوی سے درخواست نظامت کر رہے ہیں۔ [illegible] صاحب نے مائک سنبھالا [illegible] کر دیا گیا

[illegible] صاحب فرما رہے ہیں

[illegible]

میرے خلاف زہر اگلنے لگا ہے وہ
آتے جاتے سر کٹتا ہے — کھڑکی پر کھٹ بدل جاتے
بھول ہو گا نہ پیدا کبھی — رنگ لائیں کی تتلیاں
ہاتھ پہ رنگ نہیں رہ گیا — شاخ سے اڑ گئیں تتلیاں
روشنی تیرگی کھا گئی — کھڑکی جب جل گئیں بستیاں

ندیم صاحب مشاعرہ کا آغاز کرکے تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں اور اب سہیل اعظم سہارنپوری فرما رہے ہیں

سورج کو تاج روشنی سیہ پوش کر دیا
جب روشنی کے لوگ خریدار ہو گئے
اس شہر کی فضاؤں میں [illegible]
جس کی گلی کے سائے بھی دیوار ہو گئے

سہیل صاحب بھی داد وصول کرکے چلے گئے اور اب اکمل سہارنپوری نے مائک پر قبضہ جما کر ارشاد فرمانا شروع کیا جو

غیر واضح نہ ہوتیں جو سمت سفر
زندگی کا ہر اک زاویہ بولتا
وہ اگر چپ لگا کر میں بھی خاموش تھا
ساتھ چلتا ہوا فاصلہ بولتا
گہرے پانی میں تیری نگر بولتی
ریت پر بھی ترا نقش پا بولتا

اکمل صاحب بھی داد سمیٹ چکے [illegible]
لیکن پورا غزل [illegible] سے پڑھا ہے

جو بھی قدم کئے ہیں ستم زندگی
ہم کہتے ہیں ان کو کرم زندگی
[illegible]
[illegible]

دل شکنی بھی ہے تو بیوفا بھی ہے تو
کوئی کب تک کرے تیرا غم دنگی

نسیم صاحب داد وصول کرکے چلے ہیں اور اسفار کوشی صاحب فرماتے ہیں ؎

اپنے چمن کو رونق فصل بہار دے
انساں سے تو وقت کی زلفیں سنوار دے
ماحول جل رہا ہے تعصب کی آگ میں
یارب مرے وطن کو سکون و قرار دے

پھر ایک طویل نظم سنا کر پلٹ رہے ہیں لیجئے ماجد دیوبندی کے نام پر ایک آواز بلند ہوئی اب مزا آئے گا اس بر بابائے کھتولی حشمت سبزواری جھنجھٹ فرما رہے ہیں اب تک کیا ہو رہا تھا۔ اسی منفی مذاق میں ماجد صاحب غزل سرا ہیں ؎

عشق ہے دلِ ناداں جان و دل گھلا دینا
رات دن ستم سہنا اور انھیں دعا دینا
حال دشوں کی منزل تک آ گئے ہیں دیوانے
اور مسکرا دینا اور حوصلہ دینا

ماجد صاحب بھی داد پا کر پلٹ رہے ہیں اُدھر امیر احمد مکمن سہار نپوری انگو محفل بدلنے کے لئے سنجیدگی سے فرما رہے ہیں ؎

رخِ بلا نوز پہ پُر نور جبیں رکھتا ہوں
اور پیر تلے مضبوط زمیں رکھتا ہوں
بے گناہی کا تو دعویٰ نہیں مجھکو لیکن
سینٹ پرسینٹ میں بخشش کا یقیں رکھتا ہوں

قہقہوں کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

تاریخی حادثہ ہے یہ موجودہ سال کا
تھا ایکسیڈنٹ عشق میں یارِ کمال کا
مجھکو تو کالرہ ہوا اور ان کو ٹائیفائڈ
اک ہسپتال بن گیا کمرہ وصال کا

قہقہوں اور ہاؤ ہو کا ایک دھماکہ ہوا ہے دوبارہ دُہرا کر نشتی کو سہما تے چلے ہیں ؎

ہو ! تو میں بن جاؤں لیکن

کہ پا تا ہے جا تو وطن ہے عبرت کی
انتیس میں نفرت کہ میرے
آ و فکتا ہے گیا ہے سر پر ہ کی

پنڈال میں ایک ہُلّڑ بازی ہے احساس ننگ کو دہ آشہ ابھرنے کے لئے اس سے بھی بڑا جوکر اور مسخرا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے گویا آج کے

اس شاعری میں عورت سے بھی گرے والا معاملہ ہو رہا ہے بقول رزمی صاحب ایک صاحب کردار الحاج حشمت سبزواری جھنجھٹ کھتولی گا گا کر محفل کو ہنسا رہے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

ہم کے موجد نے کبھی یہ بھی نہ سوچا ہوگا
ہر کوئی ڈھیر پہ بابعد کے بیٹھا ہوگا
جس تمنا سے بڑھاپے میں کری تھی شادی
یہ نہ معلوم تھا دلبر مرا بیگا ہوگا
یوں ہی آزاد اگر پھرتے رہے تو قوریت
خون کے دریا میں ہر اک شخص نہایا ہوگا

جھنجھٹ صاحب محفل کو قہقہوں پر آتار کر جا رہے ہیں اور اب اسی جو کرانہ رنگ کو اور نکھارنے کے لئے پاپولر میرٹھی آکر فرما رہے ہیں ؎

اک کھٹکے کا آج یہ اعلان عام ہے
نیتا ہیں ہم ہمارا تو ایشار کام ہو
نیتا کا دعویٰ کس کے ہیں یہ سوچنے لگے
قربانی کھٹکے کی تو یارو حرام ہے

ہاؤ ہو کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو
کس کا یہ مصرعہ ہے مت پوچھیے یا شعر دو
صرف یہ دیکھو کہ کس شان سے پڑھتے ہیں غزل
شعر جس کے بھی یہ فرماتے ہیں فرمانے دو

پاپولر صاحب بھی محفل کو ہلڑ بازی میں آتار کر تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں اور دلکش سہارنپوری پڑھنے اور بڑے ترنم سے الاپ رہے ہیں ؎

[illegible] حسرت کی [illegible] مانگ رہے ہیں
جب آپ سے ملنے کی دُعا مانگ رہے ہیں
پھولوں سے دُعا دیکھئے کیا مانگ رہے ہیں
یہ آپ سے جینے کی ادا مانگ رہے ہیں
دیوانو لہو پیش کرو اپنی وفا کا
قاتل کے حسیں ہاتھ حنا مانگ رہے ہیں

راشد صاحب شعلۂ ترنم سے محفل کو گرما کر چلتے بنے اور ان کے بعد پروفیسر تنویر چشتی رواں دواں سُنا رہے ہیں سے۔

غمِ حیات تھا تحریر جس پہ وہ آنسو
ہماری آنکھ سے ٹپکا تو اک کتاب بنا
دل آئینہ تو نہ تھا صرف ایک پتھر تھا
تمہارے سامنے آیا تو عکس خواب بنا
نظر سے چھو لیا جس نے تمہاری نظروں کو
وہ ایک لمحہ مری روح کا عذاب بنا

تنویر صاحب بھی داد وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب اس محفل کو گرمانے کے لئے سوز نیز نہٹوری آ رہے ہیں لیجئے لحن داؤدی میں غزل چھیڑی ہے سے

جچتے ہیں پہ نظر ڈالئے دھوکا سا لگے ہے
پیتل بھی چمکتا ہوا سونا سا لگے ہے
کل جس کے تصور سے چمن دل کا کھلے تھا
آج اس کا خیال آئے تو کانٹا سا لگے ہے

ایک صاحب داد کے بجائے ایک روپیہ پیش کر رہے ہیں ساحل صاحب نے ان سے کہا ہے کہ مشاعرہ میں اس طرح انعام نہیں دیا جاتا اور عزیز صاحب فرما رہے ہیں سے

لوگوں سے یوں ملتے ہوئے گھبرانے لگا ہوں
پہلے سے کچھ حال تو اچھا سا لگے ہے
بکتا ہے ہر اک شخص اداکاری کے فن میں
قاتل بھی تو کمبخت مسیحا سا لگے ہے

داد بھرپور تالیوں سے دی گئی ہے اور آپ محفل کو چھوڑ کر مائک سے جُدا ہونا چاہتے ہیں کہ فرمائشوں اور تالیوں کے شور میں پھر اُسی بانکپن سے لپک رہے ہیں سے

کچھ [illegible] نہ جانے اس کا بھرم رکھ لیا ہے
ناصحا بندہ نوازش کی تو یہ کیا ہے

آزاد صاحب کا ایک اور فرمانا ہے، داد کے شور میں فرما رہے ہیں سے

دو قدم چل کے گھبرانے لگے ہمسفرو
دیکھتے جاؤ ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے

عزیز صاحب خوب خوب داد و تحسین لوٹتے تالیوں کی گونج میں کہاں جا رہے ہیں، اور اب ایک تو شاعر عبدالحق سحر [illegible] غزل چھیڑ رہے ہیں سے

کردار کی راہوں میں اُف کتنا اندھیرا ہے
رہزن بھی لٹیرا ہے رہبر بھی لٹیرا ہے
اب کون بچائے گا افلاس کے ماروں کو
دولت کے پجاریوں میں سانپوں کا بسیرا ہے

سحر صاحب بھی داد پا کر چلتے بنے اور حبیب عاصم دہلوی نے مائک پر آکر محفل کا جائزہ لیکر ضمانت کیا ہے سے

تمہاری شر پسندی سے جلے ہیں کتنے گھر سوچو
کٹے ہیں کتنے سر اس کا تمہیں احساس کیا ہوگا
بہالو خون سڑکوں پر مگر اتنا تو سوچو تم
وطن جب خون مانگے گا تمہارے پاس کیا ہوگا

پھر ایک گیت سُنا کر خوب خوب سے داد پا کر شاداں پلٹ رہے ہیں اور اب گنگوہ کے نسیم آزاد قدوسی نے آکر ایک غزل لحنِ داؤدی میں چھیڑ دی ہے سے۔

فکر گیتی نہ اندیشۂ پا جہاں ناتواں [illegible] کی کتاب و قرآں دیکھئے
جس پہ گرتی رہیں رات دن بجلیاں کا اسی شاخ پر آشیانہ دیکھئے
تعمیر انسانیت کے جو دشمن رہے اہلِ فکر و نظر جن سے بچتے رہے
ہاں وہی لوگ کل تک جو بر سرِ جنگ تھے آج ہیں رہبر کارواں دیکھئے

آزاد صاحب بھی داد و تحسین وصول کئے جا رہے ہیں اور اسی عالم میں کرشن بہاری کیرانوی سے اس [illegible] کو سنوارنے چلے ہیں سے

زمیں والوں میں آ کر مل گئے تھے جو
جو باتیں کر رہے تھے آسماں سے
[illegible] بہت سے راہ میں کوئی
کوئی بچ کے امیرِ کارواں سے

میں جو کچھ سوچتا رہتا ہوں کوثر
کہوں کیسے وہ اپنے بازواں سے

کوثر صاحب داد پاکر مائک سے کھسک رہے ہیں اور اب گرجنے اور برسنے کے لئے سلیم کنتولوی آکر غزل سرا ہیں ؎

غم میں انسانوں کے کردار بدل جاتے ہیں
غم بڑی شے ہے کہ معیار بدل جاتے ہیں
یہ مثل سچ ہے کہ ہو جاتا ہے صحبت کا اثر
آدمی کیا در و دیوار بدل جاتے ہیں
جب گلستاں پہ کوئی دورِ خزاں آتا ہے
گل بدل جاتے ہیں گلزار بدل جاتے ہیں

سلیم صاحب داد تو ہر حال میں لے ہی لیتے ہیں یہ الگ بات کہ سلیم صاحب ان دنوں ٹی۔ بی کے نرغے میں ہیں کاش وہ اب آرام کر سکتے ۔ لیجئے سیف اللہ خالد فرما رہے ہیں ؎

تمہارا ہی گر کچھ اشارہ نہ ہوتا
تو اتنا تقاضا ہمارا نہ ہوتا
اگر دوستوں کی عنایت نہ ہوتی
تو خوشیوں پہ کیا حق ہمارا نہ ہوتا

خالد صاحب گلو خلاصی کرکے چلتے بنے اور اب مجھ سے بھی دو شعر سن لیجئے گا ؎

ستم شعار ہیں ہم اس زمانے والے لوگ
ہمارے نام پہ تھوکیں گے آنے والے لوگ
یہ جانتے ہیں کہ پتھراؤ ہونے والا ہے
دکھشیش محلوں سے بھاگے رلانے والے لوگ

اب محمد احمد ساحل سہارنپوری نغمہ سرا ہیں ؎

پئے نمازِ شہادت لہو لہو چہرے
خود اپنے خون سے کرتے رہے وضو چہرے
یہ انتہائے تشدد نہیں تو پھر کیا ہے
لہولہان ہوئے جانِ آرزو چہرے
تاثرات کی اپنی زبان ہوتی ہے
اسی زبان میں کرتے ہیں گفتگو چہرے

برائے امن و تقاضے کیا چاہے ساحل
محافظوں میں نکل آئے جنگجو چہرے

ساحل صاحب محفل کو عزادار بنا کر چلتے بنے اور اب اس محفل اور ماحول کو پھر زندگی سے ہمکنار کرنے کے لئے مظفر رزمی نے غزل شروع کی تو فرمائشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے غزل سرا ہیں ؎

صلیب و دار پہ اک دن سجا کے دیکھو ہمیں
ہمیں ہیں اہلِ وفا آزما کے دیکھو ہمیں
ہوا کے رخ سے دریچہ بھی کھل ہی جائیگا
کسی طرح پسِ دیوار آکے دیکھو ہمیں
نظر نہ آئیں گے ہم قہقہوں کی محفل میں
جو دیکھنا ہے تو آنسو بہا کے دیکھو ہمیں

رزمی صاحب خوب خوب محفل کو گرما کر تالیوں کے ہنگم شور میں آ رہے ہیں اور اب آصف نظامی طاہر پوری سے ایک قطعہ سن لیجئے گا ؎

مرد۔ خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا
خونِ مظلوم رنگ لاتا ہے
ظلم کرتا ہے جو نہتوں پہ
دستِ قدرت اسے مٹاتا ہے

آپ کے ساتھ ہی یہ لاجواب اور کامیاب محفلِ شعر و سخن ٹھیک ۶ بجے شام ختم ہو رہی ہے ۔ یہ مشاعرہ گاؤں میں منعقد کرانے کا سہرا احباب ڈاکٹر ایم یٰسین صاحب کے سر جاتا ہے۔ اس مشاعرہ سے اندازہ ہوا کہ گاؤں میں اور دن میں بھی مشاعرہ کامیاب ہو سکتا ہے نہ جانے ظہور احمد ظہور سہارنپوری کیوں مشاعرہ کو چلاتے ہوئے ناراض ہو کر چلے گئے ۔ مجھے بتلایا گیا کہ شام ہی کو شعرائے کرام کو لوٹنا بھی تھا اور وہ دیر تک بحر تقریر کرتے رہے اس پر ان کو منع کیا گیا کہ یہ تقریر کا وقت نہیں لہٰذا وہ اس بات پر ناراض ہو کر چلے گئے اور ع

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

تعجب ہے کہ ان کو منانے اور واپس لانے کے لئے دیکھ بھی نگار
[illegible]

اور ان کے ذیلقعدہ شمار مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے
بچوں کو ایک اچھا مشاعرہ سُنا دیا یہ سبھی سادہ طرح
دیہاتی مشاعرہ سے بہت ہی خوش ہوئے اب آئندہ دیکھئے کس
گاؤں میں مشاعرہ ہوتا ہے ۔

غزل

محسن دموھی

ہے بیرلوں کے جیسا ان کا سبھاؤ
کسی بچے کو بے سبب نہ رُلاؤ
دیئے پلکوں پہ آنسوؤں کے جلاؤ
روشنی سے حیات کو نہلاؤ
کعبہ و سومنات جاؤ مگر
کبھی فاقہ کشوں کے گھر بھی آؤ
سو گئی ہے شکست کھا کے اُمید
یہ ابھی زندہ ہے کفن نہ اُڑھاؤ
زندگی بھی کٹھن اجل بھی کٹھن
آدمی کیا ہے ایک گھاؤ پہ گھاؤ
جنگلوں میں بھی پھول کھلتے ہیں
اُن بڑھوں کو نگاہ سے نہ گراؤ
سرِ نقا عشق کا مآل مگر
کر گیا کام سوزِ غم کا الاؤ
آدمی جانور بھی ہوتے ہیں
چھت کی دیوار پہ نہ گھاس اگاؤ
نیم کا پھل تو میں نہیں محسن
اس کا کہنا ہے اس کو منہ نہ لگاؤ!

○

غزل

اخلاق سہسوانی

رسوا ہو محبت یہ گوارا تو نہ ہوگا
لیکن یہ مرے قبضہ میں زمانا تو نہ ہوگا؟

ہاں! اے غمِ جاناں تجھے اپنا تو رہا ہوں
تو مجھ کو نہ اپنا سکے، ایسا تو نہ ہوگا؟

ہم ترکِ محبت کے لئے سوچ رہے ہیں
کچھ بھی ہو، مگر غیرتِ تمنّا تو نہ ہوگا؟

ماضی کے زمانے کو حقارت سے نہ دیکھو
اُس دور کا انسان درندا تو نہ ہوگا؟

اچھا ہوا ہم لا نہ سکے تابِ نظارہ
اب ہوش کا عالم تہ و بالا تو نہ ہوگا؟

لو چاک کئے لیتا ہوں میں زیست کا دامن
اب میرا جنون عشق میں رُسوا تو نہ ہوگا؟

بہتر ہے کہ تو غم کو خوشی مان لے اخلاق
دُنیا سے ترے غم کا مداوا تو نہ ہوگا!

حاضر جواب

کوکب سہسوانی

ایک دن بچوں سے پوچھا ماسٹر انصار نے
دودھ میں کیا فرق ہے بتلاؤ ماں اور بھینس کے
جو بھی بچہ اس کا اثر ٹھیک سے بتلائے گا
روم میں اس کو ہی مانیٹر بنایا جائے گا
ایک بچے نے کہا سر میں بتاتا ہوں ابھی
اس کا اثر کیا ہے یہ تو جانتا ہے ہر کوئی
قدرتاً ہی دودھ ماں کا ہے بڑا خوش ذائقہ
اس میں چینی ڈالنے کا بھی نہیں ہے مسئلہ
دوسرا بچہ ہوا اسٹینڈ اپ یکبارگی
بولا ماں کے دودھ میں ہوتی ہے یہ خوبی بڑی
گھر میں ہوں موٹر میں ہوں یا ہوں سینما ہال میں
ہر جگہ یہ دودھ آ جاتا ہے استعمال میں
بھینس تو دن رات میں دوبار ہی دیتی ہے دودھ
اس پہ ہی تکیہ کریں تو چار دن میں جائیں سوکھ
تیسرا بولا کہ سر یہ تو نہیں کوئی جواب
میں بتاتا ہوں ابھی جو اس کا اثر ہے جناب
میرے اثر سے یقیناً آپ ہوں گے مطمئن
دودھ پینے میں کبھی ماں کے نہیں آتی ہے گھن
چوتھے بچے نے کہا سُن لیجئے میری حضور
دودھ میں ماں کے کسی صورت نہیں آتا فتور
دودھ میں ماں کے ملا سکتا نہیں پانی کوئی
دودھ والا بھی یہاں مجبور ہے حلوائی بھی
دودھ برتن میں کبھی ماں کا لیا جاتا نہیں
اس لئے اس کے بگڑنے کا کوئی خدشہ نہیں
پانچواں بچہ یہ بولا سر یہ سب بکواس ہے
مجھ کو اپنی عقل پر بھرپور وشواس ہے
گھپ اندھیرے میں بھی پی اس کو پا سکتا ہوں میں
اور ابا جی کی میرے پاس گارنٹی نہیں

معصوم دشمن

ڈاکٹر اے سلیم آکان جلالی

"مشری ان جی خزانچی من جیت سنگھ کا کوارٹر کون سا ہے؟" لمبا ٹھنگے کے سے پتلے سیڈول نوجوان نے مجھ سے پوچھا۔ صبح کا وقت تھا اور میں دروازہ پر بیٹھا داتن کر رہا تھا۔ میں نے ایک نظر نوجوان کو دیکھا اور ساتھ والے کوارٹر کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔ وہ آگے بڑھا اور زنجیر کھٹکھٹانے لگا۔ خزانچی صاحب نے دروازہ کھول دیا۔

"ست سری اکال۔" نوجوان کے منہ سے نکلا۔ خزانچی صاحب نے بھی "ست سری اکال" کہا اور ساتھ ہی نوجوان کو اندر لے گئے۔

میں نے نوجوان کے لب و لہجہ سے سمجھ لیا تھا کہ یہ پنجابی نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ میں جب سے یہاں آیا ہوں آج تک اس شخص کو نہیں دیکھا۔ میں نے دل ہی دل میں کچھ سوچا اور ان کی گفتگو سننے کے لئے دھیرے سے دروازے پر کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے دونوں کی آوازیں صاف صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"کیا آج چھٹی ہے؟"

"نہیں صاحب کیسی چھٹی؟ یہاں تو مرنے تک کی فرصت نہیں ہے۔ صبح کے نکلے شام کو گھر آتے ہیں صرف اتوار کی چھٹی ملتی ہے سو گھریلو معاملوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ نو ریسٹ ایٹ آل۔"

"مگر میں تو ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ چھٹی پر ہیں۔"

"کیسے؟؟"

"اس لئے کہ آپ پیوند لگی قمیص پہنے ہوئے ہیں کام پر جانا ہوتا تو اچھی قمیص پہنے ہوئے نہ ہوتے۔ معمولی سے معمولی آدمی بھی جب کہیں باہر جاتا ہے تو کپڑے اچھے پہن لیتا ہے۔" اپنی پیروں کے پاس سرکاتے ہوئے نوجوان نے کہا۔

"تمہارا اندازہ چاہے کچھ ہو تجربات سچا ہے۔ کیا کروں بھائی صاحب چار سو روپے مہینہ ملتے ہیں تین سیانی لڑکیاں ایک لڑکا ہے اور میرے گھر میں کل ملا کر چھ [illegible] ہو گئے۔ پیوند لگی قمیص نہ پہنوں تو کیا پہنوں۔ کیوں کہ اپنا کیوں مجھے دینا [illegible] کچھ آسان نہیں ہے کیسے گھر کے اخراجات کو پورا کروں اور کیسے شان و شوکت سے رہوں۔"

دونوں باتیں کر رہے تھے خزانچی صاحب کی لڑکی نے نمستے کرتے ہوئے چائے لا کر میز پر رکھ دی اور اندر چلی گئی۔ نوجوان نے لڑکی کو پیچھے سے بغور دیکھا اور کہا "آپ کی بیٹی ہے؟"

"جی ہاں چائے پیجئے نا" خزانچی نے کہا۔

"شکریہ" انٹرویو میں بیٹھے کینڈیڈیٹ کی طرح کالر سنبھالتے ہوئے نوجوان بولا۔

"آپ کا شبھ نام کیا ہے بھائی جی؟"

"میرا نام مہالک رام ہے۔ امرتسر کا رہنے والا ہوں۔" فوراً ہی جواب دیتے ہوئے نوجوان نے کہا۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"کیسے؟؟" نئی بٹی ہوئی رسی کی طرح اینٹھتے ہوئے نوجوان بولا۔

"مگر امرتسر پنجاب میں ہے اور وہاں کے لوگوں کے بولنے کا یہ انداز ہی نہیں ہے۔ خیر جو بھی ہو میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔" عاجزی سے خزانچی نے کہا۔ دونوں کی باتیں ہو رہی تھیں کہ میری لڑکی مینا کشی نے آواز دی "پاپا جی چائے تیار ہے۔" یہ سنتے ہی میں اٹھ کر اندر کی طرف چلا گیا۔ میری جاسوسی ادھوری رہ گئی تھی جس کا مجھے بہت دکھ تھا۔ لیکن یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ مجھے کسی کے گھریلو معاملات سے کیا واسطہ۔

"خزانچی صاحب کی لڑکی [illegible] میری لڑکی [illegible] تھی اگلے دن اس نے میری لڑکی کو بتایا کہ کل شام خزانچی صاحب کو [illegible] نوٹوں سے بھری اٹیچی [illegible] گھر میں

خاموش رہا۔ مگر [illegible] اس کی سچائی [illegible] جاننے کے لئے
سوچتا رہا اور ایک دن میں نے خزانچی صاحب کو بازار میں
روک کر ادب سے آداب کرتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"خزانچی صاحب کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو نوٹوں سے بھری
اٹیچی ملی ہے؟"

"کسی اور سے مت کہہ دینا جاولہ جی ویسے یہ بات غلط
نہیں ہے۔"

"تب تو یہ کہاوت سچ ہو گئی کہ بھگوان جسے دیتا ہے چھپر
پھاڑ کر دیتا ہے۔ خزانچی صاحب میری برادری کے ہو بھلا میں
تمہارا برا کیوں چاہوں گا؟" میں نے انھیں یقین دلایا اور وہ
خوش خوش گھر چلے گئے اور میں بھی گھر آکر گلی میں آندھی سے گرے
پیڑ کے تنے پر بیٹھ کر سگریٹ کا دم لگاتے ہوئے سوچنے لگا۔

"کہیں خزانچی صاحب نے اس نوجوان کی اٹیچی کا صفایا
نہ کر دیا ہو۔ اٹیچی تو اس نوجوان کے پاس بھی تھی۔ اور یہ بھی
خیال بار بار آتا رہا کہ کسی کی جیب میں دس روپیہ ہوتے ہیں
تو بھیڑ میں سے گزرتے وقت بار بار جیب پر ہاتھ رکھ کے دیکھ
لیتا ہے۔ کون ایسا لاپرواہ ہوگا جو نوٹوں سے بھری اٹیچی کو اس
طرح بے پرواہی سے اسٹیشن پر چھوڑ جائے گا؟ اور تو بھگوان جانے
کیا لینا دینا" کہتے ہوئے میں نے سگریٹ کے آخری حصہ کو پھینکا اور
گھر کو چل دیا۔ [illegible] گھر آیا تھا۔ بھگوان خیر کرے۔"
میں نے دھیرے سے کہا تھا مگر ڈاکیے نے سن لیا اور بولا

"بالکل کشل ہے بابو جی چنتا کی کوئی بات نہیں ہے۔" یہ سن کر
میں مسکرایا، دستخط کئے اور ٹیلی گرام کھول کر پڑھنے لگا۔ "رمیش
کورائے تھرو فرسٹ۔" میں اچھل پڑا۔ میرا لڑکا ایم بی بی ایس کے پہلے
سال فرسٹ کلاس پاس ہو گیا۔ میں نے ڈاکیے کو شکر کے ساتھ
شکریہ دیا۔

"مبارک ہو بابو جی رمیش ہر سال اسی طرح پاس ہوا کرے
اور میں اسی طرح خوشخبری کا تار لایا کروں۔"

"شکریہ۔ اور میں تم کو اسی طرح پانچ روپیہ مٹھائی کو دیا
کروں۔" میں نے پانچ روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے
کہا اس نے [illegible] نوٹ جیب میں رکھا اور دعائیں دیتا ہوا

[illegible] گھر کے سب ممبروں میں خوشی کی لہر دوڑ
گئی۔ مجھے فیکٹری کے کام سے کہیں جانا تھا۔ گاڑی کا وقت سات
بجے شام کا تھا۔ ریزرویشن پہلے ہی ہو چکا تھا۔ دوسرے دن [illegible]
پہنچا۔ فیکٹری کا کام ختم کر کے آٹھویں دن گھر آیا تو جیسے ہی کپڑے
اتارنے اپنے کمرے میں پہنچا میری میز پر مٹھائی کا ڈبہ رکھا تھا
مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی مٹھائی تو ایسی چیز ہے کہ بغیر بھوک کے بھی کھائی
جاتی ہے۔ جلدی جلدی کپڑے بدلے "منا کھی یہ ڈبہ کہاں سے
آیا ہے؟" میں نے بیٹی سے پوچھا۔

"پاپا جی خزانچی صاحب کی لڑکی نیرو ایم بی بی ایس میں
آگئی ہے اسی خوشی میں یہ مٹھائی دے گئی ہے۔" لڑکی نے کہا

"نیرو ایم بی بی ایس میں آگئی ہے؟ میں نے تو دس ہزار روپیہ
ڈونیشن دیکر رمیش کو ایم بی بی ایس میں بھرتی کرایا تھا اور نیرو بنا
خرچ کئے ہی کیسے آگئی۔ خزانچی صاحب کا مقدر اتنی زوروں پر ہے
ادھر نوٹوں سے بھری اٹیچی ملی ادھر لڑکی ڈاکٹری میں سلیکٹ
ہو گئی۔ ایڈمشن کرایا ہے۔"

"اور کیا۔ بھگوان کی مایا تو ہے ہی۔" میری بیوی نے مختصر سا
جواب دیا۔ میں خاموش رہا اور غسل خانہ میں چلا گیا۔ اسی سال
میرا تبادلہ گورکھپور کا ہو گیا۔

ایک برس بعد گورکھپور میں خزانچی صاحب کی دوسری لڑکی
کی شادی کا دعوت نامہ ملا۔ لڑکی کا ہونے والا پتی جج تھا یہ جان
کر مجھے خوشی تو ہوئی لیکن تعجب خوشی سے زیادہ ہوا ایک معمولی
اوقات کا آدمی اتنا بڑا رشتہ جوڑنے میں سپھل کیسے ہو گیا
لڑکیاں تو سندر ہیں مگر آج کل کے لوگ حسن کے ساتھ دولت بھی
چاہتے ہیں۔ انھوں نے دنیا کی [illegible] کیسے بدل دی۔ اب
مجھے یقین سا ہو گیا کہ نوٹوں سے بھری اٹیچی ضرور ملی ہوگی میں نے
اس شادی میں شرکت کا پختہ ارادہ کر لیا۔ تاکہ دیکھ سکوں کہ
جاولہ صاحب کس شان سے شادی کرتے ہیں [illegible]
مع اہل و عیال میں جاولہ صاحب کے یہاں پہنچا تو ان کے یہاں
شادی کا منظر راجا مہاراجاؤں کے [illegible]
اعلیٰ تھا۔ حیرت کا مقام ہے کہ خزانچی صاحب ایک معمولی
[illegible]

تھی جو کچھ انھوں نے اپنے لڑکے شوکت کے نام پر بنائی تھی اس اس پر کوئی ایک پیسہ ترتیب لاگت آئی تھی۔ تین چار دن تک شادی کی دھوم رہی کسی بات میں کمی نہ دیکھی بلکہ... شاہی شان شوکت ہی دیکھی دولت کا مظاہرہ ہر طرف جلوہ گر تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ لڑکے کے باپ کو اسی ہزار روپے نقد دیئے گئے ہیں اور جہیز الگ ہے۔ جہیز تو ہم نے بھی دیکھا پچاس ساٹھ ہزار سے کم کا مال نہیں تھا۔ ہم لوگ تو رکھ رکھاؤ دیکھ کر لوٹ آئے لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ خزانچی صاحب نے اتنا روپیہ کہاں سے نکالا۔ اگر کالا بھی مان لیا جائے تو بھی اس میں تھوڑے ہی روپے لگے اور وہ بھی گنتی ہی کے قارون کا خزانہ تھوڑے ہی بھرا رہا ہوگا کہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کبیر کا تھیلا تھا جس کی دولت خرچ کرنے پر بڑھتی چلی جاتی تھی۔

دوسرے سال انھوں نے دوسری لڑکی کی شادی ایک لیفٹیننٹ سے کی دعوت نامہ اس شادی کا بھی آیا خزانچی صاحب معلوم نہیں کیوں مجھ جیسے معمولی پڑوسی کو بھولے نہیں تھے۔ اکثر لوگ دولت مند ہونے کے بعد چھوٹوں کو بھول جاتے ہیں مگر اس شادی میں ہم کسی گھریلو مجبوری کے باعث شریک نہ ہو سکے۔

اس کے ڈیڑھ سال بعد خزانچی صاحب کا ایک خط ملا جس میں انھوں نے اپنی لڑکی نیرج کی شادی جو ڈاکٹری میں پڑھ رہی تھی میرے لڑکے ڈاکٹر کرشن سروپ کے ساتھ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ کئی روز تک میں اس پیشکش پر غور کرتا رہا جب میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا تو راستے لینے کے لئے وہ خط بیوی کو پڑھ کر سنایا اس نے فوراً مسئلہ حل کرتے ہوئے کہا۔

"وہ پہلے کچھ بھی تھے لیکن اب تو رئیس ہیں سماج میں عزت ہے ان کے رشتے دار بھی اونچے عہدے پر ہیں۔ لڑکیاں تو تعلیم یافتہ ہیں۔ اور پھر لڑکا ڈاکٹر ہے اور لڑکی بھی ڈاکٹر ہے۔ اس شادی سے ہماری شان میں بٹا نہیں لگے گا۔ فوراً خط لکھ دو کہ ہمیں یہ رشتہ خوشی سے منظور ہے۔ بیوی کی یہ بات مجھے بھی جچ گئی اور میں نے خط لکھ دیا۔ خزانچی صاحب میرا خط ملتے ہی فوراً آگئے اور پچاس ہزار روپیہ سگائی کے شگن کے طور پر

دے کر رشتہ طے کر گئے۔ اس کے بعد ہم اپنی زبان سے کیا مانگ سکتے تھے ہمیں تو خود انھوں نے امید سے کہیں زیادہ دے دیا تھا۔ سگائی پر یہ حال ہے تو شادی پر کیا نہ کریں گے۔ اپنی طرف سے مانگ کر کے بات کیوں خراب کرتا۔ خزانچی صاحب بھی جہاں دیدہ تھے۔ آخر تک انتظار میں رہے کہ ہم لوگ کچھ کہیں، جب واپس جانے کو ہوئے اور ہم نے کچھ نہیں کہا تو خود ہی بولے، "ڈیڑھ لاکھ اور خرچ کروں گا اگر آپ کو کچھ کہنا ہو تو ابھی کہہ سکتے ہیں۔" میں نے ان کی بات سن کر کہا۔

"جو کچھ بھی آپ دیں گے وہ سر ماتھے قبول کیا جائے گا بھلے لوگوں میں مانگ تانگ شوبھا نہیں دیتی ہے۔" وہ یہ سن کر مسکرا دیئے اور چلے گئے۔ ہم لوگوں کو شادی اچھی ہونے کی امید تو تھی مگر اتنی اونچی شادی خواب میں بھی نہ تھی شادی کا دن طے ہوا اور شادی ہوگئی اور سب کچھ ہماری امیدوں سے بڑھ چڑھ کر ہوا۔

اس طرح خزانچی صاحب تینوں لڑکیوں کے بوجھ سے سبکدوش ہوگئے۔ صرف ایک لڑکا رہ گیا ہے جو ذہن تھا اور پڑھنے میں ہوشیار اسے تو خزانچی صاحب چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنانا چاہتے تھے۔ بھگوان نے ان کا یہ خواب بھی پورا کر دیا اور اب وہ ریٹائر بھی ہو گئے تھے۔ شوکمار کا رشتہ میرٹھ کے کسی ریڈی میڈ کلاتھ مرچنٹ کی لڑکی سے طے ہو گیا۔ اب کی بار انھوں نے مجھے شادی سے کئی دن پہلے شریک ہونے کی گزارش کی تھی جسے میں نے منظور کر لیا کیونکہ یہ میرا فرض تھا کہ ان کا اس موقع پر ہاتھ بٹاؤں کیونکہ اب تو رشتہ داری کی بات تھی برادری یا دوستی کی رسمی بات نہیں۔

اس وقت میری حیرت کا ٹھکانہ نہیں رہا جب انھوں نے اپنے لڑکے کی دلہن کے لئے چھتیس ہزار روپے کا سونا خریدا میں ساتھ تھا۔ میں من ہی من میں سوچ رہا تھا کہ ان کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آگیا جو ساون بھادوں کی برسات کی طرح برس رہا ہے۔ میں نے بہت سوچا مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچا اب ایک ایسی بات بھی مشکوک نظر آنے لگی تھی جو پہلے باتوں باتوں میں ان سے پوچھ ہی لیا۔ خزانچی صاحب آپ نے لکشمی جی کی

مہربانی کیسے ہوئی۔

خزانچی صاحب کچھ دیر خاموش رہ کر فرمانے لگے "صاحب اب میں ریٹائر ہوں مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے اور اب آپ بھی میرے اپنے ہیں۔ چنانچہ آپ سے کیا چھپانا۔ اصل میں یہ سارا جو تماشہ تھا ناٹک تھا جو ایک شخص نے مجھے سمجھایا تھا بہت کائیاں تھا وہ۔ میری زندگی ہی بن گیا گھر بیٹھے بٹھائے آ دھمکا اور بولا "میں تم کو ہر ہفتے بیس ہزار روپے دیا کروں گا لیکن چار میرے ہیں باقی سب تمہارے جعلی نوٹ اصلی نوٹوں میں ملا کر کسانوں کو گنے کے پیمنٹ کے وقت نکال دیا کرو" اس کی یہ بات سن کر پہلے تو میں نے اسے کوئی سر پھرا سمجھنے والا سمجھا مگر بعد کو یقین ہو گیا کہ وہ ایک شاطر ٹھگ تھا مجھے اس کی یہ ترکیب پسند آئی اور میں نے ہاں کر دی۔

بس پھر کیا تھا کام چل پڑا چار ہفتے میں سولہ ہزار روپے کے نوٹ میری جیب میں آ جاتے۔ شروع شروع میں اس کام میں گھبراہٹ ہوئی مگر جس طرح کوئی نیک عورت غریبی سے مجبور ہو کر طوائف بننے سے گھبراتی ہے مگر بعد میں ڈھیٹ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بعد میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی"

"اس طرح اپنے ذاتی مفاد کے لئے دلیپ کا بہت بڑا نقصان کیا۔

محمد علی صاحب ہم ان شریفوں سے لاکھ درجے اچھا ہوں جو سکے کے دانے دانے کو محتاج ہوتے ہیں اور پھر بھی ان کی شرافت کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ کوئی عزت نہیں ہوتی۔

میں نے حیرت سے خزانچی صاحب کے منہ کو کچھ دیر تک تکتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے"۔

●●●

بقیہ: باب انتقاد

اظہار چند سطور میں فرمایا ہے اس کے سامنے اگر اس کتاب پر طویل مقالے بھی لکھے جائیں تو پھیکے رہیں گے چنانچہ جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی بیش بہا رائے گرامی شکریہ کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔

"دراصل بعض غزلیں ایسی ہوتی ہیں اور بعض غزلیں ایسی بھی ہیں جن کی حیثیت صحرا میں نخلستان کی سی ہوتی ہے اور یہی غزلیں اور یہی غزلگو اس صنف سخن کی نمائندگی کے حق دار ہیں۔ اظہر عنایتی کا غزل کی حیثیت بھی اس صحرا میں ایک نخلستان کی سی ہے۔ وہ سراسر جدید غزل گو ہیں مگر ان کی جدت اردو غزل کی عظیم اور صد رنگ روایت کو ساتھ لیکر چلتی ہے۔ وہ بغاوت نہیں کرتے۔ اجتہاد کرتے ہیں۔ کوئی اس اجتہاد کو بغاوت کہہ لے تو یہ اس کا اپنا معیار عدل ہے ورنہ اجتہاد کا جذبہ تو تعمیر دار تقا کی نمائندگی کرتا ہے۔

غزل میں اظہر عنایتی کا اجتہاد روح عصر کو جذبے میں سمو کر پیش کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دُکھِ عصر کو بھی چونکہ جدید غزل میں کھپایا جانے لگا ہے اور بنیادی انسانی جذبات تو صدیوں سے غزل کا موضوع رہے ہیں۔ مگر اصل کام ان کی فنکارانہ آمیزش ہے تاکہ نہ روحِ عصر کا اظہار بے اثر رہے اور نہ انسانی جذبہ مجرد صورت میں پیش ہو تا رہے۔ جیسے اس میں تلازمہ شعر کہنے والے کا منفرد ذات ہے اور بس۔ اظہر نے ان دونوں مخصوص موضوعات کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کے بجائے انہیں یک جان بنا دیا ہے اور یہی اردو غزل جس نے غالب اور اقبال کے ساتھ یگانہ اور فراق کے ہاتھوں اپنے آفاق کو وسیع کیا تھا تیسری نئی دستک کی جستجو میں ہے۔"

یہ مجموعہ اس عزت و احترام کا حق رکھتا ہے کہ یہ صاحب ذوق کی ذاتی لائبریری میں موجود ہو۔ اور یہ مجموعہ ہر اس کتب فروش کے یہاں دستیاب ہونا چاہئے جو اچھی ادب کی بہترین کتابیں فروخت کرتے ہیں۔ پندرہ روپے میں ہندوستان ہندی بک ڈپو سے بھی خریدا جا سکتا ہے۔

بقیہ: [illegible] ...

وہ ہو سکا۔ پھر شکار آگیا مراعات قربانی بجا ہے مگر انسان بٹ گئے اب بھی حضرت دین پناہ کی کرامات کا شہرت دھوم میں قائم ہے وہ مستزاد ہیں پر میں نے اپنی دلی خواہش کہی تھی کہ میں مطالعہ کا شہ بیان کروں اپنی مہربانی کی مانند ایک سامنے ہے۔ ●●●

غزلیں

غازی سکروڈوی

کلیجہ منہ کو آتا ہے خوشی اچھی نہیں لگتی
مجھے یارو! پرائی شاعری اچھی نہیں لگتی

ذرا ساغر کو چھلکا دے کہ تو دینے لگی محفل
مرے ساقی یہ مدھم روشنی اچھی نہیں لگتی

کسی صورت سے اے ناخدا منجدھار تک لے چل
مجھے ساحل پہ کشتی ڈوبتی اچھی نہیں لگتی

ذرا ہنس بول، نظروں کو اٹھا، ہونٹوں کو جنبش دے
ترے چہرے پہ یہ سنجیدگی اچھی نہیں لگتی

مرے ساقی ذرا آنکھوں سے بھی دو بوند ٹپکا دے
مجھے سادہ سی ہلکے رنگ کی اچھی نہیں لگتی

ذرا کھل کر کہیں میخانہ ہے یہ محشر نہیں واعظ
نگاہوں پر یہاں شرمندگی اچھی نہیں لگتی

نگاہوں میں تکلم ہے، مگر ہونٹوں پہ خاموشی
محبت میں یہاں تک بے بسی اچھی نہیں لگتی

ترے معصوم ہونٹوں پر تبسم کیوں نہیں آتا
مجھے بھی کیا، مری دیوانگی اچھی نہیں لگتی

جبینیں تو جھکی جاتی ہیں، لیکن دل نہیں جھکتے
مجھے تو ہاں یہ رسم بندگی اچھی نہیں لگتی

یہ عالم ہے وفا کے نام سے دل کانپ اٹھتا ہے
مگر پھر بھی وفاؤں میں کمی اچھی نہیں لگتی

گوارا ہے مجھے غازی دوستوں پر جان دینے میں
مگر اس دوستی کی بات بھی اچھی نہیں لگتی

○

ڈاکٹر شمیم [illegible]

فصلِ گل آئے کب خدا جانے
اپنے ہاتھوں سے ہیں خالی پیمانے

کس کو فرصت ہے دورِ جام میں
غمزدہ صورتوں کو پہچانے

آج احساس تک نہیں باقی
ٹوٹ جائیں نہ دل کے پیمانے

یہ علامت نہیں قیامت ہے
اپنے ہونے لگے ہیں بیگانے

عہد سچا عمل شریفانہ
بھولے بسرے ہوئے ہیں افسانے

کون سمجھائے کون سمجھے گا
ہم بھی دیوانے تم بھی دیوانے

کاش ہوتا عمل بھی تم میں شمیم
ہم تمہیں پوجتے خدا جانے

○

ضیا فتح آبادی

خوئے بلبل کو نغمہ جو دیکھا
گل کو محرومِ رنگ و بو دیکھا

اک میرا ہی جام کیوں ہے تہی
بادہ بادہ، سبو سبو دیکھا

اک خموشی کا پرسکوں عالم
پسِ دیوار ہاؤ ہو دیکھا

اپنے سجدوں کو، تیرے جلووں کو
دربدر دیکھا، کو بہ کو دیکھا

موڑ کر روشنی سے منہ اپنا
اپنے سائے کو روبرو دیکھا

یہ بھی تھا اپنی ہی نظر کا فریب
دوست کے بھیس میں عدو دیکھا

کبھی اپنا پتا ملا نہ ضیا
دیکھنے کو تو چار سو دیکھا

○

ڈاکٹر لطیف اکبر آبادی

یہ خراجِ عشق بھی حد سے سوا دینا پڑا
انتہائے رنج و غم میں مسکرا دینا پڑا

بجھنے والے کب تھے میرے عزمِ پختہ کے چراغ
ہر قدم پر ظلمتوں کو راستہ دینا پڑا

اہلِ دل پر کس قدر حادثے ہیں یہ اہلِ جہاں
بات کرنے میں خدا کا واسطہ دینا پڑا

اہلِ گلشن کے کرم کچھ اس قدر بڑھنے لگے
خود نشیمن اپنے ہاتھوں سے جلا دینا پڑا

جب کہ ساری کوششیں بے سود ہو کر رہ گئیں
خود کو [illegible] دینا پڑا

کام جب پختہ ارادوں سے لیا [illegible]
[illegible]

انجمن افغان دوستاں [illegible] मित्र संघ

FRIENDS OF AFGHINISTAN ASSOCIATION

بمبئی چلو

بتاریخ: ۳ مئی ۱۹۸۱ء — بمقام: مستان ٹینک، بمبئی

برادرانِ وطن

افغانستان میں روسی فوجوں کے داخلے سے اس برصغیر کے لئے تاریخ کا شدید ترین خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ روس کی بھارت پر بری نظر ایک مدت سے رہی ہے۔ اور افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد نے ہندوستان کے لئے بھی خطرے کی گھنٹی بجا دی ہے۔ آج افغانستان کل پاکستان اور پھر ہندوستان اس کے ناپاک ارادوں کا شکار ہو سکتا ہے۔

لہٰذا روس کے ان ناپاک ارادوں کو ناکام بنانے کے لئے دیش کی جنتا کو بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے بمبئی میں انجمن افغان دوستاں کی طرف سے ایک قومی اجتماع منعقد ہو رہا ہے۔

اس اجتماع میں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ صاحب وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر، جناب اٹل بہاری باجپئی صدر بھارتیہ جنتا پارٹی۔ جناب رام جیٹھ ملانی ممبر پارلیمنٹ۔ جناب سکندر بخت، جناب جے پی ماتھر ایم پی۔ جناب اچاریہ دھریندر ناتھ، جناب عارف بیگ وغیرہ وغیرہ حضرات ملک کے عوام کو اس ضمن میں ایک نئی راہ دکھائیں گے۔

آپ سے التماس ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں بمبئی تشریف لائیں
اور اپنے نیتاؤں کا پیغام سنیں اور اسے گھر گھر پہنچائیں۔ فقط

مہیش جیٹھ ملانی چیئرمین مہاراشٹر
انجمن افغان دوستاں

گلہائے عقیدت

رام

قاضی سید عرشی کاظمی

خطرِ وحشت تھے صحرا میں کارواں کیا کیا
زمیں پہ فتنے بپا تھے آسماں کیا کیا
فضا میں قافلۂ مہر و ماہ تھا تو سہی
مگر ہلاکِ سویدائے بے کراں کیا کیا
دلوں میں جذبِ محبت پناہ تھا تو سہی
مگر تنفر زدہ کاہشِ نہاں کیا کیا
وہ دودِ خوں کی تپش روح میں در آئی ہوئی
وہ برشگالِ فضا چشمِ خوں چکاں کیا کیا

ہوا ظہور پھر اُس شانِ کبریائی کا — طلسم ٹوٹ گیا جبر کی خدائی کا
حیاتِ منضبطِ انقلاب تازہ ہوئی — وہ چہرہ چہرہ مصائب کی گرد غائب ہوئی
سیاہ خانوں کا ماحول رنگ و نور بنا — زمینِ ہند کا ہر ذرہ شمعِ طور بنا
خلوص و مہر کی صدق و صفا کی بات چلی — خدا کی بات اور اہلِ خدا کی بات چلی

جنونِ شوق کو آخر جلوۂ یار ملا
فسونِ بیان و پیرایۂ ہزار ملا

وہ حسنِ جلوۂ ایماں طراز کیا کہنا
وہ نغمۂ شعلۂ مضرابِ ساز کیا کہنا
تمام فخر و نظافت تمام اباحت و ناز
تمام طاعت و عجز و نیاز کیا کہنا
تمام رحمت و شفقت تمام عفو و کرم
تمام درگزر و احتراز کیا کہنا
تمام عزت و عظمت تمام جاہ و جلال
تمام مرحبا دل و جاں نواز کیا کہنا
وہ ذاتِ قدس، قیامت تک آبرو ہے یہی
کہ ہم سے حق زدہ و حق رسی کا خواہ یہی

غزل

شاہد رتلامی (کویت)

اس حیاتِ عارضی کا فلسفہ ہو جاؤں گا
رفتہ رفتہ اک مقامِ گم شدہ ہو جاؤں گا

بس اسی اُمید پہ بیٹھا ہوں تیری راہ میں
ٹھوکریں کھا کر کسی دن پارسا ہو جاؤں گا

ہنستے ہنستے طے کروں گا زندگی کے مرحلے
چلتے چلتے زندگی کا آئینہ ہو جاؤں گا

درد کے تپتے ہوئے صحرا کو کر دوں گا چمن
پائے استقلال کا جب آبلہ ہو جاؤں گا

جستجو کے یار میں نکلوں گا جب دیوانہ وار
منزلِ دیر و حرم کا راستا ہو جاؤں گا

عشق کی راہوں میں اک دن آئیگا ایسا مقام
تم تمھاری میں محبت کا خدا ہو جاؤں گا

اس طرح کھو جاؤں گا شاہد کسی کی یاد میں
یہ جہاں کیا چیز ہے خود سے جدا ہو جاؤں گا

غزل

قمر مرادآبادی

قفس کی [illegible] ہے
[illegible] بال و پر لے شعور بال [illegible] دیدے

مجھے صیاد میرے آشیانے کی خبر دیدے
مجھے پرواز کی حسرت ہو اُس کو بال و پر دیدے

میں دیوانہ [illegible]
[illegible] دیتی ہوں اس کو [illegible] دیدے

سکونِ دل کی خاطر [illegible] دعائیں کرتا رہتا ہوں
مگر یہ تو نہیں کہتا دعاؤں میں اثر دیدے

مجھے [illegible] دل کی [illegible] تھی
[illegible] کہا [illegible] دیدے

[illegible]
[illegible] اہلِ ساحل [illegible] دیدے

سیاہ پوش خاتون

نوڈار ڈمبدزے
ترجمہ: ستار طاہر

([illegible])

"نوڈار ڈمبدزے۔ جارجیا کے افسانہ نگار ہیں ۱۹۸۴ء میں ان کا انتقال چھپن برس کی عمر میں ہوا تھا۔ ان کی کہانیوں کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے اردو میں پہلی بار ان کی کہانی شائع ہو رہی ہے۔

س۔ ط"

سب کچھ قدیم روایات کے مطابق طے ہوا۔ یہ روایات ۔ ۔ ۔ ۔ جو صدیوں پرانی تھیں، اس لئے چالیس برس پہلے جب یہ شادی ہوئی تو پرانی روایات کے تحت ہوئی کیونکہ چالیس برس پہلے یہ رسم و رواج عام تھے، بیس برس پہلے کم ہو گئے، اور آج کل، ان روایات کا شاذ و نادر ہی کوئی خیال رکھتا ہے۔

رشتہ کرانے والی بچولی نے لڑکے کو دور سے لڑکی کی ایک جھلک دکھا دی، باقی باتیں پہلے سے طے ہو چکی تھیں لڑکے نے لڑکی کو پسند کر لیا تو بات پکی ہو گئی پھر منگنی ہوئی پورے رسم و رواج اور روایات کے ساتھ اور پھر شادی......

باجے گاجے کے ساتھ، اور رات گو آتش بازی چھوڑی گئی شادی کے کھانے کی ضیافت کا خاص اہتمام کیا گیا۔ سب نے ڈٹ کر کھایا۔ پورے گاؤں کے لوگ اس کھانے پر مدعو تھے شادی کے کھانے پر خوب ہلا گلا رہا۔ رقص ہوا، گیت گائے گئے، کچھ لوگ زیادہ پی گئے اور انھوں نے بدمستی کا مظاہرہ بھی خوب کیا، پھر ہنگامے ختم ہو گئے، دولہا دلہن تنہا رہ گئے اور ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی گئی۔

مہمان رخصت ہو گئے تھے [illegible] بیوی محنتی، گھر کے کام کاج سنبھالنے والی اور شوہر کی سب ضرورتوں کا خیال رکھنے والی تھی میاں کو بھی محنت سے کام کرنے کا شوق تھا اور وہ بھی بیوی کی ہر ضرورت اور خوشی کو خندہ پیشانی سے پورا کرتا تھا۔

آہستہ آہستہ گھر میں جم جاؤ ہو گیا، گھر ضرورت کی ہر چیز سے بھر گیا، کسی چیز کی کمی نہ رہی یہ ایک خوشحال گھرانہ تھا، دوسرے لوگ اپنی ضرورتیں پوری کرنے وہاں آتے تھے۔

اور پھر اس گھر کے ہرے بھرے صحن میں بچوں کے قہقہے گونجنے لگے۔ ایک بیٹی، دو بیٹے، خوشحال گھرانہ،

موسم گرما میں گندم کی کٹائی کا وقت آیا، کھیت مزدوروں کی خدمات حاصل کی گئیں، جب فصل کٹ رہی تھی تو گھر کا مالک جو سارا دن کام کاج میں لگا رہتا تھا، دوسروں سے کام کروا رہا تھا، اور خود بھی فصل کاٹتا رہا تھا، وہ تھک کر چور ہو گیا ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا، پھر دیر گئے جب وہ اٹھا تو اسے بخار تھا اور ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے، پھر اسے کپکپی محسوس ہونے لگی وہ کانپنے لگا جو دوا دارو ممکن تھا کیا گیا، مگر وہ بچ نہ سکا اور چند دنوں کے بعد چل بسا۔

مرنے والے کی بیوی نے سیاہ لباس پہن لیا، اپنے شوہر کی موت کے بعد وہ ایک طویل عرصہ زندہ رہی مگر اس نے سوگ کا لباس کبھی اپنے جسم سے نہ اتارا، تھوڑے دنوں میں اس سیاہ پوش خاتون کو سب جاننے اور پہچاننے لگے، یتیم بچے چھوٹے تھے اور مسائل کا انبار لگا ہوا تھا گھر کا سربراہ مر گیا تھا اور دولت کم تھی، وہ تمام مسائل خود حل کر رہی تھی [illegible] سب [illegible] زمینوں کا انتظام [illegible] کس طرح کے [illegible] والی تھی اس نے سب کچھ [illegible] کرلیا ایک ایک کام [illegible] سیاہ لباس [illegible] اور [illegible]

[illegible]

[illegible] بھی [illegible] کی [illegible]

[illegible] کی۔ سب اپنے اپنے مشاغل میں لگے رہتے تھے وہ تنہائی کی عادی ہو گئی تھی لیکن اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے بچوں کو اس سے محبت نہیں تھی، وہ بات بات پر اسے دھتکار دیتے اس کی باتوں کی ہنسی اڑاتے۔ بڑا بیٹا کہتا [illegible] چھوٹے بیٹے [illegible] چھوٹے بیٹے کو بھی یہی شکایت تھی اور بیٹی [illegible] صاف کہتی تھی کہ اس کی ماں کو اس کا خیال نہیں ہے ورنہ وہ اس کے گھر میں رہتی، اس کے گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی، وہ پریشان ہو گئی وہ ہمسایوں کے ہاں جاتی تو بیٹے اور بیٹی اس کو منع کرتے حالاں کہ وہ کبھی اپنی اولاد کی بے اعتنائی کا شکوہ کسی سے نہ کرتی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ وہ بوڑھی ہوتی گئی پھر ضعیف۔ اب، اس کے بیٹے اس کے پوتے پوتیاں اس پر احسان جتانے لگے "ہم تمہاری دیکھ بھال کرتے ہیں، ہم اپنی حیثیت سے بڑھ کر تمہارا خیال رکھتے ہیں، تم اس طرح منہ کیوں بنائے رکھتی ہو۔"

کسی کو اس کی پروا نہ تھی، سب اسے ایک بوجھ سمجھتے تھے، اس نے اپنی ساری زندگی اپنے مرحوم شوہر کی یاد میں بسر کر دی تھی اپنی اولاد کی خوشیوں کے لئے دن رات ایک کر دیا تھا، مگر اس کی اولاد کو اتنی توفیق نہ تھی کہ وہ کبھی اس سے پیار سے پوچھتے اماں تم خوش تو ہو؟ اس کی اولاد تو یہ سمجھتی تھی کہ وہ بے حد خوش ہے بلکہ وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے اپنی والدہ کو دنیا بھر کی خوشیاں فراہم کر دی ہیں۔

ایک دن اچانک بوڑھی سیاہ پوش خاتون کے طلبے کہا، کسی کو [illegible] کہ [illegible] کی [illegible] کے [illegible] جب مجھے اپنے گھر سے جانا چاہئے۔

[illegible]

[illegible] اور بولی۔

[illegible] سیاہ پوش خاتون کے بیٹوں اور [illegible] کو علم ہو [illegible] کر [illegible] بے [illegible] بڑے [illegible] کے بھائی کے [illegible] چھوٹے [illegible] کہاں ہو گی [illegible] بعد جب [illegible] انہیں پتہ چلا کر ان کی ماں غائب ہو چکی ہے کہیں جا چکی ہے تو وہ سٹ پڑے، وہ اپنی ماں کو کوس رہے تھے کہ جب لوگوں کو اس واقعہ کا علم ہو گا تو ان کی کتنی بدنامی اور رسوائی ہو گی، وہ سارا الزام اپنی ماں پر دھر رہے تھے، حویلی میں آ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ماں کی تلاش میں نکلیں گے، لیکن جلد ہی انہوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور یہ طے کیا کہ اخبارات میں اس کی گمشدگی کا اشتہار دیا جائے۔ لیکن غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ بھی واپس لینا پڑا کیوں کہ اس طرح لوگوں کو خبر ہو سکتی تھی کہ ان کی والدہ گھر سے غائب ہے اور اس طرح یہ اشتہار رسوائی کا سبب بن جاتا انہوں نے اپنی والدہ کو تلاش کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور انتظار کرنے لگے کہ وہ خود ہی لوٹ آئے گی۔

بوڑھی سیاہ پوش خاتون کے دل میں بچوں کی محبت کیسے مر سکتی تھی، وہ سوچتی وہ اسے یاد کرتے ہوں گے، اس کے لئے پریشان ہوں گے، اپنے بچوں کی پریشانی کا خیال جب اس کے دل میں شدت اختیار کر گیا تو اس نے ان پیسوں سے جو اسے بھیک میں ملے تھے ایک لفافہ خریدا اور اپنے بچوں کو ایک خط لکھوا کر بھجوا دیا۔

"میرے پیارے بچو، میرے بارے میں پریشان نہ ہونا، میں مقدس زیارتوں کے [illegible] میرے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو بہت بہت [illegible] میرے بارے میں فکر مند نہ ہونا [illegible]

[illegible]

بوڑھی [illegible]

[illegible]

جب ان کے [illegible] بھی [illegible] نہیں اور اسے
بوڑھی کو [illegible] محسوس ہوا کہ جیسے ان کے دل کا بوجھ
ہلکا ہو گیا ہے [illegible] میں جو خوف تھا وہ دور ہو گیا۔ انہوں
نے بوڑھی سیاہ پوش عورت کے خلاف خوب تشہیر کی،
ہمسایوں [illegible] اور سب جاننے والوں کو بار بار
یہ غلط پڑھایا اور یہ کہا انہوں نے اپنی والدہ کو خود مقدس
زیارتوں پر روانہ کیا تھا۔

بوڑھی سیاہ پوش عورت کی حالت بہت خراب تھی وہ زندہ تھی مگر مردوں سے بدتر۔ ایک کوڑھی بھکاری نے اسے ایک روز کہا "بوڑھی سیاہ پوش عورت۔ تو کیوں اس طرح گھسٹ رہی ہے۔ مر کیوں نہیں جاتی، وہ، دیکھ سامنے دریا بہہ رہا ہے"

بوڑھی سیاہ پوش عورت نے آہستہ سے کہا "خودکشی حرام ہوتی ہے"

—o—

اور ایک دن وہ مر گئی، اس کی موت کی خبر اخبار میں شائع ہوئی۔ اس لئے کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا اور اسے سرکاری خرچ پر دفنایا گیا تھا۔ اسے دفناتے وقت اس کا پھٹا ہوا میلا کچیلا سیاہ لباس تبدیل نہ کیا گیا، وہ قبر میں بھی اسی سیاہ لباس کے ساتھ گئی۔

اس کے بیٹے، اس کی بیٹی، اس کے پوتے اس کی پوتیاں، اس کے نواسہ نواسی اس کو بھول گئے۔ ایک بار جب کسی تقریب پر سارا خاندان جمع ہوا تو ان میں سے ایک نے کہا ان کی ماں پاگل تھی، ذہنی توازن سے محروم تھی، کہیں مر کھپ گئی ہوگی۔

انہوں نے [illegible] رشتہ داروں اور عزیزوں اور جاننے والوں کو جمع کیا اور [illegible] کہ ان کی والدہ مقدس زیارتوں [illegible] ہو گئی ہے [illegible] کہ ان [illegible] اہتمام سے دفنا دیا گیا ہے۔

[illegible] رشتہ داروں اور ہمسایوں کو جو کھانا کھلایا گیا وہ بے حد لذیذ تھا۔!!

غزل

نیئر [illegible]

کیا مزا ہے زبان بسمل تک — آنکھیں پُرنم ہوئی ہیں قاتل کی
سامنے ان کے سر نگوں رہنا — یہ حقیقت ہے حسرت دل کی
[illegible] کر لیے — [illegible] ہے منزل کی
[illegible] ہے یہ لب دریا — [illegible] ہے ساحل کی
حسن کی [illegible] — [illegible] ہے سعی حاصل کی

وہی مشکل یہاں ہیں ابھی
[illegible] اور غم دل کی

فارم IV
دیکھیں رول نمبر ۸
۱۔ مقام اشاعت: فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی
۲۔ نوعیت اشاعت: ماہنامہ
۳۔ نام پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر و مالک: ودیا پرکاش سرود
قومیت: ہندوستانی
پتہ: فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی
میں ودیا پرکاش سرود تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔
ودیا پرکاش سرود، یکم مارچ [illegible]

بقیہ [illegible] کہ مکتوب الیہ

[illegible] بالکل درست [illegible]
[illegible]
[illegible] کر دیا [illegible]
[illegible] درست [illegible]

بابِ انتقاد

سرور وسوجی

[illegible] کے پھول: نعت، منقبت اور سلام

[illegible] ایک مشکل ترین صنف ہے۔ کیوں کہ یہ حضور [illegible] کی تعریف و توصیف کے لئے ہے۔ لہٰذا نعت کہنے کے لئے شاعر کو ایسی باریکیوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے جو شاعری کی دوسری اصناف کے لئے ضروری نہیں ہوتیں۔

موجودہ دور کے نعت کہنے والوں میں ہند و پاک میں جناب سادھو رام آرزو سہارنپوری جیسا بہتر نعت کہنے والا کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے۔ کیوں کہ نعت کہنے والے شاعر کو رموزِ شاعری کی جملہ خصوصیات سے کما حقہ واقفیت کے علاوہ عشقِ نبی میں بدرجہ کمال حاصل ہونا ضروری ہے۔ اور جناب سادھو رام آرزو سہارنپوری کی کہی ہوئی سینکڑوں نعتوں، ہزاروں مناقب اور لاتعداد سلام پڑھ کر جہاں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے اس خیال کا قائل ہونا پڑتا ہے ؎

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمد پہ اجارہ تو نہیں

حال ہی میں حمد و نعت، منقبت اور سلام کا ایک نہایت خوبصورت اور قابلِ مطالعہ مجموعہ "عقیدت کے پھول" شائع ہوا ہے۔ جناب محمد عثمان عارف نقشبندی [illegible] ہاؤسنگ حکومت [illegible] کے چشم و چراغ [illegible] نقل سے قدیم [illegible] عارف صاحب [illegible] [illegible]

عارف صاحب سے [illegible] کی پہلی ملاقات [illegible] ہوئی تھی جب [illegible] ہوتے راجستھان [illegible] اشاعت کے سلسلے میں تمام راجستھان کا دورہ کیا گیا۔ اس وقت سے [illegible] قبلہ بیکل مرحوم کی وفات تک مدیر شانِ ہند کے تعلقات بیکل صاحب سے نیاز مندانہ نوعیت کے رہے۔ اور راقم تحریر جناب عارف سے دوستانہ۔ عارف صاحب کی شاعری میرے سامنے پروان چڑھی۔ راجستھان کے اچھے مشاعروں میں جب ہم دونوں کی شرکت ہوتی تو اکثر مشاعرہ کا دور [illegible] وقت بعض اشعار کے لئے استفسار سے مجھے عارف صاحب نے ہی آگاہ کیا۔ چنانچہ جے پور کے ایک مشاعرے میں ایک بزرگ خود مشہور شاعر کے ایک شعر کی طرف میری توجہ عارف صاحب نے مبذول کی تو سرِ مشاعرہ اعتراض کرنے پر کافی ہنگامہ ہوا۔ آخر قبلہ [illegible] صاحب نے فیصلہ دیا اعتراض سو فیصد صحیح ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج سے پچیس تیس سال پیشتر عارف صاحب رموزِ شاعری سے اچھی طرح واقف تھے۔

عقیدت کے پھول جناب محمد عثمان عارف کا [illegible] ہے۔ حمد، نعت، منقبت اور سلام کے [illegible] [illegible]

[illegible] صاحب [illegible]
[illegible] ہے
اس کتاب کا پیش لفظ نائب صدر جمہوریہ ہند جناب
ہدایت اللہ صاحب نے لکھا ہے پیش لفظ کیا ہے
نثر میں شاعری کی گئی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں
کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کا پیش لفظ شاید ہی کسی نعتیہ
کلام کو نصیب ہوا ہو۔ بہت ہی کم حضرات کو اس کا علم ہے
کہ جناب محمد ہدایت اللہ صاحب کے والدِ محترم اردو کے بہترین
شعرا میں سے تھے۔ اور نائب صدر جمہوریہ ہند کو خود اردو شاعری
سے کس قدر لگاؤ ہے۔ اس کا اندازہ یہ پیش لفظ پڑھ کر بخوبی
لگایا جا سکتا ہے۔

۱۶۰ صفحات کا یہ مجموعہ آفسیٹ پر اعلیٰ ترین کاغذ بہترین
کتابت اور دیدہ زیب گیٹ اپ کے ساتھ جلوہ میں لئے منظرِ شہود
پر جلوہ گر ہوا ہے۔ اور نعتیہ کلام سے عقیدت رکھنے والوں
کے لئے ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے کہ جس کا کوئی بدل
ہو نہیں سکتا۔ یہ خوشنما مجموعہ جس کے ناشر بیدل اکیڈمی بیدل
محل۔ بیکانیر (راجستھان) ہے دفتر شاعِ ہند سے ۲۵ روپیہ میں
دستیاب ہے۔

پریم چند

ہر دیال لیسٹکالیہ کی یہ پیشکش
نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے شائع کی ہے جو عظیم قلم کار
پریم چند کی ایک مختصر مگر معلوماتی سوانح ہے جو خود انہی کی
تحریروں اور خطوں کے اقتباسات پر انحصار کرتی ہے۔ اس
سوانح کو امرت رائے نے جو پریم چند کے بیٹے بھی ہیں اور
ملک کے مشہور مصنف بھی، بڑی صفائی مگر تاثراتی انداز
میں لکھا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس کا لفظ لفظ صحیح ہے اور یہ کہنے
میں کوئی ہچک نہیں کہ منشی پریم چند [illegible]
بڑی بڑی کتابیں شائع کی گئی تھیں، یہ کتاب ان سب پر
بھاری ہے۔ اس کتاب میں چند خاکے بھی دیئے گئے ہیں
جو [illegible] پریم چند کی کسی نہ کسی کہانی سے ہیں۔ یہ خاکے [illegible]

[illegible] جہاں
[illegible] رکھتا ہے
قیمت صرف [illegible] ضخامت ۴۰ صفحات۔ ناشر ۱-۵
گرین پارک نئی دہلی ۱۶ یا دفتر شاعِ ہند سے مل سکتی ہے

جے کانتن کی کہانیاں

ناشر نیشنل بک
ٹرسٹ انڈیا ۵-A گرین پارک، نئی دہلی ۱۶ ضخامت
۱۹۴ صفحات۔ لکھائی چھپائی کاغذ اچھی۔ ٹائٹل شاندار
روایات کے عین مطابق۔ قیمت گیارہ روپیہ پچاس پیسے۔
کہانیوں کا یہ مجموعہ مشہور و معروف تامل قلم کار شری جے کانتن
کی ان اہم کہانیوں کا انتخاب ہے جو انہوں نے ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۲ء
کے درمیان لکھی تھیں۔ ان کہانیوں میں آپ کی عجیب و غریب تخلیقی
صلاحیتوں کی مختلف جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہ کہانیاں جہاں جذباتی
ہیں، وہیں سماجی برائیوں کے خلاف مصنف کے غم و غصہ
کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ مایوسی بھی ان کہانیوں میں موجود ہے
لیکن ایک حد کے اندر۔

جے کانتن کی اعلیٰ ترین منتخبہ کہانیوں کا مجموعہ تامل
سے اردو میں ذکی انور نے ترجمہ کیا ہے۔ ذکی انور خود ایک
بہترین افسانہ نویس تھے۔ اس لئے انہوں نے ترجمہ میں
اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس کتاب کو زندہ جاوید
بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مرحوم ذکی انور کا یہ آخری
ادبی تحفہ ہے جو انہوں نے تامل سے اردو میں منتقل کیا ہے۔
کہانیوں کا یہ مجموعہ ماہنامہ شاعِ ہند نئی دہلی ۱۶ سے بھی
خریدا جا سکتا ہے۔

خود کلامی

جناب اظہر عنایتی ایڈوکیٹ رامپور
کے غزلیہ کلام کا مجموعہ ہے۔ حسن طباعت کی جملہ خصوصیات
کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ راقم الحروف نے پوری کوشش کی کہ اس
مجموعۂ کلام پر اپنی رائے کا اظہار کر سکے مگر جناب [illegible]
نے جناب اظہر عنایتی اور ان کی غزل گوئی پر جو [illegible] ہے اس کا

من کہ مکتوب الیہ

مکرمی محمد قاضی آبادی

۱۳ راپریل ۸۲ء   گڑسرن لالوبیب

کرم فرمائے بندہ جناب سرور صاحب تسلیم
ایک فقیر گوشہ نشین ہوں کسی کی بیجا مدحت یا قصیدہ خوانی
اِشعار نہیں مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ رسالہ ومجلہ شان
د پابندیٔ وقت کے ساتھ دستیاب ہوتا ہے دوسری
ت جو قابل تعریف ہے وہ آپ کی ذاتی ایمانداری ہے کہ
خطوط آپ کے خلاف لکھے جاتے ہیں انہیں بھی آپ دیانت
زی کے ساتھ شائع کر دیتے ہیں، علاوہ ازیں آپ نئے
نے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔

ماہ مارچ کا رسالہ ملا۔ اس میں من کہ مکتوب الیہ،
عنوان سے جو بحث چل پڑی ہے میں اس میں کوئی حصہ نہیں
چاہتا تھا، البتہ دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں (۱) صفحہ ۲۶ پر
زا غالب کا جو شعر تنافر کے متعلق تحریر فرمایا ہے وہ صحیح
ں ہے، غالب جیسا خوش گو اور خوش فکر شاعر "تم ہم سے
رگراں کیوں ہو" ہرگز نہیں لکھ سکتا۔ مصرع یوں ہے۔
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
غالب نامہ ... ۲
(۱) ... [illegible] ... ہونا چاہیے،
... [illegible] ... صاحب نے محبوب
... کے نام ... ہیں اس سلسلے میں واقفیت نہیں
تھی ... [illegible] ... نکال دیا جائے تو
ترجمہ

کیرانہ

۱۳ راپریل ۸۲ء

پیکرِ خلوص

سرورِ کرم

بندہ نواز

نذرانہ ہائے خلوص و نیاز، امید ہے کہ مزاج گرامی
بخیر ہوں گے۔ پرسوں شام کی ڈاک سے "صحیفۂ کرم"
شانِ ہند کا مارچ کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ یاد آوری اور
بندہ نوازی کا شکریہ!!

اس شمارہ میں کشمیو کے آل انڈیا مشاعرہ کی کریم
بھائی کی "روداد" بھی پڑھی اور اس میں آپ کا اداریہ
بھی خاص طور سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اداریہ میں
آپ نے جس جرأت و بیباکی سے "تبصرہ نگاری" کے سلسلہ
میں "موشگافیاں" فرمائیں اور جن جن نکات کی طرف
اشارہ کیا درحقیقت ایک پُرخلوص اور بے لوث صحافت
ادارت کی صحیح آئینہ داری ہے۔ اسی طرح آپ نے اپنے
تنقیدی صفحہ "بلبل چہ گفت ...." میں پٹنہ میں اردو بزم
سیمنار" کے عنوان کے تحت عظیم آباد ایکسپریس" کے ایڈیٹر
حضرت رضوان کے "فرمان" پر جس بیباکی سے تعریف فرمائی
ہے وہ بھی آپ ہی کا حق اور حصہ ہے آپ اس سلسلہ میں
بجا طور سے "داد و تحسین" کے مستحق ہیں جو نذر ہے۔ "اللہ
کرے جرأت و انداز بیاں اور زیادہ"

فقط
ممنونِ کرم
آزمنہ [illegible]

مکرمی، سلام مسنون

شانِ ہند بابت ماہ فروری ۱۹۸۱ء ملا۔ صد شکریہ!
آپ کا رسالہ یوں تو ہر زاویہ سے جاذبِ نظر ہوتا ہے مگر کچھ نمبر تو واقعی اپنی شانِ امتیازی کے سبب انتہائی دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہ بلبل پر گفت "گل چہ شنید و صبا چہ کرد" کے بموجب بانداز محرمانہ گزند "مشاعرہ" اور "من کہ مکتوب الیہ" چاروں کیجا ادبی حلقہ میں خاص طور پر اس لئے پڑھے جاتے ہیں کہ ان کا ایک ایک لفظ معلوماتی ہوتا ہے۔

فروری ۱۹۸۱ء کے پرچہ میں حضرت ثروت میرٹھی صاحب کے کچھ ارشادات نظر سے گزرے۔ جی چاہتا ہے کہ ان کے متعلق کچھ کیوں نہیں لکھوں۔

حضرت ثروت صاحب کا یہ فرمان کہ ردیف کا کوئی حرف وزن سے ساقط نہیں ہونا چاہئے، اپنی جگہ بالکل درست ہے، اگر کوئی شاعر ایسا کرتا ہے تو بے شک غلطی کرتا ہے لہٰذا گیا دی کو اس کا خیال رکھنا ہی چاہئے، فنِ شعر، ردیف کے کسی حرف کو گرانا ہرگز برداشت نہیں کرتا۔

۳۔ شاہد صاحب کی غزل کا یہ مطلع ؎

بستیاں چھوڑ کے جب شہر میں بس جاؤ گے
دیکھنا اک دن ہنسنے کو ترس جاؤ گے

اس شعر کے متعلق ثروت صاحب کا ارشاد ہے کہ "ہنسنے" کی ہ وزن سے ساقط ہونے سے غلطی ہے "میں سمجھتا ہوں کہ اس مقام پر ثروت صاحب سے سہو ہوا ہے، فعلاتن بعمل تسکین مفعولن ہو جاتا ہے اور اگر کوئی شاعر ایسا کرتا ہے تو از روئے عروض موزونیت میں کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہوتا۔

ملاحظہ ہو۔

بستیاچھو	ڑکے جب شہ	رمیں بس جا	ؤگے
فاعلاتن	فعلاتن	فعلاتن	فعلن

[illegible] فعلن

مصرع ثانی کے حشو اول میں "فعلاتن، مفعولن" ہو کر آیا ہے لہٰذا مصرع نا موزوں نہیں۔ حضرت ثروت صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ غور فرمائیں۔

۴۔ ؎ میں اس وقت کہوں گا تمہیں مہربان
جب تم دیہات کے شہر میں بس جاؤ گے

مصرع اولیٰ "تو" کا متقاضی ہے [illegible] سے لکھا بھی جا سکتا ہے۔ صدر و ابتدا میں فاعلاتن کی جگہ فعلاتن آسانی لایا جا سکتا ہے اور فعلاتن مسکن ہو کر مفعولن کرنا جائز ہے شاید اس سے شاہد صاحب نے اس جگہ "تو" کو رکھا ہو، اگر شاہد صاحب نے اس خیال کے پیش نظر ایسا کیا ہے تو یہ درست نہیں، مصرع اولیٰ بغیر "تو" نا موزوں ہی رہے گا

۴۔ کا دش صاحب کا یہ شعر ؎

وہ آرہے ہیں تو کچھ ایسا اہتمام کریں
کہ شمس و قمر کو چراغِ شام کریں

۵۔ بسمل صاحب کا یہ شعر ؎

فریب کاروں کی نگری سے دور کیسے رہوں
قصور واروں میں بے قصور کیسے رہوں

یہ مطلع بحر مجتث میں ہے "مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن فعلن" ثروت صاحب کا یہ کہنا کہ "میں" لکھنے سے رہ گیا درست نہیں نہ اس لئے بحر اخفش کا ذکر بھی بے محل ہے مصرع ثانی از روئے عروض بالکل صحیح ہے۔

ملاحظہ ہو۔

فریب کا	رکی نگری	م دو کیسے	میں رہو
مفاعلن	فعلاتن	مفاعلن	فعلن
قصور وا	روں میں بے	قصور کیسے	میں رہو
مفاعلن	مفعولن	مفاعلن	فعلن

فعلاتن کی جگہ دوسرے مصرع میں مفعولن لایا گیا جو قاعدہ [illegible]

[illegible] صفحہ ۱۵۱





ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر: سرور تونسوی

چندہ سالانہ ۱۸ روپیہ
فی پرچہ ۱/۵۰ روپیہ

جلد نمبر ۳۲ — مئی ۱۹۸۱ء — شمارہ نمبر ۵

ہندی کے مسلمان شعراء

۱۔ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد پر ایسی مفید کتاب آج تک اردو زبان میں شائع نہیں ہوئی ہے [illegible]

۲۔ اس کتاب کو پڑھنے سے اردو اور ہندی کے [illegible] دانشور جو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اردو اور ہندی کی بقا و حیات کے ضامن بنے بیٹھے ہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے جو کام سرکار [illegible] نہ ہو سکا اور جو کام اردو اور ہندی کے نام نہاد دانشوروں سے نہ ہو سکا وہ ایک فرد واحد نے اپنی لگن کے باعث پورا کر دیا۔

۳۔ اس کتاب نے ہندی کے مسلمان شعرا کا سر اونچا کر دیا ہے اور وہ ثبوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی زبان کی نشو و نما اور ترقی میں جو کردار مسلمانوں نے ادا کیا ہے اسے ہندی زبان فراموش نہیں کر سکتی۔ اور ہندی مسلمان اس [illegible] میں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے کوسوں آگے دکھائی دیتے ہیں۔

۴۔ اس کتاب کو پڑھنے والا ہر ہندی والا [illegible] کرے گا [illegible] مصنف [illegible] ہندی ادب کو ایسی بیش بہا تصنیف سے مالا مال کر دیا۔

۵۔ ترقی اردو بیورو، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی، انجمن ترقی اردو ہند [illegible] کے ذمہ دار [illegible] محسوس کریں [illegible] ہندی کے مسلمان شعرا ایسی بیش بہا اور ہندوستانی تہذیب [illegible] کا آئینہ دار تصنیف کو شائع کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

۶۔ آپ چاہتے [illegible] کی صداقت کی جانچ کرنے کے لئے یہ کتاب پڑھیے [illegible] اس تحریر کا حرف حرف [illegible] فراہم کرنے [illegible] ہزار ہا کتابوں کا مطالعہ [illegible] یہ نادر کتاب ہندی کے مسلمان شعرا شائع ہو کر [illegible] فہرست میں [illegible] قیمت [illegible] روپیہ

مزید معلومات کیلئے: دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲۵ سے رجوع کیجئے۔

جانشینی

یہ سلسلہ اعتبار الملک حضرت ... شاہجہانپوری کا شاعری کا تقریباً نصف صدی تک جاری رہ کر ۱۹۵۱ء میں ان کے انتقال پر ختم ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت داغ و امیر کے بیشتر تلامذہ بقیدِ حیات تھے۔ ان دونوں باکمال استاذوں کے بلند پایہ شاگرد یکے بعد دیگرے ان کے جانشین قرار دیے جاتے رہے اور حضرت دل شاہجہانپوری بھی اپنے استاد جناب امیر مینائی کے جانشین تسلیم کیے گئے۔

حضرت دل کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ان میں سے اکثر نے مشقِ سخن سے اردو شاعری میں بلند مرتبہ حاصل کیا اور ان کے متعدد مجموعے شائع ہوئے اور ادبی حلقوں میں مقبول ہوئے۔ حضرت عابد شاہجہانپوری۔ نقش جالندھری۔ رتن پنڈوری۔ مشیر جھنجھانوی۔ شبنم رومانی۔ ساقی جاوید اور نسیم شاہجہانپوری۔ اپنے استاد حضرت دل کے تلامذہ میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا ادبی مقام ہے۔

حضرت دل نے اپنی زندگی ہی میں حضرت عابد شاہجہانپوری کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ لیکن اپنے استاد کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد وہ ہمارے درمیان سے اٹھ گئے۔

جناب رتن پنڈوری ایک کہنہ مشق شاعر ہیں ان کے متعدد شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ جو ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ پنجاب میں خاص طور پر ان کو ایک نہایت معتبر شاعر تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی بنا پر وقتاً فوقتاً وہاں ان کو مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔ اور حال ہی میں ابوالبلاغت کے خطاب سے بھی ان کی عزت افزائی کی گئی۔ پنجاب میں اردو زبان کی مقبولیت کی یہ واضح دلیل ہے۔ شاعری میں جناب رتن ہر صنف میں استاذانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ غزل، نظم، رباعیات اور فنِ تاریخ غرض کہ ہر صنفِ سخن کے قادرالکلام شاعر ہیں۔ لیکن ان ساری اہلیت اور فنی بلندیوں کے باوجود جناب رتن نے اپنے استادِ بزرگ کی حیات میں کبھی اپنے کو مشورۂ سخن سے بے نیاز نہیں سمجھا اور ان کی وابستگی اپنے استاد سے بدستور برقرار رہی اور آج بھی اپنے استاد سے ان کا روحانی تعلق برقرار ہے اور ان کی عقیدت اور شیفتگی میں کسی طور پر کمی نہیں۔

جناب رتن تلامذۂ حضرتِ دل میں اس وقت سب سے زیادہ کہنہ مشق شاعر ہیں اور ہر اعتبار سے اس اعزاز کے مستحق ہیں کہ ان کو جانشینِ حضرتِ دل قرار دیا جائے۔ چنانچہ میں دیگر عقیدت مندانِ حضرتِ دل کی متفقہ رائے سے جناب رتن کو جانشینِ حضرتِ دل مرحوم تسلیم کرتا ہوں۔

خدا حضرتِ رتن کو عمر دراز عطا کرے اور ان کی صحت برقرار رکھے کہ وہ تا دیر اردو ادب و شاعری کی خدمت انجام دیتے رہیں اور تشنگانِ ادب ان سے سیراب ہوتے رہیں۔

شبیر حسن خان
بی اے۔ ایل ایل بی وکیل
(شاہجہانپور)
۱۹ مئی [illegible]

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

کل ہند غیر مسلم اردو کانفرنس

۲۰ اپریل ۱۹۸۳ء کی صبح کو ۹ بجے مسلم مسافر خانہ کے ہال میں کچھ کتابوں کو ریلیز کیا گیا۔ تقریب کی صدارت جناب سید اطہر حسین صاحب نے فرمائی اور انھوں نے اپنا تازہ ترین مجموعۂ کلام "کلام اطہر" کی ایک ایک جلد اکثر و بیشتر مندوبین کانفرنس کو تحفۃً پیش کی۔ تمام مندوبین نے اپنا اپنا تعارف بھی کرایا۔ یہ مختصر تقریب کئی پہلوؤں سے کافی جاندار تھی۔ مجلس علم و ادب کی طرف سے اس تقریب میں کانفرنس کے مندوبین کو استقبالیہ دیا گیا۔ آج دوپہر کا کھانا کچھ مندوبین نے اپنے طور پر اپنے پسندیدہ ہوٹلوں میں کھایا اور باقی حضرات کو رام لال صاحب نے ایک اچھے ہوٹل پر کھانا کھلایا جس کا بل تقریباً ایک ہزار روپیہ تھا۔

ساڑھے تین بجے ایڈیٹر شان ہند اور اچاریہ دھرمیندر ناتھ کارلٹن ہوٹل سے رویندرالیہ میں پہنچے تو کئی اجلاس کے مندوبین تشریف لا رہے تھے۔ آج کا موضوع تھا "ہم اردو کے طرفدار کیوں ہیں"۔ اس اجلاس کا افتتاح حضرت فراق گورکھپوری نے فرمایا۔ جناب اندر کمار گجرال مہمان خصوصی ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی صدارت ہے۔ ویلکم ایڈریس جناب مقبول احمد لاری نے پڑھا۔ جناب رام لال کنوینر تھے۔

ڈاکٹر عنوان چشتی نے مائک پر کلمہ طیبہ کا ترجمہ غلط کیا تو جناب مالک رام [illegible] اور اچاریہ دھرمیندر ناتھ نے بہ یک زبان ٹوکا۔ تھوڑی دیر بعد عنوان صاحب نے ڈاکٹر عابد رضا کو حکومت ہند کا وزیر کہا تو اس پر بھی قہقہہ لگا۔ محترمہ یاد دلانے لگیں کہ عنوان صاحب جب سے سٹھیا [illegible] گئے ہیں ان کی یادداشت کم ہوتی جا رہی ہے۔

جناب فراق گورکھپوری کارلٹن ہوٹل میں مقیم ہیں اور پرنس انجم قدر صاحب کے مہمان ہیں۔ انھیں کرسی پر بٹھا کر لایا گیا ہے۔ فراق صاحب نے اپنی تقریر دل پذیر سے وہ سماں باندھا کہ مدتوں یاد رہے گا۔ فراق صاحب دماغی طور پر بالکل ٹھیک ہیں۔ آواز میں وہی کڑک ہے۔ تقریر لکھی ہوئی نہیں تھی بلکہ اپنی روایت کے مطابق فی البدیہہ تھی اور خوب تھی۔ جناب اندر کمار گجرال کی تقریر مناسب تھی مگر کہیں کہیں ان کا خالص پنجابی تلفظ اکھرتا تھا مثلاً "تعلق" کو بار بار "تلق" کہنا تو ذوق سلیم پر سراسر ظلم تھا۔ ڈاکٹر عابد رضوی کی تقریر مختصر مگر بامعنی تھی۔ ڈاکٹر [illegible] نے جملہ قراردادیں پڑھ کر سنائیں اور ہر قرارداد پہ یہ فرماتے تھے کہ جن حضرات کو اس قرارداد سے اتفاق ہے وہ ہاتھ کھڑا کر دیں۔ قراردادیں کوئی نئی نہ تھیں بلکہ وہی تھیں جو ہر اردو کانفرنس میں پاس کی جاتی ہیں۔ ہاں ایک قرارداد ضرور ایسی تھی کہ اردو اکاڈمیاں اور دوسرے اردو کتابوں وغیرہ پر انعام دینے والے ادارے انصاف سے کام لیا کریں اور غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں سے ناانصافی نہ کریں گو قرارداد کے الفاظ یہ نہیں تھے۔ مگر یہ مطلب ضرور تھا۔ کاش کہ اتر پردیش اردو اکاڈمی کے ناظم اس قرارداد پر کان دھریں اور ہندوستان کی دوسری اردو اکاڈمیوں کے ناظمین تک بھی قرارداد پہنچ سکے۔

اس اجلاس کی قابل قدر [illegible] صاحب صدر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خطبۂ صدارت۔ جو مطبوعہ بھی تھا اور تمام حاضرین اجلاس کو تقسیم بھی کیا گیا۔ گو ڈاکٹر صاحب نارنگ نے خطبہ کو کہیں کہیں سے پڑھا مگر پھر بھی انھوں نے اردو کی تاریخ اور ان وجوہات کو اس خوشگوار انداز سے پیش کیا تھا کہ یہ خطبہ سننے اور پڑھنے والا بے ساختہ کہہ اٹھے کہ ہم اردو کے طرفدار اس لئے ہیں۔ یہ کھلا اجلاس اپنی نوعیت کا ایک یادگار اجلاس تھا۔ [illegible] اس کانفرنس کا آخری [illegible] کشش [illegible] ڈاکٹر حکم چند نیر کے

دوسٹ آف [illegible] کے عہدے پر فائز ہیں یا رہ چکے ہیں والا اجلاس شام کے سات بجے ختم ہوا۔ رعیہ یا لیگ لالی [illegible] مشنی لال کشور کی یادگار جناب تیج کمار جو مالک تیج کمار [illegible] والے ہیں، پبلیشنگ کی طرف سے چائے کا انتظام [illegible] کانفرنس میں جس قدر مندوبین کے اعزاز میں [illegible] جانے کے بعد مندوبین کو [illegible] ہے۔ رات کا ڈنر جناب عمار رضوی صاحب کے ہاں ہے مگر مندوبین کی اکثریت واپس جا رہی ہے۔ اور ایڈیٹر شمع دہلی بھی رات کو ساڑھے نو بجے والی ٹرین سے دہلی کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔

جناب آچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب نے لکھنؤ سے واپسی پہ دوسرے دن بتایا کہ رات کے نو بجے آل انڈیا مشاعرہ [illegible] ہوٹل میں جناب [illegible] صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا [illegible] کامیاب ہوا۔ جناب پرنس انجم قدر صاحب کی تقریر بہت پسند کی گئی۔ جناب ڈاکٹر عمار رضوی کے ہاں یقیناً ڈنر میں میدان حشر والا معاملہ نہیں ہوا ہوگا۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ کانفرنس امید سے کہیں زیادہ کامیاب رہی۔ جناب رام لال سرخرو ہوئے جس پر انہیں ہر اردو داں کی طرف سے دلی مبارک باد دی جانی چاہیے۔

راجستھان اردو اکاڈمی

راجستھان اردو اکاڈمی جنتا حکومت کے دور میں قائم کی گئی تھی اور اس کا وجود محض کاغذی حد تک ہی رکھا گیا تھا۔ جنتا حکومت نے اپنے آخری دور میں راجستھان اردو اکاڈمی کے سکریٹری اور دوسرے ممبران وغیرہ کا اعلان کیا تھا مگر عملی کارروائی صرف یہ ہو سکی کہ [illegible] کا انتظام ہو کچھ روپیہ اس اکاڈمی کو دے دیا گیا تاکہ راجستھان کے مسلمان شعراء اور ادیبوں کو لقمۂ تر پہنچایا جا سکے۔

اندرا کانگریس کی حکومت آنے پر بھی یہ اکاڈمی کسمپرسی کی حالت میں رہی کیونکہ اس کے صدر مولوی قمر صاحب جوڑ توڑ کے قابل ہی نہ تھے کہ وہ حکومت کو مجبور کر سکیں کہ اردو اکاڈمی کو ایک فعال ادارہ بنایا جا سکے۔ اور سکریٹری ایک سرکاری ملازم تھے جنہیں اس بکھیڑے میں پڑنے کی فرصت [illegible] نہ تھی۔ جنتا پارٹی میں یہ سکریٹری صاحب حبیب علی ایسے شخص سے [illegible] تعلق تھے احساس جس سے محبوب علی صاحب نے انہیں اردو اکاڈمی کا سکریٹری مقرر کر دیا۔ حال ہی میں اردو اکاڈمی راجستھان کے صدر ڈاکٹر [illegible] مقرر کئے گئے اور ممبران بھی بدل دیئے گئے ہیں مگر اکاڈمی کا سکریٹری حسب سابق مونس صاحب کو ہی رکھا گیا ہے۔ اور یہی راجستھان اکاڈمی کی بدقسمتی ہے کیونکہ مونس صاحب [illegible] محروم ہیں جو ایسے اداروں کو مقبولیت خاص [illegible] کام آتی ہے۔ راجستھان اردو اکاڈمی کا سکریٹری [illegible] مخلص اور رہنما قسم کا تجربہ کار ہونا چاہیے۔ جو اس [illegible] کو واقعی دل و جان سے ایک فعال ادارہ بنانے کی تڑپ رکھتا ہو۔ مونس صاحب کی شرافت اور خاموش طبع اس قسم کے اداروں کو راس نہیں آ سکتی۔

ایک جائزہ

قرآن مجید میں کل حروف: ۳۲۳۶۷۸،

الفاظ: ۳۲۱۲۶۷۰، کلمے: ۷۰۰۰۔ آیات: ۶۶۶۶

رکوع: ۵۴۰، سورتیں: ۱۱۴، نقطے: ۱۰۵۶۸۴

زیر: ۳۹۵۸۲ اور زبر: ۵۳۲۴۳ ہیں۔

گورو گرنتھ صاحب میں جس قدر بانیان پد، شبد، شلوک، چھند اور پوڑی وغیرہ گورو صاحبان کے فرمودات ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ گورو نانک ۹۴۷، گورو انگد دیو ۶۳۔ گورو امر داس ۸۶۹۔ گورو رام داس ۶۳۸۔ گورو ارجن دیو ۲۲۱۲۔ گورو تیغ بہادر ۱۱۵۔ اور گورو گوبند سنگھ جی کا صرف ایک شبد۔ اس کے علاوہ دوسرے بزرگوں، سنتوں اور بھگتوں کے فرمودات کی تفصیل یوں ہے۔ سندر بھگت ۱۔ ستہ رام کلی ۶۔ بھگت سور داس ۲۔ بھگت سین ۱۔ بھگت کبیر ۵۴۳۔ بھگت جے دیو ۲۔ بھگت ترلوچن ۵۔ بھگت دھنا ۵۔ بھگت نام دیو ۶۳۔ بھگت پرمانند ۱۔ بھگت پیپا ۱۔ بھگت بینی ۳۔ شیخ فرید ۱۲۳۔ بھگت بھیکن ۲۔ بھٹوں کے سویئے ۱۲۳۔ بھائی مردانہ ۲۔ بھگت روی داس ۴۰۔ بھگت رامانند ۳۔

گورو گرنتھ صاحب کا حسب ذیل میں [illegible] ہیں۔ (۱) بھائی گورداس جی [illegible] بھائی نند لال [illegible] بھائی

[illegible] رواں والا ہیرو [illegible]
ہوتا ہے۔

بیتاب: پاکستان کے مشہور ہفت روزہ "چٹان" میں ہندوستان میں مقیم [illegible] ہفت روزہ سرگرمیوں کا ایک مکتوب امرتسر کے عنوان سے جناب ادم پرکاش سونی ترتیب دیتے ہیں۔ کوئی بھی رپورٹ جب تک لکھنے والے کے ذاتی مفاد یا اس کی عناد اور سیاسی پروپیگنڈہ سے پاک نہیں ہوگی وہ بے معنی ہو جاتی ہے بلکہ ایسے لکھنے والا نہ صرف صحافتی بددیانتی کا ارتکاب کرتا ہے بلکہ پڑھنے والوں کا وقت بھی ضائع کرتا ہے۔

چٹان ۲۷ اپریل [illegible] میں شائع شدہ "مکتوب امرتسر" میں سونی صاحب لکھتے ہیں۔

"جناب جگر جالندھری کے مجموعہ کلام لختِ جگر کی اشاعت کے بعد کئی تنازعات نے جنم لیا اور سر اٹھانا شروع کر دیا ہے اور جگر جالندھری صاحب اپنے لختِ جگر بہ معنی نورِ نظر کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔"

حالانکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ محکمہ السنہ پنجاب نے لختِ جگر کی اشاعت کے لئے جزوی امداد دی۔ لختِ جگر ایسا اچھا مجموعہ کلام ہے کہ اسے اتر پردیش اردو اکاڈمی نے انعام دیا۔ مجموعہ اس قدر جاذبِ نظر ہے کہ حکومت پنجاب نے اسے سالِ گزشتہ میں پنجاب میں شائع ہونے والی سب سے زیادہ خوبصورت کتاب قرار دیا اور انعام سے نوازا۔ جگر صاحب ذاتی طور پر شرافت اور انسانیت کا ایسا نمونہ ہیں کہ جناب سونی صاحب اگر ان کی اس طرز میں تقلید فرماتے تو یقیناً وہ جگر صاحب اور ان کے مجموعہ کلام لختِ جگر کے بارے میں ایسی تحریر سے گریز کرتے جس سے کہ سونی صاحب ذاتی عناد اور حسد کی بو ہی نہیں بلکہ سڑاند آتی ہے۔

ایڈیٹر شانِ ہند نے جناب جگر سے کہا ہے کہ وہ اپنا مجموعہ کلام مدیر محترم چٹان لاہور کی خدمت میں بھجوائیں تاکہ انہیں بھی اندازہ ہو سکے کہ ان کے اخبار میں سرحد پار کا جو مکتوب شائع ہوتا ہے وہ کس قدر صحیح ہوتا ہے؟

جانشین دلؔ شاہجہانپوری

حضرت دلؔ شاہجہانپوری (مرحوم) کے جانشین حضرت عابد شاہجہانپوری تھے۔ عابد صاحب کے انتقال کے بعد حضرت دلؔ مرحوم کے صاحبزادے جناب شہر مسیح خاں وکیل شاہجہانپور نے بہ اتفاق حضرت رتن پنڈوری کو مرحوم دلؔ صاحب کا جانشین تسلیم کرتے ہوئے تحریری بیان دیا ہے جو شانِ ہند کی اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔

حضرت رتن پنڈوری کو ابھی پچھلے دنوں ہی [illegible] کا اعزاز دیا گیا ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا اعتراف دشمنوں کو بھی ہے کہ اس وقت پنجاب میں قبلہ رتن سے اچھا سے بہتر کوئی ایسا شاعر نہیں ہے جو فنِ شعر سے اس طرح واقف ہو اور ہندوستان میں بھی شاید ہی ایسے حضرات ہوں گے جو رتن صاحب کے ہم پلہ ہوں۔ مدیر شانِ ہند کو دلی خوشی ہے کہ قبلہ رتن صاحب کو حضرت دلؔ مرحوم کا جانشین مقرر کیا گیا ہے۔ قبلہ رتن صاحب بھی حضرت دلؔ مرحوم کے تلامذہ کی صفِ اول میں شمار کئے جاتے ہیں۔

رام لال صاحب کا نیا پتہ:

مشہور افسانہ نگار رام لال صاحب ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے ذاتی مکان میں رہائش پذیر ہو چکے ہیں۔ جناب رام لال کا مستقل پتہ حسبِ ذیل ہے۔

"شانتی نکیتن" ڈی-۲۲۹۰، رام نگر کالونی، [illegible] روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۰

حضرت آرزو سہارنپوری

برصغیر ہند و پاک کے مشہور نعت و منقبت کہنے والے حضرت علامہ آرزو سہارنپوری کراچی [illegible] صاحبِ فراش ہیں۔ ان کے پاؤں کی ہڈی میں [illegible] آ جانے کے باعث کئی ماہ سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ [illegible] نے ان کا [illegible] کیا ہے۔ چونکہ مدیر شانِ ہند کو خود علم نہیں تھا کہ قبلہ آرزو صاحب کہاں ہیں اس لئے گزشتہ [illegible] ماہ سے [illegible] تلاش کی جا رہی تھی ان کے بارے میں [illegible] کوئی [illegible]

نہ مل سکی تھی۔ کچھ عرصہ قبل آرزو صاحب کا کلام ہی تاحال
کلکتہ سے ملا تھا۔ سب حالات معلوم ہوئے۔ اب بھی انہوں نے
تحریر فرمایا ہے کہ صحبت کا وقت گناہی میں ہی گزر رہا ہے۔
چالیس ان کے مشکور ہیں کہ مطابق ان کا موجودہ پتہ۔ شائع کر رہے
مشکور ہے۔ جو حضرات انہیں خط لکھنا چاہیں دفتر شاہکار
کی معرفت کر سکتے ہیں۔ ایسے خطوط جناب آرزو سہارنپوری
تک پہنچا دیئے جائیں گے۔

بقیہ:- سدھی

"شام کو دکان کی بکری بوری میں بھر کر آتی ہے اور بہو بچوں
کے سامنے لاکر لوٹ دی جاتی ہے۔ وہ سب مل کر نوٹوں کو الگ
الگ کر کے ربڑ کے چھلوں میں باندھ دیتے ہیں۔ نوٹوں کی گنتی
تک نہیں کی جاتی کہ کون وقت برباد کرے۔

ذرا دیکھو بھگوان کا انصاف کہ ایک کے پاس خرچ کرنے کو
پیسے نہیں اور دوسرے کے پاس نوٹ گننے کے وقت نہیں۔ بھگوان کی یہ
بے انصافی مجھے ہر وقت اکھرتی رہتی ہے۔ میرے جسم پر چیونٹیوں
کی طرح کاٹتی رہتی ہے۔

ایک دن کی بات ہے کہ زور کی بارش ہوئی اور اولے
بھی پڑنے۔ سیٹھ صاحب کے بچے خوشی میں اچھلنے کودنے لگے۔ اور
اولے اٹھا اٹھا کر چبانے لگے۔ اور بڑے بڑے اولے پڑنے کی
دعا مانگ رہے تھے۔ سیٹھ صاحب ان بچوں کو دیکھ کر خوش
ہو رہے تھے۔ اور میں ایک طرف حیران کھڑا تھا۔ اگر میں تمہارے
سامنے ایسے کرتا تو تم میری کھوپڑی ادھیڑ دیتے۔ کسان اولے
پڑنے پر دکھی ہوتا ہے۔ اور بھگوان کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہے۔
کہ اولے بند ہو جائیں مگر سیٹھ کے ہاں الٹا ہی دیکھا۔ مجھے
حیران دیکھ کر سیٹھ صاحب بولے، ارے تو بھی اچھل کود اولے
کھا اور بچوں کے ساتھ مستی لے"

"میں تو روٹی کھا کر جیتا ہوں اولے کھا کر نہیں۔" میں
نے سیٹھ صاحب سے کہا وہ ایک دم چپ ہو گئے۔ میں کچھ اور بھی
کہتا مگر ان کے گمبھیر چہرے کو دیکھ کر چپ ہو گیا۔

"بیٹے اولے پڑنے میں کسانوں کا نقصان ہوتا ہے۔ وہ دکھی
ہی ہوتا ہے۔ بکری کا نقصان ہوتا ہے۔ جو وہ
دکھی ہوتا ہے۔"

"مگر کسانوں کو تو بعد میں بھی بہت فائدہ ہوتا ہے اور
اناج کئی گنا ہو جاتا ہے۔"

"دیکھنے کی کیا ضرورت باتوں کو سوچے اس کو قدرت اپنی
سمجھ کا سمجھدار رہتا ہے۔ کہ وہ خالی ہے یا بھرا ہے۔ مسکرا کر بولا
"اب ہم سمجھ گئے بیٹا کہ تولتے پہلے گھڑے سکے بھی عرش کیا
نہیں ہے۔ ارے بیٹا اب ہم پہلے کی طرح لگتی نہیں ہیں۔"

"کیسے؟"

"تم نے اب دنیا کا سبق سیکھ لیا ہے۔ مجھ کو فرصت ہوتی
ہے اس سے منگا لیتا ہوں۔ اب تو تمہاری مصیبتوں، پریشانیوں
اور دقتوں کو سوچ سوچ کر کڑھنا چھوڑ دے۔"

"سدھی کا چمتکار مجھے بھی دکھاؤ تو میں بھی جانوں"

"اچھا ایسے دیکھو دوبارہ لڈو لایا ہے میں ان کو چوبیس
یعنی دو گنے کرتا ہوں۔" یوں کہہ کے وہ اس کے چہرے کو اندر لے
گیا۔ اور پہلے والے لڈو اس میں ملا کر لے آیا۔ "لے گن لے چوبیس
ہیں یا نہیں۔"

"ہاں ڈیڈی یہ تو سچ مچ دو گنے ہو گئے۔"

"بس تو بیٹا اب تمہارے چنتا چھوڑ کر شانت رہا کر
اب ہم کو کوئی تکلیف نہیں ہے۔" یہ سنتے ہی نوٹوں سے بھری
کھیتی پر بارش کے بعد آئی چمک کی طرح ریوت کا چہرہ
کھل اٹھا۔

بقیہ:- خواب یا حقیقت

دو دل کے ہو جائیں مگر اس کے رعب سے قریب جانے کی ہمت
نہ ہوتی تھی۔ اب وہ کالج میں گیا اور ایک نوعمر پروفیسر کی طرف
دیکھا کیا پروفیسر بھی سب کچھ بھلا کر اس کے ساتھ ہو گیا
اسکی بیوہ ماں اور چار دن کی بیاہی دلہن زار زار روتی رہ گئی
مگر اسے کبھی بھی رحم نہ آیا۔ اسکے بعد وہ اسی کارخانے میں داخل
ہوا کارخانہ دار کا لڑکا دو روز پہلے لندن سے انجینئرنگ پاس
کر کے آیا تھا۔ تمام کارخانے میں اسکی آمد پر خوشیاں منائی جا
رہی تھیں۔ کہ اس دیو نے اس لڑکے کو وہ ہی جیز دکھائی لڑکا فوراً

خواب یا حقیقت

حسین قربان سہارنپوری

میں بستر پر نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھا کہ شمشاد نے آواز دی بھئی آج ادھر کیا بیٹھے بیٹھے بولا کچھ سنا تم نے حکیم صاحب انتقال فرما گئے۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا حکیم صاحب کیا کہہ رہے ہو؟ ہاں ہاں سچ کہہ رہا ہوں میں ابھی رشید بھائی کے مکان سے چلا آ رہا ہوں انکو بذریعہ تار اطلاع ملی ہے۔

ارے بھئی ابھی پرسوں ہی تو یہاں سے بھلے چنگے دہلی گئے ہیں ہاں مکان پر پہنچے۔ بیٹھے بات چیت کر رہے تھے کہ ہارٹ فیل ہو گیا۔ اُف غضب ہو گیا کرتا ملک الموت تقاضہ کوئی دن اور پینتیس چالیس سال کوئی مرنے کی عمر ہوتی ہے۔ کیا خوش مزاج دریا دل اور بے غرض انسان تھے۔ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے۔

شمشاد کچھ دیر بعد اٹھ کر چلا گیا ادھر حکیم صاحب کی صورت میری نظروں کے سامنے آگئی وہی۔ وہی تبسم قہقہے لطیفے ہنسی مذاق انکی ایک ایک بات نظروں میں پھرنے لگی۔ واقعی زندگی کا کیا اعتبار۔ اس کمبخت ہارٹ فیل نے تو تمام ڈاکٹروں کا ناطقہ ہی بند کر دیا ہے بہ قول فرحت بیگ زندگی بجلی کا قمقمہ ہو کر رہ گئی کہ جھک سے گل۔ اگلے دنوں میں آدمی بیمار ہوتا تھا اسکی دوا دارو ہوتی تھی مرتے مرتے بھی پچاس ساٹھ تو پکڑ ہی لیا تھا مگر اب تو بیٹھے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں چلتے پھرتے ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون قصہ ختم۔ زمانا بھی بے مروت ہے عش رہا تھا میں سو گئے داستاں کہتے کہتے

معلوم ہوتا ہے کہ نئی نئی تعداد کی ایجاد دیکھ کر ملک الموت کے یہاں بھی کسی سائنسداں نے کوئی شے ایجاد کر دی ہے کہ بیٹھے بیٹھے ہی جیسے چلے کھینچ لیا جاتا ہے بندہ کی قسمت منزالہ خدا معلوم انہیں خیالات میں غرق تھا کب میری آنکھ لگ گئی۔ دیکھتا ہوں کہ ایک کشادہ سی سڑک ہے دونوں جانب فٹ پاتھ ہیں سامنے ایک کارخانہ ہے جس میں ہزاروں آدمی کام کر رہے ہیں اس کے انواع و اقسام کی دکانیں بھی ہیں تجار تجارت میں مصروف ہیں۔ ایک سمت اسکول اور کالج موجود ہیں درس و تدریس کا کام جاری ہے۔ جا بجا مختلف قسم کی عبادت گاہیں ہیں۔ جن میں لوگ مصروف عبادت ہیں۔

میں سیر میں منہمک ان نظاروں سے لطف اندوز ہوتا چلا جا رہا تھا یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ پیچھے سے ایک دیو سیاہ جسم بڑے بڑے دانت نکالے دیو سیاہ منہ کھولے چلا آ رہا ہے میں خوف سے سہم کر ایک طرف چھپ گیا۔ حیران تھا کہ اس خوبصورت بستی میں جہاں ہر شخص مصروف کام ہے ہر طرف ہنسی خوشی ہے ایسی خوفناک مخلوق کہاں سے وارد ہو گئی جب وہ آگے نکل گیا تو اس کی اصلیت معلوم کرنے کے خیال سے چپکے چپکے اس کے پیچھے چلا۔

وہ کارخانے میں داخل ہوا اسے دیکھتے ہی سب کے چہرے خوف سے زرد ہو گئے اور سب ادھر ادھر چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس نے لپک کر مالک کارخانہ کا ہاتھ پکڑ لیا جو بڑی شان و شوکت کے ساتھ ایک آراستہ کمرے میں گدے دار صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس سے کہا آپ کو میرے آقا نے بلایا ہے۔

سنتے ہی وہ تھر تھر کانپنے لگا آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں بولا مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں مگر مجھے کچھ برس کی مہلت دے دیجئے میرا لڑکا انگلینڈ گیا ہوا ہے وہاں سے انجینئرنگ پاس کر کے آجائیگا تو میں یہ کارخانہ اس کے سپرد کر دونگا۔ اپنی جائیداد وغیرہ کا بھی بندوبست کر لونگا۔ یہ سُن کر اس دیو ہیکل نے اسے چھوڑ دیا اور کارخانے کے ایک عمر رسیدہ بوسیدہ حال منشی کو پکڑ لیا جو منت سماجت کرنے لگا میرے مالک میرے بچے ابھی چھوٹے ہیں جو میرے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں [illegible] سب بکھر جائیں گے پھر میں خوشی خوشی آپ کے ساتھ چلونگا [illegible] نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا [illegible] کا [illegible] کر [illegible]

[illegible]
[illegible] پہلے اس کو [illegible]
کہاں سے یہاں [illegible] تیار ہوں [illegible] میں کسی کو اپنے ہمراہ لے جانا
چاہتا [illegible] وہ باہر آیا [illegible] ایک پری بن نہ منہ میں
[illegible] آرہی تھی وہ لپک کر اسکے
پاس پہنچا اور کہا منیفہ مجھے یہاں سخت تکلیف معلوم ہوتی ہے۔ تو
میرے ساتھ چل۔ میرے ساتھ تجھے کسی قسم کی محنت و مشقت
کرنا نہیں ہوگی۔ [illegible] کر بولی لے چل دور ہو مجھے یہاں کیا
تکلیف ہے؟

ابھی تو میری سترہ برس کی عمر ہے۔ جب اپنے نانی پوتوں کا
سہرا دیکھ لونگی تب جانے کی تیاری کرونگی۔ اسکی بات سن کر وہ
بھی مسکرا دیا اور آگے چلا یہاں کچھ چھوٹے چھوٹے بچے کھیل
رہے تھے وہ انکی طرف چلا سب کے سب ماں ماں کرتے ہوئے
بھاگے پھر بھی اس نے ایک کا ہاتھ پکڑ ہی لیا۔ بچے نے بڑی
معصومیت سے کہا مجھ سے پہلے تم اپنی ممی سے دریافت کر آؤ
وہ مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔ کہیں نہیں جانے دیتیں اور میرے
پاپا بھی دفتر سے آتے ہی مجھے گود میں اٹھا لیتے ہیں اگر انکو
چھوڑ کر تمھارے ساتھ چلا جاؤنگا تو پھر وہ دونوں کس کو پیار کرینگے
اسکے بعد وہ کالج میں داخل ہو گیا اور ایک نوجوان طالب علم کے
پاس پہنچا اسکا مطالبہ سن کر طالب علم کے پروفیسر نے آگے بڑھ
کر کہا یہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے اور ہمارے کالج کا سب
سے ہوشیار طالب علم ہے۔ اس سے ہمارے کالج کا نام روشن
ہوگا۔ امتحان کے چند ماہ باقی ہیں امتحان تک کے لیے اسے چھوڑ
دو۔ وہ آگے چل دیا میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر یہ ان تمام
لوگوں کو کہاں لے جانا چاہتا ہے اس کی نظروں میں چھوٹے بڑے امیر
غریب کسی کے لیے کوئی امتیاز نہیں سب سے ایک ہی مطالبہ
اور یکساں سلوک کرتا ہے اب وہ ایک مکان میں داخل ہوا
اسے ایک حسینہ دوشیزہ ملی اس نے دوشیزہ کا ہاتھ پکڑ لیا فوراً
دوشیزہ کی ماں آگئی اور بولی اس لڑکی کی چار روز پہلے منگنی
ہوئی ہے اور ایک ماہ کے بعد شادی ہوگی اگر تم اسکو لے
جاؤ گے تو دو خاندان برباد ہو جائینگے اس پر رحم کرو۔

[illegible] نہایت [illegible] سے
[illegible] یہاں ایک عجیب
بات نظر آئی۔ وہ جب اس [illegible] مسکراکر
پیشانی کے ساتھ لگا کے استقبال کو [illegible] لبیک کہہ
اسکو اپنی طرف بلانے لگے [illegible] کو نہ تو اس کی ہیبت
سے خوف معلوم ہوتا تھا اور نہ اس کے بلاوے پر کوئی گھبراہٹ
و پریشانی بلکہ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسکی آمد کے منتظر
اور اس کے ہمراہ جانے کو [illegible] جس کی طرف بھی آنکھ
اٹھاتا وہی ہنستا ہوا اس سے بغلگیر ہونے کو آگے بڑھ آتا مگر
کہ وہ گروہ [illegible] سے گھبرا گیا۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر وہ جس طرف سے آیا
اسی جانب واپس چلا گیا۔

میں اب تک اس کا تعاقب کر رہا تھا وہ ایک سنسان ویرانے
میں پہنچا جہاں ہر سو سناٹا تھا کچھ دور جانے کے بعد وہ ایک بستی
سامنے پہنچا یہاں اس سے بھی زیادہ کریہہ المنظر سیاہ فام
شخص بیٹھا ہوا تھا جس کے ارد گرد سیاہ چغے پہنے بہت
کالے بھیانک قسم کے لوگ لمبے لمبے دانت نکالے کھڑے
ہوئے تھے اس [illegible] آقا کو سمجھ گیا وہ
بولا تو اپنے ہمراہ کسی کو نہیں لایا۔ اس نے نہایت ادب کے
سرگذشت دہرادی جس کو سن کر اس نے سر کو جنبش دی اور
جانب کے گروہ میں سے ایک کو اشارہ کیا وہ اس کے قریب
دونوں میں کچھ سرگوشی ہوئی جس کو سن کر وہ کہیں چلا گیا اور
دیر کے بعد واپس آکر کوئی شے اس کے ہاتھ میں دی جسے
[illegible] دیکھ نہ سکا۔ آقا نے اس کو کچھ [illegible] کر دیکھا اور پھر
دیو کے ہاتھ میں دے کر کہا جا اب [illegible] آ
وہ خوشی خوشی پھر اس سڑک پر آیا [illegible] کھیل رہے تھے
[illegible] نہایت خوبصورت گلاب جیسے بچے کی طرح
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

(باقی [illegible])

صرف

اور سیلپ کی بچتوں پر
سب سے زیادہ سود

چھ برسوں میں

اپنی رقم کو دوگنی سے بھی زیادہ کیجئے

قومی بچت سرٹیفکیٹ (چھٹے اجرا) میں لگا کر

ان نئے سیریز میں 100 روپیہ 6 برسوں میں 201.50 روپے ہو جاتے ہیں جس میں 12 فیصد سالانہ کی شرح سے ششماہی مرکب سود بھی شامل ہے۔

ایک نیا ساتواں اجرا بھی ہے جس میں 12 فیصد سالانہ سود ششماہی قابل ادا ہوگا اور راس المال 6 سال کے بعد واپس کیا جائے گا۔

دونوں سیریز کو 3 سال کے بعد بھنایا جا سکتا ہے۔ رقم لگانے کی کوئی حد نہیں۔ نامزدگی، شناختی پرچی اور منتقلی کی سہولیات۔

انکم ٹیکس کے مقاصد کیلئے سرٹیفکیٹ ڈاک گھروں سے باقاعدہ جاری کئے جاتے ہیں۔ ایک لاکھ روپے تک دولت ٹیکس سے چھوٹ۔ 3,000 روپے سالانہ تک سود بعد دیگر متعینہ سرمایہ کاریوں پر سود کے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ۔ یہ سرٹیفکیٹ ڈاک گھروں سے انفرادی یا مشترکہ طور پر یکم مئی 1981ء سے خریدے جا سکیں گے۔

مزید تفصیلات کے لئے ان سے رجوع کیجئے:

- مجاز ایجنٹ
- ڈسٹرکٹ سیونگز افسر
- معرفت ڈسٹرکٹ کلکٹریٹ
- نزدیکی ڈاک گھر
- ڈائریکٹر جنرل نیشنل سیونگز آرگنائزیشن (دارالحکومت مرکزی سیکرٹریٹ)

یا لکھئے:

قومی بچت ادارہ

12 سیمزی بلڈ نمبر 44006

رباعیات علامہ ادیب لکھنوی

رباعی کا صنف لطیف اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کے وجود و لذت اور خصائص وغیرہ پر روشنی ڈالی جائے جو ادبی و لسانی مختلف کتب کی ورق گردانی کے بعد درج ذیل چند امور نذر ناظرین کئے جاتے ہیں۔

رباعی کا موجد جمہور کی رائے میں رباعی کا موجد ابو الحسن رودکی ہے۔ چنانچہ علامہ محمد بن عبش خوارزمی اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ ایک دن بتقریب عید سعید حضرت رودکی باغ جا رہے تھے۔ رستے میں دیکھا کر چند لڑکے جوز بازی کر رہے تھے۔ اور ایک جم غفیر تماشا گیروں کی حیثیت سے وہاں جمع ہے۔ گیارہ سال کے ایک حسین لڑکے نے چند جوز گڑھی میں ڈالے سب جوز گڑھی میں جا پڑے۔ صرف ایک رہ گیا اور وہ گڑھی کی طرف لڑھک رہا تھا جس کو دیکھ کر لڑکا بے ساختہ بول اٹھا

ع غلطاں غلطاں ہمی رود تا بن گو

رودکی نے جب اس جملہ پر غور کی تو اس کو عروض کے مطابق پایا۔ اور ۲۴ اوزان بحر ہزج سے اس کے لئے استخراج کئے اور یہی کہہ کر اس کا نام ترانہ رکھا۔

علامہ ... حضرت عندلیب شادانی دام ... مرحوم فرماتے ہیں کہ رسالہ رباعی میں مفتی سعد اللہ صاحب نے مصرعہ مذکور کو اس طرح لکھا ہے۔ ع

غلطاں غلطاں ہمی رود تا سر گو

محکم کی رائے کے خلاف دولت شاہ سمرقندی اور دیگر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ یعقوب لیث جو اسلام کے [illegible] کا فرمانروا بادشاہ تھا نے اپنے [illegible] سالہ بچے کو عید کے روز بچوں کے ساتھ [illegible] کرتے دیکھا [illegible] الفاظ میں [illegible] تک کھیل دیکھتا رہا۔ بچے نے جوز گڑھی میں ڈالے۔ سب گڑھی میں جا پڑے۔ صرف ایک رہ گیا۔ وہ بھی لڑھکتا ہوا گڑھی میں جا پہنچا۔ بچے نے خوش ہو کر بے ساختہ کہا

غلطاں غلطاں ہمی رود تا بن گو

اس پر بادشاہ نے اپنے دربار کے نامور شعرا ابو دلف عجلی اور شہید بلخی کو بلا کر اس کا وزن دریافت کیا انھوں نے عرض کی۔ جہاں پناہ اس کی تقطیع یوں ہو سکتی ہے۔

مَفعُولُن فاعِلُن مَفاعِیلُ فَعَل

جو بحر ہزج کی ایک شاخ ہے۔ بادشاہ کی خواہش پر اس پر تین مصرعے لگائے گئے اور اس کا نام دو بیتی رکھا گیا۔ حاصل کلام یہ کہ خواہ اس کا موجد رودکی ہو۔ خواہ یعقوب بن لیث۔ یہ امر مسلم ہے کہ رباعی اہل عجم کی ایجاد ہے۔

وجہ تسمیہ بدائع الافکار کا فاضل مصنف لکھتا ہے کہ رباعی کو رباعی اس لئے کہتے ہیں کہ بحر ہزج اشعار عرب میں مربع الاجزاء ہے۔ جو علماء کے خیال کے مطابق ہر مصرع دو بیت مربع کی طرح ہے اور مجموعہ چار بیت ہے۔ مگر اہل عجم اس کو دو بیتی کہتے ہیں اور مجموعہ کو دو بیت جانتے ہیں۔ حاشیہ [illegible] پر مرقوم ہے کہ رباعی منسوب بہ رباع یعنی چار چار ہے۔ چونکہ [illegible] میں چار مصرعے ہوتے ہیں۔ اس لئے اسے رباعی کہتے ہیں۔ اور اسی لئے اس کا نام چہار مصرعی اور [illegible] بھی ہے۔ [illegible] عروض [illegible] رباعی اور [illegible] الافکار [illegible] کاشفی [illegible] رباعی [illegible] ہے [illegible] اور اس کا [illegible] اس [illegible] نام ترانہ ہو گیا۔

رباعی [illegible] قوافی

[illegible] میں [illegible]

ں قافیہ ہوتا ہے اس کو رباعی خصی کہتے ہیں اور اگر تیسرے مصرعہ
ں قافیہ نہ ہو تو اس کو رباعی [illegible] کہتے ہیں۔ اس ضمن میں
صاحب محیط الدائرہ اور صاحب بحر الفصاحت فرماتے ہیں کہ مصرع
سوم میں قافیہ کا ہونا ضروری نہیں ہے مگر بہتر ہے۔ اہل [illegible]
ہے۔ جبکہ [illegible] اور مخزن الفوائد کے قابل مصنفین
فرماتے ہیں کہ اگر رباعی کے تیسرے مصرعے میں بھی قافیہ ہو
تو مستحسن ہے۔ بہرحال یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ
متقدمین کے نزدیک رباعی کا مصرع سوم لازمی طور سے
بلا قافیہ ہوتا تھا۔ [illegible] اور فردوسی کی اکثر رباعیات
اسی قبیل سے ہیں لیکن متاخرین نے اس شرط کو اڑا دیا اور
صرف پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ کو ضروری سمجھا۔

رباعی کے خصائص

ہدایۃ البلاغت میں لکھا ہے کہ چونکہ رباعی دو ابیات کا مجموعہ ہے لہٰذا
شاعر کو اس کے الفاظ کی ترکیب و ترتیب میں سعی بلیغ لازم
ہے تاکہ محاسن و صنائع شعری اس میں پیدا ہو سکیں۔

جامع الصنائع میں مرقوم ہے کہ اصل وضع رباعی کی اس
پر ہے کہ رباعی کی دوسری بیت میں مقصود کسی لطیفہ یا نکتہ
یا مثال کا بیان کرنا ہو لیکن اس کے سوا اور کچھ بیان نہ کریں
جبکہ بعض کی یہ رائے ہے کہ ایجاز و اختصار کے طور پر کسی
مضمون کو ادا کرنے کے لئے رباعی ایک خاص سانچہ ہوتا ہے چاروں
مصرعوں میں باہمی معنوی ربط لازمی ہے۔ چوتھا مصرع جس پر
مضمون کا مدار ہے خوب برجستہ اور منجھا ہوا ہو۔ دیگر مصرعے
بھی ایک سے ایک بڑھے ہوئے ہوں [illegible]۔ مقابلے [illegible]
کا رباعی میں آ جانا خاص لطف پیدا کرتا ہے مثلاً غالب ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اسی طرح [illegible]

[illegible]

[illegible] میں [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] دوسرا شعر [illegible]
[illegible] معلوم ہوتا ہے کہ [illegible]
چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

از رباعی بیت آخر می کند ناخن بدل
خط پشت لب بچشم ما تا بشد خوشتر است

یہ اسی شعر کا ترجمہ ہے۔

اب [illegible] رباعیات مطالعہ [illegible]
از بسکہ رباعی تمام آسان و عبث + ہر مصرعہ اور چاروں مصرعے
مندرجہ بالا خصائص پر نظر رکھتے ہوئے جب حضرت ادیب کی رباعیات
کا مطالعہ ہوتی ہیں تو بے ساختہ داد و تحسین کے کلمات زبان پر
آجاتے ہیں کیونکہ ادیب صاحب کی طبیعت فطرتاً شاعرانہ
ہے اور آپ نے [illegible] کہ [illegible] نہایت
عمر کے [illegible] کے شعر و ادب کے میدان میں قدم رکھا تھا
یہی وجہ ہے کہ وہ اس وقت ادیب لبیب۔ شاعر کامل اور
شہسوار عرصۂ فن ہیں۔ طبع رسا، نکتہ دان اور [illegible]
واقع ہوئی ہے۔ ذہن رسا۔ ذوق سلیم۔ بلندیٔ تخیل۔ فصاحت
زبان۔ اسلوب بیان۔ حسن ادا نہایت دلکش۔ دل دوز۔
آویزاں اور دلچسپ ہے اسی وجہ سے ان کی ہر بات سامع کے دل
کو لگتی ہے اور سننے والے بے ساختہ خراج تحسین ادا
کرتے ہیں۔ ان کی [illegible]
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ایسی رباعیات بھی کہی ہیں جو ادب
کی کلاسیکی حیثیت رکھتی ہیں اور رباعی کے اصول کا علم رکھتی ہیں
چنانچہ فلسفۂ حیات اور نشیب و فراز زندگی سے متعلق فرماتے ہیں ؎

پر خار سہی [illegible] گلزار ہستی
پائندہ نہیں نہ ہو بہار ہستی
[illegible]
[illegible] نہ جا کہ شہر [illegible] ہستی

[illegible]
[illegible]

[illegible]

ہو [illegible] تین [illegible]

[illegible] + قائم نہیں ہے کی بے بسی

[illegible] بنیاد ہوا ہے [illegible] + انفاس پہ ہے دار و مدار ہستی

جیسے [illegible] پہلے مصرعے میں کتنا وسیع ثبوت

بے ثباتی دنیا کا پیش کیا ہے۔ پہلے تینوں مصرعوں میں جس

چیز کی تشریح کی انفاس پر ہے۔ دار و مدار ہستی کہہ کر

یہ وجود ثابت کر دیا۔

شاعری کی ہمہ گیر اور متنوع طبیعت اسی مضمون کو نئے

رنگ میں یوں پیش کر رہی ہے ؎

دنیا میں کچھ اس طرح سے انسان رہے

جس طرح سرا میں کوئی مہمان رہے

وہ [illegible] جانتا ہے یہ دار فنا

تاریک لحد کا بھی ذرا دھیان رہے

ایک عالم باعمل کی طرح اپنے ذہن کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے

ہیں ؎

اک ذرۂ ریگ ہوں کہ صحرا ہوں میں

اک قطرۂ آب ہوں کہ دریا ہوں میں

یہ قید تعینات باطل ہے ادیبؔ

جیسا مرا حوصلہ ہے ویسا ہوں میں

حسن فراخ دلی۔ بلند نظری۔ پاک باطنی اور بلند آہنگی کے ساتھ

اپنی [illegible] کا لائحہ عمل پیش کرتے ہوئے نہایت مقدس

جذبات کا اظہار کیا ہے نیز انسانی شعار کو صفات ملکوتی

کا رنگ دیا ہے ؎

اب درد کو ہم راز بناؤں گا میں

اک مونس و دم ساز بناؤں گا میں

اے درد وطن دل میں خلش پیدا کر

احساس کو اعجاز بناؤں گا میں

وسعت اخلاق۔ وسعت رفق۔ صداقت محبت کی جلوہ

[illegible] زیر اثر ذاتی شدائد زندگی اور شخصی کرب یا

حیات کو لیں پشت ڈال کر درد کی [illegible] اور عالم گیر حیثیت

[illegible]

جتنا اساس [illegible] کا [illegible]

اس تربیت کو [illegible] رنج حاصل کرے

[illegible] کائنات [illegible]

انسان کو شریک رنج عالم کر دے

عابد و زاہد کی عبادت حور و قصور۔ کوثر و تسنیم۔ جنت و

کی جزا کا تقاضہ کرتی ہے اور [illegible] آتما یہ جاتے تعلقا

کی طرف متوجہ رہتا ہے لیکن ادیب صاحب کی عبادت کتنی و

کتنا وسیع۔ کتنی ہمہ گیر اور کتنی دل پذیر ہے فرماتے ہیں ؎

جو اہل جہاں سے عام الفت میری

ہو خدمت خلق ہی عبادت میری

راحت کبھی خواب میں بھی مجھ کو نہ ملے

گر اوروں کے رنج میں ہو راحت میری

یہ رباعی ہر انسان کے لئے مشعل راہ ہے اگر اس پہ عمل کیا جا

تو مذہبی مباحث ختم ہو جائیں۔

اسی سلسلہ میں ذیل کی رباعی ملاحظہ ہو۔ کس قلبی رواداری

و مصلحت کی تلقین کی گئی ہے۔ اور پھر تلقین کا انداز کس قدر

دلچسپ اور دل کش ہے۔

تفریق ہے اپنے کی نہ بیگانے کی + سے نوش ہوا ہے جو کسی پیمانے کی

کیوں کا نہ کروں قدر میں کعبہ کی ادیبؔ + عزت ہے مرے دل میں صنم خانے کی

ادیب صاحب، نہایت منکسر المزاج، سنجیدہ اور متین

انسان ہیں ان کی گفتار و کردار دونوں بہ روش نظر آتی ہیں۔

ذیل کی رباعی ان کے شعار زندگی کی آئینہ دار ہے ؎

بے حق نہ ہو وہ بیان نہیں مجھ کو پسند

رنگینی داستان نہیں مجھ کو پسند

جو بات ہو دل میں وہ زباں پر آئے

تفریق دل و زبان نہیں مجھ کو پسند

خدمت خلق کا درجہ ادیب صاحب سے پوچھئے۔ فرماتے ہیں ؎

دنیا میں کمائی بس یہ دولت یکسر ہے

ہر ایک سے جہان میں کی محبت [illegible]

[illegible] قریب [illegible]

کی خلق خدا سے جتنی الفت [illegible]

حُبِّ وطن کا [illegible] دیکھئے رباعی سے

میں کس کو سناؤں آہ افسانۂ دل
[illegible] الم ہے [illegible] دل
اے شمعِ وطن تجھی پہ [illegible] گئے
مُدت سے تڑپ رہا ہے پروانۂ دل

تقسیم وطن پر شعرا نے طویل نظمیں کہی ہیں۔ لیکن دیکھئے ادیب صاحب نے ایک ہی مصرع میں کس قدر درد و سوز پیدا کر دیا ہے

دو قوموں کی تقسیم نے مارا ہم کو + بگڑی ہوئی تعلیم نے مارا ہم کو
بچپن میں ریاضی سے ڈرا کرتے تھے + پیری میں بھی تقسیم نے مارا ہم کو

اس رُباعی میں ریاضی اور تقسیم کے الفاظ کتنے موزوں کتنے بلیغ اور کتنے ذو معنی ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے طنز و مزاح کا نمونہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

جس شخص کو دیکھئے وہ متوالا ہے
اک میں ہوں کہ میں نے مُفت غم پالا ہے
ہارا ہوں جوئے میں قرض لے کر [illegible]
سب کی دیوالی میرا دیوالا ہے

بقیہ۔ کل ہند مشاعرہ

طوفانِ غم کی ندیہ تھا ہستی کا کارواں
اچھا ہوا کہ تیری گلی میں ٹھہر گئے۔

ہر گام پر جبینِ محبت جھکا کے ہم
کس شوق سے خلیق درِ یار پر گئے

حضرت مولانا خلیق صاحب کے بعد دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور میری صحت اب اجازت نہیں دے رہی کہ تیس شعرا کا کلام سننے کے بعد مزید بیٹھ سکوں لہذا میں مولوی بدر الدین صاحب اور [illegible] صاحب کے ہمراہ اسٹیج سے اٹھ کر جناب حکیم [illegible] صاحب [illegible] کے مطب میں [illegible] کے [illegible] آ گیا ہوں۔ حکیم [illegible] صاحب [illegible] اور [illegible] کے بعد [illegible] گیا ہوں ———

بقیہ: باب انتقاد

[illegible] کتاب ۱۹۶۷-۶۸ء میں [illegible] [illegible] والے [illegible] کی داستان ہے۔ جس میں سماج کے ان [illegible] کی [illegible] کی گئی ہے جو شرافت کا لبادہ اوڑھ کر [illegible] سب ہی کا [illegible] انسانیت کا [illegible] کرتے ہیں۔ جب [illegible] ہوتا ہے اس وقت [illegible] سفید پوش [illegible] عزت [illegible] کی [illegible] زمین جائیداد بیچنے میں [illegible] ہیں۔ اس ناول کے مصنف کا نہو چرن مہانتی اڑیا زبان کے ایک معروف و مقبول ناول نگار ہیں۔ اردو ترجمہ [illegible] صاحب نے کیا ہے۔ ضخامت ۲۵۴ صفحات۔ قیمت تیرہ روپیہ پچیس پیسے۔ ناشر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا 5- A گرین پارک نئی دہلی ۱۶ سے مل سکتی ہے یا دفتر شانِ ہند نئی دہلی سے منگا سکتے ہیں۔

اردو ہے جس کا نام (حیدرآباد کے شب و روز)

اردو اکاڈمی اندھرا پردیش کے سکریٹری اور ڈائرکٹر جناب چندر سری واستو احمد آباد کے روزنامہ رہنمائے دکن کے اخباری اشاعت سے [illegible] سال تک [illegible] حیدرآباد کے شب و روز کے عنوان سے شائع شدہ ان کے مضامین جن میں اردو مسائل پر بحث کی گئی ہے اور اردو ہے جس کا نام عنوان سے ان کے مضامین مختلف جرائد اور رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان سب کو زیر نظر کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں اردو زبان کا مقدمہ سری واستو کا [illegible] ایک [illegible] کا نام ہے [illegible] کی [illegible] گئی ہے [illegible] کے لئے تمام جمہوری و دستوری طریقوں کو اپنانے کی ضرورت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ضخامت ۱۹۲ صفحات [illegible] [illegible] قیمت [illegible] [illegible] [illegible]

رپورتاژ

کل ہند مشاعرہ جشنِ خلیق مجّاری دہلوی (جے پور)

(سرور تونسوی)

جناب خلیق مجّاری دہلوی حضرت نوح ناروی مرحوم کے شاگرد ہیں مگر شاگرد واقعی اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلے تو استاد کی تمام خصوصیات شاگرد میں قدرتی طور پر منتقل ہو جاتی ہیں۔ محمود مرحوم کے بعد جن شاگرد ہیں مگر قدرت نے اس سلسلے میں جس قدر خلیق صاحب کو نوازا ہے دوسرے تلامذہ اس نعمت سے محروم ہیں۔ جناب گل خلیقی جے پوری مولانا خلیق صاحب کے شاگردِ رشید ہیں انھوں نے اپنے استادِ محترم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے ۲۳ مئی ۱۹۸۱ء کو جے پور میں اپنے مکان محلہ جالوپورہ میں مولانا خلیق مجّاری دہلوی کا جشن منایا اور اس مبارک موقع پر ایک کل ہند مشاعرہ بھی منعقد کیا۔ گل خلیقی صاحب میرے مخلص نیاز مندوں میں سے ہیں۔ اس لئے ان کی اس خواہش کی تکمیل سے انکار نہ کر سکا۔ کہ اس مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا حال میں لکھوں۔ (سرور تونسوی)

مقامِ مشاعرہ: محلہ جالوپورہ۔ جے پور (راجستھان)

صدرِ مشاعرہ: جناب عبد الرحمٰن صاحب چودھری ڈپٹی منسٹر راجستھان۔

مہمانِ خصوصی (۱) جناب احمد بخش صاحب ڈپٹی اسپیکر راجستھان اسمبلی (۲) جناب شری رام گوئنکا والے

ناظمِ مشاعرہ: جناب راہی شہابی جے پوری

تاریخ: ۲۳ مئی ۱۹۸۱ء ہفتہ بوقت ساڑھے دس بجے رات

جے پور کے عاشقِ اردو جناب نذیر احمد چودھری کے ہمراہ مشاعرہ گاہ میں ساڑھے دس بجے پہنچا تو تلاوتِ قرآن کریم ہو رہی ہے۔ اس کے بعد [illegible] نے نعت پڑھی۔ نعت ختم ہوئی تو [illegible] جناب گل خلیقی نے اپنے استاد جناب خلیق مجّاری دہلوی کی گلپوشی کی اور صدرِ مشاعرہ نیز مہمانانِ خصوصی کو پھولوں کے ہار پہنائے۔ مقبول احمد صاحب۔ یاسین صاحب اور نور محمد صاحب نیز راہی شہابی صاحب نے بھی صاحبِ جشن کی گلپوشی کی۔ راہی صاحب نے مائک سنبھالتے ہوئے کہا شعرائے کرام کے جشن منانے کے سلسلے میں جے پور اپنی نظیر آپ ہے اور اس زندہ پرستی کی [illegible] چاہیے۔ انھوں نے فرمایا کہ سب سے پہلے جشنِ صبا جے پوری ان کی زندگی میں منایا گیا۔ جشنِ پارسا، جشنِ قمر، جشنِ عمل، جشنِ بسمل۔ جشنِ مراد، جشنِ معشوق۔ جشنِ شاد اور اسی قسم کے کئی جشن منا کر اہلِ جے پور نے خدمتِ اردو کے ساتھ ساتھ زندہ پرستی کی جو شاندار روایات قائم کی ہیں۔ آج کا مشاعرہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ راہی صاحب نے گل خلیقی صاحب اور ان کے رفقائے کار جناب نور محمد صاحب وغیرہ کی تعریف کی کہ انھوں نے حضرت خلیق مجّاری دہلوی کے اعزاز میں یہ جشن منایا۔

اب راہی صاحب نے مشاعرہ کی ابتدا شاد آبہ سے کی ہے۔ ان کا قطعہ ہے ؎

عرضِ آداب لے کے آیا ہوں ۔ [illegible] لے کے آیا ہوں
[illegible] ۔ گلشنِ شادآبہ کے کیا ہوں

قطعہ کے بعد شادآبہ نے غزلِ مسلسل شروع کی ہے۔ ترنم کے زیرِ [illegible] کہ آپ تصور کر [illegible] غزل [illegible] اپنا اور آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ ایک تو شادآبہ مقامی شاعر دوسرے غزل [illegible] پڑھ [illegible] شاد [illegible] کون؟ اس پر راہی صاحب [illegible] مشاعرہ ہے۔ جب تک آپ داد دیں گے [illegible] کیسے آئے گا [illegible] اپنی زبان [illegible] کہ ہر شاعر [illegible] کا ایک [illegible] دیتے ہیں۔ [illegible] ان کی [illegible] کیا ضرورت

تی۔ یہ سراسر [illegible]
گیا۔ راہی صاحب کو [illegible]
مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ [illegible]
ایک شعر تو [illegible]

وہ رات جس میں تم آ گئے ہو تصور میں
وہ رات ایک قیامت کی رات گزری ہے

رونق بے پوری واقعی مشاعروں کی رونق ہیں۔ جس طرح سرکس میں کچھ وقفے کے بعد جوکر سامنے [illegible] کہیں کہیں مزاحیہ سین رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح مشاعروں میں بھی کچھ وقفے کے بعد رونق ایسے شعرا کو پیش کر کے سامعین کو تازہ دم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رونق صاحب نے ایک ہی [illegible] صاحب صدر اور مہمان خصوصی کو بامزہ کر دیا ہے۔ اور راہی صاحب کی شان میں تو قصیدہ کہہ دیا ہے۔ غرضیکہ رونق صاحب کی [illegible] و یقین دلایا کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں [illegible] مرزا عظیم بیگ غزل عطا فرما رہے ہیں:

سوزِ غم پنہاں ہے بے چینی دم بالا ہے
ناکام محبت کا لیکن یہ [illegible] ہے
بے چین تھا جب بھی تھا بے چین کیا اب بھی ہوا
پہلے غم پنہاں تھا اب غم دوستاں ہے
اس کو کبھی [illegible] نہیں ملتی
کس درجہ مصیبت میں اس کا انساں ہے
اے [illegible] یہ کون سی منزل ہے
کچھ [illegible] پریشاں ہوں کچھ [illegible] ہے

مناسب [illegible] مرزا عظیم بیگ [illegible] تشریف لے گئے [illegible] غفار راز [illegible] اشعار [illegible] خوب داد پائی۔ فرماتے ہیں:

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] غزل [illegible] نہیں ہیں [illegible]
[illegible] نظم [illegible]
[illegible] اس شعر سے

امن اک لطف و مسرت کی حسیں وادی ہے
امن تصویر سکوں نغمۂ آزادی ہے

سے اپنی نظم شروع کی ہے اور سامعین پر ایک بامقصد نظم سنا کر داد پائی ہے۔

اب راہی صاحب نے جناب پارس رومانی جودھپوری کو کلام سنانے کی درخواست کی ہے۔ میں نے پارس صاحب کے والد محترم جناب امجد جودھپوری (مرحوم) کو بھی بارہا مشاعروں میں سنا تھا۔ پارس صاحب میں اپنے والد مرحوم کی سب خصوصیات موجود ہیں۔ اور ہر موضوع پر اشعار کہنے کی [illegible] پارس صاحب رکھتے ہیں۔ آج بھی یہ موقعے کی مناسبت سے جناب خلیق بخاری دہلوی سے متعلق نظم سنا رہے ہیں۔ کیونکہ سارے مشاعرے میں یہی ایک نظم ہے جو صاحب جشن کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے۔ [illegible] اسے من و عن شائع کر کے اس خراجِ عقیدت میں حصہ دار بن رہا ہوں۔ سنئے پارس رومانی کس جوش و خروش سے عرض کرتے ہیں:

آج یہ پیر و جواں کہہ رہے ہیں بار بار
آج [illegible] جشن ہو گیا شاندار
آج [illegible] اس طرح آئی بہار
آج [illegible] پر نثار
آج [illegible] کہہ رہے ہیں [illegible]
آج [illegible] خلیق
آج [illegible] دیکھئے
[illegible] دیکھئے
[illegible] دیکھئے
[illegible] دیکھئے
[illegible]

آپ دنیائے ادب میں [illegible] احترام
[illegible] سے [illegible] مقام
آپ [illegible] ہے [illegible] کلام
آپ کا کلام مقبول ہو [illegible] یہ تمام

آپ کے قدموں میں آ کر ہم [illegible]
آپ عالم با عمل ہیں آپ شاعر باشعور

آپ کے اشعار میں ہیں [illegible] کی صورتیں
آپ کے اشعار میں ہیں درد دل کی لذتیں
آپ کے اشعار میں ہیں علم و فن کی [illegible]
آپ کے اشعار میں ہیں زندگی کی عظمتیں

آپ نے اشعار کا مقصد جو پوچھا یہ کہا
خدمتِ اردو زباں اور خدمتِ خلقِ خدا

آپ کی [illegible] ہیں اردو زباں کے واسطے
آپ کے [illegible] ہیں اردو زباں کے واسطے
آپ کے جذبات ہیں اردو زباں کے واسطے
آپ کی خدمات ہیں اردو زباں کے واسطے

آپ [illegible] ہیں لیکن اب سکونت ہے یہیں
آپ کی [illegible] خدمت کی ضرورت ہے یہیں

آپ کا ہے بزمِ ہستی میں [illegible] طریق
کہہ رہے ہیں آپ کو شیخ و برہمن بھی شفیق
میکدہ دیکھا نہیں اور [illegible] رفیق
احترام آپ کو ساقی بھی کہتا ہے خلیق

آپ کو [illegible] بخشیں مکمل یہ صفات
نیک صورت نیک سیرت نیک دل اور نیک ذات

ان کا کل [illegible] بھی ہو گئے مقبول ہیں
اب خوشی سے [illegible]
آپ سب آ [illegible] مشغول ہیں
[illegible] مقصد تو جشن کرتے [illegible] ہیں

[illegible] کا پیام
[illegible] اہتمام

[illegible]
[illegible] بھی [illegible] کتنا مطلب
آج [illegible] نے [illegible] کتنا خطاب
[illegible] جشن پارس ہی [illegible]

آج کے جشن [illegible] یادگار
جشن پارس [illegible] انتظار

پارس [illegible] کہ اس [illegible] ملی ہے اور یہ صرف اس لئے کہ انھوں نے [illegible] مطالبہ صاحب جشن کو [illegible] طور پر عقیدت کے پھول پیش کئے ہیں۔ خدا کرے کہ پارس صاحب کا جشن بھی جلد از جلد منایا جائے۔

جناب فرید [illegible] مائیک پر تشریف لا چکے ہیں۔ اس وقت بے پردہ میں ترنم کے لحاظ سے ان کا مدمقابل کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے۔ غزلیں تو عام طور پر یہ بھی پرانی ہی پڑھتے ہیں۔ مگر ان کی پرانی غزل بھی [illegible] مکرر کا مزا دے جاتی ہے۔ آپ بھی ان کے کچھ اشعار سن لیجئے ترنم کا محض تصور ہی فرمالیجئے ارشاد ہوا ہے ؎

دل میں اگر خلوص و محبت کی خو نہ ہو
اس دل کی تو جہاں میں کہیں آبرو نہ ہو
جب تک شریک ان میں ہمارا لہو نہ ہو
صحنِ چمن میں [illegible] سرخرو نہ ہو
[illegible] حسن پر [illegible] نہ ہو
آئینہ دیکھ [illegible] بے خود نہ ہو

داد ہے کہ اس شعر کا پیدا [illegible] ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بے پورے بچے جب [illegible] میں روتے ہیں۔ اور یہاں تو معاملہ شعر و شاعری کا ہے [illegible] شرمارہا ہے

قائل ہے کون اس کا [illegible]
[illegible] کا نام [illegible] کہیں یار [illegible] نہ ہو

[illegible] متروک ہیں۔ مگر یہاں [illegible] لفظ [illegible] صاحب فرماتے ہیں

[illegible]
[illegible] نہ ہو

جس میں ہو عزت سلیقہ بات کا
بہتر یہی ہے اس سے کوئی گفتگو نہ ہو

پُرزور تالیوں کی گونج گڑگڑاہٹ میں فریدی صاحب اپنی جگہ گئے
اعلان کیا گیا ہے کہ جناب گل نشلیتی حضرت خلیق ٹونکی کی
کی خدمت میں اس مبارک موقع پر مبلغ گیارہ سو روپیہ کا تھیلہ
زر پیش کریں گے۔ گل صاحب اپنی سابق نیازمندی اور شرافت
کا نمونہ پیش فرماتے ہوئے اپنے استاد محترم کی خدمت میں ہدیہ
تبریک پیش کریں گے... تو ہال سامعین نے پُرزور تالیوں سے مبارکباد
دی ہے اور جناب رضی الدین صاحب نے خلیق صاحب
کی گل پوشی فرمائی ہے۔

وفتی صاحب جناب بے چین دہلوی سے تشریف لانے کی
...... درخواست کی ہے سنیئے بے چین صاحب
واقعی بے چینی کی باتیں کر رہے ہیں ؎

جن کے پینے سے ہونٹ جل جائیں۔ زہر اچھا ہے ایسے پانی سے
جو گزرتی ہو بے حیائی سے۔ موت بہتر ہے اُس جوانی سے

پی گئے خون دھرم کے داتا۔ ہائے قسمت الم نصیبوں کی
دیش سیوا کے نام پر بے چین۔ کھال تک کھینچ لی غریبوں کی

دھرم ایمان کے ٹھیکیداروں نے۔ گھر بیچ ملا ہیں کسوٹی پر
کوٹ اور پینٹ کے لقدق میں۔ ٹیکس لگوا دیا لنگوٹی پر

بے چین صاحب نے خوب ہی بھر کر داد پاتے ہوئے
سوسائٹی کے مختلف کرداروں کا طنزیہ منظوم تعارف اس ادا
سے فرمایا کہ سامعین لوٹ پوٹ ہو گئے۔ صاحب صدر اور ڈپٹی
سپیکر صاحبان اس تعارف پر خوب داد دے رہے ہیں۔

اب جناب رحمت امروہوی کلام سنانے کی تکلیف
فرما رہے ہیں۔ لیکن تو بے چین کے تیکھے اور طنزیہ کلام کا اثر لیے
ہوئے ان کا کلام بھی کچھ دب سا ہے اس لئے رنگ جما نہ سکے
ان کا ایک قطعہ سن لیجیے ؎

کسی پتھر پہ کچھ سلام لکھیے۔ درختوں کے بدن پہ نام لکھیے
بہت اب لوگ ... ہیں۔ کسی غزل میں نہ اپنا نام لکھیے

نعت ... صاحب تشریف لے گئے اور ...
ساقی صاحب کو آواز دی گئی ہے۔ آپ نے تین چار قطعات سنانے
کے بعد غزل شروع کی ہے۔ حقیقت ہے کہ یہ محفل میں بیٹھے ہیں
مگر انداز کے تو کیا کہنے ... جیسا تبسم کرتے ...
... اپنے جمال حال کا تعارف بھی ترنم سے کرتے ہیں
ساقی فرماتے ہیں۔

ایک پل مانگے وہ دوسرے پل دیتا ہے
جو سلیقے سے وہ اوقات بدل دیتا ہے

لیکن آواز آئی ہے کہ یہاں اوقات سے معنی مقصد لیجیے۔ باذوق
اصحاب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس تشریح کی داد دی ہے
اور ساقی صاحب کہہ رہے ہیں ؎

آپ یہ سوچتے رہیے کہ زباں کچھ نہ کہے
اور چہرہ ہے کہ سچائی اگل دیتا ہے
میرا کردار تو اس پیڑ کے جیسا ہی نہیں
باپ بوتا ہے تو اولاد کو پھل دیتا ہے

ساقی بہرکیف کچھ کچھ داد لے ہی گئے اور اب تشریف لا رہے ہیں
ساحر رتلامی۔ اور صاحب صدر جو ڈپٹی منسٹر ہیں کی طرف دیکھتے
ہوئے کہنے لگے ؎

ہمارے دیش کی جمہوریت میں ہمیشہ ٹھیک سے ہوتا رہا ہے
غریبی کو مٹانے کے بہانے وہ دنیا کی بہلائے ... رہا ہے

صاحب صدر اور ڈپٹی سپیکر صاحب سامعین کے ساتھ مسکرا رہے
ہیں اور ساحر رتلامی صاحب اپنے فرمودات میں یوں رنگ
بھرنے کی کوشش کر رہے ہیں ؎

امیر آگ کھاتے میں سو رہا ہے غریب اسرار کے ... رہا ہے
تماشہ گاہِ عالم میں خدایا یہ کیا ہوتا ... رہا ہے

ہنستے ہنساتے ساحر صاحب بھی مائک سے جدا ہوئے اور اب ساقی
صاحب جناب ہوش سرحدی ... صاحب کو کلام سنانے کی دعوت
دے رہے ہیں۔ آئیے اب ہوش صاحب کا ... کلام ...
فرماتے ہیں ؎

کہاں ... میں ... دیتا ہے
... کو ... دیتا ہے

[illegible]

ہم کو بہت سنا دکھائی دیتا ہے

[illegible] ہو کہ [illegible]

ہم اتنے ہیں سنا دکھائی دیتا ہے

بہار عجائب [illegible]

زندگی صرف تماشا دکھائی دیتا ہے

انکے کلام میں حسن بیانی کی دلالت کرتی ہے اور ہوش صاحب تحت میں پڑھتے ہوئے بھی سامعین کو [illegible] پہ چھا جاتے ہیں یہ

میں اپنے شہر میں بستا ہوں [illegible] جگر کو

مجھے کہاں کوئی ایسا دکھائی دیتا ہے

کہیں تو ہوش کی خاطر میں کا مدہوشی

پھر ایک خواب اندھیرا دکھائی دیتا ہے

ہوش صاحب [illegible] اچھی داد پاکر مائیک سے ہٹے تو مرحوم ساغر صاحب [illegible] صاحبزادے میکش ساغری مائیک پر آگئے ہیں اور غزل کا مطلع [illegible] ہے

جس کو مدافعت کا میری اعتراف تھا

سب کی طرح وہ شخص بھی میرے خلاف تھا

مطلع غمازی کر رہا ہے کہ آپ "جدیدیت" کا شکار ہیں۔ ان کا ایک اور شعر سن لیجیے ؎

آئینہ [illegible] سب

چہرے کی [illegible] آئینہ [illegible] تھا

جدیدیت پسند شعرا کو ان کے اشعار پر کم [illegible] پر زیادہ داد ملتی ہے چونکہ میکش جدیدیت [illegible] سے واقف نہیں ہیں اس لئے داد کا کوسوں پتہ نہیں چل رہا ہے۔ میکش اپنی جگہ پر گئے تو [illegible] کا کلام سننے آئے۔ انھوں نے قطعات [illegible] سنائی ہے [illegible] کا [illegible] سہولت کے باعث قابل احترام ہے۔ مگر افسوس ہے کہ [illegible] سہولت ایسے شعرائے باکمال ہوئے [illegible] ہیں [illegible] شعر و شاعری سے [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] صاحب نے آئی کا [illegible] کلام سنانے کی استدعا کی ہے۔ آپ نے ترنم [illegible] قطعات سنانے کے بعد غزل سنائی

[illegible] امد رکھ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بعد قطعہ [illegible] احساس کے تحت غزل شروع کر دی ہے۔ جو خوب [illegible] ہیں آخر [illegible] صاحب [illegible] لگے اثر صاحب [illegible] ہیں اس کی [illegible] یہ کلام [illegible] ختم ہوئی [illegible] تک پہنچے۔ دو چار شعرائے کرام [illegible] گزارش کی ہے ایک غزل اور عنایت کیجیے اور اثر صاحب ہیں کہ مقبولیت کا [illegible] قطعات کی بوچھاڑ کر رہے ہیں اور کئی قطعات کے بعد تیسری غزل شروع کر دی ہے۔ بے شک اثر صاحب کے اشعار اچھے ہیں اور وہ ترنم سے پڑھ رہے ہیں مگر اب سامعین اور سٹیج پر بیٹھے سب حضرات بور ہو گئے ہیں۔ [illegible] چپکے سے ان کے پاس گئے اور ان سے کہا ہے کہ جلد جلدی غزل ختم کر کے بیٹھ جاؤ تاہم پون گھنٹے کے بعد اثر [illegible] نے مائیک کو چھوڑا تو راہی صاحب نے اثر صاحب کی جان [illegible] کی طنز یہ داد دیتے ہوئے نظر [illegible] کلام سنانے کی التجا کی ہے۔ نظر [illegible] میں غزل شروع کی ہے اور مطلع کے بعد سے [illegible] انداز پڑھا ہے ؎

آدمی کی قسمت میں صرف غم اٹھانا ہے

زندگی بھی دھوکا ہے موت بھی بہانہ ہے

مطلع پر [illegible] داد ملی ہے کہ اثر [illegible] جو بوریت پھیلائی تھی وہ یکدم ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اور نظر صاحب ایسے والہانہ انداز میں [illegible] کے [illegible] حضرات کی روحیں بھی [illegible] مشاعرہ گاہ کے [illegible] لگی ہوں گی ارشاد ہوا ہے ؎

عشق میں [illegible] ہے

آپ کو [illegible] لگتا ہے

سر [illegible] ملتا

کس کو [illegible] ہے

[illegible]

آسمان کو جب ... کیوں نظر آتا ہے

آسماں نہیں سر پہ غم کا شامیانہ ہے

مندرجہ بالا اشعار بے شک کا منظر آپ کو انتہائی سموئی ہوئی دکھائی دیتے ہوں گے اور بعض کو آپ سہل بھی قرار دیتے ہوں گے مگر مشاعرے میں یہی اشعار نظر صاحب کے ترنم میں ہر سامع کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ اچھی آواز جو شعر میں ہو وہ مجھے بھی اچھی لگتی ہے چنانچہ اگر میں نے نظر صاحب کے ترنم کی تعریف کی ہے تو اسے میری کمزوری سمجھ کر معاف فرمائیے گا۔

نظر صاحب داد و ستائش سے لدے پھندے مائیک سے ہٹے تو ڈاکٹر تمکین بھارتی تشریف لائے ہیں۔ راہی صاحب نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ انھوں نے چار مصرعے سنانے کے بعد ایک نظم شروع کی ہے "مجھے جینا ہے"۔ عالم فتحپوری کے انداز میں اردو سے متعلق اس نظم کے دو تین اشعار سننے کے بعد ہی مجھے عالم فتحپوری کی مشہور نظم دماغ میں گھومنے لگی۔ وہی نپے تلے الفاظ۔ وہی انداز بیان۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمکین بھارتی نے عالم فتحپوری کی نظم ... ٹیپ کر کے اپنے حلق میں ٹیپ کر لگا رکھا ہے۔ [illegible]

[illegible]

... کھینچ کر ... ہو گئے۔ گل صاحب ... کا ایک بہترین ... ہے۔ سنیے گل صاحب اپنے مخصوص ترنم سے نغمہ ریز ہیں۔

... مخلصانہ تھا
... کا مرے عشق میں نا معتبر نہ تھا

جلا دی برق تعصب نے ایک ہی پل میں
وہ شاخ جس پہ محبت کا آشیانہ تھا

... وصل میں ... نالہ کشی تھی ورنہ
جنونِ وحشتِ ... تو اک بہانہ تھا

فریب دینے ہی ... ورنہ
... مخلصانہ تھا

گل صاحب مناسب داد پا کر پھر انتظامی معاملات میں مصروف ہو گئے ہیں اور اب ایک کم عمر نوجوان افکار ... آ گئے ہیں۔ مطلع پڑھا ہے

رتبہ بلند عشق کا دونوں جہاں میں ہے
میں ہوں زمیں پہ ذکر مرا آسماں میں ہے

[illegible]

بہت اچھے [illegible] کر رہے ہیں صاحب۔ تشریف لے گئے تو پتہ چلا جب پارسا کو ڈری کو دعوت سخن دی گئی ہے۔ سامعین نے پُرزور تالیوں سے پارسا صاحب کا خیر مقدم کیا ہے۔ پارسا صاحب کے ترنم کی نقل راجستھان بھر کے لے دالیاں [illegible] کرتی تھیں اور صاحب علاقوں کی ہر ایک [illegible] والی یہ خواہش رکھا کرتی تھی کہ وہ پارسا کا کلام پارسا صاحب کو سنا سکے اب ترنم کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ تحت میں عطا فرما رہے ہیں ؎

سحر کے شام کے منظر نکھر گئے ہوں گے
کسی کے رخ پہ جو گیسو بکھر گئے ہوں گے
تمہاری آنکھ کے یقیناً سنور گئے ہوں گے
تمہارے حضور میں با چشم تر گئے ہوں گے
قریب تھے وہ اندھیروں میں کھو گئے لیکن
ترے ترنم کو پڑھ کر گئے ہوں گے
تری نگاہِ کرم نے گرا دیا جب کو
وہ غم کے مارے نہ جانے کدھر گئے ہوں گے
ہمارے اشک کبھی رائیگاں نہیں جاتے
کسی کے حسن کے صدقے اتر گئے ہوں گے

اور قوالی اشعار کا حق بھی ہے۔ وہ پارسا کو داد ملی بھی خوب۔

دیوراج صاحب گاندھی ہر شخص کو کلام سنانے کی سمجھنے لگے ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں ؎

زندگی ہم بھی گزاریں تھکے خوابوں کی طرح
یہ خیال آتا ہے دل میں تیرے خوابوں کی طرح
طوفان شور اٹھا اور بیٹھ گیا
ہم ہوں کے جو اہم بھی حبابوں کی طرح
رہنماؤں کی چلتی ہوئی صورت پہ نہ جاؤ
ان کا ہستی ہے بیاباں میں سرابوں کی طرح
بے خود صاحب کو ترجمے کی تخلیق نہیں
آپ کو یاد بھی ہو کہنہ شرابوں کی طرح
ختم ہوتی نہیں یہ کتنی بھی کر لو کوشش
ہے [illegible] کتابوں کی طرح

ہورلی صاحب موزوں [illegible] پانے کے بعد مائیک سے ہٹا ہوئے
تو بیخود صاحب [illegible] ایک قطعہ کے بعد [illegible] کلام سنایا ہے

[illegible] آشیاں [illegible] کہاں چھوٹا
نہ [illegible] کے اسے ظالم ہم نے آشیاں چھوڑا

شعر کے بعد ساکش چند جوہری مائیک پر تشریف لائے ہیں اور اپنے اشعار سنا رہے ہیں ؎

وہ اشک جو پلکوں پہ لرزاں نظر آتا ہے
افسانۂ ہستی کا عنواں نظر آتا ہے
اب رنگ خنک بھی کچھ پیش نہیں چلتی
انسان کا کتنا انداز نظر آتا ہے
افسردہ جو دل کا جینا ہے کوئی جینا
بے زندہ دلی انساں بے جاں نظر آتا ہے
ہنس ہنس کے وہ کہتے ہیں یہ زخم جگر تیرا
ہاں ہاں نظر آتا ہے، ہاں ہاں نظر آتا ہے
یہ منظر بھی دیکھا ہے اے جوہری ہم نے تو
جو پیکرِ ذلت ہے ذی شان نظر آتا ہے

جوہری صاحب حضرت صبا جے پوری مرحوم کے شاگرد رشید ہیں اس لئے بھی یہ سب کو عزیز ہیں۔ جوہری صاحب کے بعد انجم رومانی تمام سب ایڈیٹر انقلاب ٹائمز بمبئی مائیک پر آئے ہیں اور ڈھائی سال پہلے کے حادثے جے پور کے پیش نظر ایک مطلع سنایا ہے۔ (جے پور کے ایک مشاعرہ میں ان کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی) ؎

کیا تھا عہد جو عہدِ وفا نہ بھولوں گا
شکستہ پا ہوں مگر راستہ نہ بھولوں گا

مختلف اشعار خوب خوب سنائے ہیں دو اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

نہیں [illegible] میں پہچان ہی نہیں سکتا
دیئے بجھا کر چہرے کی روشنی پہلے
گرد جھڑا۔ دو ستاروں [illegible]
ہم تری دنیا میں جیتے [illegible]

نجیب [illegible] پانے کے بعد [illegible] ہیں ؎

[illegible]
اس [illegible] کے [illegible]
[illegible]
[illegible]

اس مہ جبیں کو زمانے سے کیا نا یاب
میرے اخلاص کے موتی نہ کہیں لٹ جائیں
آج بیکار ہیں الٹے ہوئے ساغر کی طرح
جن کا یہ حکم تھا میخانوں پہ تالے پڑ جائیں

[illegible] رومانی صاحب غزل پر مناسب داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور اعلان ہوا ہے کہ دختر راجستھان [illegible] رفعت مائیک پر تشریف لا رہی ہیں۔ سنئے رفعت صاحبہ راگ [illegible] درباری جس میں پہاڑی کی آمیزش ہے میں کس قدر اچھے انداز میں نغمہ سرا ہیں۔

اڑی اور تیری رعنائیاں — کتنی دلکش ہیں میری تنہائیاں
[illegible] سیت کہتے ہیں جسے [illegible] — یہ تو ہیں سب زیست کی پرچھائیاں
سفینہ دل کا ڈوبا گم ہوا ہے — آہ تیری آنکھوں کی یہ گہرائیاں
[illegible] یہ شہرت کب کسی تقدیر میں — میری قسمت میں ہیں [illegible]
[illegible] بیٹھے ہو خطا کو اپنی ہم — یاد ہیں ان کی کرم فرمائیاں

[illegible] تو خیر اب ڈھل چکا ہے۔ مگر ترنم باقاعدہ موسیقی کی راہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ لہٰذا مناسب اشعار اور بہترین ترنم نے ایک سماں باندھ دیا ہے۔ سامعین کے پرزور مطالبہ پر رفعت صاحبہ دوسری غزل راگ درباری میں جس میں [illegible] کی آمیزش ہے شروع کر رہی ہیں۔

[illegible] میں زخموں کی لالہ کاریاں ہے فصل گل پھر بھی ہم کو پیاری ہے

یہ غزل نا شاد رفعت صاحبہ نے جب مشاعرہ میں پہلی بار شرکت فرمائی تھی تو پڑھی تھی۔ لہٰذا شان ہند میں کئی بار مختلف مشاعروں میں آ چکی ہے۔ اسی وجہ سے اس غزل پر داد بہت کم ملی ہے۔

رفعت صاحبہ کے بعد راحت اندوری [illegible] سامعین [illegible] [illegible] لہٰذا آہی صاحب نے راحت صاحب [illegible] کلام سنانے کی گذارش کی ہے۔ راحت صاحب فرماتے ہیں کہ عابدہ رفعت کے بعد [illegible] [illegible] معلوم دیتا ہے جیسے مسجد سے شراب خانہ میں آ گیا ہوں۔ لیجئے اب راحت صاحب اپنی روایت کے مطابق [illegible] رہے ہیں۔

[illegible] تو ملا جناب تو ہے
[illegible] حساب تو ہے

تھا سہارا جو ساقی گزندگی کیا ہے
جو اب زیست ہوں پہلے تھی شراب تو ہے

کہاں گنہگار دیا [illegible] جواب مانگے گا
وہ جب [illegible] ہے سے گا حساب مانگے گا
شریف لوگ تو مسجد میں چھپ جا بیٹھے
وہ جانتے تھے کہ راحت شراب مانگے گا

اسی قسم کے قطعات۔ مختلف اشعار سنا کر راحت نے داد سے جھولیاں بھرتے ہوئے غزل شروع کی ہے۔ جو اشعار گنگنائے سے

سسکتی رُت کو مہکتا گلاب کر دوں گا
میں قطرہ قطرہ لہو کا حساب کر دوں گا
مہاجنوں سے کہو تھوڑا انتظار کریں
شراب خانے سے آ کر حساب کر دوں گا

راحت نے کلام سنانے کے بعد راحت پائی تو آہی صاحب نے پورے احترام سے قبلہ مولانا سید عبدالخالق صاحب خلیق بخاری دہلوی سے استدعا کی ہے کہ کلام عطا فرما کر ممنون فرمائیں۔ مولانا ارشاد فرما رہے ہیں۔

ہم عالم جنوں میں جدھر سے گزر گئے
[illegible] اعتبار کر کے ترا نام کر گئے
دامن ہماری چشم تمنا کا بھر گئے
ہم اس کرم پہ ایسی عنایت پہ مر گئے
جدھر سے گزرے ہیں گے وہ گزرے جدھر گئے
ہر گام رنگ و نور کے جلوے بکھر گئے
[illegible] رہ گئے ہم ایک [illegible]
پہلے تو حد جہاں کی حدود سے گزر گئے
[illegible]
[illegible] کبھی کے گزر گئے
[illegible]
[illegible]
[illegible] تمنا لئے ہوئے
[illegible]

بابِ انتقاد

(ادارہ)

قصرِ علم: زیرِ نظر کتاب اُن مضامین پر مشتمل ہے جو مختلف اہلِ قلم نے ٹونک (راجستھان) کے اُس تاریخی کتب خانہ کے قلمی نوادرات و مخطوطات پر تحریر کئے ہیں (ان تاریخی مخطوطات و ملفوظات کو ٹونک کے تیسرے حکمراں نواب محمد علی خاں نے بڑے ذوق و شوق سے اور زرِ کثیر صرف کرکے جمع کیا تھا) جو برِّ صغیر ہند و پاک میں اپنی نظیر آپ ہے۔

ادارہ تحقیقات عربی و فارسی راجستھان کے ڈائریکٹر صاحبزادہ شوکت علی نے ٹونک کی عظمتِ رفتہ اور تاریخ پارینہ کے گمشدہ اوراق کو یکجا کرکے ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جسے تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ ان اوراق میں نہ صرف ٹونک کی تاریخ پوشیدہ ہے بلکہ اسلامی فکر و فن، ہندوستانی تاریخ و تمدن اس شان امتزاج سے جلوہ گر ہے کہ اسلامیات کا یہ بیش بہا سرمایہ ہندوستانی اقدار میں آپ اپنا جواب ہے۔

قصرِ علم ادارہ کے اہم ترین مخطوطات و ملفوظات کا ایک تنقیدی و تفصیلی جائزہ بھی ہے اور ایک اہم ترین تاریخی سرمایہ کی ترتیب و تدوین بھی۔ ایک طرف مخطوطات پر تبصرہ ہے تو دوسری طرف ماخذ و مصادر کا دل پسند انداز کے ساتھ مطالعہ بھی ہے۔ جس میں مرتب نے حوالجات، حواشی اور تحقیقی تراکیب و اسلوب کے ساتھ علوم شرقیہ سے متعلقہ رموز و نکات پر اچھے انداز سے اظہارِ خیال بھی۔

قصرِ علم کے مقدمے میں خشک مضامین اور تحقیق و تنقید و تنقید اور خطاطی کے جملہ کمالات پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کا پیش لفظ مولانا منظور الحسن برکاتی کے قلم جادو رقم کا ممنونِ احسان ہے۔ راجستھان سرکار کے چیف سکریٹری جناب موہن لال کرشن جنوریٹ کا پیش گفتار اختصار کے باوجود جامع اور بلیغ ہے۔ "قصرِ علم" ایسی کتاب ہے جو ہر لائبریری میں ہونی ضروری ہے۔ یونیورسٹیوں کی لائبریریوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ قیمت مجلد چالیس روپیہ۔ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی راجستھان۔ ٹونک راجستھان سے طلب کیجئے۔ یا دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے فرمائش کی جاسکتی ہے۔

مثنوی مجاہدینِ غدر: جنابِ متین بدایونی نے واقعاتِ غدر کو مختصراً منظوم کیا ہے۔ یہ مثنوی قابلِ مطالعہ ضرور ہے مگر اس کی چھپائی اور کتابت اس قدر بھدّی ہے کہ ذوقِ سلیم کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ مثنوی کے مطالعہ سے چند نام ایسے بھی سامنے آئے جن کا حالاتِ غدر میں نام تک نہیں پڑھا۔ مثنوی صنفِ شاعری کی ایک اچھی خاصی مشکل صنف ہے مگر متین صاحب ایک حد تک اس کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ویسے فنی خامیاں متین صاحب کے ہاں پائی جاتی ہیں، جو اس مثنوی میں بھی موجود ہیں۔ ۵۶ صفحات کا یہ کتابچہ پانچ روپیہ میں متین بدایونی۔ نظیر بلڈنگ۔ کوہلی واڑہ۔ کلیان۔ مہاراشٹر سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ قیمت باوجود گرانی کے نامناسب حد تک زیادہ ہے۔

آوارہ احساس: ہمراہ کاشمیری کی ۵۸ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ کئی کہانیاں تو ایک یا دو سطروں میں ہی وہ سب کچھ سموئے ہوئے ہیں جو کسی طویل کہانی میں ہوسکتا ہے۔ ہمراہ کا طرزِ بیان بھی کچھ الگ تھلگ ہے۔ جناب جوگندر پال کا پیش لفظ ہے۔ ضخامت ۱۴۸ صفحات۔ قیمت دس روپیہ۔ لکھائی چھپائی انتہائی معمولی۔ ہمراہ دارالاشاعت سید کریم۔ بارامولا (کشمیر) ۱۹۳۱۰۱ سے رجوع کیجئے۔

تشریح الہیکل (خلاصہ تشریح) حصہ اوّل

ڈاکٹر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی ایک اردو داں سائنس داں کی حیثیت سے اپنا ایک مقام رکھتے ہیں گزشتہ چوتھائی صدی سے وہ زبانِ اردو سائنس کی خدمت میں کوشاں ہیں۔ انشا

جوان کی علم تشریح پر ایک بہترین تالیف ہے۔ طبیہ کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اب انھوں نے مفصّلہ تشریح لکھ کر ہماری علمی دولت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع وصفی تشریح ہے جسے انگریزی میں "ڈسکرپٹیو اناٹومی" کہتے ہیں۔ اور اردو میں ہم اسے "تشریح نظامی" کہہ سکتے ہیں۔ زیر نظر حصہ اوّل انسان کے عظام، مفاصل اور عضلات کی تشریح پر مشتمل ہے۔ اصطلاحات کے سلسلہ میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ عربی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ لاطینی اور یونانی اصطلاحات بھی لکھ دیئے گئے ہیں تاکہ جو طلبا عربی سے ناواقف ہیں وہ بھی سمجھ سکیں۔ قابل مصنف نے حسب موقع و محل تشریحی تصاویر بھی دی ہیں۔ یہ کتاب ایسی زبان میں لکھی گئی ہے جو آجکل کے اردو داں طلبا بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ طرز بیان علمی ہونے کے باوجود خشک نہیں ہے۔ قیمت گیارہ روپیہ ضخامت ۲۱۲ صفحات۔ ترقی اردو بورڈ یقیناً مبارکباد کا مستحق ہے جو ایسی مفید کتابیں شائع کر کے اردو کی اہمیت کو بڑھا رہا ہے۔ ترقی اردو بورڈ۔ ویسٹ بلاک ۸۔ آر کے پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲ سے یا دفتر شان ہند سے یہ کتاب دستیاب ہے۔

اردو کی کہانی

سید احتشام حسین (مرحوم)

کی یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی اس کے بعد کئی ایڈیشن اور بھی چھپے۔ اب ترقی اردو بورڈ نے اسے اپنی روایات کے مطابق واقعی ایک بہترین کتاب کی شکل میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں یا تھوڑی بہت اردو جاننے والوں کے لئے اس لئے مفید ہے کہ وہ اس کے مطالعہ سے اردو کی تاریخ سے واقف ہو جاتا ہے۔ اس وقت جبکہ قومی یکجہتی کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مختلف زبانیں بولنے والے ایک دوسرے کے قریب آئیں گے۔ اس کتاب میں امیر خسرو سے لیکر ڈاکٹر عابد حسین تک ۱۴ مشہور اور مسلّمہ اردو کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں، افسانہ نگاروں کی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ اور مجموعہ مختلف عنوانات میں اردو کی کہانی کو سمویا گیا ہے ضخامت ۱۴۰ صفحات۔ یہ کتاب ترقی اردو بورڈ۔ ویسٹ بلاک ۸ آر کے پورم نئی دہلی ۲۲ یا دفتر شان ہند سے مل سکتی ہے۔ قیمت پچیس پیسے۔

ہندوستانی مصوّری (ایک خاکہ)

ڈاکٹر انیس فاروقی کی بنائی ہوئی تصاویر پر کئی انعامات مل چکے ہیں۔ انھیں مصوّر کی حیثیت سے اپنی ملیں پینٹنگ سے انعام بھی مل چکا ہے۔ اور کئی شہروں میں ان کی تصاویر کی نمائشیں بھی ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کی اردو میں پہلی کتاب ہے جسے انھوں نے تین خصوصی ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ قرون اولیٰ کے بیان میں وہ ابتدائی مصوّروں کے گپھاؤں اور ان کی دیواری تصاویر اور مینا تور مصوّری کی ابتدا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قرون وسطیٰ میں پٹھانوں اور مغلوں کے دور میں جس طرح فن مصوّری کا عروج ہوا اس کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور قرون جدید میں فرنگی اثرات اور دور حاضرہ کے نئے رجحانات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ زبان سلیس اور عام فہم ہے۔ نہ صرف تاریخی واقعات کا قابل یقین اور صحیح رُخ پیش کیا گیا ہے بلکہ جدید تحقیقی مقالوں اور مختلف نظریات و فکر سے بھی روشناس کرایا گیا ہے۔ ہندوستانی مصوّری کے ۱۸ منتخب نمونے بھی کتاب کی اہمیت کو بڑھاتے ہوئے ہیں قیمت دس روپے جو یقیناً کم ہے۔ ترقی اردو بورڈ، ویسٹ بلاک ۸ آر کے پورم نئی دہلی ۲۲ یا دفتر شان ہند سے دستیاب ہے۔

اقبال (جادوگر ہندی نژاد)

اس بیسوی صدی کے ۲۰ ویں دہائی میں شروع ہے سے اب تک اقبال کی شاعری کے تقریباً تمام پہلوؤں (بلکہ ایسے پہلو بھی تلاش کئے گئے ہیں کا وجود ہی نہیں تھا) پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے۔ برصغیر ہند کے کسی شاعر کے بارے میں شاید ہی لکھا گیا ہو۔ اس کتاب میں رفیق صدیقی نے اقبال کی شاعری کی روشنی میں ان کے سیاسی افکار و اعمال کا جائزہ دس مضامین میں لیا ہے کتاب کے آخر میں شیخ عبدالقادر اور مولانا محمد علی کے دوام اور تاریخی نوعیت کے مضامین بھی ضمیمہ کے طور پر شامل کئے گئے ہیں۔ زیر نظر کتاب اس لحاظ سے قابل مطالعہ ہے کہ اس میں اقبال کے سیاسی افکار و اعمال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کی ضخامت ۱۷۰ صفحات ہے۔ اور قیمت چودہ روپیہ۔ ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ یا دفتر شان ہند سے خریدی جا سکتی ہے۔

(باقی صفحہ ۳ پر)

"خفیہ پلان"

نرگس سہوانی

سنا ایک ایسا "کیس" آیا آج جج کے روبرو
مدعی جج سے یہ بولا سنیے میری گفتگو

ہو گئے شادی کو میری آج پورے دس برس
خواہشِ اولاد میں پہنچا بریلی تا ترس

آخرش اک دن سے گولی ملی اولاد کی
پھر کلی کھلنے لگی میرے دلِ ناشاد کی،

پھر کہا بیوی سے اب لڑکا نہ پاؤں گا اگر
جبر یہ پہنچاؤں گا تجھ کو ترے ابا کے گھر

میرے کہنے پر اگر کرتی مری بیوی عمل
دوستوں میں پھر مجھے ہونا نہیں پڑتا خجل

اس نے لڑکی کو جنم دے کر یہ ڈالا ہے نفاق
مجھ کو لازم ہے کہ دیدوں آج ہی اس کو طلاق

سن کے یہ روداد جج صاحب نے عورت کہا
سچ بتا اس "کیس" میں تیری ہے کس حد تک خطا

ولی یہ سن کے عورت کہ اس کا جھوٹ ہے سارا کلام
خود تو ناکارہ ہے اور رکھتا ہے سب مجھ پر الزام"

عائیں اس نے گولیاں معجون بھی کیپسول بھی
پھر بھی باغِ زیست میں پیدا نہ کر پایا پھول

ں نے سوچا گھر میں اک تصویر ہونی چاہیئے
یعنی اب خفیہ کوئی تدبیر ہونی چاہیئے

پنے ہمسائے سے میں نے کہہ دیا سب ماجرا
اُس نے سینے سے مجھے بے ساختہ لپٹا لیا

کامیابی کی طرف آخر بڑھا میرا "پلان"
نو مہینے بعد گھر میں آ گئی ننھی سی جان

میں اگر رہتی اسی کے آسرے میں آج تک
تب نہ ہوتی عمر بھر اس گھر میں ڈھولک کی دھمک

سن کے عورت کے دلائل جج نے فوراً یہ کہا
تو نہیں مجرم تجھے بے داغ چھوڑا جائے گا



خون رستا ہے

شاعر مبارک پوری

جب میں باتھ روم سے غسل کر کے نکلا تو تولیہ گردن پر پڑا ہوا تھا۔ قدِ آدم آئینے کو صاف کرتا ہوا کرسی کے پاس جا کھڑا ہوا اور تولیے سے سر کے بھیگے بالوں کو خشک کرنے لگا۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔ آسمان کی نیلاہٹ اور ہلکی دھوپ اس وقت بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ نسیم صبح کے معطر جھونکے چل رہے تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ لیکن میرا دل اداس تھا۔ میری نظر سامنے والی کوٹھی کی طرف اٹھ گئی جس میں چند انگریز آکر بس گئے تھے۔ اور اپنے بچوں کو کیاریوں میں ٹہلا رہے تھے۔ مگر اب مجھے اس کوٹھی سے کچھ دلچسپی نہ رہی تھی۔ صرف سابق مکینوں سے میرا ماضی وابستہ تھا۔ ماضی کی تلخ یادوں سے میرا ذہن جھنجھنا اٹھا۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

میں وہاں سے ہٹ آیا اور کنگھا لیکر آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ جب آئینے میں اپنے عکس پر نظر پڑی تو میرے لبوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ جھلک کر ماند پڑ گئی۔ مجھے اپنی ہی بے ترتیبی پر ہنسی آ رہی تھی۔ میں بے پرواہ ہو گیا تھا۔ میرے الجھے ہوئے بال جو تیل سے بے نیاز تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی۔ پژمردہ آنکھیں اور لبوں پر پھیکا تبسم جو میری حالت پر ہنس رہا تھا۔ مجھ میں پہلے سے کافی تبدیلی آ گئی تھی مجھ پر بے انتہا مظالم ڈھائے گئے تھے۔ مجھے ذکر صدمہ، فکر اور غم سب ہی کچھ ملا۔ کبھی خوشی اور راحت کبھی میسر نہ ہوئی۔ دنیا والوں نے مجھ پر طنز کیا اور میں اسے تلخ گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔ قسمت نے مجھے لوٹا۔ مجھ پر قہقہے لگائے گئے۔ مجھ سے محبت بھی کی گئی اور نفرت بھی۔ یہاں تک کہ میری ہر آرزو نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا میرے خواب ٹوٹ گئے۔ مگر اب ظلم و ستم نہ سہہ سکوں گا۔ کیونکہ میرا ناسور پھٹ چکا ہے۔

چائے خانے میں ناشتے کے لئے پہنچا۔ میں نے صوفے پر بیٹھ کر دھوتی کے مرغولے کو چھت کی طرف چھوڑتے ہوئے کہا "ناشتہ میز پر لگا دو جلدی"

"کہاں رکھوں صاحب؟" بیرے نے میز کی طرف اشارہ کیا میں جھینپ گیا۔ کیونکہ میز پر کتابوں اور رسالوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں نے ان سب کو دوسرے صوفے پر ڈال دیا۔ بیرے نے میز پر ناشتہ چن دیا۔ اور خالی ٹرے لیکر چلا گیا۔ سگریٹ ایش ٹرے میں ڈال کر ناشتہ کرنے بیٹھ گیا۔ توسٹ اور انڈا کھانے کے بعد چائے کی پیالی اٹھائی۔ کپ سے چائے کی بھینی بھینی خوشبو بھاپ کے ساتھ اٹھ رہی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ بھاپ میرے ہی زخم خوردہ دل سے نکل رہا ہے۔ لہراتی اور بل کھاتی ہوئی بھاپ کی لکیروں میں مجھے میرا ماضی نظر آ رہا تھا۔ گزرتے ہوئے واقعات سینما کے متحرک تصویروں کی طرح یکے بعد دیگرے نظروں کے سامنے آنے لگے۔

اس دن جیسے ہوا کا نام نشان تک نہ تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ بارش ہوئے تین چار دن ہو چکے تھے۔ دھوپ کی تیزی کی وجہ سے دن میں باہر نکلنا مشکل ہوتا اور رات گئے تک گرمی سے طبیعت پریشان ہو جاتی۔ اس دن بھی رات میں غیر معمولی گرمی تھی۔ کپڑوں سے خارج ہونے والی پسینے کی بدبو سے دل گھبرا جاتا۔ بدن گرمی سے جل رہا تھا۔ میں تنہا لحاف کی لذت میں کھوئے بیٹھ گیا کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر میں خوشگوار ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آنے لگے اور ہوا کا ایک جھونکا فرحت بخشنے لگا۔ میرا کمرہ اس ہوا کے جھونکے سے مہک اٹھا۔ پسینے سے تر ہو گیا تھا۔ گرمی برداشت سے باہر تھی۔ مگر کھڑکی سے گزر کر آنے والی خنک ہوا میں دل کو فرحت بخش رہی تھی۔ میں لکھتا جا رہا تھا۔ ...

گی۔ جب [illegible] تو
[illegible]
[illegible] پھر ٹھیک [illegible] گیا
[illegible] لیکن تلاش سے مجھ کو
[illegible] کر لی پھر [illegible]
[illegible] وائلن سے سرور کی [illegible]
[illegible] چاندنی [illegible]
اور وائلن کی آواز [illegible] اس کمرے سے [illegible] چاندنی کو سکڑنے
پر مجبور کر رہا تھا۔ سب [illegible] جیسے [illegible] تھا
اچانک ہوا کا ایک جھونکا آیا اور سب کچھ پھر [illegible] لہرانے
لگا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو روزانہ صبح کے وقت معلوم
نہیں کہاں جاتی ہے اور پھر گھنٹے آدھ گھنٹے بعد واپس آجاتی ہے
اس کے ہاتھ میں ہمیشہ وائلن ہوتا ہے۔

آہستہ آہستہ وائلن کی آواز تیز ہوتی جارہی تھی۔ ایسا
محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی چاندنی کی پیالی میں شہد
گھول رہا ہو۔ اس مسحور لمحے میں کھو کر نہ جانے کب میری آنکھ
لگ گئی۔ [illegible] اس وقت جاگا جب میرے کانوں میں چڑیوں
کے چہچہانے [illegible]۔ مشرق کی طرف آسمان سورج کا لال سا
گولا [illegible] رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور میرے ان
کے بکھرے ہوئے اوراق کو قرینے سے سجانے لگا۔ جالو نے
آکر اطلاع دی کہ غسل کا پانی تیار ہو گیا۔ جب غسل کر کے
[illegible] ناشتہ لے کر آیا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے
سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالی اپنے ہونٹوں میں
دبا کر لائٹر سے سلگایا۔ پھر کھڑکی میں کھڑا ہو کر باہر کے دلفریب
منظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔ میں نے دور ہی سے اسے
آتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں وائلن لئے خراماں چلی
آرہی تھی۔ اس کا سڈول اور متناسب جسم [illegible] جوانی سے
سرشار تھا۔ اس نے سرخ ساڑھی باندھ رکھی تھی اس کا
بلاؤز بھی سرخ تھا۔ ہوا کے گستاخ جھونکے اس کے گھنگھریالے
بالوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ سے بالوں کو درست
کرتے کرتے تھک گئی۔ اس کی چال میں بلا کی قیامت تھی وہ گویا

[illegible] دیکھ کر [illegible]
[illegible]
[illegible] بھٹکایا۔ یہ غیر ضروری بات آئی گئی اور ختم ہو گئی۔
اس کے اس طرح اشارہ کرنے سے کیا مطلب تھا۔ مجھے اس بات
کی کرید سی لگ گئی۔

تیسرے روز [illegible] کے پاس کیا نمبر [illegible] تھی۔ چنانچہ میں
نے فون کے ذریعے [illegible] اپنا ارادہ [illegible]
پہچاننے کیلئے اس کی کوٹھی کے نیم پلیٹ (NAME PLATE)
پڑھ کر ٹیلیفون ڈائریکٹری سے اس کا نمبر تلاش کر کے رنگ
کیا۔ ریسیور کسی نے اٹھا لیا تھا۔

"کون صاحب بول رہے ہیں" اس کی آواز کی کھنک، جیسے دور کسی نے
بربط کے تار چھیڑ دیئے ہوں۔

"جی، میں آپ کی کوٹھی کے سامنے والی بلڈنگ میں رہتا
ہوں۔"

"اوہ تو آپ ہیں" اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دوسری
طرف اس کے گالوں پر حیا کی سرخی دوڑ گئی ہو۔

"ابھی ابھی آپ مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہی تھیں۔
آخر بات کیا ہے؟"

"ذرا ٹھہریئے" اُدھر کچھ دیر خاموشی رہی پھر آواز آئی
"میرے والد صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیجئے ان سے
گفتگو کیجئے۔"

اس نے یہ کہہ کر ریسیور اپنے والد صاحب کو دے دیا۔ ایک
بھاری سی آواز آئی "ہیلو! کیا شکیب بھائی بول رہے ہیں؟"

"جی ہاں - جی ہاں"

"شکیب صاحب۔ آپ کے والد کیا کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں؟"

"جی وہ [illegible] گئے ہوئے ہیں اور آج کل ہی میں آجائیں
گے۔"

"میں اور آپ کے والد بڑے اچھے دوست ہیں آپ کو شاید
معلوم نہیں۔ آپ تھوڑی دیر کیلئے یہاں آجائیں۔"

"جی اچھا۔ ابھی حاضر ہوا۔"

کریڈل پر ریسیور رکھ کر میں لباس تبدیل کرنے لگا

جلدی جلدی زینے طے کر کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا۔ وہ
برآمدے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی [illegible]
اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے کوٹھی میں داخل ہو گئی
ڈرائنگ روم میں ایک شخص کاؤچ پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ
میں پائپ تھا جس میں سے دھواں نکل نکل کر فضا میں
گم ہو رہا تھا۔ اس کے بال کچھ سفید ہو چکے تھے۔ غالباً
شاہین کے والد تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بڑے تپاک سے ملے۔
"بیٹھو بیٹھو۔" انھوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا
میں بیٹھ گیا۔ وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔
"شاہین کئی دنوں سے تنگ کر رہی تھی کہ آپ سے ملا
دوں۔ یہ آپ کے افسانے پڑھا کرتی ہے۔ کسی سے سن لیا کہ آپ
وہ شکیب جلالی ہیں جو افسانے لکھا کرتے ہیں۔" بس پھر کیا
تھا۔ میری ناک میں دم کر دیا کہ آپ سے تعارف کرایا جائے۔"
میں نے مسکراتے ہوئے بیٹھی ہوئی شاہین پر نگاہ ڈالی۔ اس
کی شرم سے بوجھل پلکیں میری طرف اٹھیں اور پھر جھک گئیں
اس کے لبوں پر بھی دبی دبی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔
"اچھا بھائی۔ تم دونوں گفتگو کرو۔ میں بزنس کے
سلسلے میں ایک صاحب کو فون کر کے ابھی آیا۔" شاہین
کے والد یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر چلے گئے۔
"اچھا تو آپ میرے افسانے پڑھا کرتی ہیں؟ [illegible]
مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔"
"میں ایک بات پوچھنا چاہتی تھی۔" وہ آنکھیں جھپکاتی ہوئی
بولی۔ "آپ کے ہر افسانے کا انجام ٹریجڈی پر کیوں ہوتا ہے؟
کیا سارے جہاں کا درد بس آپ ہی کے جگر میں ہے۔" ان کی آنکھوں
سے شوخی ظاہر ہو رہی تھی۔
"اس لیے کہ میں ہمیشہ ٹریجڈی سے دوچار رہتا ہوں۔" میں
نے مسکراتے ہوئے کہا۔
[illegible] تجربات نے کیا کیا سکھایا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کرتا ہوں [illegible] قدر [illegible]
کیا [illegible] ہے۔
میری بات ابھی [illegible] نہیں ہوئی تھی کہ [illegible]
ان کے پیچھے ایک بیرا ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے لیے ہوئے تھا
اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ شاہین چائے بنانے لگی۔ پھر اس
کے والد نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے
کہا۔
"بھئی پرسوں شاہین کی سالگرہ ہے۔ ضرور تشریف لائیں [illegible]
سے [illegible] کر رہا ہوں۔" دعوت کا وقت [illegible] تھا۔
میں نے چائے ختم کی اور سالگرہ پر حاضر ہونے کا وعدہ
کر کے چلا آیا۔
شام کی سرخی [illegible] پھیل رہی تھی۔ شاہین کا گھر دلہن
کی طرح آراستہ تھا۔ رنگ برنگے بلب [illegible]
کی طرح جل بجھ رہی تھیں۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] میرا استقبال [illegible]
[illegible] پیکٹ میں نے اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اس نے مجھے
ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر [illegible]
ہوئی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ بیرا کچھ مٹھائی اور شربت کے دو
گلاس ہمارے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ ہم [illegible] مٹھائی کھانے کے
بعد شربت سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ شاہین کے والد
داخل ہوئے اور مجھے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے بولے
"بھئی شکیب خدا جانتا ہے کہ تمہارے آنے سے بڑی خوشی
ہوئی۔" پھر شاہین کی طرف متوجہ ہوئے "چلو بیٹی مہمان
تمہارے کیک کاٹنے کے منتظر ہیں۔"
اس نے میری طرف [illegible]
چلی گئی۔ [illegible] آپ بھی [illegible] ان کے والد [illegible]
ہوئے [illegible]
جب وہ [illegible] حیرت [illegible]
[illegible]
[illegible]

سُننے والے ہکا بکا بنے بیٹھے تھے۔ بعض سر دُھننے لگے
بعض وقفہ شدہ شیدہ کو کہہ کر ہمہ تن گوش ہو گئے تھے۔ ہیروں
کا تذکرہ شاہین پر کیا ہونے نہیں۔ وائلن بجاتے ہوئے اس کا
چہرہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے گلدان میں رکھا ہوا گلاب
کا پھول مسکرا رہا تھا۔ جب وائلن کی غیر فانی دھن ختم ہوئی
تو سامعین نے تالیوں کی پُرشور آواز میں شاہین کو داد دی
اور میں نے اس کی تعریف میں صرف اتنا کہا۔
"آپ کے وائلن کی دھن میری روح کی گہرائیوں میں اُتر گئی۔"
"شکریہ" اس کے متبسم ہونٹ پھر پھیل گئے اور گالوں کی سرخی
دوہری ہو گئی۔

ہلکی پھلکی چاندنی کائنات پر اپنی خواب آور چادر پھیلا
رہی تھی۔ گہرے نیلگوں آسمان پر چھوٹے چھوٹے سفید سفید شگوفوں کے
درمیان چندا آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ ہمارا مستقبل [illegible] رہی
تھی ہم دونوں خواب دیکھ کر لوٹ رہے تھے پہلے دن کی ملاقات نے
بہت کم از کم ہر روز ہماری ملاقات ہونے لگی تھی۔ کبھی وہ
یہاں آ جاتی کبھی میں اس کے یہاں چلا جاتا۔

سڑک کی خنکی اور سرد ہوا نے شاہین کے ترا شیدہ بال
اس کے شانے پر بکھیر دیئے اور خوشبو کی تیز مہک میرے
نتھنوں سے ہوتی ہوئی دماغ کو معطر کرنے لگی۔ کولتار کی
لمبی سیاہ اور بل کھاتی ہوئی سڑک جیسے سانس روکے ہوئے
لیٹی تھی۔

"آج موسم کتنا خوشگوار ہے" اس نے آسمان پر آنکھ مچولی
کھیلتے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر کہا۔
"ہاں" [illegible] "ہر ذرہ [illegible] گنگنا رہا ہے۔"
"کتنا حسین ہے موسم کتنا حسین منظر ہے"
اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔
"کیا بات ہے آج بڑے موڈ میں نظر آ رہے ہو؟"
"اس لئے کہ ایک حسین ہمسفر ساتھ ہے۔ جس کے حسن سے
شرما کر چاند بھی اپنا منہ بادلوں میں چھپا رہا ہے۔ موسم نے
گنگنانے پر مجبور کر دیا ہے اور ..."
"بس بس رہنے دیجئے۔ باتیں بنانا خوب آتی ہیں۔

[illegible] بھی یہ باتیں بھی تو ہیں۔ مگر حقیقت یہ
ہے [illegible] ہو رہا ہے"

"کچھ حسن کے نغمے یہ سنا دیتے ہیں
جب یہ ہم آئیں تو تاروں کو جھکا دیتے ہیں"

اس نے شرما کر سر جھکا لیا مگر [illegible]
[illegible] شب بخیر کہا۔ سگریٹ کا آخری کش لگا کر
ٹکڑے کو جوتے سے مسل دیا اور گھر واپس آ گیا۔

کچھ لمحے میں نے [illegible] لیا اور سگریٹ کے
لمبے لمبے کش لگائے۔ سگریٹ کا پیچ و تاب کھاتا ہوا دھواں
ابھی فضا میں اچھی طرح تحلیل نہ ہوا تھا کہ شاہین آ گئی۔ اس
کی سحر کار آنکھوں کے گرد تفکرات اور غم و الم کی لکیریں واضح
جھلک رہی تھیں۔ گھنی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے لرز رہے تھے۔
"کیا بات ہے شاہین؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔
"شکیب۔" اس کی آواز شدتِ غم سے لرزنے لگی۔ "ڈیڈی
میری شادی کر رہے ہیں۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"کس سے؟"
"مجھے نہیں معلوم وہ کون ہے۔ صرف اتنا پتہ چل سکا ہے
ڈیڈی اس کے والد کے دوست ہیں۔ آج سے پندرہ دن
بعد شادی ہو جائے گی۔ مگر میں زہر کھا لوں گی — مر جاؤں گی
کسی دوسرے کی نہ ہوں گی۔"
"ہشت۔ پاگل ہوئی ہو کیا وہ جو کچھ کر رہے ہیں تمہاری
ہی بھلائی کے لئے۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
تھامتے ہوئے کہا۔
"بھلائی — ہونہہ۔ اگر انہیں اتنا ہی خیال تھا تو
پسند بھی پوچھتے۔" وہ جیسے بپھر گئی۔
"تم لوگ روتی کیوں ہو۔ شادی میں ابھی پندرہ دن
باقی ہیں اس عرصے میں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ [illegible]
[illegible] میں ان کے [illegible]
[illegible]" میں نے
اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
لیکن خیال خام نہ ہو [illegible]

ہو جاؤں۔" اس کی آنکھوں سے رم جھم برسنے لگی۔ وہ مجھ سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگی۔ میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ دل میں آنے والے اندیشے کے تحت چونک اٹھی۔ وہ مرنے کے حال سے اسے تسلی دی اور گھر چھوڑ آیا۔

میں صوفے پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ کھٹ کی آواز سن کر پیچھے دیکھا۔ ابا جان کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"آپ نے بڑی دیر لگا دی ابا جان۔" میں اٹھتے ہوئے بولا۔

"کام ہی کچھ ایسا تھا۔" انھوں نے کہا۔ "پھر اسی دوران میں چپکے چپکے تمہارے سر پر سہرا باندھنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔"

"جی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ارے بھئی۔ سامنے والی کوٹھی میں میرے بچپن کے دوست رہتے ہیں۔ ان کی لڑکی شاہین سے تمہاری شادی کی بات طے کر دی ہے۔ وہ بہت ہی سلیقہ مند لڑکی ہے۔ امید ہے کہ میری پسند سے تمہیں اختلاف نہ ہوگا۔"

مجھے اپنے حلق میں کوئی چیز پھنستی ہوئی محسوس ہوئی۔ تو گویا شاہین کے ڈیڈی میری شادی کی بات شاہین سے طے کر رہے تھے۔ اگر شاہین کو یہ بات معلوم ہو جائے تو پھر؟ شاید وہ شرما کر گھٹنوں میں سر چھپا لے گی۔ یہ سوچ کر خوشی سے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

"تم نے کچھ جواب نہیں دیا بیٹا۔"

"جی۔ بھلا مجھے کیا اختلاف ہو سکتا ہے۔" میں نے سر جھکائے جواب دیا۔ یہ سن کر انھوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اور شادی کے انتظام میں لگ گئے۔

شادی بڑے دھوم دھام سے ہو گئی۔ مجھے شاہین کیا ملی زندگی مل گئی۔

میں نے اس کے آنچل تلے زندگی کی نئی صبح دیکھی۔ اس کے نقرئی لب پر ہر وقت تبسم رقصاں رہتے۔ جیسے سنہرے بچپن کی مست لے میں کلیاں چٹک رہی ہوں [illegible] رہا تھا مگر ایک دن ایسا حادثہ ظہور پذیر ہوا جیسے ستاروں کا دل ہی ٹوٹ گیا۔ آسمان رو دیا۔ دھرتی کا کلیجہ دہل گیا۔

شاہین [illegible] کہ اس کا پاؤں زینے سے پھسل گیا۔ وہ لڑھکتی ہوئی نیچے آ رہی۔ اس کا سر [illegible] گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ جلدی جلدی ڈاکٹر بلایا گیا۔ [illegible] کے بعد ہوش میں آتے ہی اس نے مجھے پکارا۔ میں اس کے قریب گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے شاہین؟"

"آپ کہاں ہیں؟ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔" وہ چیخ پڑی۔ "میری آنکھیں۔ کیا ہو گیا ان کو؟" میرا دماغ جیسے ماؤف ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کیا شاہین اندھی ہو گئی۔ اُف یہ کیا ہو گیا!؟

ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں کا معائنہ کر کے مجھے کنارے لے جا کر کہا۔

"مسٹر شکیب! آپ کی [illegible]، زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے آپ کی بیوی کی آنکھیں جا چکی ہیں۔" یہ سن کر میری چیخ حلق میں پھنس گئی۔ دل تڑپ کر رہ گیا۔ آخر میں تقدیر کے آگے کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کے لئے کئی جتن کئے مگر سب بیکار۔

میں نے اسے شہر کے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ مگر کوئی بھی اس کی آنکھوں کی جوت واپس نہ لا سکا۔ وہ ہر وقت گم سم سی رہتی۔ نہ ہنستی نہ بولتی بس سوچتی چلی جاتی۔ میں جب اسے ٹوکتا تو الٹے مجھ سے سوال کرنے لگتی۔

"کیا میری آنکھیں دوبارہ اچھی نہ ہو سکیں گی۔ کیا میں ہمیشہ کی اندھی ہو جاؤں گی؟"

اور میں اسے دلاسا دیتے کہتا: "گھبراؤ نہیں شاہین۔ خدا نے چاہا تو تمہاری آنکھوں کی جوت لوٹ آئے گی۔"

وہ خلا میں یاس و امید کی کرن ڈھونڈنے لگتی۔ اس کے معصوم حسن سے کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی مرجھایا ہوا پھول موسم بہار کی آس لگائے بیٹھا ہو۔

اسے کلکتے کے میڈیکل کالج میں داخل کرا دیا جہاں اس کی آنکھوں کا آپریشن بھی ہوا۔ مگر نوشتۂ تقدیر اس کی آنکھوں کی روشنی لوٹ نہ سکی۔ چاند سا چہرا [illegible] گیا۔ وہ ہر وقت [illegible] رہتی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے [illegible] کائنات کے [illegible] سب بیکار۔ اس کی آنکھوں کو [illegible]

چھوٹ موٹ کرنے کی سوجھ آئی۔

ایک دن میں کمرے کے پاس بیٹھا ایک افسانہ لکھ رہا تھا۔ وہ [illegible] میرے پاس آئی اور بولی کیا کر رہے ہو؟

افسانہ لکھ رہا ہوں۔

ایک خوشخبری سنو گے؟ اس نے مسکراتے ہوئے کہا جس میں شرم و حیا بھی جھلک رہی تھی۔

اوہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ میں نے پیار سے اس کے دونوں ہاتھ ہاتھ میں لے لئے اس نے شرماتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے میرے کان میں آہستہ سے کہا جسے سنتے ہی میں خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اور اسے گود میں اٹھا کر پورے کمرے میں ناچنے لگا۔

گھر میں نئے مہمان کی آؤ بھگت کے لئے پہلے ہی سے تیاریاں ہونے لگیں۔ دن گزرتے گئے۔ جیسے گزرتے گئے آخر وہ دن بھی آ گیا .... ڈلیوری کا وقت۔ اس دن میں نے نہ جانے کتنے ہی جھلتے ہوئے معلوم نہیں کتنے سگریٹ پھونک ڈالے۔ کبھی اُدھر اِدھر یونہی ٹہلنے لگتا کبھی غیر ارادی طور پر کرسی میں دھنس جاتا۔ میرے کان نرس کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ جو کچھ کچھ دیر بعد آ کر زچہ کی خیریت کی خبر دے جاتی۔ اماں اور شاہین کے لیڈی نرس پریشان تھے۔ ڈیڑھ بجے کے قریب لیڈی ڈاکٹر گھبرائی ہوئی باہر آئی اور شہر کے بہترین ڈاکٹر مسٹر گھوش کو فون کرنے کو کہہ گئی۔

میرے فون کرنے کے تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر گھوش آ پہنچے۔ لیڈی ڈاکٹر انہیں اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ آدھ گھنٹہ بعد جب وہ نکلے تو ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ میرے قریب آ کر دھیرے سے بولے: مسٹر شکیب مجھے بے حد افسوس ہے میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکا ... بھگوان کی اچھا!

شاہین چل بسی بچہ چھوڑ کر۔ یا خدا یہ تو نے کیا کیا؟ کیا تو نے مجھے اس لئے یہاں بھیجا تھا کہ … میرے پیار کا سہارا … وہ شمع بجھ گئی جس سے گھر کی رونق تھی … میرا دماغ چکرا گیا تھا لیکن زبردست مخلوق ہم کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

میں اپنے انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا … کہ ایک چھناکا سا ہوا اور چائے کی پیالی ہاتھ سے چھوٹ پڑی … بھاگا ہوا اندر آیا۔

کیا ہوا صاحب؟ اس نے انگوچھا کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

کچھ نہیں ... کچھ نہیں کپ ٹوٹ گیا ہے ... میں یہ کپ کے ٹکڑوں کو اٹھانے لگا تھا کہ ایک تیز کرچ انگلی میں چبھ گئی۔ اور سرخ سرخ خون رسنے لگا۔ بھالو نے میری پٹی باندھنا چاہی۔ مگر میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ زخم دیکھ کر میں سوچنے لگا۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے میرے زخم کھل گئے ہوں اور ان سے … کوئی بات نہیں ہو … شاید یہ خون یونہی رستا رہے؟

بقیہ: بڈھی	صفحہ … سے آگے

دن اس کی صفائی کی جاتی ہے۔ جب میں اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھتا ہوں تو مجھے تمہارے اس لباس کی یاد آ جاتی ہے جس کو اوڑھتے ہوئے کتنی سردیاں بتا دی ہیں۔ یہ گھنٹوں بیٹھ کر مجھے کیسے موٹا ہونے دے … اچھی طرح سے … کرتے … رات بھر روتا رہتا ہے تو کبھی بھگوان کو … کہتا ہوں اور … کو کوستا ہوں۔

وہ کتا روز صبح انڈا اور بسکٹ کھاتا ہے دوپہر کو گوشت اور روٹی کھاتا ہے شام کو پھل کھاتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ ایک ہی خشک روٹی اور چٹنی مل جاتی ہے۔ تو بھگوان کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس کتے کے مزاج و نخرے کی اگر … تو … کر چھوڑ دیتا ہے اور زبان کے چٹخارے کو … کبھی … سے جھکے … دونوں ٹانگیں کندھے پر رکھ کر بلانے لگتا۔ … سب کچھ … یقین نہیں …

میں تمہیں … کیا صاحب …

بندھی

(ڈاکٹر [illegible])

۔ کیوں جی ؟

۔ کیا بات ہے !

دیکھو ریوت جب کسی چیز کی ضد کرتا تھا تو کا ... ہے ہونے چھٹے بھی کہیں نہ کہیں سے لاکر اس کی خواہش پوری کی ... تھی۔ اور اسی بہانے تمہارا بھی شوق پورا ہو جاتا تھا۔ جب ... ماں سے سیکھ کے گھر لوٹ کر آگئے ہو تب تم نے تہوار ... منانے بھی چھوڑ دیئے۔ صحیح بات ہے کہ گھر کی خوشی بچوں سے ہوتی ...

۔ ایسا ہے۔ سچ تہوار نہ منانے کی وجہ ریوت نہیں تم ... جب ... تہوار آتا ہے تو کہہ دیتے ہو، مزا تو ہے نہیں، اچھا کھانا بنا کر ... کیا کرو گی۔ ریوت کے بنا تو میرے حلق سے اترے گا نہیں۔ اسی ... بعد اسی سال بیت گیا۔ تم نے کوئی تہوار نہیں منانے دیا اور آج ... یہی کہہ رہے ہو جیت بھی اپنی رکھتے ہو اور پیٹ بھی اپنی۔

۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ ریوت کی ماں ہمارا تمہارا اچھا کھانا اور اچھا ... پہننا اوڑھنا بیکار ہے۔ بچوں کی خوشی میں ماں کی آتما خوش ہو جاتی ... ۔ سر ہمارا بچہ خوش ہے۔ اب اسے کسی طرح کا کوئی دکھ نہیں ہے۔ اب وہ ... اپنے گھر میں رہ رہا ہے کہ اسے ہر طرح کا آرام حاصل ہے۔ وہ ایک ... بار تم نے اس کے یہاں جا کر خود بھی اس کا رہن سہن دیکھا ہے ... تاکہ خوش رہتا ہے اور تمہارا تو اس کا رنگ بھی نکھر گیا ہے ... پہلے سے لمبا بھی ہو گیا ہے۔

۔ یہ تو ہے۔ دیوالی آنے والی ہے تہوار پر سیٹھ ... صاحب کو گھر آنے کو کہیں ...

... سال سے مزہ نہ آئے گا۔ سیٹھ جی کیا سمجھے نہیں کہ سال بھر ہو گیا ہے ... ریوت کو ان کے گھر رہتے ہوئے۔ تم نے ایک بات اور کہی۔

۔ کیا ...

۔ اگر کوئی تہوار بھی بدلا گیا ہے اس پر وہ ... سمجھے کہ بچی والے ... کھانا ہے ... جیسا کہ تھا

بلکہ مجھ کو یہ خوشی ہے کہ وہاں رہتا ہے ہمیں کہ خوشی کا ... ہوتا۔

۔ کہو ذکر اچھا لگتا ہے مگر ذیشان تو بالکل اچھا نہیں لگتا۔

۔ اس کے بعد میں اب بھی یقین ہے۔

۔ ٹھاکر پر دھیان دینی پر۔ ماتا پتا جی کہہ کر ... بات ہو ... اور سب کچھ تو ایسے لوگوں کی بہت سی باتوں سے نفرت ہے۔

۔ جیسے ؟

۔ تم نے دیکھا نہیں ان کے یہاں ... کا لڑکا ہو ساس اور سسر ... کھانا کھا رہے تھے۔ لڑکے کی بہو سسر کے اتنے قریب بیٹھی تھی کہ منہ میں نوالا ... ڈالتے ہی ... وقت اس کا گھونگھٹ بار بار سسر کی گفتگو سے بے پردہ ہو جاتا ... تھا۔ مجھے شرم ہی نہیں بلکہ باتیں ... جا رہی تھی اور کھانا بھی کھائی جا رہی ... تھی۔ یہ کوئی اچھی بات ہے ؟ یہ کیا فیشن ہوا ؟ گھر بڑوں کا ادب لحاظ بھی ختم ... کر دیا جائے۔

۔ تم گھونگھٹ ... پھر وہی بات ... ہم نے ... دیکھا ہی کیا ہے۔

۔ کیا مطلب ؟

۔ یہی کہ یہ باتیں تم کرو ... پرانے ... کی علامت بھی ہو جاتا ہے۔

۔ ماں ... کے ساتھ ... کیا ؟

۔ ہاں مہذب لوگوں کا ایسا ہی خیال ہے۔

۔ ریوت کی اماں ... رتن کی بات ختم ہو گئی ؟ کسی نے دروازے پر آواز لگائی۔

ریوت کی ماں نے دروازہ کھولا اور باہر ... ان ... آ کر اندر آؤ۔

[illegible]

[illegible]

والد کے سامنے گئے ہوئے تھا۔

" یہ تیلیوں دیکھیے ہمارے ریوت کا حصہ بھی بچا ہے اس کو بکھنے نہیں ملا کہ وہ سال بھر سے یہاں نہیں ہے۔"

" بھلے آدمیوں کا دستور ہے کہ کسی کا حصہ نہ دینا اس کو کوستا کہلاتا ہے۔"

" ٹھیک ہے چاروں کا غم کھا کر چار میں کھالیں مہیلا اور چار ریوت کا حصہ کے رہیں گے۔ دیہاں میں اب کون سے زیادہ دن رہ گئے ہیں چار دنوں کی تو بات ہے۔ اگر چار دنوں میں خراب نہیں ہوں گے تو سب کو بلا کر دو ماں کے آنے پر کھا لیں گے۔"

" ہاں ماں کے بغیر تو ہم سے حلق سے لڈو کہاں اتریں گے۔" ؟ نکتو نے طنز سے کہا اور لڈو رکھنے کمرے میں چلی گئی۔ لڈو کی کھالی بنا دوبارہ رکھ گئی۔ رتن اس رقعہ کے بعد کو یونہی پڑھتے ہوئے مسکرایا۔ سکو کمرے میں لڈو رکھ کر باہر آئی تو رتن کو مسکراتے دیکھ کر پوچھا "مسکرا کیوں رہے ہو۔ ؟"

اس رڈی کاغذ پر لکھا ہے (دس کروڑ کا یگیہ) بمبئی ۱۴ جنوری کلکشن چیتنیہ بہم چاری عرف کاشی جی مہاراج سنت اس سال کے دوران ماچ کوٹ تیس جنڈی مہایگیہ کریں گے۔ اس یگیہ پر دس کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ برہمچاری جی نے نامہ نگاروں کو بتایا ہے کہ سوا لاکھ براہمن گیارہ ہزار ہوا کنڈوں میں اکیس دن تک لگاتار منتر پڑھتے ہوئے یگیہ سمپن کریں گے۔ یہ یگیہ عالمی امن اور قومی یکجہتی کے لئے ہوگا۔ سنت نے یقین ظاہر کیا ہے کہ وہ ایشور کی کرپا سے اتنا دھن اکٹھا کر لیں گے۔"

اتنی بڑی رقم آگ میں پھونک دی جائے گی کیا اس طرح شانتی اور ایکتا کو بڑھاوا ملے گا۔ ؟"

" شانتی ایکتا کو بڑھاوا ملے نہ ملے لیکن لوگوں کے دماغوں میں یہ بات ضرور آئیگی کہ عالمی امن کا ڈھنڈورا پیٹنے والے امریکہ سے تو یہ سنت کافی اچھے ہیں جو عالمی امن کے لئے شانتی یگیہ کر رہا ہے اور امریکہ ویتنام میں ایک فوجی سپاہی کو گولی کا نشانہ ... تین لاکھ چوالیس ہزار آٹھ سو ستائیس روپیہ خرچ کرتا تھا۔

" ممی جی " کسی نے زور سے دروازہ پر آواز لگائی اور دونوں نے باتوں کا سلسلہ توڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ یہ تو ریوت کی آواز ہے۔ " جلدی سے سکو دروازہ کھولنے گئی۔ کواڑ کھلتے ہی "ممی جی نمستے"

ریوت کو سکو نے دیکھتے ہی جیسے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار اور اشفقت کی "دیکھو ہمارا بیٹا آگیا۔ اب کی دیوالی خوب شان سے منائیں گے۔"

" ہاں ہاں شان سے منائیں گے۔ آؤ بیٹا بیٹھو۔" پاس بٹھاتے ہوئے رتن نے کہا۔ "تمہاری چھٹی کب ہے بیٹا ابھی ابھی تم کو یاد کر رہے تھے ایک بات بتاؤ ؟"

" پوچھئے۔"

" تم موٹے تازے کیوں نہیں ہو ؟"

" تم بھی کمال کی باتیں کرتے ہو بھلا پراٹھے گھر پر بنے گھر جیسی آزادی ہاسٹل میں کہاں ہوتی ہے" سکو نے بات کاٹی۔

" نہیں ممی جی ایسا مت کہو میں سب کچھ سن سکتا ہوں مگر سے کا جواب نہیں سن سکتا وہ تو دیوتا ہیں دیوتا۔ مجھے اپنے بچوں رکھتے ہیں کبھی کبھار کوئی نقصان بھی ہو جاتا ہے تو بھی نہیں ڈانٹتے اور کسی دوسرے کو بھی نہیں ڈانٹنے دیتے کہتے ہیں نقصان سب سے بچہ ہے سیکھتے سیکھتے سب سیکھ جائے گا۔"

" بیٹا جب تم ان کی اتنی تعریف کرتے ہو تو پھر تمہاری صحت کیوں ایسی ہے ؟"

" آپ کا یہ خیال صحیح ہے ڈیڈی کہ کوئی موٹا تازہ نہیں ہو سکتا دبلے پتلے ہونے کا کارن کھانے پینے کی کمی ہی نہیں ہو سکتی ہے کوئی بھی تو ہو سکتی ہے " ممی لاماں کی طرف بڑھاتے ہوئے ریوت کی طرح نشفی کا جیسے کوئی طالب علم امتحان کے وقت کچھ سوچنے بیٹھ جاتا ہے جھولے میں جھانک کر دیکھا " ارے اس میں تو لڈو ہیں ہاں ممی اس میں بارہ لڈو ہیں سیٹھ صاحب نے دیئے تھے کہ گھر کو جا رہا ہے خالی ہاتھ جانا ٹھیک نہیں ہے سال کے بعد گھر جا رہا ہے تب تو مجھ کو سیٹھ جی ایک اچھے آدمی ہیں۔ ورنہ عام مالک ایسی باتیں دیکھنے میں نہیں آتی ہیں۔ مجھ کو بتا اب کیا غم ہے۔ بلکہ مجھے گھر لائے دے رہا ہے۔ " ... کہا۔ یہ سن کر ریوت لگا۔ " ممی جی یہ ایسا کیوں ہوا سیٹھ صاحب کے یہاں ایک بہت اچھی کتاب ہے۔ جتنا خرچ وہ اس کے لئے کرتے ہیں اتنے میں ایک ... سکتا ہے۔ جاڑوں کے دنوں میں وہ ایک بڑی تختی پر سونا ... روز شام کو دھنی کا جاکٹ ... جاتی ہے۔ دوسرے

(باقی صفحہ ۳۰ پر)





ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵ | رجسٹرڈ نمبر ڈی ۸۷/۳۷۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی

سرور تونسوی

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیضانِ جلوہ پید
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
(فیاض گوالیاری)

چندہ سالانہ -/۱۵ روپے
فی پرچہ ۱/۵۰ روپے

جلد نمبر ۴۲	جون سنہ ۱۹۸۱ء	شمارہ نمبر ۶

ہندی کے مسلمان شعراء

۱۔ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد پر ایسی مفید کتاب آج تک نہ تو اردو میں شائع ہوئی نہ ہندی میں۔

۲۔ اس کتاب کو پڑھنے سے اردو اور ہندی کے خود ساختہ نام نہاد دانشور جو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اردو اور ہندی کی بقا و حیات کے ضامن بنے بیٹھے ہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے جو کام سرکار سے ہتھیائے ہوئے لاکھوں روپیہ سے نہ ہو سکا اور جو کام اردو اور ہندی کے یہ نام نہاد دانشور آج تک نہ کر سکے وہ ایک فردِ واحد نے اپنی لگن کے باعث پورا کر دیا۔

۳۔ اس کتاب نے ہندی مسلمانوں کا سر اونچا کر دیا ہے اور وہ ثبوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی زبان کی نشو و نما اور ترقی میں جو کردار مسلمانوں نے ادا کیا ہے اسے ہندی زبان فراموش نہیں کر سکتی۔ اور ہندی مسلمان اس سلسلے میں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے کوسوں آگے دکھائی دیتے ہیں۔

۴۔ اس کتاب کو پڑھنے والا ہر ہندی داں لیکھک کا گن گان کرے گا اور ہر اردو داں مصنف کو دعائیں دے گا کہ جس نے اردو ادب کو ایسی بیش بہا تصنیف سے مالا مال کر دیا۔

۵۔ ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی، اردو اکادمی، انجمن ترقی اردو ہند اور ریاستی اردو اکادمیوں کے ذمہ دار ارکان میں شاید غیرت کے جراثیم اپنا اثر دکھانے لگیں۔ اور وہ ندامت محسوس کریں کہ انھوں نے سرکاری یعنی عوامی کروڑہا روپیہ اردو کی اکثر غیر مفید اور غیر ضروری کتابیں شائع کر کے محض اپنوں کو فائدہ پہنچایا اور ہندی کے مسلمان شعرا ایسی بیش بہا اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار تصنیف شائع کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

۶۔ آپ ہمارے اس دعوے کی صداقت کی جانچ کے لئے یہ کتاب پڑھئے اگر آپ ہماری اس تحریر کی حرف بحرف تائید نہ فرمائیں تو کتاب واپس کر کے اس کی پوری قیمت لیجیے۔ حضرت رتن پنشدری نے اپنی زندگی کے عزیز ترین پچاس سال اس کتاب کی تالیف پر صرف کئے اور اپنی زندگی بھر کا سرمایہ اس کتاب کے لئے سواد فراہم کرنے پر لگا دیا اور اس کتاب کو ہر پہلو سے مستند بنانے کیلئے فاضل مؤلف نے ہزاروں کتابوں کا مطالعہ کرنے میں اپنی آنکھوں تک کو قربان کر دیا۔ یہ نادر روزگار کتاب ہندی کے مسلمان شعراء شائع ہو گئی ہے۔ پہلی فرصت میں منگائیے۔ قیمت -/۵۱ روپے

مزید معلومات کے لئے: **دفتر شانِ ہند، نئی دہلی۔ ۲ سے رجوع کیجئے۔**

مدیر پرکاشک سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو، جامع مسجد دہلی اور سرورق ہائیلٹ پبلیشرز سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند ملیٹ ۵۰ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲ سے شائع کیا

اہلِ اسلام سے اپیل

برادران!

اس مقدس مہینے میں اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتا ہے۔ اس لئے اپنی مناجات میں حسب ذیل دو دعائیں شامل کرنا نہ بھولیں۔

۱۔ یا پروردگار ہندوستان اور پاکستان میں امن قائم رکھنا۔

۲۔ یا پروردگار افغان پناہ گزینوں کو عزت اور خیریت سے اُن کے اپنے وطن میں آزاد باشندوں کی حیثیت سے سلامتی کے ساتھ واپس پہنچانا (آمین)

اگر آپ روزے کی حالت میں تہِ دل سے یہ دُعا کریں گے تو یقیناً خداوند کریم اسے قبولیت کا درجہ عطا فرمائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی عید کے مبارک موقع پر اپنے مال میں سے فی گھر ایک کمبل کی قیمت افغان پناہ گزینوں کے لئے نکال کر رکھیں اور براہِ کرم حسبِ ذیل پتہ پر بھجوانے کی مہربانی کیجئے۔

آچاریہ دھرمیندر ناتھ

عارف بیگ

جنرل سکریٹری انجمن افغان دوستاں

۱۰۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد روڈ۔ نئی دہلی

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

"بین الاقوامی اردو کانفرنس"
اتر پردیش اردو اکاڈمی کے لئے
عیاشی اور فضول خرچی کی نئی راہیں

اردو اکاڈمی اتر پردیش کے زیر اہتمام ایک بین الاقوامی اردو کانفرنس اس سال کے آخر میں منعقد کی جا رہی ہے۔ غیر ممالک کے چند اردو داں پروفیسروں۔ ادیبوں اور شاعروں کو بلا کر لاکھوں روپیہ کی خطیر رقم صرف کرنے کے لئے وزیر اعلیٰ اتر پردیش نے اکیڈمی کی عام گرانٹ میں اس رقم کا اضافہ فرمایا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ کیا اس بین الاقوامی اردو کانفرنس کی ضرورت بھی ہے یا نہ؟ دوسرے ممالک سے آنے والے یہ اردو کے دانشور کونسی ایسی نئی راہیں سجھائیں گے جس سے اردو کے کاز کو تقویت ملے گی اور وہ راتوں رات اتر پردیش کی سرکاری زبان قرار دے دی جائے گی۔ جبکہ یہ کام وزیر اعلیٰ اتر پردیش بغیر ایک پیسہ خرچ کئے کر سکتے ہیں جیسا کہ بہار کے چیف منسٹر ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے کیا ہے۔

پچھلے دنوں جناب رام لعل صاحب نے کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی تھی۔ جس میں ملک بھر کے علاوہ دوسرے ممالک سے بھی دو چار نمائندے اکٹھے ہوئے تھے اور اردو سے متعلق ہر زاویۂ نگاہ سے غور و خوض کیا گیا۔ اور اس کانفرنس میں وزیر اعلیٰ اتر پردیش نے اعلان کیا کہ وہ اس سال کے آخر تک اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان قرار دے دیں گے۔ پھر نہ معلوم کونسی ایسی خطیر تجاویز باقی رہ گئی ہیں جن پر بین الاقوامی اردو کانفرنس میں غور و خوض ہو سکتا ہے۔

اور یہ امر بھی غور طلب ہے کہ یہ رقم خطیر ضائع کرتے ہوئے بیرونی ممالک کے اردو دانشوروں کا اثر اردو مخالف حلقوں پر کس طرح پڑے گا۔؟ اور اردو کو اتر پردیش کی سرکاری زبان بنانے کے لئے رائے عامہ کس اثر سے ہموار ہو گی جب کہ اپنے ہی ملک کے لاکھوں حامیانِ اردو کی کوششیں مسلسل جد و جہد کے باوجود اردو کو گزشتہ تیس پینتیس سال سے کوئی بھی جائز حق نہ دلوا سکیں۔

حال ہی میں اردو کے تئیں جو ہمدردانہ الفاظ سرکاری حلقوں سے سنائی دینے لگے ہیں تو یہ بھی محض مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے تھے۔ اور وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کا اشارہ تھا کہ اردو کے لئے کچھ کیا جائے جس کی وجہ سے بہار کے مکھیہ منتری نے اردو کے لئے کچھ مراعات دیں اور اتر پردیش کے مکھیہ منتری بھی اردو کی حمایت میں پر تول رہے ہیں۔ بلکہ ان دونوں فیصلہ اعلانات کو کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس لکھنؤ میں بڑی صاف گوئی سے کہا کہ انہیں وزیر اعظم صاحبہ نے کہا ہے کہ اردو کو حق دیا جائے۔ اور اسی وجہ سے وہ ایسا کر رہے ہیں۔

دراصل اتر پردیش اردو اکاڈمی کو نہ تو اردو سے محبت ہے اور نہ ہی وہ یہ چاہتی ہے کہ اردو پھولے پھلے۔ مگر اس کے دفتری کارکنان پر یہ کوشش ہے کہ ان کی روزی روٹی کا معاملہ محض اکاڈمی کے قائم رہنے میں ہی ہے اور اگر اکیڈمی اپنے زندہ رہنے کا ثبوت دیتی رہی تو عوام اور سرکار کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہنے سے یہ روزی روٹی کا سلسلہ بہتر انداز میں چلایا جا سکتا ہے۔ اور اسی لئے یہ اکاڈمی کئی سال سے متواتر نمائشی قسم کے جلسوں سمیناروں اور مشاعروں پر بے دریغ گرانقدر رقم صرف کر رہی ہے اور یہ سارے پروگرام ایک محدود حلقے کے اندر گنے چنے اشخاص کی ماتحتی میں انجام پاتے ہیں اور اپنی تعریف کے لئے مالی مفاد کا موجب ہوتے ہیں۔ اردو اکاڈمی اتر پردیش کا کوئی بھی اہلکار اسے بتانے سے گریز کرتا ہے کہ ان نام نہاد جلسوں

سیمیناروں اور مشاعروں سے اردو کے کاز کو کیا فائدہ پہنچا؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ چند احباب کو معقول معاوضے سفر خرچ کے نام پر دئیے گئے اور اپنا حلوہ مانڈہ بھی چلتا رہا۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی کا یہ حال ہے کہ آپ انھیں کوئی خط لکھئے کیا مجال کہ آپ کو جواب ملے۔ آپ کتب کا آرڈر بھیجئے مہینوں بعد تعمیل ہوگی۔ اکاڈمی جو رسالے خریدتی ہے۔ ان رسائل کے شمارے دفتر کے کارکن اٹھا کر لے جاتے ہیں اور رسائل کے دفاتر کو مہینوں بعد لکھا جاتا ہے کہ آپ کا رسالہ فلاں فلاں مہینہ کا نہیں ملا۔ دوبارہ بھجوا دیجئے۔ چنانچہ اس ستم ظریفی کی داد دیجئے کہ شان ہند کو ایک سال کی خریداری میں ۲۱ پرچے دینے پڑے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ جناب رام لال صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اکثر اوقات شان ہند کا شمارہ اتر پردیش اردو اکاڈمی میں پڑھا کیونکہ ڈاک کی بدنظمی سے انھیں یہ شمارہ نہ مل سکا تھا۔ مگر دو ماہ بعد اتر پردیش اکاڈمی کے دفتر سے شکایت موصول ہوتی ہے کہ وہی شمارہ انھیں ملا ہی نہیں دوبارہ بھجوایا جائے۔

جن ادیبوں اور شاعروں کو مالی امداد دی جاتی ہے ان کے ماہانہ امداد کے چیک تیار ہونے کے بعد مہینوں دفتر میں پڑے رہتے ہیں۔ اکاڈمی کے دفتر میں اخبارات، رسائل اور کتابیں اس بری طرح سے ادھر ادھر بکھرے ہوتے ہیں جیسے کسی کباڑی کی دوکان ہو اور مالی طور پر تو اس قدر بے راہ روی ہے کہ اکاڈمی کا ایک کارکن سالہا سال تک بددیانتی کرتا رہا اور آخر کار ۱۶ ہزار روپیہ غبن کر کے دوبئی چلا گیا۔ مگر اردو اکاڈمی کے کارکن آج تک پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرا سکے اور یہ محض اس لئے کہ اگر یہ معاملہ پولیس میں جاتا ہے تو شاید رپورٹ لکھوانے والوں کا اپنا حدود اربعہ بھی پیمائش کر لیا جائے۔ کیونکہ اس حمام میں سب کے سب ننگے ہیں۔

اگر وزیر اعلیٰ نے ۹ لاکھ روپیہ جو کہ عوام کے دیئے ہوئے ٹیکسوں سے وصول ہوا ہے، اکاڈمی کو دے ہی دیا ہے تو چاہئے تھا کہ اسے اردو کی بنیادی تعلیم اور اساتذۂ اردو کی کوچنگ کے انتظام پر صرف کیا جاتا جس کی اس وقت زیادہ ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں یہ قابل توجہ ہے کہ جناب حیات اللہ انصاری نے وزیر اعظم صاحبہ سے اردو کے سلسلے میں ایک وفد کے ساتھ ملاقات کی تو اتر پردیش اردو اکاڈمی کی بین الاقوامی کانفرنس کا ذکر بھی آیا تو وزیر اعظم صاحبہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ باہر کے سو آدمیوں کو بلا کر ۹ لاکھ روپیہ صرف کرنا اور اردو کی بنیادی تعلیم کی طرف توجہ نہ کرنا حیرت کی بات ہے؟ حیات اللہ صاحب کا یہ بیان قومی آواز لکھنؤ میں شائع ہو چکا ہے۔

جناب وزیر اعلیٰ یو۔پی کو غالباً وزیر اعظم کے اس ریمارک کا علم نہ ہو سکا ورنہ ان کی کیا مجال کہ وہ بین الاقوامی اردو کانفرنس بلانے کی حمایت کر سکیں اور ۹ لاکھ روپیہ برباد کرنے کے احکام جاری کریں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ اگر وزیر اعظم صاحبہ سے اس سلسلے میں تبادلہ خیال فرمائیں تو بہتر رہے گا تاکہ ملک کا ۹ لاکھ روپیہ محض اعلیٰ ہوٹلوں کے کمرے کرائے۔ اچھے کھانے کے بلوں اور واہ واہ کے لفظی نعروں پر برباد کرنے سے بچ جائے اور اردو کے کسی بامقصد پروگرام پر لگایا جائے۔ ایڈیٹر شان ہند اس سلسلے میں وزیر اعظم ہند اور وزیر اعلیٰ اتر پردیش کو خطوط لکھ رہا ہے کہ بین الاقوامی اردو کانفرنس محض ایک ڈھونگ ہے اور یار لوگوں کے لئے حلوے مانڈے کا ایک دلکش ذریعہ۔ لہٰذا اسے حکماً منسوخ کر دیا جائے

کیا ریلوے حادثات
وزیر ریلوے کے برے ستاروں کا باعث ہیں؟

جناب کیدار شرما صاحب مرکزی ریلوے وزیر کے عہد وزارت میں جس قدر ریلوے حادثات ہوئے ہیں۔ آج تک دنیا بھر میں کسی بھی وزیر ریلوے کے عہد میں نہیں ہوئے۔ اور تو اور صوبہ بہار میں جو حال ہی میں ریل گاڑی کا دریا میں گر جانے کا دردناک حادثہ ہوا ہے اس کی مثال تو دنیا بھر کی ریلوے تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ کوئی وزیر ذاتی طور پر کسی ریلوے حادثے کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ کیونکہ نہ تو وہ کسی ریل گاڑی کو پل پر سے دریا میں دھکیل دیتے

کی سکت رکھتا ہے اور نہ ہی وہ علم غیب جانتا ہے کہ فلاں ریل پٹری پر کسی تخریب کار نے کوئی فش پلیٹ کھول دی ہے مگر انقلابیات کے ماہرین اور مہذب ممالک کے سیاست دانوں کا یہ کہنا ہے کہ ایسے حادثات کی ذمہ داری وزیر ریلوے کو قبول کرنی چاہئے ہندستان میں صرف مرحوم لال بہادر شاستری نے ہی اس پاکیزہ روایت کا مظاہرہ فرمایا تھا کہ ایک ریلوے حادثہ کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے وزارت سے استعفیٰ دیدیا تھا۔ موجودہ دور کا وزیر اس قسم کی حماقت کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا کیدار شرما صاحب یا کسی دوسرے وزیر سے کسی معقول وجہ پر استعفیٰ دینے کا مطالبہ کرنا اپنی حماقت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ مگر ایک اسٹرالوجسٹ کی یہ پیش گوئی کان دھرنے کے قابل ہے کہ ہمارے وزیر ریلوے جناب کیدار شرما کے ستارے کچھ اس قسم کے ہیں کہ ان کے عہدِ وزارت میں ریلوے کے چھوٹے موٹے حادثات ہوتے ہی رہیں گے۔ لہٰذا بہار میں ہوئے دُنیا کے سب سے بڑے ریلوے حادثہ کے بعد نصف درجن کے قریب چھوٹے چھوٹے ریلوے حادثات مزید ہو چکے ہیں

اس سلسلے میں ہم وزیراعظم صاحبہ سے ہی مودبانہ گزارش کر سکتے ہیں کہ وہ اگر ستاروں کی اچھائی یا بُرائی پر یقین رکھتی ہیں تو جناب کیدار شرما صاحب کو ریلوے کی بجائے کسی اور محکمہ کا وزیر مقرر فرما دیں تاکہ یہ اُمید رکھی جا سکے کہ شاید اس طرح ریلوے حادثات میں کمی آ سکے۔

زبان کی تقسیم

سنہ ۱۹۴۷ء میں مُلک کی تقسیم ہوئی تھی۔ اس وقت انگریز نے مسلمانوں کو تقسیم ملک پر اُکسایا اور آخرکار یہ فیصلہ سب کو تسلیم کرنا پڑا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تقسیم مُلک کے باعث بے شک ایک اور اسلامی مُلک دُنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا مگر بحیثیت مجموعی یہ تقسیم مسلمانوں کے لئے مفید نہیں رہی۔ خیر اب اس ہیت کی حالت پر کچھ لکھنا لاحاصل ہے۔ تازہ ترین خطرہ زبان کی تقسیم کا ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ "اُردو" کو مسلمانوں کی زبان قرار دیدیا جائے (حکومت اپنے تئیں اس اصول پر عمل درآمد بھی کر رہی ہے) تاکہ مسلمانوں کے ووٹ محفوظ رہیں۔ اور اُردو کے مسلمان دانشور (زیادہ تر) محض لقمہ ہائے تر کے لئے حکومت کی اس پالیسی کو لبیک کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں اگر اُردو کو زندہ رکھا ہے تو غیر مسلم اُردو ادیبوں اور اُردو جاننے والوں نے۔ آپ مثال کے طور پر بھی کسی مسلم اُردو دانش ور کا نام پیش نہیں کر سکتے جس نے اپنے بچوں کو سکول یا کالج میں اُردو کی تعلیم دلائی ہو۔ مگر ایڈیٹر شانِ ہند کئی ایسے اُردو دان غیر مسلموں کو جانتا ہے جنہوں نے اپنے بچوں کو اُردو کی تعلیم دلائی۔ اور تو اور خود مدیر شانِ ہند نے اپنے بڑے لڑکے کو اُردو میں بی۔ اے (آنرز) کرا دیا۔ اور لڑکی کو اُردو کے ساتھ ساتھ خانۂ ایران سے فارسی میں تعلیم دلائی۔ تقسیم ملک کے بعد ہی مدیر شانِ ہند کی بیوی نے اُردو پڑھی اور آج وہ اُردو کے صحیح تلفظ کے لئے ایک اتھارٹی تسلیم کی جاتی ہے۔

یہ اُردو کی بدقسمتی ہے کہ اس کے مسلمان دانش ور محض مالی مفاد اور لقمہ ہائے تر کے لئے اُردو کی تقسیم پر آمادہ ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ زبان کی اس تقسیم کو روکنا ہمارے بس کی بات نہیں مگر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ زبان کی تقسیم پر جلوے مانڈے کا سامان کرنے والوں کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ دوام کسی کو حاصل نہیں ہے مستقبل میں حکومت میں تبدیلی بھی آ سکتی ہے۔ اگر کسی آنے والی حکومت نے اُردو کو وہ اہمیت نہ دی جو موجودہ حکومت محض زبان کی تقسیم کے لئے دے رہی ہے تو اس وقت کیا ہوگا۔ اس لئے دوراندیشی یہی ہے کہ زبان کی تقسیم کا خطرناک کھیل نہ کھیلا جائے اور اُردو کو ہندو مسلم مشترکہ زبان قرار دینے پر زور دیا جائے۔

کشمیر میں بجٹ پہلی بار اُردو میں

آزاد ہندوستان کی ۳۳ سالہ تاریخ میں ریاست کشمیر کے وزیر خزانہ نے اسمبلی میں بجٹ کو پہلی بار اُردو میں پیش کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ سعادت بھی ایک غیر مسلم وزیر خزانہ جناب ڈی ڈی ٹھاکر کو نصیب ہوئی۔ اُتر پردیش اسمبلی میں مسلمان ممبران اسمبلی کو اُردو میں حلف اُٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اور اس کے

مقابلہ میں ایک ہندو وزیر خزانہ نے اُردو میں بجٹ پیش کیا۔ اس پر بھی کچھ حرام خور اُردو کے مسلمان دانشور حکومت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں کہ اُردو کو [illegible] زبان قرار دیئے جانے پر بضد ہیں۔ بجا ہے کہ پہلا قدم زبان کو دشمنوں سے محفوظ رکھے۔

حفیظ جالندھری کا دوغلا پن

پچھلے دنوں یوم پاکستان کے مشاعرے کے کچھ خصوصی شعرائے کرام کا کلام ریڈیو پاکستان لاہور سے سُنایا گیا۔ جہاں احمد ندیم قاسمی کا کلام واقعی ایک ایسے شاعر کا کلام تھا جو اپنے وطن کے لئے قرمایۂ ناز ہے ہی اس کے علاوہ بنی نوعِ انسان کا درد بھی ان کے دل میں ہے۔ مگر حیرت ہوئی کہ جناب حفیظ جالندھری جو قیامِ ہندوستان کے دوران پاکستان اور حکومت پاکستان میں ہزاروں کیڑے نکالتے تھے کس دھوم دھڑکے سے پاکستان کے گن گان کر رہے تھے۔ جو شاعر محض آرام دہ جاہ و منزلت کی خاطر بے جا تعریف و خوشامد کے لئے اپنے وطن کی برائی کر سکتا ہے وہ عظیم شاعر یا اچھا انسان کہلانے کا حقدار نہیں ہو سکتا ہے۔ یومِ پاکستان کے مشاعرہ میں حفیظ جالندھری بے شک اپنے روایتی شاعرانہ حربوں سے کام لیتے ہوئے پاکستان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے مگر جب ہندوستانیوں کی موجودگی میں وہ اپنے وطن کی برائی کرتے ہیں تو ان کی نظروں میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔ کوئی بھی وطن پرست دوسرے ملک میں جا کر اپنی ماں کو بُرا نہیں کہتا۔ اس اصول کو حفیظ صاحب اگر اس عمر میں بھی اپنا لیں تو بہتر ہے۔

پنجاب سندھ بینک کا نیشنلائزیشن ختم کرنے کا مطالبہ

جب سے پنجاب سندھ بینک کو نیشنلائز کیا گیا ہے ہندوستان کے سکھوں میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ یہ بینک سکھ اقلیت نے اپنے فرقے کی بہتری اور بہبودی کے لئے جاری کیا اور اسے جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے بینک کاری کے سلسلے میں اس بینک نے عوام کی خدمت کے لئے بہت کچھ کیا۔ کچھ مفاد پرست مخالفوں نے [illegible] میں اس بینک کے چیئرمین پر الزامات لگائے اور حکومت نے [illegible] چیئرمین کو کسی دوسرے مناسب چیئرمین کے دستیاب ہونے [illegible] ہٹا دینے کا وعدہ بھی کیا۔ مگر سکھوں کا عوامی حلقہ موجودہ چیئرمین پر پورا پورا اعتماد رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس بینک کا نیشنلائزیشن ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے صدر گورچرن سنگھ ٹوہرہ نے بھی وزیر اعظم سے اپیل کی تھی کہ پنجاب سندھ بینک کے نیشنلائزیشن کو ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ سکھوں میں بے اطمینانی دور کرنے کے لئے یہ ضروری ہے۔

بظاہر یہ مطالبہ منظور کیا جانا مشکل نظر آتا ہے۔ مگر اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ سکھوں کا یہ مطالبہ معقولیت پر مبنی ہے۔

دہلی کا شجرِ ممنوعہ "جی۔ بی۔ روڈ"

"جی بی روڈ" دہلی کے بازارِ حُسن و عشق کا نام ہے، جہاں پیسے کی آڑ میں سب کچھ ہو سکتا ہے اگر اس شاہراہ پر گشت کرنے والے پولیس مینوں سے آپ سانٹھ گانٹھ کر لی ہو۔ جیسی ضرورت منہ مانگی قیمت پر خرید یا بیچا جا سکتا ہے پولیس والوں کی فرض شناسی سے بحث نہیں بلکہ بتانا یہ ہے کہ اس طرح یہ جاتا ہے جس میں اس بازار کی گلیوں یا ناچنے والیوں کو رکھا جاتا ہے شام کو شروع غروب ہونے کے بعد طلوعِ آفتاب تک اس بازار میں رہنے والی کوئی بھی آزمائش نہ تو پہنچ پاتی ہے اور نہ ہی اس بازار سے باہر جا سکتی ہے نہ ہی باہر سے اس بازار میں آ سکتی ہے۔ کسی ملک کا بھی قانون بھی حکومت کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ اس قسم کا حبس بے جا رکھا جا سکے۔ ہمارا ملکی قانون بھی اس کی اجازت نہیں دیتا اور یہ پولیس کی اپنی من مانی ہے جس کے لئے ہم وزیر داخلہ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس حبس بے جا کو ختم کرنے کے احکامات جاری کریں۔ ضرورت ہے کہ اس بازار کی کوئی بھی ولاسٹ ہائی کورٹ میں اس حبس بے جا کو ختم کرانے کے لئے رٹ داخل کرے۔

بوئے سمن

" بوئے سمن " محترمہ مسعودہ حیات صاحبہ کا مجموعۂ کلام اسی ہفتہ شائع ہوا ہے " بوئے سمن " ظاہری اور باطنی دلکشی میں اس سال کا خوبصورت ترین شعری مجموعہ کہا جا سکتا ہے. مسعودہ حیات اُن گنی چُنی شاعرات کی صفِ اول میں ممتاز جگہ رکھتی ہیں جو واقعی شعر کہتی ہیں۔ اور دُنیائے شاعری میں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔ اخترالایمان صاحب نے " بوئے سمن " کا پیش لفظ لکھا ہے جسے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین شانِ ہند " بوئے سمن " کی ایک جھلک دیکھ سکیں. اس مجموعہ کی قیمت بیس روپیہ اور ڈی لکس ایڈیشن کی چالیس روپیہ ہے۔ اور دفتر ماہنامہ شانِ ہند سے دستیاب ہے۔ (ایڈیٹر)

شاعری شاعر کی ذات کا نقاب ہے یا اس کی ذات کا الکشاف
اس بات کا تعین بہت مشکل ہے مگر شاعری اس کی ذات کے کسی کسی پہلو کی نمائندگی کرتی ہے یہ بات طے ہے. اب وہ پہلو احساس محرومی ہے؟ احساس کمتری ہے؟ سماجی قدروں کی پیدا کی ہوئی گھٹن ہے؟ سیاسی معاشی مسائل سے پیدا ہونے والی ناآسودگی ہے یا صرف شاعر کے جمالیاتی ذوق کی تسکین؟ اس کا اندازہ کلام کے تجزیہ سے ہوگا یا ہوتا ہے

مسعودہ حیات درس تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہیں. اور انہوں نے ایک طرح سے ایک محصور ماحول میں پرورش پائی ہے. پردہ بھی شادی کے بعد چھوٹا ہے. پردہ کرنا یا چھوڑنا کوئی اہمیت کی چیز نہیں. میں نے اس بات کی طرف اس لئے اشارہ کیا کہ ان کے ماحول کی نشاندہی ہو جائے اور جب آپ یہ اشعار پڑھیں،

ساری دنیا کی سمٹ آئی ہیں خوشیاں دل میں
کیسے اس ایک محبت کی نظر کو بھولیں

چھونے سے کبھی بادِ صبا کے مرے تن میں
اک برق سی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

جُرم سا جُرم ہے کچھ تم سے محبت کرنا
دل اسی جُرمِ محبت کی سزا مانگے ہے

وہ نکہتِ بہار ہوائے چمن میں ہے
اک جانفزا مہک سی مرے پیرہن میں ہے

تو ان کے کلام کا صحیح تجزیہ کر سکیں۔

مسعودہ حیات نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے غزل کا اسلوب اختیار کیا ہے اور جو اشعار میں نے اوپر نقل کئے ہیں وہ خالص غزل کے اشعار ہیں مگر ان کے یہاں اس طرح کے اشعار ملیں گے جن سے ظاہر ہوتا ہے وہ آج کے سماجی اور عصری زندگی کے تار و پود اور اس کے ڈھرے کو سمجھتی ہیں. اور اس کے دوغلے اور دوغلے پن کا اندازہ ہے۔ اس کے علاوہ ہماری صنعتی ترقی کے منفی پہلو بھی ان کی نظر میں ہیں ؎

ہم یوں بے رنگی کا رہے عمر بھر شکار
مل جائے مصلحت کی قبا سوچتے رہے

آتے نہیں نظر کہیں اپنے وہ لالہ زار
یہ کون سے نگر میں ہوا لے گئی مجھے

یہ مسعودہ حیات کا پہلا مجموعہ ہے مگر ان کے کلام سے کہیں ایسا اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ نومشق یا نوآموز ہیں. جو کیفیت اور سرشاری ان کے یہاں مجھے نظر آئی بہت سے دیرینہ مشق شاعروں کے یہاں نہیں ملتی ؎

اک یاد کی خوشبو سے مہکی مری تنہائی
تم نے تو جدا ہو کر کی اور مسیحائی

یہ سرشاری کی کیفیت ان کے یہاں غالباً اس لئے ہے کہ ان کے کلام اور ان کی شاعری کی بنیاد جمالیاتی قدریں اور بالیدہ جمالیاتی ذوق ہے۔ ہماری زندگی میں سیاسی سماجی اور

معاشی مسائل کی کج روی سے جو بد صورتی پیدا ہوتی ہے، اس کا احساس اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک لکھنے والے کا جمالیاتی احساس بہت تربیت یافتہ اور نکھرا ہوا نہ ہو ۔

ہزاروں درد سمیٹے ہوئے ہوں اک دل میں
بکھر گئی جو مری داستاں تو کیا ہوگا

یہ اپنے کو سمیٹے رہنے کا انداز آیا ہی جمالیاتی قدروں کی تربیت سے ہے۔ بکھر جانے کا ڈر زندگی کے فطری جذبے سے آیا ہے۔ بکھر جانے کا ڈر اس محصور زندگی کا نتیجہ بھی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ۔

ادھر غزل کے لب و لہجہ، آہنگ اور الفاظ کے دروبست میں بہت تبدیلی آگئی ہے ۔ اس کی مثال مومن اور ناصر کاظمی کے یہ دو شعر ہیں ؎

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے (مومن)

اس بے چراغ شہر میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں (ناصر کاظمی)

یہ آہنگ اور لب و لہجہ تو مسعودہ حیات کے یہاں نہیں مگر وہ حسیت، وہ ہر غم کو اپنا بنا کر اپنانے کا انداز جو آج کی شاعری کا خاصّہ ہے، ان کے یہاں ضرور ملے گا، ؎

بارہا کوچۂ جاناں سے مرے ساتھ حیات
سونی سونی سی ہر اک راہ گزر آئی ہے

اک تصور شاعری میں شعرِ محض کا بھی ہے جس کا کوئی سیاق و سباق نہ ہو، وہ کسی جذبہ، کسی خیال، کسی قدر کی نمائندگی نہ کرتی ہو، صرف الفاظ کی موسیقی اور آہنگ کا بانکپن ہی شاعری کا حسن ہو ۔ شعرِ محض کی مثالیں تو ہمارے یہاں ہیں، غزل کی بیشتر شاعری اس کے ذیل میں آتی ہے مگر الفاظ کی موسیقی اور آہنگ کا بانکپن مفقود ہے ۔ یہ بات میں نے یہاں اس لیے کہی کہ مسعودہ حیات کی بیشتر شاعری غزل کی شاعری ہے، مگر شعرِ محض کے ذیل میں نہیں آتی ۔

اس مجموعۂ کلام کے بارے میں مختصراً یہ کہوں گا کہ ہر شاعر یا شاعرہ کی تخلیق کا آغاز دراصل اس کی اپنی تلاش سے ہوتی ہے۔ انھیں بھی اپنی تلاش ہے ۔ جس طرح ہمیں ان کے آغاز کا علم ہو گیا جب یہ اپنے آپ کو پالیں گی اس کا علم بھی ہو جائے گا ۔

آخر میں چند سطریں نظم کے بارے میں ہیں ۔ ان [illegible] پر نظم کا اطلاق کم ہوتا ہے مسلسل غزل کا زیادہ ۔ اگ[illegible] کا مضمون الگ الگ نہیں مگر نظم میں جس یک جہتی، ارتقا[illegible] اور اختتام کا خیال رکھا جاتا ہے وہ ان نظموں میں نہیں[illegible] بھی ان کا نہیں، نظم کے اس تصور کا ہے جو ابھی تک [illegible] بیشتر شعرا کے ذہن کیں ہے ۔ کسی ایک خیال کو لے کر [illegible] اور بس ! انھیں اگر نظم کہنی ہے تو اس کے تکنیکی پہلو کو [illegible] کرنا ممکن نہیں ہوگا ۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اپنی بات ختم کرتا ہوں [illegible] کے شعری مستقبل کے دعائے خیر ! شکریہ

اخترالایمان
۱۸ ستمبر ۱۹۸۷ء

غزل

صلاح الدین خان
خالد
کوٹہ، راجستھان

غمِ زندگی کا تو غم نہیں کہ مجھے غموں سے [illegible]
ترا غم بھی مجھ کو عزیز ہے ترے غم میں [illegible]

جو اداس آیا کوئی نظر تو خزاں میں گا رہی ہے [illegible]
مرے آنے کا کوئی غم نہ کر مرے بعد فصلِ [illegible]

تری بزم نے مرے لب پہ خوشی جو دیا تھا با[illegible]
وہی جام ہے مری زندگی وہی ہے مجھ کو کی[illegible]

کبھی شکوہ تیرے ستم کا ہے کبھی شکر تیرے کرم [illegible]
رہ و رسمِ عشق بھی خوب ہے نہ شکوہ ہے نہ قرا[illegible]

نہ تو چھیڑ اب مری داستاں مرے ہم نفس [illegible]
میں وہی ہوں خالدِ خستہ جاں کہ جو زندگی پہ [illegible]

○

اوجین کے چند قدیم شعراء

محمد خالد عابدی آل انڈیا ریڈیو اندور

جب رام بابو سکسینہ نے اُردو زبان وادب کی تاریخ
لکھی تو اُس وقت بھی اُس زمانے کے مدھیہ پردیش یعنی
سی پی کو وہ نمائندگی حاصل نہیں ہوسکی جو اس کا حق تھا
مد بعیر حامد حسن قادری مرحوم نے " داستانِ تاریخ
اُردو " کے لئے قلم اُٹھایا تو اُس وقت بھی وہاں تجسس وتلاش
نہیں کی گئی۔ بہت ممکن ہے کہ آج سے نصف صدی قبل بھی
اگر مدھیہ پردیش میں تحقیق کی جاتی تو بیشتر نوادرات ہاتھ
آتے۔ لیکن افسوس کہ تقسیم اور اس کے ساتھ ہی جو نفسا نفسی
کا عالم ہوا اس میں بھی کافی بیش قیمت اُردو کا اثاثہ ضائع
ہوگیا۔ اور اس طرح اگر مدھیہ پردیش کی اُردو زبان وادب
کی تاریخ دوبارہ تفویض قلم کی جائے تو بمشکل ہی یہاں کا ہلکا
پھلکا ذکر کرکے مورخ آگے بڑھ جائے گا۔

کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ ہنوز " مدھیہ پردیش
کی اُردو تاریخ " ترتیب نہیں دی جاسکی ہے۔ کیا میں اُردو
کے اساتذہ کرام سے یہ دریافت کرسکتا ہوں کہ پی ایچ ڈی اور
ایم اے کے مقالوں کے لئے " مدھیہ پردیش میں اُردو " موضوعات
سے کیوں اجتناب کیا گیا ہے۔ مجھے محاسبہ مقصود نہیں ہے تاہم
دل ودماغ میں اس طرح کے سوالات تو پیدا ہوتے ہی ہیں
کیوں مسلسل میر، غالب اور اقبال پر ہی دفتر کے دفتر لکھے
جارہے ہیں۔ کیا آپ کے پاس اس امر کا جواب ہے کہ اہم ہستیاں
" مدھیہ پردیش میں اُردو " وغیرہ موضوعات کیلئے
کتنے سمپوزیم، سمینار اور مقالے لکھوائے ہیں۔ اور مدھیہ
پردیش میں اُردو زبان وادب کو لے کر کتنے سوونیر وغیرہ
شائع کئے ہیں۔ ایسے کتنے کالج اور اسکول ہیں جو اپنے
میگزین میں اپنے علاقے کے شعراء وادباء اور اس علاقے کی
قدیم اُردو تاریخ کا احاطہ کرتے ہیں؟

مدھیہ پردیش کی دوسری بدنصیبی یہ بھی ہے کہ ابھی تک یہاں
اُردو زبان کا کوئی سرکاری یا نیم سرکاری ریسرچ سلسلہ جاری نہیں ہو
سکا جو مدھیہ پردیش کے ادب کو کسی حد تک محفوظ کرتا جبکہ یہاں
کی تہذیب وثقافت اُردو میں ابھی محفوظ ہوتی جارہی ہے۔ ابھی تک
ہمارے سامنے مدھیہ پردیش سطح پر ادبی جائزے کے طور پر
ایم عرفان مرحوم کے " شعلۂ حیات " بھوپال کا " مدھیہ پردیش اُردو "
اور ماہنامہ " آجکل " دہلی کے " اُردو نمبر " میں حکیم سید ظفر الحسن
صاحب کے مضامین کے علاوہ مطبوعہ شکل میں کیا ہے۔ ادبی تاریخ
ان تذکروں نے مدھیہ پردیش کی صحیح سالم تصویر کھینچی ہے مگر
یہ معذوب سوالیہ نشان کب تک مجبور رہے گا۔

بہرکیف مدھیہ پردیش کو اُس مسیحا کی تلاش ہے جو اس علاقہ
کی اُردو خدمات کو ہندوستان گیر پیمانے پر متعارف کرا سکے۔
میں ۱۹۷۶ء سے " مدھیہ پردیش میں اُردو " موضوع کے تحت
تلاش وتحقیق کا کچھ کام بطور شغل کے کر رہا ہوں۔ شاید میری
یہ کاوشیں آئندہ کسی مورخ کی فہرست کا حصہ بن سکیں۔

اوجین میں اُردو کی قدامت کب سے ہے؟ اوجین کا پہلا
اُردو شاعر کون ہے؟ یہ مسئلہ ابھی حل نہیں ہوسکا ہے۔ یہ مسئلہ
کسی حتمی سال کے اور ٹھوس دلائل کا طالب ہے۔ تاہم میں نے ایک
ایک مضمون " اوجین کے ہندو شعراء " میں کسی قدر تعین کی کوشش
کی ہے۔

کرم فرمائے من جناب سلطان احمد صاحب صدیقی کی وساطت
سے اوجین کے قدیم ترین شعراء میں سے ایک ایسے شاعر کا انکشاف ہوا ہے
جو آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل اوجین کے گرد ونواح
میں بحیثیت اُردو شاعر کے " چراغِ اُردو " روشن کئے ہوئے تھا

پیش نظر مضمون میں، اجین کے چند قدیم شعراء کا تعارف مقصود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

محمد عظیم خاں عظیم :- ۱۸۴۳ء میں آپ کی پیدائش وزیر محمد خاں جاگیردار سنج پورہ پرگنہ سون کچھ ضلع اجین کے خاندان میں ہوئی۔ مروجہ تعلیم فارسی، عربی اور انگریزی اساتذہ سے سنسکرت اور ہندی، پنڈتوں سے حاصل کی۔ آپ کی پرورش نہایت ناز و نعم سے ہوئی۔ شاعری کا ذوق عہد جوانی میں ہوا۔ اساتذہ کے دواوین کے عمیق مطالعہ نے اپنی طبیعت کو ہی استاد بنایا۔ آپ کے مزاج میں مشکل پسندی تھی۔ سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف و قوافی میں شعر کہتے تھے۔ آپ عربی، فارسی کے جید عالم اور فن عروض کے ماہرین میں سے تھے۔ اور خوش نویس بھی۔ شاہ نصیر (استاد ذوق) اور ناسخ کی طرح سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے چنانچہ اس قبیل سے بلکہ شاعری قدامت کی غمازی کرتے ہیں۔ آپ حضرت کرامت علی بشر سے گو کہ عمر میں بڑے تھے تاہم اکثر معرکے ومناقشے اور معاصرانہ چشمک رہتی تھی۔ آپ کے کلام میں کہیں کہیں ابتذال بھی آگیا ہے۔ محمد عظیم خاں عظیم نے سو سال کی عمر میں ماہ اپریل ۱۹۴۳ء میں انتقال فرمایا۔ افسوس کہ ان کا کلام محفوظ نہیں رہ سکا۔ نمونہ کلام ؎

بار لپٹانے سے تری ہالک لچکتی ہے مگر
ان اللہ اللہ کے ڈالی کراری ہوتی ہے

بوسہ لب کے شیریں لب کے کمائیں کھالیا
ساتھ شیرینی کے ہم کو بھیز کھانا چاہئے

اجین میں ایک مقام بھرتری گپھا ہے روایت ہے کہ مہاراجہ بھرتری ہری نے کہا کہ اس گپھا کے اندر سادھو بن کر بیٹھے آج تک تپسیا کر رہے ہیں ؎

زمیں ہے خطہ اوجین عشق خیز عظیم
کہ سائیں جن میں کہ ذی جاہ بھرتری ہیں مقیم

اوجین میں سوضرب کا ایک بازار بیچنی بازار ہے یہاں سن ۱۸۸۸ء میں یہاں آتشزدگی سے جل کر تباہ ہو گیا تھا۔ درمیان میں "مولا آپا" کی مسجد واقع ہے۔ خدا کے فضل سے وہ محفوظ رہ گئی تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خیرن کی خیریت سے مسجد رہی سلامت
ویسے تو جل گیا تھا بازار سارا بچنی

سید کرامت علی بشر اوجینی :- آپ ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کسی ٹھیکیدار کے محاسب اور منشی کی حیثیت سے مہو چھاؤنی اوجین تشریف لائے اور پھر یہیں اقامت گزیں ہو گئے۔ شاعری کا ذوق و شوق آپ کو اوائل عمری سے تھا۔ اس زمانے میں شعر و سخن کے افق پر داغ دہلوی اور امیر مینائی جیسے اساتذہ درخشاں تھے۔ چنانچہ کرامت علی بشر، حضرت کیفی کاکوروی کی سفارش سے حضرت امیر مینائی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے، اصلاح ڈاک کے ذریعے ہوا کرتی تھی۔

سلطان احمد صدیقی نے، سید کرامت علی بشر اوجینی کی قطع اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

"حضرت بشر گورے چٹے بڑی بڑی آنکھیں، پانچ فٹ منی قد، خشخشی ڈاڑھی رکھتے تھے، لانبی شکل تھی، سر پر صافہ اور شیروانی، علی گڑھی پاجامہ پہنتے تھے۔ اوجین کے رؤسا، حکام، امیر غریب، ہندو اور مسلمان سب ہی آپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ آپ کی سرپرستی میں ۱۹۱۲ء میں بزم ادب قائم ہوئی اور ماہانہ مشاعرے ہونے لگے۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا جن میں اوجین میں محمد یار قریشی، اختر اوجینی، حکیم مہر، رشید، وحید محمد قیصر، نذر محمد شرر، احمد علی وفا، ریاض احمد جوہر، حسرت عزیز علی ماہر، شبنم، اکبر، کنتر، بہ سہو دیال اشہر، بھیر سنگھ صادق، ہیرالال وکیل (نعت گو) وغیرہ تھے"۔

سید کرامت علی بشر کے ایما سے ہی ان کے شاگرد عزیز محمد قیصر جاگیردار نے ۱۹۲۱ء میں اوجین سے ایک ماہنامہ "آفتاب مالوہ" جاری کیا تھا۔ اس رسالہ کی ایک خصوصیت تھی کہ اس میں ہر ماہ ایک مصرع طرح دیا جاتا تھا۔ اس مصرع پر نہ صرف شاگردان بشر بلکہ اندور، بھوپال، گلشن آباد، مہو

محاورہ، مندسور اور رتلام وغیرہ کے شعراء اپنا کلام اشاعت کی غرض سے بھیجتے تھے۔ مجوزہ مصرع طرح پر سب سے اچھی گرہ لگانے پر شاگردانِ بشر کو میڈل اور انعامات سے نوازا جاتا تھا۔

بقول سلطان احمد صدیقی "حضرت بشر مدظلہٗ نے قومی نظمیں میلاد نامے، مرثیے، نوحے، سلام، نعت، منقبت، رباعی قطعے، غزل، مسدس اور مخمس وغیرہ اصناف پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ امیر مینائی اسکول کا رنگ آپ کے کلام میں جھلکتا ہے پختگیٔ کلام، فصاحت، بلاغت، روانی، سلاست، صحتِ زبان و محاورہ کا خیال رکھتے تھے۔ فطری شاعر تھے۔ بشر مرحوم زود گو اور پُر گو واقع ہوئے تھے۔ آپ نے اپنا طریقۂ اصلاح حضرت امیر مینائی کی طرح ہی رکھا شاگردوں کو اس کی خامیاں بتلاتے اور نکاتِ شاعری سمجھاتے تھے۔

سید کرامت علی بشر کو بھی غالب کی طرح اولاد کا داغِ مفارقت اٹھانا پڑا۔ آپ کے صاحبزادہ مولوی سید یاد علی جو ایک بہترین مقرر اور مبلغ تھے کم عمری میں انتقال فرما گئے تھے بشر صاحب پر اس حادثے کا اس قدر اثر ہوا کہ آپ نے شاعری ترک کر دی اور اپنا کلام نذرِ آتش کر دیا۔ آخرش خود بھی [illegible] سال کی عمر میں [illegible] میں انتقال فرما گئے۔ سید کرامت علی بشر مرحوم کے بیشتر شاگرد استادی کے درجے کو پہنچے اور خود استاد الاساتذہ فخرِ مالوہ کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

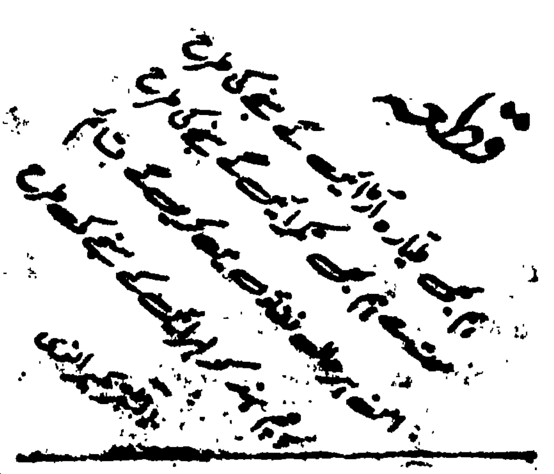
نمونۂ کلام سے

(۱) — [illegible] کوئی بے خود نہ ہو مخمور نہ ہو
مست بے باک بشر صورتِ منصور نہ ہو
مجرم ہے مرضیٔ محبوب سے روگردانی
وہ تمنا نہ کرو جو اُسے منظور نہ ہو
وہ جفائیں ہوں کہ بڑھتا ہے جوشِ الفت
زندگی تلخ نہ ہو شیشۂ دل چور نہ ہو
وہ جہاں چاہیں دکھائیں کہیں جلوہ اپنا
شوقِ دیدار طلب ہے نہ ہی طور نہ ہو
ان کے رخ تک بشر کس طرح جا سکتا ہے
[illegible] دستور نہ ہو

(۲) — تمنا ہے تصورِ یار کا ایمان بن جائے
جو صورت سامنے ہو صورتِ قرآن بن جائے
دکھائے اب خیال روئے جاناں طلبِ مضطر
الٰہی مالکِ خانہ یہی مہمان بن جائے
اثر اتنا تو ہو اے شوق جذباتِ محبت میں
جو تیرِ ناز کے قلب کا درماں بن جائے
تڑپ اس طرح سے اے دل وہ گھبرا کر چلے آئیں
یہ تیری بے قراری وصل کا ساماں بن جائے
بشر مضمونِ حسن و عشق کی تنظیم ہو ایسی
کہ تفسیرِ محبت آپ کا دیوان بن جائے

(۳) — اے جلوۂ حقیقت حسنِ مجاز ہو جا
ہاں شانِ بے نیازی مصروفِ ناز ہو جا
حسنِ بتاں میں دکھلایا اپنا جمالِ دلکش
آئینہ میں نمایاں آئینہ ساز ہو جا
آ میں تجھے دکھلاؤں محمود گر کی صورت
اس شان پہ تصدق روحِ ایاز ہو جا
گھبرا کے وہ اٹھا لیں آغوشِ مرحمت میں
بے ہوش اتنا اے دل وقتِ نماز ہو جا
مرغوب اے بشر ہے اندازِ خاکساری
بس تو بھی آج وقفِ عجز و نیاز ہو جا

(جاری ہے)



ایرانی افسانے

داش آکل

صادق ہدایت
ترجمہ ڈاکٹر آفتاب اصغر

داش آکل حسبِ معمول دو میل کے قہوہ خانے میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے والی میز پر اس کا طوطے کا پنجرہ رکھا تھا جس پر سُرخ ململ کا کپڑا پڑا تھا۔ وہ اپنی انگشتِ شہادت کے ساتھ پانی کے لبالب بھرے ہوئے بڑے سے پیالے کے اندر پڑی برف کو گھمانے پھرانے میں مشغول تھا اچانک کاکا رستم اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور بالکل سامنے والی میز پر اکڑ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی چائے خانے کے ملازم لڑکے کی طرف منہ کر کے بڑے تحکمانہ انداز میں بولا:

"ادے چھوکرے جلدی ایک چ چ چائے لاؤ۔"

داش آکل نے بڑی معنی خیز نظروں سے لڑکے کی طرف دیکھا۔ لڑکا اس کی آنکھ کا اشارہ پاکر ادائے بے نیازی کے ساتھ مسکرا دیا اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے اس نے کاکا رستم کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ بدستور اپنے کام میں مگن رہا کبھی تو وہ چائے کے ننھے منے گلاسوں کو پیتل کے ایک بڑے سے برتن سے نکال نکال کر باہر رکھتا تھا، کبھی انہیں پانی کی ایک بالٹی میں ڈبو ڈبو کر نکالتا تھا۔ اور کبھی انہیں ایک ایک کر کے بڑے آرام آرام سے ایک میلے سے تولیے کے ساتھ خشک کرنے لگتا تھا۔ ماحول پر ایک کامل سکوت طاری تھا صرف کسی وقت تولیے کو گلاس کے شیشے کے ساتھ رگڑنے کی آواز سنائی دیتی تھی جو تھوڑے وقفے کے بعد سکوت درہم برہم کر دیتی تھی۔

کاکا رستم لڑکے کی اس دیدہ و دانستہ بے اعتنائی کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا اور ایک بار پھر دھاڑا۔

"س س سُنا نہیں میں ک ک کیا کہہ رہا ہوں؟"

لڑکے نے اس کی بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے ایک بار پھر مسکرا کر داش آکل کی طرف دیکھا۔ داش آکل نے آنکھ میچ کر اس کی طرف دیکھا اور زیرِ لب مسکرانے لگا۔

کاکا رستم نے ان کی اشارہ بازیوں کو دیکھا تو اور بھی بھڑک اٹھا اور دانت پیستے ہوئے بولا:

"یہ بڑے ب بد۔ معاش بنتے ہیں۔ اگ اگر بدمعاشی کا ش ش شوق ہے تو آج رات سر ام میدان میں آ ج جائیں انت انتڑیاں نکال کر ڈھیر کر دوں گا۔"

داش آکل نے جو کہ بدستور پیالے میں برف کو گھما پھرا رہا تھا اور کنکھیوں سے ساری صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی یہ گیدڑ بھبکیاں سُن کر اس زور کا قہقہہ لگایا کہ اس کی حنائی رنگ کی گھنی مونچھوں کے نیچے سے اس کے اوپر والے سفید سفید اور مضبوط دانت چمک اٹھے پھر اس نے ایک اور زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔

"جو گرجتے ہیں برستے نہیں۔ بے غیرت لوگ باتیں ہی بنا سکتے ہیں۔ اصلی رستم اور نقلی رستم [illegible] جائے۔ جب ہاتھوں میں ہاتھ [illegible]"

داش آکل نے سنتری پیلے [illegible] سب جانتے تھے [illegible] نہیں کہ کاکا رستم کی زبان میں لکنت تھی بلکہ اس لئے کہ داش آکل ایک بدمعاش [illegible] سارے شہر میں مشہور تھا۔ یہ بھی سبھی جانتے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے اور دیکھا دوسرے کو دیکھ آنکھ نہ بھاتے تھے۔ داش آکل کا نام سنتے ہی شہر کے چھٹے ہوئے بدمعاش اپنے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ شہر بھر میں ایک بھی غنڈہ ایسا نہ تھا جس کا اس نے کبھی نہ کبھی پنجہ نہ مروڑا ہو۔ رات گئے جب وہ اسحاق یہودی کے گھر سے شراب پی کر محلہ سر دزک میں آ کھڑا ہوتا تو کاکا رستم تو کیا اس کا باپ بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈال سکتا

تا۔ خود کاکارُستم بھی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ کہ اس کا اور داش آکل کا کوئی مقابلہ نہیں کیونکہ دو دفعہ پہلے بھی وہ اس کے ہاتھوں زخم کھا چکا تھا۔ اور ہر بار اسے پچھاڑ کر اس کے سینے پر سوار ہو چکا تھا۔ ابھی چند ہی روز پہلے جب کاکارُستم نے دیکھا میدان صاف ہے تو لگا اول فول بکنے اور لوگوں کو تنگ کرنے ہی کی شامت آئی داش آکل بھی اجل معلق کی طرح کہیں سے آدھمکا اور اس کی خرمستیاں دیکھ کر کہنے لگا۔

"کاکا مدار کا، مثال ایک ایسی لڑاکا عورت کی سی ہے جس کا شوہر گھر پر نہ ہو اور وہ آتے جاتے لوگوں کے ساتھ تم ٹھوکتی رہے۔ لگتا ہے جیسے آج کچھ ضرورت سے زیادہ ہی چڑھا لئے ہو جو اتنا اودھم مچا رہے ہو۔ یہ بے غیرتی اور گھٹیا پن کی باتیں چھوڑ دو۔ یوں تو بڑے بدمعاش بنے پھرتے ہو مگر لوگوں سے چکا ٹیکس مانگتے ہو اگر تم میں ذرا سی غیرت ہوتی تو تم جانتے کہ ڈرا دھمکا کر لوگوں سے پیسے بٹورنا اور بھیک مانگنا ایک ہی بات ہے۔ اگر تم ان حرکتوں سے باز نہ آئے تو مولا قسم تمہاری مونچھوں کی [illegible] لگا دوں گا۔"

کاکارُستم اس روز تو داش آکل کی یہ جلی کٹی اور کڑوی کسیلی باتیں سن کر دم دبا کر بھاگ گیا تھا۔ مگر جب سے اس کے دل میں گرہ بیٹھ گئی تھی اور منتظر تھا کہ کب موقع ملے اور وہ اس سے توہین کا بدلہ لے۔

کاکارُستم کے برعکس داش آکل اہل شہر کی آنکھ کا تارا تھا کیونکہ وجہ یہ تھی کہ جب وہ محلہ سردزک میں آتا تھا تو صرف اپنے حریفوں کو للکارتا تھا۔ عورتوں اور بچوں کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔ اگر کوئی شامت کا مارا کبھی کسی عورت کو چھیڑ بیٹھتا تو اس کی ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ کمزور اور مجبور لوگوں کی دامے، درمے، سخنے غرض ہر طرح سے مدد کرنا فرض عین سمجھتا تھا۔ کبھی موج میں آتا تو لوگوں کا سامان اٹھا کر ان کے گھروں تک پہنچا آتا۔ بہرحال اس میں کسی کی بلاوجہ دلالت کرنے کی تاب نہ تھی۔ اور وہ بھی کاکارُستم جیسے شخص کی جس میں پانچوں شرعی عیب تھے۔

کاکارُستم اپنی توہین کی وجہ سے پھنیر سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اور اپنی مونچھوں کو چبا رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد قہقہوں کا طوفان تھم گیا اور سب لوگ سنجیدہ ہو گئے مگر چائے خانہ کا ملازم لڑکا جو کہ آڑی آڑی سی رنگت والے بلکے کرتے۔ رات کو پہننے والی ملگجی سی ٹوپی اور کھدر کی میلی سی شلوار میں ملبوس تھا۔ ابھی تک اپنا ہاتھ دل پر رکھے ہوئے تھا۔ اور مارے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔ گاہکوں میں سے اکثر اس کی مضحکہ خیز حرکات دیکھ دیکھ کر پھر ہنسنے لگے۔ کاکارُستم اپنی مسلسل ہنسی آتی دیکھ کر غصے سے پاگل سا ہو گیا اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ میز پر پڑا ہوا قندان اٹھایا اور لڑکے کو کھینچ مارا۔ لڑکا جھٹ لڑکھڑا کر ایک طرف کو ہو گیا اور گلدان اس کو لگنے کی بجائے سماوار سے جا ٹکرایا جو کہ چوکی پر رکھا ہوا سماوار اور اس کے اوپر رکھی ہوئی کیتلی دونوں ایک دھماکے کے ساتھ زمین پر آ رہے اور ساتھ ہی ایک سینی میں رکھی ہوئی چائے کی پیالیاں بھی زمین پر گر کر چور چور ہو گئیں۔ یوں ہنگامہ آرائی کرنے اور دھما چوکڑی مچانے کے بعد کاکارُستم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور غصے سے لال پیلا ہوتا اور پاؤں پٹختا قہوہ خانہ سے باہر نکل گیا۔

قہوہ خانہ کے مالک نے بصد حسرت و یاس ٹوٹی ہوئی ٹونٹی والے اوندھے پڑے سماوار اور ٹوٹی پھوٹی پیالیوں کی طرف دیکھا اور بڑی بے بسی کے ساتھ ایک ٹھنڈی سی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"قہر درویش برجانِ درویش" پھر غضبناک ہو کر اٹھا اور برا بھلا کہتا ہوا لڑکے کو مارنے کے لئے جھپٹا۔ کھیل بگڑتا دیکھ کر داش آکل نے جھٹ سے روپوں کی بھری تھیلی نکالی اور کھٹ سے اس کی طرف اچھالی۔ قہوہ خانہ کے مالک نے جھک کر اپنے قدموں میں پڑی تھیلی کو اٹھایا۔ اس کے وزن کا اندازہ کیا۔ اور ممنونیت بھری نظروں سے داش آکل کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔

اسی دوران میں ایک شخص بڑے سے گھیرے والی شلوار، لمبا سا کرتا، اور اس پر مخملی صدری پہنے اور سر پر نمدے کی ٹوپی رکھے گھبرایا گھبرایا سا قہوہ خانہ میں داخل ہوا۔ اس نے چاروں طرف ایک طائرانہ سی نظر ڈالی۔ یوں جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ جونہی اس کی نظر داش آکل پر پڑی لپک کر اس کی طرف

بڑھا۔ بڑے مودبانہ انداز میں کھڑے کھڑے سلام کیا اور بولا:

"حاجی صمد صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

"إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" اللہ تعالیٰ اس کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔"

"شاید آپ نہیں جانتے انھوں نے وصیت کی ہے..."

"تو مجھے کیا میں مُردہ خور نہیں ہوں جو مجھے بتا رہے ہو جاؤ جا کر مُردہ خوروں کو اطلاع دو۔"

"لیکن جناب مرحوم نے اپنی وصیت میں آپ کو اپنا وصی قرار دیا ہے اور..."

یہ سنتے ہی داشی آکل کو ایسا محسوس ہوا جیسا اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو اور سوتے سوتے بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ہو۔ اس نے نوعمر کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا جیسے اسے اس کی بات کا یقین نہ آرہا ہو۔ پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں جب اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو اس کی بیضوی شکل کی ٹوپی پیچھے کو سرک گئی۔ اور اس کے نیچے سے اس کی دو رنگی پیشانی نظر آنے لگی جو آدھی تو دھوپ کی تمازت کے باعث جھلس کر سیاہی مائل ہو گئی تھی اور آدھی ٹوپی کے نیچے چھپی رہنے کی وجہ سے بدستور سفید تھی۔ پھر اس نے پریشان کُن خیالات کو ذہن سے نکالنے کے لئے اپنے سر کو کئی بار جھٹکا۔ لیکن موہوم سے خدشات نے پھر بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا آخر کار اس نے اپنا پائپ نکالا اس میں تمباکو ڈالا، اپنے انگوٹھے کی مدد سے اس کو دبایا اور پھر اس کو سلگاتے ہوئے بولا۔

"خدا حاجی کو معاف کرے۔ اب تو جو ہونا تھا ہو گیا لیکن اس نے اچھا نہیں کیا۔ خواہ مخواہ میری جان کو مصیبت میں ڈال گیا۔ اچھا خیر، تم چلو، میں تمہارے پیچھے پیچھے آتا ہوں"

یہ سن کر وہ شخص جو کہ حاجی صمد کا پیشکار تھا تیز لمبے ڈگ بھرتا ہوا قہوہ خانے سے باہر نکل گیا۔

داشی آکل کافی دیر تک حیران و پریشان بیٹھا کش پر کش لگاتا اور دھوئیں کے مرغولے اڑاتا رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے قہوہ خانے کی فضا یک لخت سی بدل سی گئی ہو اور بہجت و مسرت کی جگہ ماحول پر افسردگی و اُداسی سی طاری ہو گئی ہو۔ آخر اس نے چلم خالی کی اور اٹھ کھڑا ہوا، طوطے کا پنجرہ قہوہ خانے کے ملازم کے سپرد کیا اور گہری سوچ میں ڈوبا ہوا قہوہ خانے سے باہر نکل گیا۔

جب وہ حاجی صمد کی شاندار حویلی کے صحن میں داخل ہوا تو قرآن خوانی ختم ہو چکی تھی البتہ چند پیشہ ور قسم کے قاری اور قرآن خواں ابھی تک پیسوں کی تقسیم پر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ اس نے اپنے آنے کی اطلاع بھجوائی اور حوض کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ایک بڑے سے کمرے میں بٹھایا گیا جس کی کھڑکیاں صحن میں کھلتی تھیں۔ ابھی اسے اس کمرے میں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مرحوم کی اہلیہ نے اسے پردے کی اوٹ سے سلام کیا اور خوش آمدید کہا۔ سلام دعا اور رسمی گفتگو کے بعد اس نے کہا۔

"بیگم صاحبہ! خدا آپ کے بچوں کے سر پر آپ کا سایہ قائم و دائم رکھے اور آپ کو ان کی خوشیاں دیکھنی نصیب کرے۔"

مرحوم حاجی صاحب کی بیگم گلوگیر آواز سے بولیں۔

"اسی رات کو جب حاجی صاحب کی حالت بہت بگڑ گئی تو انھوں نے جامع مسجد کے امام صاحب کو بلوایا اور تمام حاضرین کی موجودگی میں آپ کو اپنا وکیل ٹھہرایا۔ حاجی صاحب یقیناً آپ کو بہت عرصے سے جانتے ہوں گے؟"

"آج سے پانچ سال پہلے کا زرون جاتے ہوئے ہماری جان پہچان ہوئی تھی۔"

"اللہ بخشے وہ کہا کرتے تھے کہ اگر پورے شہر میں کوئی قابلِ اعتماد شخص ہے تو وہ آپ ہیں۔"

"حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اپنی آزادی دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ خیر اب اگر مرحوم نے مجھ پر اتنے اعتماد کا اظہار کیا ہے تو میں خدا کو حاضر ناظر جان کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر زندہ رہا تو خود کو اس بات کا اہل ثابت کروں گا۔"

دورانِ گفتگو دفعتاً اس کی نظر ایک سرسراتے ہوئے پردے پر پڑی جس کی اوٹ سے ایک کمسن نوخیز دوشیزہ جھانک رہی تھی اس کے معصوم چہرے پر حیا کی سرخی اور غزالی آنکھوں میں ...

شش تھی ۔ لمحہ بھر کے لئے نظریں چار ہوئیں ۔ تو ملتے ہی وہ
لی شرما کر پھر سے پردے کے اوٹ میں چھپ گئی ۔ کیا وہ لڑکی
ت حسین تھی ؟ ذرا سی دیر میں کیا پتہ چل سکتا تھا بہرحال
کی پرکشش آنکھیں اپنا کام کر چکی تھیں ۔ داش آکل کے دل
ایک ہلچل سی مچ گئی ۔ اس کا سر بے اختیار جھک گیا اور
ہے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں ۔

وہ لڑکی حاجی صمد کی بیٹی مرجان تھی جسے اپنے شہر کی مشہور
برون شخصیت اور اپنے سرپرست کو ایک نظر دیکھنے کے شوق
ربستس نے پردے کے پیچھے لا کھڑا کیا تھا ۔

اگلے روز سے داش آکل حاجی صمد مرحوم کے معاملات
دیکھ بھال میں جٹ گیا وہ علاقے کے چند معتبر اشخاص اور
منشی کے ہمراہ مرحوم کے گھر گیا اور ان کی موجودگی میں بڑی
تیاط سے گھر کی تمام اشیا کی فہرستیں تیار کروائیں ۔ جو چیزیں
ورت سے زائد تھیں انہیں ایک گودام میں رکھوا کر مقفل اور
چیزیں قابل فروخت تھیں انہیں فروخت کر دیا ۔ غیر منقولہ
ئیداد کی دستاویزیں پڑھوا کر سنیں اگر مرحوم کو کچھ لینا
تو وہ اس سے وصول کیا اور اگر کسی کو کچھ دینا تھا تو اس
دا کر دیا ۔ یہ تمام کام دو شبانہ روز میں انجام پا گئے ۔ تیسری
ت کو جب وہ تھکا ہارا اپنے گھر جا رہا تھا ۔ اسے سید حاجی
بیب کے چوراہے کے پاس امام قلی چلنگر ملا اور چھوٹتے
بولا ،

" دو روز سے کاکا رستم تمہاری راہ دیکھ رہا ہے ۔ کل کہہ رہا
کہ بابا یار بس یونہی بڑکیں مارتا ہے ۔ ہاں بھائی ۔ آج
تو اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں ۔ اب اسے ہم لوگوں سے کیا
رکار ؟ "

داش آکل نے اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب
؛

" کتے بھونکتے رہتے ہیں اور کارواں چلتا رہتا ہے ۔ جو
بکتا ہے بکتا رہے ۔ مجھے اس کی یاوہ گوئی کی کچھ پرواہ نہیں "

داش آکل کو اچھی طرح یاد تھا تین روز پہلے دو میل کے
وہ خانے میں کاکا رستم نے اسے دعوت مبارزت دی تھی
اور ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور اس
کی یہ دھمکی محض گیدڑ بھبکی ۔ وہ یہ بھی خوب جانتا تھا کہ اس
کی امام قلی کے ساتھ ملی بھگت ہے اور وہ دونوں اس پر طعن و
تشنیع کے تیر برسا کر محض جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا چاہتے
تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے امام قلی کی بات کو درخور اعتنا نہ
سمجھا اور اپنی راہ لی ۔

راستے بھر اس کا دھیان مرجان کی طرف لگا رہا ۔ اس نے
اسے بھلانے کی لاکھ کوشش کی لیکن وہ اسے برابر یاد آتی رہی ۔ وہ
جتنی کوشش کرتا تھا کہ اس کے خیال کو دل سے نکال دے وہ
اتنی ہی زیادہ اس کے دل میں گھر کرتی جا رہی تھی ۔ بار بار آنکھیں
موند کر اپنے سر کو جھٹکا دیتا مگر ہر بار جب وہ آنکھیں کھولتا وہ
مجسم ہو کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ۔

داش آکل کوئی چالیس کے پیٹے میں تھا ۔ وہ بڑا قوی ہیکل
مگر کریہہ المنظر شخص تھا ۔ پہلی نظر میں اس کی شکل و صورت ذوق
لطیف پر سخت گراں گزرتی تھی لیکن اگر کبھی کسی کو اس کے احباب
کی محفل میں اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوتا یا اگر اسے اس کی جوانمردی
اور عالی ظرفی کی داستانیں ، جو کہ شہر میں بچے بچے کی زبان
پر تھیں ، سننے کا موقع ملتا تو وہ اس کا دل و جان سے گرویدہ
ہو جاتا تھا ۔ اگر کوئی اس کے چہرے پر دائیں بائیں لگے ہوئے
زخموں کے نشانات سے لمحہ بھر کے لئے چشم پوشی کر لیتا
تو اسے اس کا چہرہ انتہائی شریفانہ اور حد درجہ پرکشش نظر
آتا تھا ۔ اس کی جھکی جھکی آنکھیں سیاہ اور گھنی بھنویں ، بھرے
بھرے گال ، ستواں ناک اور نہایت خوبصورت داڑھی اور مونچھیں
اور سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر برستی ہوئی فطری شرافت
و نجابت اور خاندانی وجاہت سے اس کی مردانہ شخصیت کے
حسن کو چار چاند لگ سکتے تھے ۔ لیکن برا ہو کٹار کے ان گہرے
زخموں کے نشانات کا جو اس کی کنپٹی ، پیشانی اور سرخ سرخ
گالوں پر جابجا نظر آتے تھے ۔ یہ بگڑے ہوئے زخم اگرچہ مندمل
ہو چکے تھے لیکن ان کے نیچے سے سرخ سرخ رنگ ابھی تک
چہرے پر جھلکتا تھا اس پر مستزاد یہ کہ ان میں سے ایک
زخم کچھ اس بری طرح لگا تھا ۔ جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کا

نچلا کنارہ کچھ نیچے کی طرف کھنچا کھنچا سا دکھائی دیتا تھا۔

اس کا باپ صوبہ فارس کے چوٹی کے زمیں داروں میں شمار ہوتا تھا۔ جب وہ اگلے جہاں کو سدھارا تو اس کی تمام جائیداد اس کے اکلوتے بیٹے کے ہاتھ آئی۔ اس کا دل بہت بڑا اور ہاتھ بہت کھلا تھا۔ دُنیاوی مال و منال کو وہ پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ جوانمردی، حریت پسندی اور عالی ظرفی اس کی شخصیت کے بنیادی اوصاف تھے۔ اس کو زندگی میں اگر کسی سے کوئی دلچسپی تھی تو اس بات سے کہ وہ اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو بے دریغ لٹائے۔ وہ اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ یتیموں، بیواؤں اور ناداروں کو دے دلا دیتا تھا اور کچھ حصہ شراب پینے میں اُڑا دیتا یا اپنے ہم پیالہ و ہم نوالہ دوستوں کے ساتھ جوئے اُڑانے میں اُٹھا دیتا تھا۔ اس کا ایک اور محبوب اور مرغوب مشغلہ رات کو شراب دو آتشہ کی بوتل چڑھانا اور بیچ چوراہے میں آکر بڑھکیں مارنا اور شہر کے نامی گرامی غنڈوں کو دھمکانا تھا۔

اس کی شخصیت کے تمام عیوب و محاسن اس دائرے کے اندر محدود تھے۔ ایک چیز جو کچھ عجیب سی لگتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ ابھی تک کسی کے تیرِ نظر سے گھائل نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ کئی بار اس کی دوستی کا دم بھرنے والوں نے اس کے حسن و عشق کے جال میں پھانسنے کی کوششیں کیں لیکن وہ ایسے ہزار دام سے ایک جنبش میں نکل گیا اور کوئی بھی شوخ و شنگ حسینہ اسے اپنی زلفِ گرہ گیر کا اسیر بنانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

لیکن جب سے وہ حاجی صمد مرحوم کا وکیل بنا تھا اور اس نے اس کی بیگم مرجان کو دیکھا تھا اس کے دل کے سمندر میں طوفان برپا ہو گیا تھا اور اس کی جان ایک عجیب مخمصے میں پھنس گئی تھی۔ ایک طرف فرض کی پکار تھی اور دوسری طرف محبت کے تقاضوں کا فشار۔ وہ روز بروز ایک طرف فرض کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا، اور دوسری طرف مرجان کی محبت اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔

وہ شخص جس نے اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹایا اور وہ جس نے روپیہ کو ہمیشہ ہاتھ کا میل جانا اب صبح اٹھتے ہی اسے یہ فکر دامن گیر ہو جاتی تھی کہ کس طرح صمد مرحوم کی جائیداد اور آمدنی میں اضافہ کرلے اور اس کے بیوی بچوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ اس کے اہل و عیال کو اپنے ایک چھوٹے سے گھر میں منتقل کر کے ان کا ذاتی بڑا گھر کرایہ پہ اٹھا دیا۔ بچوں کو گھر پر تعلیم دینے کے لئے ایک معلم مقرر کر دیا اور تمام نقد روپیہ نفع بخش کاموں میں لگا دیا۔ بس کچھ اسی قسم کے کام تھے جن کو کرنے کے لئے وہ صبح سے شام تک بھاگ دوڑ کرتا رہتا تھا۔

ان مصروفیات کے باعث اس نے راتوں کو کوچوں میں گشت کرنا اور شراب پی کر چوراہوں میں ڈھول بجانا بھی چھوڑ دیا۔ دشمنوں کے ساتھ خم ٹھونکنے کی ریت بھی ترک کر دی اور تو اور دوستوں کے ساتھ بھی وہ التفات نہ رہا اور وہ ان سے بھی کنی کترانے لگا۔

دوسری طرف اس کے تمام حریف اس کی یہ تبدیلی دیکھ کر شیر ہو گئے اور بدخواہ بغلیں بجانے لگے۔ شہر کے اوچھے ہوئے بدمعاش جن کے دل اس کے خلاف بغض سے بھرے ہوئے تھے اس کو نیچا دکھانے کے منصوبے۔ ان کے علاوہ وہ تمام لوگ جو کہ اس کے بیچ میں آجانے کی حاجی صمد مرحوم کی دولت کی لوٹ کھسوٹ میں کامیاب وہ مختلف محفلوں اور قہوہ خانوں میں بیٹھ کر اس کے خاکے اُڑانے لگے۔ خاص طور کا کارستم جیسے پست اور کمینے مستقل اپنے قہوہ خانے یا چائے میں اکٹھے بیٹھنے والا دھو کر اس کے پیچھے پڑے ہو سکتے اور طرح طرح بناتے تھے۔

ایک کہتا:

"ارے بھائی داش آکل کی کیا پوچھتے ہو؟ حاجی دیکھ کر اس کی بھی رال ٹپک پڑی ہے۔"

دوسرا اس کی بات کاٹتے ہوئے کہتا:

"چھوڑو بھائی اسے وہاں کا تو بیچ چکا ہے۔ اس کا وہاں گئے سے بھی بدتر ہے سارا دن اُدھر سے اُدھر پھرتا ہے۔"

گوشۂ عقیل صدیقی

کریم الاحسانی

آل انڈیا مشاعرہ سہارنپور

اس مشاعرہ میں بزم ادب سہارنپور کے منتظمین نے ۳۳ شعرا کو مدعو کیا اور صرف ۹ نے شرکت کی جنہوں نے شرکت کا وعدہ فرمایا وہ کہاں گئے؟ وہ وہاں گئے ہونگے جہاں سے زیادہ رقم ملی ہوگی۔ اب شعرا کے اصول اور عہد و پیمان بھی معشوقانہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

یہ مشاعرہ ایک ایسی بزم ادب کے زیر اہتمام منعقد ہوا ہے جسکے پیش نظر دو مقاصد ہیں۔ اول یہ کہ ترقی اردو۔ دوئم یہ کہ ہر سال اس بزم کی جانب سے کسی بھی مستحق شاعر کی مالی امداد کرنا یا پھر کسی ضرورت مند شاعر کی کتاب چھپوانا۔ چنانچہ اس سال اس اعزاز کے لیے جناب عالم فتحپوری کا نام لیا جا رہا ہے چونکہ انکی طبیعت خراب تھی۔ لہٰذا وہ مشاعرہ میں شرکت نہ فرما سکے اب شاید یہ رقم ان کی خدمت میں بذریعہ منی آرڈر پیش کی جائیگی۔ اس مشاعرہ میں ملک کے معتبر ذمہ دار مقبول و مشہور شعرا نے شرکت نہ فرما کر بزم ادب اور منتظمین مشاعرہ کو بدنام کرانے کی ناپاک اور مذموم حرکت کی لیکن اس کے باوجود مشاعرہ نہایت کامیاب رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ چند سر پھرے اور دیوانوں نے اسلامیہ انٹر کالج کے آس پاس سڑکوں اور چوراہوں پر اس قسم کے بورڈ لٹکا رکھے تھے کہ بہار میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ اور تم مشاعرہ کر رہے ہو کیا اس طرح یہ جنونی سہارنپور ہی کو بہار بنانے کا پلان تو نہیں بنانے چلے تھے۔ لیکن ان مفسدان ملک کی یہ چال ناکام ہو کر رہ گئی۔ اور کسی نے ان بورڈوں پر توجہ کیا تھوکا تک نہیں۔ کیا ستم ہے کہ ( ) مسلمانوں کے ہمدرد اردو کے جاں نثار اور فنکار بھی ہیں اور انکی فرقہ پرستی کا یہ حال ہے سوال یہ ہے کہ اگر بہار میں کسی جگہ فساد ہو تا ہے تو سہارنپور کے لوگ اس کے ذمہ دار کیوں ہیں۔ کیا بہار کے فساد کے دوران سہارنپور کے مسلمانوں نے سینا کا رخ تبدیل کیا؟ کیا انہوں نے ... کی۔ ؟ غالباً انہوں نے ایسا نہیں کیا ہوگا پھر یہ واویلا کیسا اور اشتعال انگیزی کیوں؟ ہاں اگر مدعو شعراء جیسے وامق جونپوری، فنا نظامی، شمیم جے پوری، بیکل اتساہی، ڈاکٹر بشیر بدر، میر رضوی، والی آسی، راحت اندوری وغیرہ بھی شرکت کرتے تو اس مشاعرے کو چار چاند لگ جاتے۔ لیکن وہ نہ آسکے انکی کمی کو محسوس کیا گیا۔ کیونکہ پوسٹر میں یہ نام نمایاں طور پر شائع کیے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حضرات کی منظوری کے بعد یہ نام دیئے گئے پھر اگر مشاعرہ میں پتھراؤ ہوتا یا پبلک مطالبہ کرتی کہ جن شعرا کے پوسٹر میں نام دیئے گئے ہیں وہ کہاں ہیں تو اس عالم میں کیا ہوتا۔ لہٰذا اب منتظمین مشاعرہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں اور ان وعدہ خلاف شعرا کو جواب دہی کے لیے عدالت میں طلب کیا جا رہا ہے

۱۷ مئی ۸۱ء

یہ اسلامیہ انٹر کالج سہارنپور کا وسیع کراونڈ ہے جسکو قناتوں سے احاطہ کیا گیا ہے سامعین کا ایک جم غفیر ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق سامعین کی تعداد پندرہ سے بیس ہزار تک ہو سکتی ہے گیارہ بج چکے ہیں پیارے لوگ خصوصاً اسٹیج کے سامنے نوجوان اور معمر شعرا اسٹیج پر آ گئے ہیں۔ سہارنپور کے نوجوان رہنما الحاج اسعد علی خان ایڈوکیٹ صدارت کے لیے جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا اسم گرامی پیش کر رہے ہیں سامعین تالیوں سے اظہار پسندیدگی کر رہے ہیں محمد علی موج رامپوری اسٹیج پر تشریف لائے ہیں۔ لہٰذا مقامی شعرا کو پڑھوانے کے لیے انور تاباں سہارنپوری ایڈوکیٹ کو مائک سونپا جا رہا ہے۔ تاباں صاحب سہارنپور کے جواں سال اور خوش فکر شاعر شمیم تہذیبی کو دعوت غزل دے رہے ہیں شمیم صاحب غزل سرا ہیں۔

کوئی قیمت ... دل کی خریدار نہیں

شریاں بڑھے کہاں ہوگا تمہیں اندازہ
پچھلے پہنچے ہیں خبر تک کوئی اخباروں میں
تیری رحمت پہ مرا حق ہے بتا اے یارب
اس لیے روزِ ازل سے ہوں گنہگاروں میں

شمیم صاحب مشاعرہ کا شاندار آغاز کیے جا رہے ہیں اور انجم جمالی مذاق و تفریح کا پہلو نشانہ بنتے چلے ہیں۔

پرائے دیس میں کیسی یہ سند ہے سلمٰی

اس شیپ بند کے مصرعہ پر نوجوان جی جی کا نعرہ بلند کر رہے ہیں انجم صاحب دعا میں دعاں سنا کر چلتے بنے اور اسلام سکندر صاحب سہارنپوری بڑی بے تکلفی سے سنا رہے ہیں۔

ہم انتہائے درد سے مجبور ہو گئے۔
معاف کرو تمہاری یاد سے کچھ دور ہو گئے

چونکہ شمیم صاحب بھی مقامی شاعر ہیں لہٰذا یار لوگ ابھی تفریح کے موڈ میں ہیں اور انور تاباں فرما رہے ہیں آپ جتنا صبر کریں گے اتنا ہی اچھا پھل ملیگا آپ کے سامنے ابھی بہت اچھے شاعر آنا چاہتے ہیں لہذا اب آپ شعلہ رامپوری سے ان کا کلام سنیے شعلہ صاحب فرما رہے ہیں۔

مرے قریب رہ کر بھی مری تلاش میں تھا
ابھی سماعتوں کا مقدر مری تلاش میں تھا
میں آئینہ تھا گرا - گر کے ٹوٹ گیا
تیری نگاہ کا پتھر مری تلاش میں تھا
میں اپنی آنکھوں سے آنسو کیسے کیسے دیتا
ہر ایک پیاسا سمندر مری تلاش میں تھا

شعلہ صاحب بھی داد وصول کیے جا رہے ہیں۔ اور یعقوب علی معصوم نے مائک پر آکر مختصر شعراء کا تعارف فرما کر حبیب عاصم دہلوی کو زحمت سخن دے رہے ہیں۔ عاصم صاحب فرما رہے ہیں۔

کل کی سی بات اور کوئی پوچھتا نہ تھا
کرسی ملی تو ان کے بھی تیور بدل گئے
فیصلوں میں میرا قتل ہوا ہے کچھ اس طرح
قاتل بدل گئے کبھی خنجر بدل گئے۔

پھر ایک گیت سنا کر داد لوٹ کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب عنایتی رامپوری یوں اعتماد کے ساتھ محفل کو گرماتے ہوئے چلے ہیں۔

اب مری آئینہ گری کو یہ ہنر بھی آئے
جن کو محسوس کروں میں وہ نظر بھی آئے
اب مرے عہد کا ہیں تجھے دلکاری کیا
آسمانوں سے کچھ تو اتر بھی آئے
طشت میں رکھ دیا ظالم نے سرِ کا منظر
دیکھنے کے لیے اب کوئی ظفر بھی آئے

اب داد نے ایک ہنگامہ کا سبب دھار لیا ہے کئی بار دہرا کر فرماتے ہیں

کچھ نہ کچھ سنگِ تحفظ کو تو میں رکھ لوں
منتقل ہو جو یہ ممکن ہے ادھر بھی آئے

پھر دو غزلیں ترنم سے سنا کر کامران مائک سے کھسک رہے ہیں اور میں سننے میں محو سا ہوں اعلان ہوا کہ ان غزلوں کو سنا چکا ہوں لیجئے تمنا جمالی غزل سرا ہیں۔

جیسے فلک پر جگمگ جگمگ دیکھ رہے ہیں تارے لوگ
یوں ہنس ہنس کر دیکھ رہے ہیں میرے آنسو سارے لوگ
ہم کو تو ہر لمحے گلشن کا کانٹا کانٹا پیارا ہے
جانے کس دل سے پھولوں کو کہتے ہیں انگارے لوگ
جنبش لب پر قید لگی ہے آہ و فغاں پر پہرے ہیں
کیسے اپنا حال سنائیں ہم قسمت کے مارے لوگ

تمنا صاحب ان دنوں علیل ہیں پھر بھی محفل کو گرما کر جا رہے ہیں اور سامنے والے منچلوں میں سے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہا موج صاحب لطیفے نہیں چلیں گے — بہت بہتر مولانا — موج صاحب نے فرمایا اس پر ایک دوسرے صاحب نے چیخ کر کہا ان کی داڑھی بڑھ رہی ہے۔ یہ مولانا نہیں ہیں۔ اسی ہنسی مذاق میں محمود خیام تخریباتی نہایت سنجیدگی سے سنا رہے ہیں۔

سارا پانی چہرے کے ہونٹوں سے گلابی کر گیا
وہ ندی کی مچھلیوں کو بھی شرابی کر گیا

اب داد کے بارے میں کیا عرض کروں مطلع بار بار دہرایا جا رہا ہے اور آپ اسی متانت سے فرما رہے ہیں۔

تو انہوں نے سعید اختر سے رسید کراچی پاس رکھ لی۔ سعید اختر کو تنویر کے پلان کا علم نہ تھا۔ چونکہ ہم لوگ دو چار روز چندہ وصول کرنے کے بعد محترم ڈاکٹر نسیم الزماں صاحب کے مشورہ کے مطابق بہ حالت مجبوری مشاعرہ اور چندہ کے التوا پر آمادہ ہو گئے تھے اس کا علم تنویر کو بھی تھا اور یقیناً انہوں نے سعید اختر سے رسید لے کر یہ پلان بنایا ہو گا کہ اگر برسات بعد ہم لوگوں نے مشاعرہ کرا دیا تو خیر ورنہ کم از کم مجھے بدنام کرنے کا موقع تو مل ہی جائے گا۔ ادھر برسات گزرنے پر ہم لوگوں نے مشاعرہ کا خیال ہی ترک کر دیا اور جتنی رقم وصول کی تھی خود میں نے اپنے ہاتھ سے نہایت دیانتداری کے ساتھ جملہ چندہ دہندگان کو واپس کرنا شروع کر دی اور لگ بھگ ستمبر کے پہلے سے دوسرے ہفتے تک میں نے فراغت پالی۔ میرے پاس واپسی چندہ کی وہ فہرست موجود ہے جس پر تمام چندہ دہندگان کے دستخط موجود ہیں۔ والسلام

قاضی سید عرشی کاظمی

● محترمی جناب سرور صاحب

سلام مسنون

جس چندے کی رسید کا ذکر آپ نے شان ہند میں کیا ہے وہ رسید عرشی صاحب نے میرے نام سے کاٹی تھی اور بہت عرصہ ہوا کہ میرے چندے کے مبلغ ۲ روپے واپس مل گئے تھے۔ میں نے یہ رسید مسٹر تنویر چشتی کو دیکھنے کے لئے دی تھی آگے میرے علم میں نہیں کہ آپ تک یہ کیسے پہنچ گئی۔

والسلام

سعید اختر

محلہ قلعہ۔ منگلور ٹاؤن۔ سہارنپور۔

آل انڈیا میر اکاڈمی لکھنؤ کو انعامات کیلئے اردو کتابیں مطلوب

میر اکاڈمی لکھنؤ ہر سال اردو کے کسی ایک ممتاز ادیب کی خدمات کا اعتراف میں "امتیاز میر" اعزاز سے اور مصنفوں، شاعروں اور محققوں کو "امتیاز میر" اور اردو کے مصنفوں کو ان کی مطبوعہ تصانیف پر "ایوارڈ" پیش کرتی ہے۔

اکاڈمی نے اپنی روایات اور ضوابط کے مطابق ۱۹۸۲ء میں پیش کئے جانے والے انعامات کے لئے اردو کے مصنفوں سے ان کی ۱۹۷۸ء، ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۱ء کی مطبوعہ تصانیف کی پانچ پانچ جلدیں طلب کی ہیں جن کو سکریٹری آل انڈیا میر اکاڈمی، اقبال منزل۔ وزیر گنج۔ لکھنؤ کے پتہ پر ۱۵ فروری ۱۹۸۲ء تک پہنچ جانا چاہیئے۔ ایسی کتابیں بھی داخل کی جا سکتی ہیں جن پر سرکاری یا غیر سرکاری انعامات مل چکے ہوں یا مالی تعاون سے شائع ہوئی ہوں۔

میر اکاڈمی منتخب کتابوں کو انعامات اور توصیفی اسناد ایک مخصوص تقریب میں پیش کرتی ہے جس کی اطلاع اخبارات میں شائع کر دی جاتی ہے اور تفصیل اور دعوت نامہ براہ راست انعام یافتگان حضرات کو مناسب وقت بھیج دیا جاتا ہے اور تاخیر سے بھیجنے کے لئے اس بات کی گنجائش رکھی جاتی ہے کہ اگر انعام پانے والے حضرات بذات خود اس تقریب میں تشریف نہ لائیں تو اپنے کسی نمائندے کے ذریعہ اپنا انعام و اعزاز حاصل کر لیں۔

(منظور احمد لاری) سکریٹری۔ آل انڈیا میر اکاڈمی۔
اقبال منزل۔ وزیر گنج۔ لکھنؤ۔

بقیہ باب استفسار اداروں میں عموماً انگلینڈ اور امریکہ کی لکھی ہوئی کتابیں کام میں لائی جاتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ عام طور پر مفید ہیں۔ پھر بھی ہم خاص طور سے ہندوستانی حالات کے پیش نظر لکھی ہوئی کتابوں کی ضرورت ہے اس نقطۂ نظر سے طالبانہ حلقوں میں اس کتاب کے خیر مقدم کی توقع کی جاتی۔ سرکاری یا نیم سرکاری ادارے ترجمے کے فرائض عام طور پر ایسے اصحاب کو سونپ دینے کے لئے مجبور یا بد دیانت ہوتے ہیں جنہیں مالی فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔ مگر اس کتاب کے لئے خواہ سفارش یا دوست نوازی کے تحت ہی مترجم کو یہ کتاب سونپی گئی ہو مگر یہ مسلم امر ہے کہ مترجم کا تعلق براہ راست درس و تدریس سے رہا ہے اس لئے ان کا انتخاب کسی حد تک مناسب ہے اور ترجمہ بھی بس مناسب حد تک ہی ہے۔ صرف ایک سطر کو ہی ملاحظہ فرمائیے "کوئی سکول اپنے طلبہ کی صحت مند ذہنی بڑھوار کی توقع نہیں کر سکتا" یہ لفظی ترجمہ تو کہا جا سکتا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ اسے رواں دواں بامعنی اور بامحاورہ ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر فی زمانہ اساتذہ جس علمی اقدار کے حامل ہیں ان کے لئے یہ ترجمہ برا نہیں۔ یہ کتاب بھی ناشر یا دفتر شان ہند سے دستیاب ہے۔

[illegible] تو تفریح یا تنقید میں فرق رہتی ہے۔ حالانکہ دینے ہی سامنے والے ہیں مہ صاحب اس کا دیگ سے بیک رہے ہیں۔

کیا حکایاتِ شب و روز کہوں
ذہن میں ہیں شرحِ گیسو میرے

مہ صاحب اپنی جگہ آکر بیٹھتے نام نامی اسیر کو یاد فرما رہے ہیں اسیر صاحب کس اللہ ہی عالم میں نظر آ رہے ہیں اور اس طرح [illegible] رہے ہیں

تسکیں بہت آرام دہ پانی نہ ہوا ہے
صحرا میں اگر خاک ہے شہر میں [illegible]
کیا جانیے کہ چارہ کی تقدیر میں کیا ہے
اس دور میں جو دل کا سکوں ڈھونڈ رہا ہے

اسیر صاحب رہائی پا کر بیٹھتے تھے اب دہلی کے جواں سال ہیرا سو شاعر امیر آغا قزلباش نے یوں محفل کو گرمانے کی ٹھانی ہے

مرے جنوں کا نتیجہ ضرور نکلے گا
اسی سیاہ سمندر سے نور نکلے گا
گرا دیا ہے تو ساحل پہ انتظار نہ کر
اگر وہ ڈوب گیا ہے تو دور نکلے گا
اسی کا شہر وہی مدعی وہی منصف
ہمیں یقیں تھا ہمارا قصور نکلے گا
یقیں نہ آئے تو اک بات پوچھ کر دیکھو
جو ہنس رہا ہے وہ زخموں سے چور نکلے گا

پھر دلا شبلی ہے نہ جانے کیوں مجھے اپنا یہ شعر یاد آگیا [illegible] سن رہے تھا

ہر کوئی اپنے ہی غم میں ہے گرفتار اس طرح
شور زنجیر سرِ زنداں ہے اسے کیا کیجیے

امیر صاحب داد پا کر بیٹھ رہے ہیں اب خالقِ بدیع [illegible] سیوہاروی اکرم عنایت کر رہے ہیں۔

ہیں [illegible] انسان خدا [illegible] ہے
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اس کے بائیں جانب والے زیادہ فرمتی کا مظاہرہ کر رہے ہیں ہلال صاحب قطعہ کو دل نکھر کو دیکھ اس تفریح کو دیکھ رہے ہیں اور [illegible] سکوت کے بعد فرما رہے ہیں یہ قطعہ پچھلی سرکار میں ایک طرح ترائی ہوا کرتے تھے انکی نظر ہے۔

کوئی رستہ ہے نہ منزل نہ مسافر نہ سفر
یہ کہاں گردشِ حالات کہاں جائے گی
اب اسی فکر میں دن رات ہیں بجلت کلام
دولہا غائب ہے یہ بارات کہاں جائے گی۔

پھر وہی ہڑبڑانگی ہے اور آپ ایک طویل نظم سے محفل کو قہقہوں پہ لگا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں۔ ادھر قیصرہ ریاض۔ اب ان کو پاکستانی کہا جائے یا برطانوی۔ غالباً یہ ان دنوں مہاد سرکار کی معتوب ہیں۔ سنا ہے بجنور نواز ہیں۔ دروغ بر گردن راوی خدا کرے کہ اس دھرتی پر انکو شہریت اور سکون ملے کئی آزاد نظمیں سنا کر چلتی بنیں اور غزل سے کتراتی رہیں ہیں بہ اصرار تمام ولود بہاری طالب اکبر عطا کر رہے ہیں۔

رہے ہیں یہ دونوں ہمیشہ یگانے
حقیقت فسانے حقیقت فسانے
یونہی غم یہ غم میں اٹھاتا رہا تو
کوئی غم نہ آجائے مجھکو اٹھانے

قبلہ طالب صاحب نائک سے کھسک آئے ہیں اور اب لکھنؤ کے منفرد غزل گو شاعر کرشن بہاری نور ترنم و عقل انداز سے عطا کر رہے ہیں

ایک غزل اس پہ لکھوں دل کا تقاضہ ہے بہت
آج کل خود سے بچھڑ جانے کا دھڑکا ہے بہت
رات ہو دن ہو کہ غفلت ہو کہ بیداری ہو
اس کو دیکھا تو نہیں ہے اسے سوچا ہے بہت
تشنگی کے بھی مقامات ہیں کیا کیا یعنی
کبھی دریا نہیں کافی کبھی قطرہ ہے بہت
کوئی آیا ہے ضرور اور یہاں ٹھہرا بھی ہے
گھر کی دہلیز پہ اے نور اجالا ہے بہت

نور صاحب ہر شعر پہ وہ داد لوٹ رہے کہ بس دیکھئے

اور غزل سے تعلق رکھتی ہے ادھر ملک کے مشہور بزرگ شاعر کیفی اعظمی صاحب تالیوں کی جھنکار میں تشریف لاکر کرسی پر بیٹھ کر کچھ شروع کرنا چاہتے ہیں کہ فرمائشوں کا ایک ہنگامہ ہے ابنِ مریم سنائیے۔

ایک آواز ——— کس کی ہے یہ بھی بتا دیجئے ———

کیفی صاحب یہ فرما کر عطا کر رہے ہیں۔

ہاتھ آکر لگا گیا کوئی — میرا چھپر اٹھا گیا کوئی
لگ گیا اک مشین میں میں بھی — شہر میں لے کے آ گیا کوئی
میں کھڑا تھا کہ پیٹھ پر میری — اشتہار اک لگا گیا کوئی
یہ اچھیں بھی ساتھ لے آیا — گاؤں سے جب آ گیا کوئی

پھر سومنات اور دوسری نظم سنا کر داد و تحسین پا کر کامراں پلٹ رہے ہیں پھر تالیوں کی گونج میں شہر بلند غزل پر خرابات خمار بارہ بنکوی آخر میں اپنے مخصوص ترنم سے غزل چھیڑ رہے ہیں

ہم انہیں وہ ہمیں بھلا بیٹھے
دو گنہ گار زہر کھا بیٹھے
حالِ غم کہہ کے غم بڑھا بیٹھے
تیر مارے تھے تیر کھا بیٹھے
جی تو ہلکا ہوا مگر یار و
رو کے ہم لطفِ غم گنوا بیٹھے
اٹھ کے اک بے وفا نے دی جان
رہ گئے سارے باوفا بیٹھے

اب داد دینے والے بھی بے حال سے ہو چلے ہیں اور آپ اسی بلند پر سے مقطع عنایت کر رہے ہیں

حشر کا دن ابھی ہے دور خمار
آپ کیوں زاہدوں میں آ بیٹھے

خمار صاحب یارانِ محفل میں گھر گئے ہیں اس لئے وہ پھر دوسری غزل شروع کر رہے ہیں چونکہ میں بھی دیر سے بیٹھا تھا بناظمی محمد اسحاق حافظ صاحب سے اشارہ پر پونے تین بجے جلسہ سے اٹھ چلا ہوں غالباً خمار صاحب کے ساتھ ہی یہ نشست اور اصحاب محفلِ شعر و سخن ختم ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر نثار علی خاں ایڈیٹر ہفت روزہ بہار، طالب سعید کار ساغر، حنیف سیمابی، کوثر تسنیمی، اسلامیہ انٹر کالج کے اساتذۂ کرام اور اسٹاف، عقیل اعظمی وغیرہ نے اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں بڑی لگن کے ساتھ جدوجہد کی یہ سب حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اس شہر میں ایک مشاعرہ کامیاب کرا دیا ورنہ یہاں کے ادب نواز مشاعرہ ہی کے نام سے بیزاری کا اظہار کر رہے تھے اور وہ اس لئے کہ ابھی چند دن پہلے ایک انڈو پاک مشاعرہ کا اعلان کر کے مقامی لوگوں کو ہی نہیں بلکہ پورے ملک کو بیوقوف بنایا گیا تھا اور پُر لطف بات یہ کہ وہ مشاعرہ آل انڈیا بھی نہ ہو سکا لہٰذا زخم خوردہ لوگوں نے شرکت تو کی لیکن ذرا سوچ سمجھ کر اور تعجب کہ یہ مشاعرہ ان کے اندازے سے کہیں بہتر اور کامیاب رہا۔ یہاں خلوص کی کارفرمائی تھی نمائش نہیں تھی۔

غزل

ڈاکٹر تفتہ گورکھپوری
یونیورسٹی

کانٹوں کی راکھ ہو کہ وہ ہو گل بدن کی راکھ
لُوٹے وفا سے مہکی ہے اک اک کفن کی راکھ
پہلے تو اہلِ فن نے جلایا لیا بس فن
اور اب اٹھائے پھرتے ہیں ہر سمت فن کی راکھ
میکش چلیں گے تیر پہ نوش سے اسی طرح
کرتے کو شیوہ نے خیر سے کر دی مدن کی راکھ
اک رات ایسا خواب بھی آیا نظر مجھے
میں پھر رہا ہوں ساتھ لئے اپنے تن کی راکھ
وہ وقت اب قریب ہے اے شمسِ تابناک
جب ہو گی تیری آگ سے اک اک کرن کی راکھ
محبوس ہیں جنم میں ترے انوارِ آگہی
لازم ہے اب ظہور ہے اس پیرہن کی راکھ
پہلے ہی رہبروں نے لگائی ہوئی ہے آگ
اب ہو گی ان کے فیض سے باغِ وطن کی راکھ
ممکن کہاں ہے تفتہ نمونۂ جہان کو
جب تک بنا نہ دوں گا چمن کی راکھ

احمد ندیم قاسمی

حفیظ کی غزل

حفیظ جالندھری نے لاجواب گیت کہے ہیں۔ اقبال کے بعد یہی حفیظ نے اپنی نظموں میں اپنے اسلوب خاص کا لوہا منوایا ہے حفیظ نے تاریخ اسلام کو زبان کی صحت و سلاست اور بیان کی بے ساختگی کے ساتھ نظم کر کے اپنی حیرت انگیز قادر الکلامی کا عرفانی ثبوت مہیا کیا ہے۔ لوگ اس طرح کی باتیں تو کھل کر کہہ دیتے ہیں اور سدا سے کہتے چلے آ رہے ہیں مگر تعجب ہوتا ہے کہ جس صنف سخن میں حفیظ کی شاعری نے ساحری کا کردار ادا کیا ہے۔ اس کی طرف ناقدین فن کی توجہ ذرا کم ہی منعطف ہوئی ہے۔ یہ حفیظ کی غزل ہے۔ کہیں یہ بات تو نہیں کہ ان کی طرف سے حفیظ کی غزل کی سادگی و پرکاری کے اعتراف سے بعض نامور غزل گو شعراء کے مقامات و مراتب کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یا کہیں یہ بات تو نہیں ہے کہ خیال کے ارتعاش اور جذبے کی موسیقی کا احساس و ادراک ہی حاصل نہیں ہے۔ "چراغ سحر" کی غزلیں پڑھ کر میرے ذہن میں یہ بہت بڑا استفسار ابھرا ہے کہ حفیظ کی غزل کے ساتھ کما حقہ انصاف کیوں نہیں کیا گیا جبکہ یہ غزلیں اپنے مضامین کی بلاغت اور اپنے الفاظ کے ترنم اور اپنی بحروں کی لطافت کے معاملے میں قطعی طور پر منفرد غزلیں ہیں جن سے محسوس اور دکھ لیے ہیں اور چھپا لیے ہیں کا اعتراف نہ کرنا استبداد یا کم ذوقی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ابو الاثر حفیظ جالندھری ایک ہمہ پہلو اور ہمہ رنگ شاعر ہیں ان کے شاہنامے قومی اور ملی نظموں اور گیتوں سے کوئی بھی دیانت دار نقاد صرفِ نظر نہیں کر سکتا مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان کی غزل کی تحسین کے معاملے میں ان کے ساتھ شعوری طور پر زیادتی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ غزل میں حفیظ صاحب اسلوب شاعر ہیں اور انکا بھی سہارا لینا ہے۔ اس زمانے میں جب اردو غزل پر فانی جگر، حسرت، اصغر اور یگانہ حکمراں تھے حفیظ کی آواز سب سے الگ پہچانی جا سکتی ہے۔ اس آواز میں الفاظ کھنکتے ہیں ان میں شکست خوردگی ہے نہ اضمحلال ہے نہ انفعال ہے نہ حفیظ نے تصوف میں پناہ ڈھونڈی ہے۔ نہ انہوں نے عرض ہنر خوشی و سرشاری کو غزل قرار دیا ہے۔ نہ انہوں نے معاملہ بندی کا سہارا لیا ہے [illegible] کو مرعوب کیا ہے۔ انہوں نے تو جب قدیم رنگ تغزل میں شعر کہا ہے تو بھی اس طرح کا شعر کہا ہے۔

آئینہ دیکھ کر مری صورت نہ دیکھیے
میں آئینہ نہیں مجھے حیراں نہ کیجیے

مگر میں اپنے اس مختصر سے تاثر میں صرف چراغ سحر کی غزلوں تک اپنے آپ کو محدود رکھوں گا۔ ان غزلوں کے پس منظر میں جو حفیظ ابھرتا ہے۔ اس نے سالہا سال کے تجربات کو بیشتر نہایت تلخ تجربات کو اپنے اندر کچھ اس طرح سمیٹ رکھا ہے کہ اب وہ شعر یوں بے ساختگی سے کہتا ہے جیسے باتیں کر رہا ہو

جو مرے دل میں ہے کہنے دیجیے
یا مجھے خاموش رہنے دیجیے

اظہار کی یہ سادگی پڑھنے والوں کو دھوکا دے جاتی ہے مگر سلاست اظہار کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے بڑی محنت اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرزا غالب نے بھی ایک دور میں اس طرح کی غزلیں کہنا شروع کی تھیں کہ۔

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

حفیظ کے اسلوب غزل کی تو نمایاں ترین خصوصیت ہی اظہار کی یہ سادگی ہے مگر بظاہر ان سادہ الفاظ میں معنی و مفہوم کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سخن شناسی اور دیانت داری شرط ہے جب حفیظ یہ کہتے ہیں۔ سو نظر آتی ہیں نہیں صورتِ حالات کوئی۔

اب یہی صورتِ حالات نظر آتی ہے

غم موجود ہے۔ آنسو بھی ہیں، کھاتو رہا ہوں، پی تو رہا ہوں۔

جیا تو دیکھتے ہیں (جیسے مجبوریاں ہوں)، تو سیاست اور معاشرت کا ایک پورا پینورامہ ہمارے سامنے پھیل جاتا ہے۔ ایک ایک لفظ ایک ایک علامت بن جاتا ہے اور شعر قاری کے ذہنی آفاق میں گونجتا رہ جاتا ہے۔ حفیظ کی اس عمر میں، ان سے غزل میں سرمستیٔ شباب کا تقاضہ کرنا شاید بعید از انصاف ہوگا اگرچہ وہ آج بھی نہیں تھکے اور اس انداز کے اشعار کہنے پر اب بھی قدرت رکھتے ہیں کہ:

اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی

ہمیشہ وصل ہی کی رات ہوتی

مگر ساٹھ سال کے تجربوں اور داناٰئیوں کو سمیٹ لینے کے بعد ان کے ہاں طنز کی جو کاٹ پیدا ہوئی ہے اسے میں معاصر اردو غزل کا سرمایہ قرار دیتا ہوں۔ حفیظ نے بھی ایک غزل میں خود کو طنز گفتار اور تلخ گفتار کہا ہے اور یہ تعلی نہیں ہے حقیقت ہے طنز نگار تو وہ ہمیشہ سے تھے۔ مگر طنز کی چوٹ اس وقت تک زیادہ موثر نہیں ہوتی جب تک طنز کرنے والا زندگی کے تمام شعبوں میں بے پردہ کا دو ٹوک بیان اور مروجہ نظامِ حیات کے عملی تضادات اور برائیوں پر تجزیاتی حد تک حاوی نہ ہو۔ "چراغِ سحر" کی غزلیں بتاتی ہیں کہ حفیظ حاوی ہیں چنانچہ ان کے طنز میں کوئی تصنع کوئی EFFORT نہیں ہے انہوں نے زندگی کی تلخیوں کو اپنے خون میں کھپا لیا ہے۔ اور انہیں اپنی شخصیت کا ایک ناگزیر حصہ بنا لیا ہے چنانچہ ان کے طنز کی دھار اس قدر تیز ہو چکی ہے کہ پڑھنے والا ایک بار تو لرز کر رہ جاتا ہے اور فوراً بعد اس کے ذہن پر مسئلے کے کتنے ہی پہلوؤں کی پرتوں کی پرتیں کھلتی جاتی ہیں چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

رہزنوں سے تو بھاگ نکلا تھا

اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے

بیت کدے سے چلے ہو کعبے کو

کیا ملے گا تمہیں خدا کے سوا

اللہ عطا پاش و خطا پوش سہی دوست

اللہ کے بندوں سے تو کچھ نہ ملے گا

خبر نہ تھی کہ غبارے گرا بھی کرتے ہیں

زمیں پہ دیکھ رہے تھے تم آسماں سے مجھے

فقیری نے بوریا دیا مجھ کو

تو کے میں بادشاہ ہی بیٹھا

ہم جس مقام پر ہیں وہاں سب مزے میں ہیں

سب کر رہے ہیں آہ و فغاں سب مزے میں ہیں۔

جا رہے ہو جاؤ لیکن لوٹ آؤ

لوٹ آؤ جب ہو مطلب دوستو

طنز سے بیشتر انتہا درجے کی تلخی کے ساتھ ہی انتہا درجہ کی مایوسی کا تاثر بھی مل سکتا ہے مگر یہ منفی طنز ہوتا ہے حفیظ کا طنز مثبت ہے یہ معاصر صورتِ حال سے بے اطمینانی اور اس لیئے اصلاحِ احوال کی تمنا سے توانائی حاصل کرتا ہے اسی لیئے تو حفیظ یہ کہتے ہیں کہ:۔

اب تو کچھ اور بھی اندھیرا ہے

یہ میری رات کا سویرا ہے

تو ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ:۔

آگے آگے چلو تبر والو

ابھی جنگل بہت گھنیرا ہے

مانا کہ حفیظ یوں بھی کہتے ہیں کہ:۔

"جو تن بدن گئے تھے جن نہ سے

وہ کانٹوں کے سروں پر ہیں کلاہیں

مگر وہ معاشرے کی طرف سے اس نوچا کھسوٹی پہ اداس ہو جانے کے باوجود یہ کہنے کا بھی حوصلہ رکھتے ہیں۔

آبروئے حیات کی خاطر

آرزوئے حیات باقی ہے

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے "چراغِ سحر" کے انتساب میں احباب کو آخری سلام پہنچانے کے باوجود اپنے اس تازہ مجموعہ کلام "طلوعِ سحر" کی اشاعت کی بھی نوید سنائی ہے اور ان

آفتاب سحر اور نصف النہار تام کے مجموں کا بھی انتظار رہے گا کیوں سے حفیظ کو تو انشا اللہ ابھی برسوں تک پاکستان کے ایوان تہذیب میں گنگنانا اور گونجنا ہے اور چراغِ سحر کی اس انداز کی نامکمل نظموں کی تکمیل کرنا ہے۔

اک دن ہم بھی جیتیں گے
ہم ہیں بازی ہارنے والے
جان وطن پر وارنے والے
آج تمہارے تخت جیت گئے ہیں ہم کو
بھوکا مارنے والے
لیکن اک دن
اک دن ہم بھی جیتیں گے
جیت کی دُنیا رنگ برنگی
ہار کی دُنیا رنگ برنگی
جیت کی تو ندیں موٹی موٹی ہار نہ پائے
سوکھی روٹی
لیکن اک دن
اک دن ہم بھی جیتیں گے۔

غزل

تحریر نسرین ظلال

منظر دہر کر دیا وقفِ نگاہِ نازِ دوست
دیکھئے کس کو دیکھ کر جلوۂ دل نوازِ دوست
حُسن فدائے روئے دوست، نغمہ ہیں سازِ دوست
کیف طراز کیوں نہ ہو عالمِ بزمِ بازِ دوست
شوق نہیں اگر مرا در خورِ بزمِ نازِ دوست
کیوں یہ نظر ملی مجھے لائقِ امتیازِ دوست
سعی بشر ہے منحصر کشمکشِ حیات پر
تلخی روزگار ہے لطفِ ستم طرازِ دوست
اس کا تصورِ جمال کیا ہے فریبِ شوق ہے
عین شہود بھی ہے صرف جلوہ گہِ مجازِ دوست
خواہشِ دید کیا کروں خوگرِ یاس دل ہے
میری جبیں کو ہو نصیب سجدۂ بے نیازِ دوست
عکسِ جمالِ دوست سے خیرہ ہوئی ہے چشم
دستِ طلب سے چھُٹ نہ جائے دامنِ امتیاز
سرخوشِ حُسن ہوں مگر تنگ نہیں ہے ظرفِ د
اہلِ ہوس یہ کیا کہا میری زبان و دارِ دوست
بیمِ خزاں سے دُور ہوں موسمِ گُل ہے
بس گئی میری آنکھ میں نرگسِ نیم بازِ دوست
سوئے حجاز جائیں کیوں منزلِ یار دل ہے
کعبہ سے ہے قریب تر کعبہ خانہ سازِ دوست
شکوۂ روزگار ہے اور رہ گیا رنجِ ادیب
محفلِ دل میں چھڑ گئے قصۂ غم گدازِ دوست

صالحہ خاتون

پکڑ

گئے اگر ناخن سے سر کھجانے لگتے تو غالباً یہی کیفیت ہوتی جو اس وقت توفیق کی تھی توفیق احمد عرف پھیکا جوانی عرفیت کسی کی زبان سے سن پاتا تو مارنے مرنے کو تیار ہو جاتا شیداں کے سامنے کتاب کھولے بیٹھا تھا۔

"پڑھیے "میری باجی کا نام شاذی ہے"

اور شیداں سطر پر انگلی رکھ کر دہرانے کے باوجود جب شاذی تک پہنچتی تو اس کے منہ سے حمیداں نکل جاتا آخر اس کی باجی کا نام حمیداں ہی تو تھا بار بار سمجھانے کے باوجود جب شیداں اسی غلطی کا اعادہ کرتی تو توفیق کا زناٹے دار طمانچہ جس میں اس کی قوت کے ساتھ جھلاہٹ اور ناکامی کا سکت بھی ملا ہوتا تھا اس کے گورے گال پر پانچ انگلیاں ابھار دیتا طمانچہ کھا کر شیداں بھیں بھیں رونا شروع کر دیتی اور وقفے وقفے سے دوپٹے کے کونے سے اپنی ناک پونچھتی جاتی عاجز آ کر توفیق اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر سر کے نیچے رکھ لیتا اور چارپائی پر چت لیٹا چھت کی کڑیوں کو گننے لگتا تھک کر شیداں خود ہی خاموش ہو جاتی اور کتاب پھینک یہ جا وہ جا پھینکارتی دوڑتی دوڑتی بھی سے ٹکی کبھی سموچا کنا اٹھا لاتی۔

"نے توں بھی کھا" وہ مفاہمت کرنا چاہتی توفیق شیداں کی اس ادا پہ سب کچھ بھول بھال کر اسے دیکھے جاتا ۔۔۔ وہ نادان اس کی نظر کی ہتک پہچانتی، تامر رہتی اور سموچیاں کتر کتر کے ہستی تکتی توفیق نے کتنی دفعہ بتایا تھا کہ یوں بڑا ایوں اگنا منہ میں بھکوس کر نہیں کھاتے چنے اسے چھیلتے ہیں پھر کنٹھ میاں بناتے ہیں اور پھر دوسری پلیٹ میں چھلکے چوس چوس کر جمع کرتے ہیں ایسے فرش پر بیٹھ کر گندگی نہیں پھیلاتے۔ مگر وہ غریب کیا کرتی کہ رفیق کی تمام تر وہ ملامتیں ترکیب صرف اس کی کتابی تک قابل عمل تھیں اور اس کے باہر جو بیس گھنٹے وہ دستور نافذ رہتا تھا جو شاید ازل سے اس گھر کا آئین تھا۔ نجیبن ہر کی مانگ شیداں سے جب اسکی شادی ہوئی تو اس کا خیال

پکی تھی اور ایسی کہ مٹی کے بجائے دھات کی بنی لگتی تھی۔ دھات بھی وہ جس کا پگھلانا آسان نہ تھا۔ پورے تین سال میں وہ ابھی تک اردو کی پہلی کتاب پر گڑی ہوئی تھی۔ اس عرصہ میں توفیق نے اپنی ساری قوت اسکی بھٹی میں جھونک دی تھی اپنے خاندان کا پہلا کالج تک پڑھا ہوا شخص توفیق بر ترکیب آنہ پکا محمد عزیز قدرت نے شیداں کو بخشی ہی نہ تھی اس کو پیدا کرنا توفیق کے بس کی بات نہ تھی لیکن اپنی ضد کے ہاتھوں وہ بھی مجبور تھا سیدھی سادی معقول شکل وصورت والی شیداں ان پڑھ ضرور تھی مگر اس کے اندر نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ توفیق کے ہاتھوں پٹنے کے باوجود اس نے پڑھنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ اپنی سی بڑی کوشش کرتی کہ جیسے وہ بتاتا ہے ویسے ہی پڑھے لیکن وہ غریب کیا کرتی کہ حرف کو پہچاننے کی شدبد اس میں تھی ہی نہیں۔ بڑی دقتوں کے ساتھ مسجد کے مولوی صاحب نے اسے تین کلمے رٹوائے تھے جن میں اب صرف اول کلمہ طیب اسے یاد رہ گیا تھا۔ فرفر اسے تو ڈھولکی بلت وہ تو یہ بھی نہ سمجھتی تھی کہ ۔۔

چندا کہاں گزاری رات ۔۔

البتہ جب سہ

چنا کہاں گزار ... اور ... دے

سنتی تو اپنی بھنسی بھنسی بھاری آواز میں ریڈیو کے ساتھ ساتھ گاتی بد نایاب ہے کہ پیسے فیض کا مصرعہ جوش کی نظم اور فراز کی غزل کیا اور ایک وہ فراست تھی کمبخت! جتنی جاذب نظر تھی اتنی ہی ذہین اور فطین بھی ہزاروں کی تعداد میں اشعار یاد تھے فیض کی پوری پوری نظمیں وہ آنکھیں بند کر کے نہایت دلکش لہجے میں سناتی تھی لیکن فراست کے ساتھ قیامت یہ تھی کہ ایک ہی کلاس میں پڑھنے کے باوجود توفیق صرف دور ہی سے اسے تک سکتا تھا صرف دیکھ سکتا تھا وہ اپنے چچا صاحب سے نیچا دیکھنے کے خلاف تھی ان

تعمیر کیے ہوئے تھا ہر چند توفیق لکھ پڑھ گیا تھا تاہم پورے خاندان سے ٹکر لینا اس کے بس کی بات نہ تھی لہٰذا اس نے شیداں وا اپنانے ہی میں عافیت جانی اسے اپنے اوپر اعتماد بھی تھا کہ وہ خود ساختہ سانچے میں اسے ڈھال سکتا اس کے علم نے اس وقت اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ جب تک مٹی کچی ہو تو کمہار کے ہاتھ اسے حسب خواہش شکل دے سکتے ہیں لیکن بھٹی میں تپ جانے کے بعد مٹی کا برتن توڑ کر ہی بدلا جاسکتا ہے اور شیداں تیس سال سے تو بہر حال تھی کم بخت ٹوٹتی ہی نہ تھی اس جد و جہد میں وہ جس طرح تشدد کے عمل سے بھی گزری تھی یہ اذیت جسمانی ہی نہیں ذہنی اور اخلاقی بھی تھی اب شیداں اتنی پتھر بھی نہیں تھی کہ توفیق کی نفرت اور سرد مہری کو سمجھ نہ پاتی اور اثر نہ لیتی۔ توفیق اس کا شوہر نہیں تھا اتالیق ہو کر رہ گیا تھا جب اس کو نا کامی ہوئی تو اس نے گھر آنا چھوڑ دیا وہیں شہر میں جہاں نوکر تھا کمرہ لے کر رہنے لگا۔ مہینہ پندرہ دن میں ایک آدھ روز کے لیے آجاتا تو شیداں سے سیدھے منہ بات تک نہ کرتا وہ غریب پھر بھی رہا تھ چوڑیاں پہنے بھورے رنگ کے موٹے موٹے رسے جیسے بالوں میں خوب تیل لگائے کنگھی پٹی کیے رنگ برنگے موتیوں والے پراندے باندھے دانتوں پر دنداسہ لگائے آنکھوں میں باہر تک کاجل نکالے چہرے پر کسی تھرڈ کلاس کمپنی کی کریم ملے اور گالوں پر انتہائی کچے رنگ کی سرخی تھوپے بار بار بلا ضرورت اندر باہر کرتی آنگن میں برگد کی گھنی چھاؤں میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے توفیق کے سامنے سے بے شمار مرتبہ گزرتی مگر وہ نظر اٹھا کر نہ دیکھتا۔ توفیق کے چلے جانے کے بعد وہ کوٹھڑی میں آکر ریشمی لاچا اتار کر اپنا سوتی لاچا پہن لیتی بالوں سے اتنی زور سے پراندے کھینچتی کہ چند بال ٹوٹ کر پراندے کے ساتھ چلے آتے گالوں پر سے سرخی اتنی شدت سے اتارتی کہ وہ سرخ ہو جاتے اور دونوں رخسار جیسے کالے ہو جاتے غصے سے چوڑیاں کھینچ کھینچ کر کلائیوں سے اتارتی جس کے نتیجے میں چند ایک ٹوٹ کر اس کی موٹی سخت کھال میں پیوست ہو جاتیں ہاتھوں جذب کر لیتی لیکن ایک بات تھی۔ وہ زخمی ضرور ہوتی تھی مگر کبھی اپنی چوڑیوں کو کلائیوں میں پھر سے توڑنے کی کوشش نہ کرتی اور دونوں کلائیوں کو کبھی بھی نہیں رگڑتی تھی اس تمام ردِ عمل کے ہاں وہیں پیدا ہو کر گھٹتی جہاں پر کسی بھی عورت کی آکر ٹوٹا کرتی ہے گھٹنوں میں منہ دے کر سسکیاں لیتی رہتی جب تک یہ ایسا کرنے کی ہمت باقی رہتی تھی اور وہ ایک بہت ہی سہانی شام تھی شمال کی جانب سے گھنگھور گھٹا بدمست ہاتھی کی طرح جھومتی چلی آرہی تھی تیز ہوا کے جھونکے اپنے جلو میں خشک پتوں کو اڑاتے ہوئے شانوں کے بال اس کی پیشانی پر بکھیرتے تھے توفیق اپنی ساری تلخیں بھول کر بہت ہی خوشگوار انداز میں زیر لب گنگناتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

جب ساون بادل چھائے ہوں
جب پھاگن پھول کھلائے ہوں
جب چندا روپ لٹاتا ہو
جب سورج دھوپ نہاتا ہو
یا شام نے بستی گھیری ہو
اک بار کہو تم میری ہو

اپنی دھن میں مگن جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو ٹھٹک گیا فراست کی روح اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی گویا وہ اب تک عالم خواب میں فراست سے محو کلام تھا اور سامنے شیداں حسب معمول میلے کپڑوں میں کھڑی مرغیوں کو ہنکا رہی تھی توفیق کو دیکھتے ہی وہ اندر بھاگی اسے کیا پتہ تھا کہ وہ آج اس طرح آجائے گا اندر جا کر توفیق کسی سے ملے بغیر سیدھے اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا شیداں اپنا حلیہ درست کر کے آئی تو وہ چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا وہ اس کے پائنتی بیٹھ گئی اس نے پھر اس کی طرف رخ نہ کیا تو شیداں کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ فوراً اٹھ گئی واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں اردو کی ہی کتاب تھی اس نے ایک عرصہ کے بعد کتاب کھولی سبق نکالا اور سطر پر انگلی رکھ کر بولی:
[illegible]

میری باجی کا نام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے توفیق کی جانب دیکھا۔ اُسے یاد نہ تھا اور وہ جانتی تھی کہ غلط پڑھنے سے توفیق خفا ہو جائے گا جب تیسری مرتبہ بھی شیداں میری باجی کا نام ۔ ۔ ۔ ۔ کہہ کر رک گئی تو نہ جانے توفیق کو کیا ہو گیا وہ جو اب تک سیلی بیٹری کی طرح بجھا تھا یکدم چارج ہو گیا چپ کیوں ہو گئی پڑھتی کیوں نہیں؟

پڑھو ۔ آگے پڑھو! وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ہاتھ ڈھول کے ڈنڈوں کی طرح شیداں پر برسنے لگے۔ اس کا سر توفیق کے ہر تھپڑ کے ساتھ گھوم جاتا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ شیداں کے منہ سے اُف تک نہ نکلا جب توفیق نے دم لیا تو شیداں بے دم ہو چکی تھی اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پیٹ لینے کے بعد توفیق پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

شیداں کو جب ہوش آیا تو اس کے حواس ہمیشہ کے لیے گم ہو چکے تھے اب اس کا ٹھکانا پاگل خانے ہی میں ہو سکتا تھا چار سال سے وہ وہاں زیرِ علاج ہے اور آج بھی اُردو کی پہلی کتاب کی طرح اس مقام پر ٹھہری ہوئی ہے جس پر چند سال قبل تھی اس کی حالت نہ تو مزید بگڑتی ہے اور نہ ہی کچھ افاقے کی صورت نظر آتی ہے اب بھی کاغذ کا کوئی ٹکڑا اسے مل جائے تو وہ انگلی رکھ کر کہتی ہے —

پڑھو! پڑھو! پڑھو!

نقوشِ تحریر

توصیف علوی [illegible]

اس دور کی سوغات کو تحریر کروں گا
ہر [illegible] کی خدمات کو تحریر کروں گا
اب تک بھی جو انسان کے ہیں سینے میں پلتے
اُن گمرہ خیالات کو تحریر کروں گا
دکھلاؤں گا ہر گام پہ بکھرے ہوئے کانٹے
ہر راہ کے خطرات کو تحریر کروں گا
آئے گی نظر آج کی نفسا نفسی بھی
زخموں کے نشانات کو تحریر کروں گا
جو پاسبانِ امن و اماں کا ہیں عطیہ
اُن لطف و عنایات کو تحریر کروں گا
ذکر آئے گا تاروں کے بھی اندازِ کرم کا
جب ہر شبِ ظلمات کو تحریر کروں گا
طوفان و تلاطم کا تو اب ذکر ہی چھوڑو
ساحل کی کرامات کو تحریر کروں گا
جب اپنے چراغوں سے جلی اپنی ہی محفل
کچھ ایسے سانحات کو تحریر کروں گا
جس میں کہ مغلوب ہیں ساقی بھی [illegible]
اُس میکدہ کی حالات کو تحریر کروں گا
گلشن میں ہوا جن سے نیا نغمہ چراغاں
اُن شخصوں کی خدمات کو تحریر کروں گا
جو وقت کے بدلے ہوئے تیور ہی بدلتے
ان رمز و اشارات کو تحریر کروں گا
پھولوں کی جبینوں پہ بھی آئے گا پسینہ
حالات کے [illegible] کو تحریر کروں گا
نالے بھی [illegible] کرامات
[illegible] کو تحریر کروں گا
[illegible] کتنا ہے کا جہاں ذکر [illegible]
محنت کی عنایات [illegible]

غزل

محسن ہاشمی بلاری

یاس وغم دستیاب ہیں دونوں
بے حد و بے حساب ہیں دونوں
حُسن کا ناز عشق کی مستی ،
آپ اپنے جواب ہیں دونوں
حادثہ جانے آج کیا گذرا ؟
اُن کی آنکھیں پر آب ہیں دونوں
شیخ بھی کم نہیں برہمن سے
آدمی لاجواب ہیں دونوں
آپ کے سامنے مہ و خورشید
شرم سے آب آب ہیں دونوں
آج تو مَیں بھی میری توبہ بھی
غرقِ موجِ شراب ہیں دونوں
زندگی اور موت اے محسنؔ
اک صحیفے کے باب ہیں دونوں

غزل

اخلاقؔ سہسوانی

یہ دردِ محبت ہے ناداں اِس کا تجھے عرفاں کیا ہوگا
اے چارہ گر اب رہنے بھی دے اس درد کا درماں کیا ہوگا
شبنم کا لہو بہ جائے گا جب ہوگی کہیں تزئینِ چمن
غم اور خوشی کا ہوگا تماشہ، جشنِ بہاراں کیا ہوگا،
بہتے ہوئے اِن اشکوں کی قسم ہنستے ہوئے ان زخموں کی قسم
محسوس جو کرلے عظمتِ غم وہ غم سے پریشاں کیا ہوگا
افسانہ حسن و عشق اگر تا صبح مکمل ہو بھی گیا
اے شمع تری محفل میں پھر قرخاکِ شہیداں کیا ہوگا
ہم دیدۂ پُرخوں سے اپنے دامن کو بنالیں رشکِ چمن
یہ سوچ کے پھر رہ جاتے ہیں انجامِ گلستاں کیا ہوگا
طوفان و حوادث کی زد سے بچنا کوئی مشکل کام نہیں
طوفاں میں لیکن بے ڈوبے اندازۂ طوفاں کیا ہوگا،
رہبر پہ بھروسہ کرلینا اخلاقؔ تری نادانی ہے
جو خود ہی لُٹیرا بن بیٹھا وہ تیرا نگہباں کیا ہوگا

(ادارہ)

بابِ انتقاد

آئینۂ سکندری

جناب قمر مُرادآبادی اور حضرت علی سکندر جگر مُرادآبادی کا مُدتوں ساتھ رہا۔ آئینۂ سکندری میں قمر صاحب نے حضرت جگر کے صحیح صحیح حالاتِ زندگی لکھے ہیں۔ اور انکی شاعری پر حتی المقدور سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ جگر صاحب کی مستی و سرشاری کے دَور کے پیشِ نظر یار لوگوں نے کئی داستانیں گھڑ رکھی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ یہ سب من گھڑت کہانیاں قطعاً جھوٹ ہیں۔ جگر صاحب کا اخلاق اتنا بلند تھا جسکی تقلید کی جانی چاہیئے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے جگر کو صحیح طور پر سمجھا اور جانا جاسکتا ہے۔ کتاب کے آخر میں جگر صاحب کے کچھ خطوط کی نقل بھی شائع کی گئی ہے جو انہوں نے مختلف اصحاب کے نام لکھے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے حُب الوطنی اور ہمدردیِ قوم کے صحیح مفہوم کو سمجھا جاسکتا ہے۔ آخر میں ادوھ کے عنوان سے جگر مرحوم کی والدہ سے متعلق ایک ایسا واقعہ لکھا گیا ہے جس کے پڑھنے سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ اگر جگر کی صحیح تصویر دیکھنی ہو تو آئینۂ سکندری پڑھیئے۔ ۱۹۲ صفحات کی اس کتاب کی قیمت دس روپیہ ہے۔ تاج بن قمر۔ قاضی ٹولہ مُرادآباد۔ یوپی یا دفترِ شاہراہ ہند نئی دہلی ۶ سے دستیاب ہے

تیموری

امر سنگھ کا نام افسانہ نگاروں کی صفِ اول میں آتا ہے گو ان کا افسانہ پڑھنے کو سالہا سال تک انتظار کرنا ہوتا ہے ظاہر ہے جو افسانہ نگار اپنی تخلیق کو سالوں بعد پیش کرے گا وہ یقیناً صحت مند اور دیرپا اثرات رکھنے والی ہوگی۔ "تیموری" ان کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں اکثر افکار کراچی اور شاہراہ نقوش ایسے رسائل میں مدتوں پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ اچھے اور نئے انداز کے افسانے جو جدت لیئے ہوئے ہوں اگر آپ پڑھنا چاہتے ہیں تو تیموری پڑھیئے۔ جسے مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے۔ ۱۷۶ صفحات کا یہ افسانوی مجموعہ جو بہترین طور پر شائع کیا گیا ہے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ یا دفترِ شاہراہ ہند سے چودہ روپیہ پچھتر پیسے میں خریدا جاسکتا ہے

ریت، سمندر، جھاگ

ہرچرن چاولہ کی افسانہ نگاری کا محدود دائرہ یہ ہے کہ ان کے اکثر و بیشتر افسانے گرد و پیش کے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور مثل مشہور ہے گرد و پیش دیکھنے والا محتاط رہتا ہے اور دور دیکھنے والا بعض اوقات قریب کی کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ لہٰذا ہرچرن چاولہ صاحب کا ہر افسانہ چونکہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے اس لیئے۔۔۔ قاری کے دل میں اُتر جاتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں ان کے سترہ افسانے ہیں جن میں دو تو غیر مطبوعہ ہیں اور باقی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تمام افسانے یورپ میں تخلیق ہوئے اس لیئے یہ ہم وطنوں اور مشرقی بھائیوں کی زندگی کی اچھائیاں اور برائیوں کے عکس کے ساتھ اپنے معاشرے اور وطن کی مٹی کی خوشبو کو اپنے اندر بسائے ہوئے ہیں جو یورپ میں ہیں۔ ۱۵۲ صفحات پر پھیلا ہوا یہ افسانوی مجموعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ نے اپنی روایات کے مطابق شائع کیا ہے قیمت بارہ روپیہ پچھتر پیسے۔ ناشر یا دفتر شاہراہ ہند

کلامِ اطہر

سید اطہر حسین صاحب اطہر کے دو مجموعہ ہائے کلام متاعِ نظر اور جامِ شعور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کا تیسرا مجموعۂ کلام۔ کلامِ اطہر شائع ہوا ہے، جناب شجاعت علی سندیلوی نے کلامِ اطہر کا مقدمہ لکھا ہے اور کس قدر حقیقت نگاری کی ہے "سید اطہر حسین صاحب کی شاعری کا محرک اور سرچشمہ ان کا غم یار ہے۔ شدتِ غم اور کرب نے ان کا خوابیدہ جذبۂ شاعری تمام بندشیں توڑ کر بیدار اور آزاد ہو گیا۔ اس نے قلب و جگر پر ایسے اور اتنے نشتر لگائے فکر و نظر کی خلش اتنی زیادہ بڑھائی کہ حادثاتِ غم شعر کے سانچے میں ڈھلنے لگے۔"

غزل کا پیکر بن گئے۔ غزل کا یہ پیکر سلاستِ زبان، ندرتِ بیان،
بلندیِ فکر، رفعتِ تخیل اور وسعتِ نظر کا حسین و دلکش مرقع ہے
شاعر نے پہلے اس سے اپنا جامِ شعور لبریز کیا اس کے بعد
متاعِ زندگی حاصل کی لیکن ہنوز اس کا کرب و اضطراب اور
سوزِ دروں کم نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں اور زیادہ شدت پیدا ہو
اور گہرائی آگئی ہے۔ اگرچہ یہ تمام محاسن جامِ شعور اور متاعِ
زندگی میں بھی موجود ہیں لیکن اس تیسرے مجموعۂ کلام "اظہر" میں
خصوصیات شعورِ حیات و کائنات کے ساتھ نمایاں ہیں۔
شاعر کے وسیع مطالعے اور تجربے نے اس کو شخصیت میں نکھار پیدا کیا ہے
ان دونوں مجموعوں میں ساغرِ اظہر کو زمانہ میں غم و حزن و ملال کی [illegible]
[illegible] لیکن قنوطیت یا مایوسی نہ ہونے کے برابر تھی
[illegible] شکستہ ہونے کے باوجود امید کے چراغ روشن رکھے
بات و کائنات کے معاملات و مسائل پر نظر رکھی۔ ہمت و
استقلال اور عزم و حوصلہ سے کام لیا۔ بے حسی، جمود، پست ہمتی
و مایوسی سے حتی الامکان اپنے کو دور رکھا۔ شرح و بیان
سے کیف و سکون حاصل کیا۔ اور اعلیٰ اقدار، بلند خیالات
و جذبات کی حسن و عشق کی زبان میں ترجمانی کرتا رہا ہے

شرح و بیانِ درد سے اظہر ملا سکوں
بے کیف زندگی میں یہی کام آگیا

کلامِ اظہر میں جانفزا اور روح پرور نغموں کی فضا، کیف آور
و مسرت انگیز کرنوں کی ضیا، حیات آفریں اور حرارت بخش آنچ
دونوں موجود ہے۔ اس میں اظہر صاحب نے اپنے جذبہ و احساس
خیال، علم و عرفان اور تجربے و مشاہدے کو زبان کی لطافت
خیال کی رعنائی اور فکر کی گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔
[illegible] مافی الضمیر کے اظہار و بیان اور مفاہیم و مطالب
[illegible] پر قدرت کاملہ حاصل ہے دل کی تپش اور سوزِ دروں
[illegible] کا عنوان اور موضوع ہے۔"
[illegible] غزلیات کا یہ مجموعہ [illegible] سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے
[illegible] شوقِ مطالعہ ذوقِ شعری کی سیری کے لیے [illegible]
[illegible] ناشر سید اظہر حسین - ۲ - [illegible]
([illegible]) یا دفتر ماہنامہ شانِ ہند دہلی ۶ سے [illegible]

کھڑکی

پرکاش پنڈت کے افسانوں کا مجموعہ نئی آواز جامعہ
نگر نئی دہلی ۲۵ نے شائع کیا ہے بظاہر یہ مجموعہ تازہ ترین ہے
اور اس کا ناشر بھی نئی آواز ہے مگر افسانے پرانے ہیں۔ مگر کہانیوں میں
پرانی شراب سے سرور زیادہ ہوتا ہے۔ پرکاش پنڈت علیل
ہیں اور ایسی حالت میں ان سے نئی تخلیقات کی توقع کرنی بھی
نہیں چاہیے۔ دیباچہ [illegible] زیرِ نظر مجموعہ کے افسانے بقول پرکاش پنڈت
واقعی ایسے ہیں "یہ کہانیاں میری کہانیاں نہیں ہیں۔ میری [illegible]
ہو گئی ہوں لیکن دراصل یہ آپ کی کہانیاں ہیں جنہیں میں نے
آپ سے لیا اور اب اپنے قلم کی مہر لگا کر آپ کو واپس لوٹا
رہا ہوں"
نئی آواز مکتبہ جامعہ کا ایک ذیلی ادارہ ہے اور مکتبہ جامعہ
کی مطبوعات میں کتابت کی غلطیاں بہت کم ہوتی ہیں۔ معلوم
ہوتا ہے کھڑکی کی پروف ریڈنگ جلدی میں کی گئی ہے۔
صفحات ۱۹۲ قیمت بارہ روپیہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵
سے یا دفتر شانِ ہند سے خرید لیجئے

زمزمے

صوبہ بہار کے شعراء میں حبیب آروی صفِ اول کے شعراء
میں سے ہیں۔ حضرت سیماب اکبر آبادی سے شرفِ تلمذ تھا اور
اب ان کے کئی شاگرد ہیں۔ حال ہی میں بہار اردو اکادمی کی جزوی
مالی تعاون سے ان کا مجموعۂ غزلیات زمزمے شائع ہوا ہے۔
۷ غزلیات کا یہ گلدستہ ہر انداز میں ایسا پرکشش اور دل
نواز ہے کہ ذوقِ سلیم رکھنے والوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں
ڈاکٹر مظہر رضوی برق دانا پوری کا پیش لفظ حبیب آروی کا فن
پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ حبیب آروی صاحب نے عرضِ حال
کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے۔ ایسی نثر پر کئی کتابیں قربان کی جا سکتی
ہیں۔ چھپائی، کتابت اور کاغذ نہایت اعلیٰ ایک آدھ جگہ کتابت
کی غلطی رہ گئی ہے۔ قیمت دس روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ الحماد کے
نگار شاہی، ڈی کے خانہ۔ مانگو جمشید پور (بہار)
کلی نمبر ۳۹۹

نگاروں میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں مگر زیرِ نظر مجموعہ ان کے تیرہ مختصر سنجیدہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ وجاہت علی سندیلوی جس طرح طنز و مزاح کے میدان میں اپنی ایک جداگانہ روش رکھتے ہیں ان کے یہ افسانے بھی تخیل و خیالی نہیں بلکہ بقول ان کے اپنے گرد و پیش سے جیتے جاگتے انسانوں ہی کے دکھ درد اور الجھنوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش ہے گزشتہ چالیس سال میں انہوں نے اس طرح کے جو افسانے لکھے یہ مجموعہ ان کا انتخاب ہے ۱۷۱ صفحات قیمت چودہ روپیہ پچھتر پیسے ناشر نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ یا دفتر شانِ ہند سے۔ فرمائش خریداری کی جا سکتی ہے۔

بادۂ صافی

کوکن (مہاراشٹر) کے مشہور شاعر صوفی بانکوٹی مرحوم کا یہ مجموعۂ کلام ان کے فرزند نذیر احمد بدیع الزماں اعادہ بانکوٹی نے ترتیب دیا ہے۔ اور پیلوی تعلقہ منڈنگڑھ (مہاراشٹر) کے اردو دوست حضرات کے تعاون سے موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ نے شائع کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دنوں جو شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں بادۂ صافی ان میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے صوفی مرحوم مولانا ابوالرضی گنوری مرحوم کے تلامذہ میں سے تھے اور حضرت اثر احمی نے کئی بار باتوں باتوں میں صوفی صاحب کی شخصیت شرافت اور ان کی شعری سوجھ بوجھ کی راقم الحروف سے تعریف کی بدیع الزماں خاندانی طور پر بھی لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے جب فرزند نذیر احمد کا یہ حال ہے تو ان کے والدِ محترم کے کلام میں کسی فنی سقم کا ہونا ناممکنات میں سے ہے یہ مجموعہ ہر شعری ذوق رکھنے والے کے لئے مطالعہ کی چیز ہے اور کوئی بھی لائبریری جس میں اردو کی کتابیں رکھی جاتی ہوں اس شعری مجموعے سے محروم نہیں رہنی چاہئے۔ بادۂ صافی کا پیش لفظ بھی ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کے قلم کا رہین منت ہے کسی کتاب کا پیش لفظ لکھنے والوں کو ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کے تحریر کردہ مختلف کتابوں کے پیش لفظ پڑھنے چاہئیں ۱۲۸ صفحات کا یہ مجموعہ کتابت۔ طباعت اور کاغذ کے لحاظ سے بھی عمدہ

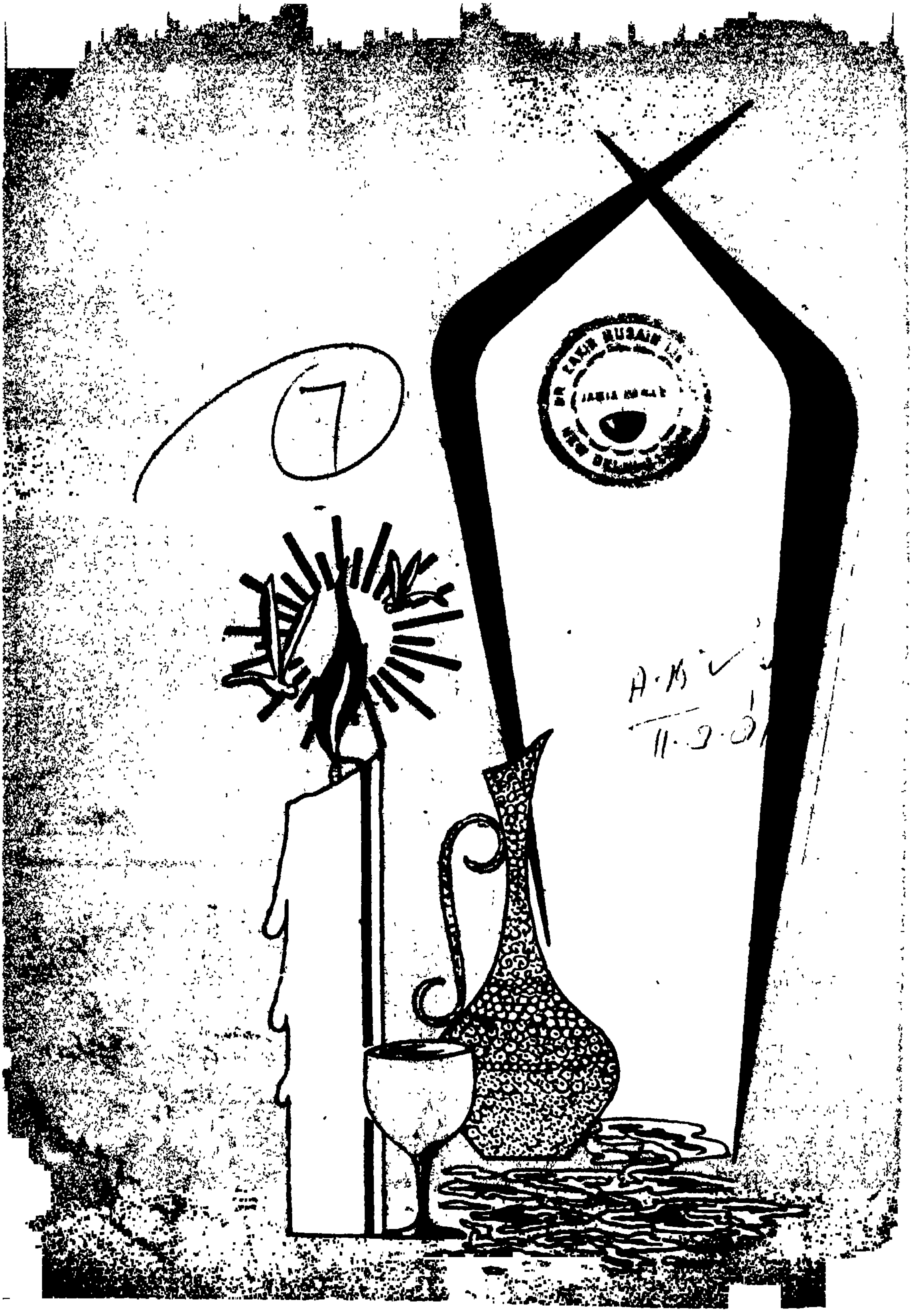
ہے ناشر یا دفتر شانِ ہند سے دستیاب ہے

ماڈرن قصۂ درویش

ابوالکلام (جن کے والدین نے ان کا نام رکھتے وقت کسرِ نفسی سے کام لیا اگر ابوالکلام کے ساتھ آزاد کا بھی اضافہ کر دیتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا) کے فکاہیہ مضامین کا مجموعہ اس عام میں شائع ہو کر مناسب حد تک مقبولیت حاصل کر زیرِ نظر فکاہیہ سفرنامہ "موڈرن قصہ دو درویش" بھی کچھ اچھے انداز میں اپنا زورِ بیان دکھا سکتے ہیں اور اس مجموعہ بہت سے مقصدی نظریات کو جلو میں لئے ہوئے۔ کتاب ہر لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے۔ سیاحوں میں حاجی کے بجائے کوئی اور نام تجویز کر دیا جاتا تو بہتر تھا اگر محمد تغلق کا نام نامی کتاب کی مقبولیت کا باعث مصنف کے لاشعور میں تھا۔ تو پھر وہ ایک طنز نگار کے بجائے تاجر پر زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ۹۶ صفحات کی مجلد کتاب ۷ روپیہ میں زیور پبلیکیشنز باقر گنج پٹنہ نمبر سے مل سکتی ہے

راکھ اور کلیاں

محترم جناب کوثر چاندپوری کا یہ ناول ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا اب اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ کے علمی ادارے ناولستان۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ نے شائع کیا ہے۔ کون سا ایسا اردو داں ہے جو جناب کوثر چاندپوری سے ناواقف ہوگا اردو افسانہ لکھنے والوں میں ان کا پہلی صف میں شمار ہوتا ہے آسان اور سلیس زبان میں لکھنا کوثر صاحب کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عوام ان کے افسانے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں "راکھ اور کلیاں" کوثر صاحب کا جو ہندوستان میں پہلی بار شائع ہوا (؟) جس میں کوثر صاحب ان روایات کو ویسے ہی گلے لگائے ہوئے نظر آتے ہیں صدی لعل بھی ان کا طرۂ امتیاز ہیں تین سو سے زائد صفحات پر یہ ناول مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵ یا دفتر شانِ ہند۔ قیمت سولہ روپیہ پچاس پیسے۔





ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپرز انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵/۴۴۳ | رجسٹرڈ نمبر ڈی ۳۰/۳۲

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

زر سالانہ ۱۵/- روپیہ
فی پرچہ ۱/۵۰ روپیہ

جلد نمبر ۴۲ | جولائی سنہ ۱۹۸۱ | شمارہ نمبر [illegible]

ہندی کے مسلمان شعراء

۱۔ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد پر ایسی مفید کتاب آج تک اردو زبان [illegible]

۱۔ اس کتاب کو پڑھنے سے اردو ہندی کے خود ساختہ نام نہاد دانشور جو سرکاری عہدوں پر ہندی ہو یا اردو اس ہندی کی بقا [illegible] کے مناظر [illegible] ہیں مندو دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ جو کام سرکار [illegible] روپیہ سے نہ ہو سکا اور جو کام اردو اور ہندی کے نام نہاد دانشور [illegible] نہ کر سکے وہ ایک [illegible] لگن کے باعث پورا کر دیا۔

۔ اس کتاب نے ہندی مسلمانوں کا سر اونچا کر دیا ہے اور [illegible] کہہ سکتے ہیں کہ ہندی زبان کی نشو و نما اور ترقی میں جو کردار مسلمانوں نے ادا کیا ہے اسے ہندی زبان فراموش نہیں کر سکتی۔ [illegible] سلسلے میں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں [illegible] سے آگے دکھائی دیتے ہیں۔

۔ اس کتاب کو پڑھنے والا ہر ہندی داں [illegible] اردو [illegible] کو ایسی بیش بہا تصنیف سے مالا مال کر دیا۔

ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی، اردو اکادمی، انجمن ترقی اردو ہند اور ریاستی اردو اکادمیوں کے ذمہ دار ارکان میں [illegible] کے جراثیم اپنا اثر دکھانے لگیں اور وہ ندامت محسوس کریں کہ انھوں نے سرکار کی عینی عیاشی کروڑ ہا روپیہ اردو کے [illegible] غیر ضروری کتابیں شائع کر کے محض ناشروں کو فائدہ پہنچایا اور ہندی کے مسلمان شعراء [illegible] بہادر ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار تصنیف کو شائع کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

آپ ہمارے اس دعوے کی صداقت کی جانچ کے لئے یہ کتاب پڑھئے اگر آپ ہماری اس تحریر کی حرف حرف تائید نہ فرمائیں تو کتاب واپس کر کے اس کی پوری قیمت لے لیجئے۔ حضرت پنڈت عدی نے اپنی زندگی کے عزیز ترین پچاس سال اس کتاب کی تالیف پر صرف کئے اور اپنی زندگی بھر کا سرمایہ اس کتاب کے لئے مواد فراہم کرنے پر لگا دیا اور اس کتاب کو ہر پہلو سے مستند بنانے کے لئے فاضل مؤلف نے ہزار ہا کتابوں کا مطالعہ کرنے میں اپنی آنکھوں کو قربان کر دیا۔ یہ نادر روزگار کتاب ہندی کے مسلمان شعراء شائع ہو گئی ہے پہلی فرصت میں منگا لیں۔

قیمت ۵۱/- روپے

مزید معلومات کیلئے:۔ دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے رجوع کیجئے۔

درپاپرکاش سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ایمپائر کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو، جامع مسجد دہلی میں چھپوا کے اور سرورق پائلٹ پریس سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند، انیس ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

اترپردیش اردو اکادمی کی طرف سے

ترقی اردو بیورو کی انعام یافتہ کتابیں

1۔ کلیاتِ نعقی

مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

قیمت: [illegible] روپے

2۔ کتاب کی تاریخ

شایان سندر واقی

[illegible]

[illegible]

[illegible] صفحات ـــــ [illegible]

قیمت: 12.00 روپے

3۔ دانتے

زیڈ اے شاکی

[illegible]

[illegible] صفحات ـــــ 192

قیمت: [illegible] روپے

4۔ ہندوستانی [illegible]

مصنف: [illegible]

مترجم: عبدالقادر [illegible]

[illegible]

[illegible]

زیبائی سائز ـــــ صفحات ـــــ [illegible]

قیمت: 12.20 روپے

5۔ نورتن کہانیاں

شمیم احمد

اس کتاب میں ہندوستان [illegible]

[illegible] بچوں کے لیے آسان۔

[illegible]

زیبائی سائز ـــــ صفحات ـــــ 192

قیمت: [illegible] روپے۔

6۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں ـــــ ایس ایم جعفر

مترجم: سعید انصاری

[illegible]

ہندوستان [illegible] مسلم [illegible] نظام

تعلیم اور تعلیمی سرگرمیوں [illegible] ثقافتی پہلو [illegible]

کیا ہے۔ سعید انصاری نے اس کا ترجمہ آسان سلیس

[illegible] زیبائی سائز ـــــ

صفحات ـــــ 170 ـــــ قیمت: 8.25 روپے

7۔ تیمارداری

حسین فاروقی

نرسنگ یا تیمارداری کی ضرورت اسپتالوں کے

علاوہ گھروں میں بھی ہوتی ہے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

زیبائی سائز۔ صفحات: 288 ـــــ

قیمت 12.20 روپے

8۔ بھارت کی لوک کتھائیں

محمد قاسم صدیقی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] صفحات ـــــ 232 قیمت 12.20 روپے

دو تازہ کتابیں

مدرسہ بالغات

[illegible]

[illegible]

[illegible] صفحات ـــــ 192

قیمت: [illegible] روپے

وضع اصطلاحات

سید وحید الدین سلیم

[illegible]

[illegible]

[illegible] ـــــ زیبائی سائز

صفحات ـــــ 318 ـــــ قیمت 12.20 روپے

[illegible]

شعبۂ فروخت و نمائش، ترقی اردو بیورو [illegible]

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

مہادیوی ورما کی حق گوئی

شریمتی مہادیوی ورما نے انگریزی روزنامہ "پانیر" لکھنؤ کو انٹرویو دیتے ہوئے اردو کی مخالفت میں جو کچھ کہا ہے اُس پر اردو حلقوں (خدا کرے کہ کوئی ایسا حلقہ ہو) میں کافی لے دے ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ انجمن ترقی اردو ہند کے ہفت روزہ "ہماری زبان" کا اداریہ لکھتے وقت، اداریہ نگار کو ایک دو جگہ املا غلط ہو جانے کا بھی احساس نہیں رہا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اداریہ لکھتے وقت اداریہ نگار غصّے کی حالت میں تھے۔

ایسی حالت میں غصہ یعنی جوش کی بجائے شوجھ بوجھ یا دوسرے الفاظ میں ہوش کی ضرورت ہے۔ محترمہ مہادیوی ورما کے حسب ذیل فرمان کو ٹھنڈے دل سے پڑھئے کیونکہ ان کے انٹرویو کا یہی حصہ قابلِ غور ہے۔ باقی باتیں ایسی ہیں کہ جن کو آسانی سے جُھٹلایا جاسکتا ہے۔ مہادیوی صاحبہ فرماتی ہیں۔

> "اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی جدوجہد کی آڑ میں فرقہ وارانہ بنیاد پر ملک کو مزید تقسیم کرانے کے لئے ایک سازش رچائی جارہی ہے۔ اگر ہم زبان و ادب کے میدان میں سیاست کو داخل ہونے کی اجازت دیں گے تو آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہ کریں گی"

اب ذرا اپنے گریبان میں مُنہ ڈالئے اور خُدا لگتی کہئے کہ محترمہ مہادیوی ورما کے اس فرمان کا ایک ایک حرف زبانِ حال سے پکار پکار کر یہ نہیں کہہ رہا کہ مہادیوی ورما نے ایک ایسی "چیتاونی" دی ہے۔ جس پر ہر وطن پرست کو پوری پوری توجہ دینی چاہئے۔

جبکہ اردو کو محض اس لئے مراعات دی جارہی ہیں کہ برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی کو مسلمانوں کے ووٹوں کی ضرورت ہے۔ معاملہ مراعات تک ہی رہتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ افسوسناک تو یہ ہے کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور زبان کی یہ تقسیم اب آپ کو سرسیہ کے اس قول کو دہرانے پر مجبور کر رہی ہے کہ:

"اردو زبان ہندو اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ ہے"

اب یہ مشترکہ ورثہ سیاست کی نذر ہو چکا ہے اور ہم خوش ہیں کہ حکومت اردو کو اس کا مقام عطا فرما رہی ہے۔

یہ مت سمجھئے کہ زبان کی تقسیم ہمیشہ فرقہ پرستی کو ہوا دیتی ہے اور فرقہ داری ہی کسی ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا آزمودہ نسخہ ہے۔

اس لئے اگر مہادیوی ورما نے اپنے انٹرویو میں ایک تلخ تعبیرِ حقیقت کا اظہار کیا ہے تو ان کی [illegible] کے قابل بھی مانی جانی چاہئے۔ اور ہر وطن پرست کا فرض ہے کہ زبان و ادب کے میدان میں سیاست کے داخلہ پر احتجاج کرے اور جو ایسا نہیں کرتا اس کی وطن دوستی مشکوک ہے۔

ہم اردو کو تا اگرچہ [illegible] ہندو رسم الخط میں [illegible] ایک بکواس سمجھ کر زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے۔ [illegible] مہادیوی ورما کہیں یا مرارجی ڈیسائی کہیں یا کوئی اور۔

اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ [illegible] وجود میں آنے کے لئے حکومت پاکستان کی طرف سے [illegible] اردو زبان کو سرکاری حیثیت سے [illegible] ایک [illegible]

محترمہ مہادیوی ورما کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ [illegible] تک ہندی نے ہماری جدوجہدِ آزادی کے [illegible] ہے۔ حالانکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ اس [illegible] اردو نے جدوجہدِ آزادی کے اتحاد میں [illegible] زبان "انقلاب زندہ باد" ایک نعرہ دے دیا۔ جبکہ جنگ آزادی میں اس نعرے نے جو کام کیا ہوگا اس کا صحیح تجزیہ آج تک کوئی انگریز حاکم ہی کر سکتا ہے۔ مہادیوی ورما نہیں۔

مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے مسلم اردو دانشوران اردو کے تئیں ایماندار نہیں ہیں۔ انھیں کو ملک کے چھینکے بھوکے لقمہ بانٹ کر کا زیادہ مزہ ہے۔ ان کے ہاں یہ تقسیم ہوتی ہے۔ یا زبان کی اس تقسیم کی آڑ میں ملک کو مزید تقسیم کرانے کے لئے جراثیم ..... پیدا کئے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ان مسلم اردو دانش وروں کے تحت الشعور میں بھی ملک کی مزید تقسیم کا کیڑا ایسے ہی کلبلا رہا ہے۔ جیسے کسی مسلم بدترین وطن دشمن مسلم لیگی کے دل و دماغ میں یہ خواہش چٹکیاں لے رہی ہو۔

"ہماری زبان" کے اداریہ میں مہادلیوی ورما صاحبہ کو محترمہ مرحومہ کی ہندی کا کوکیلا قرار دیا گیا ہے حالانکہ کسی وقت ... مہادیوی ... انھیں ... کہا گیا ہے۔ ایڈیٹر شان ہند ہندی زبان سے قطعاً ... مہادیوی ... ہمارے ملک ... سے قطعاً واقف ... ہے کہ موصوفہ ملک کی ایک اہم ... ہیں اور ان کی ... ہو کر ... ہو تا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ... کے اشتراک کے اس حصہ کو ... کرنا یقیناً ملک سے غداری ... ہے اقتباس پہلے دیا جا چکا ہے۔

ہم دل سے ... اور ... ہمارے ... سے چاہتے ہیں کہ اردو ہمارے ملک کی دوسری سرکاری زبان تو کیا اولین ... قرار دے دی جائے مگر اس ... کو سیاست کے گندے کھیل کا میدان نہیں بنایا جانا چاہئے۔ ان دلی جذبات کے ساتھ ہم اردو کے مسلم دانشوروں سے مودبانہ گزارش کریں گے کہ یہ دنیاوی فائدے عارضی ہوتے ہیں مگر زبان کی آڑ میں ایک ایسا گناہ ہے جس کا کفارہ ... نہ ہو سکے گا

اقتصادی مفاد اردو کی ترقی کا اچوک نسخہ

ہمارا یہ نظریہ ہمیشہ رہا ہے کہ اردو کی ترقی جبھی ہو سکے گی اگر اردو سے اقتصادی مفاد جوڑا جائے گا۔ مثال کے طور پر جب تقسیم وطن ہوئی تو وہاں آنے کے بعد یہ فکر ہوئی کہ بچوں کو ہندی پڑھائی جائے ... ساتھ اردو بھی پڑھائی جا ... رہی ...

صاحب کا جو ان دنوں دلی کالج میں اردو ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے جنہوں نے ایڈیٹر شان ہند کو یہ صحیح مشورہ دیا کہ میں اپنے لڑکے ہربنس لعل کو کالج میں اردو ضرور پڑھاؤں۔ لہذا جب ہربنس لال نے اردو میں بی۔ اے آنرز تمام یونیورسٹی میں اولین پوزیشن پاس کیا تو اسے فوراً سرکاری ملازمت محض اس لئے ملی کہ وہ اردو میں گریجویٹ ہے اور آج اسی اردو کے باعث پرلیس آفیسر اردو ہے۔

اس زمانے میں جب کہ اردو کی ... اردو پڑھانے کے بجائے کار کو اپنانے کی بجائے "عالمی اردو کانفرنس" کے انعقاد میں ۹ لاکھ روپیہ برباد کرنے میں ہی مصروف رہی جا رہی ہے آپ یہ جان کر حیرت فرمائیں گے کہ ماہنامہ "شمع" غیر ارادی طور پر اردو کی توسیع اور ترقی ... ایسا رول ادا کر رہا ہے کہ ملک کی تمام انجمن ترقی اردو اور اردو اکاڈمیاں مشترکہ طور پر بھی یہ کام نہ کر سکیں گی۔ معاملہ یوں ہے کہ ماہنامہ شمع کی طرف سے شمع ادبی معمہ کا سلسلہ سالہا سال سے جاری ہے اور اس ضمن میں تین لاکھ روپیہ ... کے انعامات ... تقسیم کئے جاتے ہیں۔ تو وہ عوام جو اردو نہیں جانتے تھے اور انھیں یہ انعامات حاصل کرنے کا شوق تھا تو انھوں نے اپنے طور اردو سیکھنی شروع کر دی اور اس وقت ہزاروں غیر مسلم ... جن میں نوجوانوں کی تعداد ... ہے اپنے آپ اردو میں ... حاصل کی کہ جس سے وہ شمع ادبی معموں کے اشتہارات کو سمجھ سکیں جس روز شمع ادبی معموں کی آخری تاریخ ہوتی ہے ... ہزاروں شمع ادبی معموں کے حل ڈالنے والے حضرات میں ... سکھ اور ہندو حضرات کی ہوتی ہے۔ اور اگر شمع ادبی معموں میں انعام حاصل کرنے والوں کی فہرستیں مطالعہ کی جائیں تو ہندو اور سکھ حضرات کی تعداد بھی مسلمان دوستوں ... ہوتی ہے چنانچہ اس بار معمہ نمبر ۲۲۲ میں اول انعام ... ہزار روپیہ ... جنہوں ... ہندو خواتین ہیں۔ جناب ترلوک ناتھ ... اس بار "شمع معمہ" کی آخری تاریخ پر جگادھری کے ایک ایسے نوجوان سے تعارف کرایا جس نے ... اردو ... ادھر ادھر سے اسے پڑھا اور ... یہ نوجوان شمع معموں کے اشتہارات پر اس ...

باقی صفحہ پر

جانشینی

مندرجہ بالا عنوان سے شانِ ہند میں جو اعلان جناب شبیر حسن خان صاحب وکیل کی طرف سے شائع ہوا ہے وہ وکیل صاحب موصوف کی قدر شناسی اور منصفانہ طبیعت کا ثبوت ہے۔ ایڈیٹر شانِ ہند نے بھی جو نوٹ لکھا ہے نہایت مناسب ہے۔ میں مندرجہ ذیل چند سطور میں اسی موضوع پر لکھ رہا ہوں۔

کسی اُستادِ فنِ شعر کی جانشینی کے لیے مندرجہ ذیل شرطیں ضروری ہیں۔

۱۔ جانشین اُستاد کا شاگرد ہو اور اعتراف کرتا ہو۔

۲۔ جانشین کی فنی قابلیت ایسی ہو کہ اُستاد کی طرح شاگردوں کے کلام کی اصلاح کر سکے۔

۳۔ وہ بزرگ اور سنجیدگی رکھتا ہو اور ایسا صاحبِ اخلاق ہو جیسا ایک صاحبِ کمال کو ہونا چاہئے۔

۴۔ جانشین اپنی فنی صلاحیت کی بنا پر اب ممتاز ہو کہ شعرائے وقت اور بیشتر دیگر اساتذہ مرحوم اس کی فضیلت کے معترف ہوں۔

۵۔ انجمن نے زبان اور فن شعر کی قابلِ قدر خدمت کی ہو۔

مندرجہ بالا حقیقت تحریر کیا جائے تو ابوالبلاغت جناب رتن پنڈوروی کو جناب تلوک کا جانشین ماننے ہوئے مسرت ہوتی ہے [illegible] اور [illegible]۔ [illegible] فن کی درج بالعموم [illegible] اور [illegible] ایک مثال [illegible]۔

جناب رتن نے حضرت دل سے تلمذ کا تذکرہ بھی مواقع پر کیا ہے۔ صرف شعر درج ذیل ہے۔

ہو گیا دل میں سوا ذوقِ غزل گوئی کا
حضرتِ دل کی رتن نے جو عنایت دیکھی

جناب رتن نے اپنے مجموعۂ کلام بہشتِ نظر میں صفحہ ۸۱ سے صفحہ ۹۹ تک فنِ سخن کے متعلق جو تحریر [illegible] اور سلسلہ [illegible]

نکات فن بتائے ہیں ان سے موصوف کی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ آپ پابندیوں کے ساتھ شعر کہنا ہر شاعر کے لیے لازمی سمجھتے ہیں۔ جناب رتن ایک عالم باعمل ہیں۔

جہاں تک حُسنِ اخلاق اور سنجیدگی کا تعلق ہے وہ ایک گوشہ نشین ہیں ہنگامہ شور و شر سے دور لیکن کتنے ہی طالبانِ فن ان سے فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ نو واردانِ بساطِ سخن کی وہ جس طرح ہمت افزائی کرتے ہیں یہ وصف کم اساتذہ میں ہوتا ہے۔

حال میں انجمن ابوالبلاغت کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔ اس سے ان کے مقبولِ خاص و عام ہونا صاف ظاہر ہے۔ ان کے مداحوں کی اگر فہرست تیار کی جائے تو ایک طویل مضمون کے برابر ہو جائے۔ جناب جگر بریلوی۔ علامہ منور۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ حضرت نوح ناروی۔ جناب تلوک چند مرحوم۔ علامہ گوپی ناتھ امن لکھنوی۔ جناب سید احتشام حسین۔ جناب آل احمد سرور۔ جناب نجم آفندی۔ جناب عابد شاہجہاں پوری۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ جناب واثق جونپوری وغیرہ نے ان کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔

خدمتِ زبان کے سلسلے میں ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مطبوعہ تین دیوان اور آٹھ دیگر کتابیں ہیں۔ اس سے زیادہ تعداد غیر مطبوعہ تصانیف کی ہے۔

الغرض جناب رتن میں وہ جملہ کمالات موجود ہیں جو ایک عالم میں ہونے چاہئیں۔ ہم جناب رتن کی خدمت میں تہِ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ پرماتما ان کو عمرِ دراز عطا کرے تاکہ وہ تادیر زبان اور زبان کے ذریعہ وطن کی خدمت کرتے رہیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

خاکسار جی ایل ادیب لکھنوی
۱۴۷، سکندر نگر، غازی آباد (یوپی)

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

اندرونِ بوہڑ دروازہ ملتان شہر (پاکستان) کے حکیم چیلا رام کا شہرہ قرب و جوار ہی میں نہیں بلکہ دور دور تک تھا۔ اسی باعث میرے نانا جناب کیول رام میچند، فورٹ سنڈیمن (بلوچستان) سے علاج کرانے کی غرض سے ملتان تشریف لائے۔ میرے ہاں قیام فرمایا اور میری ہی یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ حکیم صاحب موصوف سے انہیں دکھانے کا وقت مقرر کیا جائے اور دورانِ علاج دوا لانا۔ مریض کا حال بیان کرنا اور ضرورت پڑنے پر حکیم صاحب کو اپنے مکان پر لاکر مریض کو دکھانے کا سب انتظام بھی کیا جائے۔

اُن دنوں میں محلہ گجر کھڈا ملتان چھاؤنی میں مقیم تھا اور میرے مکان سے حکیم چیلا رام کا مطب کم و بیش دو اڑھائی میل تھا۔ ملتان چھاؤنی سے بوہڑ دروازے تک تانگے دو پیسے فی سواری اوقاتِ کار میں بآسانی مہیا تھے۔ میں اپنے نانا صاحب کو تانگے میں بٹھا کر بوہڑ دروازے تک لے گیا اور وہاں سے کم و بیش دو فرلانگ پر حکیم چیلا رام کا مطب تھا۔ ان دنوں رکشا وغیرہ کا رواج قطعاً نہیں تھا۔ لہٰذا نانا صاحب کو تھامے قدم قدم پیدل چل کر مطب پہنچے تو مریضوں کا ہجوم غفیر دیکھ کر حیرت ہوئی۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ صبح چار بجے سے مریض آنے شروع ہوتے ہیں۔ اور نمبروار بیٹھتے جاتے ہیں۔ آٹھ سے دس بجے تک کسی بھی وقت مطب کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور حکیم صاحب مریضوں کو نمبروار دیکھتے ہیں۔ کیونکہ حکیم صاحب صبح ۴ بجے ہی ایسے مریضوں کو ان کے گھروں پر دیکھنے جاتے ہیں جو ایک دن پہلے وقت لے جاتے ہیں۔ اور یہ ایسے مریضوں کی تعداد پر منحصر ہے کہ اگر وہ کم ہیں تو یہ جلدی مطب کھول دیتے ہیں۔ اور اگر ایسے مریض زیادہ ہیں تو مطب کا دروازہ دیر سے کھلے گا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ مریض کو خالی پیٹ ہی دیکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم نانا نواسے نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب واپس چلا جائے اور شام کو میں حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں گھر پر لانے کے لئے وقت لیا جائے۔ میں شام کو حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کچھ لوگ اور بھی بیٹھے تھے جو محض خوش گپیاں کر رہے تھے۔ مریض کا نہیں تھا۔ میں نے انتہائی نیازمندانہ انداز میں نمسکار کیا۔ انتہائی بے رخی سے سر کی جنبش سے حکیم صاحب نے جواب دیا اور سفید بھنویں سکیڑتے ہوئے فرمانے لگے کیا تمہارا باپ مر گیا ہے۔ اس غیر شائستہ اور غیر متوقع استقبال پر بڑی حیرانی ہوئی اور حکیم صاحب کی بے نیازی، تلخ مزاجی، اور فرعونیت پر تعجب۔ بہر حال پورے احترام کے ساتھ عرض کیا کہ باپ تو بفضلِ خدا زندہ ہیں۔ ماتھے پر سینکڑوں بل ڈالتے ہوئے کہنے لگے تو پھر ننگے سر کیوں آئے ہو۔ جانتے ہو جب کسی بزرگ کے ہاں جایا جائے تو سر ننگا نہیں ہونا چاہئے۔ (آج سے چالیس سال پہلے کی اخلاقی قدروں کو دھیان میں رکھئے) عاجزانہ انداز میں اظہارِ ندامت کرتے ہوئے معذرت چاہی اور آئندہ ننگے سر نہ آنے کا وعدہ کرنے پر پوچھنے لگے کیسے آئے ہو۔ مدعا بیان کیا تو کہنے لگے کہ اگر مریض کی حالت ایسی ہے کہ وہ یہاں آسکتا ہے تو میں گھر پر دیکھنے نہیں جاؤں گا۔ صبح چار بجے آکر اپنے نمبر پر بیٹھ جانا۔ مریض بے شک ۸ بجے تک یہاں آجائے۔ دوسرے دن صبح سویرے چار بجے سے پہلے ہی میں سائیکل پر حکیم صاحب کے مطب پر آگیا اور دروازے کے ساتھ لگے تختے پر بیٹھ گیا اور سائیکل کو تالا لگا کر اپنے قریب ہی کھڑا کر لیا۔ (حالانکہ ان دنوں سائیکل چوری ہونے کا خدشہ قطعاً نہ تھا) جون کا مہینہ صبح چار بجے کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا تختے پر لیٹے ہی آنکھ لگ گئی۔ نہ معلوم حکیم صاحب نے چار بجے کب دروازہ کھولا اور مجھے تختے پر سوتے پایا۔ وہ دروازہ بند کر کے مریضوں کو دیکھنے چلے گئے۔ چھ بجے کے قریب جب میری آنکھ کھلی تو پچاس ساٹھ مریض لائن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بھی اٹھ کر سائیکل کو ایک طرف کھڑا کیا اور سب سے پہلے نمبر پر بیٹھ گیا۔ میرے نانا صاحب بھی میری بیوی کے ساتھ حسبِ پروگرام پورے آٹھ بجے آگئے۔

حکیم صاحب نے ساڑھے نو بجے دروازہ کھولا۔ اور میں نانا صاحب کو لے کر ان کے سامنے ہوا میرے سر پر پگڑی دیکھ کر کہنے لگے ۔ بن آدمی ڈسڈا ایں نہ ہ (اب آدمی نظر آ رہے ہو نہ) میں نے دست بستہ حامی بھری اور نانا صاحب کی نبض حکیم صاحب کی انگلیوں کی زد میں تھی ۔ دائیں ہاتھ کی نبض تو صرف چند سکنڈ کے قریب ہی دیکھی مگر بائیں ہاتھ کی نبض پر دو منٹ تک صرف کر دیئے اور کہنے لگے کہ آپ کو فلاں فلاں تکلیف ہے جس میں بواسیر۔ ذیابیطس ۔ بلڈ پریشر ۔ اختلاج قلب اور نہ معلوم کیا کیا شامل تھا ۔ نانا صاحب نے کچھ مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کی تو فرمانے لگے کرتے کیا ہو ۔ نانا صاحب نے فرمایا بلوچستان کے ریزیڈنٹ کا پیشکار ہوں ۔ بڑا سا منہ بنا کر حکیم صاحب کہنے لگے رشوت کا مال کھایا ہے ۔ مرغے خوب کھائے ہیں اور ان کا ہی یہ سب نتیجہ ہے نانا صاحب نے فرمایا کہ رشوت کو میں نے ہمیشہ گائے کا لہو کہا ہے ۔ ویسے دُنبے کا گوشت تو ہر روز ہی کھاتا رہا ہوں ۔ حکیم صاحب نے نسخہ لکھا پرہیز بتایا اور ہر روز کیفیت بتلانے اور نسخہ ساتھ لانے کی تاکید کی اور کہا کہ ایک آنہ دیجئے ۔ حکیم صاحب ہر ہندو مریض سے ایک آنہ لیتے تھے ۔ اور مسلمان سے یہ فیس نہیں لی جاتی تھی ۔

اب میرا معمول بن گیا کہ صبح چار بجے سے پہلے ہی سائیکل پر حکیم صاحب کے دروازے پر آ کر تختے پر بیٹھتا اور میرا نمبر پہلا ہی ہوتا ۔ ایک ہفتہ گزرنے کے بعد یہ ہوا کہ کوئی انکم ٹیکس آفیسر کار پر اپنی بیوی کو لائے ۔ افسر مذکور اور ان کی بیوی تو کار میں ہی بیٹھے رہے ان کا ڈرائیور اندر آیا اور بغیر سلام دعا کئے کہنے لگا انکم ٹیکس آفیسر آئے ہیں ۔ ان کی بیوی بیمار ہیں ۔ ان کا ہاتھ دکھانا ہے حکیم صاحب خاموش رہے جیسے انھوں نے سنا ہی نہ ہو ایک دو منٹ بعد ڈرائیور کچھ خشونت سے بولا صاحب باہر گاڑی میں بیٹھے ہیں بلا لاؤں ۔ بس پھر کیا تھا حکیم صاحب نے خالص ملتانی زبان میں غراتے ہوئے کہا یہ رنڈی کا مکان نہیں ہے کہ جس کی مرضی ہو جب دل چاہے چلا جائے ۔ اپنے صاحب سے کہہ دو کہ لائن میں لگ جائے جب اس کا نمبر آئے گا تو اندر آ جائے ۔ ڈرائیور یہ غیر متوقع جواب سن کر بھنایا ہوا چلا گیا ۔ دو منٹ بعد انکم ٹیکس آفیسر صاحب خود تشریف لائے اور افسری نیز رعونت منش کے لہجے الفاظ میں کہنے لگے کہ ہم ملازمت پیشہ لوگ ہیں اتنا وقت لائن میں کھڑے نہیں رہ سکتے ۔ ہم جیسے لوگوں کے لئے تو کچھ رعایت ہونی ہی چاہئے ۔ حکیم صاحب نے نسخہ لکھتے لکھتے قلم رکھ دیا اور نظر اٹھا کر کہنے لگے کہ صاحب، آپ دیکھتے ہو یہ ایک اخبار کا ایڈیٹر ہے ۔ لالہ بالکشن بترہ ایڈوکیٹ نے مجھے سب کچھ اس کے بارے میں بتایا ہے کہ ملتان کے اخبار نویسوں میں اس کا کیا مقام ہے مگر یہ صبح چار بجے سے پہلے میرے دروازے پر پڑا ہوتا ہے ۔ میں اسے ہر روز دیکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اسے میرے علاج کی واقعی ضرورت ہے ۔ میرے ہاں تو یہ دستور چلا آ رہا ہے میں اسے توڑ نہیں سکتا ۔ آپ کو غرض ہو تو صبح سویرے کسی کو بھیج کر اپنا نمبر لگا لیجئے ۔ میں بغیر نمبر قطعاً نہیں دیکھوں گا ۔ افسر صاحب فرمانے لگے حکیم جی گاڑی بھجوا دوں گا آپ ہمارے گھر پر آ جائیں ۔ آپ کی جو فیس ہو گی دے دی جائیگی ۔ وقت بتا دیں گاڑی آ کر لے جائے گی ۔ حکیم صاحب پھر کہنے لگے کہ موٹراں میں بہوں ڈٹھیاں ہن (میں نے موٹریں بہت دیکھی ہیں) تمہاری بیوی چل پھر سکتی ہے وہ موٹر میں یہاں آ سکتی ہے میں ان لوگوں کے گھر جاتا ہوں جن کے یہاں موٹریں نہیں اور وہ پیدل چل کر نہیں آ سکتے ۔ افسر مذکور نے حکیم صاحب کے تیور دیکھے اور اندازہ لگا لیا کہ یہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوں گے ۔ تو وہ خاموشی سے واپس چلا گیا ۔

دوسرے دن حکیم صاحب نے بتایا کہ اس انکم ٹیکس آفیسر نے نوٹس بھجوایا ہے کہ گزشتہ چھ سال کا حساب پیش کریں اور جملہ کاغذات ہمراہ لائیں اور یہ بھی بتائیں کہ اتنا بڑا مکان بنا کر کیا اخراجات آئے ہیں ۔ اور یہ آمدن کہاں سے ہوئی ۔ حکیم صاحب اس نوٹس سے بوکھلائے ہوئے تھے اور آج ان کی تلخی و ترش میں اضافہ تھا ۔ میں نے دست بستہ گزارش کی کہ کیا وہ نوٹس دکھائیں گے ۔ کہنے لگے میں نے رات کو ہی لالہ بالکشن بترہ وکیل کے ہاں بھجوا دیا تھا ۔ لالہ بالکشن بترہ اردو کے محسن اور ملتان کے خصوصی قبولیت کی پوزیشن کے حامل تھے ۔ اخبار اقبال کے ایڈیٹر تھے ۔ مالی طور پر رئیس تھے ۔ آئے دن ان کے ہاں دعوتیں رہتی تھیں بہت ہی با اثر اور مقبول شخصیت کے مالک تھے میرے کرم فرما تھے

میں شام کو حمزہ صاحب کے ہاں گیا اور ان سے حکیم صاحب کے نوٹس کے سلسلے میں دریافت کیا تو کہنے لگے انکم ٹیکس آفیسر بے وقوف ہے۔ میں خود جا کر اسے سمجھاؤں گا۔ مگر انکم ٹیکس صاحب نے حمزہ صاحب کا کہا نہ مانا اور حکیم صاحب کے خلاف انکم ٹیکس کی باقاعدہ انکوائری شروع ہو گئی۔ جب بھی ان کی تاریخ ہوتی میں ان کے کہے کے بغیر ہی انکم ٹیکس دفتر میں پہنچ جاتا اور ان کے ساتھ رہتا۔ اس سے ان کے دل میں میرے متعلق کچھ شکر گزاری اور نرمی کے جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے اور وہ ہر روز دوسرے مریضوں کی نسبت میرے ساتھ نرمی اور عزت کا سلوک کرنے لگے۔ ہر آٹھ دس دن کے بعد میں نانا صاحب کو بھی ہمراہ لے جاتا تاکہ نبض دیکھ لیں اور علاج کے بارے میں مزید رد و بدل کرنا ہو کر لیں۔ ایک دن کہنے لگے تم کہاں رہتے ہو! گزارش کی کہ پیر کھنڈا والا مکان، چوک بابو محلہ ملتان چھاؤنی میں حکیم محمد امین صاحب کے مکان میں آگیا ہوں۔ حکیم محمد امین صاحب ملتان کی ایک سرکردہ شخصیت تھے اور ان سے حکیم جیلانی صاحب بخوبی واقف تھے۔ فرمانے لگے اچھا کسی دن چھاؤنی آنا ہوا تو تمہارے گھر بھی آؤں گا۔ میں نے ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے گزارش کی اگر آپ حکم فرمائیں تو بجائے اس کے کہ میں صبح چار بجے آؤں شام کو آجایا کروں۔ کیونکہ صرف مریض کی کیفیت ہی بتانی ہوتی تھی۔ اور دوا ہر روز کی لینی ہوتی تھی۔ ہنستے ہوئے (یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے حکیم صاحب کو ہنستے ہوئے دیکھا) فرمایا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ تم شام کو ہی آیا کرو تاکہ اسی بہانے کچھ گپ شپ بھی ہو جائے گی۔ ملتان میں شام کو کھانے پینے کی اشیاء بیشمار انواع و اقسام کی ملتی ہیں۔ دراصل کوئی بھی گھرانہ سبزی یا سالن نہیں پکاتا تھا۔ صرف روٹی گھر میں بنا لی جاتی تھی یا وہ بھی تنور سے منگوالی جاتی تھی اور ہر قسم کی دال سبزی سے لے کر گوشت تک پکا پکایا دستیاب ہو جاتا تھا۔ سینکڑوں دکانیں اور چھابے والے ہندو مسلمان یہی کاروبار کرتے تھے۔ اس لئے میں ہر روز چار بجے شام ہی اندرون بوہڑ دروازہ چلا جاتا کھانے پینے کی اشیاء کی بنائی ہوئی مارکیٹ تھی۔ سستا زمانہ تھا تین چار آنے میں کئی چیزیں کھا پی کر حکیم صاحب کے پاس چلا جاتا اور یہ محفل چھ بجے تک جمتی۔ اب حکیم صاحب کا رویہ کافی حد تک دوستانہ ہو چکا تھا۔ اور میں ان سے بے تکلفانہ گفتگو بھی کرنے لگا تھا۔

ایک دن ایک عورت اپنے بچے کو لے کر آئی نبض دیکھی تو فرمانے لگے اس کے کفن کا انتظام کرو۔ ماں اپنے بیٹے کا کفن تیار کرنے سن کر ہی سکتے میں رہ گئی کہنے لگی۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ اگر اسے ٹکر (روٹی) کھانے دیا تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور آج اس نے ٹکر کھایا ہوا ہے۔ عورت حلف اٹھا کہ کہہ رہی ہے کہ اس نے بچے کو روٹی کھانے کو نہیں دی مگر حکیم صاحب کہہ رہے ہیں کہ اس کی نبض کہہ رہی ہے کہ اس نے روٹی پیٹ بھر کھائی ہے۔ حکیم صاحب نے عورت سے کہا کہ تم باہر چلی جاؤ۔ عورت تعمیل حکم میں باہر گئی تو حکیم صاحب نے بچے سے پچکارتے ہوئے پوچھا۔ پتر ٹکر کھادا ای؟ دس تے سہی (بیٹے تو نے اگر روٹی کھائی ہے تو بتاؤ) بچے نے سچ سچ بتا دیا کہ ماں کہیں گئی ہوئی تھی اور اس نے روٹی کھا لی تھی۔ عورت کو بلا کر کہنے لگے یہ دوا الکوہل ہے۔ اسے پلاتی رہو اور اگر اس نے پھر روٹی کھا لی تو پھر میرے پاس نہ آنا۔ عورت کے جانے کے بعد میں نے حکیم صاحب سے پوچھا کہ جناب آپ نے ماں سے بچے کے کفن تک کا معاملہ کہہ دیا تو اس کے دل پہ کیا گزری ہوگی۔ اگر آپ اس تلخی اور ترشی کی بجائے ویسے سمجھا دیتے تو کیا خرابی تھی۔ کہنے لگے اب کفن کا نام سن کر یہ سب کام چھوڑ کر بچے کو روٹی نہیں کھانے دیگی۔ اور بچہ دو دن میں ٹھیک ہو جائیگا

ایک دن میں نے خفیف سے مخلصانہ لہجہ میں شکایت کی کہ میرے نانا صاحب کو آٹھ ماہ سے زائد ہو گئے ہیں۔ یہ علاج کب تک چلے گا۔ کہنے لگے مہمانداری سے اکتا گئے ہو تو دوسری بات ہے۔ اگر ان کا علاج جاری نہ رہتا تو یہ کبھی کے ہارٹ اٹیک کے شکار ہو چکے ہوتے۔ ان سے کہئے کہ ریٹائرڈ منٹ کی چھٹی لے لیں اور نوکری چھوڑ دیں کیونکہ مطلب نہ تو یہ پہلے پہ رہ سکتے ہیں اور نہ ہی بغیر علاج کے یہ زندہ رہ سکتے ہیں جب تک یہ زندہ رہیں گے انہیں ادویات کا استعمال جاری رکھنا ہوگا۔ اب جو دوا چل رہی ہے یہی دوا آٹھ دس دن کی لے جایا کرو۔ جب تک عام حالت میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہو انہیں دکھانے یا دوا تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر تم روزانہ آؤ گے

(جاری ہے)

گوشۂ عقیل صدیقی

قاضی سید عرشی کاظمی

کُل ہند مشاعرہ نمائش بجنور

۲۰ر جون [illegible]

یہ روداد بغیر ایڈیٹ کئے شائع کی جا رہی ہے کیونکہ قاضی سید عرشی کاظمی [illegible] فرماتے ہے اگر کہیں لفظ لکھ [illegible] گیا ہے یا املا کی غلطی ہے تو اُسے ایسے ہی رہنے دیا گیا ہے۔ رہی عطف و اضافت کی بات تو اُسے شاید سید عرشی صاحب ضروری نہیں سمجھتے۔

عرشی صاحب کو عروض دانی۔ شاعری۔ مضمون نویسی اور مشاعرے [illegible] کا نہ صرف دعویٰ ہے بلکہ وہ کسی کو اپنا مدِ مقابل بھی گردانے کو تیار نہیں ہیں۔ اس [illegible] آپ یہ روداد پڑھنے کے بعد اپنی رائے سے ضرور مطلع فرمایئے۔ تاکہ عرشی صاحب جو احساس کمتری میں مبتلا [illegible] نہیں رکھتے۔ آپ حضرات کی آرا گرامی سے شاید اپنا ادبی حدود اربعہ متعین کر سکیں۔ ویسے یہ حضرت کم و بیش گیارہ اُستادوں سے ناخلف شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ (ایڈیٹر)

شب کے دس بج چلے ہیں۔ فضا کے حبس اور گھٹن میں پر نمائش گاہ میں حلوائیوں اور چائے فروشوں کی دہکتی ہوئی بھٹیوں کی لپیٹیں... اور [illegible] کی طرح تھپیڑے مارتا ہوا گرم گرم دھواں .... خدا کی پناہ [illegible] ہے مشاعرے کے منتظمین حضرات ہم لوگوں کو [illegible] جہنم کی وادی سے گزار رہے ہیں۔ دھوئیں کے مرغولوں سے گزرتے ہوئے ہے چارے عزیز سنہوری، شاکر تیوری اور حضرت [illegible] وغیرہ... [illegible] ہیں۔ مگر کیا کیجے قہرِ درویش برجانِ درویش۔ ہماری آنکھ ناک سے پانی چھوٹ رہا ہے۔ کچھ بولنے کے لیے منھ کھولئے تو ہپک سے دھواں منہ [illegible] گھبرا گئے۔ مجھے منتظمین مشاعرہ سے زیادہ خود پر اور خود سے زیادہ ساتھیوں پر غصہ آ رہا ہے۔ آخر کیوں نہ اس مغربی سڑک سے باہر باہر ہو لئے جس سے ہجوم در ہجوم شعلہ رخانِ شہر۔ خوشبوئیں بکھیرتے۔ قہقہے اُڑاتے اور خوش گپیاں مارتے محو خرام ہیں۔ بہر کیف ہم سب لوگ تپیدہ تپیدہ اپنے دامنوں کی ہوائیں لیتے اور گریبان [illegible] میں پھونکیں مارتے مشاعرہ گاہ کے گیٹ تک پہنچ گئے ہیں۔

ہمارے سامنے چہار دیواری سے گھرا ہوا [illegible] وسیع میدان ہے جس پر دور تک انسانوں کا جم غفیر سمندر کی طرح ہلکورے لے رہا ہے۔ بہت سے لوگ فرش پر ڈٹے ہوئے ہیں اور بہت سے حسبِ عادت باقر باندھے چاروں طرف کھڑے نظر آ رہے ہیں۔ آنے والوں کا تانتا سا بندھا ہوا ہے۔ میدان کے شمال میں پختہ ڈائس پر شامیانہ کی بجائے سنہری و روپہلی چندروال کا جال اور اس میں لٹکے ہوئے رنگا رنگ قمقمے۔ کنارے کنارے نیلی پیلی اور گلابی روشنیوں کا جھالریں اور پورے گراؤنڈ پر کھمبوں سے لٹکے ہوئے ہاف سات کوروں میں بدلتے نظر آ رہے ہیں۔ اسٹیج کی دائیں جانب چلمنوں کی دیواریں اُٹھا کر مستورات کے لئے معقول انتظام کیا گیا ہے۔ اس طرح بائیں ہاتھ قطار اندر قطار نہایت سلیقہ سے کچھ [illegible] پر معززینِ شہر تشریف رکھتے ہیں۔ اسٹیج کے بالکل نیچے[1] ـــ

---

[1] «حضور» پانی چھوٹ رہا ہے «کہ [illegible]» پانی بہہ رہا ہے «بجر» [illegible] «پانی چھوٹنا» تو مرد وست کے [illegible] کہا جاتا ہے۔ [illegible] عرشی کے [illegible] نے لکھنا چاہئے تھا۔

کافی دور تک شیاطین[1] کی فوج جمی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ پتہ نہیں بچوں کو سب سے آگے بٹھانے کی چھوٹ کس نے دی ہے۔

ان شیطانوں کو براجمان دیکھ مجھے آگرہ کا مشاعرہ یاد آ رہا ہے ان نالائقوں کے کارن حضرت فراق گورکھپوری اور کئی دوسرے شاعروں کو بڑی جھینپ اٹھانی پڑی تھی۔ توجہ دلانے کے باوجود ذمہ داران مشاعرہ ان خدائی فوجداروں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تیار نہیں۔ ہاں تو سارا ماحول بے ہنگم شور و غل سے گونج رہا ہے۔ سگریٹ بیڑیوں کا دھواں ہوا بند ہونے کی وجہ سے مجمع پر چادر سی تان کر رہ گیا ہے۔ ادھر ہم لوگ آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے اسٹیج پہ پہنچ گئے ہیں۔ حاضرین کرام پر شوق نظروں سے اپنے مہمانوں کو دیکھ رہے ہیں۔ بس پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔ چہروں کے آثار چڑھاؤ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اب زیادہ گنجائش باقی نہیں۔ آخر لوگوں کے جذبات کا ادراک کرتے ہوئے جناب سید مختار علی صاحب نے مائک پر آ کر مشاعرہ کے آغاز ... پہلے ایک رسم ادا ہونی یعنی وہی صدارت نظامت کا فیصلہ صادر کرتے ہوئے جناب انیس انصاری (ڈی ایم بجنور) کی صدارت کا اعلان کیا ہے۔

مگر جیہ غروب! تام زد صدر موجود ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کی جگہ عارضی صدارت کے لئے جناب انظار الحق صاحب پرنسپل انٹر کالج کرتارپور سے درخواست کی گئی ہے۔ میری نظر میں یہ عارضی صدارت بہت بڑی مہتک ہے۔ مگر انظار الحق صاحب مسند صدارت پر متمکن ہو رہے ہیں۔ مشاعرے کی نظامت کے لئے صاحب مضطر نگینوی کے نام کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ نقیب پہلا ہی دیکھ رہا ہوں۔ میرا نفسیاتی اندازہ ہے کہ یہ صاحب مجمع پر خاطر خواہ کنٹرول نہیں کر سکیں گے۔ اس کام کے لئے تو مشہور و معروف اور بے تکان بولنے والے شخص کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اول فعلول[2] لوگوں سے لوگ مطمئن نہیں ہوا کرتے۔ دیکھیں کیا گزرتی ہے قطروں پہ گہر ہونے تک خیر چھوڑیئے۔ مضطر نگینوی نظامت کے بوجھ کو سنبھالنے کے لئے دوسرے مائک پہ آ ڈٹے ہیں۔ موصوف نے شہر کی تعریف میں ایک شعر پڑھ کر سب سے پہلے جناب کوثر کو (واضح رہے کہ یہ کوثر میرٹھی مرحوم نہیں) دعوت کلام دی ان کا نام سنتے ہی مجمع پر ایک لخت سکوت چھا گیا ہے۔ سب ہمہ تن گوش ہو گئے ہیں۔ آیئے ذرا ملاقات ہو جائے۔ چوڑا ڈھانچہ، گہرا سانولا رنگ، مکعب چہرے پر چیچک کے خدوخال سر پہ چھدرے چھدرے بال، کرتہ اور پائجامہ زیب تن ہوگا پچاس کے ہیر پھیر میں۔ ہاں تو مائک پہ آتے ہی ترنم سے ہوتے ہیں

روندتے دیکھا کبھی "اس کو" کچلتے دیکھا
جان ہی لے کے غم عشق کو ٹلتے دیکھا

مطلع پہ شبہ سا ہو گیا۔ "قوم" اور "کو" کو کی تکرار سی محسوس ہو رہی ہے۔ تاہم کئی حضرات دل نوازی سے داد دے رہے ہیں۔ ادھر کوثر صاحب نے اگلا اقدام کیا ہے

اک فقط ان کی ہی فطرت پہ نہیں ہے موقوف
وقت جب ہم پہ پڑا سب کو بدلتے دیکھا

اس شعر نے محفل کو خوب گرما دیا ہے۔ کوثر صاحب کھل گئے ہیں۔ اب یہ شعر ہے اور دھڑا دھڑ تالیاں اور اسی کھینچ تان میں ترنم گیئر بدل رہا ہے۔ ترنم کے بے ہنگم مدوجزر سے کچھ گوشوں میں ہنسی کے فوارے چھوٹ چلے ہیں۔ مزید ستم یہ کہ ظالم بچے مسکرا کر اور گردنیں و آنکھیں مٹکا مٹکا کر داد دے رہے ہیں۔ کوثر صاحب معاملہ سمجھ گئے ہیں۔ لہٰذا۔ انہوں نے بادل ناخواستہ مائک چھوڑ دیا

[1] آپ نے سنجیدہ دیکھ دیا ہوتا کہ آپ کا اپنا بچہ تو ان شیاطین میں شامل نہیں ہے؟ [2] اب پتہ چلا کہ آپ کو بیرونی مشاعروں میں بھی بلایا جاتا ہے۔ فراق اور جگر ادھر سے جھینپیں؟ یہ تو آپ نے ان کی توہین فرما دی وہ تو بچوں کے بالوں سے بھی نہیں جھینپتے۔ [3] مہا نیند ہونے کے معنی کسی بچہ کو دیکھ لئے ہوتے یہ شبہ۔ کیا کسی بھلے مانس کو "اول فعلول" کہنا آپ کی شرافت کی دلیل ہے؟ "فعلول" غلط ہے صحیح لفظ "جلول" ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں "اول جلول" کے معنی درج ہیں انکی روشنی میں تو آپ پر ہتک عزت کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ البتہ مضطر نگینوی صاحب معذرت ہے۔ نقل کفر کفر نباشد کے طور پر ان توہین آمیز الفاظ کو حذف نہیں کیا گیا تاکہ پڑھنے والے صاحب مضمون کا اخلاقی طور پر بھی حدود ...

خدا رحم کرے "بسم اللہ" ہی غلط ہو گئی۔ فاتحہ کا حال تو جانے کیا ہو۔ خیر وہ دیکھئے اناؤنسر کی آواز پھر مائک سے گونج رہی ہے اور میرے نزدیک سے محترمہ کملا انجم نجیبوری اٹھ کر منظر پر آ رہی ہیں۔ سڈول جسم، لانبا قد، دمکتا ہوا سُرخ و سپید رنگ، گولائی مائل بھرپور چہرے پر انتہائی دل کش نقوش، بشرے سے وقار و سنجیدگی نمایاں، کھلے ہوئے سیاہ چمکیلے اور نیم گھنگھرالے بال۔ گلابی ساری میں ملبوس، عمر ہوگی ۲۰-۲۲ کے قریب۔ آخر مائک سنبھالتے ہی کافی لوچدار ترنم میں ... دو جگہ ... لُطف ہے اُن کے رُک رُک جانے میں + اور رکو تابیاں ... ہیں

خوبصورت شاعر، خوبصورت شعر[۹] اور خوبصورت ... لہجہ ... کا عالم مت پوچھئے ... ہیلو ... آہ واہ کا ہنگامہ ... رہا ہے ... کہ فنکار سامعین بڑھ بڑھ کر قدم لے رہے ہیں۔ اور انجم صاحبہ اسی بھرپور انداز میں پھول برسا رہی ہیں۔ ملاحظہ ہو ...

حرف حرف آس لفظ لفظ اُمید + رنگ بھر دو ... رے فسانے میں

اُف ... توبہ، اس شعر نے تو حشر ... برپا کر دیا۔ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں پڑ رہی۔ ماحول آتش ناک ... ہو رہا ہے بلکو رہے پر بلکو رہے اُمڈ رہے ہیں۔ مرد ... اپنے ہاتھ چلمنوں نے جھینے پردے الٹ گئے ہیں۔ اور "کند ہم جنس باہم جنس پرواز" کی زندہ مثال سامنے ہے۔ سریلی اور کھنکتی ہوئی داد میں اپنا سماں الگ باندھ رہی ہیں۔ کچھ چور نظریں کبھی چلمنوں کی طرف ہیں تو کبھی انجم کے چہرے پر۔ مگر گم ... یہ رنگ میں بھنگ! اسی دوران اناؤنسر نے انجم سے مائک لے کر جناب انیس انصاری صاحب کی آمد کا اعلان کر دیا ہے کیسی غیر معقول بات ہے۔ یہ کام تھوڑی دیر بعد بھی ہو سکتا تھا۔ انیس صاحب یعنی صدر مشاعرہ کی تشریف آوری پر کارکنانِ مشاعرہ ان کے استقبال کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور جناب افضال الحق صدیقی نے ان کی مسندِ صدارت خالی کر دی ہے۔ انجم صاحبہ اس درمیان غزل تمام کر کے پلٹ چکی ہیں دوسری طرف سامعین "ایک اور - ایک اور" چلا رہے ہیں۔ مگر شاعروں کی طویل فہرست سے خوف زدہ اناؤنسر اگلے دور کا وعدہ کرتے ہوئے جناب یوسف اقبال کو دعوتِ سخن دے رہا ہے۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ اناؤنسر شاعر کا تعارف کرانے میں بڑی کنجوسی سے کام لے رہا ہے۔ حالانکہ ایک اچھے اناؤنسر کا فرض ہے کہ نفسیاتِ مشاعرہ کو سمجھتے ہوئے شاعر کا اچھے ڈھنگ سے تعارف کرائے۔ مجمع کو جلانے کے لئے ایک تخیلاتی لہر ہے۔ بہرکیف اپنا سیاٹ اعلان سنتے ہی ڈائس کے ایک گوشے سے بھرپور ہیولہ سا اٹھا ہے۔ پھیکا گندمی رنگ، لمبے چہرے پر کھڑا ناک نقشہ، کلین شیو، سر پر ڈھلکے ہوئے بال، پینٹ اور شرٹ، میرے خیال میں چالیس سے اوپر یا اُس کے قریب۔ مائک پر آتے ہی تحت اللفظ میں شروع ہو گئے ہیں۔

ہیں آسماں شبا شب پہ لاتعداد تارے
مجھے کہیں مہ کامل نظر نہیں آتا

سامعین شعر پر شش و پنج میں ہیں ... حاصل ابھی ابھی انجم ہمارے ماحول پر جادو[۱۰] چھڑک گئی ہیں۔ ان کا دلکش کلام اور سیال ترنم ابھی تک سماعت میں شہد و انگبین گھول رہا ہے پھر یہ پھیکے شعر کون سُنے۔ بہرکیف یوسف صاحب نعرہ لگا کر کچھ اور عطا فرما رہے ہیں۔ لیکن ان کی آواز بازگشت اور پھر میرے ارد گرد بیت سے لوگوں کی چیخ پکار کچھ سمجھنے نہیں دے رہی

---

[۸] آج تک تو قطرے کو گہر ہونے تک ہی پڑھا ہے۔ [۹] معلوم آپ نے خط میں اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ آپ جدت پسند ہیں۔ مگر "بوجھ بھاری" تو پرانا محاورہ ہے۔ آپ ایسے جدید ... کو کوئی نیا محاورہ استعمال کرنا چاہئے تھا ... میں پہلی بار یہ محاورہ پڑھنے میں آیا ہے۔ یہاں آپ نے واقعی جدیدیت کا ثبوت دیا ہے۔ [۹] شعر اچھا تو ہو سکتا ہے ... کا اندازہ تو نظر آنے والی کشش سے متعلق ہی ہو سکتا ہے۔ [۱۰] آپ ... خوبصورت ہو سکتے ہیں مگر لہجہ تو شیریں یا شائستہ یا خوبصورت نہیں [۱۱] ان کی ڈائری ہے۔ [۱۲] معلوم ہوتا ہے یہ جادو آپ کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔

اور اسی بدنظمی و ابتری میں یوسف اقبال اسٹیج چھوڑ گئے ہیں۔ میں اس بدنظمی و ابتری کی ساری ذمہ داری اناؤنسر پر ڈالتا ہوں۔ اس کی کمزور شخصیت اسی ہیجان کی متقاضی ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ لاحول ولاقوۃ ... آئیے اب میں آپ کو محترمہ شیریں چودھری اکبرآبادی سے ملاؤں۔ ناٹا سا... ارے نہیں بوٹا سا قد،[۱] مناسب بدن، سانولا سلونا رنگ کتابی چہرے پر چھوٹے سے خطوط، شانوں پر لہراتی ہوئی سیاہ زلفیں، مسکراتی ہوئی آنکھیں، گہرے عنابی سوٹ میں کافی پرکشش بنی ہوئی ہیں۔ عمر ہوگی اٹھارہ برس۔ مائک پر آتے ہی بڑے دلدوز ترنم میں غزل چھیڑ دی ہے

لے آیا ... ہاں وحشت دیوانے سے کیا ہوگا
کانٹوں بھری منزل ہے گھبرانے سے کیا ہوگا

مطلع سنتے ہی سامعین پھڑک اٹھے ہیں۔ داد کا وہ ریلا چلا ... ہے۔ مگر شعر کے گھسے پٹے پن پر ہماری ناک سکڑ رہی ہے ... روح کو چھو جانے والی آواز جسم میں سرسراہٹ ... پیدا کئے دے رہی ہے۔ اور محفل[۲] بیستدہ جزرڈالتے ہوئے ... صاحبہ مزید اقدام فرما رہی ہیں۔

... تصور میں کیوں آنے سے کیا ہوگا
جب دل نہ سکوں پائے گھبرانے سے کیا ہوگا

اربابِ فکر و نظر اب بھی چپ ہیں۔ پر بھاڑ میں چند دانوں کی ... قیمت؟ مجمع کا مجمع لہریں لے رہا ہے۔ آہ واہ کا وہ غلغلہ ہے کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ میرے خیال میں اگلے شعر کے لیے گنجائش نہ رہ جائے گی۔ چلمن کے پول سے لگی ہوئی ایک دوشیزہ[۳] تو کچھ زیادہ ہی زیادہ محظوظ نظر آ رہی ہے۔ ... جلنے سُریلی داد اور رسیلی آواز نے ماحول کو شعلہ ناک بنا رکھا ہے۔ کاش یہ منظر فلمایا جا سکتا۔ یار، تو شعر ... جھرجھری لگاتے ہو۔ یہ محترمہ شیریں چودھری اپنی غزل تمام کر کے اپنی نشست گاہ کی طرف پلٹنا چاہتی ہیں۔ لیکن سامعین کی فرمائش ان کے پیروں میں زنجیر بن گئی ہے۔ وہ پھر نغمہ سرا ہیں

پھر وہی ملکوتی وہی ہنگامہ اور وہی دل مدوجزر میں ہوا سوز و گداز۔ وقت دھیمی رفتار سے گزر رہا ہے۔ پراسرار وسرور کا عالم طاری ہے۔ اور یہ لیجئے منظر بدلا۔ یعنی شیریں کے ہٹتے ہی اناؤنسر نے محترمہ شگفتہ انجم کو دعوتِ کلام دی ہے۔ اناؤنسر کی اس ٹیکنیکل غلطی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس نے شیریں کے بعد انجم کو بلا لیا۔ محفل میں دن ہی کیا جائے گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ عموماً انھیں سامعین کی وجہ سے جمے رہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ کہ انجم صاحبہ کو ابھی کچھ اور توقف کے بعد منظر پر لانا تھا۔ بہرکیف ہرچہ باداباد ... محترمہ انجم جناب کے بھوپالی کے نزدیک سے اسائی کسمائی اٹھ رہی ہیں۔ بھوپالی سا مدھر قد، چھریرا ہلکا پھلکا جسم، صاف گندمی رنگ گولائی مائل چہرہ، دلکش نقش و نگار، ہری ساری میں عمر ہوگی ۲۵ کے لگ بھگ آخر مائک پر آ کر گلوکار ترنم شروع ہوئی ہیں

سوزِ غم کیا ملا زندگی کے لئے
شمع جلنے لگی روشنی کے لئے

مطلع سن سامعین پر جادو پھونک گیا ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ سامعین کے گلے خشک ہو چکے ہیں۔ پر آفریں ہے اہل پر ... پھیپھڑوں کی ساری طاقت صرف کئے دے رہے ہیں۔ واہ وا اور مکرر مکرر کا وہ طوفان ہے کہ کیا کہئے۔ محترمہ انجم مزید قیامت ڈھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں

مشکلیں مشکلیں دوستی کے لئے
کتنی آسانیاں دشمنی کے لئے

یقین کیجئے۔ اس شعر نے تو محفل پر طوفان ہی گرا دیا۔ میرے قریب ایک "اہلِ فن" اس مطلع میں "ایطائے" تلاش کر رہے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ ... انھیں کس طرح سمجھاؤں کہ مصرع ثانی میں "ایطائے جلی و خفی" قابلِ درگزر[۴] ... خیر چھوڑئیے ... وہ دیکھئے ... انجم صاحبہ نے کہا۔

۱۔ دیکھا گیا ... اس مشاعرہ کے نقیب الشعرا ہوتے تو کیسا ہوتا۔ ۲۔ معلوم ہوتا ہے آپ عشقیہ ناول زیادہ پڑھتے ہیں۔ ۳۔ ابھی محفل گئی بھاڑ میں ... آپ کو ... خوش نظروں کی داد دی جانی چاہئے۔ ۴۔ آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ ۵۔ یہ تو محض آپ نے اپنی عروض دانی کا سکہ جمانے کے لئے ...

[illegible] سے پہلے ہی غزل ختم کردی۔ اور اب وہ سامعین بے پناہ اصرار پر دوسری خوبصورت غزل[1] چھیڑ رہے ہیں۔ پھر سے سماں بندھ رہا ہے۔ پھر آہ واہ کے ریلے آمڈ رہے ہیں۔

اس وقت میری گھڑی[2] میں بارہ بجا چاہتے ہیں۔ یعنی چند لمحوں بعد ہی "آج" "کل" میں بدل جائے گا۔ دیکھئے کل کون کامیاب ہوتا ہے۔ اس وقت مشاعرہ کی رونق شباب پر ہے۔ ہنستے مسکراتے چہروں سے بشاشت پھوٹ رہی ہے اور اس تر و تازہ ماحول کو گرم رو رکھنے کے لئے اناؤنسر فہرست سے ایک اور نام قلم زد کر رہا ہے۔ ارے ... رے ... رے ... یہ تو میرے نام[3] کی ہی رطب اللسانی شروع ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں میرے تعارف میں اس قدر نمک مرچ کیوں لگایا جا رہا ہے۔ شاید اناؤنسر نہیں جانتا کہ میں "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کا سخت مخالف ہوں۔ میرے ظرف و ضمیر مجھ سے کبھی جدا نہیں ہوتے جس کو جیسا پاتا ہوں ویسا ہی بتاتا ہوں۔ خیر چھوڑئیے۔ حاضرین محفل میرا نام سنتے ہی پرسکون ہو گئے ہیں۔ غالباً سوچ رہے ہوں گے کہ یہ بھی شیریں اور [illegible] کا جواب ہوگا۔ پر میرے سامنے سخت مسئلہ درپیش ہے کہ [illegible] پھر جگر کا [illegible] کا متقاضی ہے اور اپنی حالت [illegible]۔ بہر کیف [illegible] سے عہدہ برآ ہونے کے لئے میں تیار ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس وقت قومی اتحاد کا نعرہ لگا کر ہی میں بخشش کا حقدار بن سکوں گا۔ اچھا تو لیجئے ملاحظہ کیجئے ؎

آؤ پھر عہد کریں آج سے ہم ایک ہیں ایک
اپنے غم اپنی خوشی اپنے الم ایک ہیں ایک
ایک ہے ذوقِ طلب دیر و حرم ایک ہیں ایک

ربطِ باہم سے ہے رشتوں میں کشش کی طاقت
ہم بھی ہوں ایک تو طاقت ہے وطن کی طاقت

بند سنتے ہی عوام و خواص، سب ہی پسندیدگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور میں معزز سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسرا بند پیش کر رہا ہوں ؎

آؤ پھر ایک ہوں [illegible] کی خاطر
غنچہ و برگ و گل و سرو و سمن کی خاطر
عظمتِ گنگ کی تقدیس جمن کی خاطر
لب کہ آپس میں شناسا کہ یگانہ نکلیں
کوئی میدان ہو سب شانہ بشانہ نکلیں

اس بند نے بھی مجھے خاطر خواہ کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ میں دھیرے دھیرے نظم کے اختتام تک پہونچ رہا ہوں۔ مگر ... آہ وہ سامنے کیا ... ہاں ہاں میرے قومی اتحاد کے پیغام کا الٹا عمل میں آ رہا ہے۔ دو نوجوان ایک دوسرے کے ناک سے مکھیاں اُڑا رہے ہیں۔ میں مرنے مارنے کی بات کرتا تو جانے کیا ہوتا۔ خیر جلد ہی معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ادھر میں بھی "ایک اور ایک" اور "کے نعروں[4] میں مائیک سے پلٹ آیا ہوں۔ میں نے سامعین سے خود معذرت طلب کر لی ہے کہ میں دوسروں کے حق پر حملہ نہیں کیا کرتا۔ آخر اناؤنسر نے اب پھر غیر معمولی تعارف کے ساتھ جناب انیس انصاری صاحب (صدر مشاعرہ) کو کلام مرحمت فرمانے کی تکلیف دی ہے۔ اناؤنسر کے اس اعلان پر مجھے بہت افسوس ہے کہ صدر مشاعرہ کسی مجبوری کے تحت واپس روانہ ہو جانا چاہتے ہیں۔ اس لئے انہیں غیر موقع پڑھوایا جا رہا ہے۔ میں صدر مشاعرہ یعنی انیس انصاری صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر ایسی مجبوریوں اور مصروفیتوں کے پیش نظر وہ اس ذمہ داری کو قبول ہی کیوں کرتے ہیں۔ ان کے بے موقع آنا اور بے موقع

---

[1] خوبصورت [illegible] یہاں بھی ٹھیک نہیں ہے [2] یہ کس نے کہا کہ آپ نے کسی دوسرے کی گھڑی سے وقت دیکھا ہے [3] آپ تو شاید چاہتے کہ اناؤنسر شعراء کا تعارف کرانے میں کنجوسی سے کام لیتا [illegible] [4] اس وقت تک آپ نے کسی بھی شاعر کے دو سے زیادہ اشعار نہیں دیئے ہیں اور اپنے دو بند یعنی چھ اشعار آخر کس خوشی میں دیئے؟ جن عوام و خواص نے پسندیدگی کا اظہار ... فرمایا ہے اُن سے ہی پوچھئے کہ کونسی نئی بات کہی ہے آپ نے۔ [5] اس لئے کہ آپ کے اشعار آپ کے دل سے نہیں نکلے محض دکھاوا ہیں۔ یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ [6] یہاں اڑانوں چاہئے۔ نعرے کے صحیح معنی لغات میں ملاحظہ فرمائیے۔

جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ کرتپور کے مشاعرے میں بھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔ میری رائے ہے کہ وہ یا تو صدارت کیا ہی نہ کریں یا پھر پروگرام ختم ہونے تک دلجمعی کے ساتھ بیٹھا کریں۔ خیر چھوڑیئے آیئے آپ کو ملاؤں۔ مناسب قد، سڈول جسم، گورا چٹا تمتماتا ہوا رنگ، کتابی چہرے پر قابلِ قبول نقوش، کلین شیو، آنکھوں پر نیلگوں چشمہ، سر پر چھوٹے چھوٹے بال، چیک کی شرٹ اور کاہی پینٹ۔ عمر ہوگی ۵۳ سے ادھر یا اُدھر نہایت وقار و سنجیدگی کے ساتھ مائیک پر آتے ہی گوارا ترنم میں غزل چھیڑی ہے ؎

جب تک ہم شمشیر تھے چلتے تھے ہونٹوں پر ہاتھوں پر
جب سے بکھرے ہیں ٹکڑوں میں ہم سے ڈر جاتے ہیں لوگ

شمشیر کا ہونٹوں اور ہاتھوں پر چلنا میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ مگر شعر کو عام طور پر اٹھایا جا رہا ہے میرے پیچھے ایک صاحب تو گویا اسی کام کے لئے آئے ہیں۔ انھوں نے چیخ چیخ کر میرے کان پھاڑ ڈالے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کلکٹر صاحب کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ غیر حاضر نہیں ہیں۔ بہر کیف آنیس صاحب داد سے بے نیاز اگلا قدم اٹھا رہے ہیں ؎

اس کے دم سے شام میں روشن تھیں سواب ویران ہوئیں
جب سے اس نے بستی چھوڑی جلدی سو جاتے ہیں لوگ

شعر میں "شکستِ ناروا" نے میری ناک سلے[1] پھر ماتھے تک سکیڑ دی ہے پر کلائمکس کی داد میرے منہ سے بھی نکل گئی ہے۔ سامعین کی تو کچھ نہ پوچھئے ... اور ان حضرات کی کیا کہیئے ... کرایہ کے داد چی محسوس ہو رہے ہیں۔ ان کی آہ واہ سارے مجمع سے نیاری سنی جا سکتی ہے۔ اسٹیج پر بیٹھے لوگ آنیس صاحب کی بجائے ان بزرگوار کو ملاحظہ کر رہے ہیں۔ غزل طویل ہے۔ یقیناً داد بھی طویل ہمیں ٹھہرے گی اور ان بزرگوار کے صدقہ میں میرے کانوں کے پردے ورشلے[2] اُڑ جائیں گے ... آیئے ذرا تھوڑا دُور ہو بیٹھیں۔ ہاں تو تحسین و آفریں کے درمیان آنیس صاحب خوش کام و خوش نام گزر رہے ہیں۔ اور میرے پاس بیٹھے ہوئے عزیز نہٹوری صاحب پر تو لنے شروع ہو گئے ہیں۔ غالباً سگنل مل گیا ہے۔ اور یہ لیجئے نیا منظر۔ جناب انیس کے بعد عزیز نہٹوری، ہمارے سامنے ہیں۔ ہلکا پھلکا قد تن، پھیکا گندمی رنگ، کتابی چہرے پر کافی اچھے خد و خال، گالوں سے لگی لگی سفید مشت بھر داڑھی۔ پیچھے کی طرف پلٹے ہوئے لمبے بال، کھڑے کالر کا کرتا اور علی گڑھی پائجامہ۔ میرے اندازے میں عمر پچاس کے قریب اپنا اعلان سنتے ہی مائیک پر شعلے لپکا دیئے ہیں ؎

خود میرے ہی دل سے کہ کسی مست نظر سے
آغازِ محبت کا ہوا جانے کدھر سے

مطلع کے روایتی انداز اور گھسے پٹے مضمون سے قطع نظر ... سامعین دل گداز ترنم کے جادو میں ڈوب رہے ہیں اور یہ جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ داد کا ہنگامہ موجیں مار رہا ہے عزیز صاحب "مکرر مکرر" سے بے نیاز بڑے والہانہ پن کے ساتھ پھر ذوق و غالب کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

دل کس لئے بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں
بس اتنی خبر ہے کوئی گزرا تھا ادھر سے

اس شعر نے مزید ستم ڈھا دیا ہے واہ واہ کی بوچھار چل رہی ہے۔ عزیز صاحب خوب جم رہے ہیں۔ سماں بندھ چکا ہے ایسا لگتا ہے وقت کی رفتار ٹھہری ہوئی ہے۔ آخر اسی تحسین و آفریں سے گزرتے ہوئے عزیز مقطع تک پہنچ رہے ہیں اور سامعین پھر سننے کے لئے چلّا رہے ہیں۔ آخر عزیز نے لوگوں کی فرمائش کے احترام میں دوسری غزل چھیڑ دی ہے۔ اس غزل میں معنی گھبرول[3] مجھے بڑی طرح کھل رہے ہیں۔ کاش اس شاعر کا کچھ مطالعہ ہوتا[4] ... اوہ معاف کیجئے میں بھی کہاں آ نکلا۔ لیجئے اب حضرت شہباز امروہی سے بھی نیاز حاصل کر لیں مگر یہ کیا۔ جناب انیس انصاری مسندِ صدارت سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اناؤنسر اور کنوینر صاحبان انھیں رخصت کر رہے ہیں

---

[1] ناک کیا ہر بڑی گنوار کی ہے۔ [2] کانوں کے پردے پھٹا کرتے ہیں اُڑا نہیں۔ [3] شاید آپ عزیز صاحب کی کامیابی اور مقبولیت سے جل گئے ورنہ ان کا ایک ہی شعر ایسا پیش کیا ہوتا جو فنی سقم کا حامل ہوتا۔ [4] مطالعہ تو آپ کا بھی ایسا ہی ہے ورنہ گھبرول کو گھبول نہ لکھتے۔

ادھر حضرت شہباز امروہی[1] اپنے داہنے بائیں بوجھ ڈالتے، لنگوں پر قدم رنجہ فرماتے، ازلبسکہ رگڑتے روندتے ایک نوجوان کے سہارے مائیک پر آگئے ہیں۔ بھاری بھرکم جسامت، مناسب قد بیکا گندمی رنگ، کتابی چہرے پر کھڑا ناک نقشہ، بادامی شیروانی اور اسی کلر کی کیپ۔ چوڑے پائنچوں کا پائجامہ، عمر غالباً ۶۰ سے بھی اوپر۔ آخر تحت اللفظ میں شروع ہوئے ہیں ـــہ

جاتا ہوں نہ مسجد میں نہ بت خانے میں
جی لگتا ہے نہ گلشن میں نہ ویرانے میں
رٹ رکھا ہے اس واسطے اللہ کا نام
کام آتا ہے یہ نام قسم کھانے میں

سامعین کھسیانی سی ہنسی ہنس رہے ہیں۔ کہیں کہیں سے اکا دکا داد بھی پھوٹ رہی ہے۔ آخر کچھ ہے بھی؟ مجھے یہ ہنسنے ہنسانے کی بے مقصد شاعری اچھی نہیں لگتی۔ میں اور عمر انصاری[2] صاحب ابھی اسی تبصرے سے گزر رہے تھے کہ اچانک سارا مجمع اکھڑ گیا۔ سارا گراؤنڈ بے ہنگم شور و غل کی آوازوں سے گونج رہا ہے۔ پتہ چلا ہے کہ ایک بلا نوش سفولات و خرافات بک رہا ہے۔ یہ کوئی ذمہ دار افسر بھی ہے۔ جب تک کلکٹر صاحب موجود رہے۔ اس شخص کے پر پرزے بھی سکڑے رہے۔ اب وہ جا چکے تو حماقت پر حماقت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ سامعین طیش کھاتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ بس نہیں چلتا کہ تکا بوٹی کر ڈالیں۔ خیر ذمہ دار لوگوں نے معاملہ سنبھال لیا ہے مگر اس ہوا و گیر کے چل چلاؤ میں بزرگوار شہباز امروہی غائب ہو چکے ہیں۔ ٹھیک بھی تو ہے۔ بزرگ آدمی اور پھر نابینا[3]۔ خیر آئیے اب میں آپ کو جناب شاکر کرتپوری سے ملاتا ہوں ہلکا پھلکا جسم، مناسب قد، گورا رنگ۔ کمبوترے چہرے پر خاصے نقوش۔ مشت [illegible] داڑھی۔ سر پر فلمی اسٹائل بال، بیل باٹم اور شرٹ میں ملبوس، عمر ہو گی چالیس کے قریب۔ مترنم پان کی پیک نگلا کرتے مائیک پر آگئے ہیں اور کافی دلکش ترنم میں شروع ہوئے ہیں۔ مگر مجمع کی ہلچل ابھی برقرار ہے۔ وہی غل غپاڑہ برپا ہے کہ ان کا کوئی شعر بھی سماعت قبول نہیں کر رہی اور اسی ہاؤ ہو کے عالم میں شاکر صاحب پڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اناؤنسر میں اتنی سکت نہیں کہ ماحول کی بدنظمی و ابتری کو درست کر سکے۔ آخر شاکر صاحب طوفانِ بدتمیزی سے اُکتا کر اپنی جگہ پلٹ آئے ہیں اور اناؤنسر نے گھبرا کر محترمہ سلکشنا انجم کو دوبارہ منظر پر پیش کیا ہے پھر اور یہ لیجئے.. عورت کا رعب دابہ... لوگ صدق دل کے ساتھ فرش گھیرتے جا رہے ہیں۔ موصوفہ نے غزل شروع کر دی ہے۔ داد کا عالم جاگ اُٹھا ہے اور پھر وہی تر و تازگی... وہی بشاشت اور وہی زندگی و زندہ دلی ایسا لگ رہا ہے گزرا ہوا وقت پلٹ آیا ہے۔ بہرکیف فضا کو سازگار بنانے کے بعد انجم پھر اپنی جگہ چلی گئی ہیں اور اب اعلان ہو رہا ہے جناب منصور لکھنوی کے نام کا۔ میرے بائیں ہاتھ سے اُٹھ رہے ہیں جناب منصور۔ لانبا قد، چھریرا جسم، کپاسی رنگ، گولائی مائل چہرے پر کھڑے نقش و نگار، کلین شیو۔ آنکھوں پر چشمہ، چھدرے چھدرے بال، قمیص اور پائجامہ میں ملبوس۔ عمر ہو گی پچاس سے متجاوز ـــ مائک پر آتے ہی گلو ترنم میں قطعہ مرحمت فرمایا ہے۔ ـــہ

ہم نے گلۂ رنج و محن چھوڑ دیا ہے
تاریخ کا فرسودہ چلن چھوڑ دیا ہے
جو میرے لئے زمزمۂ ساز و طرب تھا
ظالم نے وہی طرزِ سخن چھوڑ دیا ہے

"شتر گربہ"[4] کی صنعت میں یہ قطعہ مجمع پر کوئی اثر نہیں چھوڑ سکا ہے۔ پھر بھی ایک آدھ کراہ کسی نہ کسی منھ سے نکل ہی گئی ہے۔ حیران ہوں کہ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی یہ بھی نہیں

۱۔ خط کشیدہ عبارت [illegible] نابینا کے [illegible] آپ کو زیب نہیں دیتا۔ ۲۔ تبصرہ اپنے تک محدود رکھا ہوتا۔ بیچارے عمر انصاری کو بدذوق ہونے کا الزام نہ دیجئے ۳۔ یہاں پھر آپ نے "نابینا" تضحیک کے طور پر لکھا ہے جو اس کا مظہر ہے کہ آپ خدا کی خدائی کے قائل نہیں ہیں۔ ۴۔ "شتر گربہ" نہیں "شتر گربہ" لکھا کیجئے۔ آپ کو عروض دانی کا دعویٰ ہے اور شتر گربہ کو صنعت کہہ رہے ہیں حالانکہ یہ عیب ہے۔

جاننا کہ قطعہ میں ایک مقام پر "صیغۂ جمع" استعمال کر رہا ہے تو
دوسری جگہ "صیغۂ واحد" ۔ مری طبیعت مکدر ہو گئی۔ آیئے
جناب کیف بھوپالی سے ملیں۔ چوڑا چکلا ڈھانچہ، مناسب قد
پھیکا گندمی رنگ، لٹکا ہوا چہرہ، مغلئی خد و خال، کلین شیو، سر
پر چھدرے چھدرے بال، لمبا کرتہ اور چوڑی مہری کا پائجامہ
میرے خیال میں ساٹھ سے کچھ اوپر ہی اوپر۔ اپنے نام کا اعلان
سنتے ہی تعمیل چھوڑتے مائیک پر آ گئے ہیں۔ اور نشہ ناک آواز
میں غزل چھیڑی ہے ؎

ہائے لوگوں کی کرم فرمائیاں
تہمتیں، بدنامیاں، رسوائیاں

مطلع سامعین پر بجلی بن کر ٹوٹا ہے۔ ہر طرف آہ و واہ کا غلغلہ
مکرر مکرر اور سبحان اللہ سبحان اللہ کی صدائیں اُمڈ رہی
ہیں۔ ایک جادو سا جادو ہے کہ توبہ۔ اور سنئے ؎

زندگی شاید اسی کا نام ہے
دوریاں، مجبوریاں، تنہائیاں

اس شعر نے بھی ایک طوفان سا جگا دیا ہے۔ سامعین لہرا لہرا
کر داد دے رہے ہیں۔ اور کیف صاحب کی سرمد آگیں لے
پھر کانوں میں رس گھول رہی ہے ؎

کیا زمانے میں یونہی کٹتی ہے رات
کروٹیں، بے تابیاں، انگڑائیاں

یہ شعر بھی مجمع کو لے اُڑا ہے۔ داد کا سلسلہ تھمائے نہیں تھمتا
مگر مجھے تعجب ہے کہ کیف جیسا کہنہ مشق شاعر بھی نشستِ
الفاظ سے پوری طرح بہرہ ور نہیں۔ مصرعِ اولیٰ میں "زمانے"
اور مصرعِ ثانی میں "انگڑائیاں" قطعاً زبردستی کی ٹھونسا ٹھونسی
سے زیادہ نہیں۔ نظم میں لفظ انگڑائی محبوب کے لئے مختص
ہے یا ہو سکتا ہے کیف صاحب خود ہی محبوبیت کا شکار
ہوں خیر اور ملاحظہ کیجئے ؎

ایک رندِ مست کی ٹھوکر میں ہیں
شاہیاں، سلطانیاں، دارائیاں

پناہ بخدا .... اس شعر کی قیامت خیزی نہ پوچھئے۔ کیف
صاحب کے ہم مشرب تو کچھ زیادہ ہی زیادہ آہ واہ مار رہے
ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں کسی کے ہاتھ لات نہ چل جائیں۔ بہر کیف
ماحول کے ارتعاش کا منظر دیدنی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ کیف
اور داد میں دامن چولی کا ساتھ ہے۔ میں نے کیف صاحب
کو کبھی شکست پڑھتے نہیں دیکھا۔ ہاں تو غزل انتہائی کامیابی
کے ساتھ ختم کر کے موصوف مائیک چھوڑنا چاہتے ہیں، پر
سامعین انھیں چھوڑنے والے نہیں۔ آخر دوبارہ شروع ہو گئے
ہیں۔ اب کی بار انھوں نے ایک رنگین و سنگین گیت چھیڑا ہے
نوجوان تھرک رہے ہیں، مگر سنجیدہ طبقہ اس چھچھورے پن سے
کراہت محسوس کر رہا ہے۔ آخر کار موصوف گیت اور اپنی چیک
مٹک سے فارغ ہو کر پلٹ گئے ہیں۔ اناؤنسر نے اب مولانا
طوفان قریشی جھانسوی کو زحمتِ سخن دی ہے طوفان کا نام سنتے
ہی کئی لوگوں پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ غالباً کبھی کبھی [illegible]
سنے ہوئے ہیں۔ آخر طوفان صاحب بھی اسم با مسمیٰ نکلے
اپنا اعلان سنتے ہی کرسیوں کی قطاروں سے پھلانگتے سامنے
والوں کو دھکے مکے دیتے بڑی سرعت سے لپکے ہوئے مائیک
پر آ ڈٹے ہیں۔ چھریرا بدن، دراز قد، گہرا سانولا رنگ
چہرے مہرے سے ایک دم سلطان حیدر علی۔ وہی گنجان اور
منہ چھوٹ داڑھی، چوڑی مونچھیں، گھنی بھنویں، چھتنگ ماتھے
پر ذرا سی ترچھی گول ٹوپی اور شانوں پر سجا شدہ،
چوخانہ رومال، مکو ہی اچکن اور شلوار، عمر پچاس سے ادھر
یا ادھر۔ زنّاٹے دار آواز میں شروع ہو گئے ہیں ؎

بے ستون سر پہ آسمان ہے میاں
ہم غریبوں کو سائیاں ہے میاں

مطلع کورا اُتر گیا .... مگر کرسیوں پر ڈٹے کالجیئیٹوں نے
شعر سے ہٹ کر "میاں ۔ میاں" کی تکرار لگانی شروع کر دی
ہے۔ اور سنئے .... ستم بالائے ستم۔ چلمنوں کی طرف سے بھی
صدا آئی "میاؤں میاؤں" اُف توبہ .... ایک ہنگامہ سا
ہنگامہ ہے۔ ہر شخص لوٹ پوٹ ہوا جا رہا ہے۔ مگر واہ رے
مولانا طوفان — آفریں صد آفریں ہمت مردانہ تو دیکھئے۔ ہوٹنگ کا
حرف حرف شیر مادر سمجھ کر پی رہے ہیں۔ اور دیکھئے ؎
اپنے سینوں میں دل کہاں چھپائیں + مچھینوں کے درمیان ہے میاں

شعر سنتے ہی پھر "میاں، میاں" اور "بھیا وہ میاں" کا ہڑبونگ برپا ہوا ہے۔ پر ظرفانی کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہے اپنے کام سے کام۔ آخر اللہ اللہ کرکے موصوف نے مائک کا پیچھا چھوڑا ہے۔ پھر من چلے ایک اور ایک اور سے نوازتے ہیں۔ خیر چھوڑئیے۔ آئیے اب ایک معتبر ادبی شخصیت سے ملیں۔ یہ ہیں جناب عمر انصاری لکھنوی۔ اناؤنسر انہی کے نام کا اعلان کر رہا ہے۔ میرے پاس سے اٹھ کر مائک کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ فربہ جسم، لانبا قد، گہرا سانولا رنگ، ملیالی مائل چہرے پر خاصے خد و خال اور گالوں سے لگی لگی بڑھائے نام ہی داڑھی، سر پر سفید ٹوپی، اور اسی کلر میں شیروانی۔ چوڑے پائنچوں کا پائجامہ۔ عمر پچاس سے متجاوز۔ مائک پر آتے ہی جامع لب و لہجہ میں تحت اللفظ کے ساتھ شروع ہوئے۔ ہیں ؎

تجھ کو قسم ہے زندگی اب جو ہمارا نام لے
یہ رہے تیرے صبح و شام اپنے یہ صبح و شام لے

مطلع معنی آفرینہ نہ سہی۔ پر زبان و محاورہ کا بلیغ استعمال اور طرزِ بیان کی سادگی مجمع کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکی لوگ کھلے دل سے خیر مقدم کر رہے ہیں۔ اور شائستہ و سنجیدہ واہ واہ کے درمیان عمر انصاری مزید ارشاد فرما رہے ہیں ؎

ظلم کے جتنے ہاتھ ہیں سب ہیں مری نگاہ میں
کوئی کسی کا نام لے کوئی کسی کا نام لے

اس شعر نے بھی سننے والوں کو بھرپور کشش کے ساتھ اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ اہلِ علم و فن خوب لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اس وقت میری گھڑی میں ڈھائی بجا چاہتے ہیں۔ آسمان ابر آلود ہو گیا ہے۔ سڑکی ہوئی گرمی اور حبس سے لوگ بے حال ضرور ہیں۔ مگر ماحول کی ترو تازگی اور زندگی و زندہ دلی اسی طرح برقرار ہے۔ عمر انصاری کی غزل سے محظوظ ہوتے ہوئے لوگ پھر شعلہ ناکی کے لیے چشم براہ ہو گئے ہیں۔ اور اب آ رہے ہیں جناب نسیم[1] شاہجہاں پوری۔ اوسط قد، چھریرا بدن، گہرا گندمی رنگ کتابی چہرہ قبولِ خاطر نقوش، پینٹ اور بش شرٹ، عمر کے اعتبار سے پچاس کے ادھر یا ادھر۔ مائک سنبھالتے ہی گلا ترنم میں غزل چھیڑ دی ہے۔

بجھ گیا دل آرزو کرتے کرتے
کھو گئے اور جستجو کرتے کرتے

سامعین مطلع سر آنکھوں پر لے رہے ہیں۔ ہر طرف سے خوش دلی و خوش نظری کا اظہار ہو رہا ہے۔ اور مکرر مکرر کی جھنکار میں نسیم پھر فرما رہے ہیں ؎

واقفِ آدابِ عرضِ شوق تھے
چپ رہے اور گفتگو کرتے رہے

اس شعر نے بھی مجمع کو بہت محظوظ کیا ہے۔ داد سلیقے اور معقول طریقے پر دی جا رہی ہے۔ ادھر نسیم صاحب رفتہ رفتہ کامیاب و کامراں غزل کے اختتام تک پہنچ رہے ہیں۔

خونِ دل سے عمر بھر بے غش نسیم
ہم چراغِ آرزو کرتے رہے

اور مقطع ہوتے ہی اناؤنسر جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری سے منظر پر آنے کی درخواست کر رہا ہے۔ معلوم کس طرف سے ایک گول مٹول چاروں چول برابر ہو لہ بلند ہو کر مائک پر آ کھڑا ہوا ہے۔ تمتماتا ہوا سرخ و سپید رنگ، گول چہرے پر قابلِ قبول نقوش، نیلگوں چشمہ سے جھانکتی ہوئی بھوری بھوری آنکھیں کلین شیو، چندیا پر چھدرے چھدرے بال، ہاف شرٹ اور بیل باٹم، عمر ہو گی پچاس پچپن۔ آخر جوہر صاحب روایتی ترنم کے ساتھ شروع ہو گئے ہیں ؎

حضورِ دوست اظہارِ بیاں کا کیا بھروسہ ہے
نظر سے حالِ دل کہہ دے زباں کا کیا بھروسہ ہے

مطلع سنتے ہی محفل پر رنگ سا رنگ دوڑ گیا ہے۔ اہلِ بجنور اپنے عزیز شاعر کو ہاتھوں ہاتھ لے رہے ہیں۔ میں تو کچھ گھڑی دال برابر سوچ رہا تھا۔ مگر نہیں شخصیت باوقار ہو تو کچھ قدر و منزلت ہوتی ہے ہاں تو واہ واہ سے گزرتے ہوئے جوہر مزید ارشاد فرما رہے ہیں۔ ؎

---

[1] حضور نسیم کو شعلہ ناکی سے کیا نسبت ؟

ادھر یہ چار تنکے اور ادھر وہ برق کی یورش
نہ جانے ہمارے آشیاں کا کیا بھروسہ ہے

اس شعر نے محفل پر قیامت ہی جگا دی ہے۔ حرف حرف حاضرہ کے امید و بیم کی تفسیر اور جذبات کا مظہر نظر آرہا ہے۔ سامعین بے حد محظوظ ہو رہے ہیں اور اس ہنگامہ واہ واہ میں جناب جوہر نہایت خوبصورتی کے ساتھ غزل ختم کر کے اپنی جگہ لوٹ پڑے ہیں۔ ان کے بعد اناونسر یعنی مضطر نگینوی خود کو سامعین کے سپرد کیا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھیے.. فہرست وکیل صاحب کی طرف کھسک رہی ہے۔ سمجھ جائیے کہ "قہر درویش بر جان درویش" والا معاملہ ہے مگر یہ کیا وکیل صاحب نے آسمان و زمین کے قلابے ملائے بغیر ہی پکار دیا۔ مجمع اناونسر یعنی مضطر صاحب کی شخصیت سے ذرا متاثر نہیں۔ لوگ ادھر ادھر کی باتوں میں لگ گئے ہیں۔ اسٹیج پر بیٹھنے والے شاعروں اور دوسرے افراد میں بھی آٹو گراف اور ایڈریس کے تبادلے ہو رہے ہیں۔ اور اس سب ہنگامہ کائیں کائیں کے سبب مضطر صاحب کا ایک لفظ بھی کچھ نہیں آرہا ہے سارا پنڈال شور و غل سے گونج رہا ہے اور اس افراتفری کے عالم میں مضطر صاحب مائیک سے ہٹتے ہوئے جناب خمار بارہ بنکوی کے نام کا اعلان کر رہے ہیں اور خمار صاحب سگریٹ کے لمبے کش کھینچتے ہوئے اٹھ رہے ہیں۔ آئیے ان سے بھی ملاقات ہو جائے۔ درمیانہ قد، چھریرا بدن، گہرا سانولا رنگ، مریخ چہرے پر گوارا نقوش، سر پر گھنگھریالے چھوٹے چھوٹے بال (غالباً خضاب زدہ) بنگالی کرتہ اور چوڑی مہری کا پائجامہ میرے خیال میں ساٹھ کے آس پاس۔ مائیک چھوتے ہی شعلے بھی شعلے لپکا دیے ہیں ؎

ہم انہیں وہ ہمیں بھلا بیٹھے
دو گنہگار زہر کھا بیٹھے

مطلع کی برجستگی اور چستی ..... جادو کا کام کر گئی۔ سامعین بڑی خوش دلی کے ساتھ داد سے نواز رہے ہیں۔ مجمع لہر در لہر ابھر رہا ہے۔ مزید سونے پر سہاگہ ..... خمار صاحب کے پڑھنے کا معصومانہ انداز۔ مگر میری طبیعت میں تکدر سا پیدا ہو چلا ہے حیران ہوں کہ خمار جیسے پختہ گو شاعر بھی "بھول" چوک کا شکار ہو سکتے ہیں۔ کیا انھیں علم نہیں کہ "بھول" غیر اختیاری فعل ہے ۔ یاد، بھولنا، بھوک ہر دو افعال پر نفسیاتی انضباط منحصر ہے۔ اور یہ استدراک انسانی فطرت پر منضبط ہوتا۔ لہٰذا فطری عوامل انسان کے اختیار و انضباط سے باہر ہیں چھوڑیئے۔ وہ دیکھیے۔ خمار صاحب مکرر مکرر کے طوفان میں کتنا خوبصورت شعر عطا کر رہے ہیں ؎

آندھیو جاؤ اب کرو آرام
ہم خود اپنا دیا بجھا بیٹھے۔

خدا کی پناہ۔ آہ واہ کا وہ عالم کہ فضا گونج رہی ہے۔ ایک سماں ہے کہ ہلکورے لے رہا ہے۔ اہل بجنور کی ادب نوازی کو آفریں کہ ساڑھے تین بج رہے ہیں۔ پھر ہر شخص انتہائی دلجمعی کے ساتھ اپنی جگہ جما ہوا ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ ایک بجے ہی لوگوں کے تلوے کھجلانے لگتے ہیں۔ لیکن آج ایسا نہیں۔ چہروں کی بشاشت بتا رہی ہے کہ کسی کا "اشعر" پھیکا اثر نہیں پڑا۔ حد کہ نیند بھی تازہ دم نظر آتے ہیں اوہ..... معاف کرنا ... ملاحظہ ہو ؎

ہم سے ہے مبتلا دیر و حرم + وہ جب یاؤں دل میں آ بیٹھے

دہانک کی صفائی و پاکیزگی اور بلیغ پیرایہ بیان۔ پھر پڑھنے کا بہت ہی پیارا ڈھنگ روح کی گہرائیوں میں در آیا جا رہا ہے۔ گوشے گوشے سے تحسین و آفریں کا غلغلہ ہے کہ توبہ۔ آخر ؎ آہ واہ کے عالم میں خمار صاحب پھر فرما رہے ہیں ؎

حشر کا دن ابھی ہے دور خمار + آپ کیوں زاہدوں میں جا بیٹھے

بعض اوقات شام کا حسن تعلی بڑا مزہ دے جاتا ہے دیکھیے مقطع پر بھی رنگ سا رنگ جم رہا ہے۔ سامعین چمکتی مسکراہٹوں کے ساتھ خیر مقدم کر رہے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ خمار اور داد میں چولی دامن کا ساتھ ہے ہاں تو ماحول کو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بناتے ہوئے اب خمار صاحب مائیک چھوڑ رہے ہیں۔ مگر توبہ جی توبہ۔ لوگوں کی لطف اندوزی کا یہ عالم ہے کہ شاید دن نکلنے تک بھی خمار کو نہ چھوڑیں گے بہرکیف عام عزما کشوں کے احترام میں موصوف مائیک پر ٹھہر گئے ہیں۔ پھر وہی سوز و گداز، وہی سرود اور فردوس گوش گفتگی۔ لمحہ بھر توقف کے بعد محفل کا رنگ ...

سلہ شاید آپ سے بھول ہو گئی۔ تک آپ نے خوبصورت "تھا" کر کے ... [illegible]

دو ہالا ہو گیا ہے۔ ہماری رسٹ واچ[1] میں جاری بجا جاتے ہیں صبح کا تازہ ... اب ناقوس وانان کے وجہ آدرین سرگرم سخن کا منظر ہے۔

اب اخیر میں امین مشاعرہ کے کنوینر جناب ارشاد احمد صاحب اور مسعود کمیٹی جناب انیس انصاری صاحب (ڈی ایم بجنور) اور جناب سید مختار علی صاحب آفس انچارج میرنسپل بورڈ بجنور کو بہت بہت مبارک باد دوں گا کہ ان کی بے لوث سعی و عمل کے نتیجہ میں نمائش کا یہ مشاعرہ انتہائی کامیاب رہا حق تو یہ ہے کہ سابقہ ریکارڈ میں اس مشاعرے کی نظیر نہیں ملتی۔

معذرت کنندہ ہو چلا تھا کہ تو غنی صاحب کا ہدایت نامہ ملا کہ حسینہ فیل عبارت حذف کیں سکریٹری میں انشاء ہو اسلا اسد تحریر الفاظ کی ذمہ داری کیپٹری نگار یا کاتب[1] پر ہے۔

غزل

شاہد رتلامی (کویت)

آہستہ جو کانوں میں ترے بول رہا ہے
زہراب فضاؤں میں وہی گھول رہا ہے

نظروں سے تری گر کے یہ احساس ہوا ہے
ہر شخص نگاہوں سے مجھے تول رہا ہے

انسان کو پرکھنا ہے تو دھرتی پہ اُتر آ
کیوں عرش سے انسان کا بھرم کھول رہا ہے

نشتر کے سوا اور بہاروں نے دیا کیا
ہر زخم مرے دل کا یہی بول رہا ہے

جو آج حقارت سے مجھے دیکھ رہے ہیں
ہاتھوں میں کبھی اُن کے مرے کشکول رہا ہے

جو وقت تری یاد میں گزرا ہے تڑپ کر
وہ وقت مری ذہنیت کا انمول رہا ہے

جو چاہے سزا جرم محبت کی مجھے دو
میرا تو زمانے سے یہ ماحول رہا ہے

شاہد نہ چھپا پاؤگے کیفیت دل کو
خود آپ کا چہرہ ہی بھرم کھول رہا ہے

غزل

نشتر مکرانوی

جھیلے زندگی کے بھی نہیں کم
خوشی ہوگی جہاں پہ ہوتے ہیں غم

زمانے میں نہ ہوتے پیچ اور خم
تری زلفیں اگر ہوتیں نہ برہم

تجھے پہچانتا کیوں کر نہ عالم
تری محفل میں گر ہوتے نہیں ہم

تمنا آرزو ارمان و حسرت
کسی صورت کبھی ہوتے نہیں کم

گلستاں میں کبھی غنچے نہ کھلتے
صبا آتی نہ لیکر اشکِ شبنم

سکوں مل جائے گا اب آبلوں کو
یہ کانٹے بھی نہیں پھولوں سے کچھ کم

محبت آشنا یا بھی نہ ہوتی
اگر کچھ حادثے ہوتے نہ پیہم

نہیں پاتے کبھی ہم کامیابی
نہ لیکر چلتے گر ہم عزمِ محکم

مزہ آتا نہیں محشر میں نشتر
اگر ہم تم وہاں ہوتے نہ باہم

[1] کاش یہ بھی لکھ دیا ہوتا کہ آپ کی رسٹ واچ سیکو ہے یا ریکو ہ...
[illegible]

دی بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس: مرکنٹائل کوآپریٹو بینک بلڈنگ، ۷۸، محمد علی روڈ، بمبئی - 400003

بینک کاری کے تمام امور بشمول غیر ملکی زر مبادلہ کا لین دین انجام دیتا ہے اس کے علاوہ آپ کا معیار زندگی بلند کرنے میں آپ کی ہمت افزائی کرتا ہے اور جملہ اقسام کے گھریلو استعمال کی سامان کے حصول میں آسان شرائط پر آپ کی مدد کرتا ہے۔

یکم اکتوبر ۱۹۷۹ء سے سود کی شرحیں

۱۔ سیونگ ڈیپازٹس پر

(سیونگز اکاؤنٹس پر چیک سہولت کے ساتھ ۶ فیصد سالانہ)

۲۔ فکسڈ ڈیپازٹس پر ۱۳ ستمبر ۱۹۷۹ء سے

۱۔ ۱۵ سے ۴۵ دن تک	۳½ فیصد سالانہ	۵۔ ۹ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ایک سال سے کم	۶½ فیصد سالانہ
۲۔ ۴۶ سے ۹۰ دن تک	۴ فیصد سالانہ	۶۔ ایک سال اور اس سے زیادہ مگر بشمول ۳ سال تک	۸ فیصد سالانہ
۳۔ ۹۱ سے زیادہ مگر ۶ ماہ سے کم	۵ فیصد سالانہ	۷۔ ۳ سال اور اس سے زیادہ مگر بشمول ۵ سال تک	۹½ فیصد سالانہ
۴۔ ۶ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ۹ ماہ سے کم	۵٫۵ فیصد سالانہ	۸۔ ۶۱ ماہ اور اس سے زیادہ عرصہ پر	۱۱ فیصد سالانہ

دہلی برانچ

3655 نیتا جی سبھاش مارگ، دریا گنج، نئی دہلی - 110002

فون: 268266 - 264374

منیجنگ ڈائریکٹر

نوین جی رنگون والا

دہلی زونل منیجر

شمیم کاظم

سانپ اور انسان

شام بارک پوری (بنگلہ دیش)

اندھیری اور خاموش رات تھی۔ رات کا سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت نر سانپ نے اپنے بیوی بچوں سے "دن کے وقت میں ایک مینڈک کھا رہا تھا کہ وہ حلق میں پھنس گیا۔ بڑی مشکل سے نگل سکا اسے۔ ابھی تک گلے میں درد ہو رہا ہے۔ اور طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے" ذرا رک کر بولا "مگر آج اس گھر میں دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے۔ اس اندھیری رات میں شور و غل سے یہاں ہمیں نیند کیونکر آئے گی؟"

مادہ سانپ نے جو کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ اپنے بچوں کو پیار کرنے کے لیے سینے سے لگا لیا۔ اور پھنکار کر کہنے لگی: "میں نے بہت آدمیوں کو اس گھر میں آتے جاتے دیکھا ہے" بڑی لڑکی دُم ہلا کر بولی "ہاں! بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے بھی آئے ہیں۔ ایک لڑکی بہت ہی حسین ہے۔ جیسی کہ . . . میں ہوں"

سانپ نے کچھ سوچ کر جواب دیا "سُنا ہے کہ انسان کی ذات اچھی نہیں ہوتی۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ ان کی بات پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کی ظالم نظریں ہم پر نہ پڑیں تو اچھا ہے" مادہ سانپ اونگھ رہی تھی کہ اس کی آواز سُن کر کہنے لگی۔ "تمہیں تو انسانوں سے خواہ مخواہ بغض ہے۔ کیا انسان اچھے نہیں ہوتے؟ مجھے تو اچھے خاصے لگتے ہیں۔ آخر ان میں کیا خرابی ہے؟ ایک دفعہ ایک نوکرانی اپنی پوتی کے ساتھ اس صندوق پر بیٹھی تھی جس کے اندر ہم رہتے ہیں۔ اس نے ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی صندوق کتنے دنوں [illegible] بر آمدے میں لاپرواہی سے پڑا ہے۔ کوئی اسے چھوتا [illegible] نہیں"

سانپ کا بیٹا [illegible] ۔ وہ جھک کر [illegible] سنگ کا تھا اور بچپن کم از کم چار [illegible] بڑا تھا

ماں کی بات سُن کر وہ ہنسا اور کہنے لگا۔ ماں! تم بہت بھولی ہو۔ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ انسان کی ذات کتنی خطرناک ہے، تم کیا جانو! دراصل جب تم رات گئے گھر میں داخل ہوتی ہو تو وہ سوئے رہتے ہیں اور صبح کو جس دم باہر نکلتی ہو تب بھی وہ جاگنے کے بجائے صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا مزا اُٹھاتے رہتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ان میں ہمیشہ ان بن رہتی ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کا دشمن ہوتا ہے۔ وہ کسی کو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ مقتول قصوروار ہو یا نہ ہو۔!"

سانپ کی بڑی لڑکی چپ سادھے بیٹھی تھی۔ اس مرتبہ وہ بھی بولی "بھائی جان نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے ماں! انسان میں لالچ کا جذبہ بہت ہے۔ ہم لوگ دو چار بار شہر گئے تھے۔ وہاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کو بلا وجہ جان سے مار دیا اور باقی تمام لوگ یہ تماشہ کھڑے کھڑے دیکھتے رہے۔ اس کے علاوہ میں نے سُنا ہے کہ یہ انسان سینکڑوں آدمیوں سے محنت مزدوری کرا کے ان کے فاقوں پر اپنے بڑے بڑے کارخانے اور لاکھوں روپے کا کاروبار چلاتے ہیں وہ سونا کھاتا اور سونا پیتا ہے اور اس کے نوکر اور ان کے بچے بھوکوں مرتے ہیں۔ ماں! مگر ہم میں تو ایسا رواج نہیں ہم جتنا چاہتے ہیں جنگل میں کھا لیتے ہیں۔ ہمیں روکنے والا کوئی نہیں۔ ہم میں کوئی طبقاتی اونچ نیچ نہیں ہے ماں!"

مادہ کنڈلی مارتی ہوئی بولی "تم لوگ کچھ بھی کہو مگر مجھے ان پر بھروسہ ہے۔ ان کا اتنا بڑا جسم ہے مگر ہم لوگوں کی طرح ان [illegible] زہر نہیں ہے" ا

اس گھر [illegible] آدمی جو [illegible] پڑے [illegible]۔ اگر ہم لوگ انہیں ڈس لیں تو ان کی [illegible] ہوگی۔ [illegible]

اس وقت تو وہ بے خبر سو رہے ہوں گے چنانچہ ہم چلیں اور کسی کو ڈس لیں۔"

باپ نے اس کا راستہ روک کر کہا "چھی۔۔۔۔ چھی۔۔۔ چھی۔۔۔۔ تمہارے دل میں اس گندے خیال نے کیونکر جنم لیا۔ جب تک تمہیں کوئی ستائے نہیں تم کسی کو کیوں ڈسنے لگے۔ کسی کو خواہ مخواہ نقصان نہیں پہنچانا چاہیئے۔" بچہ اتنا کا بولا "مگر ابا یہ تو بڑی ظالم قوم ہے خود اپنی نسل کی بھی دشمن ہے۔ کیا پتہ ہم [illegible] [illegible]۔"

باپ بچے کے ان خیالات سے حیران رہ گیا۔ [illegible] کہ وہ ہمیں اس سے کیا واسطہ [illegible] وقت خود [illegible] سے بدلہ لے لیگا ہمیں اس کی فکر کرنے کی کیا [illegible]۔

اس کی ماں تنگ ہو رہی تھی جھلا کر بولی "بھئی دو رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اب سونا چاہیئے۔ دیکھو! غصہ میں کسی کو مت ڈسنا وہ لوگ بھی نہیں رہتے اور ہم لوگ بھی۔ اس لیے شرافت [illegible] جھگڑا کرنے [illegible]۔"

پھر وہ لوگ بہت جلد بے خبر سو گئے۔

سانپوں کا یہ خاندان علی الصباح اٹھ بیٹھا۔ باپ بڑے اور ہوشیار بچے کو ہمراہ لیکر باہر چلا گیا۔ ان کی ماں تینوں چھوٹے چھوٹے بچوں اور انڈوں کو سینے سے لگائے وہیں بیٹھی رہی۔ اس کے دماغ میں نئے نئے خیالات آنے لگے۔ یہ انڈا کب پھوٹے گا۔ اور بچے کب چلنے پھرنے لگیں گے۔ "انسان کے بچے کتنے اچھے ہوتے ہیں وہ ماں کو چھوڑ کر کھیلنے کودنے ہیں۔ لیکن ہمارے بچے ہر وقت ماں ماں کرتے اور ہمارے پاس گھسے رہتے ہیں۔ کوئی ایسی ترکیب ہو کہ میں ان سے الگ رہ سکوں۔"

سوچتے سوچتے وہ سر نیچے کر کے بچوں کو چاٹنے لگی۔ چونکہ رات [illegible] وقت اچھی طرح سو نہ سکی تھی اس لیے اونگھتے اونگھتے سو گئی۔ [illegible] وہ کھٹ کھٹ کی آواز سن کر [illegible] بیٹھی۔ اور اپنا پھن اٹھا کر ڈھکن کی طرف تکنے لگی۔

ایک آدمی صندوق کا ڈھکن تھوڑا سا اٹھا کر اندر دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر سانپ پر پڑی صندوق کا ڈھکنا اسی طرح چھوڑ کر چلاتا ہوا بھاگا۔ اس کی آواز سن کر بہت سے آدمی جمع ہو گئے جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ صندوق کے اندر سانپ ہے۔ تو انہوں نے ہاتھوں میں ڈنڈے لیکر صندوق کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

انہیں ڈنڈے لیے دیکھ کر مادہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے جلدی سے اپنے بچوں کو اپنے نیچے چھپا لیا۔ اور پھن اٹھا کر [illegible] پھنکارنے لگی۔ اس کا پھن [illegible] ہو گیا تھا۔ وہ بار بار زبان نکال کر صندوق [illegible] اندر [illegible]۔

صندوق کا ڈھکن [illegible] ٹوٹا ہوا تھا۔ لیکن وہ [illegible] سوچتی کہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر کیسے بھاگ جائے۔ [illegible] اپنے بچوں کو موت کے منہ میں اکیلا کیسے چھوڑ دیتی۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اپنی زبان [illegible] آدمی سے مخاطب ہو کر بولی۔ "اے لوگو! ہمیں مت مارو۔ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تم اشرف المخلوقات ہو اپنے اشرف اور افضل ہونے کا ثبوت دو۔ ہمیں مت ستاؤ۔"

آدمیوں نے صندوق کا ڈھکن زور سے پکڑ کر [illegible] ہی تھا کہ وہ ٹوٹ کر مادہ کے سر پر گرا۔ اسے گہری چوٹ آئی وہ درد کی شدت سے بے تاب ہو کر اپنا سر صندوق کی دیوار پر پٹخنے لگی۔ بچے گھبرا کر [illegible] اس کے پیٹ کے اندر [illegible] وہ خوف اور کسی قدر غصہ سے [illegible] ہو کر اپنی چمکیلی آنکھوں سے انہیں گھورنے لگی۔ اور سانپوں کی زبان بولی "تم لوگ آج مجھے بڑی آسانی سے مار سکتے تم سمجھتے ہو کہ سانپ کو مار کر فاتح اعظم کہلاؤ گے۔ شاید تم یہ نہیں جانتے کہ آج میں بچوں سے [illegible] مجبور ہوں۔ ورنہ جہنم رسید کر دیتی۔ اگر میں ایک بار

باہر نکل کھڑی ہوئیں تو ہم تم میں ماں کا لال نہ میرے ابل ٹھہر جائے ؟"

کھٹا کھٹ! کھٹا کھٹ!

مادہ کے سر پر ڈنڈوں کی بارش شروع ہوگئی۔ ماں کے سر سے خون بہنے لگا اور بدن اینٹھنے لگا۔ اور اس تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ اور دنیا میں ماں کے پیار کا نشان پھر بلند ہوگیا۔ !!

سانپ کے پانچ ہاتھ لمبے جسم کو کھینچ کر صندوق سے باہر نکالا گیا۔ بچے کلبلا اٹھے اور اپنی زبان میں چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ ماں! ماں! ہم اب کیسے زندہ رہیں گے ماں!"

وہ صندوق میں کلبلا رہے تھے کہ ان کا بھی وہی حشر ہوا جو ان کی ماں کا ہوا تھا۔ دور فضا میں شیطان، انسان کی جہالت پر قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا اور ظالم انسان مسکرا رہا تھا۔

رات کے وقت جب نر سانپ اپنے ٹھکانے کے ساتھ میں آیا تو اپنے صندوق نما گھر کو وہاں نہیں پایا۔ بچے کے مارے رونے لگے "ماں! ماں!"

سانپ کا بڑا بچہ روتا ہوا بولا "ظالم انسان نے ہماری ماں اور بہن بھائیوں کو مار ڈالا ہے انسان کے بھیس میں شیطان ہیں۔ ظاہر میں شریف اور باطن میں بھیڑیا۔"

صندوق کو توڑ پھوڑ کر ایک کنارے پھینک دیا گیا تھا ایک سانپ کے چھوٹے بچے نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے مارے ... اپنے باپ کو صندوق دکھایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

باپ نے وفورِ الم سے رو پڑا۔ غیظ و غضب سے پھن اٹھائے دُم کے بل کھڑا ہوگیا۔ جذبۂ انتقام سے اس کا منہ تمتما اٹھا۔ وہ پھنکار کر اپنے بچوں سے کہنے لگا۔

"دیکھا تم نے انسان کی کرتوت؟ کتنا ظالم ہے؟۔ ہمارا چھوٹا سا خاندان کیسی ہنسی خوشی اور آرام سے زندگی گذار رہا تھا۔ مگر انہوں نے ہمیں برباد کر دیا۔ انسان کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے بچے میرے سامنے سے گذر جاتے تھے مگر میں انہیں نہیں ڈستا تھا۔ کیونکہ وہ معصوم اور بے قصور ہوتے تھے۔ مگر اب تم انسان کی طرف دوستی کی نگاہ سے مت دیکھنا۔ کل رات تمہاری ماں نے تین آدمیوں کو ڈسنے سے روکا تھا۔ تو دیکھا اسے اس کا کیا پھل ملا؟ تم لوگ اب کہیں اور جا کر رہ سکتے ہو لیکن میں یہیں رہوں گا اور دیکھوں گا کہ میں انہیں رلا سکتا ہوں یا نہیں؟" یہ کہہ کر وہ غیظ و غضب میں اپنا پھن زمین پر مارنے لگا۔

وہ ایک ہفتہ تک وہیں رہا مگر کسی آدمی کو نہ پا سکا۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے ملے تھے۔ مگر انہیں ان سب سے کیا واسطہ؟ وہ معصوم بچے کسی کو ستانا کیا جانتے تھے جو وہ انہیں ڈستا۔ وہ دوسرے کے بچوں کو کیوں ڈستے؟ جبکہ اس کے بھی بچے تھے۔!!

ایک رات بارش ہوئی۔

آسمان خوشنما نظر آرہا تھا۔ فضا میں موسیقی گھلی ہوئی تھی۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے سبز گھاس پر موتی کی مانند چمک رہے تھے۔ پودے ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔ پھول مسکرا رہے تھے۔ ہر طرف خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ وہ سبز سبز گھاس پر رینگتا ہوا تالاب کے کنارے آپہنچا۔ پھول کی خوشبو سے وہ جھوم اٹھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد سے وہ غمگین رہا کرتا تھا۔ لیکن آج خوش نظر آرہا تھا۔

وہ پودے کے قریب جا بیٹھا۔ پھول کی خوشبو سے اس کا دماغ معطر ہو رہا تھا۔ اور وہ اپنے دل میں سکون محسوس کرنے لگا۔ اس نے سوچا قدرت نے بھی دنیا میں کیا کیا چیزیں پیدا کی ہیں۔ کہیں خوشی کہیں غم! ہم لوگوں کی چند روزہ زندگی ہے پھر ہم دوسروں کو کیوں ستائیں؟ اب میں کسی سے انتقام نہیں لوں گا

جو مر گئے ہو مر گئے۔ وہ مرنے کے بعد آرام ہی سے ہوں گے۔ اور پھر مجھے بھی تو کسی نہ کسی دن وہاں جانا ہے"!

اچانک اسے پھول کے پودے کے قریب دو انسانی پاؤں نظر آئے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک نمودار ہوئی اور پھر آپ ہی آپ غائب ہو گئی۔ وہ اپنے بیٹے کو جھٹک کر چلا گیا۔ نہیں

"نہیں اب میں کسی کو نہیں ڈسوں گا۔"

بقیہ:- بُلبل چہ گفت ...

طرح مدلّل بحث کر رہا تھا کہ ہمارے کئی اُردو دانش ور بھی ایسی بحث نہ کر سکیں۔ ایڈیٹر شانِ ہند بہت جلد کسی پریس کانفرنس میں اسی نوجوان کو پیش کر رہا ہے تاکہ وہ یہ سب کچھ تفصیل سے بتا سکے کہ اس نے اقتصادی مفاد کی خاطر اُردو کس لگن سے بغیر کسی مدد کے سیکھی اور پڑھی۔ اس لئے اگر اُردو کی ترقی چاہنے والے اردو کے ساتھ کوئی اقتصادی مفاد بھی وابستہ کر دیں تو عوام بغیر کسی تحریک اور کوشش کے اپنے آپ اُردو سیکھیں اور پڑھیں گے۔

منشی دیانارائن نگم کا جشنِ صدسالہ

منشی دیانارائن نگم (مرحوم) نے "زمانہ" کے ذریعہ اُردو کی جڑیں مضبوط کرنے میں جو خدمات انجام دیں انھیں اُردو اور اُردو کے شیدائی کبھی نہیں بھول سکتے۔ اُردو کے وہ مسلمان دانشور بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے جو اُردو کو قریب قریب مسلمانوں کی زبان کے طور پر تقسیم زبان کے گناہ کے مرتکب ہو چکے ہیں۔

۲۲ مارچ ۱۹۸۲ء کو لکھنؤ میں منشی دیانارائن نگم کا جشنِ صدسالہ منایا جا رہا ہے۔ خوش قسمتی سے اُتر پردیش اُردو اکادمی نے یہ جشن منانے کے لئے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ اس موقع پر "زمانہ" کا ایک یادگار نمبر بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ جس میں "زمانہ" کے پرانے شماروں سے اقتباس و چند اُردو ادب کے ستاروں کے مضامین بھی شامل کئے جائیں گے۔

ہر اُردو داں اور اُردو پرست کا فرض ہے کہ "منشی دیانارائن نگم" کے اس جشنِ صدسالہ کو کامیاب کرنے میں ہر طرح سے اعانت فرمائے اور اپنا اولین فرض سمجھتے ہوئے ہندوستان کی وزیرِ اعظم محترمہ اندرا گاندھی کو اُردو میں خط لکھے کہ اس مبارک موقع پر ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا جائے جس پر مرحوم منشی دیانارائن نگم کی تصویر ہو۔ ملک بھر کے اُردو رسائل و جرائد کے مدیرانِ کرام سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ منشی دیانارائن نگم کے جشنِ صدسالہ کے سلسلے میں اداریئے نوٹ لکھیں اور اس جشن کو کامیاب بنانے کے لئے مناسب اقدام اٹھائیں۔ اخبارات کے ذریعہ حکومت کی توجہ مبذول کرائی جائے کہ وہ منشی دیانارائن نگم کے جشنِ صدسالہ کے موقع پر ڈاک ٹکٹ جاری کرے۔

علامہ سیماب اکبرآبادی کی سوویں سالگرہ

بزمِ سیماب دہلی کے صدر جناب ضیاء فتح آبادی نے اطلاع دی ہے کہ ۱۹۸۲ء میں علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کی سوویں سالگرہ منانے کی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔ یہ تقریبات ہند و پاک کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی منعقد کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ ہم سب کا فرض ہے کہ جب وزیرِ اعظم صاحبہ کو خط لکھیں تو منشی دیانارائن نگم کے ساتھ یہ بھی لکھیں کہ علامہ سیماب اکبرآبادی کی سوویں سالگرہ پر بھی ڈاک ٹکٹ جاری کیا جائے کیونکہ علامہ سیماب اکبرآبادی کی بھی اُردو شاعری پر ایک ایسی چھاپ ہے جسے مٹایا نہیں جا سکتا۔

اوجین کے چند قدیم شعراء

قسط (۲)

محمد ثنا عابدی
آل انڈیا ریڈیو اندور

جان عالم خاں: آپ وزیر محمد جہانگیر خاں کے صاحبزادہ اور محمد عظیم خاں عظیم اوجینی کے چھوٹے بھائی تھے۔ آپ ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ عربی۔ فارسی۔ اور اُردو کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ شاعری کا شوق اپنے بڑے بھائی محمد عظیم خاں عظیم اوجینی کو دیکھ کر ہوا۔ چنانچہ اُن ہی سے آپ نے مشورۂ سخن کیا۔ جان عالم خاں کا غزل گوئی کی طرف خصوصی رجحان تھا۔ اوجین کے مشاعروں میں برابر شرکت فرماتے تھے۔ آپ کا کلام "آفتاب مالوہ" اوجین کے علاوہ ملک کے دوسرے جرائد میں بھی نکلتا تھا۔ آپ نہایت زُود گو تھے۔ غزلوں میں قدیم رنگ نمایاں اور زبان و بیان کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں ؎

اتنے اتراؤ نہ تم حُسن پہ نازاں ہوکر
کچھ خدا تو نہیں ہو جاؤ گے انساں ہوکر

صاف پیشانیٔ قاتل پہ نمایاں ہوکر
قطرۂ اشک ندامت بھی انشاں ہوکر

حیف سر گرم عملیات ... مسلماں ہوکر
قوم مفلس ہے ... بے سر و ساماں ہوکر

استقامت سے اگر دل میں رہے ذوق عمل
مشکلیں سامنے آجاتی ہیں آساں ہوکر

ہم فدا ہوگئے دیکھا جو ہلالِ ابرو
عید عُشّاق مناتے ہیں تو قرباں ہوکر

لذتِ ذبح کوئی پوچھ لے جانبِ زدگاں سے
لُطف جینے کا ملا کرتا ہے قرباں ہوکر

تیغ قاتل کو گلے سے میں لگا لیتا ہوں
... وہ گلا ... قرباں ہوکر

... آگئی ... قفس
... جگر ... محفلِ ... ہو

تحفۂ آزادی کا اس طرح ملا کرتا ہے
شرط اوّل ہے رہو قیدیٔ زنداں ہوکر

صورتِ نور گری جزو کتاب اللہ
رہتی ہے پیشِ نظر صورتِ قرآں ہوکر

چند قطرے مرے اشکوں سے ابھارے تھے
بن گئے سیلِ غضب نوح کا طوفاں ہوکر

جان عالم یہ عجب سانحہ ہے لے شان خدا
آپ اس بُت کے پجاری ہیں مسلماں ہوکر

میر سید منور علی: آپ سرسی مخدوم پور تحصیل سنبھل ضلع مرادآباد میں ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ عربی۔ فارسی اور اُردو کی تعلیم وطن میں حاصل کرکے اپنے چچا میر علی نقی کے پاس اوجین چلے آئے۔ ریاست گوالیار کے قوانین کا امتحان پاس کرکے وکالت شروع کی۔ آپ فارسی کے جید عالم بھی تھے۔ بقول سلطان احمد صدیقی آپ کے احباب میں نیاز فتح پوری ایڈیٹر نگار بھی تھے۔ نیاز صاحب بھوپال میں مقیم تھے۔ دوستوں کے اشتراک "یاران نجد" کی امداد سے رسالہ "نگار" بھوپال سے جاری کیا گیا۔ حضرت نیاز فتح پوری جب اوجین آتے تو منور علی صاحب کے دولت کدہ پر قیام فرماتے تھے۔ نیاز فتح پوری نے جابجا اپنے مضامین اور خطوط میں میر سید منور علی اور اوجین کا تذکرہ کیا ہے۔

میر سید منور علی کی اولاد میں سید مہر علی، سید مبشر علی، سید مسعود علی، سید مدبر علی، سید ناصر علی اور سید انور علی ہیں۔ مہر علی مرحوم نے بریلوی اور دیوبند کا مناقشوں میں مقالے ادا کئے ... جو دہلی اور لاہور سے شائع ہوئے۔ مبشر علی ... علی ... ہیں ... اوجین ... اسکول اور انجمن ترقی اُردو ...

اوجین کا قیام آپ ہی کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ ڈاکٹر سید ناصر علی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں۔

میر سید منور علی کا سسرالی رشتہ ناصر نظیر فراق اور حضرت خواجہ میر قدر دہلوی سے ہے۔ اوجین میں اُردو ناول نگاری اور میر سید منور علی کا اہم تعلق ہے۔ اس سلسلے میں سلطان احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ:

"اوجین میں پہلا ناول سب سے پہلے کس نے لکھا۔ یہ ایک تحقیق طلب امر ہے۔ پنڈت برج سنگھ صاحب نے ایک ناول بنام "فردوس کی حور" لکھا جو لاہور کے اخبار عام پریس سے ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ پنڈت چاند نرائن راو دان نے ایک ناول اپنے زمانہ طالب علمی (میٹرک) میں "عروب حجاؤں" لکھا۔ جو لاہور سے شائع ہوا۔ تیسرا ناول سید منور علی صاحب وکیل نے ۱۹۲۰ء میں لکھا جو رسالہ "آفتاب مالوہ" میں بالاقساط شائع ہوا تھا رسالہ بند ہونے سے پورا ناول شائع نہ ہوسکا۔ اس کا مسودہ جناب ل۔ احمد (لطیف الدین احمد) اکبرآبادی نے طباعت کے لئے رکھ لیا تھا۔ مگر آگرہ میں تقسیم وطن کے ہنگامہ میں ان کا کتب خانہ اور مکان نذر آتش کردیئے گئے ضائع ہوگیا۔"

میر سید منور علی مرحوم کی شاعری کا نمونہ تو دستیاب نہیں ہوسکا ہے لیکن سلطان احمد صدیقی نے ان کی ناول نگاری کا اقتباس ضرور فراہم کیا ہے۔ وہ نمونتاً قارئین کی نذر ہے۔

"مسجد مرزا چمن بیگ صاحب کی بائیں آپ دیکھتے ہیں۔ یہ ایک عالیشان عمارت جو کوٹھی نما ہے کس کی ہے؟ سنا ہے کہ عالمگیر کے مشہور مدارالمہام نعمت خاں عالی کا یہ مکان ہے شاہان مغلیہ کا نیر اعظم جب بام ترقی پر اپنے قدم جمائے ہوئے تھا اس وقت یہ مکان اس کے عالی خاندان قسمت علی خاں عالی نے اپنے آسائش کے لئے تیار کرایا تھا۔ زمانہ کے انقلاب نے اس کو ایک جاگیردار ریاست گوالیار کے جو حکیم جیا صاحب کے نام سے مشہور تھے ان کو اس کا مالک بنا دیا۔ رفتہ رفتہ انقلاب زمانہ نے اس سے ہاتھ صاف کیا تو دوسرے لوگوں کے قبضے میں یہ حویلی پہنچی اور زیادہ تر اس کا حصہ وکلاء اور مختاران سے آباد ہے جو اکثر سرسی ضلع مرادآباد کے سہسوان ضلع بدایوں کے باشندے ہیں۔ اس حویلی کے ایک کنارے پہاڑی کی طرف ایک بنگلہ نما مکان بنا ہوا ہے۔ اس کی ساخت اس بات کا شاہد ہے کہ کسی ذی شعور کے ہاتھوں بنا ہے۔ بالائی منزل پر ایک نہایت خوشنما کمرہ ہے۔ اس کے سامنے چاندنی ہے جس کا رخ مسجد مرزا چمن بیگ کی جانب ہے اور وہ نہایت وسیع ہے۔ ہم دیکھتے ہیں اس چاندنی پر چند صاحبان بیٹھے ہوئے کسی خاص معاملہ پر بحث کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی ظاہری حالت اس کی گواہ ہے کہ یہ لوگ کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔"

میر سید منور علی مرحوم کی ناول نگاری کے ایک اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے ناول میں "مقامی رنگ" بھی اختیار کیا ہے۔ اور ناول تاروپود انھوں نے اپنے بزرگوں کے کردار سے تیار کیا ہے۔ میر سید منور علی کا باسٹھ سال کی عمر میں ۱۹۴۱ء میں اوجین میں ہی انتقال ہوا۔ میر سید منور علی کی شخصیت اوجین کا ایک قابل قدر [illegible] تھی۔ آج بھی اوجین میں "حویلی میر صاحب" کے نام سے ایک محلہ آباد ہے۔

عبدالقادر جنات اوجینی:-

سلطان احمد صدیقی نے اوجین کے مزاحیہ شاعر عبدالقادر جنات اوجینی کے مرسلہ تعارف میں لکھا ہے کہ "۱۸۸۶ء میں اوجین میں پیدا ہوئے۔ اردو اور قرآن کی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ بقدر ضرورت ہندی اور انگریزی سے بھی واقف تھے۔ مصوری اور پینٹنگ کی طرف رجحان دیکھ کر ان کے والد نے کسی مصور کے سپرد کردیا۔ اس شوق سے ذریعہ معاش بھی نکل آیا۔ اوجین میں شعروشاعری کا ماحول تھا۔ حضرت علامہ بشر کی سرپرستی میں مشاعرے ہورہے تھے۔ حضرت ساغر عیشی کے توسط سے بشر صاحب مدظلہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چونکہ ظریف واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ استاد نے جنات تخلص تجویز کیا۔ طرحی مشاعروں میں ہزل لکھ کر شرکت کرنے لگے۔ اوجین کے دوسرے مزاحیہ شاعر رحیم اوجینی تھے دونوں میں خوب نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ جنات اوجینی بیرونی مشاعروں میں بھی مدعو کئے جاتے تھے۔ بمبئی میں مزاحیہ اکٹر جانی واکر نے ایک مزاحیہ مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں میدان

جنات اوجینی کے بالقصد رہا۔ طنز، ظرافت اور مزاح میں اکبر الٰہ آبادی کے معتقد تھے۔ آخر عمر میں زیارت حرمین شریفین میں حاضری کی ایسی لگن لگی کہ ایک مکان فروخت کر کے یہ سعادت حاصل کی نہ

جلو جنات دنیا سے عدم آباد کی جانب
ضرورت پینٹر کی ہے خدا کے کارخانے میں

۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء بروز جمعہ نوے سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہونے سے جنات اوجینی کا انتقال ہوا۔ نمونۂ کلام (قطعات)

اس نئے دور پر خدا کی مار   شاعری سر پکڑ کے روتی ہے
آج کل شاعروں میں اے جنات   گگنے والوں کی قدر ہوتی ہے

شاعر کو علم و فن کی ضرورت نہیں ہے اب
واقف ہو راگنی سے گلے بانہ چاہئے
ممکن ہے ناچنا بھی پڑے جلوہ گاہ میں
اچکن کے ساتھ ساتھ پشواز بھی چاہئے

(متفرق اشعار)

ناز بے جا نہ اٹھائیں گے کہے دیتے ہیں
چاہنے والے تیرے کوئی مزدور نہیں

تلاشی حسن والوں کی پولیس والوں نے لی جس دم
نظر سے تیر، بغلوں سے چھری، سینے سے بم نکلے

دنیا کی سیاست ہوتی ہے آغوش میں چندو خانے کی
جس وقت گنجیڑی آپس میں اخبار کی باتیں کرتے ہیں

نظر آتا نہیں بیکار کوئی اس زمانے میں
جسے دیکھو وہی مصروف ہے اُلّو بنانے میں

(جاری ہے)

بقیہ: داش آکل ___

کے گھر کہرام مچ گیا اور شہر کے بچے بوڑھے اور جوان اس کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔ حاجی صمد کا بڑا بیٹا ولی خان فوراً اس کی تیمار داری کے لئے آن پہنچا۔ جب وہ داش آکل کے سرہانے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ نیم بیہوشی کی حالت میں بستر پر پڑا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ چکا ہے اور اس کے منہ سے خون آلود جھاگ جاری ہے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی کی راہ دیکھ رہا ہے اور اس کے انتظار میں بڑی مشکل سے سانس کی آمد و شد کا سلسلہ برقرار رکھے ہوئے ہے بہر حال اس گئی گذری حالت میں بھی اس نے ولی خان کو پہچان لیا اور آخری ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

" دنیا میں ... میرے طوطے کے سوا ... میرا اور کوئی ... نہیں ... یہ اس ... کو ... دے دینا "

یہ کہتے ہوئے اس کی قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

ولی خان بلک بلک کر رونے لگا پورے شہر پر ایک ماتمی فضا طاری ہو گئی۔ پچھلے پہر جب اس کا جنازہ اٹھا تو ایسا لگتا تھا جیسے پورا شہر اُمڈ پڑا ہو۔

تجہیز و تکفین سے فارغ ہونے کے بعد اس کی وصیت کے مطابق ولی خان اس کے گھر سے اس کے طوطے کا پنجرہ اٹھا کر اپنے ساتھ لے گیا۔

اسی روز مغرب کے وقت مرجان بڑی افسردگی کی حالت میں طوطے کے پنجرے کے سامنے بیٹھی اس کے پروں کی رنگ آمیزی دیکھ رہی تھی اچانک طوطا داش آکل جیسے گمبھیر لہجے میں بول اٹھا۔

" مرجان ... مرجان ... تجھے مار ڈالا ... کس سے کہوں؟ ... مرجان ... مجھے تیرے عشق نے مار ڈالا۔

یہ سن کر مرجان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔

داشس آکل

قسط (۲)

تیسرا بولا:

"اچھا تو یہ بات ہے جبھی تو اب محلہ سرو ذکر میں نظر نہیں آتا اور اگر آتا بھی ہے تو بھیگی بلی بنا رہتا ہے۔"

کاکا رستم جو کہ اس کے نما... غصے سے بھرا بیٹھا تھا یوں ان کی باتیں سن رہا تھا اور ہکلاتے ہوئے کہتا تھا:

"بڈھے منہ مہاسے لوگ چلے تماشے۔ ذرا اس بڈھے کھوسٹ کو تو دیکھو۔ بھلا اسے سوجھی کیا ہے جو اس بڑھاپے میں حاجی کی چھوکری سے عشق لڑانے چلا ہے نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔ اب شریف بن کر لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتا ہے۔ نہ جانے کیا چکر چلایا ہے جو حاجی کی دولت کا وکیل بن بیٹھا ہے با... دولت کو ... اڑا چکا ... دیکھنا دھیرے دھیرے حاجی کی دولت پر بھی ہاتھ صاف کر جائے گا۔ واہ بھی واہ! نصیب ہوں تو ایسے ہوں۔"

اس کے دشمن اٹھتے بیٹھتے بہانے سے باتیں اڑاتے رہتے تھے جن کا نشانہ اب اس کی بیمار کھوکھلی ... جب وہ سر جھکائے اپنے خیالات میں گم بازار سے گزرتا تھا تو لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتے تھے۔ بعض منچلے تو ایک آدھ فقرہ بھی چست کر دیتے تھے۔ ادھر ادھر سے بھی لوگوں کی الٹی سیدھی باتیں اس کے کانوں میں پڑتی تھیں مگر وہ سنی ان سنی کر دیتا تھا۔ مرجان کا عشق اس کی رگ رگ میں کچھ اس طرح سے رچ بس گیا تھا کہ سوائے اُسے اس کی یاد کے کسی چیز کا ہوش ہی نہ تھا۔

سردیوں کی طویل راتوں میں جب وہ گھر آتا تنہائی اُسے کاٹنے کو دوڑتی۔ اس کا جی چاہتا کہ کسی کو اپنا حال دل سنائے مگر سمجھ میں نہ آتا کہ کس کو محرم راز بنائے اس کے گھر میں ... کا ایک ہی ساتھی تھا اور وہ اس کا پالتو طوطا تھا۔ وہ گھنٹوں اور پہروں اس کے پنجرے کے سامنے بیٹھا اپنا حال دل سنایا کرتا تھا۔

اسے پورا یقین تھا کہ اگر وہ مرجان کا رشتہ مانگے تو اس کی ماں خوشی خوشی اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دے گی۔ دوسری طرف وہ طبعاً بیوی بچوں کے جھنجھٹ میں بھی نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ کہ ماضی کی طرح مستقبل بھی آزادانہ زندگی گزارے کبھی کبھی اسے یہ خیال آتا کہ اگر وہ اس لڑکی سے خود شادی رچا لے جو کہ اس کی سرپرستی اور نگرانی میں دی گئی ہے تو لوگ کیا کہیں گے۔ کس طرح جگ ہنسائی ہوگی۔ کیسی کیسی باتیں بنیں گی۔ جو چیز سب سے زیادہ اس کے ذہنی کرب کا باعث تھی وہ اس کی مسخ شدہ صورت تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور اپنے چہرے پر لگے ہوئے کٹار کے بگڑے ہوئے زخموں کے نشانات اور اپنی نیچے کو کھنچی ہوئی آنکھ کا بغور جائزہ لیتا اور بڑی افسردگی کے ساتھ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگتا۔

"شاید وہ مجھے پسند ہی نہ کرتی ہو... ہو سکتا ہے اسے کوئی خوبرو اور نوجوان شوہر مل جائے... نہیں، نہیں یہ بات جوانمردی کے خلاف ہے.... وہ سولہویں سال میں ہے جب کہ میں چالیس سال کا ہو چلا ہوں... لیکن کروں تو کیا کروں....؟ یہ عشق مجھے مار ڈالے گا۔؟ مرجان...! تو نے مجھے مار ڈالا... آخر کس کو بتاؤں....؟ مرجان... مجھے تیرے عشق نے مار ڈالا...."

یہ کہتے کہتے اس کا دل بھر آتا اور وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے اور اپنا غم غلط کرنے کے لئے جام پہ جام لنڈھانے لگتا جب وہ نشے میں دھت ہو کر اپنے بستر پر جا گرتا تو تھوڑی دیر بعد نیند کی دیوی اُسے اپنی آغوش میں لے لیتی۔۔

جب رات کے پچھلے پہر شیراز کی پیچ در پیچ گلیوں اور فرحت بخش باغوں پر ایک سرمدی نیند کی چادر تن جاتی جب نیلگوں آسمان پر شوخ و شنگ ستارے پُر اسرار انداز میں راز و نیاز میں مگن ہو جاتے تو دن بھر کے واقعات ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگتے ... اچانک اس کی نظر ایک طلسماتی سی اور الف لیلوی طرز کی خوابگاہ کے منظر پر پڑتی اور وہیں جم کر رہ جاتی .... وہ دیکھتا کہ اس خوابگاہ کے اندر مرجان اپنے نرم و گداز بستر میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر اور اپنے تن بدن سے بے سُدھ پڑی جوانی کی گہری نیند سے لُطف اندوز ہو رہی ہے۔ اس کے رس بھرے ہونٹوں پر ایک معصوم سی مُسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ اس کے گلابی گلابی رُخسار دوشیزگی کی چمک سے دمک رہے ہیں۔ اور رات کے مہیب سناٹے میں اس کی مہکی ہوئی سانسوں کی پُر اسرار آواز اور اس کے مرمریں سینے کا قیامت خیز اُتار چڑھاؤ جوار بھاٹے کی کیفیت پیش کر رہا ہے۔ یہ ہیجان انگیز منظر دیکھ کر اس کی نس نس میں ایک انجانے سے کیف و سُرور کی لہر دوڑ جاتی اس کے معاشرہ کے خوف سے دبے ہوئے جذبات مچل اُٹھتے وہ بلا خوف و خطر تمام سماجی بندھنوں اور خاندانی روایات کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر اپنی مرجانہ کو اپنے آہنی بازوؤں کے حصار میں لے لیتا۔ وصلِ یار اور لبہائے آتشیں یار سے کیف و سرور سے سرشار رہتا ... لیکن جب اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ دیکھتا کہ

"تھا خواب میں خیال کو ان سے معاملہ"

تو سود و زیاں کے احساس سے بیگانہ ہو کر کبھی اپنے آپ پر لعنتیں بھیجنے لگتا اور کبھی دیوانہ وار ٹہلنے لگتا۔ اور پھر اس خیال سے کہ مرجان کے خیال کو دل سے نکال سکے اور زیادہ جوش و خروش اور زور و شور کے ساتھ حاجی مرحوم کے گھرانے کے اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں لگا رہتا۔

سات سال اسی نہج پر گزر گئے۔ اس سارے عرصہ میں واش آنکل نے حاجی صمد مرحوم کے بیوی بچوں کی دیکھ بھال اور خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ جہاں ان کا پسینہ گرتا تھا۔ وہاں وہ ہمیشہ اپنا خون بہانے پر تیار رہا۔ اگر کبھی کار قضا حاجی مرحوم کا کوئی بچہ بیمار پڑ جاتا تو وہ ایک جان چھڑکنے والی ماں کی طرح ساری ساری رات اس کی پائنتی بیٹھا آنکھوں میں کاٹ دیتا رہا۔ اگرچہ اسے حاجی کے سبھی بچوں کے ساتھ ایک گونہ تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ مگر مرجان کے ساتھ اس کی دل بستگی کچھ اور ہی طرح کی تھی اور یہ شاید مرجان ہی تھی جس کی وجہ سے وہ اس کے سب متعلقین کے لئے جان ہتھیلی پہ لئے پھرتا تھا۔

اس دوران میں حاجی صمد مرحوم کے تمام لڑکے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے آخر کار ہونی ہو کر رہی۔ ایک ایسا واقعہ رونما ہوا۔ جس کا واش آنکل کو ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا واقعہ یہ تھا کہ مرجان کے لئے ایک خواستگار پیدا ہو گیا اور خواستگار بھی ایسا جو کہ اس سے زیادہ بوڑھا اور زیادہ بدصورت تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس خبر وحشت اثر کو سُن کر اُس کے پیشانی پر بل تک نہ پڑا اور اس نے اس حادثہ کو نوشتہ تقدیر سمجھ کر اس کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا۔ اس نے بھی عجیب تر یہ کہ وہ بڑی دلجمعی کے ساتھ جہیز کی تیاری میں منہمک ہو گیا۔ شادی کی تقریبات شروع ہونے سے چند روز پہلے اس حاجی مرحوم کے اہلِ خاندان کو پھر سے اُن کے ذاتی بڑے گھر میں منتقل کر دیا۔ شادی کی رات اس نے گول کمرے کو مہمانوں کے بٹھانے کے لئے بڑے شاندار طریقے سے سجایا۔ اور شہر کے تمام بڑے بڑے تاجروں اور سربرآوردہ لوگوں کو اس تقریب میں شرکت کے لئے بُلایا۔

اس روز شام پانچ بجے مہمان خانہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب لوگ گراں بہا قالینوں پر گاؤ تکیوں کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ان کے سامنے انواع و اقسام کی مٹھائیاں اور رنگا رنگ پھل سجے ہوئے تھے۔ اچانک واش آنکل اپنی پہلے جیسی داداؤں والی وضع قطع بنائے بالوں کی پٹیاں جمائے سجائے، کالے رنگ کی گھیر دار شلوار، دھاری دار صدری اور تلے والی چپل پہنے گلوبند باندھے سر پر ترچھی ٹوپی رکھے ہوئے کمر بند میں کٹار لگائے ایک غیر معمولی

کی وحشت ... اندر داخل ہوا جب کہ اس کے پیچھے پیچھے تین اور آدمی بھی کھاتے اُٹھائے ہوئے تھے۔ تمام حاضرین ایک طرف کھڑے ایک بار پھر اس کے بارعب چہرے، ڈھنگ سے دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ وہ محفل کا ماحول دیکھے بغیر لمبے ڈگ بھرتا ہوا جامع مسجد کے امام کے سامنے جا کر کھڑا ہوا اور اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"اللہ بخشے حاجی صمد کو۔ اس کی وصیت کی وجہ سے سات سال تک میں انگاروں پر لوٹتا رہا۔ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا بھی اب بالغ ہو چکا ہے۔ یہ رہا مرحوم کا حساب کتاب۔ گزشتہ سات سال میں حاجی کے لواحقین پر جو کچھ خرچ ہوا۔ اس میں اس کا ایک پیسہ بھی شامل نہیں۔ آج کی رات کے تمام اخراجات بھی میں نے اپنی جیب سے کئے ہیں۔ اب مجھ میں اس بھاری ذمہ داری کو اُٹھانے کی سکت نہیں رہی۔ آج کے بعد وہ بھی آزاد ہیں اور میں بھی۔ بہتر ہے کہ وہ اب اپنی راہ پر چلیں اور میں اپنی راہ پر.....“

یہ کہتے کہتے اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ مزید کچھ کہے سُنے بغیر ایک ہارے ہوئے جواری کے مانند ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

کوچے میں آتے ہی اُس نے ایک اطمینان کا سانس لیا اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک طویل قید با مشقت کاٹ کر ابھی ابھی رہا ہوا ہو۔ یا ایک بھاری بوجھ اس کے کندھوں پر سے اُتر گیا ہو لیکن اگلے ہی لمحے اسے یوں لگا جیسے اُس نے اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع خود اپنے ہاتھوں سے لُٹا دی ہو۔ اس کا دل احساسِ شکست سے چُور چُور تھا اور اس کا کوئی ایسا ہمراز و دمساز بھی نہ تھا جو اس کے دل کی جراحتوں پر مرہم رکھتا اور اس کے درد کا درماں کرتا۔

وہ اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں اُلٹے سیدھے قدم اُٹھاتا ہوا کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھا جا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اسحاق یہودی کے گھر پر پڑی جسے پہچاننے میں اسے کچھ زیادہ دیر نہ لگی وہ بے دھڑک اور بلا کچھ سوچے سمجھے پختہ سیڑھیوں سے ہوتا ہوا ایک پُر اسرار طرز کے صحن میں داخل ہوا

جس کے چاروں طرف دیواروں کے چھتوں جیسی جالیوں والے چھوٹے چھوٹے اور گندے گندے سے کمرے بنے ہوئے تھے جن کی دیواریں دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔ گلے سڑے انگور کی سڑاند ساری فضا میں رچی بسی ہوئی تھی۔!

اسحاق یہودی ایک میلی کچیلی سی ٹوپی سر پر رکھے آنکھوں میں حرص و آز کی چمک لئے، اپنی پہاڑی بکرے جیسی داڑھی ہلاتا اور ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگاتا ہوا اُس کے استقبال کے لئے آگے بڑھا۔

داش آکل نے کھرکھرے سے انداز میں کہا۔

”پیارے ذرا ایک اچھی سی بوتل تو لانا، گلا خشک ہوا جا رہا ہے۔“

اسحاق یہودی نے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور اپنے تاریک تہہ خانے میں چلا گیا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد وہ پرانی شراب کی سربمہر بوتل لا کر بڑے مؤدبانہ انداز میں داش کی خدمت میں پیش کی۔

داش آکل نے لپک کر بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی بڑی بے صبری سے اس کی مہر توڑی اور پوری بوتل غٹاغٹ چڑھا گیا۔ یوں جیسے برسوں سے پیاسا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس بادہ خواری سے اس کی غرض نشاط نہ تھی بلکہ اُسے تو دن رات اک گونہ بے خودی چاہئے تھی۔ مگر اس کی صہبائے غم اتنی تند تھی کہ پوری بوتل چڑھا جانے کے باوجود اس کا آبگینۂ دل پگھلا جا رہا تھا اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اسے بڑے زور کا اچھو لگا۔ جلدی سے اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنا مُنہ صاف کیا۔ اسحاق یہودی کا ننگ دھڑنگ اور گندا سندا لڑکا بیٹھا جس کی ننھی سی توند باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ناک بہہ رہی تھی، اُدھ کھلے مُنہ اور بھوکی بھوکی نظروں سے اس کو تکے جا رہا تھا۔ داش آکل نے جلدی سے مُنہ پھیر لیا اور صحن کے طاقچے میں رکھے ہوئے نمکدان میں اپنی انگلی ڈالی اور پھر اپنے مُنہ میں ڈال لی۔

اسحاق یہودی جلدی سے آگے بڑھا اور جھلسنے کیا کہ کر اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے بڑے ناصحانہ اور پیار

مِن کہ مکتوب الیہ

چھنڈی گڑھ
۱۵ جنوری ۱۹۸۲ء

محترم المقام سرورؔ صاحب
آداب

"شانِ ہند" کا نومبر کا شمارہ موصول ہوا۔ جناب گوپال متلؔ کا خط اور اُس کے جواب میں آپ کا شذرہ پڑھ کر طبیعت محظوظ ہوئی بحث و تکرار اور نوک جھونک کا معیار ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ کسی کی دل شکنی یا کردار کُشی نہ ہو، ایک دوسرے کے محاسن کا فراخدلی سے اعتراف کیا جائے اور وسیع القلبی سے کام لیتے ہوئے اپنی کمزوریوں کو تسلیم کرلیا جائے۔ دونوں تحریریں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مگر بڑے پہلوانوں میں سے لوہ مقابلہ میں دونوں ہی برابر رہے ہیں۔

جناب گوپال متلؔ ممتاز محقق اور نقادؔ، بلند پایہ شاعر اور اعلیٰ نثر نگار ہیں لیکن ایک صحافی کی حیثیت سے وہ مجھے زیادہ بلند و بالا نظر آتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اپنا منفرد اسلوبِ نگارش تھا۔ آغا شورش کاشمیری نے بحسن وخوبی ان کی تقلید کی۔ مولانا آزادؔ کے ساتھ نثر میں شاعری کا جو دَور شروع ہوا تھا وہ اُس دن ختم ہوگیا جس دن شورشؔ زندگی سے منہ موڑ کر موت کی وادیوں میں روپوش ہوگئے۔ ان دونوں کا طرزِ نگارش اب کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن ان کے بعد کسی کی تحریر نے متاثر کیا تو وہ مولانا عبدالمجید سالکؔ کی نثر تھی۔ شاہد احمد مدیر "ساقی" تو صرف نام کا دبدبہ تھا کہ ان کا تعلق دہلی اسکول سے تھا۔ سالکؔ صاحب کا اندازِ تحریر ان سے کہیں بہتر لطف تھا ان دونوں نے بڑی شخصیتوں کے جو خاکے تحریر کئے ہیں ان کا مطالعہ کیا جائے تو سالکؔ کے خاکے شاہد احمد دہلوی کے خاکوں سے کہیں بھاری نظر آتے ہیں۔ کئی بار سوچا کرتا تھا کہ کیا سالکؔ کے پائے کی نثر لکھنے والا کوئی نہیں۔ لیکن جب گوپال متلؔ کی کتاب "لاہور کا جو ذکر کیا" پڑھی تو وہی لطف آیا جو سالکؔ کی "یارانِ کہن" پڑھ کر آیا کرتا تھا۔ "لاہور کا جو ذکر کیا" ادبی صحافت کا شاندار نمونہ ہے اور اسے بار بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔

آپ نے درست لکھا ہے ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں گوپال متلؔ کی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ سرحد کے اُس پار ان کی مقبولیت ہمارے ہاں سے کہیں زیادہ ہے۔ ربع صدی قبل مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو مرزا ادیبؔ، ظہیر کاشمیری، سیف الدین سیفؔ، طفیل ہوشیارپوری وغیرہ حضرات سے ملاقات ہوئی۔ اور ان سب نے جناب گوپال متلؔ، لالہ کرم چند پارسؔ اور خوشترؔ گرامی صاحب کا ذکر بڑے احترام سے کیا۔ آغا شورشؔ کاشمیری نے جناب جگناداس اخترؔ، رنگینؔ اور متلؔ صاحب کی خیروعافیت اور سرگرمیوں کے بارے میں دریافت کیا اور ان تینوں کی انسانیت نوازی کی بہت ستائش کی۔ ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں گوپال متلؔ کے مداح موجود ہیں۔

"یہ کوئے یار یہ اندازِ محرمانہ گزر" میں آپ نے سردار دیوان سنگھ مفتونؔ کی عادات کو اپنانے کا ذکر جس بے باکی اور جرأت سے کیا ہے اُس کی مثال کم ہی ملے گی۔ الحاج محمد یوسف صاحب مدیرِ اعلیٰ "شمع" کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے وہ اُن سے آپ کی بے پناہ محبت اور عقیدت کا ثبوت ہے۔ واقعی حافظ صاحب کی بلند شخصیت کا بدل ملنا مشکل ہے۔ دُنیا نیک اور مخلص انسانوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔ اللہ حافظ صاحب کو خضر کی حیات دے کہ وہ شرافت اور وضعداری کا نشان ہیں اور دلّی شہر کی آبرو ہیں۔

احقر
وشوا ناتھ طاؤس

منگلور ٹاؤن
سہارنپور۔ یو۔ پی

گرامی قدر جناب محترم سرورؔ صاحب
سلام مسنون

حسب الحکم سعید اختر صاحب کا بیان انہیں کی تحریر میں ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ یقین ہے کہ آپ حق اور تا حق تک پہنچنے میں کامیاب ہوں گے انشاء اللہ۔

سعید اختر نے مجھے یہ بھی بتایا کہ چندہ کی رسید کٹوانے کے چند روز بعد دن بعد تو حقیقت ان کی ملاقات ہوئی۔ نومبر کو چندہ کی بابت پتہ چلا

گیا۔ چلتا گیا، یہاں تک محلہ سرونڈک میں جا نکلا۔

جب وہ وہاں پہنچا تو رات خاصی گرم ہو چکی تھی۔ چاروں طرف ایک مہیب سناٹا اور ہو کا عالم تھا۔ یہاں وہ میدان اب بھی موجود تھا جہاں کبھی وہ آج سے سات سال پہلے اپنے حریفوں کو للکارا کرتا تھا۔ اور کوئی ماں کا لال اس کے سامنے آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ سب کچھ وہی تھا مگر اب داش آکل وہ پہلے والا داش آکل نہیں تھا۔ نہ تو اب اس میں پہلے والا ولولہ تھا اور نہ حوصلہ۔ وہ بلا ارادہ ہی کسی گھر کے تھڑے پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا پائپ سلگایا اور کش پر کش لگانے اور اپنے بے نام سے غم کو دھوئیں میں اڑانے لگا۔

اس کا سر بری طرح سے گھوم رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ اچانک اسے دور سے ایک سایہ سا اپنی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے ایک موہوم سا خطرہ محسوس ہوا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ جب وہ سایہ ذرا قریب آیا تو کہنے لگا:

"ایک غنڈہ دوسرے غنڈے سے اندھیری رات میں بھی نہیں چھپ سکتا۔"

داش آکل نے اپنے دیرینہ دشمن کاکا رستم کو فوراً پہچان لیا وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھا اور بڑی نفرت اور حقارت کے ساتھ زمین پر تھوکتے ہوئے کہنے لگا:

"لعنت ہے تیرے باپ پر جس نے تجھ جیسا بے غیرت بیٹا جنا۔ بڑے بدمعاش بنے پھرتے ہو۔ اگر آج تجھے چھٹی کا دودھ نہ یاد دلا دوں تو میرا نام داش آکل نہیں۔"

کاکا رستم نے ایک تمسخر آمیز قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

"اُدھر حاجی کی بیٹی کی شادی رچی ہوئی ہے اور تم یہاں بیٹھے ہو۔ شاید تمہیں کسی نے گھاس نہیں ڈالی..."

داش آکل کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"خدا نے اچھا کیا جو تجھے آدھی زبان دی، آج رات اس نے دیا ہوتا تو میں وہ بھی کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

دیکھتے ہوئے اس نے اپنا خنجر نیام سے کھینچ لیا۔ کاکا رستم بھی خنجر ہاتھ میں لئے خم ٹھونک کر اس کے مقابلہ پر اتر آیا۔ داش آکل نے اپنا خنجر زمین میں گاڑ دیا اور اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولا:

"دیکھتا ہوں کون ایسا تیس مار خان ہے جو اس خنجر کو زمین سے نکالتا ہے...."

کاکا رستم اچانک خنجر لے کر اس پر جھپٹا مگر اس نے اس کی کلائی پر ایسا ہاتھ مارا کہ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

ان کو لڑتا دیکھ کر چند راہگیر ان کے گرد جمع ہو گئے مگر ان میں سے کسی کو آگے بڑھ کر ان میں بیچ بچاؤ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

داش آکل نے ایک طنزیہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"جاؤ جا کر اپنا خنجر اٹھاؤ مگر اب کی بار ذرا مضبوطی سے پکڑنا کیونکہ آج کی رات سارا پچھلا حساب بیباق کرنا ہے۔"

کاکا رستم مٹھیاں بھینچتے ہوئے ایک بار پھر اس پر حملہ آور ہوا اور اس کے ساتھ گتھم گتھا ہونے لگا۔ آدھ گھنٹہ تک دونوں اوپر نیچے ہوتے رہے۔ لڑتے لڑتے دونوں پسینے میں شرابور ہو گئے اور بری طرح سے ہانپنے لگ گئے مگر کوئی بھی ہار ماننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اسی کھینچا تانی کے دوران داش آکل کا سر بڑے زور سے تھڑے کے ساتھ ٹکرایا اور وہ چکرا کر گر پڑا دوسری طرف کاکا رستم بھی ادھ موا ہو رہا تھا۔ اور اس کی تاب مقاومت بھی قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ اچانک اس کی نظر زمین میں گڑے ہوئے خنجر پر پڑی اس نے اپنے جسم کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے لپک کر اسے زمین سے نکالا اور پوری قوت کے ساتھ داش آکل کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھامے ہوئے بڑی مشکل سے کھڑا ہوا۔ چند قدم کاکا رستم کی طرف بڑھا اور تیورا کر گر پڑا۔ تماشائی اسے گرتا دیکھ کر اس طرف لپکے اور اسے فوری طور پر ہسپتال لے گئے۔

اگلی صبح کو جب اس کے زخمی ہونے کی خبر پھیلی تو حاجی صم

(باقی صـ پر)


شان



MAHAVIR

LAUNCHES ITS PRESTIGEOUS EXPANSION PROJECT

-: SEWING THREAD :-

In Pursuance of its Policy of
Ushering a New Era of Industrialisation in The City of Saints at The Foothills of Shivaliks 'On the occasion of Independence Day'

'We Pledge'

To continue our Sincere efforts towards betterment of common people of Hoshiarpur. with the completion of Expension Project

We Shall

Provide Direct Employment to About 4500 People
Provide Indirect Employment to 8500 People.
Contribute in a big way to the Economy of Industrially Backward District of Hoshiarpur by way of wage Disbursement and Local, Purchase worth Millions of Rupees per Year.

With best compliments from:

Mahavir Spinning Mills Limited
Phagwara Road,
Hoshiarpur :

بلا ٹکٹ سفر کرنا بھاری سا ماجک بُرائی ہے اور اسکے ساتھ ہی یہ ہماری قومی آمدنی میں بھی بھاری شگاف ہے

بلا ٹکٹ مسافر، مسافر مجاز کے آرام و سہولت پر ڈاکہ ڈالتا ہے ۔ وہ کرایہ ادا کرنے والے گاہکوں کے موزوں حقوق میں مداخلت بیجا کرتا ہے ۔ اور بھیڑ بھاڑ پیدا کرتا ہے ۔

بلا ٹکٹ سفر مجبوری سے زیادہ عادت کے تحت کیا جاتا ہے ۔ یہ ایک گہری جڑیں رکھنے والی سا ماجک بُرائی ہے ۔ اور اس کے وبائی اور چھوت چھات کے سے اثرات ہوتے ہیں ۔ یہ امن پسند اور قانون کے پابند شہریوں کے خلاف بھرشٹاچار کو بڑھاوا دیتا ہے ۔

اپنے حقوق و آسائش کی رکھشا کریں

بلا ٹکٹ مسافر کا سامنا کریں ۔ اور اس دیرینہ لعنت کو دور کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں

یاد رکھیں ! بلا ٹکٹ سفر زیر سیکشن 112 ۔ انڈین ریلوے قابل دست اندازی پولیس جرم ہے ۔

اچھے شہری بنئے ! قومی آمدنی بچایئے !
کبھی بلا ٹکٹ سفر نہ کریں !

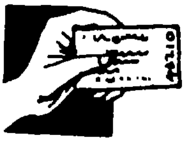


بلا ٹکٹ سفر

ایک سا ماجک بُرائی ہے



گاڑی میں
سوار ہونے سے پہلے
اپنا ٹکٹ خریدیں



ناردرن ریلوے

جاری کردہ ۔
چیف پبلک ریلشنز آفیسر

Some of my nicest dreams...



I dream with PSB

Dreams of our son growing up to a secure future.

Yet, one can't just dream. One has to save for tomorrow. So, we deposited Rs. 37,243.06 in PSB's Nau Nidhi Scheme and we'll get Rs. 1 lakh in 120 months' time. Our savings will grow with our child.

With PSB.

ASP/PSB/202-80

PSB—The name of total banking service

PUNJAB & SIND BANK

(A Government of India Undertaking)

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲
رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۶۴۲
نمبر

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرّہ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
(فیاض گوالیاری)

ماہنامہ شانِ ہند دہلی
آزادی ایڈیشن

ایڈیٹر: سرور تونسوی

زر سالانہ ۱۵/- روپے
فی پرچہ ۲/- روپے

جلد نمبر ۴۲ | اگست ۱۹۸۷ء | شمارہ نمبر ۸

ہماری آزادی کی ۴۰ ویں سال! ٥

ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور ایمانداری کے ساتھ سوچیں کہ اپنے وطنِ عزیز کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے ہم نے کیا کیا ہے؟

۱۔ کیا فرقہ پرستی کو ختم کرنے کے لئے آپ نے کوئی قدم اٹھایا؟
۲۔ قومی یکجہتی کو بڑھاوا دینے کے لئے آپ نے کیا کیا۔؟
۳۔ اشیائے ضروریہ کی کمی نہ ہونے پائے اور یہ اشیاء گرانی کی آخری حدوں کو نہ چھو لیں اس سلسلے میں آپ نے حکومت سے کیا تعاون کیا ہے؟
۴۔ سرکاری اداروں میں رشوت کے خاتمے کے لئے آپ نے کیا تدابیر اختیار کی ہیں۔؟
۵۔ وزیر اعظم صاحبہ کی ترقیاتی سکیموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے آپ نے اپنے فرائض کی ادائیگی کہاں تک کی ہے؟
۶۔ بجلی کے ناجائز استعمال اور پینے کے پانی کی بربادی کو روکنے کے لئے کیا آپ نے اپنے گھر میں کوئی عملی قدم اٹھایا ہے۔؟
۷۔ کیا آپ نے اپنے بچوں کو یہ باور کرایا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں ان کا ہڑبونگ مچانا اور تعلیم کے حصول سے روگردانی خود ان کے لئے زہر سے کم نہیں ہے۔
۸۔ جب آپ سڑک پر موٹر۔ ٹرک۔ بس۔ موٹر سائیکل وغیرہ چلاتے ہیں تو کیا یہ سوچ کر کہ راہ چلنے والے بھی آپ کی طرح جان رکھتے ہیں انہیں کسی قسم کے سڑک حادثہ سے بچانے کی کوشش کی۔؟ ۹۔ کیا آپ نے کسی مجرم کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی ہے؟
۱۰۔ کیا آپ خواتین کا احترام، مذہبی فریضہ کے طور پر کرتے ہیں۔؟
۱۱۔ کیا آپ نے کھانے پینے کی چیزوں اور ادویات میں ملاوٹ کرنے والوں کو کبھی قانون کے حوالے کیا ہے؟
۱۲۔ ہمارے اکثر منسٹر جھوٹ بولنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے جھوٹ بولنے والے وزیروں پر لعنت بھیجی ہے؟
یاد رکھئے کہ کسی آزاد دیش کے آزاد شہری اپنی چال۔ ڈھال۔ رہن سہن۔ قول و فعل اور لین دین میں اپنی آزادانہ شان کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ آپ بھی ایسا کیجئے اور اپنے وطن کی آزادی کو ہر حال میں برقرار رکھنے کی کوشش کیجئے۔

آزادی

بدالبلاغت حضرت رتن پنڈوری

اُٹھو اہلِ وطن قسمت مسیحا بن کے آئی ہے
[illegible] چہرے میں دل کشا پیغام لائی ہے

وہ آزادی کہ جس کی آرزو نے مضطرب رکھا
کہ صدیوں سے ہم کو شاکیٔ قہر و غضب رکھا

کچل ڈالا وطن کو ترکتازانِ حوادث نے
ڈبویا قلزمِ پستی میں طوفانِ حوادث نے

کبھی یونان والوں کی لکد کوبی کا شور اٹھا
کبھی تاتاریوں کی شہر آشوبی کا شور اٹھا

کبھی ابدالیوں نے کی چڑھائی ہم غریبوں پر
کبھی درّانیوں کی آفت آئی ہم غریبوں پر

سکندر کی سیاست نے کبھی ہندوستاں لوٹا
کبھی تیمور کی یلغار نے امن و اماں لوٹا

کبھی شمشیرِ نادر آگ برساتی ہوئی آئی
کبھی چنگیز کی ہیبت ستم ڈھاتی ہوئی آئی

عمل داری مغل کی تو کبھی افغان کا سکہ
کبھی توران کا سکہ کبھی ایران کا سکہ

قیامت تھا ستمگارانِ حشر انگیز کا خنجر
مگر آخر کو بازی لے گیا انگریز کا خنجر

وہ آئے تلاطم خیزیٔ موجِ بلا بن کر
مگر انگریز آ پہنچے فریبِ مقتدا بن کر

انھوں نے تو فقط ہندوستاں کا مال و زر لوٹا
مگر مغرب نے غیرت کو بھی مشکیں باندھ کر لوٹا

اسی غم نے رُلایا ملک کے جاں باز شیروں کو
اسی غم نے سُلایا خاک پر قومی دلیروں کو

دلِ پامال میں بھی خونِ غیرت جوش میں آیا
مئے غفلت کا متوالا بھی آخر ہوش میں آیا

ہزاروں ماہ پارے شمعِ آزادی کے پروانے
حکومت نے نکالے جن کی بربادی کے پروانے

اُٹھے ہاتھوں میں لے کر پرچمِ اقبالِ آزادی
ملا ناداریوں کے بعد راس المالِ آزادی

بالآخر یہ دلاور منزلِ مقصود پر پہنچے
کٹھن راہوں میں چل کر منزلِ مقصود پر پہنچے

ہزاروں نے فنا ہو کر بقا کی منزلت پائی
جگر کے دردِ پنہاں نے دعا کی منزلت پائی

مٹا آخر نشاں مغرب کی شانِ کج کلاہی کا
گیا ہندوستاں سے دورِ انگریزوں کی شاہی کا

شہیدوں کی کفن بردوشیاں معجز نما نکلیں
جو قاتل تھے انھیں کے حق میں پیغامِ قضا نکلیں

حکومت چھین لی آخر نہتوں کی جسارت نے
زمیں پر رکھ دیئے ہتھیار انگریزی حکومت نے

حکومت ہے اب حفظِ حکومت کا سبق سیکھو
صداقت کا۔ محبت کا۔ رفاقت کا سبق سیکھو

کتابِ زندگی میں اُنس کا عنوان بن جاؤ
بظاہر آدمی تو ہو مگر انسان بن جاؤ

ذرا سوچو تو آزادی کا ہے بارِ گراں کتنا
قفس سے چھوٹ کر مشکل ہے تعمیرِ آشیاں کتنا

وطن ہے تم سے اب لطف و مدارا کا تمنائی
عروجِ ارتقا۔ اوجِ ثریا کا تمنائی

خلوص و اتحاد ایسا ہمارے دل میں پیدا ہو
گریختہ موجِ مضطر سے دلِ ساحل میں پیدا ہو

کمربستہ رہیں خدمت پہ اربابِ حکومت بھی
تصدق ہو اطاعت پر۔ محبت پر رعیت بھی

یہ تفریق و تنفر اک مصیبت ہیں وطن والو
نگاہوں میں کھٹکتا ہے یہ صیاد کا گلشن [illegible]

بدل ڈالو اس آپس کی رقابت کو رفاقت سے
بدل ڈالو غبارِ دل کو اخلاص و محبت سے

محبت ہی کے پردے میں ہے پنہاں رازِ آزادی
بنا ڈالی ہے [illegible] حقیقت [illegible] آزادی

دعا ہے یہ اے رتن اہلِ وطن سب نیک ہو جائیں
جدا ہو شکل گو سب کی مگر دل ایک ہو جائیں

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

"اسکولوں کے سلیبس سے اردو غائب"

اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیئے جانے کا پہلا عملی قدم

گزشتہ ہفتہ کل ہند مسلم اردو مصنفین کانفرنس لکھنؤ کے موقع پر اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے حتمی وعدہ فرمایا تھا کہ وہ سال رواں کے آخر تک آئینی طور پر اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان قرار دے دیں گے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکیں گے تو اس عہدہ سے مستعفی ہو جائیں گے۔

وزیر اعلیٰ نے اپنے اس وعدے کا بارہا اعادہ فرمایا ہے بلکہ پچھلے ہفتہ ہی انھوں نے ریلوے سٹیڈیم گورکھپور میں ایک نمائندہ کو خصوصی ملاقات میں یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ اپنے قول سے انحراف نہیں کریں گے اور دسمبر تک اس پر عمل درآمد ہوگا۔

مگر ان کے اس وعدے کی ایفائی کے لئے ان کی حکومت عملی طور پر کیا کر رہی ہے۔ وہ انجمن ترقی اردو اتر پردیش کی صدر محترمہ سلطانہ حیات صاحبہ کے الفاظ میں سنئے۔ فرماتی ہیں "درجہ ایک سے لے کر درجہ پانچ تک کے لئے ترمیم شدہ نیا سلیبس شکشا وبھاگ اتر پردیش نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ جو بہت قابل غور ہے۔ کیونکہ اس میں کلاسوں میں اردو پڑھانے کے متعلق کوئی ہدایت نہیں ہے کہ وہ کیسے پڑھائی جائے۔ مختلف کلاسوں میں اس کا معیار کیسا ہو اور کون کون سی کتابیں پڑھائی جائیں گی۔ زبان کے سلسلے میں صرف ہندی پڑھانے کے متعلق تفصیل سے ہدایتیں موجود ہیں اسی طرح دوسرے مضامین پڑھانے کے لئے بھی وضاحت کے ساتھ ہدایتیں درج ہیں۔ مگر پورے سلیبس (SYLLABUS) میں اردو پڑھانے کے متعلق کوئی تذکرہ نہیں۔ ۱۹۷۸ء میں بھی اسی طرح کا سلیبس شائع کیا گیا تھا۔ جس میں یہ کہیں نہیں لکھا تھا کہ اردو نہ پڑھائی جائے۔ البتہ یہ تذکرہ ضرور تھا کہ اگر کوئی طالب علم اردو پڑھنا چاہے تو اس کو اردو پڑھائی جائے۔ کونسی کتابیں ہوں وغیرہ۔ ان باتوں کے متعلق سلیبس خاموش تھا اس کے معنی محکمہ افسران نے یہ لئے کہ اب اردو پڑھانے کی ضرورت نہیں اور اس پر فوراً عمل بھی کیا گیا۔ مگر موجودہ سلیبس میں تو اردو پڑھانے کا تذکرہ ہی نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بیسک اسکولوں میں اردو پڑھائی بالکل ہی بند ہو جائے گی۔ ایک طرف تو آنریبل وزیر اعلیٰ یوپی اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے متعلق واضح اعلان کر رہے ہیں اور دوسری طرف محکمہ تعلیم کا یہ سلیبس ہے" کیا فرماتے ہیں عالمی اردو کانفرنس کے داعیان محترم اتر پردیش سرکار کے اس اولین عملی قدم پر؟

محکمہ تعلیم اتر پردیش کے ناخداؤں کی کیا مجال کہ اپنے وزیر اعلیٰ کی پالیسی کے خلاف چلیں جبکہ وزیر اعلیٰ عالمی کانفرنس میں نہایت کھلے الفاظ میں یہ کہہ چکے ہوں کہ ہماری نیتا شریمتی اندرا گاندھی کا یہ حکم ہے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا دیا جائے لہذا اندرا جی کے اس حکم کی تعمیل ہو کر ضرور رہے گی۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ محترمہ اندرا گاندھی کے ہر حکم کی تعمیل کرنیوالے وشوناتھ پرتاپ سنگھ وزیر اعلیٰ اتر پردیش کی حکومت نے اردو کی بیخ کنی کرتے ہوئے بیسک اسکولوں کے سلیبس سے اردو کو غائب کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ عالمی اردو کانفرنس کے جملہ چودھری اتر پردیش میں اردو کی اس بیخ کنی پر فوراً توجہ دیں۔ جناب عمار رضوی اور سید علی حماد زیدی کا فرض ہے کہ وہ وزیر اعلیٰ کی توجہ اس طرف جلد سے جلد مبذول کرائیں۔

عالمی اُردو کانفرنس :-

جناب علی جواد زیدی صاحب کا ایک طویل بیان حال ہی میں اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے عالمی اُردو کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت اور عالمی اُردو کانفرنس کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں لائحہ عمل پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ زیدی صاحب سرکاری عہدوں پر فائز رہے ہیں اس لئے انھیں یہ ڈھب بہتر انداز میں معلوم ہے کہ اپنی بات کے جواز میں کیسے گول مول بات کی جاتی ہے۔ ورنہ دل سے تو وہ بھی مانتے ہوں گے کہ آخر اس عالمی اُردو کانفرنس کا ڈھونگ رچا کر ملک کا لاکھوں روپیہ برباد کرنے سے یہی تو فائدہ ہوگا کہ وہ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے سربراہ ہونے کے باعث وزیر اعلیٰ یوپی اور وزیر اعظم صاحبہ ہند کے قریب بیٹھ سکیں گے۔ اخبارات میں تصاویر شائع ہوں گی۔ ممالک غیر سے آنے والے نام نہاد اُردو کے نمائندوں کی موجودگی میں واہ واہ ہوگی۔ تالیاں بجائی جائیں گی۔ وزیر اعلیٰ یوپی بڑے طمطراق سے وہ الفاظ (جن کی ریہرسل انھیں مہینوں پہلے کرائی جا چکی) میں وزیر اعظم ہند کے سامنے اُردو کے حق میں کم اور وزیر اعظم سے وفاداری کی زیادہ یقین دہانی کرائیں گے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں بلکہ وہ خود کہتے بھی ہیں کہ اُتر پردیش کی میری چیف منسٹری وزیر اعظم صاحبہ کے باعث ہی قائم ہے۔

جناب زیدی صاحب ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ علی گڑھ میں اپنی علمی و ادبی تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں پریشان تھے۔ جوڑ توڑ کرنا انھیں آتا ہے لہذا وہ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے سربراہ بنا دیئے گئے آخر انھیں بھی اپنے دانے پانی کا خیال ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ جب تک صوبے کے وزیر اعلیٰ کو بے وقوف نہ بنایا جائے یہ مطلب براری ممکن نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے گرد ایک حلقہ اکٹھا کیا اور عالمی اُردو کانفرنس کی تجویز وزیر اعلیٰ یوپی کے سامنے رکھ دی اور وزیر اعلیٰ کو شیشے میں اس طرح اُتار لیا گیا کہ انھیں عالمی اُردو کانفرنس میں اپنی شہرت مسلمانوں میں مقبولیت [illegible]

مشکل فرما دی اور علی جواد زیدی صاحب سے ہی کہا کہ آپ لوگ جو یہ تجویز لائے ہیں آپ ہی اسے سرے چڑھائیے۔

اب آپ ہی سوچئے کہ آخر اُردو کے لئے ایسی جانبازی کون دکھائے گا کہ یہ لاکھوں روپیہ بجائے اُردو والوں کو اُردو پڑھانے پر صرف کیا جائے۔ یار لوگوں کو ایسا موقع پھر ہاتھ آنے کا نہیں ہے لہذا کیا کیا خوش آئند پروگرام بنا ڈالے گئے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں غیر ملکی نمائندوں کو ٹھہرایا جائے گا آخر ان کے ساتھ اخلاقی طور پر کھانے میں شرکت کرنی ہوگی۔ دوسرے ممالک میں جا کر اُردو کے نمائندوں کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دینا اور اس کے علاوہ ایسے ایسے مفاد کہ شاید ہی پھر زندگی میں نصیب ہوں۔ اُردو کو مارو گولی وہ تو اپنے آپ عوام میں مقبول ہوتی جائے گی۔ اُردو کی آڑ میں اپنا دانہ پانی پکا کر لو۔ تو حضور یہ ہے زیدی صاحب کے اس بیان کا لُبِّ لباب۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ یہ عالمی اُردو کانفرنس کیسے ضروری نہیں ۔؟

ترقی اُردو بورڈ :-

جناب شمس الرحمٰن صاحب فاروقی نے ترقی اُردو بورڈ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے جو کام کیا اس کی تعریف میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ مگر جونہی ان کی جگہ جناب کے کھلر کا تقرر کیا گیا۔ تو ملک کے ہر مسلم اُردو دانشور کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگا اور لکھنؤ اور اطہر پرویز ایسے نو آموز اُردو دانشور نے بھی یہ اعتراض کر دیا کہ کھلر صاحب کو اُردو دنیا میں کوئی جانتا ہی نہیں۔

سورج کی روشنی میں اگر چمگادڑ کو نظر نہیں آتا تو اس میں سورج کا کیا قصور۔ بیچارے اطہر پرویز کا بھی کیا قصور ہے انھوں نے تو یہ محض اس لئے لکھا کہ وہ اُردو کو مسلمانوں کی میراث سمجھتے ہیں اور ایک غیر مسلم کا ترقی اُردو بورڈ کا ڈائرکٹر مقرر کیا جانا ان کے گلے اُترنا مشکل ہو گیا۔ ایک اطہر پرویز ہی کیا ملک کا ہر ایک مسلمان اُردو دانشور اپنے پیٹ میں یہی درد محسوس کرتا ہے اور یہ بدہضمی محض اس لئے ہے کہ ایک ہندو کو اُردو بورڈ کا ڈائرکٹر مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر قمر رئیس شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی نے کھلر صاحب کے حق میں ایک مراسلہ "قومی آواز" میں شائع کرایا ہے [illegible]

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

سرور تو

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

ایک شام حکیم صاحب بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ جھجکتے جھجکتے میں نے گزارش کی کہ آپ مسلمان مریضوں سے ایک آنہ فیس بھی نہیں لیتے۔ کسی مسلمان مریض کو گھر دیکھنے جاتے ہیں تو اس سے نصف فیس چار آنے لیتے ہیں۔ جبکہ غیر مسلم مریضوں سے آٹھ آنے فیس لیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان مریض نسخہ میں لکھی ادویات کی قیمت ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتا تو آپ اس کے نسخہ پر ہی لکھ دیتے ہیں کہ دوا کی قیمت نہ لی جائے جب کہ آپ ہندو ہیں مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کے ساتھ آپ کا سلوک مشاورانہ تو کیا بلکہ کسی حد تک ہتک آمیز ہوتا ہے۔ حکیم صاحب سر سے پگڑی اتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے بڑے حکیمانہ انداز سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ وِدیا پرکاش جی یہ سوال پہلے مجھ سے کئی حضرات نے دریافت کیا ہے مگر میں اس کا جواب دینے سے احتراز کرتا ہوں مگر آپ سے اب کوئی پردہ نہیں اس لئے غور سے سنئے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میرا استاد مسلمان تھا جس فراخ دلی سے میرے استاد نے طبی راز مجھے بتائے وہ کوئی بھی ہندو استاد قطعاً نہ بتاتا۔ اس لئے میں یہ اپنے استاد کا قرض اتار رہا ہوں کہ مسلمان مریضوں کو ہر سہولت دی جائے دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندو فطرتاً پیسہ پرست ہے اور میرے استاد نے چالیس سال تک جو کچھ مجھے سکھایا وہ یہ تھا کہ روپیہ سے محبت نہ کرنا۔ بلکہ روپیہ کو اپنا غلام سمجھنا۔ طبی طور پر کبھی کسی مریض سے اپنی فہم و فراست کے مطابق علاج میں بددیانتی نہ کرنا۔ اور ہر انسان کو خدا کا بندہ سمجھنا۔ ہندو مریضوں سے میرا قدرے ہتک آمیز سلوک ان کی فطری کمزوری اور پیسے کو ہی سب کچھ سمجھنے کے باعث ہے۔!

ابھی حکیم صاحب بات ختم بھی نہ کر پائے کہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص آیا اور کہنے لگا کہ حکیم صاحب مریض کا حال خراب ہے۔ ذرا چل کر دیکھ لیجئے۔ حکیم صاحب نے بندھی پگڑی سر پر رکھی۔ سفید صافہ گلے میں ڈالا اور جوتا پہن کر تیار ہو گئے کہنے لگے آئیے ودیا پرکاش جی آپ بھی چلئے بوہڑ دروازہ کے باہر ہی ہے۔ ابھی واپس آجائیں گے میں میں بھی ساتھ ہو لیا۔ بوہڑ دروازہ سے باہر نکلے تھے کہ اوپر بجلی کی تار پر بیٹھے ہوئے کبوتر کی بیٹ رشتہ دار کے سر پر گری اور حکیم صاحب وہیں کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ جاؤ اب میرے جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ مریض دنیا سے چل بسا۔ یہ کہا اور حکیم صاحب نے اپنا رخ مطب کی طرف کر لیا اور دکان کی طرف چل پڑے۔ میں حکیم صاحب کے پیچھے حیران و پریشان چلتا رہا۔ حکیم صاحب نے کمرے میں بیٹھتے ہوئے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا ودیا صاحب آپ مریض کی موت سے پریشان ہو گئے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ میں نے کبوتر کی بیٹ مریض کے رشتہ دار پر گرنے سے مریض کی موت کا اعلان کیسے کر دیا۔ حکیم صاحب نے پوچھا تمہاری عمر کیا ہو گی عرض کیا تقریباً اٹھائیس سال۔ کہنے لگے ابھی یہ باتیں سمجھنے کے لئے پچیس سال اور چاہئیں۔

ایک دن ایک بڑا خوبصورت اور جیم و شحیم نوجوان حکیم صاحب کے پاس آیا اور مریضوں کے بیٹھنے سے گھبرا کر اپنی بیماری کی تفصیل بتانے کی بجائے کاغذ پر لکھ کر حکیم صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ پرچہ کی پہلی سطر ہی پڑھ کر حکیم صاحب بھناتے ہوئے بولے جب رنڈیوں کے پاس عیاشی کرنے جاتے تھے تو اس وقت شرم نہیں آئی تھی اب تمہیں اپنی خبیث بیماریاں کی تفصیل بتلاتے شرم آتی ہے۔ اگر مجھ سے علاج کرانا ہے تو اپنے ماں باپ کو ساتھ لے کر آؤ تاکہ تمہیں عبرت حاصل ہو کہ تم کس قدر

باپ کی اولاد ہو کر کس قدر غلط قدم اُٹھا چکے ہو۔ نوجوان ندامت کے آثار چہرے پر لئے واپس چلا گیا۔ شام کو میں نے حکیم صاحب سے اس نوجوان کے بارے میں دریافت کیا تو کہنے لگے فلاں سیٹھ کا لاڈ پرچینٹ کا لڑکا ہے۔ بہت ہی وافر ہے عیاشی کرتا ہے پہلے بھی ایک بار اسے سوزاک ہو چکا ہے اور اب تو اس نے سوزاک اور آتشک دونوں خرید لئے ہیں۔ عیاشی اور جنسی بے راہ روی پر باتیں ہوتے ہوتے حکیم صاحب فرمانے لگے کہ فلاں کشمیری مصنف کی کتاب "سنگار رس" جنسیات پر ایسا مستند گرنتھ ہے کہ اس سے بہتر اس موضوع پر آج تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ فرمانے لگے کہ اصل کتاب سنسکرت میں ہے بعد میں اس کا ترجمہ انگریزی میں شائع ہوا۔ خدائے جمالیات شو جی مہاراج کی استتی کرنے کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ میں یہ کتاب عیاشی کی غرض سے نہیں لکھ رہا بلکہ اس غرض سے لکھ رہا ہوں کہ یہ فطری تقاضہ ہے کہ مرد اور عورت کچھ عرصے کے بعد "CHANGE" چاہتے ہیں۔ چنانچہ مصنف نے ایسے ایسے جنسیاتی اور جمالیاتی طریقے اور آسن بتائے ہیں کہ کوئی بھی عورت اپنے مرد سے مختلف چھتیس انداز میں جنسیاتی طور پر لطف اندوز ہو سکتی ہے اور کوئی بھی مرد اپنی بیوی کی مختلف چھتیس دل نواز اور شہوت انگیز جنسیاتی اداؤں سے دلجمعی اور تسکین قلبی حاصل کر سکتا ہے۔

میں نے اشتیاقاً عرض کیا کہ یہ کتاب آپ کے پاس ہے؟ فرمانے لگے میں تم سے اسی سوال کی توقع رکھتا تھا۔ کیونکہ ہر ہندوستانی نوجوان اپنے آپ کو جنسی طور پر مکمل ہی سمجھتا ہے خواہ وہ پوری طرح سے مرد ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا حضور ابھی تو آپ نے بتایا کہ اس کتاب میں مختلف قسم کے جنسی حقائق پر بحث کی گئی ہے اس کا تو کوئی ذکر ہی نہ تھا کہ نوجوان جنسی طور پر اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ کہنے لگے ہاں ہے تو سنسکرت میں۔ کل ذرا جلدی آجانا تو الماری میں سے تلاش کر دوں گا۔

گو آتے برسات [illegible] بھی [illegible] دیت

میں ہے اور میں سنسکرت تو کیا ہندی کا بھی ایک لفظ نہیں پڑھ سکتا۔ میرے جاننے والوں میں بھی زیادہ تر مسلمان حضرات ہیں اور ان میں بھی کوئی سنسکرت نہیں پڑھ سکتا۔ حکیم صاحب کی مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کتاب پڑھ کر سنائیں گے ممکنات میں سے نہ تھا۔ اور پھر میں یہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ حکیم صاحب سے اس کتاب میں درج آسنوں یا طریقوں کی وضاحت چاہوں۔ کیونکہ حکیم صاحب کا احترام اور ہم دونوں کی عمروں میں طویل فاصلہ اس بے تکلفی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی اُدھیڑ بُن میں دوسرے دن دو بجے ہی حکیم صاحب کے ہاں حاضر ہوا تو مسکرا کر کہنے لگے میں جانتا تھا کہ آج تم بہت جلد آؤ گے میں نے بھی بے ساختہ کہہ دیا حضور واقعی رات بھر نیند نہیں آئی کہ کب دوسرا دن ہو اور کتاب دیکھوں۔

حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے الماری کھولی اور ضخیم کتاب نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا کہ میں نے اسے رات کو ہی نکال کر رکھ لیا تھا۔ میں نے بڑے اشتیاق سے کتاب اُن کے ہاتھوں سے لیکر ورق گردانی شروع کر دی مگر سنسکرت سے قطعاً نابلد ہونے کے باعث خاموش رہا۔ حکیم صاحب فرمانے لگے میں جانتا ہوں کہ تمہیں سنسکرت نہیں آتی۔ لہٰذا میں نے ایک پنڈت سے کہہ دیا ہے وہ تمہیں یہ پڑھ کر سنا دیا کرے گا۔ دوسرے دن سے پنڈت جی آنے شروع ہوئے پتہ چلا کہ یہ پنڈت جی ایک مدت سے حکیم صاحب سے تقاضا کر رہے تھے کہ انہیں یہ کتاب پڑھنے کو دی جائے تو حکیم صاحب نے پنڈت جی کو بھی خوش کر دیا اور میرے لئے بھی آسانی پیدا کر دی۔ پنڈت جی پڑھتے جاتے اور مطلب ہندوستانی میں سمجھاتے جاتے کئی الفاظ ایسے بھی تھے کہ پنڈت جی کو ان کے معنی نہیں آتے تھے مگر میں نفس مضمون کے مطابق ان الفاظ کا مطلب خود ہی نکال لیتا تھا اور اردو میں پنڈت جی کے ترجمہ کے مطابق روزانہ لکھتا رہا ——— [illegible] دنوں میں میں نے [illegible] کتاب کا رس اردو میں نچوڑ لیا تھا اور میں نے دل ہی دل میں [illegible] کتاب کو اردو میں [illegible]

کرلیا۔ اور چاہتا تھا کہ اسے بہترین انداز میں شائع کروں گا۔

ایک دن باتوں باتوں میں جناب غلام رسول خان شوق ڈائریکٹر تعلیمات کے ہاں اس کتاب کا ذکر آیا۔ جناب غلام رسول شوق جناب ڈاکٹر ہیرالال صاحب چوپڑہ کے ہم بلاک کوٹھیات کے پڑوس میں ہی ملتان ڈسٹرکٹ کورٹس کے قریب رہائش رکھتے تھے۔ جناب ڈاکٹر ہیرالال صاحب چوپڑہ کے ہاں کبھی جانا ہوتا تو جناب شوق سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ غلام رسول خان صاحب شوق بڑے ملنسار اور اس وقت کے ایک مشہور افسر تھے۔ شوق صاحب نے اشتیاق ظاہر فرمایا کہ جو ترجمہ میں نے اردو میں لکھا ہے اسے وہ بھی پڑھنا چاہتے ہیں اور میں نے ان کے حکم کی تعمیل میں یہ ترجمہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ چند ہی دنوں بعد ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہو گئے۔ جناب ہیرالال چوپڑہ تو غالباً کسی پہاڑی مقام پر گئے ہوئے تھے اور انھیں وہیں سے سیدھا دہلی آنا پڑا اور وہ ملتان واپس ہی نہ جا سکے اور کتابوں کا ایک ایسا قیمتی ذخیرہ وہاں گھر کے جملہ سامان کے ساتھ چھوڑ آئے کہ شاید ایسا علمی ذخیرہ اب بہت کم دیکھنے میں آسکے۔ اور میرا یہ مسودہ جناب غلام رسول خاں شوق کے ہاں ہی رہ گیا۔ یہاں آنے کے بعد میں نے متعدد خطوط شوق صاحب کو لکھے مگر وہ غالباً سرکاری افسر کی حیثیت میں کسی ہندوستانی سے خط و کتابت کرنا اپنے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ ازاں بعد پتہ چلا کہ شوق صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس مسودہ کی واپسی کا معاملہ بھی ختم ہو گیا۔ تاہم جو کچھ مجھے یاد ہے وہ کسی الگ مضمون میں لکھوں گا۔

بقیہ:- بلبل چہ گفت ....

ہوتا ہے کہ ڈاکٹر قمر رئیس کا کوئی ذاتی مفاد اٹکا ہوا ہے لہٰذا اس کی تکمیل کے لئے انھوں نے یہ مراسلہ گھگر صاحب کے حق میں شائع کرایا ہے ورنہ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کوئی مسلمان اردو دانش ور خواب میں بھی یہ برداشت کر سکے کہ ان کی خاندانی اور قومی میراث اردو کے

کسی ادارے کا سربراہ کسی ہندو کو مقرر کیا جائے۔

جناب کے کے گھگر کا انگریزی کے ادب اور شعر میں ان کے علمی اور تنقیدی مضامین کا جو مقام ہے اسے سمجھنے کے لئے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ اور آج کل ہمارے یہاں مسلمان اردو دانشوروں میں اسی کا فقدان ہے۔

مسلمان اردو دانشوروں کو گھبرانا نہیں چاہئے کیونکہ گھگر صاحب کا یہ تقرر محض عارضی ہے۔ اور ویسے بھی یہ جگہ ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔

راجستھان اردو اکاڈمی:-

راجستھان اردو اکاڈمی کا جنم جنتا حکومت کے عہد میں ہوا اور شیخاوت جی جنتا وزیر اعلیٰ نے اسے محض کاغذی اعلانات تک ہی محدود رکھا۔ اس کے بعد کانگریس آئی حکومت نے اسے کچھ زندگی دی۔ مگر راجستھان کی یہ بدقسمتی ہے کہ یہ انگریزوں اور راجواڑوں کی دوہری غلامی میں رہا۔ لہٰذا اس دوہری غلامی کے اثرات ابھی تک وہاں کے باشندوں کے دل و دماغ پر مسلط ہیں۔ اور بڑا سے بڑا راجستھانی بھی از خود کوئی بہتر فیصلہ کرنے کے نااہل ہے۔ ہاں جوڑ توڑ کرنے، ناجائز روپیہ کمانے اور سیاسی اتھل پتھل کرنے میں راجستھانی نیتا بھی کسی دوسرے سے کم نہیں ہیں۔

راجستھان اردو اکاڈمی کے ممبران اور عہدہ داران میں کافی معقول نام نظر آتے ہیں۔ مگر اکاڈمی نے کوئی معقول کام بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کیا ہو۔ ایسا ابھی تک محسوس نہیں ہو سکا۔ شانِ ہند کا تعلق راجستھان کے اردو حلقوں سے اس وقت سے ہے جب کہ راجستھان اردو اکاڈمی کے ممبران اور عہدہ داران میں سے ایک آدھ ہی ایسا تھا جسے اردو دنیا میں کوئی جانتا تھا۔ لہٰذا ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ راجستھان میں اردو کی ضروریات کے بارے میں جو سروے لگ بھگ شانِ ہند نے کیا ہے۔ یہ اکاڈمی اس سے کما حقہٗ طور پر ناواقف ہے۔ اور محض اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے جائز ناجائز طور پر وقت گزاری کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہم محض ایک ہی ادبی شخصیت کے بارے میں راجستھانی اردو اکاڈمی کے ناخداؤں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے جناب عنداں صاحب ٹونکی کے لئے کیا کیا؟ شانِ ہند میں آئندہ راجستھان کی اردو اکاڈمی سے متعلق کچھ واقعات شائع کئے جا رہے ہیں۔

مضمون

اوجین کے چند قدیم شعراء

محمد خالد عابدی
آل انڈیا [illegible] اندور

محمد قاسم اوجینی۔ ۱۸۸۵ء میں اوجین میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپ کے بارے میں سلطان احمد صدیقی رقمطراز ہیں کہ اسکول میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ عہد جوانی میں شاعری کا شوق ہوا۔ سید کرامت علی بشر سے اصلاح لی۔ آپ کا کلام "آفتاب مالوہ" اور "تصویر نور" گلدستوں میں شائع ہوتا تھا۔ آپ نے نعتیں ہی لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں۔ میلاد نامہ بھی نظم کیا ہے۔ پچاسی سال کی عمر میں ۱۹۶۵ء میں انتقال ہوا۔

نمونہ کلام:۔

جس کے سینے پہ محمدؐ کی شفاعت ہوگی
اس کے قدموں کے تلے حشر میں جنت ہوگی

ہند سے سوئے عرب جب مری رحلت ہوگی
اور ہی کچھ غم فرقت کی حلاوت ہوگی

غیر ممکن ہے چھپائے کوئی خون شبیر
اس شہادت پہ زمانے کی شہادت ہوگی

چاند کے جس نے اشارے سے کئے دو ٹکڑے
واعظو یہ کسی انسان میں طاقت ہوگی

دے گا اللہ انہیں حسب مراتب رتبے
جتنی جس جس کو محمدؐ سے محبت ہوگی

جن کو اُلفت ہے شہ جن و بشر سے قاسم
اُن پہ اللہ کی محشر میں عنایت ہوگی

نصیر علی نشتر اوجینی۔ آپ کے تعارف میں سلطان احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ۱۸۸۰ء میں اوجین میں پیدا ہوئے۔ عدالت میں عرائض نویس تھے۔ شاعری کا شوق جوانی میں ہوا۔ اوجین میں قبلہ بشر صاحب کی کوششوں سے شعر و شاعری کا بہت فروغ ہوا تھا۔ آپ بھی حضرت بشر کے شاگرد ہوئے۔ اپنا تخلص نشتر رکھا۔ کلام "آفتاب مالوہ" اور دیگر گلدستوں میں شائع ہوا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں اسی سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ نعتیہ کلام اور غزلوں کا مجموعہ ترتیب دیا تھا۔ لیکن صاحبزادے کی بے پروائی سے ضائع ہوگیا۔ آپ کی شاعری میں شوخی اور قدامت پسندانہ رنگ غالب ہے۔ نمونۂ کلام

عشق ہے جن کو تری زلف گرہ گیر کے ساتھ
کھیلتے ہیں وہ سدا قید میں زنجیر کے ساتھ

حلق پہ پھیر نہ جلاد چھری رُک رُک کر
ذبح کرتا ہے عبث کیوں مجھے تاخیر کے ساتھ

خاکساروں کے بڑے رتبے ہیں پیش داور
منعمو دیکھو غریبوں کو نہ تحقیر کے ساتھ

ہاتھ کیوں دھو کے جنوں ہوگئے پیچھے میرے
کیا پھرائے گا مجھے دشت میں تحقیر کے ساتھ

ہمیشہ رنج و غم دیکھے اُٹھائیں سختیاں برسوں
ذرا سی بات پر سہنے پڑے جور بتاں برسوں

اڑائی اس قدر خاک بیاباں ہم نے وحشت میں
زمیں پھرتی رہی ہے سر پہ مثل آسماں برسوں

شرف ہم لے گئے مجنوں پہ بھی صحرا نوردی میں
اُڑائیں دامن صحرا کی ہم نے دھجیاں برسوں

ہمارہ سخت جانی کا اثر ہو کیوں نہ قاتل پہ
سفر کرنے چلا ہے زیر خنجر امتحاں برسوں

غضب ہے آج اس دل پہ میاں ہوگیا قبضہ
ستم ڈھاتی رہی ہیں جس پہ آنکھ کی شوخیاں برسوں

بتوں کی بندگی میں نشتر نے فیض کیا پایا
عبث پوجا کئے تم ان کا سنگ آستاں برسوں

ہیرالال وکیلؔ :- منشی ہیرالال بھٹناگر کا جنم ۱۸۹۵ء میں ملھیہ شہر دبھولپا کے کایستھ خاندان میں ہوا۔ ابتدائی فارسی اور عربی کی تعلیم آپ نے مکتب میں حاصل کی۔ بعدہٗ ہندی، سنسکرت اور انگریزی کا بھی مطالعہ کیا۔ گوالیار سے قوانینِ ریاست گوالیار کا امتحان پاس کر کے وکالت کی سند حاصل کی۔ آپ کچھ عرصہ پولیس کاظم پراسی کیوٹرا اور میونسپل بورڈ کے وکیل بھی رہے۔ قیامِ اوجین کے زمانے میں آپ کو شعر و سخن میں دلچسپی پیدا ہوئی تو حضرت کرامت علی بکریؔ سے سلسلۂ تلمذ قائم کیا۔ وکالت کی مناسبت سے استاد نے آپ کا تخلص "وکیلؔ" تجویز کیا۔ آپ کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا چنانچہ آپ نے "گیتا" کا منظوم ترجمہ کیا۔ قرآن شریف کا بھی مطالعہ کیا کرتے تھے۔ شاعری میں نعت، منقبت، مراثی اور سلام بھی کہتے تھے۔ جامع مسجد الاخیہ کا میں عید میلاد النبی کی تقاریب میں آپ کی خصوصی شرکت ہوتی تھی۔ اس وقت کا ان کا ایک مقطع تھا ۔

وکیلؔ آئے محشر میں جب یا محمدؐ + نہ کہنا کہ یہ میری اُمت نہیں ہے

اوجین میں آل انڈیا طرحی مشاعرہ (ہر آئینہ ہے ایک نیا دل لئے ہوئے) منعقد ہوا تو منشی ہیرالال وکیلؔ نے جو گرہ لگائی تھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتی ہے ۔

اللہ رے تصرفِ عشقِ محمدی + ہر آئینہ ہے ایک نیا دل لئے ہوئے

منشی ہیرالال وکیلؔ اپنی زندگی میں ایک با اصول سچے کھرے اور مخلص انسان تھے۔ وہ ایسے مقدمے لیتے تھے جن میں حق و صداقت ہو۔ اور یہ ایک عدیم المثال کارنامہ ہے کہ آپ کو کسی بھی مقدمے میں شکست نہیں ہوئی۔ آپ کے مقدموں کے خلاف اپیلیں ہائی کورٹ میں بھی ناکامیاب رہیں اور آپ ہی کے حق میں فیصلے بحال رہے۔ ریاست گوالیار کے علاوہ ہولکر اسٹیٹ اندور میں بھی پیروی کے لئے آپ کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ آپ دیوانی مقدمات زیادہ لیتے تھے۔ فوجداری مقدموں کی بھی آپ پیروی کرتے تھے۔

آپ کی اولاد میں چار لڑکے لکشمی نارائن، رام نارائن، پرکیم نارائن اور گوپال نارائن ہیں اور تین لڑکیوں میں سے چھوٹی

کا انتقال ہو گیا۔ منشی ہیرالال وکیلؔ کو علمِ نجوم سے بھی واقفیت تھی۔ آپ زائچہ تیار کر کے صحیح واقعات منکشف فرمایا کرتے تھے۔ مومنؔ کی طرح آپ نے اپنی جنم پتری دیکھ کر بیس سال قبل اپنے انتقال کی پیش گوئی فرمائی تھی۔ جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ آپ کی دیانتداری کا یہ عالم تھا کہ انتقال کے دن صبح ایک موکل کا پانچ لاکھ روپے مطالبے کا عرضی دعویٰ لکھا جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ سینے میں ضعف ہوا لیکن تاہم آپ عدالت گئے اور مقدمہ پیش کیا۔ شام کے بعد حالت بگڑتی گئی۔ موکل نے دو ہزار روپے محنتانہ پیش کیا تھا۔ آپ نے بڑے صاحبزادے لکشمی نارائن کو حکم دیا کہ وہ محنتانہ واپس کر دو چنانچہ محنتانہ واپس کر دیا گیا۔ اسی رات ۱۱ اگست ۱۹۳۴ء کو نو بجے حرکتِ قلب بند ہونے سے روح پرواز کر گئی ۔

منشی ہیرالال وکیلؔ ایک سچے اور پرخلوص انسان تھے۔ وہ تمام مذاہب کے قدردان تھے اور ہندو مسلم تہذیب کا ایک نمونہ تھے۔ آپ کا کلام تصوف، حقانیت، عشقِ حقیقی اور اسلامی تلمیحات سے پُر ہے۔ نیز زبان کی سلاست، فصاحت اور روانی کا آئینہ دار ہے۔ منشی ہیرالال وکیلؔ کے انتقال کے بعد ان کے ایک داماد آپ کا کلام بیاض بغرضِ ترتیب و اشاعت مراد آباد لے گئے تھے افسوس کہ وہ دیمک خوردہ ہو کر تباہ ہو گیا۔

منشی ہیرالال وکیلؔ کا کلام "آفتاب" جادہ" (اوجین) "خورشید" "امیر" کے علاوہ ملک کے دیگر رسائل اور گلدستوں کی زینت بنا کرتا تھا۔ آپ نے گیتا کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا اگر وہ زیورِ اشاعت پذیر ہوتا تو غالباً کے جزو اور بیان کی شاہکار رہا ہوتا۔ بقول سلطان احمد صدیقی کہ اب ان کے صاحبزادوں میں کسی کو منشی ہیرالال وکیلؔ کے کلام کی اشاعت کا خیال ہوا ہے وہ دیوناگری رسم الخط میں چھاپنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ خیال ان کے صاحبزادوں کو مبارک ہو۔ وہ ناگری رسم الخط میں چھاپیں لیکن اردو رسم الخط میں بھی اس کی اشاعت ہونی چاہئے۔ اس عمل سے منشی ہیرالال وکیلؔ کی آتما خوش ہو گی کیونکہ وہ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو استعمال کرتے تھے۔

نمونۂ کلام :- شبیر پہ قربان دل و جان کریں گے

خوشنودیِ احمد کا یہ سامان کریں گے
خیریت ہے خم شہ ملیہ کہیں اپنا سفر ہو
جا اس کے سوا اور نہ ارمان کریں گے
جانتے تھے یہ جہاں میں نہ رہیں گے پھر ہم
کس قدر ہے نیلدا اس خوبی کا تقصیر ہم
کار دنیا کرتے ہیں بے شک عمر بھر سوچ کر
نیک کاموں میں نہیں کرتے کبھی ہیں غور ہم
پیش آئے گا وہی اک دن جو پیشانی میں ہے
واقفِ اپنی عقل کے کرتے ہیں تدبیر ہم
خاک ہیں کیوں جہاں میں مثلِ خاکِ بے نشان
آ عاجزی نے ہو گئے ہیں صاحبِ تقصیر ہم
لے گئی مرکز پہ آخر کھینچ دل کی کشش
بیٹھے تھے ڈالے اگر ہو گئے اکسیر ہم
آئے ہم بھی عدم سے گستی میں
صدمۂ ہجرِ حبیب سہا نہ گیا!
کس زباں سے کہیں گے محشر میں
نام ہم سے ترا لیا نہ گیا!
حق سے جو عہد کر کے آئے تھے
ہم سے ہے ہے وہ کیا نہ گیا
دیکھئے خدارا خلد بریں کا پتہ
یا شاہِ دیں یہ میری جاگیر رہ نہ جائے
اپنے سلامیوں میں لکھ لو کنیز کو بھی
حسرت یہ اس کے دل میں شبیر رہ نہ جائے

منشی پربھو دیال اشہر ادجینی

آپ ۱۸۹۸ء میں اجین کے کایستھ گوڑ خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی فارسی اور عربی کی تعلیم آپ نے میاں محمد یعقوب سے حاصل کی تھی۔ میاں محمد یعقوب عملیات سے اور روحانیت سے خصوصی شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے شاگرد ہونے کا اثر قبول کیا۔ میٹرک کی تعلیم ختم کرنے کے بعد آپ نے مہاراجہ ہائی اسکول میں اردو فارسی کا درس دینا شروع کر دیا تھا۔ عین شباب میں شاعری کا شوق ہوا تو امیر مینائی کے جانشین حضرت کیفی کاکوروی سے اصلاح لینے لگے۔ اس کا تذکرہ انہوں نے اس طرح کیا ہے۔

حضرت کیفی سے اشہر نے تلمذ کا سبب
اب سخن آمد ہر چیز ہمہ گاہ تھا

سلطان احمد نے کہ پر بھو دیال اشہر ادجینی کے بعد جن کے لئے تحریر فرمایا ہے کہ "ایک مجموعہ نعت کا ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا جس میں تمہید سے پہلے مسدس نعتیہ، تہنیت ولادت با سعادت شاہزادہ بھائی بالا ذکر بار مقدمہ دیا ہوا مطبع مصطفائی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ نظمی مجموعہ جو غالباً اسی طرح غیر مطبوعہ موجود ہے۔ اشہر صاحب ہندو مسلم اتحاد کا مثال تھے۔ ہندو مذہب کا پالن کرتے تھے اور قرآن شریف کی تلاوت بھی کرتے تھے۔ ان کا مذہب صوفیانہ تھا۔ استاد میاں محمد یعقوب آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ انہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ انتقال کے بعد پربھو دیال ہی مٹی دے گا۔ میاں صاحب کا مزار کا لیا دہ دو ملانہ، قصائیوں کی مسجد میں ہے جہاں اشہر صاحب کی زیرِ نگرانی عرس ہوا کرتا تھا۔

پربھو دیال اشہر نے علامہ اقبال کے ہم ترانہ سے متاثر ہو کر اسی طرز زمین میں آزادی کے متوالوں کو جوش دلایا تھا۔

ہمت ہے ایسی کس کو روکے گا کون ہم کو
کیا سامنا کرے گا یہ آسماں ہمارا
دکھلائیں گے جہاں کو پھر اپنے کو ولولے
لائے گا رنگ اک دن جو شِ جہاں ہمارا

مجاہد آزادی گوپال کرشن گوکھلے پر جگبست نے تو منظوم مرثیہ لکھا ہی تھا لیکن پربھو دیال اشہر نے بھی نذرانۂ عقیدت کے طور پر منظوم مرثیہ لکھا تھا۔ ان کے جذبات کچھ اس طرح تھے۔

کون سا دل ہے مرثیہ بے پتہ نہ ہوا
گوکھلے کون ترا ہند کو آسماں نہ ہوا

شیخ کو رنج ہوا سوگ برہمن کو ہوا
مرگ سے آپ کے دل کس کا پر ملال نہ ہوا

پربھو دیال اشہر نے گاندھی جی کی تعلیمات سے متاثر ہو کر بیشتر نظمیں لکھی تھیں "چرخا تحریک" کے متعلق انھوں نے لکھا تھا ۔

حقوں کے مانگنے میں کیا آزار سے ڈرنا
جو خود قانون توڑے ایسی کیا سرکار سے ڈرنا
اگر اک روز مرنا ہے تو پھر کیا دار سے ڈرنا
مہلک بزدلوں کو لاٹھیوں کی مار سے ڈرنا
یہ چرخہ ہی چکر ہند کو آزاد کر دے گا
نہیں یہ جانتا اشہر کسی ہتھیار سے ڈرنا

پربھو دیال اشہر کا دیوان قلمی ردیف وار موجود ہے۔ اس کی تاریخیں بحساب ابجد اس طرح ہیں ۔

۱۔ بیاض اشہر ستارہ کش = ۱۹۱۵ء
۲۔ اشعار نادر اشہر = ۱۳۳۳ھ
۳۔ چمن خیالات رنگین اشہر = ۱۹۷۱ بکرمی
۴۔ بوستان دل پذیر اشہر = ۱۹۷۱ بکرمی
۵۔ مصنف طراز اشہر = ۱۳۳۳ھ

پربھو دیال اشہر اوجینی نے اردو شاعری کی تقریباً سبھی مقبول اصناف غزل، نظم، حمد، نعت، سلام، مرثیہ، منقبت، مسدس، مخمس اور قصیدے پر طبع آزمائی کی تھی ۔ اشہر نے غزلیں زیادہ کہی ہیں اور ان کے کلام میں دبستان لکھنؤ اپنے استاد کیفی کاکوروی اور امیر مینائی کی پوری طرح تقلید کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔

تقلید لکھنؤ کی ہے دہلی کی پیروی + ہم وہ نہیں کہ نالہ ہو اپنی زبان پر

اشہر اوجینی کی ادبی خدمات میں یہ صلع جنرل لائبریری کا قیام ایک عظیم خدمت ہے ۔ پربھو دیال اشہر اوجینی کا [illegible] سال کی عمر میں انتقال ہوا ۔ اشہر اوجینی کا نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے ۔

کون دیتا ہے عالم پیری میں ساتھ
دستگیر خدا ہے سب عصا جاب
کوئی چراغ ہے نہ کوئی دم گر نہ پھول

سونا پڑا ہوا ہے کسی کا مزار آج
کر جاؤ اپنا نام زمانے میں مشتہر
کر دو کسی پہ جان کو اشہر نثار آج

اس طرح رسم نامہ و پیغام چاہیے
جائے ادھر سے خط اگر آئے ادھر سے خط

شمع سو رنگ بدلتی ہے سحر ہونے تک
داغ اک رنگ رہا خون جگر ہونے تک

روز و شب انتظار کرتے ہیں
موت کے دن شمار کرتے ہیں

ایک بھی وہ وفا نہیں کرتے
اور وعدے ہزار کرتے ہیں

جن کو گھبرانا ہو گھبرائیں وہ اشہر درد سے
میرے دل کی آرزو میری تمنا درد ہے

وہاں کیا جانے کیا قاصد پہ گزری
الٰہی دیر کیوں ہے واپسی میں

خیال وصل ہے اشہر شب وصل
غم فردا بھی شامل ہے خوشی میں

(جاری ہے)

غزل

دانش علی گڑھی

بے گناہی کو خطاؤں میں بدلتے جاؤ
وقت کے ساتھ یہ چال بھی چلتے جاؤ

ساتھ حالات کے چلنا تو کوئی بات نہیں
بات تو جب ہے کہ حالات بدلتے جاؤ

راہ تاریک ہو کہ کانٹے ہوں کہ انگارے ہوں
تم کو منزل پہ پہنچنا ہے تو چلتے جاؤ

شان خودداری کی قائم رہے ہر قدم تک
راہ میں شعلے ہی شعلے ہیں تو جلتے جاؤ

گردش وقت سے گھبرانا بھلا کیا دانش
لطف تو جب ہے کہ گر گر کے سنبھلتے جاؤ

گوشۂ عقیل صدیقی

انڈو پاک مشاعرہ انبالہ

کریمی الاحسانی

آیئے آپ کو انبالہ چھاؤنی (ہریانہ) کے پرکشش دلیپ سی میموریل ہال کے وسیع و عریض میدان میں لئے چلتا ہوں جو ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی واقع ہے چونکہ میں خود صحیح وقت پر نہیں پہنچا اس لئے مجھے پنڈال میں داخل ہونے کی جلدی ہے اور یہاں گیٹ پر اعلیٰ حکام اور پولیس کی ایک ٹیم کھڑی ہے جو دعوت نامے دیکھ کر اندر جانے کی اجازت دیتے ہیں اور میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے خدا بھلا کرے ساحت اندوری کا کہ انھوں نے مجھے دور سے ہی دیکھ کر اندر بلا لیا ہے ان سے علیک سلیک ہو ہی رہی تھی کہ قاری محمد اسحٰق حافظ صاحب سہارنپوری دوڑتے ہوئے آئے اور سلام و دعا کے بعد شکایت کرنے لگے کہ دو پہر سے انتظار کر رہا ہوں آؤ اسٹیج پر چلو اور وہ مجھے شعراء کے پاس بٹھا کر پھر انتظام میں مصروف ہو گئے ہیں۔

۱۰ بج چکے ہیں اس انڈو پاک مشاعرہ کی صدارت کے لئے جناب کے ایل پوسوال صاحب ہوم منسٹر ہریانہ سرکار کو دعوت دی جا رہی ہے۔ پوسوال صاحب کا تالیوں سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے پھر مشاعرہ کے افتتاح کے لئے ایک شمع روشن کی جا رہی ہے ادھر خوب آتش اور بارود سیٹ کی قطاریں ایک سماں باندھ رہے ہیں سامعین اور حاضرین کا ایک ہجوم غفیر ہے گویا ؏

آج رہا ہے در و دیوار سے انساں غالب

کا منظر ہے غالباً یہ جگہ ناکافی رہے گی آہ بڑھتے ایسا منظر آ رہا ہے لیجئے اب پاکستان کے سفیر جناب عبدالستار صاحب سے مؤدبانہ گزارش کی جا رہی ہے کہ وہ افتتاحی تقریر فرمائیں سفیر صاحب ایک مختصر سی تقریر پڑھ کر سنا رہے ہیں جسے عوام نے بہت پسند کیا۔ پھر آپ کو اور پوسوال صاحب کو پھولوں کے ہار پہنائے جا رہے ہیں جس پر تالیاں گونج اٹھی ہیں اور پوسوال صاحب فرما رہے ہیں کہ میں ہریانہ سرکار کی طرف سے عبدالستار صاحب اور شعراء کرام کو خوش آمدید کہتا ہوں یہ ان کا بڑا پن ہے کہ وہ یہاں تشریف لائے ہیں آزادی کی لڑائی میں اردو نے حصہ لیا تھا ان دنوں انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کیا جاتا تھا ان دنوں میں طالب علم تھا اور اس زمانہ میں ہم اپنے ماں باپ تک کو پسند نہیں کرتے تھے۔ تالیاں — پھر پوسوال صاحب یہ فرما کر کہ اب ہم شعراء کرام کا کلام سنیں گے اپنی جگہ آ گئے ہیں اور دیر تک تالیاں بجتی رہیں انور کوثر سہارنپوری فرما رہے ہیں کہ نقیب الشعرا کے فرائض ملک زادہ منظور احمد سا کر انجام دیں گے اور منظور صاحب فرما رہے ہیں:

جناب صدر، عزت مآب سفیر پاکستان اور شعرائے کرام

سامعین نے جس انداز میں تالیاں بجائی ہیں میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں آپ کے صبر و تحمل کا امتحان اور عزت و آبرو کو خطرہ میں بھی ڈالنا نہیں چاہتا پھر بھی عرض کروں گا کہ میں مبارکباد دیتا ہوں ملہوترہ صاحب کو ایسے مشاعرہ کو۔ جغرافیائی حد بندیاں اپنی جگہ ہیں میں تو ذرا بھی حد بندیاں نہیں دیکھ رہا ہوں اردو جادو ہے جو اپنے شہر لکھنؤ سے شروع ہو کر سارا کشمیر سے کنیا کماری تک چل رہا ہے۔ اگر نہیں تو آپ کسی اور سے بات کر کے دیکھئے ——— لیکن شعراء نے سب کو قریب لانے کی جو کوشش کی ہے وہ اپنی جگہ خوب ہے بزم اور شعراء کی طرف سے استقبال کرتا ہوں اور ہار بھی پیش کرتا ہوں۔ پاکستانی پارٹی کے لئے شیروانی ز

اُردو کو استعمال کیا اور جیسے کہ شیر و لق کو شادیوں کے
موقع پر استعمال کرتے ہیں نیر رکھ دی جاتی ہے یہی حال
اُردو کا بھی ہوتا ہے۔ میں ابھی دھنباد سے آیا ہوں آپ کا
وقت لینا نہیں چاہتا لہٰذا اب آپ حبیب عاصم دہلوی
سے ان کا کلام سنیئے۔ عاصم صاحب فرما رہے ہیں ؎

تم مجھ سے دور ہو گئے اس کا تو غم نہیں
غم یہ نہیں کہ ترکِ ملاقات ہو گئی
بس اور کچھ نہیں مجھے اس کا ملال ہے
دُنیا جو چاہتی تھی وہی بات ہو گئی

[illegible] ابھی کچھ رات باقی ہے۔ شنکر شارہ
کا لاجواب اور شاندار آغاز کر کے جا رہے ہیں۔ اور منظور
صاحب زحمتِ سخن دے رہے ہیں سلیم لکھنوی کو سلیم
صاحب کا نام سن کر یار لوگ تالیوں پر اُتر آئے ہیں۔ سلیم صاحب
اس مشاعرہ میں برابر شرکت کرتے ... ہیں یہاں زیادہ مقبول
ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

ہستی کے سفر میں جو گرہِ غم کب عیش گوارا کرتے ہیں
طوفاں پہ نظر رکھنے والے ساحل سے کنارہ کرتے ہیں
پُر کیف گھٹائیں اٹھتی ہیں جب مست ہوائیں چلتی ہیں
مَے جام بکف ہو جاتا ہوں کچھ یوں اشارہ کرتے ہیں
فطرت کے جمالِ رنگیں کی سچ یہ ہے کہ ہم میں تاب نہیں
آنکھیں تو نگاہیں اٹھتی ہیں کرنے کو نظارہ کرتے ہیں

سلیم صاحب فرما رہے ہیں میری عزت و آبرو خطرے میں نہ
پڑ جائے مجھ سے پڑھا نہیں جا رہا ہے ——— سلیم صاحب ایک
ایک عرصے سے علیل ہیں ——— اس پر عاصم صاحب فرما رہے
ہیں اس عمر میں کیا خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ
ذکر ہے کہ سامنے بیٹھی ہند کی خواتین بھی بڑی فراخدلی سے داد
دے رہی ہیں۔ اِدھر اُدھر پھر گیٹ پر ایک ہنگامہ سر اُٹھا رہا ہے
جگہ کم ہے اندر آنے والوں کا ایک ہجوم ہے لیجئے پنڈال
کا پیچھے کا حصہ کھلوایا جا رہا ہے اور اس طرح سامعین کے
بیٹھنے کا مسئلہ حل کیا جا رہا ہے کچھ حضرات اسٹیج کے سامنے
خالی فرش پر بٹھلا دیے گئے ہیں اتنے میں کیا عالم [illegible]

عالم ہے کہ اس کی کشش سب کو کھینچ رہی ہے دیکھا تو عظیم
اختر ایک آزاد نظم سنا کر جا رہے ہیں۔ اب [illegible]
پیر تمام گنبد کی تغیر یا این خانہ تمام آفتاب است گفتہ
دلیل [illegible] ہماری جیت پر [illegible] انسانے محفل کو
گرماتے چلے ہیں ؎

دل کا سکون روح کا نغمہ بنا تھا وہ
خوشبو، مٹھاس، ذائقہ کیا کیا بنا تھا وہ

داد اس مطلع کا حق ہے لہٰذا داد وصول کرتے ہوئے ارشاد ہوا
ہے ؎

پھر سے تمام شہر پناہوں کے ساتھ ہیں
بچے [illegible] اک دن ہیں سپاہ کے ساتھ ہیں

پھر داد کا عالم نہ پوچھئے کئی بار شعر پڑھ کر فرما رہے ہیں ؎

نیکی نہیں قبول مگر بھولتی نہیں
وہ لذتیں جو اپنے گناہوں کے ساتھ ہیں
آباد جن سے تھی کبھی یاروں کی انجمن
وہ سلسلے ثواب بھی گناہوں کے ساتھ ہیں
واقف ہیں اپنے قتل کے ہر فیصلے سے ہم
قاتل ہمارے خود بھی گواہوں کے ساتھ ہیں

اب داد دینے والے تالیوں پر اُتر آئے ہیں اور یہ سوال [illegible]
شکریہ ادا فرما رہے ہیں۔ جمہوریت میں سب کچھ سننا ہوتا ہے
ووٹ [illegible] واہ واہ بھی کہنا پڑتا ہے اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا
ہے اور افتخار صاحب محفل کو گرما کر جا رہے ہیں ادھر لکھنؤ
کے منفرد غزل گو اور مترنم شاعر ولی آسی مائیک پر آ کر
عنایت کر رہے ہیں ؎

اس انقلاب سے یہ تجربہ کیا ہم نے
خدا نہیں کبھی توفیقِ انقلاب نہ دے

لیجئے داد سے داد وصول کر رہے ہیں۔ دیر تک اسی شعر کو دہرانا
پڑا پھر ارشاد ہوا ہے ؎

بس ایک نگاہ ہمیں دیکھ لے محبت سے
ہمیں شراب کی خواہش نہیں شراب نہ دے
مری دعا ہے کہ تو خوش رہے پھلے پھولے
مجھے حساب نہیں چاہئے حساب نہ دے

ترے میکدے نے سب کو تباہ کیا ہے مجھے
بس اس کے بعد مجھے اب کوئی جوابؔ نہ دے

داد و تحسین وصول کئے واکی صاحب جا رہے ہیں اور اپنا اس
رنگ کو دوآتشہ کرنے کے لئے نور انصاری آ کر غزل الاپ رہے
ہیں ؎

دلوں میں اگر بدگمانی رہے گی
پریشاں ہر اک زندگانی رہے گی

ابھی وقت ہے ہم کوئی کام کر لیں
کہاں مدتوں تک جوانی رہے گی

یہ دنیا تو مٹ جائے گی اک نہ اک دن
ہماری تمہاری کہانی رہے گی

داد تو نور صاحب خواہ مخواہ بھی لے ہی لیتے ہیں فرما رہے ہیں۔
یہ شعر ڈاکٹر صاحب (منظور صاحب) کی نذر ہے۔ میرے کاندھے
پر بندوق رکھی گئی ہے لیکن نشانہ اور ہی ہے ڈاکٹر صاحب
مسکرا کر فرما رہے ہیں۔ آپ کے کاندھے مضبوط ہیں یوسوال
صاحب بھی مسکرا کر فرما رہے ہیں اس پر یار لوگ مسکرا دیئے
اور نور صاحب حسبِ عادت الاپ رہے ہیں ؎

سرِ شام اس نے بکھیری ہیں زلفیں
سحر تک فضا زعفرانی رہے گی

نور صاحب محفل کو ترنم سے گرما کر خراماں خراماں جا رہے ہیں
اور اب رنگِ محفل بدلنے کے لئے ہلال رامپوری آ کر رواں دواں
سنا رہے ہیں ؎

یہ میخانہ ہے اس میں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں
یہاں نظریں بچا کر یار قصہ مختصر کر لو
نہیں پینا تمہیں پینا تکلف ہے اگر پھر بھی
ہم اپنا منہ ادھر کر لیں تم اپنا منہ ادھر کر لو

ایک شور سا شور اور ہلڑ بازی کا دور دورہ ہے قدرے
توقف کے بعد ارشاد ہوا ہے۔ ؎

دروغہ جی سپاہی سے یہ بولے دیکھتے کیا ہو
پکڑ لو اک شرابی راہ چلتے کو ستاتا ہے
سپاہی نے کہا سرکار یہ دونوں شرابی ہیں

وہ میخانے سے آتا ہے یہ میخانے کو جاتا ہے

اب ہلڑ بونگ اور قلقل مینائے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے پھر ایک
طویل نظم سنا کر محفل کو قہقہہ زار بنا کر پلٹ رہے
ادھر ڈاکٹر منظور صاحب عنایت کر رہے ہیں ؎

خواب کا رشتہ حقیقت سے نہ جوڑا جائے
آئینہ ہے اسے پتھر سے نہ توڑا جائے
اب بھی بھر سکتے ہیں میخانے کے سب جام و سبو
میرا بھیگا ہوا دامن جو نچوڑا جائے
پھر وہ توبہ کہ وہ ساغر کہ وہ پیمانِ وفا
کچھ نہ کچھ آج تو میخانہ میں توڑا جائے

داد کے خوشگوار شور میں آ کر پھر زحمت سخن دے رہے
ہیں پاکستان کے منفرد[1] غزل گو شاعر اقبال ساجد کو ساجد
صاحب کا نام سنتے ہی تالیاں بھی جاگ اٹھی ہیں اور آپ
سنجیدگی سے سنا رہے ہیں ؎

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ پہلی بار پنڈال میں بھونچال سا آگیا تھا
آپ اسی متانت سے گرج رہے ہیں ؎

دکھاوے کے لئے خوشحالیاں لکھتے ہیں کاغذ پر
ہم اس دھرتی پہ ورنہ رزق کے چکر میں رہتے ہیں
اٹھے تھے جو اٹھائی تھیں وہ دیواریں نہیں اپنے
یہی محسوس ہوتا ہے پرائے گھر میں رہتے ہیں

اس شعر کے پس منظر کو اس سرزمین کے مہاجر خوب اچھی طرح
سمجھتے ہیں لہٰذا اب داد دینے والے تالیوں پر اتر آئے ہیں
جو کرب ادھر ہے وہ ادھر بھی ہے اور دونوں ہی جگہ
حالات اسی طرح کے ہیں ہاں تو فرما رہے ہیں ؎

وہ خوشبودار چہرے جو نگاہِ دل کا مرکز تھے
خدا جانے بچھڑ کے ہم سے کس محور میں رہتے ہیں

ساجد صاحب، خوب، خوب، داد و تحسین پا کر مائک سے
الگ ہو رہے ہیں ہر چند کہ آپ تحت میں پڑھتے ہیں لیکن آپ
اس تحت پر ہزاروں ترنم قربان کئے جا سکتے ہیں اب

[1] یہ بھی کرمی صاحب کی ذاتی رائے ہی ہو سکتی ہے۔ غالباً کرمی صاحب "منفرد" کا ثبوت ہموار ہے۔ (ناشاد)

منظور صاحب کو داد دیجئے کہ انھوں نے اس وقت کس ایسے
ایسے شاعر کو قربانی کا بکرا بننے سے بچا لیا اور ایک ایسے
شاعر کا انتخاب کر لیا جو اس وقت کا تقاضا تھے آیئے پیرزادہ
قاسم صاحب کو نکڑ سے بھی سن لیجئے گا۔ ؎

خانہ بدوش لوگ ہیں کیا گھر بنائیں گے
سایہ جہاں ملے گا وہیں بیٹھ جائیں گے

داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور آپ اسی پُر شکوہ
انداز سے عطا کر رہے ہیں ؎

یہ کون جانتا ہے کہ دل کیوں اُداس ہے
اس عمر کا حساب تو میرے ہی پاس ہے

پھر داد کا عالم نہ پوچھئے ارشاد ہوا ہے ؎

اک آدمی ہے جس کے لئے جی رہا ہوں میں
وہ شخص یہ نہیں جو مرے آس پاس ہے
اس آئینہ میں عکس بہت صاف ہے مرا
جس دن سے میں اُداس ہوں یہ بھی اُداس ہے

پھر پنڈال شکن دھماکہ ہوا ہے اور آپ کامران اپنی جگہ آ رہے
ہیں اور اب آ رہی ہیں شہناز صبا کانپوری ۔ غزل سرا ہیں ؎

سوچا تھا لوٹ آئیں گے بازار دیکھ کر
بُت بن گئے ہیں پستیٔ کردار دیکھ کر

داد اس مطلع کا حق ہے لہٰذا داد ملتی جا رہی ہے ترنگ ترنم
کی ۔ فرما رہی ہیں ؎

پہلے تو خوش تھے وہ رُخ بیمار دیکھ کر
اب رو رہے ہیں موت کے آثار دیکھ کر
بازار تک گئی تھی میں جنسِ سخن لئے
واپس ہوئی ہوں تحفۂ خریدار دیکھ کر

صبا صاحبہ غالباً ابھی نو وارد ہیں آپ داد پا کر رخصت
ہو رہی ہیں راحت اندوری کا نام سُن کر تالیاں جاگ اٹھی
ہیں اُدھر سفیرِ پاکستان بشہ نشیں سے نیچے شعراء
کے جھرمٹ میں آ گئے ہیں یہ علاحدگی ان کو بھی کھلتی ہوگی
دیکھئے راحت صاحب یوں گرج رہے ہیں ؎

زباں تو کھول نظر تو ملا جواب تو دے
میں کتنی بار لٹا ہوں مجھے حساب تو دے
ترا سوال ہے ساقی کہ زندگی کیا ہے
جواب دیتا ہوں پہلے مجھے شراب تو دے
مجھے گلاس کے اندر ہی قید رکھو ورنہ
میں سارے شہر کا پانی شراب کر دوں گا

اب داد نے ہنگامہ کو جنم دیا ہے۔ اور آپ برابر اسی شعر کو دہرا کر
پھر گرج اور برس رہے ہیں ؎

مہاجنوں سے کہو تھوڑا انتظار کریں
شراب خانے سے آ کر حساب کر دوں گا

ایک اور ایک اور کے ہنگامہ کو نظر انداز کر کے مائیک سے کھسک
رہے ہیں اور منظور صاحب سفیرِ پاکستان کی طرف سے اعلان
کر رہے ہیں کہ شاعرات کی اچھی غزل پر ان کی جانب سے انعام
پیش کیا جائے گا۔ پھر اس پر منظور صاحب ہی مسکرا کر فرما
رہے ہیں نہ جانے کیوں حضور والا نے شعرائے کرام کو نظر انداز
کر دیا ۔ صنفِ نازک ہی پر کیوں نظر گئی ہے شعرائے کرام کے لئے
بھی کچھ انعام عطا کیا جائے اس پر سفیرِ پاکستان نے ان کو
اس اعلان کی بھی اجازت دیدی ہے اس اعلان پر تالیاں
گونج اٹھی ہیں دیکھا تو اسی ہنسی مذاق میں مظفر وارثی اپنا
برف کی ناؤ (غالباً مجموعہ کلام) لئے مائیک پہ آ کر فرمائشوں کو نظر
انداز کر کے قدرے سکوت کے بعد لحنِ داؤدی میں غزل سرا ہیں

؎ مہک ملی ہے حرارت شکار کرنے سے
گلاب بن گیا شعلہ بھی پیار کرنے سے
شبِ فراق کو آبِ حیات پلوا دو
طلب کی عمر بڑھے انتظار کرنے سے
خود اپنے خون سے ڈھانپی برہنگی اپنی
قبا ملی ہے بدن تار تار کرنے سے
مرے دُکھوں نے مجھے قہقہوں میں دفنایا
مرا ہوں زندہ دلی اختیار کرنے سے
جو ملتفت کرے وہ ایک بوند ہے کافی
بجھے نہ پیاس سمندر کو پار کرنے سے

مظفر صاحب ہر شعر پر داد و تحسین لوٹتے محفل کو چونکا کر اپنی جگہ

رہے ہیں اور اس عالم تشنگی میں عزیزہ ارباب وفا لکھنوی کر بیٹھ کر ہی سنجیدگی سے سُنا رہی ہیں ؎

نکلنا خود سے ممکن ہے نہ ممکن واپسی میری
مجھے گھیرے ہوئے ہے ہر طرف سے بے رُخی میری
جُدا کرکے گیا تھا جو روایت میرے چہرے کی
اسی کو ڈھونڈتی پھرتی ہے اب بے چہرگی میری
میں اپنے جسم کے مردہ عجائب گھر کی زینت ہوں
مجھے دیمک کی صورت چاٹتی ہے زندگی میری

وفا صاحبہ کو ان کی شایانِ شان داد و تحسین نہ دی گئی کیونکہ مظفر صاحبہ کے بعد انھوں نے تحت سے پڑھا لہٰذا وہ بات نہ بنی آئیے پھر ایک غزل کوثر سہارنپوری سے سُنیئے ؎

پتھروں کے دل میں لو دیتا رہا میرا لہو
برف زاروں میں ہوا شعلہ نما میرا لہو
جب کوئی مقتل پکارے یا کوئی دار و رسن
وقت کے ہر موڑ پر دے گا صدا میرا لہو
سُرخرو دیکھو مجھے تاریخ کی تحریر میں
کتنے چہروں پر شناسا مل گیا میرا لہو

کوثر صاحب داد وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور مشتاق احمد راکیش آ کر فرما رہے ہیں ؎

آئی بہار آ کے کسی کی گزر گئی
دامانِ آرزو مرا کانٹوں سے بھر گئی

میں دل سے کہہ رہا تھا غمِ دل کا ماجرا
سارے جہان میں [illegible] کی خبر گئی

جام و سبو سے میں تو یونہی کر رہا تھا کھیل
تہمت کش شراب مجھے سے اکر گئی

راکیش صاحب بھی مناسب داد پا کر چلتے بنے اور مشہور وطن دوست شاعر جناب نازش پرتاب گڑھی آ کر عطا کر رہے ہیں ؎

تاریخ کے صفحات پر جو لوگ بڑے ہیں
ان میں بہت ایسے ہیں جو لاشوں پہ کھڑے ہیں
کیا کیا نہ ہمیں گھر کی نگہداشت سے گلہ تھا
اب شہر میں نکلے ہیں تو حیران کھڑے ہیں

۔۔۔ درج جو چڑھے گا تو سمٹ جائیں گے یہ لوگ
سایہ کی طرح قد سے [illegible] بڑھے ہیں
کاندھوں پہ چڑھے لوگوں کو اس بھیڑ میں نازش
خوش ہیں کہ ہم آپ اپنے ہی پیروں پہ کھڑے ہیں

قبلہ نازش صاحب ہر چند کہ مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں لیکن وہ جس سنجیدگی اور متانت سے سناتے رہے اسی طرح ان کے شایانِ شان داد و تحسین کے گلہائے محبت برستے رہے پھر ایک طویل نظم آخری بار سنا کر شاداں پلٹ رہے ہیں۔ اب جناب رفعت سروش صاحب عطا کر رہے ہیں ؎

اچھا یہ کرم ہم پہ تو صیاد کرے ہے
پر نوچ کے اب قید سے آزاد کرے ہے

اے بادِ صبا اُن سے یہ کہیو جا کر
پردیس میں اک شخص تمہیں یاد کرے ہے

فرزانہ اُجاڑے ہے بھرے شہروں کو لیکن
دیوانہ تو صحرا کو بھی آباد کرے ہے

سروش صاحب داد و تحسین وصول کئے مائک سے جُدا ہو رہے ہیں بعد ظفر وارثی پاکستانی غزل سرا ہیں ؎

اے شمع سحر تک تو مرے ساتھ جلی ہے
تنہا مجھے جلنے کو کہاں چھوڑ چلی ہے
اک عمر نوازا ہے تجھے گردشِ دوراں
پھر جاکے کہیں تو مرے سانچے میں ڈھلی ہے
جس راہ سے گزرا ہے ظفر ہے کے ترا غم
رُسوائی بھی سایہ کی طرح ساتھ چلی ہے

ظفر صاحب بھی داد پا کر اپنی جگہ واپس آ رہے ہیں اور نہایت پُر وقار انداز سے محمود سعیدی فرما رہے ہیں ؎

ایک خاموش کسک دل میں جگا دیتے ہیں
جانے موسم مجھے رُک رُک کے صدا دیتے ہیں
کھڑکیاں گھر کی نہ کھولو کہ ہوا برہم ہے
تند جھونکے کسی طوفان کا پتا دیتے ہیں
تم نہ تھے پاس تو یہ دشمن جاں تھے میرے
اب جو ملے مجھے جینے کی دُعا دیتے ہیں

مخمور صاحب داد تو لوٹتے ہی رہتے ہیں لہٰذا خوب خوب داد لوٹتے مائک سے کھسک رہے تھے اب ایک بزرگ شاعر محترم غلام ربانی تاباں کلام عطا فرما رہے ہیں سہ

رہگذر ہو یا مسافر نیند جس کو آئے ہے
گھر کی اس میلی سی چادر اوڑھ کر سو جائے ہے

وقت کے ہاتھوں ضمیرِ شہر بھی مارا گیا
رفتہ رفتہ موجِ خوں سر سے گزرتی جائے ہے

یوں تو اک حرفِ تسلی بھی بڑی شے ہے مگر
اپنا غم ہے وفا بے آبرو ہو جائے ہے

کس طرح دستِ ہنر میں جلنے لگتے ہیں رنگ
مدعیِ حال کو تاباں کون سمجھا جائے ہے

قبلہ تاباں صاحب محفل کو تابندگی بخش کر کامران جا رہے ہیں اور ادھر یک نظا مشاعرہ (؟) فہمیدہ ریاض نیلی ساری زیب تن کئے (اور عریانی کا یہ عالم کہ الاماں والحفیظ جس کے تمام نقوش اس باریک ساری سے جھلک رہے ہیں اور یہ بھی گلی اور ہی عالم میں نظر آرہی ہیں) مائک پر آکر دو نظمیں رواں دواں سنا کر جا رہی ہیں ایک نظم میں بھٹو کو شہید کے نام سے پکارا ہے (اگر شہادت اتنی سستی بات ہے تو چنگیز اور ہلاکو کو کیا کہا جائے گا ۔ ؟) اور دوسری نظم میں برقع کا مذاق اڑایا گیا ہے واعظ محترم اور شیخ صاحب کے حجرے کی خفیہ حرکتوں کو بے نقاب کیا ہے (اب یہ اللہ ہی جانے کہ یہ تجربہ کی بنا پر کہی گئی ہے یا کسی سنائی خبروں نے تحریک دلائی) اس موقع پر دیکھا تو عبدالستار صاحب کے چہرے پر کچھ ناگواری کے اثرات ابھر آئے ہیں

اب ملک کے مشہور بزرگ شاعر کیفی اعظمی جی سو مناتھ اور بہروپی سنا کر خوب خوب محفل کو گرما کر اپنی جگہ آ رہے ہیں ۔ میں نے صرف تشنہ نظر اکتفا کیا اور پہلا دور سوا دو بجے نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے دوسرا دور شروع کیا جا رہا ہے اب میں اسٹیج کو چھوڑ کر نیچے آگیا ہوں ۔ دیر تک دوسرا دور بھی جاری رہا ۔

اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں جہاں مسٹر راجندر لال طہورہ صاحب بیشتر وقت صرف کرتے ہیں وہاں ان کے رفقار کار کے ساتھ بخصوص دل جناب قاری محمد اسحاق حافظ سہارنپوری کوثر تسنیمی سہارنپوری ۔ جگدیش رائے بسمل مظفر انبالوی وغیرہ شب و روز جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں اس مشاعرہ کی کئی سال سے تعریف سنتا آ رہا تھا واقعی جیسی تعریف سنی تھی اس سے کہیں سوا ۔ کامیاب ۔ شستہ اور پُرسکون مشاعرہ پایا اس مشاعرہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر سال جو شعراء کرام کلام پیش کرتے ہیں اس کو سوونیر کی صورت میں مع تصاویر شائع کیا جاتا ہے ۔ اس مشاعرہ پر جملہ منتظمین اور طہورہ صاحب لائق صد تحسین اور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ہر سال سرزمین ہریانہ پر ایک اچھا مشاعرہ منعقد کرا کر عوام اور خصوصاً اہلِ ذوق حضرات کو سنوا دیتے ہیں ۔ فقط

اب بھی وہ منظرِ فردوس نظر میں گم ہے
بزمِ یاراں سے کریمی کو چلے دیر ہوئی

قومی یکجہتی

فرزندانِ وطن سے خطاب

ڈاکٹر شمیم قدوائی بارہ بنکوی

بھرے بہار میں یہ کیا ہوا خدا جانے — لگا گئے ہیں آگ نشیمن میں کچھ دیوانے
وہ کھیل کھیلے ہیں ہولی جلا کے اہلِ وطن — جہاں کے سارے ستمگر لگے ہیں شرمانے
یہ ظلم و جبر کا طوفان جب بھی اٹھتا ہے — تو اس کی زد سے نہیں بچتے اپنے بیگانے
لگا کے آگ کسی گھر میں یہ کبھی دیکھا — کہ ایک گھر نے جلائے ہیں کتنے کاشانے
لٹی ہیں کتنی دکانیں یتیم کتنے ہوئے — غریب کتنے مرے یہ تو بس خدا جانے
دلوں سے اپنے یہ نفرت اگر نہ ختم ہوئی — تو پھر یہ طے ہے کہ بڑھتے رہیں گے ویرانے
ہر ایک شہر علی گڑھ سا بنتا جائے گا — ہر ایک قریئے کے ویران ہوں گے کاشانے
یہ آگ بڑھ کے گلستاں کو پھونک ڈالے گی — بچا نہ اس سے سکیں گے نہ اپنے بیگانے
دلوں میں بیج جو نفرت کا بوتے پھرتے ہیں — یہ ہیں نقاب سیاست میں چند دیوانے
الہ آباد، علی گڑھ ہو یا مراد آباد — ہر ایک جگہ ہیں یہ ان کو کوئی تو پہچانے
یہ گندہ ذہن ہیں اہلِ وطن کے دشمن ہیں — سناتے پھرتے ہیں کچھ من گھڑت افسانے
یہ کام اپنا بناتے ہیں ہم کو لڑوا کر — انہیں تو چاہیئے دولت شراب، خمخانے
انھیں پبلک ہی سمجھے انھیں دیا جائے — ہمیں جو رکھنے ہیں محفوظ اپنے کاشانے
وہ مولوی ہوں کہ پنڈت ہوں یا سیاستداں — ہر ایک کو چاہیئے مقصد کو ان کے پہچانے
دھریں نہ کان کبھی ان کی لغو باتوں پر — نقاب ان کی اتارے کہ ہر کوئی جانے
ذرا تو سوچو کہ اپنا وطن وہ بھارت ہے — جہاں کبیر کے دوہے امیر کے گانے
جہاں یہ پریم کی بہتی ہیں گنگ اور جمن — جہاں کلیسا ہیں مسجد ہیں اور بتخانے
یہاں کے میل، محبت کا ہی نتیجہ تھا — سجائے شوق سے آزاد ہو کے کاشانے
شمیم گر نہ ہوئے بے نقاب یہ دشمن — ہمارے ملک میں ہر جا بنیں گے غمخانے

وہ اگلا سا میرا وطن اب نہیں ہے

قمر بانو

مروت یہاں تھی محبت یہاں تھی
سکوں تھا کرم تھا عنایت یہاں تھی
امیروں کے در پر سخاوت یہاں تھی
غریبوں میں ہر سو مسرت یہاں تھی
وہ اگلا سا میرا وطن اب نہیں ہے

ہر اک دل تھا مسکن رضائے خدا کا
بہت خوف تھا سب کو روزِ جزا کا
تھا ہر آدمی ایک پتلا وفا کا
کہیں بھی نہ چرچا تھا مکر و ریا کا
وہ اگلا سا میرا وطن اب نہیں ہے

یہیں کے تھے لکشمن بھرت اور سیتا
پڑھی تھی یہیں کرشن نے اپنی گیتا
ہمیشہ بدی کو بھلائی سے جیتا
بہت جلد افسوس ست جگ وہ بیتا
وہ اگلا سا میرا وطن اب نہیں ہے

مگر ہر طرف آج کلجگ ہے طاری
دغا جھوٹ رشوت تشدد ہے جاری
سروں پر غریبی کا ہے بوجھ بھاری
گرانی سے ہر سمت ہے آہ و زاری
وہ اگلا سا میرا وطن اب نہیں ہے

وطن کو خدایا تو بیدار کر دے
مری قوم غافل ہے ہشیار کر دے
پھر اک بار سے وطن کو تو گلزار کر دے
جو بے درد ہیں انکو غمخوار کر دے
وہ اگلا سا میرا وطن اب نہیں ہے

من کہ مکتوب الیہ

برادرِ محترم سرور تونسوی صاحب

تسلیم و نیاز! اُردو کے موقر رسالہ "شانِ ہند" میں دوسری کل ہند غیر مسلم مصنفین اُردو کانفرنس کی جو رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں میری تقریر کے سلسلے میں دو باتیں ایسی لکھی گئی ہیں جن سے غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔ چنانچہ ان سطور کے ذریعہ اس کی وضاحت پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس کانفرنس میں مقالہ نگار کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا اور جناب پرنس انجم قدر صدر شیعہ کانفرنس نے مندوبین کے اعزاز میں ایک ڈراما کا اہتمام کیا تھا۔ جو "حضرت محل" پر تھا۔ اس ڈرامے سے قبل ایک مختصر سا جلسہ بھی ہوا تھا جس کی صدارت یوپی کے گورنر محترم چندیشور پرشاد سنگھ صاحب نے فرمائی تھی اس جلسہ کی نظامت اور افتتاحی تقریر کے فرائض میرے سپرد کئے گئے تھے۔ چونکہ بیگم حضرت محل جنگِ آزادی کی عظیم شخصیت اور ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہیں۔ اس لئے پرنس انجم قدر صاحب نے مجھ سے اُردو زبان اور شاعری کے سیکولر کردار پر افتتاحی تقریر کے لئے خواہش کی تھی۔ چنانچہ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنے افتتاحی تقریر میں اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے نقوش کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور اُردو شاعری کے فکری سرمائے میں "تصورِ ذات" کی وضاحت کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اُردو میں ایک طرف ہندو تصورِ خدا، دیومالا اور سنسکرتی اور دوسری طرف اسلامی توحید، تاریخ و تہذیب کا گہرا اثر ہے۔ اس سلسلے میں میں نے ابنِ عربی کے نظریۂ وحدت الوجود اور شری شنکر اچاریہ کے نظریۂ ویدانت کی وضاحت کرتے ہوئے اُردو شاعری پر ان نظریوں کے اثرات کی نشاندہی کی تھی۔ نظریۂ وحدت الوجود کی تشریح کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اس کی بنیاد لا الہ الا اللہ پر ہے۔ جس کو صوفیا اپنی زبان میں لا مطلوب الا اللہ، لا مقصود الا اللہ اور لا موجود الا اللہ کہتے ہیں وحدت الوجود کا اصول ہے "ہمہ موجودات در وجودِ حق دانستن" جس کو مختصراً "ہمہ اوست" بھی کہہ سکتے ہیں۔ وحدت الوجودی صوفیا اور دانشوروں کے نزدیک وجود اور موجود ایک سے زیادہ نہیں۔ یعنی وجود اور موجود میں رشتۂ غیریت نہیں بلکہ رشتۂ عینیت ہے۔ وحدت الوجود کا نظریہ اسلامی تصورِ توحید کی فلسفیانہ شکل ہے۔ اس موضوع پر میرا ایک مضمون حال ہی میں روزنامہ قومی آواز کے سنڈے ایڈیشن مورخہ ۲۱ جون ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "اُردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے نقوش"۔ تفصیل کے لئے اس مضمون کو دیکھا جا سکتا ہے۔

میں ان سطور کے ذریعے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی تقریر میں کلمہ طیبہ کی تشریح نہیں کی تھی اس لئے اس کے غلط اور صحیح ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے نظریۂ وحدت الوجود اور نظریہ ویدانت کی تشریح کی تھی اور صحیح تشریح کی تھی ۔۔۔ دوسری بات یہ کہ میں نے ڈاکٹر عمار رضوی صاحب کو حکومتِ یوپی کا وزیر کہنے کی جگہ حکومتِ ہند کا وزیر کہہ دیا تھا ممکن ہے میری زبان سے ایسا نکل گیا ہو۔ ڈاکٹر عمار رضوی میرے محترم دوست ہیں۔ وہ بالغ نظر قومی رہنما ہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ یوپی کے ساتھ پورے ملک کو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہنچائیں ۔۔۔۔ مجھے اُمید ہے کہ ازراہِ کرم آپ میرے خط کو من وعن شائع فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ اس کی اشاعت سے ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔

ڈاکٹر عبد ان چشتی قائم مقام صدر شعبۂ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

●●● محترمی سرور تونسوی صاحب

آداب و نیاز!

ماہنامہ "شانِ ہند" (دہلی) میں قاضی + سید + قریشی + شیخ

منگلوری کی نظم بعنوان " رام " نظر سے گزری ۔ معاف کیجئے میں نے بغور ضرب تفریق کا سوال حل نہیں کیا ہے ۔ محض یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہندو کے اچھے اور سچے شاعر اپنے کلام کے ساتھ لسنہ سابقے اور لاحقے نہیں لکھتے ۔ یہ مرعوبیت کا انداز یا احساسِ کمتری کی دلیل ــــ خیر میں عرشی کی نظم " رام " کے سلسلے میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ۔

اس نظم کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس نظم کا تعلق شری رام جی کی ذاتِ والا صفات سے نہیں ہے ۔ اگر اس نظم کا تعلق ان کی ذاتِ گرامی سے ہوتا تو اس نظم میں ایسے تاریخی، تہذیبی اور دیو مالائی اشارات ہوتے جن کا تعلق موصوف کی ذاتِ گرامی سے ہوتا ۔ مثلاً راجہ دشرتھ، کوشلیا، کیکئی وغیرہ کا ذکر ہوتا ۔ کیکئی کا راجہ دشرتھ کے رتھ کو بچانے اور ان سے وعدہ لینے کی طرف اشارہ ہوتا ۔ چودہ برس کے بن باس، سیتا اور لکشمن کی رفاقتِ سفر، اگنی پریکشا، سیتا ہرن، راون سے جنگ، ہنومان جی کی وفاداری وغیرہ کا تذکرہ ہوتا ۔ لیکن اس نظم میں رام چندر جی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں ہے ۔ اگر یہ نہ ہوتا تو کم از کم ان اعلیٰ اخلاقی اقدار کا انعکاس ہوتا جو اس واقعے سے وابستہ ہیں اور جن کا جیتی جاگتی تہذیبی اور معاشرتی اظہار دیوالی اور دسہرے کے تہواروں کی شکل میں ہوتا ہے ۔

آج اس بات سے ہر شخص واقف ہے کہ جب کسی مذہب کے پیشوا یا بزرگ کا ذکر کیا جاتا ہے تو احترام سے کیا جاتا ہے ۔ حضور اکرم کا ارشادِ گرامی ہے کہ " ہر قوم کی محترم (پیشوا) شخصیتوں کا احترام کرو " ــــ عرشی اتنی سی بات سے بھی واقف نہیں ہے ۔ اس نے محض " رام " لکھ کر اپنی دریدہ دہنی کا ثبوت دیا ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ عرشی کا ذہن فرقہ پرستی سے آلودہ ہے ۔ عرشی کی ایک غزل " اسپاق " (پونا) کے شمارہ نمبر ا میں شائع ہوئی ہے اس کا ایک شعر ہے ــــ

" صنم کدوں میں چراغِ حرم جلائے تو کون ؟
ادائے غزنوی و رسمِ حیدری نہ رہی "

اس شعر میں (۱) یہ کہا گیا ہے کہ اس دور کے مسلمانوں کو ادائے غزنوی اپنانی چاہیے ۔ ادائے غزنوی ہے کیا ؟ محمود غزنوی کا سومناتھ کے مندر پر حملہ کر کے اسے تاراج کرنا ۔ کیا آج کی سیکولر ریاست میں ایسی اشتعال انگیز باتیں فرقہ پرستی نہیں ہیں ؟ (۲) اس شعر میں حفظِ مراتب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے ۔ حیدرِ کرار (کرم اللہ وجہہٗ) اور محمود غزنوی کو ایک سطح پر رکھ کر شاعر نے اپنی دریدہ دہنی اور کم ظرفی کا ثبوت دیا ہے ۔ کجا محمود غزنوی جیسا ظالم و جابر بادشاہ اور کجا حضرت علی حیدرِ کرار (کرم اللہ وجہہٗ) جیسا جلیل القدر صحابی ۔
(۳) اس شعر میں غضب یہ ہے کہ حضرت علی حیدرِ کرار کو محمود غزنوی سے ملا دیا ہے بلکہ نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو گویا حضرت علی (کرم اللہ وجہہٗ) پر بھی ادائے غزنوی " فرقہ واریت " کے دورِ حکومت و خلافت میں ہر مذہب کے ماننے والوں کو اس کے حقوق کی پوری آزادی حاصل تھی ۔

سرور صاحب میں آپ سے شکایت کرتا ہوں کہ آپ نے " شانِ ہند " جیسے رسالے میں ایسی فضول، لغو، بلکہ خرافات قسم کی نظم کو شائع کر کے ہندوستان کے کروڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے ۔ ہم آپ کی ایمانداری اور نیک نیتی پر بھروسہ کرتے ہیں ازراہِ کرم میرے خط کو " شانِ ہند " میں شائع فرما کر ممنون کریں ۔

مخلص

۲۳ جولائی ۱۹۸۱ء

وہاج الدین علوی
ریسرچ اسکالر کمرہ نمبر ۱۳ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

●●● مکرمی سرور صاحب قبلہ

سلام و تمنیات

مئی ۱۹۸۱ء کے " شانِ ہند " میں یہ خبر پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ابوالصباحا صاحب حضرت رونق یزدانی کا جانشین ابنا مالک حضرت دل شاہجہانپوری تسلیم کیا گیا ہے جبکہ حضرت نسیم شاہجہانپوری کو ۱۹۷۳ء میں ہندوستان کے شعراء کرام جانشین دل تسلیم کر چکے ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے رونق صاحب کو جانشینِ دل تسلیم کیا ہے وہ اس بات سے باخبر نہیں کہ نسیم صاحب کو پہلے ہی جانشینِ دل تسلیم کیا جا چکا ہے

(ملاحظہ ہو مجموعہ تسنیم مرتبہ نسیم شاہ جہاں پوری) لہٰذا اس کا صحیح فیصلہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب قبلہ رتن صاحب وہ مستند[1] آثار منظر عام پر لائیں جن میں ان کو جانشین دل تسلیم کیا گیا ہے۔ اس خبر نے ادبی حلقوں میں ہلچل ڈال دی ہے۔

مخلص — اختر شاہجہانپوری

●●●

مسٹر ور بھائی آداب

آپ کی کانفرنس سے متعلق "رپورتاژ" قسم کی تحریر پورے ایک ماہ کے بعد پڑھنے کو ملی۔ جی خوش ہو گیا کہ آپ نے کئی جگہ میرے اس موقف کی تائید کی ہے کہ حکومت اردو کو صرف ایک طبقے کی زبان قرار دیکر ایک سیاسی فیصلہ کر رہی ہے جس سے بہرحال اردو کو نقصان عظیم پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس جال میں اگر ایک بار مسلم طبقہ پھنس گیا تو پھر اردو کی تقسیم کی ذمہ داری انہی پر عائد ہوگی اور تاریخ انھیں کبھی معاف نہ کرے گی۔ ہم غیر مسلم اردو ادیب تاریخ میں دو مرتبہ اجتماعی طور پر اردو کا سیکولر اور غیر فرقہ وارانہ حیثیت کو قائم رکھنے کے مطالبے کو لیکر لکھنؤ میں جمع ہوئے۔ ہمارے موقف کو شک و شبہے سے بھی دیکھا گیا اور سرد مہری کا سلوک بھی روا رکھا گیا لیکن یہ صرف کچھ حلقوں کی طرف سے ہوا جو اردو کو صرف اپنی زبان سمجھتے ہیں ورنہ بیشتر مسلم بھائی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ ہماری لڑائی تین طرفی ہے۔ حکومت کی فرقہ وارانہ پالیسی، تنگ نظر مسلمان اور انتہائی طور پر مسلم دشمن ہندو ذہن۔ ظاہر ہے یہ لڑائی جیتنا آسان کام نہیں ہے جب کہ پورا ہندو پریس (اردو، ہندی اور انگریزی) ہمارے ساتھ نہیں ہے۔

ہماری دونوں کانفرنسوں میں شریک ہونے والے غیر مسلم اردو ادیبوں کی قربانیاں اور ایثار بے مثال ہیں۔ جیسے گجرال، مالک رام، ضیا فتح آبادی، جگناتھ آزاد، اختر، اپادھیہ

اگرچہ ان کے دل و دماغ اردو کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ لیکن انھوں نے میری درخواست قبول کر کے دونوں بار اپنے خرچ پر لکھنؤ آنا گوارا فرمایا اور سفر کی بے انتہا صعوبتیں برداشت کی ہیں ان کا یہ احسان کبھی بھول نہیں سکوں گا۔

آپ سے جن دوستوں نے ڈیلی گیٹ سیشن پاس ہونے والی قراردادوں پر بحث کی اجازت نہ دینے کی شکایت کی ہے۔ وہ برحق نہیں ہے۔ ہر قرارداد بہت سوچ سمجھ کر اس کمیٹی نے تیار کی تھی جسے کمیٹی نے نامزد کر دیا تھا۔ قراردادوں کو پیش کرنے والے اور ان کی تائید کرنے والے دونوں حضرات کو تقریریں کرنے کی اجازت تھی۔ اور ایسا کیا گیا۔ البتہ تائید مزید اور اختلاف کی گنجائش اس لئے نہیں رکھی گئی تھی کہ وقت کم تھا۔ اس سیشن کے تھوڑا بعد ڈراما شروع ہونے والا تھا۔ جس میں آپ خود بھی شریک ہوئے تھے۔ کشمیر سے متعلق جس قرارداد کی تجویز ہمیں بعد میں ملی اسے ہم نے ۲۰ اپریل کے کھلے اجلاس میں پیش کر کے منظور کرا لیا تھا۔

امید ہے میری ان معروضات سے آپ کی وہ ساری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ جن کا ذکر آپ نے اپنے رپورتاژ میں کیا ہے۔ پھر بھی اختلاف کا حق ہر ایک کو حاصل ہے جس کا میں خیر مقدم کرتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں اتنی بڑی کانفرنس کا بوجھ مجھ پر اور میرے دو تین ساتھیوں کے کندھوں ہی پر تھا۔ اس لئے بعض موقعوں پر مزور کچھ کوتاہیاں بھی سرزد ہوئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں ہر مندوب و مشاہد ساتھی سے یہ بجا طور پر توقع رکھتا تھا کہ وہ خود آگے بڑھ کر اپنا خیال رکھے اور دوسروں کی بھی مدد کرنے اس قسم کا جذبہ ہمارے اندر اسی طرح پیدا ہونا چاہئے جس طرح دوسری اردو کانفرنسوں کے اراکین کے دلوں میں موجزن ہوتا ہے۔ میری مجبوریوں کا احساس جب فراق، پنڈت آنند نرائن ملا، پروفیسر گوپی چند نارنگ، اندر کمار

۱۔ حضور اس سے زیادہ مستند اعلان اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت سرور دل شاہ جہاں پوری کا کے فرزند ارجمند نے انھیں جانشینی کی سند

دھرمیندر ناتھ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ساحر ہوشیارپوری جیسے بزرگ کر سکتے تھے تو یہ احساس میرے دوسرے ساتھیوں کو بھی کرنا چاہیے۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ اس قسم کی شکایت سوائے ایک صاحب کے جو بڑھاپے میں مجھ ہی تک ملنے چلے آئے تھے۔ اور خود اپنے ہاتھ پانی کا گلاس تک پینا کسر شان سمجھتے تھے اور کبھی سنے مجھ سے نہیں کی تھی۔ اگر کرتے تو میں انھیں کوئی نہ کوئی کام ضرور سونپ دیتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ انکار نہ کرتے۔

مخلص رام لعل

●●● مکرمی سرور صاحب
تسلیم

فروری ۱۹۸۱ء کا شمارہ شان ہند اتفاق سے نظر سے گزرا۔ من کہ مکتوب الیہ' ایک ایڈیٹر کی دیانتداری کا بہترین ثبوت ہے۔ بالخصوص توصیف صاحبہ کیرانوی کی نظم صفحہ ۲۸ پر ہندوستان بھر میں قومی یکجہتی کے نام پر ہونے والے مشاعروں اور تبلیغ اردو کے نام پر کنبہ پالنے والوں کے لئے 'گلاب پاشی میں نمک' کے مترادف ہے۔

علاوہ ازیں لگتا ہے۔ عاصی کیرانوی صاحب واقعاتی طور پر بھی خود کسی مقامی مشاعرے میں نظر انداز کر دیئے گئے ہوں۔ میں توصیف کیرانوی صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں سے انکار نہیں کر سکتی اس لئے کہ میں نے موصوف کو کسی مشاعرے میں نہیں سنا۔ البتہ آپ نے نظم سے پیشتر تمہیداً جو تعریف توصیف کی ہے اس پر بھی مزید اعتراض ہے۔ اور سوچ رہی ہوں کہ یہ تعریف ہے یا تضحیک۔ جبکہ موصوف کی نظم

یار لوگوں کو جو سوجھی قومی یکجہتی کی بات
پہنچی آل انڈیا مشاعرے پر نگاہ التفات

بہتر ہوتا کہ موصوف اس نظم کی بحر بھی تحریر فرما دیتے تاکہ ہر مصرع کی تقطیع معلوم ہو جاتی اور آگے چل کر لکھتے ہیں کہ یہ

طے ہوا کہ کوئی بھی ہو لیکن ترنم ساز ہو
ہو سخنور یا نہ ہو پر صاحب انداز ہو

اس شعر کا دوسرا مصرعہ کلی طور پر خارج از بحر ہے ایک غیر شاعر بھی اس دوسرے مصرعہ کو اس طرح کہہ سکتا ہے۔

وہ سخنور ہو نہ ہو پر صاحب انداز ہو

نام اس کا کوئی ہو پر شہرۂ آفاق ہو
جو کسی زمرہ میں لیکن تال میں طاق ہو

اس شعر کا مصرعہ ثانی ملاحظہ فرمایئے تال اور طاق کیا پر معنی بات ہے۔ جب کہ تال میں ذم کا پہلو نمایاں ہے۔ خیر چھوڑیئے میرا مقصد کوئی بحث چھیڑنا نہیں ہے۔ ورنہ پوری نظم فنی طور پر ناقدین کے لئے بہترین موضوع ہے بہتر ہو کہ عاصی صاحب نظم سے ہٹ کر اپنے ذاتی تجربات و احساسات قارئین تک نثر کے ذریعہ پہنچا دیا کریں۔

قمر النساء ایم اے[1]

●●● بمبئی
۸۱-۶-۲

برادر محترم سرور دستان آداب

پیری صاحب مدیر حیرا دہلی داغ مفارقت دے گئے اس صدمے نے جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے۔ آپ تو اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ میرے ان سے کیا تعلقات تھے۔ میرے لئے اب دلی آدھی رہ گئی ہے خدا آپ کو سلامت رکھے۔ آپ کی پریشانی کی فہرست دیکھ کر سر چکرا گیا۔ والدہ محترمہ کی علالت۔ داماد کا ایکسیڈنٹ۔ بیوی کو ڈبل نمونیہ۔ قدرت بھی زندگی کے قالین میں سوئیاں چبھو چبھو کر کیسے کیسے نقش و نگار بناتی ہے۔ آپ ان سب متعلقین کی خیریت سے ...... آگاہ کیجئے گا۔ میری بیماری بدستور ہے اور دل بادر بھی اپنی جگہ بجا ہو گا ہے۔

والسلام ۔ راجندر کرشن

●●● کویت ۔ ۱۲ر جون ۱۹۸۱ء

مکرمی و محترمی جناب سرور صاحب آداب

شان ہند اپریل ۱۹۸۱ء میں جو کل ہند غیر مسلم اردو کانفرنس

---

[1] قمر النساء کے پس پردہ کوئی احساس کمتری کا دیرینہ مریض "عروضی" برقع اوڑھے صاف دکھائی دے رہا ہے (ادارہ)

کی روداد جو شائع کی ہے یہاں بہت پسند کی گئی ہے اور لوگوں میں اکثر یہی ذکر ہے کہ کویت میں پہلی بار انڈیا کے غیر مسلم مصنفین حضرات کی اتنی بڑی تعداد سے شان ہند نے روشناس کرایا ہے اور پوری روداد کے لئے بے چین ہیں۔ اور مجھے تو خیر بہت پسند آئی۔ مگر لوگوں میں اس کا ذکر ہے میرے لئے یہ بڑی بات ہے۔ من کہ مکتوب الیہ۔ میں جو میری حمایت میں تفتہ صاحب کا خط چھپا ہے پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی اور میری ہی نہیں بلکہ میری طرح اور لوگوں کو بھی اس خط سے فائدہ پہنچا ہے اور علم عروض اور معلومات میں اضافہ بھی ہوا۔ میرے ساتھ ساتھ کاوش صاحب، بسمل صاحب کے لئے بھی میدان صاف کر دیا ہے میں تفتہ صاحب کا احسان مند ہوں اور خاص طور پر آپ کا اور شان ہند کا بھی جس نے میری عزت اور میرے ذوق کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور ایک ذرے کو آفتاب بنایا۔

طالب دعا
شاہد رتلامی

••• کلیان بمبئی

۲۴؍۶؍۸۱ء

مکرمی سرور صاحب آداب

پہلے غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس لکھنؤ کی کامیاب شرکت پر مبارک باد قبول فرمائیے پھر ایک پرزور شکایت سنئے کہ مئی ۸۱ء کے شان ہند میں میری کتاب "مثنوی مجاہدین غدر" پر جو چند سطریں شائع ہوئی ہیں نہایت لچر، رکیک، اور دل شکن ہیں۔ میں شان ہند کا پرانا خریدار، بہی خواہ اور بزرگان ادارہ کا عقیدت مند اور ان کے بارے میں ایسی تحریر کہ "متین صاحب کے کلام میں فنی خامیاں ہوتی ہیں جو مثنوی میں بھی نمایاں ہیں اور یہ کہ رکھائی چھپائی بہت خراب ہے" مثنوی میں چند نام ایسے ہیں جو تبصرہ نگار نے نہیں پڑھے۔ آخری جملے سے تو خیر خود موصوف کے مطالعے کی پول کھلتی ہے لیکن باقی جملے ہتک آمیز [illegible] اور حقیقت پر مبنی نہیں اس سے تو کچھ نہ لکھا جاتا تو اچھا تھا ورنہ نام نہاد غلطیوں کی نشاندہی ضروری تھی۔ دعویٰ بے دلیل از خود غلط ہوتا ہے۔ فقط

خیر اندیش
متین بدایونی

بقیہ: پنروواہ

بکھری اب اُس غریب کی سانس لی کھانا کھایا آرام کیا مگر پھر بھی اُسے رات بھر نیند نہیں آئی۔ یونہی نیند آنے کا سوانگ بھرتی رہی اور پلک موندے پڑی رہی اُسے پھر بھی کوئی ڈر تھا عورت کے مزاج کی یہ قدرتی بات ہے۔ کئی بار اس کا بچہ رویا بھی مگر وہ دانستہ اُسے چپ کرانے کے لئے نہیں اُٹھی کیوں کہ سونے کا ڈھونگ نبھانا پڑ رہا تھا۔ نتے بھی سویا نہیں تھا جوگی پلکوں کے پیچھے سے اسے برابر دیکھ رہی تھی۔ وہ اٹھا اور بچے کے لئے بچا ہوا دودھ لا کے چمچے سے روتے ہوئے بچے کو پلا دیا اور بچہ پیٹ بھر جانے کے بعد پھر سو گیا۔ اُس نے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اپنے پلنگ پہ آ لیٹا۔ جوگی نتے کی اس ہمدردی کو دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ اب اسے نتے بہت اچھا لگنے لگا تھا اور اس وقت وہ نتے کے پچھلے برتاؤ کو بالکل بھول گئی تھی۔ وہ بڑی بڑی سوچ رہی تھی کہ یہ آدمی مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں رکھتا ہے اس کے دل نے جلدی ہی اس سوال کا جواب بھی دے دیا۔ بیوقوف سے بیوقوف عورت اس معاملے میں بڑی سمجھدار ہوتی ہے۔ مگر دوسرے سوال کا جواب اس کے من کو نہیں مل رہا تھا کہ جو شخص پہلے اس کی طرف سے اتنے گندے خیال رکھتا تھا آج اپنے گھر میں موجود ہونے پر بھی کچھ نہیں کہہ رہا نظر اٹھا کر دیکھتا تک نہیں۔ سوتے ہوئے بھی جسم کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور رات بھر سویا نہیں۔ اسی طرح دن نکل آیا جنگل میں چاروں طرف بیشمار چڑیاں چہچہانے لگیں۔ خطرناک درندوں کی گرجدار آوازیں کانوں کے پردوں پر ٹکرانے لگیں نتے آنکھیں موندے پڑا تھا وہ مصنوعی خراٹے بھر رہا تھا۔ جوگی نے دل ہی دل میں سوچا۔ انہیں اتنی جلدی نیند آ گئی؟ نیند کیوں نہ آئے ساری رات جاگتے رہے ہیں۔ اب مجھے جانا ہے بغیر کہے جانا بھی ٹھیک نہیں اس لئے جگا کر آگاہ کر کے ہی جاؤں گی یہ سوچ سمجھ کر وہ نتے کی طرف بڑھی نتے کے پلنگ کے پاس جا کر وہ پھر ٹھٹک گئی اس کے دماغ میں دو باتیں آ گئیں۔ آواز دے کر اٹھاؤں یا جسم کو ہلا کر اٹھاؤں

(باقی صفحہ [illegible] پر)

پُتر ووِاہ

ڈاکٹر اودے سرن ارمان
(بلاری)

۶ر جون ۱۹۸۱ء کو جب دوپہر بعد سمستی پور کے پاس بلاگھاٹ اور دھنارا گھاٹ اسٹیشنوں کے درمیان سمستی پور بنمکھی ایکسپریس کے سات ڈبے کئی سو مسافروں سمیت (جن میں سات براتیں بھی تھیں) لائن پر سامنے سے آتی ہوئی بھینس کی جان بچانے کی ناکام کوشش میں تیز رفتار ٹرین کی ایمرجنسی بریک استعمال میں لانے کے باعث گاڑی اُچھل کر پل سے نیچے بہتی ہوئی تھاہ گہری کوسی ندی میں ڈوب گئے' اسی دن المورا ضلع میں پلاشلٹ پٹی کے بھنی گاؤں میں ایک پہاڑی عورت جوگلی دیوی نے غلیل سے دھان کے کھیت میں دانہ چُگ رہے جنگلی تیتروں میں سے ایک تیتر مار گرایا تو وہ اپنے اچوک نشانے پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

تیتروں کا جھنڈ کا جھنڈ آتا اور دھان کے کھیتوں پر حملہ آور ہو کر نقصان کرتا ہوا اپنی راہ لیتا۔ جوگلی دیوی روز صبح شام ان تیتروں کو اُڑانے پر لگی ہوئی تھی۔ تیتروں کو اُڑانے میں چیختے چیختے جب اس کی آواز بیٹھ گئی تو اس نے غلیل کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ویسے وہ بڑی رحم دل تھی اور اُس نے کبھی کسی تیتر کو جان سے مارنے کا سوچا بھی نہ تھا۔ وہ دانستہ ایسے زاویے سے غُلہ پھینکتی کہ کسی تیتر کے لگنے کی بجائے کھیت میں گرتا اور اس کی آواز سے تیتر اُڑ جاتے مگر اس کے باوجود غیر ارادی طور پر آج اس کی غلیل سے نکلے ہوئے غلہ نے ایک تیتر کی جان لے ہی لی۔ زخمی تیتر گرم گھاؤ میں تیزی سے اُڑتا ہوا سڑک کے دوسرے کنارے پر جا گرا۔ اس کے جسم سے نکلتی ہوئی خون کی بوندیں سڑک پر اس کی شہادت کا اتہاس لکھ رہی تھیں کہ ایک فارسٹ گارڈ اُدھر آ نکلا۔ ننھے فارسٹ گارڈ جو خود بھی دل ہی دل میں جوگلی دیوی کے تیرِ نظر کا زخم خوردہ تھا کڑک کر بولا۔

"جوگلی دیوی تم نے جنگلی تیتر مارا ہے۔ اور یہ سرکاری قانون کے خلاف ہے تم جانتی ہو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ننھے جال بلب تیتر کو اٹھائے جوگلی کے قریب پہنچ گیا! اور سرکاری قانون کی تشریح کرتے ہوئے اسے خوف زدہ کرنے کی پوری کوشش کرنے لگا۔

"تیتر جنگلی ضرور ہے مگر میں نے اس کو اپنے کھیت میں مارا ہے۔ جنگل میں نہیں تو پھر قانون کو کیسے توڑا ہے؟

"میں نے اس کو اپنی مدد سے اُٹھایا ہے سڑک پر پڑے اس کے خون کے دھبے اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ تم نے اس کو کہاں مارا ہے۔ چلو رینجر صاحب کے پاس۔"

"چلو" جوگلی اکڑ کر بولی۔ کیوں کہ وہ سچی تھی اور غلط کار بھی نہیں اس لئے اس نے ہمت نہیں ہاری اور بے دھڑک چل دی کیوں کہ اسے یقین تھا کہ رینجر صاحب اس کی سچائی پر یقین کر کے اسے معاف کر دیں گے۔ چلتے چلتے گارڈ بولا۔

"جوگلی دیوی تجھے معلوم ہے ایک تیتر مارنے پر کتنا جرمانہ ہو سکتا ہے۔"

"میں نہیں جانتی" بے پرواہی سے اس نے جواب دیا۔

"پرسوں ایک ٹرک سے ایک گوہ کچلی گئی تھی جو ایک معمولی سے جانور نیولے یا بس کھپرے کی نسل کی ہوتی ہے مگر رینجر صاحب نے ڈرائیور پر بتیس سو روپے جرمانہ کیا۔ تیتر کے مارنے پر بھی ہزار بارہ سو روپے جرمانہ ہو سکتے ہیں۔"

کوئی ترکیب ایسی بھی ہے جو تم مجھے اس مصیبت سے بچا دو وہاں مجھ پر جو کچھ جرمانہ ہوگا اس میں سے تم کو تو کچھ ملے گا نہیں۔ سب سرکاری خزانے میں جمع ہو جائے گا اس لئے تم ہی سو دو سو روپے مجھ سے لے لینا اور مجھے جانے دو۔ جوگلی دیوی نے بچے کو گود میں سنبھالتے ہوئے کہا۔ جوگلی دیوی

کی رحم بھری اس درخواست سے گارڈ کو اپنے دلی ارمان پورے ہونے کی جھلک دکھائی دینے لگی تو مُسکراتے ہوئے بولا۔

"تم مجھے روپیہ پیسہ ہرگز مت دو صرف میرے تھڑے پر ایک رات کے لئے آجاؤ۔"

"یعنی چند ٹکوں کو بچانے کے لئے اپنی آبرو لٹا دوں تو دودھ پیتا ہوں تمہیں مجھ سے اس طرح کی بات بھی نہیں کرنی چاہئے۔ میں جرمانہ ادا کروں گی۔ لیکن یہ پاپ کبھی نہیں کروں گی،" جوگی یہ کہتے ہوئے رینجر کے بنگلے کی طرف بڑھی۔

گارڈ نے رینجر صاحب کے بنگلے پہ پہنچ کر واقعہ کچھ اس ڈھنگ سے سُنایا کہ جوگی پر جرمانہ کیا جانا ضروری ہو گیا جوگی دیوی نے بارہا کہا "یہ گارڈ جھوٹ بول رہا ہے۔ مگر رینجر صاحب پر ایسا رنگ چڑھایا گیا تھا کہ اس نے جوگی کی کوئی بھی بات صحیح نہ مانی اور کہا "تم سرکاری آدمی کو جھوٹا بتا رہی ہو اور خود مجرم ہو یہ قدرتی بات ہے کہ مجرم اپنا جرم کبھی قبول نہیں کرتا بلکہ اپنے بچاؤ کے لئے طرح طرح کی باتیں بناتا ہے چونکہ تم نے سنگین جرم کیا ہے لہٰذا میں تم پر پانچ سو روپے جرمانہ کرتا ہوں اور جب تک یہ رقم ادا نہیں ہو جاتی تب تک تم ہماری حراست میں رہو گی۔"

یہ حکم سُنانے کے بعد رینجر صاحب کاغذی کارروائی پوری کرنے لگے۔ جوگی دیوی نے بچے کو اپنے سینے سے اس طرح لگایا کہ اگر جرمانہ ادا نہ ہوا اور جیل جانا پڑا تو بچے کو نہیں چھوڑے گی گارڈ جوگی کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ مگر کچھ ہی لمحات بعد ننھے گارڈ کی مسکراہٹ کو سنجیدگی کے اژدہے نے نگل لیا۔ اب وہ غور کر رہا تھا کہ میں نے ایک غریب عورت پر جرمانہ تو کرا دیا مگر وہ اس کو ادا نہیں کر پائے گی اور اس کا جو نتیجہ ہو گا اس سے جوگی کے دل میں اور بھی اس کے لئے نفرت بڑھے گی۔ وہ سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ اب اگر رینجر صاحب سے جرمانہ معاف کرنے کی سفارش کی جائے تو کاغذی کارروائی پوری ہو گئی ہے دوسرے وہ اس سفارش سے بدظن بھی ہو سکتے ہیں لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ننھے ابھی خیالات میں اُلجھا رہا تھا کہ بستی کا پردھان وہاں آپہنچا۔

"رینجر صاحب (میری سیوا پہنچے۔ پہاڑی امنچے طبقے کا سلام)"

"رام رام۔ تم کون ہو کیسے آنا ہوا" رینجر صاحب نے افسرانہ لہجے میں کہا۔

"میں بستی کا پردھان ہوں میں نے سُنا ہے کہ تمہارا فارسٹ گارڈ جوگی کو تیتر مارنے کے جُرم میں پکڑ کر لے گیا ہے؟"

"جی ہاں وہ ہماری حراست میں ہے۔ اس پر جرمانہ بھی کر دیا گیا ہے تمہیں کچھ کہنا ہے۔"

"ہاں سرکار مجھے یہ کہنا ہے کہ وہ ایک ودھوا ہے اس کا شوہر سیما سُرکشا دل میں سپاہی تھا۔ بنگلہ دیش کے سینکوں کی گولی سے مارا گیا تھا اس کی گود میں ایک لڑکا ہے جو مرنے والے کی نشانی ہے باقی پورے گھر میں کوئی نہیں ہے یہ بہت غریب ہے۔ معمولی پنشن اور تین بیگھا زمین اُس کے گزارے کا سادھن ہے۔ اُس پر جرمانہ ہی کرنا تھا تو اتنا کرتے کہ یہ غریب آسانی سے ادا کر سکتی پہاڑی لوگوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ غریب ہوتے ہیں۔"

"جرمانہ مجرم کی ہستی کو دیکھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ جرم کی نوعیت دیکھ کر کیا جاتا ہے قانون کو ان تمام باتوں سے کیا مطلب جو آپ سُنا رہے ہیں۔"

"رینجر صاحب میں اس وقت ایک انسان سے بات کر رہا ہوں قانون سے نہیں۔"

"تم اس کی اتنی طرفداری کر رہے ہو تو جرمانہ خود ادا کر دو مگر ہمارے قلم سے جو نکل گیا وہ واپس نہیں ہوتا ہے یہ افسر کا حکم ہے کسی معمولی آدمی کا نہیں۔"

"ٹھیک ہے صاحب آپ اپنا قانون دیکھیں یہ جرمانہ میں ادا کروں گا لیکن یہ بھی آپ کی مہربانی نہیں رہے گی۔ بستی کی ناک تھوڑے ہی کٹانی ہے۔" کہتا ہوا پردھان چلا گیا اور دو سو کر جرمانہ ادا کر کے جوگی دیوی کو چھڑا لے گیا۔ ننھے یہ سب کچھ غور کر دیکھتا رہا وہ اسی ادھیڑبن میں پریشان تھا کہ کامیاب ہو کر بھی ناکامیابی رہی اب جوگی کے دل میں جگہ پانے کے لئے بہت

بڑی قربانی کرنی پڑے گی کیونکہ جوگلی اب اس سے متنفر ہو چکی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس زمانے میں کوئی کسی کی مدد بغیر مطلب نہیں کرتا۔ اس پردھان نے اتنی بڑی رقم لاکر ایکدم ... دے دی ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ بے سہارا اور غریب عورت کے لئے اتنا روپیہ ادا کرنا چغلی کھاتا ہے کہ معاملہ مشکوک ہے اور پیار محبت میں ہی اس قسم کی قربانی کی جا سکتی ہے۔"

ننھے کا رڈکے اس جال سے جوگلی کا بچ نکلنا اس امر کا کھلا ثبوت تھا کہ اب جوگلی کے دل میں ننھے کے لئے نفرت کے سوا اور کیا ہوگا۔ مگر ننھے کے دل میں تو جوگلی نے اور بھی چنگاریاں سلگا دی تھیں لہذا وہ جوگلی کو پھانسنے کی اور ترکیبیں سوچنے لگا اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس نے جوگلی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا

جوگلی نے اپنے بیاہ کا بچا کچا زیور اور گھر کا کچھ سامان اور برتن بھی بیچ ڈالے مگر اس کے باوجود پردھان کی بارہ سو روپے کی رقم فراہم نہ ہو سکی تو اس نے اپنی زندگی کا آخری اثاثہ تین بیگھے زمین بھی ایک پڑوسی کے ہاں گروی رکھ دی اور اس طرح وہ پردھان کے قرض سے بری ہو گئی۔ ننھے کو جب اس ساری حقیقت کا پتہ چلا تو اس کے دل سے پردھان کی رقابت کا شک جاتا رہا اور وہ دلی ندامت کے ساتھ سنجیدگی سے جوگلی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کہ وہ کس طرح اپنے گناہ کا کفارہ کر سکتا ہے۔ ننھے کی ضمیر اس پر ہزاروں لعنتیں بھیج رہا تھی اور وہ ذہنی طور پر نہ صرف پشیمان تھا بلکہ دل و جان سے جوگلی کی اس مصیبت کو دور کر کے اسے اپنا بنانا چاہتا تھا۔

ادھر پردھان جی اپنی رقم کی واپسی کے باوجود جوگلی کی پریشانی اور خستہ حالی سے پوری طرح واقف تھے اور وہ دل ہی دل میں جوگلی کو ان پریشانیوں سے نجات دلوانے کے لئے سوچتے رہے اور اچانک پردھان جی ننھے سنگھ کے نزدیک پہنچ گئے اور ننھے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"گارڈ صاحب آپ نے اور آپ کے افسر نے بے چاری جوگلی کو دانے دانے کو محتاج تو کر دیا اب اس پر ترس کھا کر جنگل کاٹنے والے مزدوروں کے ساتھ کہیں مناسب کام ہی دلوا دو جس سے وہ اپنا پیٹ تو پال سکے۔ پردھان کے مشورہ غور سے سننے کے بعد ننھے بولا "آپ کی اس بات کو پورا کرنے کے لئے میں پوری پوری کوشش کروں گا۔ ننھے نے اعتماد کے ساتھ پردھان جی سے کہا۔

جنگلی پیڑوں پر سرکاری آدمی مہر لگاتے ہیں ٹھیکیدار کے آدمی بھی ساتھ ہی رہتے ہیں اور ٹھوس کھوکھلے پیڑوں کو الگ الگ لکھتے جاتے ہیں لوہے کے گھن پر مہر کھدی ہوتی ہے وہ پیڑ پر مارا جاتا ہے اس کی آواز سے ٹھوس اور کھوکھلے پیڑ کا پتہ چل جاتا ہے جوگلی اس کام کو آسانی سے کر سکے گی کوئی خراب کام بھی نہیں ہے ٹھیکیدار ہمارے دباؤ میں رہتا ہے وہ اس کا خیال رکھے گا میں جوگلی کو زیادہ سے زیادہ مزدوری دلواؤں گا۔"

کچھ دنوں بعد ہی ننھے نے دلی کوشش کر کے جوگلی کو یہ کام دلوا دیا جوگلی دلیری دن بھر نیچے کو بانس کی کھپچیوں کی کنڈیا میں کمر پر لٹکائے ٹھیکیدار کے آدمیوں کے ساتھ پیڑوں پر ٹھپے لگاتی رہتی۔ اب وہ خوش تھی۔ پیٹ بھرنے کے بعد بھی وہ کچھ نہ کچھ نقد بچا کے رکھ لیتی تھی۔ بہت دنوں تک یونہی کام چلتا رہا۔ جوگلی گو شودر تھی۔ مگر اس کا ناک نقشہ رنگ روپ چال ڈھال دل پسند تھے۔ اور اسی لئے وہ ٹھیکیدار کی نظروں میں بھی کھٹکنے لگی۔ ٹھیکیدار کا خیال تھا کہ وہ ایک غریب مزدورنی ہے۔ چند سکوں میں بک جائے گی اور اس کی ہوس کا شکار ہو جائے گی یہی سوچ کر ایک دن اس نے اپنے قاعدے پر سارے مزدوروں کو اجرت تو دے دی مگر جوگلی دلیری کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ جوگلی منہ [illegible] بیٹھی رہی صبر تو غریب کا خاص گن ہوتا ہے کچھ دیر بعد ٹھیکیدار نے بلایا۔ جوگلی میں تم کو دوسرے مزدوروں سے زیادہ اجرت دیا کروں گا اسی لئے تمہیں سب کے سامنے ادائیگی نہیں کی برا مت ماننا اور اگر تم نے اچھا کام کیا تو انعام بھی دیا کروں گا۔ جوگلی سنتی رہی اور ٹھیکیدار کے ہر لفظ پر غور کرتی رہی۔ جب وہ چپ ہو گیا ... تو جوگلی نے کہا۔ بڑے لوگوں کو غریب لوگوں کی مدد کرنا ہی چاہئے اب میں چلتی ہوں۔ جیسے ہی وہ جانے کے لئے اٹھی ٹھیکیدار نے اٹھ کے دروازہ بند کر دیا۔ اب جوگلی کی آنکھیں کھلیں اسے اپنی آبرو خطرے میں دکھائی دینے لگی مگر اس نے ہمت سے کام

لیا اور زبردستی دروازہ کھول کر باہر جانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن عورت عورت ہی ہوتی ہے وہ مرد کا مقابلہ کیا کر سکتی تھی۔ ٹھیکیدار نے جوگلی کو پیچھے دھکیل دیا وہ چارپائی پر گر گئی اور کنڈیا سے نکل کر بچہ بھی دُور جا گرا اس نے جلدی بچہ اٹھا کر سینے سے لگایا اور غصے میں کانپتی کھڑی کھڑی بچاؤ کی کوئی ترکیب سوچتی رہی۔ ٹھیکیدار اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم گھبرائی کیوں ہوئیں کوئی بھیڑیا تھوڑے ہی ہوں۔ صرف تم سے پیار کروں گا اور بس" کہتے ہوئے اس نے جوگلی کو اپنی باہوں میں بھینچ لیا وہ کسمساتی رہی اور وہ اس کا منہ بند کر دیتا تھا بچہ بھی بار بار رو رہا تھا۔

اِدھر جوگلی کو گھر پہنچنے میں کافی دیر ہو چکی تھی ننھے جوگلی کی تاک جھانک میں رہتا تھا اس کے چال چلن پر نظر رکھتا تھا۔ اس کا مرا ہوا شک پھر زندہ ہو گیا اور اس نے سوچا کہ جوگلی پردھان کے گھر چلی گئی ہو گی۔ عورت کو بدلتے میں کچھ دیر نہیں لگتی ہے جب وہ پردھان کے گھر گیا تو جوگلی وہاں بھی نہیں تھی۔ اب اس کا ماتھا ٹھنکا اور ٹھیکیدار کے تھڑے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگل میں ذرا سی آواز بھی بہت دور سے سنائی دے جاتی ہے جوگلی کے چلّانے کی آواز ننھے کے کانوں میں پہنچی وہ اصلیت کو بھانپ گیا اور تیزی سے ادھر لپکا۔ "ٹھیکیدار یہ کیا شور ہے"، اس نے دروازے کو زور سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ٹھیکیدار ننھے سنگھ کی آواز سنتے ہی جوگلی کا ہاتھ چھوڑ کر سٹپٹایا ہوا سا باہر نکلا جوگلی بھی پسینے میں تر بال بکھرائے ہوئے بے حال [illegible] باہر آئی وہ ہانپ رہی تھی ننھے کے جسم میں [illegible] کر بولا "کمینے تو نے ایک ایسی غریب سہاسا بیوہ عورت پر حملہ کیا ہے جس کو میں نے یہاں کام پر لگایا تھا تو نے اس پر بُری نیت رکھی اور ایسی کمینہ حرکت کی۔ تیری بدچلنی کی شکایت رینجر صاحب سے کروں گا اور تجھے کل ہی یہاں سے نکلوا دوں گا" یہ سنتے ہی ٹھیکیدار کی ہوائیاں اُڑ گئیں۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر اپنی غلطی کی معافی مانگی پیروں پر گر کر گڑگڑانے لگا۔

"یوں گڑگڑانے سے کام نہیں چلے گا اس بدتمیزی کی سزا بھگتنی ہو گی"

"میں تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے بارہ سو روپیہ نکال کر اس کو دیدو۔"

"بارہ سو روپیہ تو بہت ہے۔ دس بیس کہتے تو معمولی بات تھی"

ننھے نے غضب ناک لہجے میں کہا "ہمارے یہاں سودے بازی نہیں ہوتی ہے جو کہتے ہیں وہ پتھر کی لکیر ہوتی ہے اگر کم و بیش کرانے ہیں تو رینجر صاحب کے پاس چل۔"

"نہیں نہیں میں وہاں نہیں جاؤں گا" کہتے ہوئے اُس نے چُپ چاپ بارہ سو روپے نکال کے جوگلی کی طرف بڑھا دیئے جونہی جوگلی پیچھے ہٹی ننھے نے آنکھ کے اشارہ سے لے لینے کو کہا اور اُس نے روپے تھام لئے۔ ٹھیکیدار نے یہ جرمانہ اس لئے منظور کر لیا تھا کہ اُسے فارسٹ گارڈ سے بہت نفع تھا۔ وہ سینکڑوں سال اور دیودار کے ایسے پیڑ کٹوا دیتا تھا جن پر پچھلے سال کی مہر نہیں ہوتی تھی۔ اگر آج گارڈ کا کہنا نہیں مانتا تو ہزاروں کے گھاٹے میں رہتا اور ٹھیکیداری بھی ختم ہو جاتی۔

"چل جوگلی۔ تو ڈر مت جانا۔ ٹھیکے لگانے روز آنا۔ کام چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل ہی لوگ تیری حفاظت کریں گے نہیں تو ان سالوں کو دنیا سے ہی وداع کروا دوں گا" کہتے ہوئے ننھے سنگھ جوگلی دیوی کو اپنے تھڑے کی طرف لے گیا۔

"تم مجھے ادھر کیوں لے جا رہے ہو میرے گھر کیوں نہیں جانے دے رہے" جوگلی نے راستے میں کھڑے ہو کر کہا۔

"آج تم کو دیر ہو گئی ہے اندھیرے میں گھر تک اکیلی کیسے جاؤ گی۔ اور اگر میں تمہارے ساتھ جاتا ہوں تو دیکھنے والے انگلی اٹھائیں گے اس لئے ادھر لے آیا ہوں یہ گھر بھی تمہارا ہی گھر ہے۔ کھاؤ پیو آرام کرو دن نکلے کام پر چلی جانا۔ تمہارے گھر میں بھی تو تمہارا کوئی نہیں ہے" یہ سُن کر جوگلی کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے "ہاں ٹھیک کہتے ہو" اس نے روندھے ہوئے گلے سے کہا اور ممتا سے بچے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ "کچھ بھی ہو اپنا گھر پھر اپنا ہی ہوتا ہے"

"ٹھیک ہے مگر میں ٹھیکیدار کی طرح نہیں ہوں۔"

"جو کسی کی آبرو بچاتا ہے وہ کسی کی آبرو کا لٹیرا نہیں ہوتا" وہ اطمینان سے کہہ کر پلنگ کی پائینتی بیٹھ گئی کنٹھیا ایک طرف

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر ایس۔ پی۔ شرما تفتہ
کوروکشیتر یونی ورسٹی

غزل

صرف اتنا سا رابطا نکلا / دل کا اُن کا معاملا نکلا
ہر تدارک سے ماورا نکلا / دردِ اُلفت کا لا دوا نکلا
بامروت دہا وفا نکلا / دلِ عاشق تو کام کا نکلا
جو بنا پھرتا تھا بہت سرکش / محض پانی کا بُلبُلا نکلا
ایک ہوکر بھی وائے ہم تم میں / کتنی صدیوں کا فاصلا نکلا
کیا شکایت کریں کسی سے ہم / اپنا دل بھی تو غیر کا نکلا
جوگیا رنگ چڑھ گیا جس پر / اُس کا باطن بھی جوگیا نکلا
جس کو سمجھا تھا دشمنِ ایمان / وہ حقیقت میں دیوتا نکلا
جس کو پوجا وہ بن گیا پتھر / جس کو چاہا وہ بے وفا نکلا
موت آئی کہ زندگی پائی / خیر! کوئی تو راستا نکلا
ہوش کھوکر ہی ہوش آیا ہے / ہوش کھوکر ہی راستا نکلا
داستانوں کے پھیر میں ہم نے / جو بھی دیکھا وہ مبتلا نکلا
تن کی دُنیا سے من کی دُنیا تک / یاد کا اُن کی سلسلا نکلا
بادۂ غم تو بادۂ غم ہے / غم میں اپنا ہی اک نشا نکلا
عشق پر ہے اساس دھرتی کی / عشق شوجی کا نادیا نکلا
زندگی کی مہیب راہوں میں / مرنے کا دیپک ہی رہنما نکلا

موت کی ہر ادا سے اے تفتہ
زندگانی کا فلسفا نکلا

قطعات

تفتہ

- اب ادب میں خیال کی نُدرت
فکر و احساس کی ہزیمت ہے
بادۂ کہنہ، ساغرِ نو میں
کوئی بھر دے یہی غنیمت ہے

- اک غریب الدیار کے دل پر
اس طرح چھا کے رہ گئے سائے
اپنی ویران مانگ پر جیسے
ایک بیوہ کی آنکھ بھر آئے

جنم اشٹمی کے مبارک دن پر بھی اہلِ فکر کی نذر!

روشنی کی ظُلمت پہ فتح

توصیف علوی عاصی بی اے کیرانوی

روشنی کو ملی ظُلمت پہ فتح آج کے دن
پائی اُلفت نے عداوت پہ فتح آج کے دن
وہ کنہیّا کہ جو تھا حق و صداقت کا نقیب
لے کے آیا وہ جہالت پہ فتح آج کے دن
وہ تھا اک نند ویشودھا کے تخیل کا اجالا
یعنی کہ کنس کی بربریت پہ فتح آج کے دن
یہ وہ دن ہے کہ ملی جس میں ہر انساں کیلئے
صبح کو شام کی ظُلمت پہ فتح آج کے دن
یہ محبت کے چراغوں کی ہے دنیا ضیا
یہ ہے ایک نور کی ظلمت پہ فتح آج کے دن
ہے حقیقت میں زمانہ کے لئے راہِ نجات
راستی کی یہ ضلالت پہ فتح آج کے دن
آشتی کا ہوا دُنیا میں پھریرا اونچا
دوستی کو ملی نفرت پہ فتح آج کے دن
غم کدے کیوں نہ ہوں خنداں کہ انھیں نے آخر
پائی ایوانِ امارت پہ فتح آج کے دن
یہ ہے اخلاص و محبت کی حقیقت میں جلا
رحم کی ہے بربریت پہ فتح آج کے دن
آدمیت کے لئے ہے یہ مسرت کا مقام
اس کو حاصل ہوئی شیطنیت پہ فتح آج کے دن

حق و انصاف نے باطل کو جھکایا عاصیؔ
پائی کمزور نے طاقت پہ فتح آج کے دن

"ہندو مسلم ایک ہیں"

کاشف کندرکوی
کندرکی ۔ ضلع مرادآباد

راہوں کا ہوں وطن کی گرد و غبار دونوں
مقصد سے زندگی کے ہوں ہمکنار دونوں
الفت کے شہر کے ہوں ہم شہریار دونوں
ہو مادرِ وطن کے دل کا قرار دونوں
منزل سے کیوں بھٹکتے ہو بار بار دونوں
ہو جاؤ ایک، کر لو آپس میں پیار دونوں

نظروں میں جوہری کی لعل و گہر ہو دونوں
دونوں ہی نورِ عین ہو بینا نظر ہو دونوں
آزادیٔ وطن کی شام و سحر ہو دونوں
کوئی دگر نہیں ہے دیکھو جگر ہو دونوں
منزل سے کیوں بھٹکتے ہو باربار دونوں
ہو جاؤ ایک کر لو آپس میں پیار دونوں

دونوں کا ایک جادہ دونوں کی ایک منزل
دونوں کی ایک کشتی دونوں کا ایک ساحل
آپس میں دونوں مل کر حل کر لو اپنی مشکل
دیکھو کبھی نہ ہونا اک دوسرے سے بیدل
منزل سے کیوں بھٹکتے ہو بار بار دونوں
ہو جاؤ ایک کر لو آپس میں پیار دونوں

دہراؤ آج پھر سے باپو کا جو سبق ہے
پر نور ایکتا سے تاریخ کا ورق ہے
کیوں ماہتاب ملت سینوں میں آج شق ہے
مل کر چلو تمہارا ایک دوسرے پہ حق ہے
منزل سے کیوں بھٹکتے ہو بار بار دونوں
ہو جاؤ ایک کر لو آپس میں پیار دونوں

دونوں چمن کی زینت گلشن کی شان دونوں
روحِ چمن ہو دونوں گلشن کی جان دونوں
ہو شوکتِ وطن کے تم آسمان دونوں
ہندوستان کی دیکھو ہو آن بان دونوں
منزل سے کیوں بھٹکتے ہو بار بار دونوں
ہو جاؤ ایک کر لو آپس میں پیار دونوں

امن و اماں میں دیکھو دونوں کی آبرو ہے
دونوں میں ایک جان ہے اور ایک ہی لہو ہے
اک شاخ کے ہی گویا گل دونوں میں ایک بو ہے
اہلِ وطن سے کاشفؔ بس ایک آرزو ہے
منزل سے کیوں بھٹکتے ہو بار بار دونوں
ہو جاؤ ایک کر لو آپس میں پیار دونوں

بقیہ پنر وواہ

دیکر جگلنے کی بات جسم جاکر جگانے کی بات سے اچھی لگی . مگر لمحہ بھر میں اس کا یہ ارادہ پلٹ گیا اس نے سوچا کہ آواز کوئی سُن سکتا ہے اور اس طرح بدنامی ہوگی اس لئے جسم کو ہلا کر جگانا ہی مناسب ہوگا . یوں سوچکر اس نے ننھے کے کندھے ہلائے . "میں جارہی ہوں اپنا گھر بار دیکھ لو"

کیا دن نکل آیا " اونگھتے ہوئے اس نے پوچھا جیسے کہ وہ واقعی نیند سے بیدار ہوا تھا .

" جی ہاں دن نکل آیا ہے اب میں جاتی ہوں "

" کچھ کھا پی کے جانا ایسے نہیں جانے دوں گا " کہتے ہوئے ننھے اٹھا اور کچھ تیار رکھا ہوا ناشتہ لے آیا کھایا کھلایا اور تازہ پانی پیا .

" تم صبح کو چائے نہیں پیتے ہو۔ " جوگلی کہنے لگی ۔

" چائے تو پیتا ہوں مگر آج چائے کے لئے رکھا ہوا دودھ رات میں جنگلی بلوٹا پی گیا ۔ اس لئے چائے نہیں بنائی گئی "

" جنگلی بلوٹا یا جوگلی بلوٹا؟ " اور ننھے تاڑ گیا کہ اس نے دودھ پلاتے وقت نیم بیداری میں اس کو دیکھ ضرور لیا ہے ۔

" اب کہاں جاؤگی ۔ " اس نے سنجیدگی سے کہا ۔

" اب گھر جاؤں گی ۔ اپنا کام کروں گی ان بارہ سوروپوں سے زمین بھی چھڑا لوں گی اور گھر کے سامان بھی خرید لوں گی تاکہ جب لڑکے کی بہو جی آئیں تو یہ کہیں کہ گھر میں کچھ نہیں ہے ۔ میں مزدوری تو مجبوری سے کر رہی تھی ۔ تم نے میرے بہت کڑے وقت میں مدد کی شکریہ ۔ "

" جوگلی میں بہت دنوں سے ایک بات کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا ۔ "

" کہو "

" میں رنڈوا ہوں "

" میں بھی ایک بات کہنا چاہتی ہوں "

" کہو ۔

" میں بیوہ ہوں اور تم جانتے ہو ہمارے سماج میں پنر وواہ نہیں ہوتا ہے ۔ " جوگلی نے دُکھیاتے ہوئے کہا ۔

" اگر تم میرا ساتھ دو تو یہ دقیانوسی سماج تو کیا یہ ساری دنیا کا مقابلہ کر سکتا ہوں ۔ تم ہاں کر دو اور پھر دیکھو " یہ کہتے ہوئے ننھے پیار بھری نظروں سے جوگلی کو دیکھنے لگا ۔ جوگلی بھی ننھے کی طرف دیکھ کر مُسکرا دی اور ننھے پرانے رسم و رواج کے ہیروشیما پہ بم گرانے کو تیار ہو گیا ۔

غزل

شاہد رتلامی (کویت)

دُور منزل ہے دشوار راہیں، ٹھہرو ٹھہرو اکیلے نہ جانا
ظلمتِ شب کی پھیلی ہیں باہیں ٹھہرو ٹھہرو اکیلے نہ جانا

حُسن دلکش ہے چہرہ کتابی سُرخ آنکھوں میں ڈورے گلابی
ہے زمانے کی تم پر نگاہیں، ٹھہرو ٹھہرو اکیلے نہ جانا

جرم اُلفت کے مجرم ہیں ہم تم دامنِ عشق میں ہی رہیں گے
ہو نہ جائیں جُدا اپنی راہیں، ٹھہرو ٹھہرو اکیلے نہ جانا

پتھروں کا نگر ہے یہاں سنگ دل لوگ رہتے ہیں گھر گھر
کوئی سُنتا نہیں دل کی آہیں، ٹھہرو ٹھہرو اکیلے نہ جانا

ہر طرف قتل و غارت گری ہے زندگی سہمی سہمی کھڑی ہے
جلوہ گاہیں بنی قتل گاہیں، ٹھہرو ٹھہرو اکیلے نہ جانا

آدمی آدمی کا ہے دُشمن بھیس میں راہبر کے ہے رہزن
لوٹ لیں گے یہ دیکر پناہیں ٹھہرو ٹھہرو اکیلے نہ جانا

رات کا ماتمی پیرہن ہے چاند تاروں پہ شاہدؔ گہن ہے
اور سُنسان ہیں شاہراہیں ٹھہرو ٹھہرو اکیلے نہ جانا

پروفیسر گوپی چند نارنگ

وزیر خارجہ نرسمہا راؤ کا ریڈیائی انٹرویو

اردو ادب کے ممتاز محقق اور صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ کے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ہندوستان کے وزیر برائے امور خارجہ مسٹر پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ کا یہ ریڈیائی انٹرویو پاکستان کے لیے ان کی روانگی سے پہلے لیا تھا۔

سوال:۔ نرسمہا راؤ صاحب! آل انڈیا ریڈیو کے اسٹوڈیو میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ آپ کی شخصیت اور سرگرمیوں کے بارے میں بات چیت کا موقع ملے گا۔ آپ حکومت ہند کے وزیر خارجہ ہیں لیکن ایک ادیب اور دانشور بھی، اور آپ کا ادیبوں اور دانشوروں سے بھی ایک سچا اور گہرا رشتہ ہے۔ اسی لئے گزشتہ سال آپ کو یاد ہوگا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آپ کو زحمت دی گئی تھی جہاں آپ نے ہندو پاک اردو سیمینار کا افتتاح فرمایا تھا اور آپ کے خیالات کو بے حد پسند کیا گیا تھا۔ اپنے سننے والوں کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ آپ کی پیدائش ۱۹۲۱ء میں کریم نگر (آندھرا پردیش) میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں آپ کا تعلق بمبئی اور ناگپور یونیورسٹیز سے بھی رہا ہے لیکن جہاں تک آپ کی ابتدائی تربیت کا تعلق ہے عثمانیہ یونیورسٹی اور اس کے اسکولوں اور کالجز سے آپ کا گہرا ربط ضبط رہا ہے اور آپ کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں عثمانیہ یونیورسٹی کے ان کالجوں کا جو اردو میڈیم اسکول اور کالج تھے بڑا ہاتھ رہا ہے جو آج آپ اپنا شستہ بتلاتے ہیں ہم سے اردو کلچر سے جو آپ کو محبت ہے، اردو تہذیب سے جو آپ کو لگاؤ ہے ذرا آپ فرمائیے گا کہ آپ کی ابتدائی تعلیم جو اردو میڈیم کے ذریعہ سے ہوئی اس کا کیا اثر آپ کی شخصیت نے اس زمانے میں قبول کیا۔

جواب:۔ پروفیسر صاحب آپ جانتے ہیں کہ ہماری تعلیم میں ذریعہ تعلیم کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے کسی کے طرز فکر کو بنانے میں اور کسی زبان پر تھوڑی بہت مہارت اس کو دینے میں۔ اردو میڈیم کے ذریعہ اپنی ساری ابتدائی تعلیم پا چکا ہوں اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ جو بھی میری بنیادی تعلیم کے اوائل میں کسی مضمون کو سیکھتے وقت جو ہم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں سمجھنے کے PROCESS میں اردو زبان کا ہاتھ رہا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ آپ انگریزی میں سوچتے ہیں اور اردو میں بولتے ہیں۔ تو میری کچھ ایسی حالت ہے کہ شاید میں اردو میں سوچتا ہوں اور کسی زبان میں بولتا ہوں۔ تو یہ جو اردو کا مقام میری ابتدائی تعلیم میں رہا ہے میں بہت اہم مانتا ہوں۔ اور اس کا جو اثر میری شخصیت پر میری تعلیم پر اور بعد میں چل کر میری سرگرمیوں پر پڑا ہے وہ کافی مضبوط اور پائیدار اثر ہے۔ میں اس بات کو قبول کرتا ہوں۔

سوال:۔ یہ فرمائیے آپ نے B.L. بمبئی یونیورسٹی سے کیا یا ناگپور سے۔ اور وکالت تو اس زمانے میں اردو سے بہت چلتی تھی (جہاں تک زبان اور کمیونیکیشن کا تعلق ہے اردو یا ہندوستانی اس کی اہمیت ہے)

جواب:۔ وکالت جہاں تک پڑھائی کا تعلق ہے انگریزی میں ہوئی کیونکہ ناگپور یونیورسٹی سے میں نے B.L. کیا لیکن B.L. کرتے ہی میں نے حیدرآباد ہائی کورٹ میں اپنے آپ کو رجسٹرڈ کرایا۔ آپ کو شاید پتہ ہوگا کہ اس زمانے میں جو بھی حیدرآباد ہائی کورٹ میں وکیل کی حیثیت سے رجسٹر کراتے تھے ان کو ایک اردو دانی کا سرٹیفکیٹ بھی پیش کرنا پڑتا تھا کیونکہ سارا کاروبار اردو میں چلتا تھا PLEADINGS اردو میں لکھے جاتے تھے بحث، تکرار جو بھی ہوتی عدالت میں سب اردو میں چلتی تھی۔ اور مجھے بھی اس طرح اردو دانی کا سرٹیفکیٹ پیش کرنا پڑا اور جہاں تک میں جانتا ہوں ایک وکیل کی حیثیت سے تھوڑی بہت جو مجھے کامیابی ملی

اس میں اردو کتابیں کافی ہوتی تھیں۔ ہماری اردو بولنے کی عادت پہلے سے ہو چکی تھی۔ اس کا بھی بہت فائدہ ہوا۔

سوال: نرسمہا راؤ صاحب! آپ نے ابھی فرمایا کہ وکالت آپ نے حیدرآباد میں اگر شروع کی تو حیدرآباد کو تو ہم لوگ یوں دیکھتے ہیں کہ محض ایک شہر کا نام نہیں ہے۔ حیدرآباد بلکہ ایک تہذیب کا، زندگی کے ایک طریقہ کا نام بھی ہے اور آپ حیدرآبادی محفلوں کا لطف اٹھاتے ہوئے ہیں غالباً اس وقت آپ کی عمر ۲۰-۲۵-۲۷ برس کے درمیان رہی ہوگی اور تحریک آزادی بھی اس وقت بہت اونچی تھی اور مجھے لگتا ہے کہ ہمارے بہت سے رہنما ہماری قومی تحریک کے۔ ان کا تعلق قانون کے اسی پیشہ سے بھی تھا اور وہ تحریک آزادی میں بھی پیش پیش رہے۔ غالباً آپ بھی ان ہی سے متاثر ہوئے ہوں گے۔

جواب: جی ہاں! مجھے سیاست میں جو سب سے پہلے آنے کا اتفاق ہوا وہ ایک وکیل کی حیثیت سے ہی ہوا جبکہ ہم نے ایک QUIT COURT MOVEMENT وہاں چلایا یہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا جب کہ آزادی کی تحریک بہت زور پکڑ چکی تھی اور کوئی بھی اس سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ حیدرآباد میں بھی وہ تحریک کافی زور سے چل پڑی تھی۔ اتفاقاً اس وقت ہم نے QUIT COURT MOVEMENT شروع کیا۔ شروع کرنے والوں میں میں تھا، میرے سینئر تھے اور بہت جیسے رہنما تھے۔ اس ریاست کے اور اس کے بعد پھر میں سیاست میں اس طرح آیا کہ پھر وہاں سے چھٹکارا ہی نہیں ملا تو یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ پہلے تو میری سیاسی زندگی شروع ہوئی تھی تعلیم کے معاملہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے پھر اس کے بعد میں نے وکالت کرنی چاہی لیکن اس وکالت میں بھی اس سیاست نے میرا پیچھا کیا اور بالآخر مجھے اپنی طرف کھینچ کر ہی دم لیا۔

سوال: آپ آندھرا اسمبلی میں ۱۹۵۷ء میں پہلی بار منتخب ہوئے یعنی آزادی کے نو، دس برس بعد۔

جواب: نہیں پہلے ۱۹۵۲ء کے الیکشن میں کھڑا ہوا تھا پارلیمنٹ کے لیے لیکن اس وقت کسی اور پارٹی کی ایسی ہوا چل رہی تھی کہ ہماری پارٹی کامیاب نہ ہو سکی اور ۱۹۵۷ء میں پہلی بار

سوال: ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۱ء تک آپ آندھرا حکومت میں وزیر رہے اور پھر ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۳ء تک آپ چیف منسٹر رہے۔ آندھرا پردیش سے ۱۹۷۷ء میں آپ لوک سبھا میں پہلی بار چن کر آئے اور ۱۹۸۰ء کا لوک سبھا کا الیکشن آپ نے پھر جیتا اور اس وقت آپ ہمارے مرکزی وزیر خارجہ ہیں۔ اور مجھے بڑی خوشی ہے اس بات کی کہ چند روز میں آپ دورہ پاکستان پر تشریف لے جا رہے ہیں۔ یوں تو لوگ سفر دورہ کرتے ہیں دوسرے ملکوں کا بھی اور ہندوستان پاکستان کا بھی۔ لیکن ہماری نظر میں آپ کے دورۂ پاکستان کی اہمیت دوہری ہے ایک تو اس لیے کہ آپ ہماری حکومت کے نمائندہ رہے ہیں اور دوسری اس لیے کہ آپ معاملہ کو ایک ادیب شاعر اور دانشور کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خود آپ کی نظر میں اس دورے اور سفر کا مقصد کیا ہے۔

جواب: میں عام طور پر یہ مانتا ہوں کہ کوئی بھی مقصد ہو یا نہ ہو ممالک کے بیچ جو تعلقات ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے سے ملنے سے مضبوط ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے۔ آنے جانے سے رشتہ مضبوط ہوتا ہے اور لینے دینے سے لین دین مضبوط ہوتا ہے۔ تو ۱۹۸۰ء میں جب سے ہماری حکومت برسر اقتدار آئی ہے۔ ہم نے ہند و پاکستان کے درمیان گفت و شنید کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ دونوں ملکوں کے ذمہ دار حضرات نے ایک دوسرے کے ملکوں کا دورہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان ملاقاتوں سے دونوں ملکوں کو مشترکہ فائدہ پہنچا ہے اور ایسے دوروں کو مختصر وقفوں سے برقرار رکھنا میں سمجھتا ہوں ضروری ہے۔ ہم پڑوسی اور دوست ملک ہیں اس لیے آپسی ربط کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری نہ صرف ہمارے ملکوں کی خاطر بلکہ پورے اس خطے کے مفادات کی خاطر بھی ہم دونوں پر لازم ہو جاتی ہے۔ اسی پس منظر میں، میں پاکستان کا دورہ کر رہا ہوں۔ اس دورے کے لیے مجھے کافی پہلے پاکستان کی جانب سے دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ میں پاکستان کی حکومت اور پاکستانی عوام کو اس دوستی اور خیرسگالی کا پیغام دوں گا جو ہندوستانی حکومت اور عوام کے احساسات کا ترجمان ہوگا محض رسمی

اور میں محض اخلاق کی خاطر یا جذبات کا اظہار نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ دوستی کا جذبہ میری نظروں میں ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے

سوال: ترسیمہارا ذمہ صاحب آپ نے جس طرح سے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی طرف اشارہ کیا ہے یہ بہت اہم بات ہے۔ لیکن ہم سب اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے تعلقات میں نشیب و فراز بھی آتے رہے ہیں اور جہاں تک ہندوستان کا معاملہ ہے یہ کہ دونوں ملکوں کا دونوں ملک ایک دوسرے کی آزادی اس کے وجود اس کی سالمیت کا احترام کرتے ہیں۔ اس وقت تعلقات کی جو نہج ہے آپ کس طرح سے سوچتے ہیں؟ کہ دونوں ملکوں کی حکومتوں کو ان تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: ممالک کے درمیان تعلقات ہوتے ہیں ان میں عوام کے باہمی تعلقات بھی شامل ہوتے ہیں اور ان ممالک کی حکومتوں کا رویہ بھی جڑا ہوا ہوتا ہے۔ پڑوسی ممالک کے عوام کے درمیان دوستی کا جذبہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ قدم قدم پر اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ جو تعلقات کا مجموعہ ہوتا ہے وہ کچھ ایسا ملا جلا اور پیچیدہ سا ہوتا ہے کہ کوئی درجہ انداز اس کے بارے میں یکساں نہیں ہو سکتے۔ ہم بڑی طور پر حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ شملہ معاہدہ کے بعد ہند و پاکستان کے درمیان تعلقات برابر بہتر ہوتے رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ رفتار سست رہی۔ تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بنیاد پکی رہی ہے اور کوئی خاص رکاوٹ بھی نہیں آئی ہے اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے اور ہوگی کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات اور دوستی کی رفتار جہاں تک ہو سکے تیز کی جائے۔ لیکن بنیاد پکی ہے اور اسے پکی بنائے رکھنے میں ہماری پوری کوشش ہونی چاہیے جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم شملہ معاہدے کے پابند ہیں اس سال کے آغاز میں ہماری وزیر اعظم نے صدر پاکستان کے نام اپنے پیغام میں اس بات کو دہرایا تھا کہ حکومت ہند اور ہند کے عوام پاکستان کی قومی سالمیت علاقائی استحکام سیاسی آزادی اور خودمختاری کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔ وزیر اعظم ہند نے حال ہی میں پاکستان کے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے دوبارہ کہا ہے کہ ایک مستحکم اور مضبوط پاکستان اور اس کے عوام کی ترقی ہندوستان کے لیے بالکل اسی طرح اہم ہے جس طرح خود پاکستان اور پاکستانی عوام کے لیے۔ مسز گاندھی کے یہ الفاظ اتنے واضح ہیں کہ وہ مزید کسی وضاحت کے محتاج نہیں

سوال: ہماری وزیر اعظم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی میرا خیال ہے پورے ملک کے جذبات کی ترجمانی انہوں نے فرمائی ہے اور آپ کا جو گہرا رشتہ عوام سے رہا ہے اور جس طرح اپنی زندگی میں تیس سے بھی زیادہ برسوں تک آپ عوام میں رہ کر کام کرتے رہے ہیں آپ کو یہ بھی احساس ہوگا کہ دونوں ملکوں کے عوام چاہتے ہیں کہ ان میں محبت اور دوستی کے تعلقات زیادہ سے زیادہ گہرے ہوں اور ان تعلقات کا اثر زندگی کے مختلف شعبوں میں مختلف سطحوں پر محسوس ہو اور یہ تعلقات عوامی سطح پر زیادہ بہتر بنائے جا سکیں اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ دونوں حکومتوں کو کیا اقدام اٹھانے چاہئیں۔

جواب: جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے دونوں ملکوں کے عوام گہرے دوستانہ تعلقات کے قیام کے خواہاں ہیں اس سلسلے میں کچھ اقدامات پہلے ہی کیے جا چکے ہیں۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں بڑی تعداد میں لوگ آجا رہے ہیں۔ تاکہ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کر سکیں ہم چاہتے ہیں کہ آمد و رفت کی رفتار اور تعداد میں مزید اضافہ ہو کیونکہ یہ ملاقاتیں اور دوستانہ مفاہمت اور خیر سگالی کو فروغ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کلچرل شعبوں میں بھی دونوں ملکوں کے درمیان زیادہ ربط ہو سکتا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان ادب علمی تحقیقات اور تعلیمی سرگرمیوں میں مشترکہ دلچسپیاں پائی جاتی ہیں دونوں ملکوں کے فن کاروں اور دانشوروں کے درمیان زیادہ گہری مفاہمت کا میری حکومت خیر مقدم کرے گی۔ مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ ان چیزوں میں وقت لگے گا لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے ہم اپنی جانب سے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں گے۔

سوال: ابھی آپ نے اشارہ کیا کہ ادیبوں اور دانش وروں کے بارے میں کہ اس علم و ادب کی سطح پر بھی ہم اپنے

تعلقات کو دونوں ملک اور زیادہ مضبوط بنا سکتے ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہمارے وزراء ہماری حکومت کے اراکین یا نمائندے دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو رسمی بات چیت میں سارا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے قیمتی وقت سے کچھ فرصت نکال کر پاکستان کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں یعنی یہ جو CROSS SECTION ہے جو نمائندگی کرتا ہے عوام کی اس سے بھی وہاں آپ کا کچھ ربط ضبط قائم ہوگا یا نہیں؟

جواب: جی ہاں! ویسے تو میں اپنے وقت کا مالک کامل نہیں ہوں لیکن پھر بھی پاکستانی عوام کے مختلف تہذیبی شعبوں سے تعلق رکھنے والے نمائندوں اور فنکاروں سے ملاقات کا بھی خواہش مند ہوں مجھے، جیسا کہ میں نے ابھی کہا اردو زبان و ادب سے کافی دلچسپی ہے اور میں چاہوں گا کہ ان ملاقاتوں کے ذریعہ پاکستان کے جدید ادبی رجحانات سے آگاہی حاصل کر سکوں۔ ویسے مجھے پڑھنے کا بہت کم وقت ملتا ہے تو شاید زبانی ہی کچھ پتہ چل جائے کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا کیا لکھا جا رہا ہے جب میں اردو ادب کا ذکر کرتا ہوں تو اس سے میرا اشارہ پاکستان کی مجموعی ادبی سرگرمیوں اور تخلیقی رویوں کی طرف ہے جو قوم کی زندگی اور طرز فکر کے آئینہ دار ہیں ان سرگرمیوں کے سمجھنے سے ملک کی زندگی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے کیونکہ میں مانتا ہوں کہ ادب عکاسی کرتا ہے زندگی کی اور یہ جاننا ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ یہ دونوں ملکوں کے عوام کو قریب لانے میں بھی معاون ہو سکتی ہے۔ اور ہوتی ہے اس کو اگر ہم نظر انداز کرتے ہیں تو زندگی کا ایک اہم پہلو ہم سے پوشیدہ رہ جاتا ہے۔ اور تعلقات کو بنانے کا جو سلسلہ ہے، جو ہماری کوشش ہے اس میں تھوڑی سی کمی آ جاتی ہے۔ اس کو شامل کرنے سے یہ مکمل ہو جاتا ہے ایسا میں سمجھتا ہوں۔

سوال: آپ نے بالکل صحیح اشارہ کیا کہ زندگی اور تہذیب کی روح شعر و ادب میں اور آرٹ میں نکھر کر آ جاتی ہے اور زندگی کا کوئی تصور اس وقت تک مکمل نہیں جب تک کہ ہم تخلیق اور آرٹ کی سطح پر بھی وہی ہم کلامی یعنی MENTAL COMMUNICATION کا رشتہ استوار نہ کریں آپ کے بارے میں تو ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ۔ مثال کے طور پر آپ کسی کہہ میں گئے۔ اور چونکہ آپ کی تعلیم و تربیت اردو ذریعہ تعلیم سے ہوئی ہے تو وہاں ایک صاحب اردو پڑھا رہے تھے اور آپ نے محسوس کیا کہ اس میں کچھ کمی ہے تو آپ نے خود ہی استاد کی جگہ اردو پڑھانی شروع کر دی تو یہ انسانی طریقہ کار ہے معاملات کو سمجھنے کا۔ یا معاملات کے تئیں رویہ مجھے یقین ہے کہ ان سب کار خیر کا بیڑا آپ نے اٹھایا ہے۔ ان میں آپ کو بے حد مدد ملے گی۔ کیا اس موقع پر آپ اپنے سننے والوں کے لئے کچھ پیغام بھی دینا چاہیں گے؟

جواب: پیغام تو کیا میں ان سے کچھ اپیل ضرور کرنا چاہوں گا۔ میں اپنے مجوزہ دورہ پاکستان کو وقت کی ایک اہم ضرورت تصور کرتا ہوں۔ میں دوستی اور خیر سگالی کا پیغام لے کر جا رہا ہوں اور دونوں ملکوں کے عوام سے میری درخواست ہے کہ وہ ہند و پاکستان کے تعلقات زیادہ پختہ اور شگفتہ اور ہمارے قومی ورثے کے وقار کے مطابق بنانے میں تعاون کریں۔

سوال: آپ نے دوران گفتگو فرمایا تھا کہ پاکستان کی ترقی پاکستان کی خوشحالی اور ہمارے پڑوسی ملک پاکستان کی ترقی مضبوطی ایک طرح سے خود ہماری مضبوطی ہے۔ اس سے نہ صرف امن کے رشتے اور محبت کے رشتے مضبوط ہوتے ہیں بلکہ عوام کی سطح پر بھی بہتر زندگی کا خواب دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ جس اہم کام پر تشریف پاکستان لے جا رہے ہیں اور جو انسانی اور فنکارانہ رویہ ہے آپ کا۔ ایک ادیب اور شاعر کا دل آپ کے پہلو میں دھڑکتا ہے اور سیاست کا جو تجربہ دست ہے آپ کو حاصل ہے مجھے یقین ہے کہ ان سب چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے آپ کے دورہ پاکستان کا اثر دونوں ملکوں کے تعلقات پر بہت ہی خوشگوار مرتب ہوگا بہت بہت شکریہ۔

(آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے نشر کیا گیا)





...باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کا لاڈلا دُنیا کی آنکھ کا تارا بنے۔ صرف اُن کا ہی نہیں، قوم کا ملک کا بھی نام روشن کرے، دُنیا کی ...کا بوجھ اٹھائے۔ یہ خواہش اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر آپ نے اس سلسلہ میں کیا کچھ کیا ہے۔ اس کی ابتداء پنگوڑے میں ہی کرنی چاہئے ...کو "ممتا" دیجئے یہ ننھے بچوں کا خاص ٹانک ہے جو ایک ماں کی طرح ان کی حفاظت کرتا ہے جسم میں کیلشیم کی کمی کو دُور کرکے ...کے ٹیڑھے پن کو روکتا ہے۔ ننھے بے زبان بچوں کو قبض سے نجات دلاتا ہے۔ نزلہ اور زکام میں بھی مفید ہے۔ بچوں کو ہنستا اور خوش و خرم "ممتا" کا کام ہے۔ اپنے بچے سے پیار ہے تو اسے "ممتا" ہی دیجئے اور دیکھئے وہ کتنی جلدی جلدی پروان چڑھتا ہے۔

...: چھ پیسے
ممتا: تین روپے پچاس پیسے

شمع (یونانی اینڈ آیورویدک)، لیبارٹریز بلال محل، دہلی

ٹیلیفون نمبر ۲۰۵۱۰۳ رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا رجسٹریشن نمبر ۹۴۴/۵۰ رجسٹرڈ نمبر ۹۴۴۷

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر قطرۂ وطن سے ہے مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
(فیاض گوالیاری)

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

زر سالانہ ۱۵/- روپے
فی پرچہ 1/50 روپے

جلد نمبر ۲۲ | ستمبر ۱۹۸۱ء | شمارہ نمبر ۹

ہندی کے مسلمان شعراء

۱۔ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد پر ایسی مفید کتاب آج تک اردو زبان میں شائع ہوئی ہے نہ ہندی میں۔

۲۔ اس کتاب کو پڑھنے سے اردو اور ہندی کے خود ساختہ نام نہاد دانشور جو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اردو اور ہندی کی بقا و حیات کے ضامن بنے بیٹھے ہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے جو کام سرکار سے ہتھیائے لاکھوں روپیہ سے نہ ہو سکا اور جو کام اردو اور ہندی کے یہ نام نہاد دانشور آج تک نہ کر سکے وہ ایک فرد واحد نے اپنی لگن کے باعث پورا کر دیا۔

۳۔ اس کتاب نے ہندی مسلمانوں کا سر اونچا کر دیا ہے اور وہ ثبوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی زبان کی نشو و نما اور ترقی میں جو کردار مسلمانوں نے ادا کیا ہے اسے ہندی زبان فراموش نہیں کر سکتی، اور ہندی کے مسلمان اس سلسلے میں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے کوسوں آگے دکھائی دیتے ہیں۔

۴۔ اس کتاب کو پڑھنے والا ہر ہندی داں لیکھک کا گن گان کرے گا اور ہر اردو داں مصنف کو دعائیں دے گا کہ جس نے اردو ادب کو ایسی بیش بہا تصنیف سے مالا مال کیا۔

۵۔ ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی، انجمن ترقی اردو ہند اور ریاستی اردو اکاڈمیوں کے ذمہ دار لوگ اس میں شاید غیرت کے جذبے کا اثر دکھانے لگیں اور وہ ندامت محسوس کریں کہ انھوں نے سرکاری یعنی عوامی کروڑہا روپیہ اردو کے اکثر غیر مفید اور غیر ضروری کتابیں شائع کرکے محض اپنوں کو فائدہ پہنچایا اور ہندی کے مسلمان شعراء ایسی بیش بہا اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار تصنیف کو شائع کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

۶۔ آپ ہمارے اس دعوے کی صداقت کی جانچ کے لئے یہ کتاب پڑھئے اگر آپ ہماری اس تحریر کی حرف حرف تائید نہ فرمائیں تو کتاب واپس کر کے اس کی پوری قیمت لے لیجئے۔ حضرت پنڈوری نے اپنی زندگی کے عزیز ترین پچاس سال اس کتاب کی تالیف پر صرف کئے اور اپنی زندگی بھر کا سرمایہ اس کتاب کے لئے مواد فراہم کرنے پر لگا دیا اور اس کتاب کو ہر پہلو سے مستند بنانے کے لئے فاضل مؤلف نے ہزارہا کتابوں کا مطالعہ کرنے میں اپنی زندگی کو قربان کر دیا۔ یہ نادر روزگار کتاب ہندی کے مسلمان شعراء شائع ہو گئی ہے پہلی فرصت میں منگا لیجئے۔ قیمت ۵۱/- روپے

مزید معلومات کے لئے۔ دفتر شانِ ہند، نئی دہلی ۲ سے رجوع کیجئے۔

ودیا پرکاش سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلیشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چتلی قبر مٹکو، جامع مسجد، دہلی میں چھپوائے۔ اور ٹائمس پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

عالمی اردو کانفرنس اور اتر پردیش اردو اکاڈمی

اتر پردیش اردو اکاڈمی کو لاکھوں روپیہ کی سرکاری امداد ملتی ہے۔ مگر اس کی کارکردگی کا یہ عالم ہے کہ دس سال کے طویل عرصہ میں صرف بیالیس کتابیں شائع کی ہیں جب کہ شانِ ہند ایسے معمولی ادارے نے جو صرف "دن میں شو" ہے ایک سال میں پانچ کتابیں شائع کی ہیں اور یہ پانچ کتابیں جو شائع ہوئی ہیں اُن کی اہمیت اکاڈمی کے شائع کردہ درجنوں کتابوں پر بھاری ہے۔ اکاڈمی کا "خبر نامہ" جنوری ۸۲ء سے شائع نہیں ہوا۔ اور اکاڈمی کے "آرگن" اکاڈمی کا صرف ایک شمارہ شائع ہوا ہے۔ جبکہ شانِ ہند ایسا ماہنامہ ہر ماہ شائع ہو رہا ہے اکاڈمی کے منتظمین نے ...... اکاڈمی کے "آرگن" "اکاڈمی" کی پبلسٹی پر ہزاروں روپیہ کے اشتہارات دوسرے رسائل و اخبارات میں شائع کرائے۔ اسی طرح اکاڈمی کی مطبوعات کی پبلسٹی پر بھی بیش بہا روپیہ صرف کیا گیا۔ مگر ہمارا دعویٰ ہے کہ اشتہارات کی اجرت پر جو روپیہ برباد کیا گیا اس کا دس فیصدی بھی کتابوں کی فروختگی اور "اکاڈمی" کے خریداروں کے زرِ سالانہ سے وصول نہیں ہوا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اکاڈمی نے جن حضرات کے سپرد پبلسٹی کا کام سونپا انھوں نے ایسے رسائل جرائد میں اشتہارات دیئے جن کے مدیران کرام سے ان کے ذاتی تعلقات تھے یا یہ جرائد و رسائل اکاڈمی کی جھوٹی تعریفوں میں قصیدے لکھتے رہے سرکاری روپیہ پبلسٹی کے بہانے کتنی بے دردی سے برباد کیا گیا اس کے متعلق اگر کسی عدالت میں اکاڈمی کو چیلنج کیا جائے تو اصل صورتِ حال عوام اور سرکار کے سامنے آجائے۔ مگر سرکار کہتی تو عوام کا کوئی پرواہ ہے اور نہ عوامی روپیہ کا [illegible] [illegible] اردو کے نام پر دو ٹوں کی ضرورت ہے اگر مسلمان ایسی [illegible] سے خوش ہو سکتے ہیں تو بہ جماعت سودا ہے۔ اور سرکار [illegible] سے کیوں نہ فائدہ اٹھائے۔ اور یہی [illegible] اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ نے عالمی اردو کانفرنس کے لئے لاکھوں روپیہ کی رقم منظور فرما کر اس کی تمام تر ذمہ داری اتر پردیش اردو اکاڈمی کو سونپ دی۔ اور اتر پردیش اردو اکاڈمی کے صدر جناب علی جواد زیدی کس سادگی سے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ "اردو کے فروغ سے متعلق مختلف مسئلوں پر یہ کانفرنس غور کرے گی۔ ان میں تعلیم سے متعلق مسئلے بھی شامل ہوں گے۔ اور چونکہ اس اجتماع میں دنیا بھر کے اہل علم مدعو کئے جا رہے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ بعض ایسے [illegible] ہو جائیں جو ابھی تک تاریکی میں ہیں یا جن کی طرف لوگوں کی [illegible] عام طور پر نہیں جاتی۔"

ہم علی جواد زیدی صاحب سے نہایت ادب سے دریافت کرتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ یہ فرمایا ہے کیا وہ حقیقت ہے [illegible] ہیں کہ انھوں نے یہ سب کچھ ایمانداری سے کہا ہے؟ کیا وہ واقعی ایسا سمجھتے ہیں؟ کہ

(۱) ہندوستان بھر میں اردو کے فروغ کے سلسلے میں [illegible] آج تک سوچا گیا ہے کیا اس میں غیر ملکی [illegible] کوئی مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔

۲۔ اردو کی تعلیم کے بارے میں جو کچھ ہندوستان [illegible] نے سوچا ہے کیا غیر ملکی حضرات اس [illegible] کر سکتے ہیں؟

۳۔ کیا واقعی اردو کے [illegible] [illegible] [illegible] ہیں؟ [illegible]

ہیں کہ ان کی نگاہیں ایسے نکموں تک جا ہی نہ سکیں۔؟

ہمارے نزدیک تو علی جواد زیدی صاحب نے یہ کہہ کر اپنے ملک کے دانشوروں اور اپنے ملک کے ماہر تعلیمات حضرات کی توہین کی ہے۔ اور محض اردو عالمی کانفرنس کے لئے جو کروڑ روپیہ ان کے ہاتھوں میں آنے والا ہے اُسے برباد کرنے کی راہوں کی تلاش میں یہ سب کچھ کہہ گیا ہے۔ اور اگر انھوں نے واقعی بےلاگ طور پر یہ سب کچھ کہا ہے تو پھر وہ کسی ایک ایسے نکتے کی نشاندہی فرمائیں جس پر اہل ملک نے یا اُردو کے ہندوستانی دانشوروں نے نگاہ نہ ڈالی ہو۔

اور اگر ان غیر ملکی مندوبین نے سر محفل کانفرنس میں زیدی صاحب سے یا وزیر اعلیٰ سے یہ پوچھا تو ان کے پاس کیا جواب ہوگا۔

۱۔ جبکہ وزیر اعلیٰ نے بڑے طمطراق سے یہ اعلان فرمایا کہ ۱۹۸۱ء کے خاتمے تک وہ اردو کو صوبے کی دوسری زبان قرار دے دیں گے تو اسمبلی کے مون سون اجلاس کے ایجنڈے میں اُردو کے سلسلے کوئی بل تھا ہی نہیں؟ حالانکہ اس اجلاس میں بل پیش کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

۲۔ آپ کے وزیر اعلیٰ اُردو کو صوبے کی دوسری سرکاری زبان قرار دینے کے بلند بانگ دعوے کر رہے ہیں مگر اُن سے آج تک نہ ہو سکا کہ وہ اپنے سکریٹریٹ میں اُردو رپورٹنگ کا کوئی محکمہ ہی قائم کر دیتے۔ لہٰذا اُردو کے اخبارات میں جو کچھ اُردو کے سلسلے میں لکھا جاتا ہے اس کے بارے میں وزیر اعلیٰ کے یہاں مکمل بلیک آؤٹ ہے۔

بتائیے زیدی صاحب آپ اہل ملک کو یا دوسرے ممالک کے اُردو دوستوں یا مجوزہ عالمی اُردو کانفرنس میں شریک ہونے والے بیرونی نمائندوں کی تسلی کے لئے جو چاہے کہہ لیجئے مگر صورت حال یہ ہے کہ آپ کے صوبے کے وزیر اعلیٰ اب اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ وہ اپنے اس وعدے کو پورا کر سکیں جو انھوں نے بیسیوں جلسوں میں بڑے طمطراق سے کئی بار کیا ہے۔ ان کی پارٹی کے ممبران کی جائز تعداد ان کے اس وعدے پر ناراض ہے [illegible] یہ وزارت اعلیٰ بار بار توڑنے سے متعلق ہے۔ ایسے [illegible] پتہ نہیں نہ جانے کتنی بار کانگریس نے بھی

جا کرتے ہیں کہ ڈھونڈنے سے بھی اُن کا نام و نشان نہیں ملتا۔ اس لئے آپ اپنے صوبے کے مندرجہ ذیل اُردو دانشوروں کے ان فرمودات کو دھیان سے پڑھئے۔ جو لکھنؤ کی مختلف اُردو تنظیموں کے نمائندوں اور دانشوروں نے اپنے ایک جلسے میں ایک قرارداد کے ذریعے وزیر اعلیٰ مسٹر وشوناتھ پرتاپ سنگھ سے اپیل کی ہے کہ مجوزہ عالمی اُردو کانفرنس کے انعقاد کو اس وقت تک کے لئے ملتوی کرا دیں جب تک اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل نہ ہو جائے۔ اس قرارداد میں وزیر اعلیٰ کا اس بات کے لئے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہ انھوں نے اُردو کو رواں سال کے آخر تک ایک ایکٹ کے ذریعے اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلا دیں گے اس بات پر زور دیا کہ اس کام کو اس سال کے آخر تک ضرور کر دیا جائے۔

جلسے میں جو آل انڈیا اُردو سبھا کے زیر اہتمام جمعیت بلڈنگ میں مسٹر کنھیا لال مہندرو ایم ایل اے کی زیر صدارت ہوا۔ مقررین نے عام طور پر رائے ظاہر کی کہ اُردو کے نام پر عالمی کانفرنس کا انعقاد کرنے سے قبل اُردو کا ماحول قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ صدر جلسہ نے تو یہاں تک کہا کہ اردو ریاست کی پہلی سرکاری زبان بننا چاہئے تھا۔ لیکن اب کم سے کم اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے میں تاخیر نہیں کرنا چاہئے۔ مسٹر ہاشم رضا عابدی الہ آبادی ایم ایل سی نے اس مجوزہ کانفرنس کو حکومت اور ملک کو رسوا کرانے کی ایک سازش قرار دیا۔ مسٹر حیات اللہ انصاری نے کہا کہ کانفرنس کے لئے سب سے بہتر مقام کشمیر یا مدھیہ پردیش یا بہار یا مہاراشٹر ہے لیکن یوپی میں جہاں اُردو میڈیم اسکول کا نام بھی نہ لیا جاتا ہو وہاں ایسی کانفرنس کا بلایا جانا ملک کی رسوائی اور جگ ہنسائی ہے جمعیت علماء یوپی کے نائب صدر مولانا عبدالرؤف خاں نے یوپی میں اُردو کی بقا کے لئے عربی مدارس کا خراج تحسین پیش کیا مسٹر حفیظ نعمانی نے اُردو اکاڈمی کے چیئرمین ڈاکٹر محمود الٰہی کے ایک مضمون کے الفاظ دہرائے جس میں انھوں نے یوپی میں اُردو کی خستہ حالی کا ذکر کیا تھا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب کے ان احساسات

کے بعد اب بمبئی میں کسی عالمی کانفرنس کی بات اس وقت تک مضحکہ خیز ہے جب تک یہاں اُردو کو سرکاری درجہ نہ مل جائے۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے اُردو اکادمی پر الزام لگایا کہ وہ محبانِ اُردو اور حکومت کے درمیان رابطہ میں دیانت داری سے کام نہیں لیتی اور حکمراں طبقے کو گمراہ کرتی ہے۔ مسٹر اطہر نبی ایڈوکیٹ نے حیرت ظاہر کی کہ اکاڈمی عالمی کانفرنس کے سلسلے میں اخراجات کس مد سے کر رہی ہے۔ آخر میں مسٹر محمد رفیع صدیقی ایم ایل اے نے شکریہ ادا کیا۔ جلسے کی نظامت مسٹر رفیق انصاری نے کی۔

بُری عادت کوئی بھی ہو بآسانی نہیں جاتی

مرحوم ہری چند اختر کے مندرجہ بالا مصرع کی صحیح تفسیر دیکھنی ہو تو جناب قاضی سید عرشی کاظمی جرنلسٹ ناظم بزمِ عروض و فن کے اُن خطوط کا مطالعہ کیجئے جو اُنھوں نے اپنی لکھی ہوئی روداد مشاعرہ نمائش بجنور کی اشاعت کے سلسلے میں مدیر شانِ ہند کو لکھے۔ آیئے آپ بھی اس دُنیا کے آٹھویں عجوبے کے مکتوبات گرامی کے کچھ اقتباسات سے لُطف اُٹھایئے۔

۱۔ "کمنٹری پر آپ کے ریمارکس میں مزہ نہیں آیا۔ براہِ کرم کچھ اور لکھئے۔ سرمد صاحب اس قسم کی باتوں سے آپ کا حلقۂ احباب ہی محدود ہوگا۔"

۲۔ "سرمد صاحب! مَیں نے آپ کے اعتراضات پر کسی قسم کی شکایت نہیں کی بلکہ آپ کے بہت بڑے نقصان پر افسوس کا اظہار کیا کہ آپ نے خود پر ہی ظُلم کیا۔ آج وہ بیس کاپیاں پڑی رہ گئیں جنہیں اُن دوستوں تک پہنچنا تھا جو شانِ ہند کے پچاس روپیہ سالانہ کے خصوصی خریدار بننے جا رہے تھے (یاد رہے کہ عرشی صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ جس شمارے میں اُن کی یہ روداد شائع ہو اس کی بیس کاپیاں انھیں وی پی سے بھجوا دی جائیں۔ کیوں کہ انھوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ مدیرانِ رسائل غلط سلط مضامین اس لالچ میں شائع کر دیتے ہیں)

۳۔ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو گزشتہ اعتراضات کی تردید شائع کر دیں۔ تردید کے لئے یہ جواز کافی ہے کہ آپ اپنی غیر موجودگی کا اظہار کرتے ہوئے خوش اسلوبی کے ساتھ بات نبھا لیں۔"

عرشی صاحب کی کمنٹری کیا شائع ہوئی کہ مُلک بھر سے تو کیا کویت اور ناروے تک سے خطوط آئے جن میں عرشی صاحب کو ایسا سراہا گیا کہ اگر اُن تمام خطوط کو شائع کیا جائے تو عرشی صاحب شاید ہندوستان چھوڑ کر وہاں چلے جائیں جہاں کے لئے وہ اپنے اشعار میں اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اور فرقہ وارانہ ذہنیت کا اظہار فرماتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کی روداد مشاعرہ شائع کر کے مفت میں گیارہ صفحات ضائع کئے گئے اور اس بکواسِ محض کے سلسلے میں جو سینکڑوں خطوط موصول ہوئے ہیں انھیں شائع کر کے مزید صفحات کیوں ضائع کئے جائیں مگر کیا غضب ہے کہ جو شخص ہر جمعہ کو نہانے کے لئے بھی مسجد کے غسلخانے کا رہینِ منت ہو وہ شانِ ہند کے لئے پچاس پچاس روپیہ کے خصوصی خریدار فراہم کرتا۔ عرشی صاحب کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ آئندہ ایسی بے تکی باتوں سے احتراز فرمایا کریں اور اپنی غلطی کا اعتراف کر کے توبہ کر لیں کہ اپنی عروض دانی، علمی لیاقت اور ادبی فہم و فراست کا جھوٹا دعویٰ نہیں کریں گے۔ مگر انھوں نے جواب میں اُلٹے ایڈیٹر شانِ ہند کی تحریر کو قواعد کے اوزان پر پرکھنا شروع کر دیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایڈیٹر شانِ ہند پنجابی نژاد ہے نہ تو اسے زبان داں ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ اہلِ زبان ہونے کا۔ اگر کسی نے ایڈیٹر شانِ ہند کی کسی تحریر کی صحیح اصلاح فرما دی تو اُسے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا گیا اور ہمیشہ ایک طالب علم کی حیثیت میں سیکھنے کی تمنا رکھی۔

عرشی صاحب کے مشورے پر تردید شائع نہیں کی گئی اور نہ ہی اُن کے خصوصی خریداروں کا لالچ ہمیں اس قسم کے بیہودہ اور ناپسندیدہ شخص سے کسی قسم کا ادبی و علمی تعاون رکھنے پر مجبور کر سکا۔ تو عرشی صاحب نے اپنے خطوط کا اندازِ تحریر ایسا اختیار کر لیا کہ بھی بے تکلیفات لکھ کر ان کی خدمت میں کچھ ایسی پڑی کہ کُتّے کی دُم کو بارہ سال تک حقّے کی نئے میں رکھا گیا اور جب نکالا گیا تو وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی تھی۔

(باقی آئندہ)

اُردو کا "نو مسلم" وشوا ناتھ طاؤس

محترمہ مہا دیوی ورما کے بعد اُردو مخالف بیانات کی رسائل و جرائد نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے مگر

کسی بھی بیان دینے والے نے یا اداریہ لکھنے والے نے اس قدر غیر مہذبانہ، تشدد و تلخ اور غیر ذمہ دارانہ اندازِ تحریر کا سہارا نہیں لیا۔ جیسا کہ جناب وشوا ناتھ طاؤس نے اپنے اس خط میں استعمال کیا ہے جو کہ ہفت روزہ اورینٹل گزیویٹ کی ۱۴ ستمبر کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

کہاوت ہے کہ مسلمان تو پانچ وقت نماز کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور نو مسلم سات مرتبہ نماز پڑھتا ہے تاکہ اس کے تبدیلیِ مذہب کے بارے میں مسلمانوں کو یقین آجائے۔ عین یہی وطیرہ جناب وشوا ناتھ طاؤس نے بھی اختیار فرما رکھا ہے یعنی جب سے وہ انجمن ترقیِ اُردو ہند کی مجلسِ عاملہ کے رُکن منتخب ہوئے ہیں انھوں نے اس روایتی نو مسلم کا کردار ادا کرنا شروع رکھا ہے جو کہ اپنے احساسِ کمتری کی پردہ دری کے لئے وقت بے وقت نماز پڑھنے کا مظاہرہ کرتا ہے۔

جناب وشوا ناتھ طاؤس نے اپنے اس کھلے خط میں لکھا ہے کہ "ہندو ہونے کے ناطے عورت کا احترام مجھ پر فرض ہے۔" جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہندوؤں کے سوا کسی دوسرے مذاہب میں عورت کا احترام نہیں کیا جاتا۔ افسوس ہے کہ اورینٹل گزیویٹ کے فاضل مدیر جو خیر سے مسلمان ہیں انھوں نے وشوا ناتھ طاؤس صاحب ایسے "ہندو نو مسلم" کا یہ کھلا خط چھاپتے وقت اس کا بھی خیال نہیں رکھا کہ طاؤس صاحب کے خط کشیدہ فقرے سے خود مسلمانوں پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ ان کے ہاں عورت کا احترام نہیں کیا جاتا۔

وشوا ناتھ طاؤس صاحب مدیرِ شانِ ہند کو اپنا بزرگ مانتے ہیں اور وہ اکثر اس کا اعلان بھی کرتے ہیں کہ مدیرِ شانِ ہند اور جناب جمنا داس اختر ان کے صحافتی گرو ہیں۔ مگر انھوں نے اپنے اس کھلے خط میں جس قدر مہذب اور غیر مہذب گالیاں محترمہ مبارکی صاحبہ کو دی ہیں اس سے یقیناً جمنا داس صاحب اختر مدیرِ "سویرا" کو بھی اتفاق نہیں ہوگا اور مدیرِ شانِ ہند تو اسے طاؤس صاحب کی بہت بڑی حماقت ہی نہیں "چاپلوسی" بھی قرار دیتا ہے۔ کاش کہ مدیرِ "اورینٹل گزیویٹ" اور دیگر مدیرانِ کرام اس قسم کے چاپلوسانہ بیان شائع کرنے سے پہلے غور بھی کر لیا کریں۔

غزلیں

شاہد رتلامی (کویت)

جو نظر نہیں آتا آج ان اُجالوں میں
روشنی مقید ہے تیرگی کے حالوں میں
آگ سی سُلگتی ہے آج دل کے چھالوں میں
بجلیاں سمٹ آئیں درد کے خیالوں میں
سُرخ کیں صلیبیں بھی خون بھی کیا روشن
زہر بھی پیا ہم نے شہد کے پیالوں میں
آج تم حقارت سے دیکھ لو ہمیں لیکن
ذکرِ حق چلے گا جب ہوں گے ہم نوالوں میں
زندگی ہے بوسیدہ آج اس عمارت سے
جو نظر نہیں آتی مکڑیوں کے جالوں میں
گردشِ زمانہ ہے یا کہ گردشِ قسمت
آج ہم بھی تنہا ہیں اپنے خیالوں میں
مسجدوں کے میناروں سے جس کی راہ تکتے ہیں
ہم نے اس کو اے شاہدؔ پا لیا شوالوں میں

○ ○

خلیل انجم کامٹوی

مجھے رند کہنے والے ذرا سامنے تو آئیے
یہاں کتنے پارسا ہیں مجھے نام تو بتائیے
تھے جو لوگ جرم پیشہ وہ امیرِ قوم ٹھہرے
تھے غریبِ شہر جتنے انھیں دی گئیں سزائیں
یہ وفا کی رہگزر ہے یہ مقام پُرخطر ہے
جنہیں خوفِ جان و دل ہے مرے ساتھ وہ نہ آئیں
مرے گھر کی مُفلسی کا کہیں پڑ نہ جائے سایہ
مرے دوستوں سے کہہ دو کہیں اور آئیں جائیں
نہیں بھیجتے نہ بھیجیں کوئی خط کوئی پیام
وہ ملیں صبا تو کہنا مجھے یاد بھی نہ آئیں
ترے یاد کے دئے ہیں مرے دل میں اب جلا کر
مری زندگی کا حاصل تری دلنشیں ادائیں
یہ شعورِ شعر و نغمہ مجھے کہیں مٹا نہ دے انجمؔ
مجھے خود سا لگ رہا ہے مرے دوست کی دعائیں

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

قریباً تیس سال پہلے ایک دن دفتر "شانِ ہند" میں ایک صاحب تشریف لائے۔ بال بکھرے ہوئے۔ چہرے پر گرد تھی آنکھیں سُرخ جن سے وحشت ایسے ٹپک رہی تھی کہ یا تو ابھی کسی کو قتل کر کے آئے ہیں یا کسی کی خیر نہیں۔ پاؤں میں معمولی قسم کی چپل جس کی مرمت کئی بار ہو چکی تھی۔ پتلون میلی اور قمیض میلی تو تھی ہی اس کے بٹن بھی داغِ مفارقت دے چکے تھے۔

دروازے میں قدم رکھتے ہی میرا نام لیتے ہوئے رواں دواں انگریزی بولنے لگے مجھے ڈاکٹر شراف آئی سپیشلسٹ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میں نے متحیر انداز میں عرض کیا فرمایئے کیا حکم ہے انھوں نے پھر فصیح و بلیغ انگریزی میں جواب دیا کہ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو میں کچھ بیان کروں۔ میں نے صرف یہی کہا تشریف رکھیے۔ انھوں نے کرسی پر بیٹھتے ہی انگریزی میں کچھ کہنا شروع ہی کیا تھا کہ میں نے معافی چاہتے ہوئے گزارش کی اگر آپ اُردو میں بولیں تو میرے لیے آسانی ہو گی کیونکہ میں انگریزی میں ایسی دسترس نہیں رکھتا کہ آپ کی فصیح و بلیغ انگریزی کو پوری طرح سمجھ سکوں اور اسی انداز میں جواب دے سکوں۔ انھوں نے قدرے ندامت کے انداز میں سوری SORRY کہہ کر ایسی زبان میں بات کرنی شروع کی جس میں اُردو بیچاری پھر بھی گھاٹے میں تھی کیونکہ وہ ہر دو ایک فقرہ کے بعد انگریزی میں ہی بولنا شروع کر دیتے تھے اور بار بار SORRY بھی کہتے جا رہے تھے۔

فرمانے لگے میرا نام ڈاکٹر مدان ہے۔ میں نے ڈی لٹ لندن سے کیا اور کراچی میں سندھ آبزرور (SIND OBSERVER) کا ایڈیٹر تھا۔ اب رفیوجی کی حیثیت سے دہلی کنگز وے کیمپ میں مقیم ہوں۔ میری بیوی ہے اور دو لڑکیاں ہیں جن میں ایک ایم۔ اے ہے اور دوسری بی۔ اے۔ کیمپ میں کچھ دنوں تک امریکن کیبوٹ ریلیف فری لنگر کے طور پر ملتا رہا اب وہ بھی بند ہو چکا ہے۔ کبھی کبھی تو فاقے گزر جاتے ہیں۔ ہم تو خیر کچھ درختوں کے پتے نمک سے کھا کر پانی پی لیتا ہوں مگر میری بیٹیاں جب بھوک سے بے حال ہوتی ہیں تو دیکھا نہیں جاتا۔ میں نے ہر ممکن طور پر کوششیں کر لی ہیں کہیں بھی ملازمت نہیں ملتی۔ آج ڈاکٹر شراف کے یہاں گیا تھا کہ وہ اپنے ہسپتال میں کوئی کام دے دیں تو انھوں نے آپ کا نام اور پتہ لکھ دیا کہ میں آپ سے ملوں آپ ضرور کہیں نہ کہیں کام دلوا دیں گے۔ ڈاکٹر مدان سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے یکایک کانپنے لگے اور انتہائی غصے کی حالت میں انگریزی میں کہنے لگے یہ مہاتما گاندھی کی چیلی جو آپ کی دلی کی ہیلتھ منسٹر ہے ڈاکٹر سشیلا نائیر کل کیمپ میں کپڑے بانٹنے آئی تھی۔ ہمیں بھی ایک کمبل اس نے دیا تو میری بڑی لڑکی نے اسے ٹھکراتے ہوئے کہا کہ آپ ہیلتھ منسٹر ہیں کیا یہ کمبل اس لائق ہے کہ اسے اوڑھا جائے اور کیا اس کمبل کو اوڑھنے والا صحت مند سے صحت مند آدمی بھی کئی بیماریوں کے جرمز GERMS میں اپنے آپ کو گھرا ہوا نہیں پائے گا۔ تو اس پر ڈاکٹر سشیلا نائیر نے بڑی بے رخی اور توہین آمیز کلمات میں کہا کہ اتنے نواب تھے تو سیسل ہوٹل میں ٹھہر جاتا (ان دنوں سیسل ہوٹل دلی کا ایک قابلِ ذکر ہوٹل تھا) یا پاکستان میں ہی مسلمان ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد نہ جانے غصے میں ڈاکٹر مدان بیچارے "گاندھی کی چیلی" کو کیا کیا کہتے رہے۔ ابھی ان کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا کہ میری بیوی کھانا لے کر آ گئیں۔ ان دنوں میری رہائش محلہ سوئیوالان چاندنی محل میں تھی اور دوپہر کا کھانا بیوی دفتر میں ہی لے آتی تھیں۔ میں نے بیوی سے کہا کہ وہ کھانا برآمدے میں میز پر لگا دے دو چار منٹ بعد میں نے ڈاکٹر مدان سے التجا کی کہ آپ کھانا کھا لیجیے۔ وہ میرے ساتھ برآمدے میں آئے تو کہنے لگے کہ کھانا تو آپ کے لیے آیا ہے میں بن بلایا مہمان کیسے کھا لوں۔ میں نے انتہائی عاجزی سے پھر گزارش کی کہ آپ کھانا شروع کیجیے میری طبیعت خراب ہے اگر آپ تشریف نہ بھی لاتے تو بھی میں کھانا نہیں کھاتا۔ [illegible]

کھانا شروع کیا۔ اور آپ یقین مانیے کہ ہم دونوں میاں بیوی کا کھانا وہ چٹکی بجانے میں ختم کر چکے تھے (ان دنوں آس پاس سوائے موتی محل کے کوئی دوسرا ہوٹل یا ڈھابہ بھی نہ تھا کہ جلدی اور پر میں کھانا لے آتا۔ اور ان دنوں میرے ہاں کوئی چپڑاسی یا کلرک بھی نہ تھا کہ اسے بھیج کر موتی محل سے کھانا منگوا لیا جاتا) ہم میاں بیوی نے محسوس کیا کہ کھانا ڈاکٹر مدان کے لئے بہت ہی کم رہا ہے مگر یہ ضرور تھا کہ ڈاکٹر مدان کے پیٹ میں کھانا جانے سے ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی اور ان کے بولنے کے انداز میں کسی حد تک شگفتگی بھی جھلکنے لگی تھی۔

دفتر شانِ ہند کے نیچے چائے کی دوکان تھی (جو اب کھانے کا ڈھابہ بن چکا ہے) میں نے بیوی سے اشارتاً کہا کہ وہ نیچے جائے اور چائے والے سے کہہ آئے کہ تین چائے اور کم از کم دس بارہ ٹوسٹ مکھن لگا کر بھجوا دے۔ بیس منٹ کے بعد چائے والے کا ملازم چائے اور ٹوسٹ لے کر آیا۔ میں نے اور میری بیوی نے دو دو ٹوسٹ کھائے اور باقی ہم نے اصرار کر کے ڈاکٹر صاحب کو ہی کھلائے۔ ایک چائے کے ساتھ آٹھ ٹوسٹ کھانا مشکل تھا لہٰذا ایک چائے اور منگائی گئی۔ اب ڈاکٹر صاحب نے پھر انگریزی میں کہا کہ اگر ہم محسوس کریں تو وہ کچھ دیر سونا چاہیں گے۔ میں خود کھانے کے بعد دوپہر کو ایک گھنٹہ سونے کا عادی ہوں چنانچہ میں نے دفتر میں ہی ایک چٹائی اور تکیہ رکھ چھوڑا تھا۔ چنانچہ میں نے چٹائی برآمدے میں بچھا دی اور ڈاکٹر صاحب پانچ دس منٹ بعد گہری نیند سو رہے تھے۔ بیوی سے میں نے کہا کہ وہ گھر جائے اور چار بجے تھرمس میں چائے بھر کر لے آئے اور پھاٹک گھنٹی والان سے مونگ کی دال والے سموسے اور کچھ بسکٹ وغیرہ بھی لے آئے۔

ڈاکٹر صاحب سوا چار بجے سو کر اٹھے تو ان کے چہرے پر زندگی کے آثار ابھر آئے تھے۔ پھر انگریزی کے بڑے خوشنما الفاظ میں شکریہ ادا کرتے ہوئے میرے پاس آ بیٹھے۔ بیوی نے میری میز پر ہی چائے اور کھانے کی کچھ چیزیں رکھ دیں اور ہم نے باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحب کو چائے کم پلائی اور کھلایا زیادہ۔ پانچ بجے دفتر بند کرتے ہوئے میں نے ڈاکٹر مدان کے ہاتھ میں ایک لفافہ جس میں معمولی رقم تھی تھماتے ہوئے مودبانہ گزارش کی کہ آپ کل صبح دس بجے ہی تشریف لے آیئے گا۔ آپ کا سب انتظام کر دیا جائے گا۔ انہوں نے لفافہ لینے سے انکار کیا تو میں نے دست بستہ عرض کیا کہ یہ آنے جانے کے لئے اخراجات ہیں چھوٹے بھائی کی طرف سے قبول فرما لیجئے۔ ڈاکٹر صاحب نے حسب عادت انگریزی میں شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی راہ لی اور ہم دونوں میاں بیوی چاندنی محل آ گئے۔

اگلے روز حسب وعدہ وقت مقررہ پر ڈاکٹر مدان تشریف لائے۔ ان دنوں بیسویں صدی کا دفتر ترکمان گیٹ کے باہر تھا۔ اور خوشتر گرامی کے خلاف سردار دیوان مفتون نے بیسویں صدی والوں کی مبینہ بددیانتی کے خلاف جہاد شروع کر رکھا تھا۔ چونکہ میں سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست کا ادنیٰ خادم تھا۔ اس لئے میری تمام تر خدمات سردار صاحب کے لئے وقف تھیں۔ چنانچہ خوشتر گرامی صاحب مجھے بھی اپنے مخالفوں میں ہی سمجھتے تھے۔ مگر میں ڈاکٹر مدان کو لے کر بلا جھجک ان کے دفتر میں گیا اور خوشتر صاحب سے ڈاکٹر مدان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان کے گھر کے لئے راشن وغیرہ کا انتظام ابھی کرا دیجئے۔ بیسویں صدی کے دفتر کا تمام اسٹاف کنکھیوں سے ایک دوسرے کو اشارے کر رہا تھا کہ سرور یہاں کیسے۔ خوشتر صاحب نے فوراً اپنے کیشیئر کو بلایا اور حکم دیا کہ سرور صاحب کے ساتھ جائیے اور جو کچھ یہ کہیں خرید کر دیجئے اور ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی لے جائے اور جہاں سرور صاحب کچھ سامان پہنچانے کو کہیں پہنچا دو اور انہیں واپسی پر گھر چھوڑ دینا۔ چنانچہ آٹے کی بوری، ڈالڈے کا چار کلو کا ٹین، چینی، دالیں اور دوسری راشن کی ضروری چیزیں خرید کر موٹر پر ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ بھجوا دیں اور ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ کل تشریف لائیے گا۔ ڈرائیور نے آ کر بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیٹیوں کے کپڑے اس قدر پھٹے ہوئے تھے کہ لڑکی کی ران بھی نظر آ رہی تھی۔ اور میں نے از خود دس روپیہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ خوشتر صاحب سبزی خریدنے کے لئے دیئے تھے۔

دوسرے دن ڈاکٹر مدان آئے تو میں نے ان کے آنے سے

پیشتر ہی سرد لباس [illegible] ایڈیٹر امر جیتی (ہند) کا سے
اجازت لے رکھی تھی۔ چار لحاف۔ چار گدے۔ چار تکیے اور
چار چادریں اپنی طرف سے خرید کر ڈاکٹر صاحب کو پیش
کر دیں۔ اور میرے پڑوس میں تحریک کا دفتر ہے چنانچہ
تحریک کے ایڈیٹر جناب گوپال متل سے میں نے گزارش
کی کہ آپ ڈاکٹر مدان کے لئے کسی اخباری دفتر میں ملازمت
کا انتظام کرا دیجئے۔ چنانچہ تین دن کے اندر اندر متل صاحب
نے جناب رام سنگھ کے انگریزی اخبار میں ڈاکٹر مدان کی
ملازمت کا بندوبست کر دیا۔ جب چار دنوں کے بعد ڈاکٹر مدان
ملازمت پر جانے کے لئے آئے تو ان کے کپڑے اور جوتے اس
قابل نہ تھے کہ وہ کسی دفتر میں جاتے۔ لہذا متل صاحب نے فوراً
باٹا کمپنی سے بہترین جوتا خرید کر پیش کیا اور میری عرضداشت
پر میرے ایک کرمفرما نے (جن کا نام شائع کرنے کی اجازت،
نہیں) ڈاکٹر صاحب کے چار پتلون اور چار شرٹ خرید دیے
اور ان کی بچوں کے لئے بھی دو جوڑے اور چپل خرید دیئے جب
ڈاکٹر مدان تیار ہو کر کام پر جانے کے لئے تشریف لائے تو
واقعی سنڈے ابزرور کے ایڈیٹر نظر آ رہے تھے۔ مگر دفتر
والوں نے دوسرے ہی دن شکایت کی کہ ان کی نظر اتنی کمزور ہے
وہ یہ کام نہیں کر سکتے۔ دوسرے ہی دن ڈاکٹر صاحب کو نظر کا
چشمہ لگوا دیا گیا۔ اب ڈاکٹر صاحب اپنے قدموں پر کسی حد تک
کھڑے ہو چکے تھے۔ دو چار ماہ تک تو وہ کبھی کبھار تشریف لے
آتے تھے۔ مگر اس کے بعد ایسے گم ہوئے کہ کئی ماہ تک ان کی
خبر نہ مل سکی۔ کنگز وے کیمپ سے دریافت کرایا تو پتہ چلا کہ انھیں
کہیں سرکاری مکان الاٹ ہو گیا ہے اور وہ یہاں سے چلے گئے ہیں

قریباً دو سال بعد سینٹرل سیکریٹریٹ سے واپسی پر
بس میں ڈاکٹر صاحب سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے
دور ہی میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا سرور صاحب
نمسکار۔

بہترین لباس میں ملبوس، سر پر فلیٹ کیپ منہ میں
سگار [illegible] انگریزی میں کہنے لگے شاید آپ نے مجھے
پہچانا نہیں۔ [illegible] یقیناً نہیں پہچان سکتے
ہوئے کہنے لگے میں سنڈے ابزرور والا ڈاکٹر مدان۔ [illegible]
اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے ہاتھ ملایا اور شکایت بھی [illegible]
کہا کہ اتنے دنوں آپ کہاں رہے ملاقات نہ ہونے کی [illegible]
مکان کہاں لے لیا ہے۔ کہنے لگے چاندنی چوک کو جاتا ہے [illegible]
میرے ساتھ چلیں کسی ریسٹوران میں بیٹھیں گے اور باتیں
کریں گے۔ میرا ٹکٹ سیا گنج تک کا تھا اور ان کا [illegible]
آیا تو ایک آنے کا اور ٹکٹ لے کر ڈاکٹر مدان کے ساتھ [illegible]
پر اترا اور چاندنی چوک میں لکشمی ریسٹورنٹ (ان دنوں [illegible]
چاندنی چوک کی شان تھا) میں آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے چائے [illegible]
کا آرڈر دیا۔ اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فرمانے لگے کہ میں نے
لندن کے ایک روزنامے کے ایڈیٹر کو اپنی بدحالی کی داستان
لکھی تھی کہ ہمارے ملک میں صحافی کی یہ قدر ہے جب کہ [illegible]
ممالک میں صحافیوں کی عزت و توقیر کا ایک خاص مقام ہے۔ لندن کے
یہ صحافی ایک عرصہ سے سنڈے ابزرور کے ایڈیٹر ڈاکٹر مدان سے [illegible]
واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر مدان کا اصل خط ہندوستان
کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی خدمت میں بھجوا دیا اور
لکھا کہ آپ ایسے وزیر اعظم جو دنیا میں ایک مثالی وزیر اعظم ہیں۔
کے ملک میں ڈاکٹر مدان ایسے صحافی کی یہ گت بن رہی ہے۔ چنانچہ
جب یہ خط پنڈت جی کے پاس پہنچا تو انہوں نے فوراً اپنے سکریٹری
کو حکم دیا کہ ابھی ڈاکٹر مدان کو بلوایئے۔ چنانچہ پرائم منسٹر ہاؤس
کی ایک لمبی کار پر ایک افسر ڈاکٹر مدان کو ڈھونڈتا [illegible]
پہنچا اور انہیں نہایت عزت و احترام کے ساتھ پنڈت جی کی
کوٹھی پر لے جایا گیا۔ ڈاکٹر مدان نے کسی قدر فخریہ لہجہ میں کہا جب
پرائم منسٹر کی بھجوائی ہوئی کار انہیں لینے آئی تو تمام کیمپ [illegible]
والے رفیوجی حیران تھے، ایک مخصوص انسان نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر مدان
سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے سرور صاحب جیسے ہی
پنڈت جی کے سکریٹری کے پاس لے جایا گیا تو انھوں نے کہا کہ آپ کے
لئے بہت بڑی سفارش آئی ہے۔ پرائم منسٹر کی ہدایت پر آپ کو
بلایا گیا ہے دو منٹ کے بعد سکریٹری نے فون سے پنڈت جی سے کہا
کہ ڈاکٹر مدان آگئے ہیں اور اس کے بعد وہ [illegible]
[illegible] کمرے میں گئے۔ پنڈت جی نے اپنے سکریٹری سے کہا کہ

ہزار روپیہ کا چیک ان کے نام سے کراؤ۔ ڈاکٹر مدان کہنے لگے کہ یہ سنتے ہی میں نے عرض کیا کہ پنڈت جی آپ نے مجھے "BIG BEGGER" سمجھا ہے۔ مجھے خیرات کی ضرورت نہیں ہے اگر آپ نے مہربانی کرنی ہے تو کوئی کام دلوایئے۔ اس کے بعد پنڈت جی نے پہلے غصہ سے پھر مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ انہیں مناسب جگہ پر ملازمت دی جائے اور دوسرے ہی دن مجھے معقول ملازمت مل گئی اور رہائش کے لئے سرکاری طور پر مکان بھی الاٹ ہو گیا۔ لہٰذا اب میں مزے میں ہوں مگر برے وقت میں سرکار آپ نے جو میرے ساتھ سلوک کیا میں اسے وزیر اعظم کے مہربانی سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر مدان اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کی بیٹیاں بڑی اچھی جگہ پر ملازم ہیں اور دونوں اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔

•••

"شاعرِ شیریں بیاں"

نرگس سہسوانی

ہیں ہمارے شہر میں اِک شاعرِ شیریں بیان
عرض کرنا چاہتا ہوں آج اُن کی داستان

جب کوئی دیتا ہے اُن کو دعوتِ شعر و سخن
تب بتاتے ہیں وہ نامہ بر کو شرکت کا چلن

ڈھائی سو سے کم کا آفر ہے تو آ سکتا نہیں
ہو منسٹر کی سفارش تب بھی جا سکتا نہیں

شاعری میں نام میرا اس قدر مشہور ہے
مُجھ کو کنوینر بُلانے کے لئے مجبور ہے

مَیں جہاں جاتا ہوں جھنڈا گاڑ دیتا ہوں وہاں
میرے گانے پر فدا ہوتے ہیں سب پیر و جواں

وہ غزل ہو یا رُباعی سب ہی گا لیتا ہوں مَیں
بحر میں بے بحر کو بھی گُنگنا لیتا ہوں میں

فاعلاتن فاعلن کے کیوں جھمیلے میں پڑوں
مغز پچی کیا ضروری ہے کہ روز و شب کروں

میں غزل گا ہوں غزل گوئی سے مجھ کو کیا غرض
ہو گیا ہے مجھ کو اب پیسہ کمانے کا مرض

جب غزل گاتا ہوں تو چلتا ہے ریلا داد کا
نام مجھ سے چل رہا ہے اب مرے اُستاد کا

میں لبِ دریا کے ساحل پر کبھی ہوتا ہوں کھڑا
اور جل مرغابیوں کا دیکھ لیتا ہوں مزا

گاہ گاندھی کیپ ٹوپی بھی لگا لیتا ہوں مَیں
مینہ کی بارش سے کبھی اکثر نہا لیتا ہوں مَیں

مجھ کو تنقیدوں سے کیا مطلب گلے پہ ناز ہے
سُننے والے کہہ اُٹھیں واللہ کیا آواز ہے

داد مل جاتی ہے مجھ کو پھر بھی ہر مضمون کے
گو نظر میں ناقدوں کی لاکھ وہ مہمل سہی

فن میں کیا رکھا ہے فن کو پوچھتا بھی کون ہے
اور اب اہلِ سخن کو پوچھتا بھی کون ہے

یہ بتائیں آپ کیا شرطیں مری منظور ہیں ؟
آپ کیا میرے بُلانے کے لئے مجبور ہیں ؟

میری شرطیں ہوں اگر منظور تو بتلائیے
ورنہ جس رستے سے آئے ہیں اسی سے جائیے

غزلیات

مسعودہ حیات

کیا یہ سچ ہے کہ خیالات بدل جاتے ہیں
اور لوگ رسم و روایات بدل جاتے ہیں

یوں تو ہوتے ہیں بہت وعدہ و پیمان لیکن
وقت پر حرف و حکایات بدل جاتے ہیں

ہم سے ناخوش ہیں تو کل تم سے بھی نالاں ہوں گے
یوں ہی لوگوں کے خیالات بدل جاتے ہیں

آج ماضی کے ستم کا ہمیں احساس کہاں
دل پہ ہر عہد کے اثرات بدل جاتے ہیں

یوں بھی ہوتا ہے کبھی سنگِ ملامت کا اثر
شیشۂ دل کے نشانات بدل جاتے ہیں

دشمنِ جاں تھے تو کیوں اتنی مسیحائی کی
کیا یونہی آپ کے جذبات بدل جاتے ہیں

سازِ دل کا وہی عالم ہے ہر اک رُت میں حیاتؔ
لوگ کہتے ہیں کہ نغمات بدل جاتے ہیں

○

از نبیل نقشبندی
کسٹم روڈ، باتسواڑہ

نہیں دکھاؤ نہ ہم کو اس قدر عذاب کی آنکھ
کہ ہم نے دیکھی ہے دُنیا کے پیچ و تاب کی آنکھ
جو دیکھی ہم نے مرے شوق و اضطراب کی آنکھ
جھپک کے رہ گئی گردوں میں آفتاب کی آنکھ

یہ سُرخ ڈورے یہ مستی یہ ادھ کھلی پلکیں
کوئی بھی دیکھے تو کہہ دے گا ہے شباب کی آنکھ

یہ بادہ کا ہے نشہ یا شباب کی مستی
چھپائے سے نہیں چھپتی کبھی شراب کی آنکھ

تم اپنے وعدے کی توقیر تو ذرا دیکھو
تمام رات نہ جھپکی ہے اضطراب کی آنکھ

بھلاؤں کیسے ملاقات کی وہ پہلی گھڑی
مری نگاہ میں اب تک ہے وہ حجاب کی آنکھ

فضا میں عطر کی موجیں رواں دواں ہوں گی
چمن میں جب بھی کھلے گی مرے گلاب کی آنکھ

ہے اب بھی باعثِ تسکیں مرے لئے لیکن
وہ اجتناب کا پہلو وہ اجتناب کی آنکھ

○

از محمد خان محشر افغانی
بانسواڑہ

کچھ لوگ زندگانی کے ایسے سفر میں ہیں
گردش میں رات دن ہیں مگر گھر کے گھر میں ہیں

اے رہ روانِ جادۂ ہستی ذرا سنبھل
رہزن بہ شکلِ خضر تری رہ گزر میں ہیں

آؤ نہ میرے ساتھ وفاؤں کی راہ میں
دُشوار مرحلے تو اسی رہ گزر میں ہیں

منزل تو خوش نصیبوں کے حصے میں آ گئی
کچھ بدنصیب لوگ ابھی تک سفر میں ہیں

پتھراؤ کر رہی ہیں ہوائیں بھی ہر طرف
کچھ لوگ سہمے سہمے سے شیشے کے گھر میں ہیں

ہیں جن کی جستجو میں بہاروں کے قافلے
محشرؔ وہی نظارے ہماری نظر میں ہیں

غزلیں

[illegible]

[illegible] کرم تھا مقدر میں کچھ نہ تھا
[illegible] کو کے تھا سکندر میں کچھ نہ تھا

[illegible] تھی گھر میرا جل گیا
[illegible] جاتا ہوا مرے گھر میں کچھ نہ تھا

[illegible] میکدہ میں میسر ہوئی مجھے
تیری نظر کیف تھا ساغر میں کچھ نہ تھا

ہر شے [illegible] تھی نمایاں مرے غم کی روشنی
[illegible] آپ تھے گھر میں کچھ نہ تھا

ساحل خموش تھا کہ کوئی حادثہ ہوا
کچھ لوگ کہہ رہے تھے سمندر میں کچھ نہ تھا

دامن پہ میرے خون کے نشاں تک نہیں ملے
تیری نظر کا وار تھا خنجر میں کچھ نہ تھا

شادابیاں جہان کی پُرکیف تھیں سحر
اُن کے رخ کا جمال تھا منظر میں کچھ نہ تھا

٥

اشفاق سہسوانی

آپ ہی کا تو ہے یہ کرم!
ورنہ دیوانگی اور ہم —؟

دل کی خودداریوں کی قسم
جانے کیا سوچ کر چپ ہیں ہم

کس جگہ میرا سر جھک گیا؟
سر بسجدہ ہیں دیر و حرم

تم سے کوئی شکایت نہیں
اپنی بربادیوں کی قسم

کانپ اٹھی برق انھیں دیکھ کر
چار تنکوں کا جاہ و حشم

ہم میں حوصلہ ہی نہ تھا
ورنہ منزل تو تھی دو قدم

اس لئے کر رہا ہوں گنا
میرا مقصود ہے امتحانِ کرم

منزلیں مجھ کو آواز دیں
اتنا تو رہا ہو کم سے کم

یہ مرا حسنِ اخلاق ہے
سہہ رہا ہوں ستم پہ ستم

٥

از نشتر [illegible]

الحمد للہ ہے سب کچھ مرے سرکار کے پاس
کون سی شے نہیں ہے احمدِ مختار کے پاس

جب گزارہ نہیں چلتا ہے تو ساری دنیا
مانگنے بھیک چلی آتی ہے سرکار کے پاس

وہ کبھی لوٹا نہیں کاسۂ خالی لے کر
جو بھی آیا ہے شہِ طیبہ کے دربار کے پاس

آرزو حور کی ہے اور نہ کوثر کی طلب
ساغرِ حُبِّ ولا ہے دلِ بیمار کے پاس

مانگنے کا ہے سلیقہ تو ملے گا سب کو
ہاتھ پھیلا کے تو دیکھو مرے سرکار کے پاس

سرد ہو جائے گی یکبارگی نارِ دوزخ
قطرۂ اشک ندامت ہے گنہگار کے پاس

دولتِ مدحتِ خاصانِ خدائے عالم
کیسے گوہر ہیں غزینے مرے اشعار کے پاس

غزلیات

صابری۔ نعیم پوری۔ سہارنپور

[...] آگ سے بھڑکی ہوئی ہر سمت نگر میں
محفوظ جو رہنا ہے تو بیٹھے رہو گھر میں

سیب تعصب کے مظالم ارے توبہ
[...]ی سے بھی سستا ہے لہو آج نگر میں

منزل پہ پہنچ کر بھی تو رہ جاتے ہیں تنہا
ایسے بھی مراحل کبھی آتے ہیں سفر میں

[...]رم ہے رہوٹی سے یہاں ہر کس و ناکس
[...]یکھو تو ذرا گھوم کے مزدور نگر میں

ملتا ہی نہیں جام کوئی تشنہ دہن کو
آتا ہی نہیں آج میں ساقی کی نظر میں

یہ دورِ ترقی ہے کہ ہے دورِ تنزل
انساں کی محبت نہیں انساں کی نظر میں

کرتا ہے بڑے کام جو سنسار میں جوہر
اک روز وہ گر جائے گا خود اپنی نظر میں

اوم پرکاش نردوش (دیگواڑہ)

سننے کی بات ہے نہ سنانے کی بات ہے
ایسا بھی نہیں ہے کہ دیوانے کی بات ہے

اہل ستم کے بزم میں چہرے اتر گئے
بربادیوں کا جشن منانے کی بات ہے

ذکر وفا پہ کوئی بھی دیتا نہیں ہے دھیان
لگتا ہے جیسے گزرے زمانے کی بات ہے

تخیل کے افق پہ وہ بجلی سی کوندنا
اس مہ جبیں کے بام پہ آنے کی بات ہے

یہ کہنا چاہتا ہوں جوانانِ قوم سے
اک اور انقلاب کے لانے کی بات ہے

ہنستے ہو کیوں؟ یہ غور طلب ہے معاملہ
نردوش نے کہی جو ٹھکانے کی بات ہے

[...]پ آنند
[...]ن شہر
آ بہ[...]

سر کو جھکائے بیٹھے ہیں ہم — دھیان لگائے بیٹھے ہیں ہم
دستِ دعا بھی اپنے مالک — ہاتھ اٹھائے بیٹھے ہیں ہم
پروانے نے پنکھ جلائے — دل کو جلائے بیٹھے ہیں ہم
شوق سے آئیں خنجر لیکر — جاں گنوائے بیٹھے ہیں ہم
اشکوں سے لبریز آنکھوں میں — خواب سجائے بیٹھے ہیں ہم
اہل گلشن کانٹوں کو بھی — خون پلائے بیٹھے ہیں ہم
کاش ادھر سے بھی وہ گزریں — نین بچھائے بیٹھے ہیں ہم
نام وفا پہ کیا کیا آنند
دھوکے کھائے بیٹھے ہیں ہم

غزلیات

نسیم شاہجہاں پوری

بجھ گیا دل آرزو کرتے رہے
کھو گئے اور جستجو کرتے رہے

خود وہ خود سے گفتگو کرتے رہے
آئینے کو سرخرو کرتے رہے

میرے گناہ آرزو کرتا رہا
آپ خونِ آرزو کرتے رہے

تجھ کو پانے کے لئے ہم عمر بھر
آپ اپنی جستجو کرتے رہے

آف! حیاتِ عشق کی مجبوریاں
آرزو پر آرزو کرتے رہے

کی تلافی رندِ دامن پھاڑ کر
روز ہم جرمِ رفو کرتے رہے

آرزوؤں پر شباب آتا رہا
صرف ہم دل کا لہو کرتے رہے

واقفِ آدابِ عرضِ شوق تھے
چپ رہے اور گفتگو کرتے رہے

خونِ دل سے عمر بھر لاشعن نسیم
ہم چراغِ آرزو کرتے رہے

کیفی شاہجہاں پوری

زندگی بھر گور ہے گمنام سے
باخبر لیکن رہے انجام سے

ہو چکیں پامال ساری حسرتیں
کام لیں اب کیا دلِ ناکام سے

ہم سے رودادِ شبِ ہجراں نہ پوچھ
صبح تک بیکل رہے ہیں شام سے

اُڑ گئی بے ساختہ کیوں چشمِ شوق
کیا کسی نے پھر پکارا بام سے

غم کے خم مجھکو پلا دے ساقیا
پیاس بجھ سکتی نہیں اک جام سے

مجھکو ہے ہر اپنا بیگانہ عزیز
دوستی رکھتا ہوں خاص و عام سے

خود غرض وہ اور ہوں گے ہم نہیں
واسطہ ہے جن کو اپنے کام سے

کوئی اچھا یا برا کیفی کہے
آپ رکھئے کام اپنے کام سے

مس ترنم ضیا ایمھا سے
(شاہجہاں پور)

آنسوؤں کے دیئے جلاتی ہوں
جشنِ غم اس طرح مناتی ہوں

وہ نگاہوں سے دور ہیں لیکن
دل سے ان کو قریب پاتی ہوں

جو مجھے آئینہ دکھاتے تھے
میں انھیں آئینہ دکھاتی ہوں

ان کے غم کو لگا کے سینے سے
عظمتِ زندگی بڑھاتی ہوں

جان کر رازِ گریۂ شبنم
خندۂ گل پہ مسکراتی ہوں

ٹوٹ جائے نہ دل زمانے کا
بالارادہ فریب کھاتی ہوں

کوئی دیکھے تو حوصلے میرے
گردشوں سے نظر ملاتی ہوں

ان کی ادنیٰ سی مسکراہٹ پر
سارے شکوے میں بھول جاتی ہوں

اے ترنم میں غم کی راتوں میں
اپنے اشعار گنگناتی ہوں

غزل

سلام ساگری
ساگر (ایم پی)

سجدے وقتِ حرم تھے کئے ترے در پر
ہی ہے کعبہ بنا دی لکیر پتھر پر
نثار ہستیٔ کونین ایسے ساغر پر
ہزار بادہ تری چشمِ روح پرور پر

نگاہ ڈالنا مشکل تھا اس ستمگر پر
پڑی نہ ذرّے کی آنکھ آفتابِ محشر پر
تھا اپنے بارے میں کچھ حُسنِ ظن ہمیں واعظ
طفیل کے ہم سرِ میخانہ پہنچے کوثر پر

نکل کے دیکھئے بیتابیاں محبت کی
بڑے مزے کی نمائش ہے آپکے در پر
خرامِ ناز میں اس کے قیامتیں پنہاں
نثار سیکڑوں فتنے ہیں ایک ٹھوکر پر

بنائے سنگ، اگر سنگدل خدا نہ کرے
ابھر تو سکتے ہیں کہنے کو نقش پتھر پر
زمین کانپ رہی ہے کسی کی آہوں سے
گرے لرز کے نہ اب آسماں کہیں سر پر

جو بام یار سے اب تک ہوا نہ تھا واپس
خدا نہ کردہ کٹے کیا ترے کبوتر پر
غمِ فراق نے ایسا گھلا دیا مجھ کو
کہ آنکھوں میں نظر آیا نہ اپنے بستر پر

نہیں ہے شیوۂ بغض و حسد سلام اپنا
ہمیں تو فخر ہے ساگرؔ عصر سخنور پر

غزل

شاہد رتلامی (کویت)

چھپائے سے نہیں چھپتی کبھی شراب کی آنکھ
کہ دیکھو کھول رہی ہے بھرم حجاب کی آنکھ

یہ میری آنکھ میں برسوں کے رتجگوں کا خمار
مگر وہ پھر بھی یہ کہتے ہیں ہے یہ خواب کی آنکھ

جو دیکھ لوں گا تو کہہ دوں گا یہ سرِ محفل
یہی تو ہے وہ مرے شوقِ انتخاب کی آنکھ

نہ چھیڑو سوئے ہوئے حادثوں کو رہنے دو
کہ تم ہی دیکھ نہ پاؤ گے انقلاب کی آنکھ

گلابی چہرے پہ لرزیدہ قطرۂ شبنم
مری کہانی کا عنوان مری کتاب کی آنکھ

ہر ایک دیکھنے والے کی ہے متاعِ حیات
وہ نرگسی وہ غزالی ترے شباب کی آنکھ

سُنا رہی ہیں تری داستانِ دل شاہدؔ
یہ اضطراب کا عالم یہ اضطراب کی آنکھ

من کہ مکتوب الیہ

سلطان احمد صدیقی
مبارک منزل، امرپورا
اوجین (ایم پی) ۱۰ ستمبر ۱۹۸۱ء

مکرمی و محترمی سرکردہ تونسوی صاحب
تسلیم و نیاز

جناب محمد خالد عابدی صاحب آل انڈیا ریڈیو اندور کے توسط سے ماہنامہ "شان ہند" دہلی نظر نواز ہوا۔ جس میں موصوف میرے حوالے "تذکرہ شعرائے اوجین" بالاقساط شائع کرا رہے ہیں۔ متعلقین شعرائے کرام اور راقم الحروف آپ کے رسالہ اور عابدی صاحب کے ممنون و متشکر ہیں۔

اگست ۱۹۸۱ء کے شمارے میں اوجین کے چند قدیم شعراء صفحہ ۱۴ پر منشی ہیرالال وکیل صاحب مرحوم کے حالاتِ زندگی اور کلام پر تبصرہ ہے۔ اس میں "منظوم گیتا" کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ بہ تلاش بسیار مرادآباد سے اوجین آگیا ہے۔ میں کو وکیل صاحب کے صاحبزادوں کی فرمائش پر راقم الحروف "ناگری لپی" اور اردو میں نقل کر رہا ہے منشی صاحب کا خط شکستہ غیر منقوط، مٹے ہوئے الفاظ، مسودہ میں کاٹ چھانٹ۔ سرخ سیاہ سے ترمیم و حک و اصلاح کی بنا پر مسودہ کو پڑھنا اور نقل کرنا کافی وقت طلب کام ہے۔ بہرحال کیا جا رہا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا آپ شری مد بھگوت گیتا منظوم مترجم و مولفہ منشی ہیرالال وکیل صاحب کو رائیلٹی پر شائع فرما سکتے ہیں؟ یا کسی ایسے ادارے سے رجوع کرا سکتے ہیں جو اس کو رائیلٹی پر شائع کرنا پسند کرے؟ کیا بالاقساط "شانِ ہند" میں شائع ہو سکتا ہے؟

میرے خیال سے اس "گیتا منظوم" کو مثنوی گلزار نسیم کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس کی بندش میں چستی سلاست روانی۔ فصاحت و بلاغت صنائع و بدائع سے مملو ہے۔ "میں گیتا" کے اور منظوم مثنویوں کی تلاش میں ہوں فی الحال ایک "دل کی گیتا" ... [illegible] پرنسپل اسلامیہ کالج [illegible] میں شائع کی ہے۔ وکیل صاحب کا ترجمہ ۱۹۳۶ء کا ہے۔ وکیل صاحب کا ۱۱ اگست ۱۹۳۶ء کو انتقال ہو گیا۔ "گیتا" کے ۱۸ ادھیائے کا ترجمہ اشلوک کے نمبروں کے ساتھ کیا گیا ہے۔

وکیل صاحب اور دل صاحب کے نمونہ پیش ہیں

بارہواں ادھیائے۔ ارجن نے پوچھا۔ وکیل صاحب اوجینی

اشلوک (۱)

کاہو من کسی کا ہے پیوستہ ۔ دل آتشِ عشق سے ہے پُرنور
پھل تو ہے ریاض و بندگی کا ۔ ہے تو ہی مآلِ زندگی کا
جیتا ہے ترا وہ نام لے کر ۔ معروف ہے تجھ میں جان دیکر
اکثر ہیں خلاف اس بیاں کے ۔ متلاشی ہیں ذاتِ بے نشاں کے
بہتر ہے ترے خیال سے کون ۔ ہو شاد ترے وصال سے کون؟

(۲) فرمایا عزیز ہے مرا وہ ۔ میں عزیز نہیں نہ دوسرا وہ
اخلاص سے اعتقاد سے جو ۔ مخلوق میں چاہتا ہے مجھ کو

خواجہ دل صاحب لاہوری

(۱) وہ یوگی جو بھگتی میں سرشار ہیں ۔ فقط آپ ہی کے پرستار ہیں
یا وہ بہتر ہیں یا جو ہیں باطن پرست ۔ خفی لم یزل ذاتِ عالی کے مست؟

(۲) ہوئے حق کے بھگوان یوں گلفشاں
ہیں بہتر وہی یوگ میں بے گماں
یقین سے جو بھگتی کریں مستقل
مجھی سے جو ہیں لگا چکے ہیں دل

ان بارہویں ادھیائے کے دو اشلوکوں سے آپ کو کچھ اندازہ دونوں کے رنگِ سخن کا ہو گیا ہے۔ میرے خیال سے وکیل صاحب کا ترجمہ "شاہکار" اور [illegible] چیز ہے جو گوشۂ گمنامی سے نکال کر منظرِ عام پر پیش کئے جانے کا منتظر ہے۔

"من کہ مکتوب الیہ" میں اس عریضہ کو شائع فرمائیں اور [illegible] سے بھی جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عطا فرمائیں۔

فقط سلطان احمد صدیقی

کوشش: عقیل صدیقی

کرمی لال احسانی

عروج ادب دلی کا مشاعرہ جشنِ آزادی

محترم سرور صاحب نے حکم فرمایا کہ آج عروج ادب کا مشاعرہ نوٹ کر لاؤ۔ اور وہ خود قبلہ حافظ محمد یوسف صاحب مدیر اعلیٰ شمع کے دولت کدہ پر عید ملن اور جشن آزادی کی تقریب میں شرکت کرنے چلے گئے۔ میں بھی ان کے ہمراہ قوالی نہیں صرف پاکستانی مزاحیہ لطیفہ گو معین اختر کو دیکھنے اور سننے کے لئے جانا چاہتا تھا لیکن اگر میں ایسا کرتا تو آپ اس یادگاری اور شستہ مشاعرہ سے محروم رہ جاتے۔ لہٰذا میں آج قبلہ سرور صاحب کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ آئیے پھر آپ کو انجمن عروج ادب دلی کا یہ مشاعرہ سنوا دوں!

حاجی ہوٹل سے سلیم کمتولوی کے ہمراہ ایوانِ غالب... ماتا سندری لین عقب ارون ہسپتال پہونچا تو دیکھا کہ ایوانِ غالب کے باہر یار لوگ خوش گپیوں میں مصروف ہیں یہاں ملک زادہ منظور صاحب اور جناب بوگس حیدرآبادی سے ملاقات ہوئی بوگس صاحب کچھ اس والہانہ انداز سے لپک کر آئے کہ میں اُن کی پاکستانی شلوار اور قمیص سے ذرا دیر کے لئے اس شش و پنج میں رہا کہ آپ ہیں کون لیکن ان کے قہقہے نے یہ الجھن دور کر دی۔ ایوانِ غالب نہایت پُرشکوہ اور سادہ عمارت ہے اندر داخل ہو کر دیکھا تو نہایت خوش ذوق خوش پوش اور معزز تعلیم یافتہ سامعین حضرات باوجود ایئر کنڈیشنڈ کے حبس میں ڈوبے ہوئے ہیں اور پسینہ میں بھی شرابور نظر آ رہے ہیں اُردو بھی ہر فن مولائی کو کچھ اس طرح سے پابہ زنجیر بنا کر رکھ دیتی ہے کہ آگ اور شعلے برس رہے ہوں یا برف باری شباب پر ہو جو جہاں اکڑ جم جاتا ہے وہ پھر اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا اُردو کے اس جادو کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔

ایک طرف آل انڈیا ریڈیو کے کارکن اس مشاعرہ کو ریکارڈ کرنے کی تیاری میں مصروف ہیں دوسری طرف کئی حضرات ٹیپ ریکارڈ لئے پھرتے ہیں۔ شعرائے کرام اسٹیج پر تشریف فرما ہیں نو بج کر دس منٹ ہوا چاہتے ہیں۔ ساحر ہوشیارپوری افتتاح کے لئے یاد فرما رہے ہیں عالی جناب گیانی ذیل سنگھ جی وزیر داخلہ مرکزی سرکار کو۔ محترم گیانی جی تالیوں کی گھن گرج میں تشریف لا کر شعراء کی صف میں بیٹھ گئے ہیں پھر ساحر صاحب صدارت کے لئے اندر کمار گجرال صاحب کو زحمت دے رہے ہیں آپ کی گلپوشی کی جا رہی ہے۔ ادھر گیانی جی کی بھی گلپوشی کی جا رہی ہے اور آپ شستہ اردو میں فرما رہے ہیں:

صاحب صدر شعراء صاحبان۔ اور معزز حاضرین۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد ہم اس پینتیسویں سال میں خوشی منا رہے ہیں میرے خیال میں یہ دن کا سب سے بڑا دن ہے ویسے ۲۶ جنوری کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن وہ تنہا بڑا دن نہیں ہے۔

ہم صدیوں کی غلامی سے کب آزاد ہوئے وہ پندرہ اگست ہے ــ تالیاں ــ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے ہندوستان کے شہیدوں کی اور بہادروں کی۔ انھوں نے یہ کام کسی بدلے کے لئے نہیں کیا بلکہ انھوں نے یہ قربانی آزادی کے لئے دی۔

آپ کو خوشی ہوگی کہ ایک مضبوط ہاتھوں میں حکومت جو آئی تو کچھ لوگ دوستی اور دشمنی کے لئے ہاتھ بڑھا رہے ہیں ــ تالیاں ــ آج کا دن یاد دلاتا ہے کہ ہم بھائی بھائی بن کر ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ آج ہندو بن سکتے ہیں۔ سکھ بن سکتے ہیں۔ مسلمان بن سکتے ہیں اور بن رہے ہیں لیکن انسان بنا بڑی بات ہے جو شہر میں جو مذہب کے نام پر ہمیں توڑنا چاہتے ہیں ہماری ہر چیز

[illegible] سب لگ ہیں ـــ تالیاں ـــ [illegible]
[illegible] کو بجا سمجھتے ہیں [illegible] کرتے

میں شاعر نہیں اُن کا احسان مند ہوں جنہوں نے مجھے بیاں بنایا مجھے دکھ ہے کہ یہاں ایسے بھی لوگ ہیں جو آج کے دن بھی مظاہرے کرتے ہیں۔ یہ دیش بھگتی نہیں وطن دشمنی ہے ـــ تالیاں ـــ اب میں مشاعرہ شروع کرانے کے لئے درخواست کرتا ہوں ـ بے حد ـــ تالیاں ـــ اطہر ساحر صاحب انمسکار گجرال صاحب [illegible] فرمانے کی اپیل کررہے ہیں گجرال صاحب فرمارہے ہیں:

شعرائے کرام وخواتین حضرات!

مجھے خوشی ہے کہ اس مشاعرہ کا افتتاح گیانی جی نے فرمایا اس محفل میں آپ نے شرکت کی آپ سب کو آج کا دن مبارک اب میں شعراء سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کلام عنایت کریں ـــ تالیاں ـــ ساحر صاحب ملک زادہ منظور احمد منظور کا اسم گرامی نظامت کے لئے پیش کررہے ہیں تالیوں کے شور میں منظور صاحب نے مائک سنبھال کر فرمایا!۔

صدر محترم گجرال صاحب وزیر محترم ذیل سنگھ شعرائے کرام مجھے اس بات کا احساس ہے کہ دو بصیرت انگیز تقریروں کے بعد اس محفل میں تقریر کرنا اپنی عزت وآبرو کو خطرہ میں ڈالنا ہے ابھی محترم ذیل سنگھ نے فرمایا کہ میں شاعر نہیں ہوں میں کہتا ہوں کہ انھوں نے شعر بھی کہے ہیں اور وہ پہلے وزیر ہیں جنہوں نے اردو میں حلف لیا ہے ـــ تالیاں ـــ وزیر اور سفیر بدلتے رہتے ہیں لیکن کانگریس نے جو تہذیب اور کلچر پیدا کیا ہے وہ خوب ہے۔ ابھی جو گجرال رپورٹ پیش کی ہے وہ بھی خوب ہے اس پر عمل ہوا ہو کہ نہیں اور اب میں محترم کنور صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے کلام سے نوازیں محترم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے مائک پر آکر فرمایا میں تقریر نہیں کروں گا ـــ مجھے تقریر کا حصہ ہونا چاہئے ـــ کیفیت ہو یا لی شور بیٹھے ہوئے ہیں ـــ اور کنور صاحب ایک لاجواب نظم سنا کر تالیوں کی گونج میں مشاعرہ کا حسین آغاز کر سکے جارہے ہیں اور تسلیم کنتوری غزل سنا رہے ہیں ـــ

جرأت [illegible] عشق میں [illegible] نہیں ہے
[illegible] کی سزا دلد نہیں ہے
شاداب ہوا موسمِ گل جس کے لہو سے
وا اُس کے لئے اب درِ گلزار نہیں ہے

پیتا ہے شب و روز مئے عشقِ الٰہی
تم کیسے کہوں شیخ کو میخوار نہیں ہے

سلیم صاحب داد وصول کئے اپنی جگہ آرہے ہیں منظور صاحب فرمارہے ہیں نئی آواز نئے تاثرات کے ساتھ ایک اُبھرتے فنکار قمر جاوید سہسوانی سے اُن کی غزل سنئے۔ جاوید صاحب بیل باٹم اور شرٹ زیب تن کئے جو مائک پر آئے تو سامنے سے ایک آواز اُبھری ـــ شہزادے اِدھر بھی ـــ ایک قہقہہ ـــ اور آپ بڑے غلام علی خاں بننے کی یوں کوشش کررہے ہیں سے

کبھی تو ایسا نہیں ہاں یہ آج کیسا ہے
کوئی کسی کا نہیں یہ سماج کیسا ہے

لیجئے تالیاں جاگ اُٹھی ہیں یہ تالیاں کیسی ہیں اللہ ہی جانے ـ حق صاحب فرمارہے ہیں آپ ہی کا شاگرد ہے یعنی قمر جاوید صاحب حق صاحب کے شاگردِ رشید ہیں خدا مبارک کرے۔ اُدھر ہی سامنے والے من چلے چیخ رہے ہیں غزل پڑھو اسی ہنسی مذاق میں جاوید صاحب الاپ رہے ہیں سے

سبھی کے چاک گریباں سبھی کی آنکھیں نم
تمہارے شہر میں آخر رواج کیسا ہے

جاوید صاحب جارہے ہیں نہ جانے کیوں سامنے والے منچلے ایسی اچھی غزل پر فرمائش پر اُتر آئے ہر شعر پر تالیوں سے داد بھی دیتے رہے یہ تفریح تھی یا حقیقت ـ؟ لیجئے نقوی ایڈوکیٹ مائیک پر آکر فرمائشوں کو نظر انداز کرکے غزل الاپ رہے ہیں سے

آدمی کی قسمت میں صرف غم اُٹھانا ہے
زندگی بھی دھوکہ ہے موت بھی بہانا ہے
عشق میں جبیں خود کو اس لئے مٹانا ہے
آپ کو اندھیرے سے روشنی میں لانا ہے

ساتھ چل سکے دُنیا کے ہم نے کچھ نہیں پایا
اب ہمیں الگ اپنا راستہ بنانا ہے

ناظم صاحب محفل کو گرما کر تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں۔ دوسرے رنگ محفل بدلنے کے لئے ناظم انصاری ناگپوری آکر حقانیت سے فرما رہے ہیں ؎

دیوانہ جس نے کر دیا اک بار دیکھ کر
ہم کر سکے نہ کچھ بھی لگاتار دیکھ کر
کشتی کے بادبان مجھے یاد آ گئے
بیگم تمہاری نوگزی شلوار دیکھ کر

ایک غُل غپاڑہ اور شور سا شور ہے اور آپ یوں صحت میں اضافہ کر رہے ہیں ؎

ہم شریفوں کو تو پہلو میں بٹھائے رکھئے
نمبری لوگوں کو نمبر سے لگائے رکھئے
لیفٹ انکل سے تو لے آتا ہوں میں پرمٹ
آپ بھی اپنے پتاجی کو پٹائے رکھئے

وہی محل غپاڑہ کا عالم ہے اور اب آپ ترنم سے ہزل الاپ رہے ہیں ؎

مشاعروں پہ وہ چھا جاتے ہیں گھٹا کی طرح
غزل سُناتے ہیں ہنگا گا کے جو تتا کی طرح
پکڑ لیا جو پولیس نے تو شیخ جی سے بولے
شراب پی ہے یہ سچ ہے مگر دوا کی طرح

ناظم صاحب محفل کو قہقہوں اور ہنسی مذاق پر اُتار کر اپنی جگہ آئے تو شمیم جھانسوی فرمائشوں سے بے نیاز غزل سرا ہو رہے ہیں ؎

اہلِ ہوس نے رسمِ ہوس پر عشق کے پردے ڈالے ہیں
راہِ وفا میں حدِ نظر تک کیا تاریک اُجالے ہیں
سب کا درد وہی بانٹیں گے جو دُکھ سہنے والے ہیں
سایہ کرنے والے بادل سر پر دھوپ سنبھالے ہیں
جس نے ادب کی دولت بانٹی اس فنکار کے کمرے میں
لٹک دیا ہے اک چٹائی کچھ مکڑی کے جالے ہیں

داد کا شور کم ہوا تو اسی دلکشی سے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

میں تجھ کو پڑھ سکا پر لوگ سمجھ پا جائیں گے
چہرے پہ ہر پگڈنڈی کے پیچ پائے کچھ چھپائے ہیں

شمیم صاحب محفل کو لوٹ کر کامران مائک سے جدا ہوئے تو موہن جادو دانی فرما رہے ہیں ؎

کون جانے کتنی باقی کس کے پیمانے میں ہے
جتنا جس کا ظرف ہے اتنی ہی میخانے میں ہے
کیا مری رسوائیوں میں تیری رسوائی نہیں
نام ترا بھی تو شامل میرے افسانے میں ہے

موہن صاحب مناسب داد وصول کئے جو چلے تو پھر سامنے والے من چلے ونس مور۔ ونس مور کے نعرے بلند کرنے لگے۔ اب اس جمود کو توڑنے کے لئے محترم مولانا مظفر حسین ایم۔ پی کچھوچھوی نہایت اعتماد اور دلکشی سے غزل سرا ہیں ؎

حریفوں سے شگفتہ خاطری دیکھی نہیں جاتی
یہ غم تو دیکھ لیتے ہیں خوشی دیکھی نہیں جاتی
اُلجھنا ہی پڑے گا ہم کو طوفانوں سے موجوں سے
کہ طوفانوں کی ہم سے خودسری دیکھی نہیں جاتی
یہ دستورِ چمن اک روز مجھ کو توڑنا ہوگا
گلوں کی اس طرح بے حرمتی دیکھی نہیں جاتی

داد کا عالم نہ پوچھئے مولانا محفل پر چھائے جا رہے ہیں نہ جانے قبلہ اب تک کہاں چھپے رہے اور آپ اسی گرم جوشی سے محفل کو گرما اور چونکا رہے ہیں ؎

سرِ محفل کچھ اربابِ نظر ایسے بھی ہیں جن کی
نظر روشن ہے لیکن روشنی دیکھی نہیں جاتی

قبلہ مولانا مظفر صاحب کو جو محفل میں تنگی تعبیر کر رہا کی صورتحال [illegible] بھرے تشریف لا رہے ہیں اب اس عالم میں الحاج شمسی مینائی نے آکر وہی سنے سنائے قطعات اور ایک طویل نظم کا جب آخری مصرعہ

تقسیم ختم کرکے وطن کو ملائیں ہم

سنا کر چلے تو ایک نعرہ بلند ہوا بھارت ماتا کی جے۔ شمسی صاحب کے ان خیالات نے محفل کا نقشہ ہی بدل دیا ہے انھوں نے یہ تک نہیں سوچا کہ پاکستان کے معزز مہمان بھی تشریف فرما ہیں وطن شاد کو ستم کر کیا اثر قائم کریں گے۔ ٹھیک ہے شمسی صاحب ہم [illegible]

[illegible] اور بہت سے لوگوں کی رائے سے اتفاق کرنا پڑے
[illegible] صاحب [illegible] اپنی رائے کا اظہار کر کے محفل
میں بھی نہیں بلکہ آخر اب حاتم سرائی سے حاصل بھی کیا ہوتا
ہے۔ پاکستانی شعراء تو محو ہو چکے ہیں خود ہندوستانی بھی اس
وقت کی رنگینی کو بڑا محسوس کر رہے ہیں۔ وہ دیکھئے ۱۱ بجے
مدیر ماہنامہ صاحب تشریف لا رہے ہیں اور اکمل الہ آبادی
صاحب نے ایک غزل چھیڑی ہے سماعت فرمایئے

لہروں کی طرح ہم تم اک دوجے میں ڈھل جائیں
معلوم نہیں رستے کب اپنے بدل جائیں
ہم کتنے عجب ہیں کہ بہلے نہ کبھی تجھ سے
اور یہ کہ کبھی تیری باتوں سے بہل جائیں
اس دورِ کشاکش کا اکمل یہ تقاضا ہے
کچھ تم بھی بدل جاؤ کچھ ہم بھی بدل جائیں

اکمل صاحب کی خوب خوب پذیرائی ہوئی اب ذائقہ بدلنے
کے لئے بوکس حیدر آبادی جو مائک پر آئے تو ایک آواز
بلند ہوئی — نماز پڑھاتا ہے — اس پر ایک قہقہہ بلند
ہوا چونکہ بوکس صاحب ماشاء اللہ باریش، شلوار اور قمیص
میں ملبوس ہیں آپ فرما رہے ہیں

حسن میں ناز و ادا ہو تو پرستار بہت
زلف گر جال بچھائے تو گرفتار بہت
اس سے کیا بحث کہ بوکس کی غزل کس نے کہی
مال اچھا ہے تو دنیا میں خریدار بہت

قہقہوں کا سیلاب ہے جو ہال پر چھا گیا ہے پھر پرانے اشعار
سے محفل کو قہقہہ زار بنانے چلے ہیں

وہ دلہن ہماری بنتی جو اسے بھی پیار ہوتا
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
نہ ہوا تقرر اپنا اسی غم میں مر گئے ہم
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کئی بار ہیرو بن کر میں فلم میں مر چکا ہوں
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر اعتبار ہوتا
[illegible] جنازہ کا مسافر وہیں جا کے مر ہی جاتا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

بوکس صاحب ہال میں ہنڈ ہاؤس کو ہلا دیتے تالیوں کے شور
میں جا رہے ہیں بوکس صاحب اپنا پہلا مصرعہ تو تحت سے
پڑھتے ہیں اور غالب چچا کا دوسرا مصرعہ ترنم سے۔ اس پر
یار لوگوں نے خوب غل غپاڑہ کیا لیجئے اس تفریحی ماحول و فضا
کو بدلنے کے لئے ملک کے مشہور مترنم اور غزل گو شاعر حق
کانپوری غزل سرا ہیں

بہت بڑی ہے اذیت یہ جان و تن کے لئے
وطن میں رہ کے جو تر سا کریں وطن کے لئے
ہر ایک شخص کے ہاتھوں میں آج پتھر ہے
کہاں سے لائیں ہم آئینہ انجمن کے لئے
خلوص دیکھ کے رہبر کی دل نوازی کا
دعائیں مانگ رہا ہوں میں راہزن کے لئے
یہ شاعری کوئی بازی گری نہیں اے حق
شعور شرط ہے تہذیبِ فکر و فن کے لئے

حق صاحب محفل پر وجدانی کیفیت طاری کر کے داد و تحسین
پا کر شاداں آ رہے ہیں اس عالم تشنگی میں اب رفعت سروش
اس امتحان گاہ میں عنایت کر رہے ہیں

پھول رخسار کو آنکھوں کو کنول ہی کہئے
اور جب کہئے باندازِ غزل ہی کہئے
دفن ہر قبر میں حسرت و امید کی لاش
کوئی مرقد ہو اسے تاج محل ہی کہئے
حسن بیگانہ ہے بیگانہ ہے آرائش سے
اس کی تعریف میں بے ربط غزل ہی کہئے

سروش صاحب داد لوٹ کے واپس ہوئے تو محترمہ شبنم گرود
فرما رہی ہیں

حقیقتوں سے وہ نظریں چرائے جاتے ہیں
تصورات کے ایواں سجائے جاتے ہیں
عجیب رسم تبسم ہے صحن گلشن میں
پلاتے درد ہیں اور غم کھلائے جاتے ہیں

شبنم صاحبہ کچھ عجیب ڈھنگ اور نرالے انداز سے پڑھتی ہیں

۱ ۔ [illegible] ہوئی تو مبارک اور اگر اشعار کی دم سے تو پھر یہ برائی کرنے والوں پر لعنت (اداره)

مقطع تمام اُن کے اشعار سحر میں آتے ہیں آیئے پھر ملک زادہ منظور صاحب سے یہ اجواب اشعار سُنئے ؎

مقتل مقتل اہلِ ستم کا حوصلۂ دل دیکھا ہے
ہم نے فرازِ دار سے اکثر کوچۂ قاتل دیکھا ہے

صحرا ۔ زنداں ، طوق و سلاسل آتش زہر اور دار و رسن
دُنیا نے تاریخِ وفا کا بس یہی حاصل دیکھا ہے

زنداں زنداں شورِ سلاسل گلشن گلشن شورشِ گل
ابکے برس منظور نے ساحل ساحل دیکھا ہے

منظور صاحب داد وصول کئے اپنی جگہ آ کر دعوتِ غزل دے رہے ہیں، پاکستانی شاعر محسن احسان کو۔ محسن صاحب تالیوں کی جھنکار میں آ کر عطا کر رہے ہیں ؎

سجا سجا کے رکھا جن کو آئینوں کی طرح
تری نظر سے تو بکھرے ہیں کرچیوں کی طرح

اور مطلع ہی سے شباب پر ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

بکھر گئے تو سمیٹا نہ زندگی نے ہمیں
نکھر گئے تو دمکتے ہیں موتیوں کی طرح

یہی مزاج ہے اپنا کسی کا دل نہ دُکھے
جُدائیوں کو بھی چاہا ہے قربتوں کی طرح

تری طلب کا دل آویز حادثہ ہم نے
بھلا دیا ہے کسی اور حادثوں کی طرح

اور داد پر کسی ہنگامہ[1] کا گمان ہو رہا ہے اور آپ اُسی خلوص سے محفل کو لوٹنے چلے ہیں ؎

کبھی زمیں کو بھی دیکھو فلک نشیں یا رو
ہیں پستیاں بھی مقدس بلندیوں کی طرح

محسن صاحب محفل کو لوٹ کر تالیوں کی جھنکار میں مائک سے جُدا ہو رہے ہیں اور ادھر تالیوں کے شور[2] میں نور اندوری آ کر چھا رہے ہیں ؎

مجھے رحمتوں سے شکایت نہیں ہے
گنہگار تو ہوں ندامت نہیں ہے

لیجئے جس ہال شکن ترنم سے نور صاحب محفل کو گرما رہے ہیں داد بھی اسی بے ساختگی سے دی جا رہی ہے لیکن یہ رحمتوں سے شکایت کیوں ہوتا ہے ؟ آپ اسی سج دھج سے لہرا رہے ہیں ؎

خدا جانے کس موڑ پر ہے زمانہ
کسی کی زباں پر صداقت نہیں ہے

لبوں پر تبسم کا پردہ پڑا ہے
ہنسی لب پہ ہے اور مسرت نہیں ہے

مرے ہاتھ میں اب آ گیا اُن کا دامن
مجھے اب کسی کی ضرورت نہیں ہے

نور صاحب زور آزمائی کر کے کامراں جا رہے ہیں لیکن آج وہ لہک اور اٹھان نہیں ہے۔ غالباً یہ شرابِ ناب میں زیادہ ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیجئے ۲ بجے گجرال صاحب بھی جا رہے ہیں۔ مطلعاً منظفر صاحب ایم۔ پی ان کی جگہ صدر بنائے جا رہے ہیں ادھر چاند بدایونی اپنے کرتب دکھانے چلے ہیں ؎

دستور سے صحنِ چمن میں اُگائے جائیں گے
اور اک روز کھلیں گے گلاب گھوڑے پر

یہی جو حالِ ترنم رہا تو کچھ دن میں
کہیں گے لوگ غزل گا کو تان پورے پہ

پھر محفلِ شعر و سخن ہُلڑ بازی کی نذر ہو رہی ہے قدرے توقف کے بعد چیخ رہے ہیں ؎

ملنے خود آئی ہے کلوا کی بہن آج کی رات
کیوں نہ پھر ناز کریں شیخ مدن آج کی رات

وصل کو دیکھ کے مُنے کے گدھے نے یہ کہا
دو ستاروں کا زمیں پر ہے ملن آج کی رات

چاند صاحب محفل کو غلّ غپاڑہ میں اُتار کر تالیوں کے شور میں مائک سے کھسک آئے ہیں اور رعنا امروہوی غزل سرا ہیں ؎

[1] یہ ہنگامۂ داد اگر پاکستانی ہونے کے باعث ہے تو دوسری بات ہے ورنہ اشعار تو ایسے ہیں کہ محض خاموشی سے سُن لئے جائیں (ادارہ)
[2] کرسی تک تالیوں کے ساتھ جھنکار اور شور کے علاوہ کوئی اور بھی تعریفی کلمات لگائے جا سکتے ہیں (ادارہ)

مہر وفا کی بزم آرائیوں میں + ابھی ہم نے دیکھا ہے پرچھائیں میں
تماشہ جو دیکھو نے اے زمانے + کہ ہم بھی کھڑے ہیں تماشائیوں میں
مرے اشک ہیں اور تری آستیں ہے + یہی وہم ہوتا ہے تنہائیوں میں

رفتا صاحب محفل والوں کی سی داد وصول کئے چلے بیٹھے اب اس محفل کو گرمانے چلے ہیں ڈاکٹر بشیر بدر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب کا نام سنتے ہی پھر سامنے والے نوجوان من چلے چیخ چلا رہے ہیں بھائی بشیر (بھائی بشیر) ۔ یہ شور شرابہ کم ہوا تو اپنے مخصوص ترنم سے ان من چلے اور سر پھروں پر یوں سحر کرنے چلے ہیں ؎

آنسوؤں کی جہاں پائمالی رہی
ایسی بستی چراغوں سے خالی رہی

جب کبھی بھی تمہارا خیال آگیا
پھر کئی روز تک بے خیالی رہی

دشمنوں کی طرح اس سے لڑتے رہے
اپنی چاہت بھی کتنی نرالی رہی

لب ترستے رہے اک ہنسی کے لئے
میری کشتی مسافر سے خالی رہی

ڈاکٹر صاحب محفل کو لوٹ کر تالیوں کی جھنکار میں مائک سے جدا ہو رہے ہیں ادھر نظر برقی نے مزاحیہ قطعات رواں دواں سنائے ہیں جنہیں میں نوٹ نہ کر سکا افسوس کہ نظر صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور روانہ کر دیں گے لیکن یہ شاعرانہ وعدہ[1] ہی رہا آیئے پھر ایک لہجہ ایک انداز ایک منفرد غزل مشیر جھنجھانوی سے بھی سنئے ؎

دل کو بھی خود کو درندوں سے بچائے رکھئے
آگ جنگل میں بدستور جلائے رکھئے
قدرِ الماس نگاہوں میں بڑھائے رکھئے
سنگریزوں کو برابر میں سجائے رکھئے
آج کا دور شرافت کا روادار نہیں
اپنے پاکیزہ خیالات چھپائے رکھئے

جانے کب کلمۂ حق منہ سے نکل جائے مشیر
اپنے کاندھوں پہ صلیبوں کو اٹھائے رکھئے

قبلہ مشیر صاحب داد و تحسین وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور جوش نعمانی رامپوری آلاپ رہے ہیں ؎

اطلس کی بندشوں میں پرندے کسے ہوئے
انجان ہیں ہواؤں کا رُخ جانتے ہوئے
شعلوں سے آگ آگ سے جب دراکہ ہو گئی
محسوس تب ہوا کہ ہمیں تھے جلے ہوئے
اس شب کبھی میں نہ لوٹ کے گھر آ تو سارا دن
پھرتا ہوں ایک بوجھ سا دل پہ لئے ہوئے

جوش صاحب یونہی سی داد لئے جا رہے ہیں اور منظور صاحب نہایت ادب و احترام سے زحمتِ غزل سرائی دے رہے ہیں محترم قمر مرادآبادی صاحب کو ۔ قبلہ اس پیرانہ سالی میں بھی جوان ترنم سے غزل چھیڑ رہے ہیں ؎

سناؤں دل کا افسانہ کہاں سے + محبت دُور ہے لفظ و بیاں سے
اگر دل کا دھڑکنا بے سبب ہے + تری آواز آتی ہے کہاں سے
تراغم گر نشاطِ دل نہیں ہے + تو آہیں کیوں نکلتی ہیں زباں سے
دلِ وحشی کو سجدے یاد آئے + گزر آیا جب اُن کے آستاں سے

قبلہ قمر صاحب ہر شعر پہ داد و تحسین پا کر شاداں تشریف لا رہے ہیں اور اب پاکستان کے مشہور شاعر و صحافی طفیل ہوشیارپوری محفل کا جائزہ میکر عطا کر رہے ہیں ؎

مرحلہ دید کا تکرار تک آپہنچا ہے
طور سے چل کے جنوں دار تک آپہنچا ہے
شمع نے لے لیا آغوش میں پروانے کو
جب یہ دیکھا مرے معیار تک آپہنچا ہے
اُن کی سرشار نگاہوں کا تصور جیسے
میکدہ خود لبِ میخوار تک آپہنچا ہے
مطمئن قبر کی آغوش میں ایسے ہے طفیل + راہرو جیسے در یار تک آپہنچا ہے

---

[1] کسی کے چرائے ہوئے اشعار مشاعرہ میں پڑھے تو جا سکتے ہیں مگر اپنے قلم سے لکھ کر کسی اخبار یا رسالہ میں برائے اشاعت دینے سے بعید گرفت کا امکان رہتا ہے کیا آپ بھول گئے کہ ان کی ایک ایسی ہی چوری پکڑی گئی تھی (ادارہ)

تبلہ عقیل صاحب محفل کو گرما کر داد و تحسین وصول کئے پلٹ رہے ہیں اور منظور صاحب اعلان کر رہے ہیں کہ جناب آر۔ کے۔ جین صاحب عروجِ ادب کو گیارہ ہزار روپے عطا کر رہے ہیں لیجئے تالیوں کا ایک دھماکہ سا دھماکہ ہے اور جین صاحب کو مائک پر لاکر ان کا شکریہ ادا کیا جا رہا ہے ادھر کیف بھوپالی کیا آئے کہ پھر ایک ہنگامہ بدوش ہیں۔ عالم رویا میں لہک رہے ہیں ؎

مت کسی سے کیجئے یاری بہت
آج کی دنیا ہے بیوپاری بہت

وہ ہمارے ہیں نہ ہم اُن کے لئے
دونوں جانب ہے اداکاری بہت

چار جانب دیکھ کر سچ بولئے
آدمی پھرتے ہیں سرکاری بہت

کیفؔ صاحب کوئی مسجد دیکھئے
میکدہ میں ہو چکی خواری بہت

کیف صاحب ہر شعر کو کم از کم چار پانچ بار دُہرا کر خوب خوب محفل کو تفریح سے ہم آغوش کرکے جا رہے ہیں اس عالم میں دوسرے شہر یارِ غزل خمارؔ بارہ بنکوی غزل سرا ہیں ؎

آنکھ ہیں خشک اشک باری ہے
جام خالی ہے دَور جاری ہے

جیسے مجرم کوئی سزا کاٹے
میں نے یوں زندگی گزاری ہے

کہنے والے بدلتے جاتے ہیں
عشق کی داستان جاری ہے

ہیں جنت نہیں حرم نہیں ہے دَیر
ایک دل کہ جہاں پہ سجاری ہے

مر کے بھی جینے والے زندہ ہیں
موت بھی زندگی سے ہاری ہے

نثار صاحب محفل کو اس شدید میں اداسگری میں مزید گرما کر لغزیدہ قدم آ رہے ہیں اور سوا دو بجے یہ یادگاری اور شستہ محفلِ شعر و سخن ختم ہو رہی ہے آج وہ [illegible] دور کو یار لوگ بھول سکے نگری کا وہ عالم ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔

ہر سال عروجِ ادب دلّی کی جانب سے ایک لاجواب اور کامیاب مشاعرہ منعقد ہوتا ہے اور اس انجمن کے اراکین نہایت خلوص اور لگن کے ساتھ اسے کامیاب کراتے ہیں یہ سبھی حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خدا حافظ۔

غزل

ڈاکٹر کے۔ کے۔ رشی
کوروکشیتر یونیورسٹی

ہر جوان چہرے پہ کیسے زرد کا آلام ہے
کیا کہیں یہ زندگی کی صبح ہے یا شام ہے

سوچتا ہے کچھ نہیں اس کو بجز مکر و فریب
کیا یہی مخلوق ہے انسان جس کا نام ہے؟

اب کسی سے کیا کرے کوئی تمنا دہر میں
جس طرف دیکھو تمناؤں کا قتلِ عام ہے

سخت حیرت ہے کہ نفرت اُن سے کرتے ہیں لوگ
پاس جن کے اک محبت کا ہی بس پیغام ہے

زندگانی عیش و عشرت کی سبھی کچھ اچھی نہیں
دلفریب آغاز لیکن دل شکن انجام ہے

شادمانی شاد کیا کر لے کسی انسان کو
یہ تو خود ہی مبتلائے گردشِ ایام ہے

اے بُتِ کافر سے اُمیدِ وفا کرتا ہے تو
یہ خیال اب چھوڑ لے دل یہ خیالِ خام ہے

درد ہی بس درد ہے اہلِ محبت کا نصیب
ہاں مگر اس درد میں ہی چین ہے آرام ہے

کچھ نئے فکر و عمل سے روشنی پیدا کرو
ہر طرف پھیلی ہوئی تاریکیٔ اوہام ہے

مسکرا کر کہہ دیا ہے اس نے دیوانہ ہمیں
اے دلِ ناداں محبت کا یہی انعام ہے

اے رشیؔ دل کی وفا [illegible]
یہ وفا کیش ہے اپنے دَیر میں بدنام ہے

نوخواندگاں کے لئے کتابیں
23 واں قومی انعامی مقابلہ

مندکرہ بالا انعامی مقابلے کے لئے درج ذیل زبانوں کے مصنفین کو مسودے بھیجنے کی دعوت دی
آسامی، بنگالی، گجراتی، ہندی، کنڑ، کشمیری، میالم، مراٹھی، اڑیہ، پنجابی، سندھی، تامل، تلگو اور اردو۔

اس قومی انعامی مقابلے کا مقصد تخلیقی قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے کہ وہ پڑھنے کی محدود صلاحیت کے مالک افراد کیلئے مطالعے کا مواد (معہ مناسب تصاویر) تیار کریں۔ مسودہ فل اسکیپ سائز کے کاغذ پر 50 سے زیادہ نہ ہو اور کاغذ کے ایک طرف ڈبل اسپیس پر ٹائپ شدہ / خوشخط لکھا ہو۔

انعامات :

ایک ایک ہزار روپے کے 5، انعامات ان مصنفین کو دیئے جائینگے جنکے مسودے متعلقہ زبان میں بہترین تسلیم کئے جائیں

اہلیت :

مرکزی یا ریاستی سرکار کی طرف سے کرائے گئے کسی سابقہ مقابلہ میں بھیجے گئے مسودات کو زیر غور نہیں لایا جائیگا۔

فارم اور قواعد حاصل کرنے کیلئے درج ذیل پتے پر خط لکھیں اور اپنے خط کے ساتھ 24 × 10 سینٹی میٹر کا لکھا لفافہ بھی بھیجیں جس کے اوپر کے سرے پر (انگریزی / ہندی میں) یہ الفاظ لکھے ہوں۔

"ٹوئنٹی تھرڈ نیشنل پرائز کمپٹیشن فار بکس فار نیو لٹریٹس"

مسودے پہنچنے کی آخری تاریخ (دستی یا بذریعہ ڈاک)، 31 اکتوبر 1981 ہے۔ ہر مسودے کے ساتھ بطور فیس واجبہ کراسڈ پوسٹل آرڈر کی شکل میں جو ڈائریکٹر، ڈائریکٹوریٹ آف ایڈلٹ ایجوکیشن کو نئی دہلی گھر سے واجب الادا ہو، بھیجے جانے چاہئیں۔

ڈائریکٹوریٹ آف ایڈلٹ ایجوکیشن

dae

ویسٹ بلاک نمبر 8، ونگ نمبر 7، دوسری منزل، آر کے پورم، نئی دہلی 0022

P. 81/85

(قسط ۱۲)

اُجین کے چند قدیم شعراء

محمد خالد عابدی
آل انڈیا ریڈیو اندور

پنڈت جھجھو سنگھ صادق

آپ بلند شہر (یو پی) کے پنڈت شرما خاندان میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور ہندی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ ریاست گوالیار آکر وکالت کا امتحان پاس کیا اور اجین میں باقاعدہ وکالت شروع کی۔ ابتدا میں افک بلند شہری اور بعدہٗ سید کرامت علی بشر اجینی سے اصلاح لی۔ شاعری کا شوق اجین آکر بڑھا۔ آپ بزم ادب (اجین) کے مشاعروں میں بھی شرکت فرماتے تھے۔ منشی ہیرالال وکیل آپ کے ہم وطن و متعارف تھے۔ جھجھو سنگھ صادق کے بارے میں سلطان احمد صدیقی رقم طراز ہیں کہ:

"صادق صاحب نے ایک ناول بھی تحریر فرمایا تھا۔ نام "فردوس عبرت" اخبار مشین پریس لاہور سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ صفحات اٹھیاسی ہیں۔ آپ کا کلام "آفتاب مالوہ" "مرصع" اور ملک کے دوسرے رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ زبان سلیس، بامحاورہ اور معانی سے پر ہے۔ استاد (بشر اجینی) کے رنگ کی پیروی کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ سید کرامت علی بشر مرحوم کے فارغ الاصلاح شاگرد تھے۔ اجین میں ۱۹۴۶ء میں اکہتر سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔

نمونۂ کلام:

وفا کا وعدہ فردا پہ مجھ کو ÷ کہ کل آتی نہیں ہے جیسے کل میں
تجھے یہ حسن خالق نے بنایا ÷ ادائیں، بانکپن میں، ناز نیم
اپنا عارض تاباں دکھا دو ÷ کہ قسمت کا پھولوں روشنی ہے
جو بنایا یار نے پھولوں کا زیور ÷ ہزاروں حسن نکلے سادگی میں
جی چاہتا ہے دل کی منت پہ بیٹھا رہ ÷ تجھ کو بٹھا کے سامنے باتیں کیا کروں
یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم ÷ بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

فرشتوں کا تو مری جان ہوگا تجھ سے
آرزو بن کے تری دل میں محبت ہوگی
فرہاد، پوچھ سختی ہجر ÷ ملاقات پہاڑ سا کاٹا ہے
مدت کے بعد خیال ملاقات آیا
آج بچھڑا ہوا اک دوست مجھے یاد آیا
غضب ہو گیا کھل گیا حالِ دل ÷ چھپاتے چھپاتے خبر ہو گئی
جو دیکھا کسی نے نگاہیں بدل کر ÷ تو رنگ اڑ گیا نظر جھکا کر

نذر محمد شرر:

آپ کی مختصر سوانح میں سلطان احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ "آپ کا نام نذر محمد تھا۔ والد کا نام وزیر محمد خان تھا۔ ۱۸۹۵ء میں اجین میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم کے بعد انٹرنس پاس کر کے اردو اسکول میں ٹیچر مقرر ہوئے۔ آپ کے اردو اسکول کے شاگردوں میں ریٹائرڈ پرنسپل سید مبشر علی، مختار احمد جاگیردار اور ملا قمر الدین وغیرہ ہیں۔ شاعری کا شوق اسکول کے زمانۂ تعلیم میں ہوا۔ حضرت علامہ بشر مد ظلہ کے پاس حاضر ہوئے۔ استاد نے شرر تخلص تجویز فرمایا۔ "بزم ادب" کے ماہانہ اور سالانہ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ آپ کا کلام اجین سے نکلنے والے رسالہ "آفتاب مالوہ" گلدستوں اور ملک کے مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتا رہتا تھا۔ آپ کا انتقال مختصر علالت کے بعد پینتالیس سال کی عمر میں ۱۹۴۱ء میں ہو گیا۔"

نذر محمد شرر مرحوم نے غزل، نظم، مرثیے، سلام سب ہی اصناف پر طبع آزمائی کی تھی۔ لیکن غزلیات زیادہ کہی ہیں۔ ان کے کلام میں قدیم رنگ ہے۔ سلاست اور معانی ان کا جوہر ہے۔

نمونۂ کلام :-

ہوئے [illegible] پروردگار پر
[illegible] فرق ہے [illegible]

مرقد میں کچھ نیا ہے اثر قلب زار پر
کیا لکھ دیا حضور نے لوحِ مزار پر

آنسو مستِ ناز کی یہ شوخیاں تو دیکھ
ٹالا ہے جھک کر [illegible] نثار پر

کھل جائے گی حقیقتِ [illegible] سب
کیفِ شباب آسکتا نہیں دم ابھار پر

اور کس کی یاد دلاتی ہے ماہِ نو
ہے زندگی فراق میں خنجر کی دھار پر

وہ دیکھ بار یار نہایت قریب ہے
اے مرغِ شوق اور ذرا جھوکے مار پر

مستِ جدائی میں نہیں موسمِ بہار بھی
شوقِ شگفتگی کا پھول ہے شاخِ چنار پر

اس شان سے دکھایئے جلوہ [illegible]
جائے نہ عیر نگہ کسی گلِ عذار پر

بارگاہ سر پہ شر ہے تو [illegible]
اپنی نظر ہے رحمتِ پروردگار پر

چاند نارائن رازداں مونس :

آپ پنڈت بشن نارائن رازداں کشمیری پنڈت کے خاندان میں ۱۸۹۱ء بمقام امرت سر پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی ابتدائی اردو، فارسی کی تعلیم امرت سر کے "مدرسۃ المسلمین" میں ہوئی بعد ازیں کرسچین کالج لاہور میں داخل ہوئے اور میرٹھ میں آپ کی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ شعر و سخن کا شوق زمانۂ طالب علمی سے تھا۔ چنانچہ آپ نے پنڈت سروپ نارائن رازداں "یقین" جو کہ بذاتِ خود بھی شاعر تھے کو اپنا کلام بغرض اصلاح دکھایا۔ جب آپ میرٹھ کے طالب علم تھے تو ایک ناول "دھوپ چھاؤں" بھی آپ نے شائع کیا۔ بچوں کے لئے ایک نظم "بڑا گھر" بھی لکھی جو رام نارائن لال بکسیلر اینڈ پبلشر الہ آباد نے شائع بھی کی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں الہ رام نارائن لال الہ آباد نے ان کے افسانوں کا مجموعہ "بادھوی" بھی شائع کیا تھا۔ آپ کا کلام ملک کے متعدد جرائد میں چھپتا تھا۔

پنڈت چاند نارائن رازداں مونس بسلسلۂ ملازمت ریاست گوالیار ۱۹۰۷ء میں وارد ہوئے تھے۔ وہ سینٹرل انڈیا ریلوے میں اے۔ ٹی۔ ایس تھے۔ ریلوے سروس سے بعد آپ ۱۹۳۶ء میں سبکدوش ہوئے۔ اور اوجین میں ہی آپ کی مستقل اقامت رہی۔ ذوقِ شعر و سخن کے ساتھ ہی آپ کو فنِ موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ "ہزماسٹرز وائس" نے آپ کے کئی ریکارڈ بھی بنائے تھے۔ آپ معمر ہوتے ہوئے بھی علمی، ادبی، مذہبی اور سماجی میدان میں پیش پیش رہے۔ اسکاؤٹ کمشنر، تھیوسافیکل سوسائٹی کے صدر، "مہیلا سیوا آشرم" کے منتظم، نابیناؤں کی سوسائٹی کے ناظمِ اعلیٰ، ماتر سیوا سنگھ (تعلیم نسواں اسکول جس میں خواتین کو خود کفیل ہونے کی تعلیم و تربیت نیز صنعت و حرفت سکھائی جاتی ہے) میونسپل کمیٹی کے صدر، رازداں چیریٹیز اور ایک گاؤں پنگل ایشور گود لے کر وہاں دھرم شالہ اسپتال وغیرہ قائم کیا۔ بیگم رازداں بھی اوجین کانگریس کی ایم۔ ایل۔ اے (۱۹۵۷ء-۱۹۶۳ء) رہیں۔ حلقۂ نسواں میں خدمتِ خلق کرتی رہیں۔

پنڈت چاند نارائن رازداں مونس قدیم تہذیب و شرافت، ہندو مسلم اتحاد، شرافت، جلن سازی اور محبت وغیرہ کی ایک مثال تھے۔ آخرش پنڈت چاند نارائن مونس کا انتقال اوجین میں ۲۹ دسمبر ۱۹۷۹ء میں تقریباً نوے سال کی عمر میں ہوا۔ بقولِ سلطان احمد صدیقی "آنجہانی پنڈت چاند نارائن "GRAND OLD MAN OF UJJAIN" کہلاتے تھے۔ آپ کا کلام عشقِ حقیقی، تصوف، سلاست روانی، فصاحت، دہلوی زبان اور دلکش و دلآویز سے مملو ہے۔ آپ نے تقریباً سبھی اصناف پر طبع آزمائی فرمائی لیکن بالخصوص "غزل" کی طرف زیادہ توجہ فرمائی تھی۔

نمونۂ کلام :

دل کہاں ہے عطائے شب فاک ۔ اس کو لے ہے بہار زندگی
یادہی اس زندگی کی جان ہے ۔ ہے محبت ہی بہار زندگی

تمہیں آئے جانے سے فرصت ہے لیکن
جو تیجے میں بھی تم نہ آؤ تو جانوں
کہا میں نے مرتا ہوں تب مجھ سے بولے
قسم میرے مرنے کی کھاؤ تو جانوں

جو آتے ہو میں تک آتی ہے + تم جو جاتے ہو دم نکلتا ہے
مسکراتے ہیں وہ زیر لب ۔ منہ پہ کر مجھے خفا کر کے
بند عشق کی ہے ناکامی ۔ آزمائیں گے انتہا کر کے
ساری دنیا کی نعمتیں دے دیں ۔ اک قناعت مجھے عطا کر کے
وفا موش سے ملا مو کنس ۔ جو نہیں پا سکے دعا کر کے

گوری پرشاد کچلو :

آپ پنڈت کامتا پرشاد کچلو کے یہاں ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے ۔ آپ نے فارسی اردو کی ابتدائی تعلیم مولوی صاحبان سے اور سنسکرت اور ہندی پنڈتوں سے حاصل کی ۔ بھگوت گیتا کے عمیق مطالعے اور تازندگی اس کے فلسفۂ عمل پر عمل پیرا رہے ۔ انگریزی تعلیم کے حصول کے بعد ملازمت میں داخل ہوئے ۔ درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے کلکٹر اور ڈویژنل کمشنر ہوئے ۔ سلطان احمد صدیقی کے والد ماجد محمد عبدالرشید مرحوم سے گہرے روابط تھے ۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میونسپل کمیٹی اوجین کے ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے ۔ ۱۹۳۰ء میں اوجین تشریف لائے ۔ سلطان احمد صدیقی نے گوری پرشاد کچلو کی وضع قطع کے بارے میں مجھے ذاتی طور پر لکھا ہے کہ :

" قد تقریباً چھ فٹ ، دوہرا بدن ، کتابی چہرہ ، ستواں ناک بڑی بڑی آنکھیں سرخ و سفید رنگ رخسار جیسے کشمیری سیب شاہانہ مزاج ، نفاست پسند ، جامہ زیب چوڑی دار پاجامہ شیروانی ، سیاہ بال دار ٹوپی استعمال کرتے تھے اور ہاتھ میں چاندی کے موٹھ کی بید "

[illegible] سلطان احمد صدیقی [illegible] [illegible] مزاج کے بارے میں لکھا ہے کہ [illegible] گرمیوں میں [illegible] پر محفل آراستہ [illegible] ۔ [illegible] جیسے پلنگ کا پاجامہ زیب تن کر کے [illegible] عمائد شہر ، حکام ، اہلکار ، شہری ، [illegible] کا مجمع لگا رہتا تھا ۔ [illegible] "

گوری پرشاد کچلو نے انجمن [illegible] میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا ۔ اوجین میں [illegible] کی آمد سے شعر و شاعری کی محافل میں جان پڑ گئی تھی ۔ [illegible] ۲۶ [illegible] ۱۰ اگست ۲۰ [illegible] اوجین [illegible] نمائش میں ان کے اشتراک سے مشاعروں کا انعقاد [illegible] نمائش میں " کل ہند مشاعرہ " کی داغ بیل [illegible] آپ نے اوجین کے بیشتر اردو ادب [illegible] کو [illegible] کا ۔ لیکن یہ فیض عام [illegible] ۔

گوری پرشاد کچلو نے انجمن [illegible] اوجین [illegible] بارٹا ہائی اسکول اوجین [illegible] میں انہوں نے جو معلوماتی خطبے پڑھے تھے وہ اب بھی [illegible] ۔ ایک خطبے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے :

" بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اردو کسی بیرونی ملک یا دیگر قوم کی زبان ہے ۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو اپنے ملک میں پیدا ہوئی اور یہیں [illegible] یہاں رہے گی ۔ اردو کے نام سے زمانے کے ساتھ ساتھ [illegible] بدلتے رہے [illegible] ہندوی ، ہندی ، ریختہ ، اردوئے معلیٰ [illegible] کیا گیا ۔ اب اگر اردو کے نام [illegible] کے اختلافات دور کرنے کا بہتر [illegible] ہندوستانی زبان کے نام سے استعمال کریں [illegible] اردو کے ساتھ عام فہم [illegible] ترتیب دیں جس کا [illegible] آزاد ہونے کے چند سال قبل [illegible] کی یہ یادگار [illegible]

اندور [illegible] ہائی اسکول [illegible]

فضولیات کی خوبصورتی سے چیلنج کرتے ہوئے اپنے خیال کی وضاحت میں فرمایا ہے۔

"موجودہ دور میں زبان کا مسئلہ ایک عقدۂ لاینحل بنا ہوا ہے لیکن غالب حالی نے شعر اور خطوط میں جو شیریں الفاظ اور محاورات استعمال کرکے کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی شگفتہ جیسی پتھر اور نرمل زبان کو جنم دیا ہے وہ ہمارے لئے شاہراہ بن سکتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہم اپنی ہندوستانی زبان کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔"

سلطان احمد صدیقی نے آنجہانی کپلو کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

"حضرت کپلو نے غزلیں اردو ہی میں نہیں لکھیں۔ اردو ہی میں حضرت نے نظمیں لکھیں اور چھپوائیں ہندی اخبارات میں یا سائیکلو اسٹائل کر کے عوام میں۔ حضرت کپلو نے جو نظمیں اردو میں کہی ہیں ان میں سلاست اور روانی سے اردو یا ہندوستانی زبان کا جو معیار قائم کیا ہے اس کی پوری پابندی کی گئی ہے۔ حضرت کپلو کی نظموں کو دیکھ کر پنڈت نارائن چکبست کی یاد آتی ہے۔ وہی اندازِ بیان اور وہی رنگ ہے۔ کیوں نہ ہو دونوں ارضِ کشمیر جنت نظیر سے تعلق رکھتے ہیں جن کی مادری زبان اردو تھی۔ ان کو زبان پر قدرت تھی۔ اس میں محاسن شعری موجود ہیں۔"

۱۹۷۹ء میں تقریباً اسی سال کی عمر میں گوری پرشاد کپلو ہمارے بیچ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

نمونۂ کلام:- کچھ سیاسی عناصر نے گوری پرشاد کپلو پنڈت نہرو کی حمایت و مخالفت میں ان کا ایک نقلی جنازہ نکالا تھا جو میونسپل کمیٹی کے دروازہ پر لا کر جلایا گیا تھا۔ آنجہانی کپلو نے اپنی نظم "جذبۂ آزادی" کے اواخر میں طنزاً یوں فرمایا ہے ؎

یوں کسی کے مارنے سے کوئی مر سکتا نہیں
جیتے جی تو جان سے اپنے گزر سکتا نہیں
موت سے ڈرتا ہے جو وہ کام کر سکتا نہیں
ڈر کے رہ جائے کوئی تو پھر ابھر سکتا نہیں
گو یہاں کہلا کر بھی کپلو کام کر جائیں گے
اس دھرتی کا اونچا نام کر جائیں گے

گوری پرشاد کپلو کی ایک اور نظم جو انھوں نے یومِ آزادی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء پر "نکتہ چینی کرنے والوں سے" عنوان کے تحت لکھی تھی۔ اس نظم کے اواخر میں بھی انھوں نے اپنے اسی غم و غصہ کا بارِ دگر اظہار فرمایا ہے ؎

ہو مخالفت لاکھ لیکن ان سے ڈر سکتے نہیں
جیتے جی نکلے جنازہ پھر بھی مر سکتے نہیں
نکتہ چینی کرنے والے کام کر سکتے نہیں
گر یہی حالت رہی تو ہم سدھر سکتے نہیں
ہم تو کپلو سچے دل سے قوم کی سیوا کریں
چاہتے ہیں دوست پھر بھی تو ہمیں رسوا کریں

غزل

ڈاکٹر منظر (بنگلور)

مہر ہے عشق کا جس دل میں درخشاں ہوگا
اس کا ہر قطرۂ داماں مہِ تاباں ہوگا
آخر انسان ہے فرشتہ تو نہیں ہے کوئی
آج انسان نہ ہوگا تو کل انسان ہوگا
ہر ادا اُن کی جو گر کے جاتی ہے آکر دل پر
میں سمجھتا ہوں یہی حشر کا میداں ہوگا
ضبطِ غم چاہیئے، اے دوست پریشاں کیوں ہے
دردِ دل ہی تیرا ہمدم کا درماں ہوگا
غم سے دل کو بڑی نسبتِ روحانی ہے
غم نہ ہوگا تو کہاں عشق کا ساماں ہوگا
تجھ سے گل زیبِ چمن ہی نہیں جس میں وہ حسن
کیا چمن ہوگا، بیاباں ہی بیاباں ہوگا
اُف کہ آنکھوں کا مسیحا ہی تو نکلا بیمار
کیا مسیحا سے میرے درد کا درماں ہوگا
کس کو معلوم تھی منظرؔ یہ حقیقت تیری
ڈاکٹر ہوتے ہوئے صاحبِ عرفاں ہوگا

پاس ہوگئے

ڈاکٹر [illegible] ارمان
(بنارس)

"کیا آج تمہارے پاس کوئی کام نہیں ہے جو سر جوڑے پانچوں بیٹھی ہو" کرسی اپنی طرف کھینچتے ہوئے شکیلہ نے کہا
"مرنا تو تم بھی شریک ہو جاؤ ہم میں" دینا نے مسکراتے ہوئے کہا "کس حد تک، بات یہ ہے بھئی کہ مرد تو سر پر چڑھ آئے تب بھی اس کا یقین نہیں کرنا چاہئے" دینا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"تم ہمیں بھی تو بتاؤ [illegible]" شکیلہ سنجیدگی سے بولی۔
"عورت کے ساتھ بامروت سلوک کے بارے میں" [illegible] نے کہا۔
"یہ تو حقیقت ہے کہ آج کل آدمی اتنا گر گیا ہے کہ خدا کی پناہ۔ کچھ لوگ تو یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ عورت مرد کے لئے ہے اور مرد عورت کے لئے یعنی رشتہ ناطہ کوئی چیز ہی نہیں ہے!"
"جس کسی پر دل آجائے اسی کو اپنا لو اور عیش کرو۔ ذرا سوچو تو سہی اگر عورتیں بھی مردوں کی پیروی کرنے لگیں تو یہ مرد منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ اور عورتوں کے پاکیزگی نام کی کوئی چیز دنیا میں نہ رہے گی۔"
"کچھ بھی ہو ایسا وقت آئے گا ضرور۔ آدمی کو بدلتے بھی کتنی دیر لگتی ہے۔ جس دن عورت بھی مرد کے ساتھ قدم ملا جائے گی اسی دن یہ فرسودہ اور گھسی پٹی پاک دامنی کی داستانیں ختم ہو جائیں گی۔ پرانے زمانے میں دام مارگی فرقہ بھی تو تھا" شکیلہ نے کہا۔
"کیا دام مارگی فرقہ؟" [illegible] بولی
"یہ ایک ایسا فرقہ تھا کہ اپنے گھر آئے مہمانوں کی خاطر مدارات کے لئے گھر کی بہو بیٹیوں کو بھی مہمانوں کی خدمت میں پیش کرنا فرض مہمان نوازی سمجھتے تھے" [illegible] نے اپنی معلومات کو فخریہ انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا۔
"یہ مہمان داری تو خوب رہتی ہوگی" چمپا نے حیرت انگیز لہجے میں کہا۔
"تمہیں حیرت ہو رہی ہے۔ آج کل نائٹ کلبوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا ہے" شکیلہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔
"تم کہتی ہو ہمارے یہاں تو وہ رات کو گیارہ بجے سے پہلے دہلیز میں قدم ہی نہیں رکھتے۔ اور آتے ہی ایسے ہو جاتے ہیں جیسے ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سر کر کے آئے ہوں۔ اگر دیر سے آنے کی وجہ پوچھتی ہوں تو گرجتے گرجاتے ہوئے جھنجھنا دیتے ہیں۔" چمپا روہنسی آواز میں کہا۔
"اس حمام میں سب ننگے دکھائی دیتے ہیں۔ کسی بھی مرد کا چلن ٹھیک نہیں ہے۔ سیکس کے معاملے میں ہر مرد ناپختہ ذہن رکھتا ہے۔ میرے آدمی میں بھی ایک لت ہے۔ جس پر ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی" شکیلہ دل کے پھپھولے پھوڑتے ہوئے بولی۔
"کیا لت ہے؟" دینا نے لقمہ دیا۔
"خواہ پارٹی ہو۔ خواہ کوئی شادی کی تقریب۔ یا بازار میں شاپنگ کی جا رہی ہو۔ جدھر عورتیں ہوں گی ادھر ہی گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جانے کیا ملتا ہے اس طرح ادھیڑ پن سے۔ مجھے تو کوئی آدمی شریف لگتا ہی نہیں۔ ہوگا کوئی زمانہ جب خواب میں بھی لوگ اچھی باتیں سوچتے تھے اور عقد سے بہن سمجھ کر اس پاک رشتہ کو زندگی بھر نباہتے تھے" شکیلہ بولی۔
"اری نگوڑی میرا شوہر بھی ایسا ہی ہے۔ گلی کوچوں میں مگر لس کالج کے چوراہے پر بازاروں میں اسی دھن میں گھومتا رہتا ہے کہ کوئی تو پھنسے گی۔ کماتا کماتی کوڑی نہیں ماں باپ کی کمائی ادھر ادھر پھونکتا رہا ہے۔ سب

مردوں کا یہی حال ہے۔ دیکھتی نہیں ہو راہ چلتے بازاروں میں کوئی اچھی صورت دکھائی دے جاتی ہے تو کوئی چور نظروں سے دیکھتا ہے کوئی کنکھیوں سے۔ کالا چشمہ لگانے والوں کا پتہ نہیں کہ وہ کیسے دیکھتے ہیں غرض دیکھتے سب ہیں اور ایسے دیکھتے ہیں کہ جیسے نگل جائیں گے۔" نمی بولی۔

"نمی تم سب کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کا کیریکٹر گرتا جا رہا ہے۔ شرافت ختم ہو چکی ہے۔"

"اور کیا یہ جھوٹ ہے؟"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہے اور نہ ہی دنیا میں ایسا کبھی ہوگا اچھائی برائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کبھی اچھائی زیادہ کبھی برائی زیادہ مگر یہ ختم کبھی نہیں ہوتی اور نہ کبھی ہوں گی۔ اسی زمین پر بے شمار ایسے مرد بھی ہیں جو نامحرم عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔"

"آہا ہا" سب کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

"ایسے ہی ایک مرد کا نام تو لیجئے۔" نمی نے کہا

"میرے آدمی ہی کو دیکھ لو۔ کبھی دوسری عورت سے پلٹ کر بات نہیں کرتا۔ عورتوں کے بارے میں چھوٹی باتیں تک نہیں سنتا۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی سندر ہے تو اپنے ہی کے لئے۔ کوئی دولت مند ہے تو اپنے گھر کے لئے۔ آدمی کو جو کچھ مل گیا اسی پر صبر کرنا چاہئے۔ اسی میں لطف ہے۔" رادھے نے فخریہ کہا

"ایسے لوگ صرف آدرش وادی ہی ہوتے ہیں بالکل بگلا بھگت جو شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور اندر سے بالکل اس کے برعکس۔ آدمی کی یہ فطری کمزوری کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ باتیں چاہے کوئی کیسی ہی کرے۔" شکیلہ نے اعتماد سے کہا اور سب ہی نے اس کی پرزور تائید کی۔

"شکیلہ۔ ایک بات سب پر لاگو نہیں ہو سکتی۔ کوئی کیسا ہی ہو مگر میرا آدمی تو دیوتا ہے دیوتا۔ میں سب کچھ سن سکتی ہوں مگر اپنے آدمی کی برائی نہیں سن سکتی۔" رادھے نے کہا۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔" نمی نے ریمارک کسا اور کچھ دیر کے لئے سب خاموش ہو رہیں۔ یکایک نمی نے تجویز رکھی کہ کیوں نہ آج رادھے کے پتی کی شرافت کا امتحان لیا جائے۔ سب کو اپنا ہم نوا پا کر نمی کہنے لگی کہ رادھے کے پتی میرے دیور لگتے ہیں۔ میں ان کے بستر پر لحاف اوڑھ کر سو جاؤں گی اور تم تینوں دوسرے کمرے میں کھڑکی پر کھڑی چپ چاپ دیکھتی رہنا اور رادھے پلنگ کے نیچے لیٹ جائے گی۔"

"اگر انھوں نے اندر آتے ہی کمرے میں اکیلی دیکھ کر دروازہ بند کر کے دھر دبوچا تو؟"

"آدمی دنیا میں سب کچھ کر سکتا ہے۔ مگر اپنی بیوی کی موجودگی میں کسی دوسری عورت سے ایسا نہیں کر سکتا۔" نمی کے اس جواب پر سب چپ ہو گئیں اور اپنے اپنے فرائض کی سر انجامی میں لگ گئیں۔

رادھے کے پتی شیام بابو دکان بند کرنے کے بعد گھر پہنچے اور دالان میں داخل ہوتے ہی چلانے لگے "رادھے او رادھے اری کیا بات ہے جو آج سنسان ہے۔ وینا۔ وینا؟ بھئی عورتیں بھی بڑی لاپروا ہوتی ہیں۔ کہیں جانا ہی تھا تو دروازہ بند کر کے تو گئی ہوتیں لوگ آنکھوں کے سامنے سے بستر اٹھا لیتے ہیں۔ انٹیچیاں غائب کر دیتے ہیں۔ جیبیں کاٹ لیتے ہیں تو بھلا گھر میں سے مال و اسباب صاف نہیں کیا جا سکتا۔" کہتے کہتے وہ کمرے کے اندر آ گئے۔ نظر پلنگ پر پڑی "یہ لحاف اوڑھے پلنگ پر کون سو رہا ہے" بڑبڑاتے ہوئے وہ ادھر بڑھے اور لحاف اٹھاتے ہوئے "رادھے کچھ طبیعت..." دیکھتے ہی وہ چونک اٹھے "بھابی آج تک تم میرے کمرے میں نہیں آئیں آج یہاں کیسے سو رہی ہو" پلنگ سے دور ہٹ کر بولے۔

"کئی دنوں سے میں ایسے موقع کی تلاش میں تھی۔ آج یہ موقع ملا ہے کہ وہ دونوں پڑوس میں گئی ہیں۔ جلدی سے آنے والی نہیں۔ میں تم کو بہت چاہتی ہوں یہ موقع غنیمت جان کر یہاں لیٹ گئی آؤ تم بھی میرے ساتھ لیٹ جاؤ"

اور اگر تم نے میری خواہش ٹھکرا دی تو میں شور مچا دوں گی کہ شیام بابو نے مجھے کسی بہانے سے یہاں بلا کر پکڑ لیا اور میری عزت لوٹنے کی کوشش کی۔"

"اگر تم شور مچا سکتی ہو تو میں بھی تو شور مچا سکتا ہوں۔ کوئی مرد کسی عورت کی آبرو لے سکتا ہے تو کیا کوئی عورت بھی مرد کی آبرو لے سکتی ہے؟" یہ کہتے ہوئے شیام بابو ایسے پیچھے ہٹے جیسے چھپکلی ہوتی ناگن سے گھبرا گئے۔ بیچی نے فوراً آگے بڑھ کر دھوتی پکڑ لی اور اپنی طرف کو کھینچی۔ دھوتی کھلتے کھلتے بچی اور جلدی سے شیام بابو نے دونوں ہاتھوں سے دھوتی پکڑ لی۔

"بیچی۔ یہاں سے تم ابھی چلی جاؤ ورنہ میں تمہارے گھر جا کر بھیا سے سب کچھ بتاتا ہوں۔ گھر بھی بھر میں سارا بھوت اتر جائے گا۔ پاگل کہیں کی۔" یوں کہتے ہوئے دھوتی کو سنبھالتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلے تو صحن میں چھوٹی بیٹا سوئیٹر بن رہی تھی۔ "تیری بھابی کہاں ہے؟"

"آپ کے کمرے میں۔"

"بدتمیز۔ جب میں کمرے میں گیا تو تو وہاں تھی۔ پتہ ہے کمرے میں کون ہے؟" شیام بابو نے غصّے سے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"بھیا میں تو اُس وقت رسوئی میں تھی۔ رہی بھابی جی کی بات وہ آپ کے کمرے میں ہیں۔"

"تیرا دماغ تو خراب نہیں ہے۔"

"نہیں بھیا میں سچ کہہ رہی ہوں۔ جا کر دیکھ لو بھابی پلنگ پر لیٹی ہوں گی۔" بیٹا اطمینان سے بولی۔

"میری بھابی یا تیری بھابی۔"

"میری بھابی۔ آپ کی رادھا۔" یوں کہہ کر وہ سوئیٹر بننے لگی۔

"ذرا میرے ساتھ چلنا۔"

"چلئے۔" بیٹا پیچھے پیچھے چل پڑی دروازہ پر پہنچ کر اُس نے کہا "بھابی!"

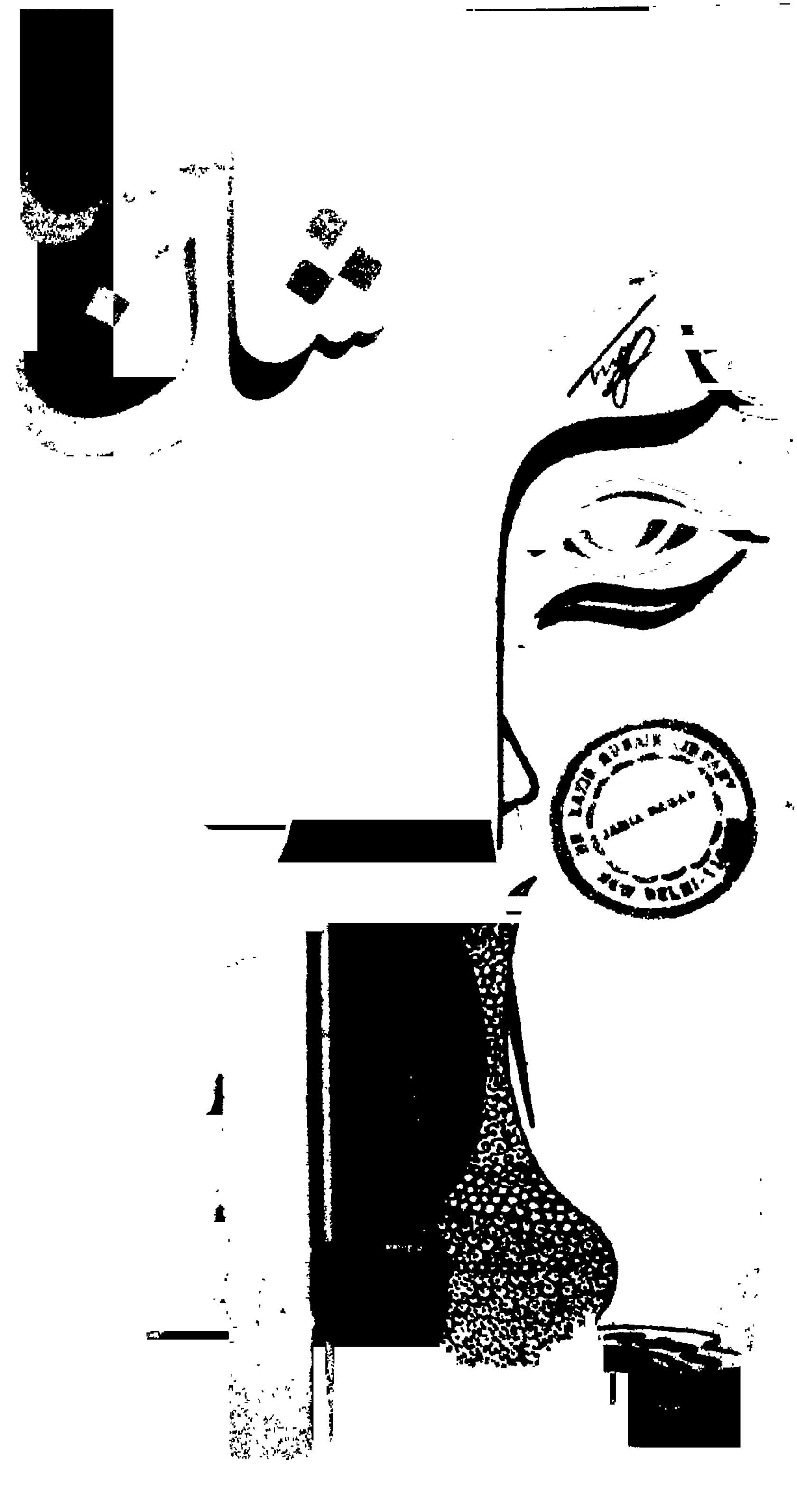
"ہاں بیٹا۔" اندر سے آواز آئی بالکل رادھا کی آواز "بھیا آ رہے ہیں۔"

"آئینے آئینے آپ کو سب لا پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔" یہ سن کر شیام بابو حیرت میں پڑ گئے۔

"تم جادوگرنی کب سے بن گئیں؟"

"جب سے میری سہیلیوں نے آپ کو ٹھیک کی نظر سے دیکھا ہے۔" اتنے میں پھاٹک کھلنے کی آواز آئی اور بچی نکلی اور بکھری کی اوڑھ سے وہ تینوں بھی کمرے میں آ گئیں اور سب مل جل کر ان کے پیر چھو چھو کر بانکا ہو گئیں۔

"پائلاگو" کہتے ہوئے کھلکھلا کر ہنستی ہوئیں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ شیام بابو سب کا منہ دیکھتے رہے اور کچھ بھی نہ سمجھے۔

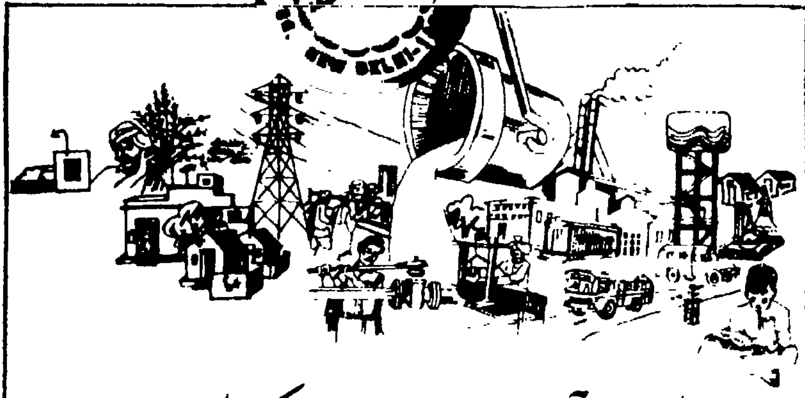

JAMIA NAGAR
NEW DELHI



ہر ماں اور باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کا لاڈلا دُنیا کی آنکھ کا تارا بنے۔ صرف اُن کا ہی نہیں۔ قوم کا ملک کا بھی نام روشن کرے، ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے۔ یہ خواہش اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر آپ نے اس سلسلہ میں کیا کچھ کیا ہے۔ اس کی ابتدا پنگوڑے میں ہی کرنی چاہیے۔ اپنے لاڈلے کو "ممتا" دیجئے یہ ننھے بچوں کا خاص ٹانک ہے جو ایک ماں کی طرح ان کی حفاظت کرتا ہے جسم میں کیلشیم کی کمی کو دُور کر کے ہڈیوں کے ٹیڑھے پن کو روکتا ہے۔ ننھے بے زبان بچوں کو قبض سے نجات دلاتا ہے۔ نزلہ اور زکام میں بھی مفید ہے۔ بچوں کو ہنستا اور خوش و خرم رکھنا ہی "ممتا" کا کام ہے۔ اپنے بچے سے پیار ہے تو اسے "ممتا" ہی دیجئے اور دیکھئے وہ کتنی جلدی جلدی پروان چڑھتا ہے۔

قیمت بڑی شیشی: چھ روپے
قیمت چھوٹی شیشی: تین روپے پچاس پیسے

شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی





ہریانہ سماجی مساوات کی راہ پر

ہند میں سماجی و اقتصادی نابرابری کو ختم کرنا [illegible] اور اقتصادی محرومیوں سے نجات [illegible] عوامی معیار زندگی کو بلند کرنا ہی حصول آزادی کا بنیادی مقصد ہے۔

ہریانہ انہی مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے اسوقت متعدد سکیمات پر عمل پیرا ہے۔ ہماری ترقیاتی حصولیابیاں [illegible] حوصلہ افزا ہیں اور ہم ان طلبہ تخلیقاتی سکیمات اور ان کی مفید سرانجام دہی کے لئے ممنون ہیں جو دور رس [illegible] حاصل ہیں۔

زراعت:۔ چھٹے پانچسالہ پلان کے اختتام تک 3.93 لاکھ ہیکٹر مزید اراضی زیر آبپاشی [illegible] چھٹے پلان میں آبپاشی سکیموں پر 330 کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے۔ عالمی بینک کے تعاون سے نہروں [illegible] جباہوں کو پختہ بنانے میں ڈھائی ایکڑ زمین کے مالکان سے کوئی خرچ نہیں لیا جائیگا جبکہ اس سے زیادہ زمین کے مالکوں سے خرچ کا نصف حصہ وصول کیا جائیگا۔

بجلی:۔ ترقی کے پہیئے کو حرکت دینے میں بجلی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس [illegible] ریاست [illegible] کام [illegible] یمنا نگر کے قریب 60 میگاواٹ کے ہائیڈل پراجیکٹ پر [illegible] سے کام ہو رہا ہے۔

1020 میگاواٹ صلاحیت کے [illegible] پراجیکٹ پر تیز رفتاری سے کام ہو رہا ہے اور یمنا نگر میں 800 میگاواٹ کا تھرمل پلانٹ جلد لگایا جا رہا ہے۔

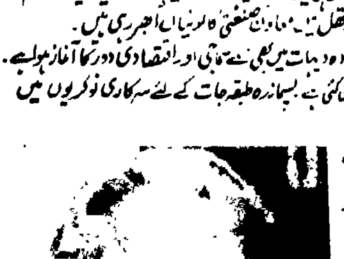
تمام ہریجن بستیوں (3456، 22000 [illegible] اور 1700 گاؤں کی گلیوں کو بجلی [illegible] سے منور کیا گیا ہے۔ 32000 ٹیوب ویلوں کو بجلی سپلائی کی جا رہی ہے۔

گزشتہ نومبر میں وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی [illegible] پروگرام شروع کیا گیا تھا۔

صنعتی فروغ:۔ 67-1966ء کے 4 [illegible] روپے کے مقابلے میں صنعتی اشیا کی [illegible] قیمت 1000 کروڑ روپے تک پہنچ گئی ہے۔ غیر ہریانوی صنعتکاروں کو ریاست میں صنعت لگانے کے لئے دلکش مراعات دی جا رہی ہیں۔ ریاست میں [illegible] چھوٹے صنعتی یونٹ ہیں جبکہ [illegible] 1966ء میں صرف [illegible] تھی۔ ابھی حال ہی میں صرف دیہی علاقوں میں 2200 ایسے یونٹ قائم کئے گئے ہیں۔ دہلی کے نزدیک [illegible] انڈسٹریل کمپلیکس قائم کیا جا رہا ہے۔ [illegible] سونی پت اور بہادرگڑھ [illegible] صنعتی کالونیاں ابھر رہی ہیں۔

نقل و حمل:۔ ریاست کے تمام [illegible] سڑکوں سے جوڑا گیا ہے۔ [illegible] جس سے ریاست کے دور افتادہ دیہات میں بھی نئے سماجی اور اقتصادی دور کا آغاز ہوا ہے۔

کمزور طبقہ جات کی بہبود:۔ 320000 ہریجن کنبوں کے معیار زندگی کو اونچا کرنے کے لئے ایک جامع سکیم مرتب کی گئی ہے۔ پسماندہ طبقہ جات کے لئے سرکاری نوکریوں میں [illegible] اور مزدوروں کے لئے 3 فیصد [illegible]



پسماندہ طبقہ جات کی نگہبانی کے لئے ایک الگ کارپوریشن بنائی گئی ہے [illegible] طریق کار کو اپناتے ہوئے پسماندہ [illegible] بہبود میں سرگرم عمل ہے۔ [illegible] ایکڑ سے زیادہ فالتو زمین بے زمین افراد میں تقسیم کی گئی اور 216000 بے گھر افراد کو مکانوں کیلئے پلاٹ دیئے گئے۔ ہریانہ [illegible] 75 فیصد مکان کمزور طبقہ جات کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔

پسماندہ علاقوں کی ترقی:۔ میوات کے پسماندہ علاقہ کی ترقی کیلئے سال 92-1981ء میں 3 کروڑ روپے خرچ کئے گئے۔

دیہات کو پینے لائق پانی کی فراہمی:۔ ہریانہ کا ہر چوتھا فرد اس وقت صاف اور پینے لائق پانی سے مستفید ہو رہا ہے۔ [illegible] آخر تک اس مسئلے سے دوچار تمام گاؤں کو اس سہولت سے فیضیاب کرنے کیلئے تیزی سے کام ہو رہا ہے۔

تعلیم:۔ 95 فیصد گرانٹ سے پرائیویٹ کالجوں کو [illegible]

چھٹا منصوبہ:۔ 3000 کروڑ روپے سے بنایا گیا چھٹا پانچسالہ پلان [illegible] ہماری ترقیاتی سرگرمیوں میں جدت [illegible] روزگار اور عوامی معیار زندگی کو بلند کرنے کے ساتھ ساتھ اقتصادی اور سماجی مساوات کا بھی حامل ہوگا۔

[illegible] میں کمزور ترین کو اوپر اٹھانا ہی ہمارا مقصد اولین ہے۔

جاری کردہ محکمہ تعلقات عامہ ہریانہ

ماہنامہ

شانِ ہند دہلی

ایڈیٹر
[illegible]

سالانہ : ۱۵/ روپے
فی پرچہ : ۱/۵۰ روپے

نمبر ۴۲	اکتوبر ۱۹۸۱ء	شمارہ نمبر ۱۰

توصیف علوی ہاشمی کیرانوی

باپائے قوم

زندگی کا وہ نرالا [illegible] دار / راہِ حق کا وہ انوکھا شہسوار
جنگِ آزادی کا وہ سالارِ قوم / وہ جہانِ حریت کا تاجدار
وہ کہ جس نے قوم کو دی زندگی / وہ کہ جس نے ہند کو بخشا وقار
امن کا رہبر اہنسا کا نقیب / وہ جہاں میں شانتی کا طرحدار
وہ نرالا پیکرِ حبِ وطن / دیش کا وہ اک حقیقی جاں نثار
وہ کہ جس کی زندگی کا ہر قدم / گلستانِ ہند کی وجہِ بہار
ہند کی تاریخ کا وہ بابِ نو / عظمتِ قومی کا وہ آئینہ دار
وہ حریفوں کا جہاں میں خیر خواہ / دوستوں کا وہ حقیقی غمگسار
وہ زمانہ میں محبت کا ستون / آدمیت کا نرالا شاہکار
وہ کہ جس کا جام تھا جامِ خلوص / وہ کہ جس کی بزم تھی بزمِ وقار
وہ اہنسا کا نیا پیغمبر / زندگی کا وہ نیا آئینہ دار
وہ روایاتِ [illegible] کا امین / ہند کی وہ عظمتوں کا رازدار
وہ کہ جس کی زندگی شرحِ وفا / وہ کہ جس کی موت رمزِ [illegible]
غمکدوں کی وہ نئی شمعِ حیات / غم کے ماروں کا وہ سچا دوستدار

وہ شہیدِ زندگی باپائے قوم
وہ نئے اقدار کا آئینہ دار

پرکاش [illegible] ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے [illegible] خواجہ پریس [illegible] جامع مسجد دہلی اور [illegible]
شانِ ہند [illegible] دہلی سے شائع کیا۔

شرپسندوں سے خبردار



اِن کی سازش کا جواب
آپسی میل محبت

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

دہلی یونیورسٹی میں ایک صاحب ہیں
نثار احمد فاروقی

جناب کالی داس گپتا رضا ایک مدت سے اردو کی خدمت جس جاں بازی اور صدق دلی سے کر رہے ہیں۔ اس کی مثال بہت کم ملے گی۔ کیونکہ عام طور پر اردو کے مبینہ جانباز محض چرب زبانی۔ غلط بیانی۔ دھوکہ بازی اور دوسروں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر نشانہ لگانے میں ہی طاق ہیں۔ اور دوسروں کے روپیہ پر ہی اپنی دوکانداری کو چمکائے ہوئے ہیں۔ مگر جناب رضا نے بے دریغ روپیہ صرف کر کے نہ صرف "غالب کلیکشن" کا بیش بہا خزانہ جمع کیا بلکہ غالب اور چکبست پر پُر مغز اور قابلِ مطالعہ نیز یادگاری کتابیں اپنے اخراجات پر شائع کرائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کے سلسلے میں رضا صاحب نے بڑے بڑے ماہرِ غالبیات کے علموں کی طنابیں ڈھیلی کر دی ہیں اور چکبست کو تو انھوں نے نئی زندگی دی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "چکبست" کے معاملے میں ہندوستان کے ہر اردو دانش ور خصوصاً مسلمانوں نے مجرمانہ حد تک چشم پوشی کی۔ منشی پریم چند کی اردو خدمات کو [illegible] نے کے لئے تو کھلم کھلا چند کمینہ اور احسان فراموش مسلمان اردو کے خود ساختہ دانش ور کوشاں ہیں (گو آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را کے مصداق ان مذہبی جنونیوں کی نامناسب حرکتوں کے باوجود منشی پریم چند کی عزت اور شہرت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے) مگر چکبست کے معاملہ میں سلو پوائیزن کا طریقہ اپنایا گیا۔ یعنی ہر طرف سے خاموشی کا ایسا ماحول پیدا کیا گیا کہ چکبست کا نام کہیں بھولے سے بھی نہ آنے دیا گیا۔ اور اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ کہیں بھی چکبست کا مطبوعہ کلام دستیاب نہ ہوتا تھا۔ بس ۱۹۵۶ء میں یوم چکبست منایا گیا جس کی کارروائی ساقی الوحدت نے لکھی اور موقر ہفت روزہ ریاست میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد قریباً چوتھائی صدی گزر گئی اور چکبست سے متعلق کوئی کارروائی بھی نہ ہوئی۔ رضا صاحب نے چکبست پر اس وقت تک دو ضخیم کتابیں شائع کی ہیں اور تیسری کتاب چند دنوں میں آ رہی ہے اور چکبست دشمنوں کو یہ کہنا ہی پڑا کہ چکبست کو رضا صاحب نے پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ تقسیمِ ملک سے پہلے کوئی بھی مسلمان اردو دان کسی غیر مسلم کو اردو کا ادیب۔ شاعر یا افسانہ نگار تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ غیر مسلم شعرا کے اشعار میں انھیں "بوئے کچوری" آتی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں اس نعرہ میں کچھ تبدیلی اس لئے آئی کہ اب اردو کو ہندوستان میں زندہ رکھنے والے محض غیر مسلم ہی تھے اور یہ ڈنکے کی چوٹ پر کہا جا سکتا [illegible] وقت بھی ہندوستان میں اردو اگر زندہ ہے تو [illegible] غیر مسلموں کے سہارے۔

مگر حکومت نے اردو کے نام پر کچھ ٹکڑے پھینکے تو مسلمانوں کی طرف فیاضی سے پھینکے تو پھر ۱۹۴۷ء سے پہلے کا ماحول بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ غیر مسلموں کے اشعار سے پھر "بوئے کچوری" کی مہک آنے لگی ہے اور غیر مسلم ادیبوں اور نقادوں پر یہ الزام لگایا جانے لگا ہے کہ ان کی تخلیقات کسی مسلمان ادیب یا نقاد کی مرہونِ منت ہیں۔ چنانچہ جناب کالی داس گپتا رضا پر جناب نثار احمد فاروقی نے یہ بہتان لگایا ہے کہ انھوں نے غالب پر یا جو کچھ بھی لکھا اور کہا ہے وہ کسی جمیل صاحب کا لکھا ہے۔

نثار احمد فاروقی نے یہ ہمت تو نہ دکھائی کہ ہندوستان میں یہ بہتان عاید کرتے۔ تاکہ ان کے اس دعوئے باطل کے جواب میں ثبوت طلب کیا جاتا اور انھیں عدالت میں گھسیٹا جاتا۔ [illegible] لئے انھوں نے یہ انکشاف پاکستان میں اس وقت [illegible] غالب کانفرنس میں ہندوستانی نشستوں کے [illegible]

علماء کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کی ... اور پاکستان میں یہاں ... گپتا رضا صاحب پر ... بہتان لگانے والے جناب نثار احمد فاروقی خود کیا ہیں اس کی ایک ہلکی سی جھلک جناب لطیف الزماں خاں صاحب جو گورنمنٹ کالج ملتان (پاکستان) میں شعبۂ انگریزی کے اُستاد ہیں کے مندرجہ ذیل گرامی نامہ میں دیکھئے جو انھوں نے جناب کالی داس گپتا رضا صاحب کو ۲۷ر جولائی ۱۹۸۱ء کو لکھا۔ اس خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپی دفتر شاعر ہند میں موجود ہے جو صاحب دیکھنا چاہیں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

لطیف الزماں خاں

شعبۂ انگریزی

گورنمنٹ کالج، یونیورسٹی روڈ، ملتان

۲۷ر جولائی ۱۹۸۱ء

صدیقِ مکرم، تسلیمات

آپ کو کتابوں کا ایک پیکٹ اور ۴ر جولائی کو ایک عریضہ ارسال خدمت کر چکا ہوں اُمید کرتا ہوں کہ یہ دونوں آپ کو مل گئے ہوں گے۔ طویل مدت سے میرے دل پر ایک بوجھ ہے میرے مزاج میں یہ خرابی بھی ہے کہ جسے بھائی سمجھ لوں، اپنا دوست اور کرم فرما جانوں اس کی برائی نہیں سن پاتا۔

دہلی یونیورسٹی میں ایک صاحب ہیں نثار احمد فاروقی انھوں نے اپنی کتاب تلاشِ غالب میرے نام اس وقت معنون کی تھی جب میں انھیں جانتا نہیں تھا۔ صرف خط و کتابت تھی بعد میں ... ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ چونکہ شعبہ عربی میں ہیں ... اس لئے ... مرتبہ علماء کانفرنس میں نمائندگی کر چکے ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ ... ہیں گی۔

فاروقی صاحب نے یہ شوشہ کیا چھوڑا کہ غالب پر جو ... آپ کے نام سے شائع ہوا ہے وہ آپ ... کا نہیں بلکہ کسی جمیل صاحب تھے ان کا کتب خانہ ... تحریریں جمیل صاحب کی ہیں جو مسودات کی شکل میں ... ۔ یہاں کا علمی و ادبی حلقہ آپ کے علم اور کام سے واقف ہے علاوہ ان تحریروں کے جو رسائل

... میں ... آپ کی ... کی ... پبلشروں ... آپ ... صاحب نے لیٹر لکھا میں آپ ... صرف یہ کہ ادبی حلقے آپ ... واقف ہیں ... بعض حضرات کو فاروقی صاحب کی یہ بات بہت بری لگی اور مجھ کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا۔

اب ذرا فاروقی صاحب کے ... کردار کو ملاحظہ کیجئے نومبر ۱۹۶۶ء میں میرے والد محترم کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۶۷ء کا موسم گرما کی تعطیلات میں والدہ صاحبہ کو لے کر میں اترولی ... چلا گیا۔ چونکہ ... کے مطابق والد صاحب نے دو ہزار روپیہ بطور ... چھوڑے تھے۔ میں نے والدہ صاحبہ کے حکم پر یہ رقم نثار احمد فاروقی صاحب کو بھجوا دی تاکہ وہ ہر ماہ کچھ رقم میری خالہ صاحبہ کو بھیجتے رہیں۔ خالہ صاحبہ بیوہ تھیں اور میری خالہ زاد بہن جو خود بھی بیوہ ہیں کے ہمراہ اترولی میں رہتی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ہندوستان سے خط و کتابت ہی بند ہو گئی خالہ صاحبہ نے کبھی نہیں لکھا کہ انھیں کیا مل رہا ہے۔ ان کے اس قدر احسانات ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ جب والد مرحوم آخری ایام میں سخت بیمار ہوئے تو وہ انھیں اپنے گھر لے گئیں۔ اسہال ہو گیا۔ ان کے کپڑے پاک کرنا، گندگی کو اٹھانا اور صاف کرنا غرض اتنی خدمت کی کہ اگر وہ میری کھال کھنچوا کر جوتی بنوا لیتیں تب بھی میں ان کے احسانوں کا بدلہ ادا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھ بد نصیب کو بہت زیادہ چاہتی تھیں۔ انہی خالہ صاحبہ کو چند مہینوں کے علاوہ فاروقی صاحب نے کچھ نہیں بھیجا اور سارا روپیہ ہضم کر لیا۔ مجھے یہ سب کچھ خالہ صاحبہ کے انتقال کے بعد معلوم ہوا۔

یہاں ایک مرتبہ آئے (اس بات کو دس گیارہ سال ہوتے ہیں) تو مجھ سے کہا کہ انجمن ترقی اردو، ڈاکٹر گیان چند جین کو کچھ روپیہ بھیجنا چاہتی ہے۔ تم دے دو۔ انجمن تمہیں ادا کر دے گی میں نے روپے دے دیئے۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ انجمن اس طرح کی کوئی ادائیگی کرتی ہی نہیں۔ یہ بات مجھے مشفق خواجہ صاحب نے بتلائی۔ ڈاکٹر جین صاحب سے میری کبھی خط و کتابت نہیں

رہی ورنہ میں انھیں لکھتا کہ ان کے نام پر لوگ روپیہ بھی بٹورتے ہیں۔

طفیل بھائی (مدیر نقوش) نثار صاحب کی مدد اس وقت سے کر رہے ہیں جب یہ حضرت طالب علم تھے۔ انھیں یہ اکثر لوٹتے رہتے ہیں۔ پچھلی مرتبہ جب یہ عالم بن کر آئے تو سرکاری مہمان تھے۔ ہوٹل میں جی نہ لگا تو سیدھے طفیل صاحب کے گھر پہونچے۔ جاتے وقت ساڑھے چھ ہزار روپے کی کتابیں طفیل صاحب سے خرید کر دیں اور بھائی جہاز سے ان کتابوں کو بھجوایا۔ خیال فرمائیے کتنا کرایہ لگا ہوگا اب انہیں لکھ رہے ہیں کہ آنے جانے کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیجو اور دس ہزار کا انتظام کرو تاکہ میں فلاں فلاں تحریری کام کر سکوں۔

یہ ہے ہمارے عالم کی تصویر۔ بیوہ کا مال غصب کرنے والا، ڈاکٹر جین کے نام پر روپیہ وصول کرنے والا اور طفیل صاحب جیسے شریف انسان کو دھوکے، جھوٹ اور فریب سے لوٹنے والا۔ یہ عالم جب آپ جیسے شریف النفس انسان پر کیچڑ اچھالے تو تکلیف ہوتی ہے۔

مجھ پر ایک احسان کیجئے کہ میرے اس خط کو کسی رسالے میں چھپوا دیجئے۔ چند جملے جو آپ سے متعلق ہیں نکال دیجئے۔ لوگوں کو معلوم تو ہو کہ عربی کے عالم اُردو کے ادیب، نسخہ امروہہ کے مرتب کیا گل کھلاتے ہیں۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ ان کی باتوں اور حرکات سے مجھے کتنی تکالیف پہنچی ہیں۔ میں نے غالب کے نام پر انھیں کتنی کتابیں روانہ کی ہیں اس کا اندازہ شاید آپ نہ لگا سکیں مگر ان کا ہاضمہ اتنا قوی ہے کہ سب کچھ ہضم کر تے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے۔

اگر آپ ڈاکٹر صاحب کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ فرمائیں تو احسانِ عظیم ہوگا۔ مجھے ان کا پتہ معلوم نہیں ہے ورنہ میں خود انھیں لکھتا۔

بھابھی جان کو آداب، بچوں کو دعائیں۔ نہیں عرض کر سکتا کس قدر جی چاہتا ہے کہ سب سے ملوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں زندگی کا کیا بھروسہ مرنے سے پہلے ان مقامات کو دیکھنا چاہتا ہوں جہاں بچپن گزرا۔ ان کرم فرماؤں اور محبت کرنے والوں کی قدم بوسی کو حاضر ہونا چاہتا ہوں جنہوں نے ہزاروں میل کے فاصلوں اور رکاوٹوں کے باوجود مجھ جیسے دُور افتادہ کو یاد رکھا۔

آپ کا مخلص

۱۴۹۔ بی، محل گشت، ملتان — لطیف الزماں خاں

جناب لطیف الزماں صاحب کے اس مکتوبِ گرامی کے مطالعہ سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ علماء کی کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کے لئے کس قدر "بہتر" نمائندہ کا انتخاب کیا گیا۔ اگر یہ انتخاب حکومت کی طرف سے کیا گیا ہے تو یقیناً افسوسناک ہے اور اگر کسی پرائیویٹ باڈی نے اپنے حسنِ انتخاب کا مظاہرہ فرمایا ہے تو پھر اس ادارے کے ذمہ دار ارکان اور ہندوستان میں عربی کی تعلیم اور ہمارے ہاں کے علماء کا خدا ہی مالک ہے۔

وزیر اعلیٰ اتر پردیش کو اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے وعدہ کی یاد دہانی

وعدہ نبھاؤ اُردو کمیٹی کے جنرل سکریٹری جناب رام لعل کی طرف سے ایک مطبوعہ عرضداشت موصول ہوئی ہے جو بہر اُردو داں کی طرف سے جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ وزیر اعلیٰ اتر پردیش کی خدمت میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے وعدہ کی یاد دہانی کے لئے بھجوائی جا رہی ہے۔

وزیر اعلیٰ ۲ر اپریل کو عالمی اُردو کانفرنس کی پہلی اسٹیرنگ کمیٹی کی میٹنگ میں اور اس کے بعد ۹ر اپریل کو اُردو اکاڈمی کی جنرل کونسل کے اجلاس میں اور اس کے بعد ۱۹ر اپریل کو آل انڈیا غیر مسلم اُردو مصنفین کانفرنس نیز انجمن ترقی اُردو اتر پردیش کی استقبالیہ تقریب اور اسی شام آل انڈیا میر اکاڈمی کے جلسہ تقسیم انعامات و اسناد میں حتمی وعدہ فرما چکے ہیں۔ کہ وہ اس سال کے آخر تک اُردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان قرار

دے دیں گے۔ اُنھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر وہ اپنا یہ وعدہ پورا نہ کر سکے تو وزارت اعلیٰ چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ ہم نے وزیرِ اعلیٰ کے اس عزمِ مستحکم کو دیکھتے ہوئے لکھا تھا کہ جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ صاحب اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک اس وعدہ کو پورا کرنے کے لیے کوئی عملی اقدامات نظر نہیں آرہے ہیں۔ ہاں جناب عمار رضوی صاحب وزیرِ اُتر پردیش یہ ضرور فرما رہے ہیں کہ جو کچھ صوبہ بہار نے کیا ہے ہم وہ عملی طور پر کر چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ وزیرِ اعلیٰ کی پارٹی کے اکثر ممبران نہیں چاہتے کہ ایسا ہو۔ اور ان ممبران نے وزیرِ اعلیٰ سے کہہ دیا ہے کہ اگر انھوں نے اُردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیدیا تو وہ اُن کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اس لیے وزیرِ اعلیٰ اپنا وعدہ پورا کرنے سے ہچکچا رہے ہیں۔ رہا ان کا یہ فرمان کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو وزارتِ اعلیٰ چھوڑ دیں گے تو ہم اس سے متعلق یہ جانتے ہیں کہ وہ رواروی میں اور اپنے بیان پر مزید تالیوں کی جھنکار سننے کے لیے ایسا کہہ گئے۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ وزارتِ اعلیٰ کی کرسی پر نہ وہ خود بیٹھ سکتے ہیں اور نہ ہی اُسے خود ہی چھوڑ سکتے ہیں۔

جناب رام لعل صاحب کا یہ اقدام واقعی مجاہدانہ ہے اور ہم سب کو اُن کا ساتھ دیتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ اُتر پردیش کو یہ یاد دہانی وعدہ نبھاؤ اُردو کمیٹی کے توسط سے لاکھوں کی تعداد میں بھجوانی چاہیے۔ تاکہ وہ اپنے وعدہ کو نبھانے کے لئے کوئی راہ نکالیں۔

قاضی + سید + عرشی + کاظمی
کا جھوٹ، فریب اور غلط بیانی

روزنامہ الجمعیۃ ۱۳ مارچ ۱۹۸۱ء میں شائع شدہ یہ اعلان ملاحظہ فرمایئے

شاندار آل انڈیا مشاعرہ

منگلور ۸ مارچ۔ بذریعہ ڈاک۔ بزمِ عروض و فن کی جانب سے ایک شاندار آل انڈیا مشاعرہ کے سلسلے میں تیاریاں زور و شور سے شروع ہو چکی ہیں اور مشاہیر شعراء کرام سے مراسلت کا جاری ہے۔ شعراء حضرات سے بات چیت مکمل ہو جانے کے بعد مشاعرے کی تاریخ کا اعلان کر دیا جائے گا۔ مشاعرہ کی کارروائی ریڈیو اور ٹی۔ وی پر نشر کی جائیگی۔ محترم شعراء سے درخواست ہے کہ ذیل کے پتے پر اپنے پتے ارسال فرمائیں تاکہ اُن سے پروگرام ہذا کے سلسلے میں خط و کتابت کی جا سکے۔

قاضی سید عرشی کاظمی
قصبہ منگلور، ضلع سہارنپور

چنانچہ یہ اعلان شائع کرانے کے بعد عرشی صاحب نے مشاعرہ کے لئے زرِ عطیہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت ہمارے سامنے انگریزی میں مطبوعہ رسید نمبر 205 مورخہ 29 اپریل (عالیتی) دو روپیہ جو عرشی صاحب کے دستخط سے جناب سعید اختر صاحب فاروقی محلہ قلعہ، منگلور کے نام جاری کی گئی ہے، کی فوٹو سٹیٹ کاپی رکھی ہے۔ چنانچہ اس حساب سے 204 رسیدیں عرشی صاحب 29 اپریل تک پہلے جاری کر چکے تھے۔ اور اس حساب سے اب ماہ اکتوبر تک وہ مزید سینکڑوں رسیدات جاری کر چکے ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ انھیں معقول روپیہ وصول ہوا ہوگا۔ کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ وصول شدہ روپیہ کس بنک میں مشاعرہ کے اکاؤنٹ میں جمع ہے اور اس کے ساتھ ہی انھیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ کیا وہ محکمہ ریڈیو اور ٹی۔ وی کے افسرانِ مجاز سے یہ اجازت نامہ حاصل کر چکے تھے کہ اُن کا یہ مجوزہ مشاعرہ ان دونوں ذرائع سے نشر کیا جائے گا (حالانکہ ٹیلی ویژن کی مناسبت سے نشر کی بجائے ٹیلی کاسٹ صحیح ہے) اور اگر انھوں نے یہ اجازت حاصل نہیں کی تھی تو انھوں نے یہ یقینی طور پر کیسے اعلان کر دیا کہ مشاعرہ کی کارروائی ریڈیو اور ٹی وی پر نشر کی جائے گی۔ اور انھیں یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ ان کے اس پُرفریب اعلان سے متاثر ہو کر ...... عوام نے عطیات کی رقوم برائے مشاعرہ دیں اور اس کے ساتھ ہی انھیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ انھوں نے اب تک اس مشاعرہ کے لئے کس کس شاعر سے خط و کتابت کر کے معاملہ طے کر لیا اور کیا وجہ ہے کہ آٹھ نو ماہ گزرنے پر بھی ابھی تک شعراء سے ان کا معاملہ طے نہیں ہو سکا جب کہ کسی بھی آل انڈیا تو کیا ہندوپاک مشاعرہ کے لئے بھی ایک ہفتہ میں شعراء کا معاملہ طے ہو سکتا ہے۔

(باقی صد ۲۴ پر)

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

۷ جون [illegible] کی صبح کو فتح گڑھ (یوپی) کے مندر کی سیڑھیوں پر ایک نوزائیدہ بچی اس دُنیا میں اپنی آمد کا اعلان رو رو کر کر رہی تھی۔ اور اس سربستہ راز کا انکشاف بھی جس کے باعث اس کا وجود اس دُنیا میں ظہور پذیر ہوا۔ مرد۔ عورتیں۔ بچے سب اس روتی ہوئی بچی کو دیکھ رہے تھے اور اس کنواری یا مجبور ماں پر لعنتوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے جس نے اس بچی کو جنم دیکر مندر کی سیڑھیوں پر ڈال دیا تھا۔ بچی کے رونے اور دیکھنے والوں کی چہ میگوئیوں سے بظاہر بے نیاز بھگوان جو اس لاوارث یا دوسرے الفاظ میں ناجائز بچی کے بھی بھگوان تھے اپنے مندر کی سیڑھیوں پر پناہ لینے والی اس بچی کو ایک روایتی اور قابل لڑکی کے روپ میں اس دنیا والوں کو دکھانا چاہتے تھے کہ اُن کے نزدیک اُن کا ہر بندہ خواہ وہ اعلےٰ خاندان کا ہو یا معمولی خاندان کا ہندو ہو یا مسلم اُن کے لئے سب برابر ہیں اور ہر ذی روح انسان اپنے اعمال سے ہی پرکھا جائے گا۔ خواہ وہ جائز اولاد ہو یا ناجائز۔

بچی کو دیکھنے والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بچی کی ماں کس مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر مندر کی سیڑھیوں پر بچی کا پایا جانا کسی حد تک اس بات کی دلیل تھا کہ بچی کی ماں ہندو ہو گی۔ مگر بھگوان کے ماننے والے ہندوؤں میں کوئی بھی آگے بڑھ کر اس لاوارث بچی کو اپنانے کو تیار نہ تھا۔ مگر بھگوان جو سب کے مالک ہیں وہ اس بچی کے بھی مالک تھے۔ لہٰذا فتح گڑھ میں محکمۂ ریل کے ایک اعلیٰ افسر مسٹر سی۔ رائے آگے بڑھے اور بچی کو اُٹھا کر اپنے گھر لے گئے اور کچھ دیر بعد عدالت میں جا کر بچی کو پیش کر کے اسے گود لے لیا۔

مسٹر سی۔ رائے حضرت مسیح کے مقلد تھے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر عیسائی عورت حضرت کی بھیڑ ہو۔ سارے شہر میں مسٹر سی رائے کے اس نیک اقدام پر واہ واہ ہو رہی تھی۔ مگر سی رائے کا گھر جنگ کا میدان بنا ہوا تھا۔ مسٹر سی رائے کی بیوی کا کہنا تھا کہ اُسے یہ بچی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ لہٰذا اسے وہ کسی قیمت پر بھی اپنے گھر میں نہیں رہنے دیں گی۔ جب بیوی کا احتجاج مسٹر رائے کے لئے سوہانِ روح بن کر رہ گیا تو مسٹر رائے نے چپکے سے اس بچی کو ریل کے فرسٹ کلاس ڈبہ میں ایک برتھ پر لٹا دیا اور جو بچی اپنی ماں کے ہاتھوں مندر کی سیڑھیوں پر بھگوان کی پناہ میں آئی تھی اب ایک انسان کے ہاتھوں ریل کے فرسٹ کلاس ڈبے میں پھر بھگوان کے سپرد کر دی گئی۔ جب یہ ریل گاڑی اندور اسٹیشن پر پہنچی تو صفائی والے کی نظر اس پر پڑی تو اس نے فوراً ریلوے پولیس کو اطلاع دی اور ریلوے پولس کے سب انسپکٹر مسٹر ہنری ولیم ہما میرمٹی نے بچی کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ بچی کے گلے میں بندھی ہوئی ایک چٹ پر لکھا تھا "الکامناکشی رائے" ایک عیسائی نے اپنی بیوی کے ڈر سے بچی کو پھر سے لاوارث بنا دیا تھا مگر قدرت نے پھر ایک دوسرے عیسائی کے دل میں رحم کی لہروں کو موجزن کیا اور یہ عیسائی ہنری ولیم ہما میرمٹی اس بچی کو اپنے گھر لے گیا مگر قدرت نے اب کی مرتبہ یہ انتظام کر دیا کہ یہ بچی پھر سے لاوارث نہ بن جائے۔ ہنری ولیم ہما میرمٹی کی بیوی اپنی ساس سے لڑ جھگڑ کر گھر چھوڑ چکی تھی۔ اور اس کی واپسی کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔ ہنری کی والدہ نے اور خود ہنری ولیم نے بچی کو خدا کی رحمت سمجھ کر اس کی پرورش شروع کر دی۔ ابھی الکامیناکشی رائے پانچ چھ سال کی ہوئی تھی کہ اندور ریلوے اسٹیشن کا دہی والا منشارام جس کی بیوی مر چکی اور وہ خود تپدق کا مریض تھا۔ جب منشارام کو یہ

نظر آنے لگا کہ اس کا آخری وقت قریب ہے تو وہ ایک دن مقامی عدالت میں حاضر ہوا اور درخواست دی کہ میرا آخری وقت قریب ہے اس لئے میں حلفیہ بیان تصدیق کرانا چاہتا ہوں کہ میری موت کے بعد میری خوردسال جڑواں بچیاں مسٹر ہنری ولیم ہما میرٹھی کی تحویل میں دے دی جائیں کسی ہندو کو یہ اعتراض کرنے کا کوئی حق نہ ہوگا کہ وہ اس بات پر اعتراض کرے کہ ہنری ولیم نے ان جڑواں بچیوں کو عیسائی بنا لیا ہے۔ یہ حلفی بیان تصدیق کرانے کے دو چار دن کے بعد منسارام قلی چل بسا اور اس کی دونوں لاوارث جڑواں بچیاں بھی مسٹر ہنری ولیم ہما کے گھر آگئیں۔ جن کی پرورش میں الکا میناکشی رائے بھی ہاتھ بٹانے لگی۔ مسٹر ہنری ولیم ہما میرٹھی نے ان تینوں بچیوں کی پرورش جس طرح کی اس کے پیش نظر یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہما صاحب نے اپنے لئے جنت میں جگہ ریزرو کرالی ہے۔ کیوں کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ خدا ہما ایسے شخص کیلئے جنت کے دروازے ہمیشہ کھلے نہ رکھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیاوی طور پر ولیم ہنری ہما صاحب پر کئی آفتیں نازل ہوئیں اور تو اور انھیں ایک فرضی معاملے میں ملازمت سے کئی سال تک معطل رکھا گیا اور اب بحال ہونے کے باوجود انھیں صرف معطلی کے زمانے والی تنخواہ ہی مل رہی ہے جو کہ اصل تنخواہ کا کچھ حصہ ہوتی ہے مگر وہ خدا کے بھروسہ پہ دنیا کا ہر ظلم انتہائی صبر اور خاموشی سے سہہ رہے ہیں اور منتظر ہیں کہ جب خدا کا حکم ہوگا تو اس کے وہ بندے جو ان کے خلاف ناانصافی کا ارتکاب کئے ہوئے ہیں از خود نادم ہوں گے اور ہما کا حق اسے ملے گا۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے ہوم منسٹر عالیجناب گیانی ذیل سنگھ سے مؤدبانہ التماس ہے کہ وہ ہما صاحب کے کیس پر دھیان دینے کے لئے مدھیہ پردیش کے آئی جی کو حکم دیں۔ کیونکہ یہ ناممکنات میں سے نہیں ہے کہ ہما صاحب کے ساتھ ناانصافی کرنے والے کسی بھی وقت

خدا کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں آکر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھیں۔ جس شخص نے لاوارث بچیوں کی پرورش تعلیم اور ان کی زندگی بنانے میں اپنی جوانی۔ گھر یہاں تک کہ اپنا سب کچھ قربان کر دیا اس کے ساتھ ناانصافی خدا کے نزدیک ایک بدترین فعل ہے۔ کیا غضب ہے کہ اس گرانی کے زمانے میں ہما صاحب کو دو صد روپے کے قریب تنخواہ ملتی ہے۔ منسارام قلی کی دونوں بچیاں جواب PRISIS DORTHI WEL IUMS اور PARVEENA DOOLY WELIUMS کے ناموں سے چودہ سال کی عمر میں رتلام مشن سکینڈری اسکول میں زیر تعلیم ہیں اور ہوسٹل میں رہتی ہیں۔ یہ دونوں بچیاں اب نانویں کلاس میں پڑھ رہی ہیں دونوں کی عادات ایک سی ہیں۔ دونوں ایک جیسے ہی کپڑے پہنتی ہیں۔ اگر ایک بیمار ہوتی ہے تو دوسری بھی بیمار ہو جاتی ہے۔ اب ان دونوں بچیوں کی تعلیم کے جملہ اخراجات جرمن اسکالرشپ سے پورے کئے جا رہے ہیں۔

مس الکا میناکشی رائے کرشچین کالج اندور میں بی اے فائنل کی طالبہ ہے۔ ۷ رجون ۱۹۸۱ء کو اس نے عمر کے ۱۸ سال پورے کر لئے ہیں۔

الکا میناکشی رائے راقم الحروف کو اپنا ہمدرد انکل سمجھتی ہے اور جب بھی وہ ہما صاحب کے ساتھ دلی آتی ہے تو ایک حقیقی بیٹی کی حیثیت سے غریب خانہ پر آتی ہے۔ اور قیام دلی کے دوران اکثر وقت ہمارے ساتھ ہی گزارتی ہے مسٹر رائے کچھ دنوں پہلے اجمیر سے ریلوے کے بہت بڑے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ مسز رائے اندور میں ہی کسی اسکول کی ہیڈ مسٹریس رہیں مگر انھوں نے کبھی الکا میناکشی رائے کو دیکھنے تک کی تکلیف گوارا نہیں کی۔

الکا میناکشی رائے کو ان سب باتوں کا احساس ہے۔ گو اسے یہ سب کچھ معلوم ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں۔ مگر اسے کسی سے بھی شکایت نہیں ہے۔ وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہے کہ اسے ہنری ولیم جیسا محسن ملا جو اس کا باپ بھی ہے اور ماں بھی۔ ہنری ولیم ہما کو دیکھتا ہوں تو دل یہ گواہی دیتا ہے کہ جب تک

گوشۂ عقیل صدیقی کا

کتھک ڈانس کی ساحرہ روشن کماری

اور

نرتیہ کلاکیندرر (باندرہ) بمبئی کا دسواں جشن

سرور تونسوی

مس روشن کماری ایک ایسی ماں کی فرمانبردار اور فن کار بیٹی ہے جس کا آج سے قریباً چینتالیس سال پہلے دنیائے موسیقی میں ڈنکا بجتا تھا۔ فلم "رتن" کے گانے آج بھی جب ریڈیو پر سنائی دیتے ہیں تو سننے والوں کی روح تک جھوم جاتی ہے۔ اس وقت فلموں میں پلے بیک گانے والوں کو وہ سہولیات حاصل نہ تھیں جو موجودہ زمانے میں ہیں مگر اس وقت کے پلے بیک سنگرز کے گائے ہوئے گانے نصف صدی گزرنے پر بھی سنتے وقت ایسا لگتا ہے کہ جیسے روح کی گہرائیوں سے گائے گئے ہوں یہی وجہ ہے کہ سامعین دم سادھ کر ان گانوں کو سنتے ہیں۔ فلم رتن اور کئی دوسری فلموں کے متعدد گانوں کے پلے بیک سنگر زہرہ بیگم انبالے والی کو فخر ہے کہ اس کی بیٹی روشن کماری آج کتھک رقص کی وہ ساحرہ ہے کہ جس پر تمام ملک کو ناز ہے۔

روشن کماری کے والد جناب فقیر محمد طبلہ اور پکھواج کے یکتائے روزگار استاد ہیں۔ چنانچہ روشن کماری نے اپنے والدین کی دیکھ ریکھ میں فن رقص میں اپنی فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہا تو انھیں شری کے۔ ایس۔ مورے۔ پنڈت سندر پرشاد، غلام حسین خان آف پٹیالہ، پنڈت ہنومان پرشاد آف جے پور سے کتھک اور شری گوبند راج پلائی اور ہانگم پلائی سے بھارت ناٹیم میں مہارت حاصل کرنے کے واقع فراہم کئے گئے۔ اور روشن کماری نے جی جان سے محنت اور جاں فشانی سے کام لیتے ہوئے اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا اور آج دنیائے رقص میں روشن کماری نام علامت ہے اس امر کی کہ روشن کماری اور کتھک یوں مدغم ہو گئے ہیں کہ اب ان کو کسی حالت میں بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔

قریباً تین سال پہلے روشن کماری کے کمال فن کا مظاہرہ دیکھتے ہوئے میرے قریب بیٹھے ہوئے اس وقت کے حکومت ہند کے وزیر خارجہ جناب اٹل بہاری باجپئی بے ساختہ فرمانے لگے کہ میں نے اپنی عمر میں اس والہانہ انداز میں کتھک ڈانس پہلی بار دیکھا ہے۔

صدر جمہوریہ ہند، پنڈت جواہر لال نہرو۔ محترمہ اندرا گاندھی، انڈونیشیا کے سابق نائب صدر ڈاکٹر ہتہ، مارشل بلگانین، کامریڈ خروشچیف۔ سیف الحسن (یمن)، یونو (وزیراعظم برما)، وزیراعظم رومانیا، سابق شاہ اور بیگم ایران، شاہ حسین (جارڈن)، صدر عارف (عراق)، ڈاکٹر اپولو ملٹن ابوٹے (وزیراعظم یوگینڈا)، ملکۂ نیپال۔ زیمل نیجیڈک اور ان کی بیگم (یوگوسلاویہ) کے سامنے جب روشن کماری نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو ہر ایک نے داد و تحسین سے روشن جی کو اس قدر سراہا کہ فن اور فن کارہ دونوں ایک دوسرے کی معراج کو آفریں کہہ رہے تھے۔

روشن کماری صاحبہ کو پریاگ سنگیت سمیتی الہ آباد کا ایوارڈ "نرتیہ شرومنی"۔ صدر جمہوریہ ہند کا ایوارڈ سنگیت ناٹک اکیڈمی (جے پور گھرانہ) اور سُر سنگار سمیتی کا ایوارڈ "نرتیہ وِلاس" بڑی عزت و احترام کے ساتھ پیش کئے گئے اور اس کا اعتراف بھی کھل کر کیا گیا کہ روشن کماری اپنے کمال فن میں اپنا جواب آپ ہے۔

[illegible] میں روشن کماری نے کتھک ڈانس سے

متعلق ایک ادارہ نرتیہ کلا کیندر کے نام سے باندرہ بمبئی میں قائم کیا جو دس سال سے انتہائی محنت و خوبی سے چل رہا ہے اور ان کی نگرانی میں رقص سے رغبت رکھنے والے اس فن میں مہارت حاصل کر رہے ہیں۔ اس ادارہ کے ذریعے روشن کماری جس شدہی سے کتھک ناچ کو صحیح معنوں میں اس کے شیدائیوں تک پہنچانے میں مصروف ہیں۔ اس سے یہ بخوبی پتہ چلتا ہے کہ وہ اس فن کو ایک صالح جذبے کی صورت اس کی توسیع کے لئے شب و روز مصروف رہنا چاہتی ہیں۔ اسی لئے ان کا شمار ملک کے اعلیٰ ترین فن کاروں میں ہوتا ہے۔

روشن کماری کی صلاحیتوں اور اعلیٰ فن کارانہ شعور کا اعتراف ملک کے مختلف اہل نظر حضرات اور اخبارات نے ان کی فنی مظاہروں کو دیکھنے کے بعد کئی بار کیا ہے چنانچہ سنڈے اسٹینڈرڈ۔ دی اکنامکس ٹائمز۔ ناگپور ٹائمز، انڈین ایکسپریس بمبئی۔ فری پریس جرنل۔ دی لیڈر الہ آباد۔ ماہنامہ شمع اور دیگر کئی جرائد و رسائل نے روشن کماری کے مختلف پروگراموں کے بارے میں اس کے کمال فن کے مظاہرہ کی تصاویر شائع کرتے ہوئے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

نرتیہ کلا کیندر ہر سال اپنا سالانہ جشن مناتا ہے جس میں اس کلا کیندر میں فن رقص سیکھنے والی طالبات اپنے فن کا کمال دکھا کر عوامی مقبولیت حاصل کرتی ہیں۔

اس سال نرتیہ کلا کیندر باندرہ بمبئی کا دس سالہ جشن ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو تیج پال آڈیٹوریم، بمبئی میں بڑے تزک و احتشام سے منایا گیا۔

محترم قبلہ حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی مدیر اعلیٰ شمع کے مبارک ہاتھوں سے نرتیہ کلا کیندر کا افتتاح ہوا تھا اور وہ تقریباً ہر سال نرتیہ کلا کیندر کے سالانہ جشن میں تشریف لے جاتے ہیں۔ اس سال وہ مصروفیت کے باعث بمبئی تشریف نہ لے جا سکے تو انہوں نے مجھے حکم دیا میں نرتیہ کلا کیندر کے دس سالہ جشن میں شرکت کروں اور اس کا آنکھوں دیکھا حال بھی قلم بند کروں۔ آئیے آپ بھی گوالیار

ٹینک بمبئی کے تیج پال آڈیٹوریم میں ہونے اس جشن رقص کی کچھ جھلکیاں محض الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ اصل نظارہ جو محض دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا میری آنکھوں میں محفوظ ہے جو پیش خدمت ہے۔

تیج پال ہال کے باہر پھولوں سے سجاوٹ کی گئی ہے وہ دیکھنے والوں کے دل و دماغ کو تر و تازہ کر رہی ہے۔ ہال میں جونہی پردہ اٹھا تو چھ بچیاں سونیا شری کانت شاہ (۶ سالہ) تار نیا رملی (ساڑھے ۸ سالہ) زینت زریں کوتوال (۶ سالہ) دیپکا کھنڈیل وال (۹ سالہ) سوتالی بیگ (۸ سالہ) سیما کنول (۱۰ سالہ) زرق برق لباس پہنے کھڑی ہیں یہ سب بچیاں بمبئی کے سکولوں کی ابتدائی درجوں کی طالبات ہیں اور نرتیہ کلا کیندر میں ڈانسنگ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ اعلان ہوا ہے کہ یہ بچیاں "عجب تال" کا مظاہرہ کریں گی۔ بچیوں نے واقعی اپنے فن کے دلکش مظاہرہ سے دیکھنے والوں کو بار بار تالیوں سے داد دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ روشن کماری صاحبہ کے والد محترم جناب فقیر محمد کلاں ولی میں ہیرے چمکتے ہوئے سابقہ سالوں کی طرح اس مرتبہ بھی اپنے کتھک دار بولوں سے سماں باندھ رہے ہیں۔ اور روشن جی ان کی مدد کر رہی ہیں۔ سٹیج کو پھولوں سے اس قدر اچھے انداز سے سجایا گیا ہے کہ دیوتاؤں تک نے تعریف کی ہوگی۔

اعلان ہوا ہے کہ اب تیسی فوک ڈانس موسمی راگ ارشارا موگل، رچنا آر۔ اے کمار، سونیا ماتونکر، جیوتی مازمودار، میجو ہنگورانی۔ نازنین چالا والا، بینک کنول، انیتا کوٹھاری، شرمیلا داس، جوہی شاہ، اپر نادیاس، اروینا گھوش، زرنگیں خان پیش کریں گی۔

پردہ اٹھا تو۔ یہ چودہ لڑکیاں جن کی عمریں دس سال سے تیرہ سال تک ہوں گی سٹیج پر اپنا پروگرام شروع کرنے کے لئے پر تول رہی تھیں۔ میک اپ خوب جلکر خوب تر ہے۔ یہ سب بچیاں نرتیہ کلا کیندر کی سٹوڈنٹ ہیں اور کتھک ڈانس سیکھ رہی ہیں۔ ان لڑکیوں نے یہ فوک ڈانس جس چابک دستی اور برق رفتاری سے پیش کیا اس کی داد بھی اسی انداز سے

دی گئی تھی ۔ ان میں سے کچھ لڑکیاں کئی کئی ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں اور روشن کماری جی کا نام اور بھی روشن کر رہی ہیں

اب کی بار جب پردہ اٹھا تو سٹیج پر ایک ہی لڑکی کھڑی تھی اعلان ہوا کہ سمیتا ڈے ۔ بھکتی " آبھار " پیش کر رہی ہیں ۔ سمیتا نے بڑھ کر روشن کماری جی اور ان کے والد فقیر محمد صاحب کے پاؤں چھوئے اور اپنے فن کو دلکش انداز میں پیش کرنا شروع کر دیا ہے ۔ پندرہ سالہ سمیتا ایس ۔ آئی ۔ ای ۔ ایس ۔ کالج سیون میں سائنس کی طالب علم ہے ۔ کتھک ڈانس کے پانچویں سال کا امتحان پریاگ سنگیت سمتی الہ آباد سے فسٹ ڈویژن میں پاس کر چکی ہیں ۔ اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنے روشن مستقبل کی نوید جانفزا دے رہی ہے ۔ سمیتا کے بعد شبنم گودی لال سٹیج پر جلوہ افروز ہوئی ہیں ۔ اٹھارہ سالہ شبنم سابقہ چار سال سے کتھک ڈانس سیکھ رہی ہیں ۔ اور یہ بھی پانچویں سال کا امتحان پریاگ سنگیت سمیتی الہ آباد سے پاس کر چکی ہیں شبنم نے تین تال کا حق ادا کر دیا ہے ۔ اگر سیکھنے والے کا ذوق و شوق ، محنت اور لگن صحیح ہو اور سکھانے والا رقص کی دنیا کا دانا دل اور ایمان سے کرنے والا ہو تو شبنم ایسی فن کارہ یقیناً ملک کا نام روشن کریں گی ۔

اعلان کیا گیا ہے کہ ونیتا ڈی سوزا " ٹھمری بھاؤ " پیش کریں گی ۔ ونیتا نے بھی اپنے استادوں کے چرن چھوئے اور " ٹھمری بھاؤ " کو مختلف بھاؤوں سے پیش کر کے جو داد پائی ہے وہ اس کی تصدیق کرتی ہے کہ اسے کالکے کالا کر سمیلن میں " سنگار منی " کا خطاب حق بہ حق دار رسید کا مصداق تھا ۔ اور سوامی ہری داس سنگیت سمیلن میں جو اس کی عزت افزائی کی گئی اس کی یہ مستحق تھی نیشنل کالج بمبئی کو بھی اس طالبہ علم پر فخر ہونا چاہیئے ۔

پردہ اٹھا تو دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں ۔ نہایت حسین و جمیل آٹھ نوجوان لڑکیاں راجستھانی لباس میں راجپوتی جاہ و جلال اور شرم و حیا کو آنکھوں میں بسائے راجستھانی فوک ڈانس کی دھاک بٹھانے کے لئے پر تولے کھڑی تھیں جیلے پر تھاپ پڑتے ہی اس ناز و ادا سے حرکت میں آئیں کہ دیکھنے والے آہ و واہ کی دبی دبی آوازوں کو بار بار تالیوں کے شور میں مدغم کرنے پر مجبور ہو گئے ۔ آیئے ان قابل تعریف فن کاراؤں میں سے کچھ سے آپ کو متعارف کراؤں ۔ مالینی گوپالن نے ٹیکسٹائل ڈیزائن کا ڈپلوما سر جے جے سکول آف آرٹ بمبئی سے حاصل کیا ہے ۔ اور انہوں نے ہینڈی ورک کے قابل قدر نمونے پیش کئے ہیں ۔ مالینی گوپالن جس قدر بہترین کتھک ڈانسر ہے اتنی ہی اچھی شاعرہ بھی ہے ۔ حال ہی میں ان کا مجموعہ کلام شائع ہوا ہے ۔ اور انھیں پانچویں ورلڈ کانگریس آف پوئیٹس سان فرانسکو میں مدعو کیا گیا ۔ اور یہ ہندوستان ۔ یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکا اور کینیڈا میں اپنے رقص کے فنکارانہ مظاہرے کر چکی ہیں ۔ ان سب اوصاف کے باوجود مالینی گوپالن کو روشن کماری کی شاگردہ ہونے پر فخر ہے

نندیتا پوری ۔ یہ اکیس سالہ حسینہ روشن کماری جی سے کتھک ڈانس کو خصوصی طور پر سیکھنے کے لئے دہلی سے نرتیہ کلا کیندر میں وارد ہوئیں ۔ انھیں گورنمنٹ آف انڈیا سے کتھک ڈانس سیکھنے کے لئے سکالرشپ ملتا ہے ۔

اب دل تھام لیجئے ۔ نرتیہ کلا کیندر کی طالبات کا آخری آئٹم تین تال میں پیش کر رہی ہیں ۔ بھیانی اگاسکر اور نگار بانو ویسے تو پروگرام میں حصہ لینے والی ہر فن کارہ کے عزیز و اقارب سہیلیاں ۔ واقف کار وافر تعداد میں تشریف لائے ہوئے ہیں مگر اس جوڑی بھیانی اگاسکر اور نگار بانو کے کمالات دیکھنے کے لئے نصف سے زیادہ حاضرین کی تعداد ان لوگوں کے رشتہ داروں ۔ مداحوں اور فن رقص سے دلچسپی رکھنے والوں کا ہے ۔ دونوں نے اپنے سب استادوں کے پاؤں چھوئے ہیں ۔ اور پھر جو ان جوڑی نے اپنے پاؤں کی تھرتھراہٹ سے دیکھنے والوں کے دلوں میں تھرتھراہٹ کی لہریں موجود کی ہیں اس کا حال الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے [illegible] کی ہی چیز تھی ۔ جس طالبانہ خود سپردگی کے ساتھ [illegible] اپنے فن کا مظاہرہ کیا اس کی تعریف کے لئے الفاظ [illegible] فرہنگ آصفیہ میں بھی تلاش نہ کر سکا ۔ میرے [illegible] ہوتا تو جگر واشٹر کے وزیر اعلیٰ انتولے صاحب [illegible] کرتا کہ نگار بانو ایسی فنافی الکتھک کو سرکاری طور پر سکالرشپ

دیا جائے تاکہ وہ اپنے فن کو مزید سنوارنے کے لئے کسی قسم کی مالی دقت محسوس نہ کرے۔ کاش ہماری سیاست والی کرسیوں کے لئے جوڑ توڑ سے کچھ وقت نکال کر فنکاروں کے مستقبل کی طرف کچھ دھیان دے سکتے۔

کماری بھانی اگاسکر کتھک ڈانس کے سلسلے میں کئی انعامات اور ٹرافیاں حاصل کر چکی ہیں۔ اور انھوں نے پریاگ سنگیت سمتی الٰہ آباد سے "پربھاکر" کی ڈگری حاصل کی ہے۔ نگار بانو کو تو شاید خود بھی یاد نہیں کہ وہ کس قدر انعامات ایوارڈ اور ٹرافیاں حاصل کر چکی ہیں۔ انھیں بمبئی دوردرشن پر کئی بار ڈانسنگ پروگرام مل چکے ہیں۔ خوبصورتی رقص اور فن کے تئیں والہانہ خودسپردگی کی یہ تثلیث مستقبل میں روشن کماری کے نام کو تو روشن کرے گی ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ فن کے تئیں والہانہ سپردگی کے سلسلے میں یہ اپنا ثانی نہیں رکھے گی۔ ناانصافی ہوگی اگر استاد فقیر محمد صاحب۔ شری وشواپرکاش۔ جناب شریف احمد۔ جناب آصف خاں بشری ماسٹر ڈمیانی اور دیگر سازندوں کے کمالاتِ فن کو نہ سراہا جائے۔ ان سب ہستیوں کی کوششوں اور محنت سے ہی یہ سب لڑکیاں اس قدر قابل ہو سکیں کہ اس قسم کے پروگرام میں مقبولیت پاسکیں۔ بھانی اگاسکر اور نگار بانو کے پرکشش رقص کے بعد انٹرول ہوا تو استاد فقیر محمد صاحب۔ روشن کماری جی اور ان کی والدہ صاحبہ کو پروگرام کی انتہائی کامیابی پر مبارکباد دی۔ روشن جی کے سیکریٹری جناب عمار صاحب پروگرام کے انتظام کے سلسلے میں اس قدر منہمک تھے کہ انھیں اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔ انٹرول میں بتلانے لگے کہ منور صاحب اب آپ ایک ایسی آرٹسٹ کا کمالِ فن دیکھیں گے کہ مدتوں نہ بھول سکیں گے۔

نرتیہ کلا کیندر کے ہر سالانہ جشن میں روشن کماری جی کسی نہ کسی ایسے ماہرِ فن کو بھی اپنے فنی کمالات دکھانے کیلئے مدعو کرتی رہیں۔ جس کی شہرت ملک اور بیرونِ ملک اپنے نقوش چھوڑ چکی ہو۔ لہٰذا پہلے سالانہ جشن میں استاد امجد علی خاں اور شریمتی کلپنا بھارت۔ دوسرے سالانہ جشن میں پنڈت جس راج اور پنڈت امیش شنکر۔ تیسرے سالانہ جشن میں شریمتی پروین سلطانہ شری کرشن مہاراج اور شری روشن جمال۔ چوتھے جشن میں شریمتی نرملا دیوی شری سمتا پرشاد اور کنور راجندر سنگھ پانچویں جشن میں پنڈت شوکمار شرما۔ شریمتی للتا راؤ اور شری لال جی سریواستوا۔ چھٹے جشن میں شری شمیم احمد اور شریمتی کنک ریلے۔ ساتویں جشن میں شریمتی سنجوکتا پانی گرہی آٹھویں جشن میں شریمتی جاویری سسٹرز۔ اور نانویں جشن میں راجہ رادھا ریڈی اور کوشیلا نے اپنے اپنے کمالاتِ فن سے حاضرین کو محوِ حیرت بنایا تھا اور اب کے برس کماری سورن مکھی اپنے کمالِ فن سے دیکھنے والوں کو مبہوت کرنے مدراس سے تشریف لائی ہیں۔

کماری سورن مکھی ہندوستانی کلاسیکل ڈانس بھارت ناٹیم میں مہارتِ تامہ رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی مثالی ڈانسر ہے جس کی نظیر شاید ہی دنیا میں مل سکے۔ سورن مکھی نے پانچ سال کی عمر میں ڈانس کی ابتدا کر دی تھی۔ ان کے والدین نے ہی انھیں ابتدائی ٹریننگ دی اور اب بھی انہی کی نگرانی میں یہ اپنے کمالِ فن کی معراج پا رہی ہیں۔ آپ تامل ناڈو کی سٹیٹ ڈانسر ہیں۔

ایک گھنٹہ تک کماری سورن مکھی نے اپنے کمالِ فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی تصویر کشی سے الفاظ قاصر ہیں۔ حاضرین بُت بنے سورن مکھی کی حرکاتِ رقص کو دیکھ رہے ہیں اور بار بار مسلسل تالیوں اور پرشور تالیوں سے داد و تحسین دے رہے ہیں۔

دہلی اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں موسیقی اور رقص کے اکثر پرائیویٹ کلا کیندر اچھی شہرت نہیں رکھتے۔ کیونکہ ایسے کلا کیندر میں بداخلاقی اور بدمعاشی کے تمام مراحل موسیقی اور رقص کے پردے میں ہی طے ہوتے ہیں اور بعض ادارے تو عیاش رؤسا کو ان اداروں میں موسیقی اور رقص سیکھنے والی لڑکیوں کو سپلائی کرتے ہیں۔ مگر نرتیہ کلا کیندر بانندرہ بمبئی روشن کماری جی کی نگرانی میں جو صالح روایات پچھلے دس سالوں میں قائم کر چکا ہے وہ اس کی شاہد ہیں

کر ادارے کے کارکنان اخلاقی قدروں کو ایمان کی حد تک شرافت اور تہذیب کا آئینہ دار بنائے ہوئے ہیں۔ یہاں نرت کو عبادت سمجھا جاتا ہے اور اسی جذبہ کے تحت نرتیہ کلاکیندر کی فضا کو بالکل پاک و صاف رکھا جاتا ہے۔ یہاں ہم اپنی بچیوں کو بغیر کسی خدشے کے رقص کی تعلیم کے حصول کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ راقم الحروف کئی مرتبہ روشن کماری جی کے زیرِ اہتمام چل رہے اس نرتیہ کلاکیندر میں گیا ہے اور یقیناً اس ادارے کی فضا کو ایک مندر کی طرح پاک پایا ہے

خدا روشن کماری جی کو اپنے والدین کے زیرِ سایہ عمر طویل دے اور وہ اسی طرح کتھک کی رانی بنی رہیں اور اپنے اس خدا داد جوہر سے ملک کو فائدہ پہونچائیں۔

بقیہ :- بلبل چہ گفت ....

اور کیا یہ درست نہیں ہے کہ وہ مشاعرہ کے نام پر وصول شدہ رقوم خورد برد کر چکے ہیں۔

ہم عرشی صاحب کا بیان اس مشاعرہ کے سلسلے میں شانِ ہند میں شائع کرنے کے لئے تیار ہیں لہٰذا انھیں چاہئے کہ اپنی صفائی میں جو کچھ چاہیں لکھیں۔ انھیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس طرح جھوٹے اعلانات سے روپیہ بٹورنا قانونی طور پر جرم ہے اور اگر انھوں نے اس سلسلے میں کوئی معقول راہ اختیار نہ فرمائی تو یقیناً انھیں بہت جلد کسی عدالت میں حساب فہمی کرنی ہوگی۔

کیا غضب ہے کہ جو شخص اول فعول کو اول جلول یشترگربہ کو شتروگربہ لکھے اور شترگربہ کو عیب کی بجائے صفت کہے وہ بزمِ عروض و فن قائم کرتا ہے ــــ ...

غزل

راز لائل پوری

شعر و سخن کی بات ہے یا فکر و فن کی بات
جب بھی کہی ہے ہم نے کہی بانکپن کی بات

آئے جو فصلِ گل تو نشیمن اُجڑ گیا
ہم کیا کریں کسی سے بہارِ چمن کی بات

زاہد کو حور، رند کو جام و سبو پسند
وہ اس کا ذوق ہے وہ شوق یہ اسکا لگن کی بات

گھبرا کے راز آنکھ سے آنسو نکل پڑے
پوچھی نہ جب کسی نے غریب الوطن کی بات

قطعات

ڈاکٹر اودے سری ارمان
(بلاری)

بموں پر فخر کرتے دیکھ کر سائنس دانوں کو
زمیں کی حسرتیں تعمیر کے گھر بیٹھ کر روئیں
ترقی یافتہ دنیا سے بچھڑے لوگ اچھے ہیں
کسانوں نے کبھی کھیتوں میں بندوقیں نہیں بوئیں

انسان کوئی بھی جیتے جی کب قہرِ خدا سے ڈرتا ہے
شیدائی رنگِ بزمِ جہاں تفریح پہ جیتا مرتا ہے
پیغامِ اجل کے آتے ہی کھلتی ہیں تغافل کی آنکھیں
انسان جنازے کے پیچھے کچھ ہوش کی باتیں کرتا ہے

آپ کا بچّہ

آپ کے گھر کا چراغ ھے

اپنے بچّے کی درازیٔ عمر کے لئے اسے

کالی کھانسی

ڈیپتھیریا

ٹیٹنس ——— اور

پولیو ——— سے بچائیے

اور اپنے نزدیکی دواخانہ / خاندانی منصوبہ بندی سینٹر سے
مندرجہ بالا سبھی بیماریوں کے لئے حفظِ ماتقدم کے لئے جملہ خدمات مفت حاصل کریں۔

فوری مفاد اٹھائیے

ڈائریکٹوریٹ آف ہیلتھ اینڈ فیملی ویلفیئر
دلّی انتظامیہ دلّی

بھولا بھٹکا

ڈاکٹر اودے سرن ارمان (بلاری)

پوٹلی بغل میں دبائے مکندی بہت دیر سے اپنے دوست
مو کے انتظار میں کھڑا تھا۔ معمول کے خلاف آج اسے آنے
ں نہ معلوم کیوں دیر ہو گئی تھی۔
مکندی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس کی راہ دیکھ رہا تھا
پرمو آتا دکھائی دیا تو مکندی بے ساختہ شکایت کے لہجہ
یں کہنے لگا۔ "پرمو تو نے تو آج تھکا دیا کیا ہوا جو اتنی دیر
ے گئی۔"

"کچھ نہیں یار۔ یہ بغل میں کیا دبائے ہوئے ہو" پرمو نے
چھا۔

"شیشے کی پالکی کی رنگین دلہن کے لیے کچھ نہ کچھ تو چاہیے
لے تو اس کو بیچ لائیں تو جاؤں گا نہیں۔" زیورات کی
لی پرمو کی طرف بڑھاتے ہوئے مکندی نے کہا۔
"تو نے اپنی بیوی کے گہنے تو پہلے ہی گروی رکھ دیئے
اور ان کے چھڑانے کی کوئی امید بھی نہیں ہے۔ آج
کے گہنے لے آیا ؟" پوٹلی کھولتے ہوئے پرمو نے کہا۔
"اپنی لڑکی سرتا کے ہیں۔"
"لڑکی کے گہنے بیچ کر شراب پیوگے۔ مکندی تمہارا
غ تو نہیں چل گیا ہے ان گہنوں کے پیچھے اس کو سسرال
طرح طرح کے طعنے سننے پڑیں گے اور اس کا جینا حرام
جائیگا۔ وہ ہر ایک کی نظر سے گر جائیگی تمہاری بیوی تو مر گئی
کے گہنے نہیں رہے تو کوئی بات نہیں۔ مگر یہ بات
ت طول پکڑے گی۔"

"چل بے گدھے اپنے شوق کو پورا کرنے میں کہیں یہ باتیں
جاتی ہیں۔ دیکھو ایک بات میں تیری مان سکتا ہوں کہ بیچنے
کے ان کو گروی رکھے دیتا ہوں جیسا موقع ہوگا دیکھا
ئے گا۔ لیکن دیانند کے ہاں گروی رکھنے تو جائے گا
نہیں" مکندی کی یہ بات سنکر پرمو نے پوٹلی سنبھالی

اور دیانند کے ہاں گروی رکھنے کے لیے چل پڑا۔ مگر پرمو
نے یہ عقلمندی کی کہ اس نے دیانند سے صاف صاف بتا دیا کہ
وہ ان زیورات کو مکندی کی طرف سے گروی رکھنے آیا ہے۔
مکندی کا بیٹا کرن اپنے باپ کی شراب نوشی سے عاجز
آگیا تھا۔ باپ گھر کی ہر چیز بیچ کر شراب پینے پر اترا ہوا تھا
باپ بیٹے کا رشتہ تھا۔ کرن باپ کو سمجھا ہی تو سکتا تھا مگر
باپ بالکل چکنا گھڑا تھا۔ اور اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔
مجبوراً وہ باپ کو تنہا چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا۔ اور ڈیڑھ سو روپیہ
ماہانہ کے عوض ایک ورک شاپ میں کام کرنے لگا۔ جب
اسے کہیں باہر ورکشاپ کے کام پر جانا پڑتا تھا تو اوپر کی ساری
آمدنی اس کی اپنی ہوتی تھی۔ اس طرح جو کچھ بھی اسے ملتا تھا
وہ اپنی بہن سرتا کو لاکر دے دیتا تھا۔ ایک بار جب سرتا روپے
گن رہی تھی تبھی مکندی آگیا اور جھومتے ہوئے ہونٹوں پر زبان
پھیرتے ہوئے بولا۔ "ان روپوں میں سے کچھ روپے تو ہمیں بھی
ملنے چاہئیں۔"
"کس خوشی میں ؟" ہونٹ بچکاتے ہوئے کرن کہنے لگا۔
"میں تیرا باپ نہیں ہوں۔ بہن کو سارے روپے دیئے
جو پرائے گھر کی ہے۔ اور مجھے ایک بوتل کے لائق روپے بھی
نہیں دیئے جس نے تجھے پال پوس کر اتنا بڑا کر دیا" مکندی
"سب کچھ ٹھیک ہے۔ تم باپ ہو مگر شرابی ہو اور شراب
سے میرا کوئی ناطہ نہیں ہے۔ میں غریب ہوں۔ تمہاری ضرورتیں
تو پوری کر سکتا ہوں مگر برباد کرنے والے شوق نہیں۔"
"شراب۔ کیا ضرورت نہیں ہوتی ہے کیا ؟"
"ہاں یہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔"
"تو مجھے ایک روپیہ روز بھی نہیں دے سکتا ؟" مکندی نے
گڑگڑا کے کہا۔ کرن کو ترس آگیا اور اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے
میں ایک روپیہ روز طاق میں رکھ دیا کروں گا۔ چاہے تم شراب

پیو یا افیون کھاؤ۔ شراب کے نام سے بھی چڑنے والے کا باپ شرابی ہو کتنے دکھ کی بات ہے۔"

"اچھا ایک ہی روپیہ سہی۔"

مکندی باہر چلا گیا۔ دونوں بھائی بہن جاتے ہوئے باپ کو نفرت اور افسوس کی ملی جلی نظروں سے دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد کرن نے کہا "سرتا مجھے ایک کسان کے یہاں آئل انجن ٹھیک کرنے جانا ہے۔ تین چار گھنٹے لگیں گے تو کھانا اب کر تیار رکھنا میں آکر کھالوں گا میرے انتظار میں تو بھوکی مت بیٹھی رہنا۔" کرن اوزاروں کا تھیلا سنبھالتا ہوا چلا گیا۔ "کیا تم مکندی کے لڑکے ہو۔"؟

کسان نے کرن کی صورت دیکھتے ہی پوچھا۔

"جی ہاں میں ان ہی کا لڑکا ہوں مگر آپ نے کیسے پہچان لیا میں نے تو آج پہلی مرتبہ ہی آپ کے درشن کئے ہیں۔"

"میں نے تمہاری شکل و صورت مکندی سے ملتی جلتی دیکھ کر اندازہ لگایا۔ کبھی کبھی اندازہ صحیح بھی ہو جاتا ہے مگر ایک بات تعجب کی ہے کہ شرابی کی اولاد کاریگر نکل گئی۔"

"زمیندار صاحب کیسی شراب، میں تو پان بیڑی کا بھی گنہگار نہیں ہوں۔" تھیلا میز پر رکھتے ہوئے کرن نے کہا۔

"بس پیٹ پالنے کی چنتا رہتی ہے اس زمانے میں عزت سے روزی کمائی جائے۔ یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔" انجن پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے بات پوری کی۔

"ہاں بیٹے ٹھیک کہتے ہو۔ ایمانداری سے پیٹ پالنا بھی ایک طرح کا تپ ہے تمہارے خیالات بہت اچھے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ترقی کرتے ہیں۔ بیگم مستری جی کے لئے چائے لاؤ۔"

"زمیندار صاحب چائے بعد میں پیوں گا پہلے انجن کو ٹھیک کر لوں۔ یہ کہتے ہوئے کرن آئل انجن سے جٹ گیا اور ٹھیک ہی کر کے دم لیا۔

"لیجئے صاحب اس کی جو خرابی میں نے ٹھیک کی ہے۔ وہ خرابی اب اس میں کبھی نہیں آسکتی۔ اگر یہی خرابی پھر سے ہوئی تو مفت مرمت کروں گا۔" یہ کہہ کر کرن کھڑا ہو گیا۔ "بیٹھو مستری جی ایسی کیا جلدی ہے۔ بولو کیا پیش کیا جائے۔" زمیندار نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جو چاہو سو دیدو صاحب میں اپنے منہ سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"مستری جی ہم تمہاری شرافت سے بہت خوش ہیں اور اس خوشی میں ہم تمہاری ماں اور بہن کے وہ گہنے جو تمہارے باپ نے ہمارے یہاں گروی رکھے ہوئے ہیں بغیر سود لئے ہی تم کو دے دیں گے جب چاہو چھڑا لینا نہ سہی ایک کا ایک۔"

"سا ہو صاحب مجھے سب کچھ معلوم ہے مگر آمدنی کم ہے اس لئے چھڑا نہیں پا رہا ہوں چھڑاؤں گا ضرور مگر پیسے پیسے کر کے زیور چھڑاؤں گا۔" کرن نے بات بنائی حالانکہ اس کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ زمیندار صاحب نے خوشی سے کچھ روپے دیئے اور وہ گھر چلا آیا۔ بھائی کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہی بولی۔ "کیا آج مزدوری نہیں ملی یا امید سے کم ملی؟"

"مزدوری ملی اور امید سے زیادہ"

"پھر سست کیوں ہو۔"

"ذرا اپنے گہنے تو دکھانا؟" یہ سنتے ہی سرتا کا ماتھا ٹھنکا وہ جلدی سے اٹھی اور صندوق کھولا تو گہنوں کا نام و نشان نہ تھا وہ اداس اداس سی بھائی کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

"کہیں مل گئے۔؟"

"کچھ بھی نہیں ہے بھیا" ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "تمہارے پتا جی نے جہاں ماں کا زیور گروی رکھ کر شراب پی وہیں تمہارا زیور بھی گیا۔" بیٹھک میں بیٹھا مکندی سب سن رہا تھا اور بہنے ترا غیر رہا تھا کہ کاش سب بیٹا نہیں سوچ پا رہا تھا کہ کیسے سامنے ہو کر کہے کہ لیا۔ اس کمبخت کو اس بات کا پتہ کیسے چل گیا۔ مکندی نے من ہی من کہا۔

"بھیا یہ بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی۔" کرن نے سارا قصہ سنایا اور کہا۔ "میں نے قسم کھائی ہے جب تک تیرے زیور چھڑا نہ لوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا کیونکہ روپیہ تمہارے پتا جی لے لیتے ہیں ورنہ اور بھی جلدی چھڑا لیتا۔"

"بھیا تم اتنا روپیہ کیسے جوڑو گے بڑی محنت کرنی پڑے

محنت تیرے گہنوں کے لیے تھوڑے ہی کروں گا اپنے گھر کا ابرو [illegible] کو مٹی میں ملانے کے لئے تمہارے باپ نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے بڑوں کا کیا اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے مکندی سب کچھ غور سے سن رہا تھا اور اس کا ضمیر اُسے لعنت ملامت کر رہا تھا جیسے جیسے نشہ اُترتا گیا اس کا شعور جاگتا گیا ساری رات اسے نیند نہیں آئی جاگتے ہی جاگتے دن نکل آیا وہ اٹھا اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔ کرن حسب معمول بیٹھک میں ناشتہ لے کر گئی تو باپ کو موجود نہ پایا اسے حیرانی ہوئی کہ جو شخص بن کھائے گھر سے قدم باہر نہیں رکھتا تھا آج بغیر کھائے کیسے چلا گیا دونوں بہن بھائی باپ کا انتظار کرتے رہے طاق میں رکھا چار روپیہ بھی یوں ہی رکھا تھا۔ مکندی شام کو گھر لوٹا تو اس کے قدم لڑکھڑا نہیں رہے تھے۔ منہ سے شراب کی بدبو بھی نہیں آ رہی تھی۔ کرن نے باپ کے بدلے ہوئے طور دیکھتے جھٹ سے پوچھا۔

"پتا جی سویرے ہی سویرے کہاں چلے گئے تھے؟"

"اس راستے کو ڈھونڈنے جس پر بیس سال پہلے چلا تھا۔ محنت کرتا تھا کنبے کو پالتا تھا میں نے سکوٹر کی آڑھت پر پلے داری کر لی ہے چار روپے کمائے تھے ایک کے چنے اور گڑ کھا لیا تین روپے یہ ہیں جتنا کماؤں گا تمہیں دوں گا اور اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ آج سے میں نے شیشے کی بالکی میں آگ لگا دی ہے۔ میری وجہ سے گھر کی پریشانیاں بڑھی ہیں۔ میں ہی ان کو کم بھی کروں گا۔ دونوں بہن بھائی خوشی سے اپنے پتا کو لپٹ گئے اور تینوں کی آنکھوں میں خوشی کی نمی بہتر مستقبل کا پتہ دے رہی تھی۔

•••

غزل

پروفیسر مجتبیٰ اختر امرتسری

زخم لاکھوں دیئے سنگِ درِ ہرجائی نے
سر کو اٹھنے نہ دیا شوقِ جبیں سائی نے

کیا کیا سحر تری انجمن آرائی نے
ہم سے منہ پھیر لیا عقل نے دانائی نے

کوئی بھی [illegible] بیانوں کو نہ سوجھی تمثیل
اس قدر کر دیا عاجز تری یکتائی نے

ترے جلووں سے بھڑکنے لگی دنیائے مجاز
حشر سا کر دیا برپا تری رعنائی نے

کبھی شعلے پہ چڑھا آگ میں کودا بھی کبھی
کھیل کیا کیا نہ دکھائے ترے سودائی نے

شادمانی میں جو تھے مست انھیں کیا معلوم
کتنے دل توڑ دیئے نغمۂ شہنائی نے

تیز تر ہو گئی ہر سینے میں دل کی دھڑکن
حشر برپا کیا وہ عشق کی انگڑائی نے

بادہ نوشی کو میں تکفیر سمجھ بیٹھا تھا
شورِ حق حق کیا قلقلِ مینائی نے

جوہری شعر کے ہیں دیکھ کے حیران اختر
گوہر اُگلے جو یمِ فکر کی گہرائی نے

دلی کی منصوبہ جاتی اسکیموں پر
عرصہ اپریل تا اگست کے دوران اخراجات سب سے زیادہ

یہ اعداد و شمار خود اس حقیقت کا مظہر ہیں

(رقم کروڑوں روپے میں)

	۱۹۷۸-۷۹	۱۹۷۹-۸۰	۱۹۸۰-۸۱	۱۹۸۱-۸۲
منظور شدہ مصارف	۱۰۷٫۳۵۰	۱۰۸٫۰۰	۱۲۰٫۶۸	۱۶۴٫۰۰
اخراجات ۳۱ اگست تک	۱۹٫۹۸	۲۲٫۲۵	۳۶٫۷۲	۵۷٫۴۸
اخراجاتی تناسب	۱۸٫۰۰	۲۰٫۶۰	۳۰٫۴۲	۳۵٫۰۴

** سال ۸۱-۱۹۸۰ء کے تمام منظور شدہ مصارف کی ۱۲۰٫۶۸ کروڑ روپے کی رقم کلی طور پر تصرف میں لائی گئی اور ایک بھی پیسہ واپس نہیں کیا گیا۔ اس سال کے مصارف کے لئے وقف ۱۶۴ کروڑ روپے کی رقم کو بھی کلی طور پر تصرف میں لانے کے لئے ضروری اقدامات اٹھائے جا چکے ہیں۔

** پہلے سے چلی آرہی اسکیموں کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ رواں مالی سال کے منصوبہ میں شامل ۲۸۷ نئی اسکیموں میں سے بیشتر پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے۔

** پسماندہ و گندے علاقوں میں ماحولیاتی سدھار کے کاموں کے لئے دلی ترقیاتی اتھارٹی کی طرف سے پہلے ہی دو کروڑ روپے کی رقم دی جا چکی ہے۔

** درج فہرست ذاتوں، قبائل اور پسماندہ طبقوں کی بہبودی اسکیموں کے عمل درآمد پر دلی انتظامیہ خصوصی توجہ مرکوز کئے ہوئے ہے۔

** رہائشی تعمیرات اور شہری فروغ وغیرہ کیلئے رواں مالی سال میں مجوزہ ۱۴۲٫۰۲ کروڑ روپے کے بجٹ میں سے دلی ترقیات اتھارٹی کی طرف سے ۵۸٫۶۲ کروڑ روپے کی رقم خرچ کی جا چکی ہے۔

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ دلی

ڈی آئی پی/۵۱۲/۱/۸۱

پاکستانی سفارت خانہ یا فرعون کا دربار؟

مسرور دوستوی

دیکھنے ہم بھی گئے ....

قیام بمبئی کے دوران روزنامہ قومی آواز (بمبئی ایڈیشن) میں ہر ہفتہ بڑی شد و مد سے یہ اعلان شائع ہو رہا تھا۔

"پاکستانی سفارت خانہ یا فرعون کا دربار" ایک اسپیشل رپورٹ قومی آواز بمبئی کے [illegible] کے پہلے شمارہ میں شائع ہوگی۔ [illegible] قومی آواز بمبئی کا پہلا شمارہ بازار میں آیا تو [illegible] رپورٹ اس میں نظر سے نہ گذری ہاں یہ نوٹ ضرور دیکھا کہ یہ رپورٹ آئندہ شمارہ میں شائع ہو رہی ہے۔

[illegible] روزنامہ قومی آواز [illegible] ہر ہفتہ با تصویر اشتہار کے ذریعہ یہ اعلان نظر سے گزرنے لگا کہ پاکستانی سفارت خانہ یا فرعون کا دربار پڑھنے کے لئے ہفت روزہ قومی آواز کا دوسرا شمارہ ابھی سے ریزرو کرا لیجئے۔ اس خدشہ سے کہ کہیں ہفت روزہ قومی آواز (بمبئی) کا دوسرا شمارہ ہمیں دہلی میں مل ہی نہ سکے احتیاطاً ہم نے بمبئی کے کچھ دوستوں خصوصاً جناب شمس کنول مدیر [illegible] کو کہہ دیا کہ جونہی یہ شمارہ شائع ہو تو فوراً بھجوا دیجئے۔

حسب اعلان دوسرے شمارہ میں بھی اسپیشل رپورٹ شائع نہ ہوئی اور اعلان کیا گیا کہ تیسرے شمارے میں یہ رپورٹ شائع ہوگی۔ اور عوام تھے کہ اس اسپیشل رپورٹ کو پڑھنے کے لئے بے تاب تھے۔ اپنا بھی یہی حال تھا لہٰذا شمس کنول صاحب کو [illegible] کہ وہ از راہ کرم بمبئی سے یہ شمارہ فوراً بھجوائیں۔ مگر یہ شمارہ ہمیں [illegible] ہی دستیاب ہو گیا ویسے شمس کنول صاحب نے [illegible] بھجوایا۔

بڑی بے تابی سے اسپیشل رپورٹ پڑھی اور بقول غالب ـــ

تھا بہت شور کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا۔

کبھی "پاکستانی سفارت خانہ یا فرعون کا دربار" عنوان پہ نظر دوڑائیں اور کبھی اس اسپیشل رپورٹ کی سیاہٹ پہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب سے "قومی آواز" نئی دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اُردو صحافت کو عزت کا مقام ملنا شروع ہوا ہے۔ اور اس روزنامہ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اگر کام کرنے والوں میں سلیقہ ہو تو اُردو روزنامہ بھی انگریزی روزناموں کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قومی آواز نئی دہلی کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ لکھنؤ، بمبئی اور پٹنہ سے شائع ہونے والے قومی آواز کے کئی شمارے ہماری نظر سے گزر چکے ہیں یہ حقیقت ہے کہ "قومی آواز" کو اُردو صحافت کی آبرو کہا جا سکتا ہے مگر ہفت روزہ قومی آواز بمبئی نے "پاکستانی سفارت خانہ یا فرعون کا دربار" عنوان جما کر ان اخبارات کی پیروی کی ہے جو سنسنی خیز سرخیاں جما کر اپنی اشاعت بڑھانے کا بھونڈا طریقہ اپناتے ہیں۔ اور عوام کو بے وقوف بنا کر اپنی کامیابی پر خوش ہوتے ہیں۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ویزا لینے والوں کو یقیناً شکایات ہیں۔ مگر یہ شکایات زیادہ تر ویزا لینے والوں کی بے صبری ڈسپلن قائم نہ رکھنا۔ پاکستانی سفارت خانہ کی ہدایات کے مطابق عمل نہ کرنا۔ اور دیگر کئی وجوہات کی وجہ سے ہیں۔

دہلی کے علاوہ ملک بھر کے ویزا لینے والوں کے لئے صاف صاف ہدایات ہیں کہ وہ بذریعہ ڈاک اپنا پاسپورٹ اور ویزا کی درخواست اور [illegible] پوسٹل آرڈر وغیرہ بھیجوائیں اور جواب کے لئے محصول ڈاک لگا لفافہ ساتھ بھجوائیں اپنے ملک سے ہی ویزا

کے بارے میں صورتِ حال سے مطلع کر دیا جائے گا۔ اور اس رپورٹ میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ بذریعہ ڈاک درخواست دینے والوں کو پاکستان سے انکوائری رپورٹ آنے کے بعد لکھا گیا کہ ویزا لے جایئے۔

اپنے رشتہ داروں سے بیماری یا شادی کا تار یا خط منگانا کوئی بڑی بات نہیں ہے اور اس حقیقت سے کون ماں کا لال انکار کر سکتا ہے کہ نوے بلکہ پچانوے فیصد تار اور خطوط غلط بیانی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور جو پانچ دس فیصد واقعی سچائی لئے ہوتے ہیں ان میں سے بھی اکثر کو جھوٹ اور غلط بیانی کی بہتات کے پیش نظر غلط سمجھ لیا جاتا ہے اور یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ واقعی اشد ضرورت رکھنے والے لوگوں کو ناکامی کا منہ دیکھنے پر دلی اور دماغی کوفت ہوتی ہے۔ مگر آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اگر جھوٹ اور غلط بیانی کا یہ طریقہ عوام نے نہ اپنایا ہوتا تو صورت حال دوسری ہوتی۔

ہمارے عوام یہ نہیں سمجھتے کہ پاکستان بلا شک وشبہ ایک اسلامی ملک ہونے کے باوجود ایک دوسرا ملک ہے۔ جہاں ہم مذہبی یا دینی ہم آہنگی کے باوجود ضابطے کی کارروائی کئے بغیر نہیں جا سکتے۔ پاکستانی سفارت خانہ کو یہ اختیار پاکستان کی حکومت نے دیا ہے کہ وہ کسی غیر ملکی (ہندوستانی) کو پاکستان میں تبھی آنے دے جب وہ یہ تسلی کر لے کہ پاکستان جانے والا غیر ملکی غیر پسندیدہ تو نہیں۔ کسی غلط مقصد کے لئے تو نہیں جا رہا۔ یا فریب دیکر پاکستان میں ہی تو رہ جانا نہیں چاہتا۔ یا کسی سیاسی بدمزگی پیدا کرنے کے لئے تو نہیں جا رہا یا دوسرے لفظوں میں جاسوسی کے لئے تو نہیں جا رہا۔ اس لئے اگر پاکستانی سفارت خانہ ویزا حاصل کرنے والوں کی درخواستوں کو افرعت رائے انکوائری کے لئے بھجواتا ہے تو وہ اپنے ملک کی بہتری کے پیش نظر کرتا ہے۔ اسے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ویزا حاصل کرنے والوں کو انکوائری کے نتائج کئی کئی ماہ گزر جانے پر بھی معلوم نہیں ہوتے۔ انکوائری کا وقت پر نہ آنا اس امر کا ثبوت ہے کہ پاکستانی پولیس (سی۔ آئی۔ ڈی) اس معاملے میں اپنا کردار ایمانداری سے نہیں نبھاتی۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں انکوائری کرنے والے حضرات رشوت کا مطالبہ کرتے ہیں اگر اُن کا مطالبہ پورا کر دیا گیا تو انکوائری چند دنوں میں ہو کر آ جاتی ہے اور اگر یہ مطالبہ پورا نہ ہوا تو انکوائری کی رپورٹ ایک تو مہینوں بعد آئے گی اور وہ مخالفانہ انداز کی ہوگی۔ کراچی ٹکسال کے ایک سرکاری ملازم کا لڑکا جو کہ ان کی پہلی بیوی کے بطن سے ہے یہاں راجستھان میں مقیم ہے۔ اس لڑکے نے اپنے باپ کو اور سوتیلی ماں جو کہ بیمار تھی کو دیکھنے کے لئے ویزا کی درخواست دی مگر پورے ایک سال بعد رپورٹ ملی کہ درخواست دہندہ غلط بیانی کرتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انکوائری کرنے سے متعلقہ افسر یا کانسٹیبل کراچی ٹکسال میں، درخواست دہندہ کے باپ سے ملا۔ باپ نے خوشی خوشی سب کچھ بتایا کہ ہاں میں اس کا باپ ہوں لیے میں دو سال کا ہی چھوڑ آیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ۳۳ سال بعد میرا بیٹا مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔ یہ سب باتیں سُننے کے بعد انکوائری کرنے والے نے کہا کہ پانچ سو روپیہ دو تو تمہارا لڑکا چند دنوں میں ہی آ جائے گا۔ یہ بیچارہ ایک معمولی تنخواہ پانے والا سرکاری ملازم یہ رشوت نہ دے سکا اور بیٹے کو ایک سال تک سفارت خانے کے کئی چکر لگانے اور نوابیوں کی گردان سننے کے بعد آخرکار یہ جواب ملا کہ تمہاری انکوائری ٹھیک نہیں آئی لہٰذا تمہیں ویزا نہیں مل سکتا۔ اب آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کسی انکوائری کے دیر سے آنے یا نہ آنے میں پاکستانی سفارت خانے کا قصور ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کا سرکاری مشینری جو بیانی انکوائری کرتی ہے یہ اس کی مہربانی ہے۔

سفارت خانے کے افسران۔ کلرک۔ دربان اور چپراسی کوئی سرپھرے نہیں کہ وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کریں یا ویزا لینے والوں کو دھکے دیکر نکال دیں۔ اب تو سفارت خانے کافی انتظامات کر دیئے ہیں ورنہ ویزا ونگ کا بیرونی دروازہ کھلتے ہی ویزا لینے والے حضرات دیواریں پھاند کر لائنوں میں پہلے لگنے کے لئے بے تحاشا دوڑتے تھے اور ان کی اس بدحواسی میں بوڑھی عورتیں کچلی جاتی تھیں۔ تو آپ ہی بتایئے کہ کیا ویزا لینے والے پاکستانی مسلمان تھے یا ہندوستانی مسلمان۔ اور یہی ہندوستانی مسلمان ہی اپنے مسلمان بہنوں۔ بچیوں اور ماؤں کو کچلتے تھے اور پاکستانی سفارت خانہ

کے افسران ان کچلی ہوئی زخمی عورتوں کو طبی مدد کے لئے ہسپتال اپنے سامان کے ذریعہ بھجواتے تھے۔

ایمبسی کے صدر دروازے پر مستعد دربان ہونے سے کسی کو کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ یہ اس کا فرض ہے کہ وہ صدر دروازے پر یلغار کرنے والے حضرات سے کہے کہ ویزا ونگ دوسری طرف ہے وہاں جائیے جو حضرات افسران سے ملنا چاہتے ہیں یا ان تک خطوط وغیرہ پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ دربار فون سے متعلقہ افسر کو ملاقاتی یا خط لانے والے کے بارے میں مفصل واقفیت بہم پہنچاتا ہے اب اس متعلقہ افسر کی مرضی ہے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے یا آپ کا لایا ہوا خط دربان کے حوالے کر دینے کو کہتا ہے اس میں دربان سے کسی کو شکایت ہو تو ناانصافی ہے۔ ہاں جب کوئی بار بار دربان کو تنگ کرتا ہے تو وہ نرمی کے بجائے سختی سے کہتا ہے کہ یہاں سے چلے جائیے۔ اور راستہ چھوڑ دیجئے کیونکہ سفارت خانے میں دوسرے ممالک کے سفارت خانوں کے افسران یا اسی سفارت خانے کے افسران نے آنا جانا ہوتا ہے اگر دربان اپنی ڈیوٹی ایمانداری اور فرض شناسی سے نبھاتا ہے تو شکایت کے بجائے اسکی تعریف ہونی چاہئے۔ یہ سپیشل رپورٹ پڑھنے کے بعد راقم الحروف خود پاکستانی سفارتخانہ کے ویزا ونگ میں گیا اور وہاں دن بھر سب کارروائی دیکھی درخواست دہندگان کو انٹرویو ڈیٹ دی جاتی ہے یہ ڈیٹ اسی دن کی بھی ہو سکتی ہے یا دوسرے تیسرے دن کی بھی ہو سکتی ہے یعنی اندازاً اتنے حضرات کو روزانہ انٹرویو ڈیٹ دی جاتی ہے جن سے انٹرویو لینے والے افسران عہدہ برآ ہو سکیں۔ فیس جمع کرانے والوں کی لائن الگ ہوتی ہے فیس جمع کرانے کے بعد ہی درخواست دہندہ کو انٹرویو ڈیٹ مل سکتی ہیں۔ اب انٹرویو میں افسر متعلقہ آپ سے پوچھتا ہے کہ آپ پاکستان کیوں جانا چاہتے ہیں اگر آپ نے کوئی معقول وجہ نہیں بتائی تو وہ یقیناً آپ کی درخواست انکوائری کے لئے بھجوائے گا۔ بہرکیف تین صد کے قریب ہر روز ویزے دیئے جاتے ہیں۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو عام طور پر ویزے جاری نہیں کئے جاتے۔ دستکاروں کو بھی عام طور پر ویزا نہیں دیا جاتا کیونکہ خلیجی ممالک کے بعد پاکستان ایسا ملک ہے جہاں دستکاروں کو معاوضہ معقول سے بھی زیادہ ملتا ہے۔ وہ مکان بنانے والے راج مستری، جو اینٹ سیدھی نہیں لگا سکتا ستر روپیہ تک یومیہ لے لیتا ہے۔ کار ڈرائیور جو ہر روز ایکسی ڈینٹ کرنے کا عادی ہے اسے بھی چھ آٹھ سو ماہانہ کی ڈرائیوری مل جاتی ہے۔ گھریلو ملازم تو وہاں پر پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ آپ کے گھر میں رنگین ٹیلی ویژن ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو وہ ملازمت کی حامی بھر بھی لے گا مگر اس شرط کے ساتھ کہ جب ٹیلی ویژن چل رہا ہوگا۔ تو آپ اس سے کوئی کام نہیں لے سکتے۔ اگر وہاں آپ فقیروں کو کھانا کھلا کر ثواب دارین حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایسے فقیروں کو مہیا کرنے کے لئے ادارے قائم ہیں جو آپ سے پوچھتے ہیں کہ کھانے کے ساتھ نقد کس قدر ہر فقیر کو دو گے جہاں روزگار کی حالت یہ ہو کہ سرکاری کلرکوں تک غیر ملکی کاریں رکھے ہوئے ہوں (خواہ یہ رشوت کے طفیل ہی ہوں) وہاں جا کر یہاں کے کاریگر اور نوجوان غیر قانونی طور پر پاکستان میں ہی رہ جاتے ہیں چنانچہ پچھلے دنوں پاکستانی سفارت خانے نے جو اعداد و شمار برائے اشاعت اخبارات کو ریلیز کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایک سال کے عرصہ میں 35 ہزار ہندوستانی ناجائز طور پر پاکستان میں رہ رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ پاکستانی پولیس کے تعاون سے ہی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر حضرات غلط بیتے دیکر پاکستان کا ویزا لے کر چلے گئے اور اب ان کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کہاں گئے۔ کیونکہ ان لوگوں نے اپنے رشتہ داروں کے طفیل وہاں راشن کارڈوں میں نام لکھوا لیا۔ اور تو اور شناختی کارڈ تک (پاکستانی شہری ہونے کا) حاصل کر لیا۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے انٹرویو لینے والے افسران سچے اور جھوٹے ویزا لینے والوں کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات ان افسران کا اندازہ غلط اور مضحکہ خیز حد تک غلط بھی ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اصل ضرورت مند رہ جاتا ہے اور خالص دھوکہ باز ویزا حاصل کر لیتا ہے۔

بالی (راجستھان) کے جناب مختار احمد صاحب ایک بااثر اور

معزز شخصیت ہیں۔ انہیں اپنے ایک انتہائی قریبی رشتہ دار کی شادی میں معہ بیگم صاحبہ حیدر آباد سندھ جانا تھا۔ یہ بیچارے لائنوں میں لگ لگا کر جب انٹرویو آفیسر کے سامنے گئے تو پورے طور پر سچ بولتے ہوئے پاکستان سے آیا ہوا خط دکھایا کہ میری بیوی کی بہن کی شادی ہے اس لئے ہم دونوں کو جانا ہے۔ افسر مذکورہ نے ان کی درخواست برائے انکوائری بھجوانا چاہا تو نثار احمد صاحب نے کہا کہ حضور شادی میں چھ دن رہ گئے ہیں اور یہ انکوائری تب آئے گی جب شادی ہونے والی لڑکی ماں بن چکی ہو گی اس لئے ہمیں آپ ویزا دے دیں۔

نثار احمد صاحب انتہائی باشرف شخصیت کے مالک ہیں اور ایک معمولی آدمی بھی ان سے بات چیت کرتے وقت اندازہ لگا سکتا ہے کہ نثار صاحب واقعی شریف اور سچائی پسند ہیں مگر نہ معلوم افسر مذکور نے ان کی کس بات پر تاؤ کھایا اور ان کے پاسپورٹ پر ایسا نشان لگا دیا کہ انہیں ویزا مل ہی نہ سکے۔ نثار صاحب کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے یہ کہا کہ اگر آپ ویزا دینا نہیں چاہتے تو میرا پاسپورٹ واپس دیدیں تاکہ میں کسی دوسرے افسر سے گزارش کر سکوں۔ مگر اس کے برعکس ایک سمگلر جو بمبئی سے آیا ہوا تھا پاکستان میں اپنی بیوی کی علالت کا سو فیصد جھوٹا سرٹیفکیٹ دکھا کر ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

تمام ویزا لینے والوں سے کہہ دیا جاتا ہے اور وہاں لکھ کر بھی لگایا گیا ہے کہ ویزا تین بجے کے بعد حاصل کیجئے۔ لہٰذا وقت مقررہ پر پاکستانی سٹاف تمام پاسپورٹ جن میں منظور شدہ ویزا بھی ہوتے ہیں کسی بیرونی شخص کے حوالے کر دیتے ہیں کہ (جیٹ جلنے بجو جانے) کے مصداق خود ہی ان منظور شدہ اور غیر منظور شدہ درخواستوں اور پاسپورٹوں کو بانٹ لو۔ چنانچہ بیرونی صاحب نام پکارتے ہیں۔ مگر میدانِ حشر میں اکثر اوقات آواز سنائی نہیں دیتی اور مستورات جب ویزا یا پیلا کارڈ لینے آگے بڑھتی ہیں تو ہندوستانی مسلمان بھائی ہی آوازے کستے ہیں۔ قومی آواز ہفت روزہ کی حالیہ اشاعت میں ایسی ہی شکایت شائع ہوئی ہے مگر سپیشل رپورٹ والے حضرت نے نہ معلوم اپنے ہندوستانی مسلمان بھائیوں کی اس نامناسب روش

کو "شیطانی" قرار کیوں نہیں دیا۔

ویزا ونگ میں آپ جہاں بیٹھیں کوئی نہیں روکتا۔ ہاں ممنوع ونگ میں آپ کو جانے کا کیا حق ہے؟ چپڑاسی جب بار بار چیخ چیخ کر بتاتا ہے کہ کسی کو انٹرویو سلپ کے بغیر اندر جانے کی اجازت نہیں ہے تو آپ اس کی بات پر عمل کیوں نہیں کرتے اور جب وہ سختی سے روکتا ہے تو آپ اس کی تلخ کلامی کی شکایت کرتے ہیں کیوں؟

یہ سپیشل رپورٹ یقیناً دفتر میں بیٹھ کر یا لکھنے والے نے اپنے گھر میں بیٹھ کر لکھ دی ہے۔ وگرنہ اسے پاکستانی سفارتخانے میں بمبئی کے علاوہ ہندوستان کے دیگر حصوں سے آئے ہوئے لوگوں کا بھی حال چال پوچھنا چاہئے تھا۔ جس سراج احمد کا تذکرہ انھوں نے اپنی رپورٹ میں اوّل نمبر پر کیا ہے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ تا ر سو فیصد جھوٹا ہو گا۔ باقی انھوں نے بمبئی کی مستورات کی شکایت کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سپیشل رپورٹ لکھنے والے حضرت مستورات سے لگاؤ رکھنے میں ماہر ہیں۔ سپیشل رپورٹ لکھنے والے میرے بھائی یہ تو بتا دیا ہوتا کہ ویزا ونگ میں کتنے درخت ہیں جن کے سایہ میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر ہندوستانی مسلمانوں میں اخبار کو مقبول کرنے کا سلسلہ ہی رچانا تھا تو اس سے بہتر انداز میں سپیشل رپورٹ تیار کی جا سکتی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ سپیشل رپورٹ نگار نے "فرعون کا دربار" ایسا توہین آمیز عنوان دیکر ہندوستانی مسلمانوں کی کچھ مدد نہیں کی ہاں ویزا حاصل کرنے والوں کے لئے مزید مشکلات ضرور پیدا کر دیں۔

یہ کوئی جواز نہیں کہ اگر پاکستان میں ہندوستانی سفارت خانہ ہندوستان آنے والے پاکستانی حضرات کو ویزے فراخدلی سے جاری کرتا ہے تو پاکستانی سفارت خانہ ہندوستانی مسلمانوں کو پاکستان جانے کے لئے اسی فراخدلی سے ویزے جاری کرے۔ مختلف ملکوں کے اندرونی حالات مختلف ہوتے ہیں اور ہر حکومت اپنے ملک کے مفاد کے پیش نظر جو بہتر سمجھتی ہے اسے اس پر عمل پیرا ہونے کا پورا پورا حق ہے۔ سعودی عرب اور دوسرے خلیجی ممالک میں جانے کیلئے

ہندستانی مسلمان دس دس ہزار روپیہ ناجائز طور پر خرچ کرتے ہیں اور آئے دن لاکھوں روپیہ کے دھوکے ہندی مسلمانوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ مگر قومی آواز ہفت روزہ کے اسپیشل رپورٹ لکھنے والے کو یہ سعادت حاصل نہیں ہو سکی کہ وہ کسی عرب ملک کے خلاف کبھی اس قسم کی اسپیشل رپورٹ میں آواز بلند کرے کہ یہ خلیجی ممالک اپنے مسلمان بھائیوں کو وہاں کیوں نہیں آنے دیتے۔ صرف پاکستان کو ہی نشانہ کیوں بنایا گیا جبکہ ہندستان میں یہ آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ ان دونوں ممالک میں خیر سگالی کے تعلقات بڑھائے جائیں ———

•••

غزلیات

صابر ابوہری

ہر نفس واردات گزرے گی
حادثوں میں حیات گزرے گی

دل کی بستی کا اب خدا حافظ
خواہشوں کی برات گزرے گی

عشق آساں نہیں یہ سُن لیجے
دل کٹے گا نہ رات گزرے گی

غم کی لذت عجیب لذت ہے
ہنستے گاتے حیات گزرے گی

رازِ اُلفت نہ لایئے لب پر
سوز بالوں پہ بات گزرے گی

ظلمتِ شب کی عاقبت معلوم
صبح ہوگی یہ رات گزرے گی

دل کی دھڑکن یہ کہہ رہی ہے آج
پھر کوئی واردات گزرے گی

حاصلِ زیست ہے وہی صابر
جو بکیف مدیرِ حیات گزرے گی

ڈی اے ہرلین قربان

حال ابتر ہے خانقاہوں کا
رنگ دیکھو شراب خانوں کا

سر بکف پھر رہے ہیں دیوانے
ہے کرشمہ تری اداؤں کا

سب نے مطلب الگ الگ سمجھا
اُن پہ پیغام اُن نگاہوں کا

ہم نے تم کو خدا سے مانگا ہے
دیکھنا ہے اثر دعاؤں کا

دل میں مطلق نہیں بجز ڈر لیکن
نام ہے ہر جگہ خداؤں کا

اہلِ محشر ہیں کس قدر بے خود
تذکرہ ہے مرے گناہوں کا

خود سفینہ سنبھالیے قربان
کیا بھروسہ ہے ناخداؤں کا

شباب داور (گوالیار)

شرط پانی سے لگاتے کیوں ہو
ناؤ کاغذ کی بناتے کیوں ہو

زخم پر زخم لگاتے کیوں ہو
حوصلہ اور بڑھاتے کیوں ہو

رنگ میں اپنے نظر آتا ہوں
آئینہ مجھ کو دکھاتے کیوں ہو

سلسلہ توڑ لیا ہے اُس نے
مجھ کو احساس دلاتے کیوں ہو

شغل تتلی کا ہے کلی کو چھونا
پھر یہ الزام لگاتے کیوں ہو

قافلے اور بھی آئیں گے ابھی
راہ میں گرد اُڑاتے کیوں ہو

توڑ دے گردشِ حالات جسے
ایسی دیوار بناتے کیوں ہو

یہ سراسر ہے تکلف داور
دائرہ اتنا بڑھاتے کیوں ہو

(قسط ۵)

اوجین کے چند قدیم شعراء

عبدالله عابدی
آل انڈیا ریڈیو اندور

محمد مہتدی رہبر :

آپ سادات کالپی (یوپی) سے تھے۔ والد صاحب بسلسلۂ ملازمت بھوپال آگئے تھے۔ بھوپال میں ہی ۱۸۹۰ء میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپ کے چچا اور خسر مولوی سید محمد صاحب مادھو کالج اوجین میں ہیڈ مولوی تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد اس عہدہ پر سید محمد مہتدی رہبر کا تقرر عمل میں آیا۔ آپ یہاں اُردو اور فارسی کے اُستاد رہے آپ نے طلبا میں شاعری کا ذوق و شوق پیدا کیا۔ سلطان احمد صدیقی نے محمد مہتدی رہبر مرحوم کے بارے میں لکھا ہے کہ

"اوجین میں حضرت کرامت علی بشر اور حضرت عظیم جاگیردار اُستاد تھے اور دونوں میں اکثر شاعرانہ چشمکیں ہوتی رہتی تھیں۔ مگر یہ دونوں اُستاد مولانا رہبر کا احترام کرتے تھے اور اکثر صدارت کراتے تھے۔ مادھو کالج میگزین، آفتاب مالوہ اور ملک کے معتبر رسائل میں سید محمد مہتدی رہبر کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔ رہبر صاحب نے اقبال اور جوش کے کلام کا جواب لکھا، ہزاروں شعر کہے۔ کلام کا رنگ اُستادانہ تھا زبان پر قدرت تھی تکرار لفظی بہت مرغوب تھی۔ مضامین ادق، بلیغ الفاظ فارسی آمیز ہوتے تھے"۔

"محمد مہتدی رہبر اوجین سے اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوکر بھوپال ہی واپس ہوگئے تھے۔ مرزا غالب کی طرح پنشن کا معاملہ درپیش تھا۔ بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ سلطان احمد صدیقی نے اس سلسلے میں مزید لکھا ہے کہ

"مولانا رہبر ۱۹۴۶ء میں ریٹائر ہوکر بھوپال تشریف لے گئے۔ پانچ سال کوشش کرتے رہے مگر پنشن نہ ملی۔ مولانا سیدھے سادے آدمی تھے۔ رشوت اور دوڑ دھوپ نہ کرسکے۔ افسوس کہ پنشن نہ ملی اور بڑی پریشانی اور عسرت میں دن گزرنے لگے

آخر مجبور ہوکر اپنے صاحبزادہ کے پاس کراچی چلے گئے اور ۱۹۵۳ء میں وہیں انتقال فرمایا"۔

نمونۂ کلام :-

دو دلوں کو ایک کرنا چاہتا ہے تو اگر
بے کسوں کی لے خبر کر درد پر کچھ رحم کر

تفرقہ پردازیوں سے ایک جانب ہو کے چل
دور کر دے درد اپنے دل سے یہ کدورت بھی

مرتے کا ہوش تیری منزل مقصد سے دور ہے
سختیوں سے افزشوں سے سر بسر معمور ہے

دورِ حاضر کی نزاکت دیکھ کے کہہ رہا ہے گل بجن
کرنہ دنیا مست ہوکر اپنی محنت کو تلف

بس جو کہنا تھا تجھ سے کہہ دیا اے مجمع
اب ترے ہاتھوں میں ہے انکا قبول اور اتحاد

السلام اے پاسبانِ خلق و بے کساں
چارہ سازِ دردِ غم غمخوارِ غریبانِ جہاں

رحمتیں اللہ کی نازل ہوں تجھ پر دم بدم
سے کے جو آئیں گے نذر کہ بیٹھے ہیں ہم

احمد علی خاں وفا :

[illegible]

پیدائش ہوئی جہاں [illegible] کے [illegible]
ہوا۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق ہوا [illegible]
تلمذ حاصل کیا۔ [illegible] اوجین [illegible]
کرتے تھے۔ آپ کا کلام [illegible]
جرائد [illegible] شائع ہوتا تھا [illegible]
نے آپ کا [illegible] تبصرہ کرتے ہوئے [illegible]
ہے کہ :

[illegible] نعت، منقبت، سلام، مرثیہ، غزل
سب ہی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ نیز
روزنامہ جہاد، وہ بندری، زبان و بیان، صداقت
و [illegible] کا خاص جوہر ہے۔ پچپن سال کی عمر
میں [illegible] میں انتقال فرمایا۔ آپ کے دو
[illegible] جناب [illegible] احمد [illegible] شبیر احمد
[illegible] کرنے میں مشغول ہیں۔ محمود احمد
[illegible] شاعری کے علاوہ افسانے اور جاسوسی ناول
بھی لکھ رہے ہیں۔"

نمونہ کلام:-

ادھر ہے جوشِ وحشت اور ادھر کانٹا بیاباں کا
خدا حافظ ہے اب دیوانے کے جیب و گریباں کا
نہ [illegible] تیر نظر کا خون ہی پی کر کلیجے سے
کہاں تک ناز اٹھائے کوئی اس خونخوار مہماں کا
تبسم فرمایئے لیکن ذرا آہستہ آہستہ
کوئی پتھر نہیں [illegible] صاحب قلب انساں کا
گھٹا کی طرح ہر موئے تن جلنے لگا اپنا
چھپانا آج ہے مشکل ہو گیا اب سوز پنہاں کا
بہا دیں پاؤں کے چھالوں نے میرے خون کے دریا میں
رہا پیاسا نہ کوئی دشت میں کانٹا بیاباں کا
خدا کرے ہم کو یاد آیا انہیں عذر ستم کرنا
لٹا اب ڈھونڈتے پھرتے ہیں وہ گھر غریباں کا
قضا پیری [illegible] جانا کرے قاتل کا نہیں اچھا
کسی دن سامنا ہو جائے گا اس آفت جاں سے

محمد خاں رحیم اوجینی:

آپ [illegible] میں اوجین میں پیدا ہوئے۔ اردو ہندی
کی [illegible] تعلیم حاصل کی۔ شاعری کا شوق بیس بائیس سال
کی عمر سے ہوا۔ [illegible] بھی کرتے تھے۔ [illegible]
گلزار، بنوٹ اور اپنے علاقے کے اُستاد رہے۔ سید
کرامت علی بکھر اوجینی مرحوم سے شاعری میں شرف تلمذ
حاصل تھا۔ مرثیہ گوئی میں آپ کا مقابلہ بالعموم جناب [illegible]
اوجینی سے ہوا کرتا تھا۔

رحیم اوجینی مزدور پیشہ آدمی ہیں۔ کبھی کرانہ کی دکان کی
تھی۔ نقصان ہونے سے دکان بند کردی پھر کرانہ کی ہی
کسی دکان پر نوکری کرتے رہے۔ باسٹھ سال کی عمر میں ہسپتال
میں باغبانی کا کام کر رہے تھے وہاں ایک حادثے میں
کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ دو سال کے بعد بیساکھی کے سہارے
چلنے کے لائق ہوئے ہیں۔ آپ کے بارے میں سلطان احمد
صدیقی رقم طراز ہیں کہ:

"چھیاسی سال کی عمر میں بھی باوجود مشاعروں میں
شرکت کرتے ہیں۔ آل انڈیا اور صوبائی
مشاعروں میں بلائے جاتے ہیں۔ ضعیفی، مفلسی
اور عسرت کا شکار ہیں۔ سرکار سے امداد کی
کوشش کی گئی۔ کلکٹر نے سفارش کی مگر امداد
منظور نہ ہو سکی۔ رحیم صاحب، اکبر الہ آبادی اور
[illegible] احمق پھپھوندوی کا تتبع کرتے ہیں۔ کہیں
کہیں ہلکا پن بھی آجاتا ہے۔ آپ کے دو گلدستے
ہندی رسم الخط میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ
فروخت ہو گئے۔"

نمونہ کلام

کل ملی تھی پگار حد کردی — آج آٹا اُدھار حد کردی
ایک پر چار چار حد کردی — سائیکل پر سوار حد کردی
کالی صورت پہ ریشمی ساڑی — اس پہ سولہ سنگار حد کردی
[illegible] گی سارے جسم پر دیک — ہائے رے انتظار حد کردی
[illegible] کہتے ہیں انقلاب رحیم — کرسیوں پر چار حد کردی

غریب ایک عورت کو ہیں کام کتنے
وہ روٹی پکائے کہ بچے سنبھالے
نہ کیوں ناز [illegible] ہو مجھ کو
میری سات سالی مرے آٹھ سالے

سوار ہوتا ہے جنات سب حسینوں پر
بس آج ہوتا ہے جنات پر سوار مجھے
رحیم کم ہے یہاں کنٹرول کی سستی
پسند ہے یہ ریاست گوالیار مجھے

جین کے چند قدیم شعراء (السلسلہ مدھیہ پردیش میں اردو) مقالہ میں اُن شعراء کو شامل کیا گیا ہے۔ جن کا سن پیدائش ۱۸۳۰ء سے ۱۸۹۵ء کے مابین ہے۔ جب تک ۱۸۰۰ء سے ۱۸۳۸ء تک اور ۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۰ء تک باقی ماندہ شعراء وغیرہ کا علم نہیں ہو جاتا۔ اس وقت یہ تذکرہ ایک صدی کا مکمل تذکرہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ تاہم بہ الفاظ دیگر ابواب کے تعین کی سہولت کی خاطر ایک صدی از ۱۸۰۰ء تا ۱۸۹۹ء کا تذکرہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ جلد ہی " اوجین کے چند قدیم شعراء " کا دوسرا باب ۱۹۰۰ء سے قبل آزادی یعنی ۱۹۴۷ء تک کے شعراء پر مشتمل ہوگا۔ بعدہٗ ۱۹۴۷ء سے تا حال اوجین کے شعراء و ادباء کا احاطہ کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔

• اوجین کے چند قدیم شعراء مقالے کے سلسلے میں مجھے شانِ ہند دہلی کے باذوق قارئین کی صائب تجاویز کے علاوہ اوجین کے قدیم ترین شاعروں کے انکشافات کا بھی انتظار رہے گا۔ میں اُن حضرات کا ممنون رہونگا۔

●●●

غزل

کرگس بھسوانی

[illegible]ئے پہ جو ساقئ میخانہ رہے گا
[illegible] مرے ہاتھ میں پیمانہ رہے گا

جب تک اثرِ جلوۂ جانانہ رہے گا
[illegible]وں کی زباں پر مرا افسانہ رہے گا

[illegible] زباں سے مجھے کچھ بھی کہو لیکن
[illegible] مرا منہ سے شریفانہ رہے گا

تم قبر پہ ہنڈا سکی جلاؤ گے تو کیا ہے
ویرانہ ہر اک حال میں ویرانہ رہے گا

شاید مرے ہاتھوں میں نہیں شادی کی ریکھا
[illegible]شا بہ ہمیشہ مرا مردانہ رہے گا

یہ کیا کہ نہ پردہ ہے نہ برقع، نہ ردا ہے
کب تک ترا انداز یہ بچکانہ رہے گا

[illegible] آپ کی [illegible] کی ہی تو محبت
[illegible] رہے گا

ہم [illegible] نہیں سمجھیں گے اس وقت تک اپنا
[illegible] یا پاتا نہ رہے گا

[illegible]
[illegible]

[illegible] بہت نہ مجھے بیگم
[illegible] مرے گھر میں [illegible] رہے گا

جب تک [illegible] کرگس کا خباثت کا تجور کے
ان کا ہر اک انداز ظریفانہ رہے گا

غزل

کلیم کیفی (بمبئی)

عشق ہر آدمی کی فطرت ہے
حسن احساس کی بدولت ہے

موت نفرت کی ایک موجِ زہر
زندگی پرتوِ محبت ہے

ایک ہے زیست اور دو انداز
اک عبادت ہے اک تجارت ہے

مختلف راستے ہیں مذہب کے
آدمی مظہرِ حقیقت ہے

یہ سمجھ انسان کا ہے حسنِ نظر
ورنہ دنیا کی کیا حقیقت ہے

غم کے ماروں کی بات کون سنے
آج کل کس کو اتنی فرصت ہے

ہے بہاروں کی اک فضا قائم
جس طرف دیکھئے محبت ہے

کس لئے غم سے آج گھبرائیں
زندگی کی یہی علامت ہے

لذتِ درد بھی کلیمؔ ابھی
آدمی کے لئے ضرورت ہے

ناردرن ریلوے

ٹائم ٹیبل نوٹس

ناردرن ریلوے کے یکم اکتوبر ۱۹۸۱ سے مروج ہونے والے ٹائم ٹیبل کے بعض اہم عناصر حسبِ ذیل ہوں گے :

نئی گاڑیاں :

گاڑی نمبر	کہاں سے کہاں تک
505 اپ ایکسپریس	بارہ بنکی۔ لکھنؤ، کانپور سینٹرل (براستہ سمستی پور)
506 ڈاؤن ایکسپریس	کانپور سینٹرل۔ لکھنؤ۔ بارہ بنکی (براستہ سمستی پور)

ذیل گاڑیوں کی آمدورفت میں اضافہ

173 اپ/174 ڈاؤن ہمگری ایکسپریس کی آمدورفت ہفتہ میں دوبار سے بڑھاکر تین بار کر دی جائے گی اب یہ گاڑی ذیل دنوں میں چلا کرے گی

گاڑی نمبر	نظر ثانی شدہ دن
173 اپ	بدھوار، سنیچر وار اور اتوار، بادشہ سے
174 ڈاؤن	سوموار، ویروار اور اتوار، جمعل توی سے

ریل گاڑیوں میں توسیع :

گاڑی نمبر	کہاں سے کہاں تک
135 اپ مسافر گاڑی	وارانسی۔ فیض آباد، لکھنؤ
136 ڈاؤن مسافر گاڑی	لکھنؤ، فیض آباد، وارانسی

تبدیل شدہ گاڑیاں

گاڑی نمبر 1 یو ایس ڈی / 2 یو ایس ٹی ڈی جو کہ دہلی، شاہدرہ۔ شاملی۔ سہارنپور۔ انبالہ سٹی کے درمیان چلتی ہے اب تبدیل ہو کر دہلی۔ شاہدرہ۔ شاملی۔ سہارنپور کے درمیان 1 ایس ایس ڈی / 2 ایس ایس ڈی ہو جائے گی اور سہارنپور اور انبالہ سٹی کے درمیان 1 یو ایس / 2 یو ایس ہو جائے گی۔

مسترد شدہ گاڑیاں

گاڑی نمبر	کہاں سے کہاں تک
15 اَپ لنک ایکسپریس	وارانسی۔ فیض آباد۔ لکھنؤ
16 ڈاؤن لنک ایکسپریس	لکھنؤ۔ فیض آباد۔ وارانسی

وہ مقامات جہاں اب گاڑیاں نہیں ٹھہریں گی:

گاڑی نمبر	اسٹیشن
177 اَپ	گھرونڈہ

گاڑیوں کے اوقات میں اہم تبدیلیاں:

33 اَپ اب دہلی سے 21/20 بجے کے بجائے 20/50 بجے روانہ ہو کر 10/40 بجے کے بجائے 9/50 بجے جموں توی پہنچے گی۔

177 اَپ اب نئی دہلی سے 20/50 بجے کے بجائے 21/20 بجے روانہ ہو کر 9/25 بجے کے بجائے 10/30 بجے جموں توی پہنچے گی۔

23 اَپ اب 22/10 کے بجائے 22/25 بجے فیروزپور کینٹ پہنچے گی۔

45 اَپ اب 11/40 کے بجائے 11/25 بجے امرتسر پہنچے گی۔

66/62 ڈاؤن اب 16/40 کے بجائے 18 بجے وارانسی پہنچے گی۔

115 ڈاؤن اب 16/25 بجے کے بجائے 16/5 بجے لکھنؤ پہنچے گی۔

266 اَپ اب 15/50 کے بجائے 15/35 بجے جودھپور سے روانہ ہوگی۔

502 ڈاؤن اب 22/05 کے بجائے 22/20 بجے دہلی پہنچے گی۔

201 اَپ اب 22/25 کے بجائے 22/10 بجے دہلی سے روانہ ہوگی۔

1 ڈی جی (پرانا نمبر 3 ڈی جی) 21/55 کے بجائے 0/30 بجے غازی آباد سے روانہ ہو کر 22/45 کے بجائے 1/15 بجے دہلی پہنچے گی۔

2 بی ایس این 13/05 کے بجائے 13/30 بجے حضرت نظام الدین پہنچے گی۔

371 اَپ اب دہلی سے 18/45 کے بجائے 18/30 بجے روانہ ہوگی۔

ضروری

15 اے جے پی اب امرتسر سے 8/45 کے بجائے 8/30 بجے روانہ ہوگی

11 اے پی جے اب امرتسر سے 21/35 کے بجائے 21/50 بجے روانہ ہوگی اور 4/20 کے بجائے 5/10 بجے جوالا مکھی پہنچے گی۔

106 اپ اب لکھنؤ سے 15/40 کے بجائے 15/15 پر روانہ ہوگی۔

2 اے ڈی اب ڈیرہ بابا نانک سے 6/40 کے بجائے 6/55 پر روانہ ہوکر 8/35 کے بجائے 9/00 بجے امرتسر پہنچے گی۔

1 جے آر جے اب 9/28 کے بجائے 9/48 پر جالندھر سٹی پہنچے گی

2 جے پی جے اب جموں توی سے 8/40 کے بجائے 7/55 پر روانہ ہوکر 12/00 کے بجائے 11/25 پر پٹھان کوٹ پہنچے گی۔

4 ایل جے ایچ اب 19/55 کے بجائے 20/15 پر حصار پہنچے گی۔

1 ایس یو ایچ اب 22/40 کے بجائے 23/00 پر نانگل ڈیم پہنچے گی۔

1 ایس ایس ڈی (پرانا نمبر 1 یو ایس ڈی) اب شاملی سے 11/44 کے بجائے 9/54 پر روانہ ہوکر 14/45 کے بجائے 12/55 پر سہارنپور پہنچے گی۔

1 کے این جے اب 22/35 کے بجائے 23/05 پر جاکھل پہنچے گی۔

4 ایس ایل اب لکھنؤ سے 16/10 کے بجائے 17/00 پر روانہ ہوکر 20/30 کے بجائے 21/20 پر سلطانپور پہنچے گی۔

372 ڈاؤن 5/05 کے بجائے 4/50 پر ہردوار سے روانہ ہوگی اور 8/45 کے بجائے 8/30 پر سہارنپور پہنچے گی۔

1 سی ایچ اب چندوسی سے 4/50 کے بجائے 4/30 پر روانہ ہوکر 6/15 کے بجائے 6/00 بجے مراد آباد پہنچے گی۔ اور مراد آباد سے 6/45 کے بجائے 6/35 پر روانہ ہوگی۔

اے سی ایم علی گڑھ سے 4/15 کے بجائے 4/00 بجے روانہ ہوگی۔

129 اپ 21/00 کے بجائے 19/35 پر مغل سرائے پہنچے گی اور وہاں سے 21/35 کے بجائے 20/35 پر روانہ ہوکر 21/50 پر وارانسی پہنچے گی لیکن سنیچر کو یہ گاڑی 22/50 کے بجائے 22/05 پر پہنچے گی۔

6 کے ایم اب 21/35 کے بجائے 21/20 پر خورجہ پہنچے گی۔

3 جے پی جے اب جیسلمیر سے 21/30 کے بجائے 21/00 پر روانہ ہوکر 7/15 کے بجائے 6/25 پر جودھپور پہنچے گی۔

2 جے پی جے اب جودھپور سے 9/15 کے بجائے 8/ بجے روانہ ہوکر 19/40 کے بجائے 18/15 پر جیسلمیر پہنچے گی۔

1 بی ایچ ایل اب 5/25 کے بجائے 4/15 پر ہنومان گڑھ سے روانہ ہوکر 6/30 کے بجائے 5/15 پر سورت گڑھ پہنچے گی۔

[illegible] ایچ ایل اب سورت گڑھ سے 17/40 کے بجائے 16/15 بجے روانہ ہوکر 0/05 کے بجائے 22/15 بجے ہنومان گڑھ پہنچے گی۔

1 ایس ایل اب ہنومان گڑھ سے 9/30 کے بجائے 7/55 پر روانہ ہوکر 12/55 کے بجائے [illegible] بجے سورت گڑھ پہنچے گی۔

2 ایس اے، اب صورت گڑھ سے 4/45 بجے کے بجائے 3/50 پر روانہ ہوکر 8/20 کے بجائے 5'
پر انوپ گڑھ پہنچے گی۔

4 ایس اے۔ اب صورت گڑھ سے 16/20 بجے کے بجائے 16/45 پر روانہ ہوکر 19/35 کے بجائے 55'
انوپ گڑھ پہنچے گی۔

3 ایس اے، اب انوپ گڑھ سے 20/10 کے بجائے 20/30 پر روانہ ہوکر 23/20 کے بجائے 35/
صورت گڑھ پہنچے گی۔

1 ڈی ایل ایف، اب صدر بازار سے 4/55 کے بجائے 4/30 پر روانہ ہوگی۔

12 ڈاؤن، اب دہلی سے 22/20 کے بجائے 22/05 پر روانہ ہوگی۔

تھرو اور سیکشنل کوچیز کی آمدورفت میں تبدیلیاں:

ایک 3 ٹائر سلیپر کوچ (جی ایس سی این) 41 اپ / 42 ڈاؤن ایکسپریس گاڑیوں میں دہلی
کے درمیان شروع کیا جائے گا۔

گاڑیوں کے اوقات اور تھرو اور سیکشنل کوچیز کے اجراء وغیرہ سے متعلق مفصل معلومات کے لئے اکتوبر 1991 کے ٹائم ٹیبل سے رجوع کیا جائے۔ یہ ٹائم ٹیبل تمام اہم اسٹیشنوں کے ریزرویشن بکنگ، ریزرویشن/انکوائری آفیسز میں فروخت کے لئے دستیاب ہیں۔

چیف آپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ

ناردرن ریلوے

R.O. 119





کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو، جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا آپریشن ہونا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

قیمت ساڑھے چار روپیے —— مشرع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

رجسٹرڈ نمبر ڈی ان ۔ ۵۸/۱۳ — ... پیپر کرانیکل رجسٹریشن نمبر ۹۲۲۳/۶۱

ہر فتنہ وطن سے ہے قیامت مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
(قیامت گوالیاری)

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

میں حق پرست ہوں انسان پرست ہوں
واحد پرست ہوں مگر بت پرست ہوں

ایڈیٹر: سرور تونسوی

زر سالانہ ۱۵/- روپے
فی پرچہ ۱/۵۰ روپیہ

شمارہ نمبر ۱۱ — نومبر ۱۹۸۱ء — جلد نمبر ۴۲

ہندی کے مسلمان شعراء

۱۔ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد پر ایسی مفید کتاب آج تک اردو زبان میں شائع ہوئی ہے نہ ہندی میں۔

۲۔ اس کتاب کو پڑھنے سے اردو اور ہندی کے خود ساختہ نام نہاد دانشور جو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اردو اور ہندی کی بقا و حیات کے ضامن بنے بیٹھے ہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ جو کام سرکار سے تنخواہیں اور لاکھوں روپیہ لے کر نہ ہوسکا اور جو کام اردو اور ہندی کے یہ نام نہاد دانشور آج تک نہ کرسکے وہ ایک فردِ واحد نے اپنی لگن کے باعث پورا کر دیا۔

۳۔ اس کتاب نے ہندی مسلمانوں کا سر اونچا کر دیا ہے اور وہ ثبوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی زبان کی نشو و نما اور ترقی میں جو کردار انہوں نے ادا کیا ہے اسے ہندی زبان فراموش نہیں کرسکتی اور ہندی مسلمان اس سلسلے میں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے کوسوں آگے دکھائی دیتے ہیں۔

۴۔ اس کتاب کو پڑھنے والا ہر ہندی دان لیکھک کا گن گان کرے گا اور ہر اردو دان مصنف کو دعائیں دے گا کہ جس نے اردو ادب کو ایسی بیش بہا تصنیف سے مالا مال کیا۔

۵۔ ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکاڈمی، اردو اکاڈمی، انجمن ترقی اردو ہند اور ہندی یا اردو اکاڈمیوں کے ذمہ دار ارکان میں شاید غیرت کے جراثیم اپنا اثر دکھانے لگیں اور وہ ندامت محسوس کریں کہ انہوں نے سرکاری یعنی عوامی کروڑہا روپیہ اردو کی اکثر غیر مفید اور غیر ضروری کتابیں شائع کرکے محض اپنوں کو فائدہ پہنچایا اور ہندی کے مسلمان شعراء ایسی بیش بہا اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار تصنیف کو شائع کرنے کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

۶۔ آپ ہمارے اس دعوے کی صداقت کی جانچ کے لئے یہ کتاب پڑھئے اگر آپ ہماری اس تحریر کی حرف حرف تائید نہ فرمائیں تو کتاب واپس کرکے اس کی پوری قیمت لے لیجئے۔ حضرت پنڈوری نے اپنی زندگی کے عزیز ترین پچاس سال اس کتاب کی تالیف پر صرف کئے اور اپنی زندگی بھر کا سرمایہ اس کتاب کے لئے مواد فراہم کرنے پر لگا دیا اور اس کتاب کو ہر پہلو سے مستند بنانے کیلئے فاضل مؤلف نے ہزارہا کتابوں کا مطالعہ کرنے میں اپنی آنکھوں کو قربان کر دیا۔ یہ نادر روزگار کتاب ہندی کے مسلمان شعراء شائع ہوگئی ہے۔ پہلی فرصت میں منگائیے۔ قیمت ۵۱/- روپے

مزید معلومات کیلئے: دفتر شانِ ہند، نئی دہلی سے رجوع کیجئے۔

مدیر، مالک، سرور تونسوی پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چتہ شیخ منگلو، جامع مسجد دہلی میں چھپوائے اور سرورق پائینیر پریس سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

امپورٹڈ کے خبط کو روکیے

[illegible]

سچے بھارتی بنیں، بھارتی اشیاء خریدیں

[illegible]

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

اترپردیش اردو اکاڈمی اور شانِ ہند کی بلیک میلنگ؟

اردو اکاڈمی اترپردیش کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ میں ایک "معزز" ممبر نے یہ انکشاف فرمایا کہ شانِ ہند اکاڈمی کو بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔

اس "معزز" ممبر کے اس "فرمان" کے مطابق "شانِ ہند" کی مبینہ بلیک میلنگ کی تفصیل کا پس منظر یہ ہے کہ

اردو اکاڈمی اترپردیش نے اپنی مطبوعات اور "اکاڈمی" کے اشتہارات اکثر ایسے رسائل و جرائد میں شائع کرائے جو اکاڈمی کی ہر سرگرمی کی تعریف کے لئے اپنے آپ کو پابند سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے اکثر کی اشاعت (پیڈ) ڈیڑھ سو سے زائد کاپیوں کی نہیں ہے۔

کسی بھی اخبار یا جریدہ کے انتظامیہ کا کاروباری فرض ہے کہ وہ فراہمیٔ اشتہارات کے لئے کوشاں ہو چنانچہ شانِ ہند کے دفتر سے بھی اکاڈمی کو لکھا گیا کہ شانِ ہند اکاڈمی کی مطبوعات کے لئے ایک موزوں جریدہ ہے لہٰذا اگر شانِ ہند میں بھی اشتہار دیا جائے تو اکاڈمی کے لئے مفید ہوگا۔ اس عرضداشت کا جواب موصول ہوا کہ اشتہار دیئے جانے کا معاملہ زیرِ غور ہے۔ جلد ہی اطلاع دی جائے گی۔

جب دو تین ماہ نکل گئے اور کسی قسم کا جواب موصول نہیں ہوا تو دفتر شانِ ہند سے یاددہانی کے طور پر لکھا گیا کہ شانِ ہند ملک بھر کی قابلِ ذکر لائبریریوں جن میں عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ لائبریری۔ رام پور رضا لائبریری۔ خدا بخش لائبریری۔ جموں یونیورسٹی لائبریری۔ حیدرآباد یونیورسٹی لائبریری وغیرہ بھی شامل ہیں میں خریدا جاتا ہے۔ اور ایسے قارئین کے ہاتھوں میں جاتا ہے جو اردو کتب بینی سے دلچسپی رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ترقی اردو بورڈ ایسے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے بھی اپنی مطبوعات کے اشتہارات شانِ ہند میں شائع کراتے ہیں۔ لہٰذا یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ اترپردیش اردو اکاڈمی کی مطبوعات کا اشتہار بھی شانِ ہند میں مفید ہوگا اور یقیناً ان جرائد و رسائل کے مقابلے میں بہتر نتائج کا حامل ہوگا۔ جن میں کہ آپ نے اپنے ہاں کی مطبوعات وغیرہ کے اشتہارات شائع کرائے ہیں۔

اور اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں کہ کسی بھی مشتہر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس اخبار یا رسالہ کو چاہے اشتہار دے اور کسی بھی رسالہ یا اخبار کا انتظامیہ کسی بھی مشتہر کو مجبور نہیں کر سکتا کہ اسے اشتہار ضرور دیا جائے۔ مگر اشتہار طلب کرنے کی عرضداشت کو "بلیک میلنگ" سمجھ لیا جائے اور ایک ایسی میٹنگ میں یہ بہتان لگایا جائے جس میں مدیر شانِ ہند کے کرمفرما جناب علی جواد زیدی، جناب حکم چند نیر، جناب رام لال، جناب صباح الدین عمر ایسے حضرات تشریف فرما ہوں۔ بلکہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اترپردیش اردو اکاڈمی کی ناپسندیدہ حرکات اور جشن عالمی اردو کانفرنس کے سو فیصد ڈھونگ اور عوام کے روپیہ کی بربادی کے خلاف لکھے جانے کو "بلیک میل" سمجھا جائے۔ آپ کسی کو اپنے اوپر اعتراض کرنے کا حق نہیں دیتے... سمجھ لینا تو اس روایت کے مطابق ہے کہ جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر کے یہ سمجھ لیتا ہے کہ بلی موجود ہی نہیں ہے۔

اس معزز ممبر نے یہ بہتان ایسی میٹنگ میں لگایا ہے جو کہ کوئی بھی عدالت میں شہادت دینے کے قابل... [illegible]

ہماری مخلصانہ گزارش ہے کہ اگر وہ "تخمِ حلال" ہیں اس بہتان کو پبلک طور پر لگائیں تاکہ انھیں معلوم ہو سکے کہ عدالت کے کٹہرے میں کیسے کھڑے ہوا جاتا ہے۔ اور جھوٹے نیز بے بنیاد بہتان لگانے کا حشر کیا ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اپنے آپ کو "تخمِ حلال" نہیں سمجھتے تو پھر انھیں خاموش رہنے کا قدرتی لائسنس حاصل ہے یا کوئی اور کون ہوتے ہیں کہ ایسے "معزز ممبر" کی کسی واس محض کا نوٹس لیں۔

ویسے ہم اس "معزز" ممبر سے درخواست کریں گے اگر وہ مندرجہ ذیل استفسارات کے بارے میں عوام کے مفاد کے لئے تفصیلاً کچھ بتا سکیں تو یقیناً اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں کی واقفیت میں اضافہ ہوگا۔

۱۔ مجوزہ عالمی اُردو کانفرنس سے ہندوستان میں اُردو کی بقاءِ حیات یا اُردو کی ترقی کس طرح ممکن ہے؟ اور اس کانفرنس میں اُردو کے مفاد کے لئے کون سے ایسے راز ہائے سربستہ ہیں جن پر ملکی اور غیر ملکی نمائندے سر جوڑ کر مشورہ کریں گے۔؟ اور اگر کوئی ایسے معروضہ مسائل ہیں بھی تو کیا آج تک اُن پر اُردو کے خود ساختہ سربراہوں نے کوئی غور و خوض کیا تھا یا نہیں۔ اور اگر جواب ہاں میں نہیں ہے تو ایسا کیوں ہوا۔؟

۲۔ اکاڈمی نے اپنی مطبوعات اور "اکاڈمی" کے اشتہارات پر جو اخراجات کئے کیا اس کا دسواں حصہ بھی کتابوں کی فروخت یا "اکاڈمی" کی فروختگی سے اکاڈمی کو ان اشتہارات سے وصول ہوا۔ کیا اکاڈمی یہ بتائیگی کہ اُس نے اشتہارات کی مد میں کس قدر روپیہ خرچ کیا اور ان اشتہارات سے اسے کتنی آمدنی ہوئی؟

۳۔ اکاڈمی کا ایک ملازم جو رقم خطیر لیکر کسی خلیجی ملک میں بھاگ گیا تھا اس کے لئے اکاڈمی نے کیا قانونی چارہ جوئی کی؟ اور کیا یہ غلط ہے کہ یہ غبن ایک عرصہ سے ہو رہا تھا اور اکاڈمی کے ذمہ داران دانستہ خاموش تھے؟۔

۴۔ کیا اکاڈمی نے ایسی کتابوں پر انعامات نہیں دئے جو غیر معیاری ہیں۔ اور شعری مجموعے تو سیکڑوں فنی اسقام سے پُر ہیں۔ اور کیا یہ انعامات محض سفارشوں پر نہیں دئے جاتے۔ ان ممبر صاحب کی واقفیت کے لئے یہ عرض کیا جاتا ہے کہ شانِ ہند نے ایک کتاب تقریباً چالیس صفحات کی ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے ایڈیٹر شانِ ہند کو کتاب کو انعامی مقابلہ میں بھجوانے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اسے انعام ملے گا کیونکہ فلاں صاحب نے انھیں اس کا یقین دلایا ہے۔ اس معزز ممبر کی مزید واقفیت کے لئے عرض کرنا ضروری ہے کہ شانِ ہند کو سرکاری طور پر اشتہار کی اُجرت فی صفحہ ڈھائی سو روپیہ ملتا ہے جس میں سے پندرہ فیصد کمیشن وضع کرنے کے بعد دو سو بارہ روپیہ پچاس پیسے ملتے ہیں۔ اگر اکاڈمی حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے ایک صفحہ کا اشتہار شانِ ہند کو دیتی تو صرف یہی "رقمِ خطیر" شانِ ہند کو ملتی۔ اور ایڈیٹر شانِ ہند اس رقم کے لئے بلیک میل کرے گا جس سے اس کی دس روز کے لئے ادویات بھی نہیں خریدی جا سکتیں۔ اس ممبر نے ایسا گھٹیا بہتان لگا کر اپنے تخمِ حلال نہ ہونے کا ثبوت دیا تھا اس کے ساتھ "بلیک میل"، ایسے جاندار فعل کی بھی توہین کی ہے جو کہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔

اگر ان صاحب نے اپنی اس بکواس محض پر اظہارِ افسوس نہ فرمایا تو ہم مجبور ہوں گے کہ انھیں "تخمِ حرام" ثابت کرنے کے لئے ان کی سابقہ سرگرمیوں کا پوسٹ مارٹم کریں تاکہ عوام کو پتہ چل سکے کہ شانِ ہند پر بلیک میل کا بہتان لگانے والا خود کیا کرتا رہا ہے (یار زندہ صحبت باقی)

*

"عزائم" کے مبارک عزائم

روزنامہ "عزائم" لکھنؤ نے حال ہی میں اپنے مسلسل پانچ اداریوں میں جس قابلِ تعریف انداز میں عالمی اُردو کانفرنس (مجوزہ) جناب حیات اللہ انصاری، محترمہ وزیر اعظم صاحبہ، اُردو یونیورسٹی اور عالمی اُردو کانفرنس اور اس کے مخالفین سے متعلق تبصرہ فرمایا ہے وہ جہاں صاف

...تری صحافت کا آئینہ دار ہے۔ وہاں لکھنؤی تہذیب ...ور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ امورِ متنازعہ پر ایمانداری ...سے رائے زنی کا بہترین نمونہ بھی ہے۔ ہندوستان میں جس ...قدر بھی اردو روزنامے ہیں ان میں جن کے مدیرانِ کرام ...سلمان ہیں اُن کے اداریے محض بھرتی کے اور رسم پوری ...کرنے والے ہی ہوتے ہیں۔ مگر عزائم کے مندرجہ بالا پانچ ...اداریے پڑھ کر یہ کہنا ہی پڑا کہ "عزائم" کے مدیرِ محترم ...صرف یہ کہ اداریہ لکھنا جانتے ہیں بلکہ انھیں اپنی بات ...میں وزن پیدا کرنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے اور اپنے وطن ...قوم۔ مذہب اور زبان کی خدمت کیسے کی جاتی ہے اس ...کا بھی انہیں تجزیہ علم اور تجربہ ہے۔ انھوں نے اترپردیش اُردو اکاڈمی اور مجوزہ عالمی اُردو کانفرنس سے متعلق کئی غلط ...فہمیوں کا ازالہ فرمایا ہے۔ اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ جناب ...حیات اللہ انصاری صاحب کو اب اُردو کی خدمت کے بجائے خود آرام کرنے کی ضرورت ہے۔

ہم مدیرِ محترم "عزائم" سے گزارش کریں گے کہ وہ مجوزہ عالمی اُردو کانفرنس کے بارے میں اپنی ایماندارانہ رائے کا اظہار "عزائم" میں فرمائیں کہ اس عالمی کانفرنس سے ہندوستان میں اُردو کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ اور کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ جو روپیہ اس کانفرنس پر محض نام و نمود اور چند اشخاص کی نمائش پر صرف کیا جاتا ہے اُسے کسی ایسی ٹھوس مد میں صرف کیا جائے جس سے واقعی اُردو کو کچھ فائدہ ہو۔ اور اگر وہ ان مسائل پر بھی کچھ روشنی ڈال سکیں جنہیں اس عالمی کانفرنس میں پیش کیا جانا ہے اور یہ مسائل اس سے پہلے زیرِ بحث ...آئے ہوں تو اور بھی بہتر رہے گا۔

پنجاب اینڈ سندھ بینک کے چیئرمین سردار اندرجیت سنگھ کے خلاف مہم

سکھ فرقے کی طرف سے قائم کردہ پنجاب اینڈ ...سندھ بنک کے چیئرمین سردار اندرجیت سنگھ کے خلاف ...چند حضرات نے یہ مہم چلا رکھی ہے کہ انہیں ہر طرح سے بدنام کرنا ہی ہے۔ پارلیمنٹ میں بھی یہ سوال اٹھایا گیا تھا مگر حکومت نے انتہائی معقول جواب دیا تھا جس سے سردار اندرجیت سنگھ کے مخالفوں کو مجبوراً خاموش ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ حال ہی میں راجدھانی کے ایک مقامی روزنامے نے بینک کی مبینہ بدعنوانیوں کے بارے میں خامہ فرسائی کی ہے۔ اگر یہ مخالفت محض بینک کا اشتہار نہ ملنے کے باعث ہے تو وجہ سمجھ میں آسکتی ہے اور اگر چیئرمین کے مخالفین کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر یہ مخالفت کی جا رہی ہے تو یہ کوئی قابلِ تعریف کارنامہ نہیں ہے۔ دہلی پردیش سکھ گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے صدر جتھے دار سنتوکھ سنگھ صاحب اور دھرم رکھشک دل کے صدر جتھے دار جیپال سنگھ صاحب دونوں نے ایک زبان ہو کر کہا ہے کہ پنجاب اینڈ سندھ بینک کی مبینہ بدعنوانیوں کی جو باتیں راجدھانی کے اس روزنامے میں کہی گئی ہیں وہ قطعی غلط اور بے بنیاد ہیں۔

پارلیمنٹ میں حکومت کی طرف سے صاف الفاظ میں یہ کہا جا چکا ہے کہ ملک کے سکھ حضرات موجودہ چیئرمین کو پسند کرتے ہیں اور جب حکومت کو موجودہ چیئرمین سے کوئی بہتر چیئرمین مل سکے گا تو اسے یہ ذمہ داری سونپی جائیگی۔

مخالفت کی یہ بدعت یقیناً قابلِ تعزیر ہے کہ سردار گورنر اندرجیت سنگھ جیسے سنت صفت اور فرشتہ سیرت انسان کے خلاف بہتان تراشی کر کے اپنی زبان اور اپنے قلم کو ناپاک کیا جائے۔

جناب گوپال متل صاحب سے مخلصانہ گزارش

آپ کا مکتوب گرامی شانِ ہند کی اسی اشاعت میں "من کہ مکتوب الیہ" کے تحت شائع ہو رہا ہے۔ آپکا یہ فرمان کہ جن ادیبوں اور شاعروں کو گروہ میسر نہیں آتا یا انھیں اس قسم کا گروہ پیدا کرنے کی فرصت نہیں ملتی ان کو شہرت دوسرے ادیبوں کے مقابلے میں ماند رہتی ہے" بالکل بجا اور سو فیصد درست ہے۔ مگر حضور آپ اپنی

مخصوص اور محتاط نیز خطرناک سیاست کے تحت کھلے بندوں یہ تسلیم کرنے کو بے شک تیار نہ ہوں مگر آپ کے دماغ کے کسی مخصوص گوشے میں یہ حقیقت ضرور جاگزیں ہے کہ کچھ مسلمان اُردو دانشور (اگر انھیں اُردو دانش ور کہا جا سکتا ہے تو) یقیناً غیر مسلم ادیبوں اور شعراء کے خلاف گروہ بند ہیں کیا آپ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ منشی پریم چند کے خلاف جو شور پہنچے مخالفانہ محاذ بنائے ہوئے ہیں وہ خالص فرقہ پرستانہ محاذ نہیں ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ بالشتیے منشی پریم چند ایسے بلند و بالا افسانہ نگار کے خلاف بکواس محض کرتے ہوئے اپنا قد لمبا کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے مسلمان جو دانشوروں کی تحریروں میں منشی پریم چند کا افسانوی وقار قابلِ تعریف حد تک مسلّم ہے۔ اور اسی طرح ایک پاکستانی مسلمان دانشور نے ہی جناب کالی داس گپتا رضا کی ادبی خدمات کو سراہنے میں فرقہ پرستی کو اپنے نزدیک تک نہیں آنے دیا۔ آپ تو ایک مانے ہوئے زیرک اور زود فہم ادیب ہیں لہذا آپ یہ بھی یقیناً سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا ادیب ہندوستان کے مسلم ادیبوں کے مقابلے میں زیادہ تجاتی پسند ہے۔ اور جلب زر کا دیوانہ نہیں۔ پاکستان میں اب کوئی غیر مسلم ادیب یا شاعر ایسا نہیں جو وہاں کے مسلمان دانشوروں سے بالاتر ہو اسی لئے پاکستان کے مسلمان دانشور ہندوستان کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں میں جو واقعی قابل ذکر اور قابل تعظیم ہیں یا جنھیں تاریخ زندہ رکھنے پر مجبور ہوگی کے لئے بہت اچھے انداز میں حق پرستانہ نظریے سے لکھتے ہیں آپ خود اپنی ہی مثال لے لیجئے جس قدر پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں میں آپ کا مقام مسلّم ہے وہ ہندوستان کے مسلمان ادیبوں اور شاعروں میں نہیں ہے اور یہ صرف اس لئے کہ آپ ایک غیر مسلم ہیں۔ پاکستان کا مسلمان ادیب اور شاعر اپنے آپ کو ایک آزاد ملک کا شہری سمجھتا ہے ہندوستان کا مسلمان شاعر یا ادیب زبان سے چاہے لاکھ کہے مگر وہ اپنے آپ کو غلام ہی سمجھتا ہے اور وہ ادیب یا شاعر جو شعوری طور پر اپنے آپ کو غلام سمجھتا ہوگا وہ فرقہ پرستی کے جہنم سے نکل ہی نہیں سکتا۔

حضور آپ تو گروہ بندوں کے امام ہیں اور آپ کے ساتھ اچھا خاصا گروہ منسلک بھی رہا۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آپ سے کٹ کر جو تعصب بہتا گیا وہ فرقہ پرستی کی ہوا سے پاک تھا۔؟

آپ کو یہ بھی یقین دلا دوں کہ میں نے آج تک کسی مسلمان دانش ور میں فرقہ پرستی تلاش نہیں کی۔ اور نہ یہ میرا مسلک ہے۔ اگر کوئی خود ہی اپنی فرقہ پرستی کا اعلان کرتا پھرے تو اسے غیر فرقہ پرست یا وطن دوست کہنا میرے لئے ناممکن ہے۔

ترقی اُردو بورڈ کی عدم توجہگی

اوّل تو کسی اُردو کتاب کا اولین ایڈیشن ہی ختم مشکل سے ہوتا ہے اور اگر خوش قسمتی سے کسی اُردو کتاب کو اس کی افادیت کے باعث درجۂ قبولیت حاصل ہو جائے تو اس کا دوسرا ایڈیشن شائع نہ ہونا یقیناً اُردو کے لئے فال بد ہے ترقی اُردو بورڈ کی ایک کتاب "اوپنیشد پھر وہ" اس قدر مقبول ہوئی کہ اب وہ نایاب ہے۔ ترقی اُردو بورڈ کو دفتر شانِ ہند سے پینتیس (۳۵) جلدوں کا آرڈر بھیجا گیا تو جواب ملا کہ کتاب ختم ہے۔ ترقی اُردو بورڈ ایک سرکاری ادارہ ہے جسے کسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے میں کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں ہے۔ ماسوائے کاغذی کارروائی پورا کرنے کے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب ختم ہوئے کئی ماہ ہوگئے ہیں مگر ابھی تک اس کی اطلاع افسرانِ متعلقہ تک بھی نہیں پہنچی۔ ہم جناب شہباز حسین صاحب سے مؤدبانہ گزارش کریں گے کہ وہ ترقی اُردو بورڈ کو ویسا ہی فعال ادارہ بنائے رکھیں جیسا کہ جناب شمس الرحمٰن صاحب فاروقی کے عہد میں تھا۔ متعلقہ وزارت کے ذمہ داران کا کہنا ہے کہ ہم تو ترقی اُردو بورڈ کو اتنی اہمیت دیتے ہیں جیسے کسی دوسرے ملک کے سفارت خانے کو دی جاتی ہے۔ اگر اس ادارے کے ذمہ دار لوگ ہی کتابوں کی اشاعت کیلئے تجاویز نہ بھیجیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ترقی اُردو بورڈ کے سیل ڈپو کے انچارج نے سٹاک انچارج سے جب یہ دریافت کیا کہ کتاب ختم ہوگئی ہے تو آپ نے متعلقہ افسران کو اطلاع دی تھی مگر سٹاک انچارج نے جس بے رخی اور غیر ذمہ دارانہ نیز توہین آمیز جواب دیا اگر یہ ذخیرہ کسی ذاتی ادارے میں اختیار کیا جاتا تو یہ افسر

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

رِشانِ ہند میں تشریف لانے والے اکثر ملاقاتی ذات میز پر رکھے اخبارات و رسائل کو اٹھا کر ورق ،انی کرنے کے بعد اس بے ترتیبی سے پھینکتے ہیں کہ جس ان کی ذہنی بے ترتیبی کی نشاندہی از خود ہو جاتی ہے۔

۱۹۴۲ء میں میں جب سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر یاست" کو پہلی بار ان کے دفتر مٹیا محل میں ملا۔ میرے ساتھ ایک دوسرے صحافی بھی تھے۔ سردار صاحب میز پر ملک بھر کے اخبارات و رسائل کا ڈھیر لگا ہوا یہ صحافی نہایت بے تکلفی سے اخبارات و رسائل کو برتتے ہوئے اپنے کسی پسندیدہ رسالے کو پڑھنے لگے تو دار دیوان سنگھ مفتون نے ماتھے پر شکن ڈالتے ہوئے صاحب یہ کوئی لائبریری نہیں ہے۔ آپ مجھ سے ملنے آئے ، لہٰذا اپنے مقصد تک رہئے۔ اخبار گھر جا کر پڑھئے گا یا ریب ہی میونسپل لائبریری ہے وہاں جا کر اپنا شوق پورا لیجئے گا۔ سردار صاحب کا یہ فرمان سن کر یہ صحافی صحافت بھول گئے اور مجھے کان ہو گئے، لہٰذا وہ دن اور آج کا دن سے سردار صاحب کی اس نصیحت کو پلے باندھ رکھا ہے۔

ماہنامہ ایجوکیشنل گزٹ جالندھر کے ایڈیٹر کی حیثیت ۱۹۳۵ء میں مجھے پشاور ایک ادبی اجتماع میں شرکت لئے جانا ہوا۔ واپسی میں کیمبل پور ریلوے اسٹیشن پر میں فر خانہ میں سویا ہوا تھا کہ میری جیب سے کوٹ سلطان وے اسٹیشن کا ریلوے ٹکٹ اور مبلغ سات روپے نے نکال لئے۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو جیب تو خالی ہی تھی اس کے ساتھ سفر جاری رکھنے کے لئے ریل ٹ بھی جا چکا تھا۔ تونسہ شریف جانے کے لئے کیمبل پور ہا کوٹ سلطان کے لئے ریلوے لائن جاتی تھی۔ میں پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں مسافر خانہ میں ایک بنچ پر بیٹھا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب نہ تو جالندھر جانے کا کوئی طریقہ نظر آتا ہے اور نہ ہی تونسہ شریف پہنچ سکوں گا۔ اس زمانے میں بغیر ٹکٹ سفر کرنا انتہائی معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ اور کیمبل پور میں کوئی ایسا شناسا بھی نہ تھا کہ جس سے دو چار روپے ادھار لئے جا سکتے۔ آپ دو چار روپے پر مسکرا دیجئے نہیں اس وقت کے دو چار روپے آج کل کے دو سو روپے سے بھی زیادہ وقعت رکھتے تھے۔ جب میں ہر طرح سے ناامید ہو گیا اور کوٹ سلطان جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر لگ گئی تو اپنی بیچارگی کا احساس اور بھی بڑھنے لگا۔ ایک پٹھان جس کی عمر چالیس سال کے قریب ہو گی۔ رئیسانہ ٹھاٹھ سے سامنے والے بنچ پر آ کر بیٹھا اس کے چار ملازم بھی ساتھ تھے جو اس کی خدمت کے لئے مودبانہ کھڑے ہو گئے تھے۔ پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ اس رئیس پٹھان نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا کہ تم اس قدر اداس کیوں بیٹھا ہے۔ مختصراً داستان بیان کی تو اس پٹھان نے جھٹ سے دس روپیہ کا نوٹ جیب سے نکال کر اپنے ملازم کو دیا کہ جاؤ فوراً کوٹ سلطان کا ایک ٹکٹ خرید لاؤ۔ ایک روپیہ اور کچھ آنے کا ٹکٹ تھا باقی آٹھ روپے اور ریزگاری بھی مجھے دیتے ہوئے کہا کہ جاؤ بھائی تم اپنے گھر جاؤ۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ اس پٹھان کا نام اور پتہ دریافت کروں مگر اس بندۂ خدا نے قطعاً نہ بتایا اور یہی کہتا رہا کہ خدا نے ہمیں تمہارے ہی لئے یہاں بھجوایا ہے ورنہ ہم تو لاری (بس) سے جانے والے تھے۔ مگر خدا نے ہمارا ارادہ بدل دیا اور دل نے کہا کہ ریل سے چلو ہماری ریل تو ابھی چار گھنٹے بعد آئے گی۔ اب سمجھ میں آگیا کہ خدا نے ہمیں یہاں کیوں بھجوایا ہے

کوٹ سلطان جانے والی گاڑی کا انجن سیٹی بجا رہا تھا اور اس پٹھان کا ملازم میرا سامان اُٹھا کر گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے خان صاحب کا شکریہ ادا کیا تو فرمانے لگے شکریہ تو مجھے خدا کا کرنا ہے جس نے مجھے یہاں اس کام کے لئے بھجوایا۔

اس خان صاحب کا یہ سلوک میرے دل و دماغ پر آج تک اپنا سکہ بٹھائے ہوئے ہے اور میں اُنھی کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند۔ صحبتِ طالح ترا طالح کند

پانچویں جماعت میں پڑھا تھا۔ یہ مقولہ ویسے تو ہزاروں بار پڑھا اور متعدد بار موقع محل سے اس کا استعمال بھی تحریر میں کیا مگر اس کا عملی تجربہ اب ہوا۔

جب میرا اُٹھنا بیٹھنا زیادہ تر سردار دیوان سنگھ مفتوں کے یہاں تھا تو اُن کی عادات۔ اطوار وغیرہ غیر شعوری طور پر میری عادتِ ثانیہ بن گئے۔ اور میں نے بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ مثلاً ادارتی نوٹ لکھتے وقت بے باکی کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ بلیک میلنگ کے گُر سیکھ لئے (گو خدا نے ابھی تک یہ گُر استعمال کرنے سے محفوظ رکھا ہے) شراب کا استعمال گھریلو ذمہ داریوں سے فرار۔ جس سے قرض لے لیا اس کو ادا کرنا اُس وقت ضروری سمجھا جب ضرورت سے زیادہ روپیہ آجائے اور جس کو دیدیا اس سے مانگا نہیں (اگر وہ از خود ادا کر دے تو اُس کی مہربانی) ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا اور مظلوم کا ساتھ دینا درست کا ساتھ دینا۔ اگر دوستی ہے تو بے مثال اور دشمنی ہے تو لاثانی۔ فراخ دلی سے رغبت۔ کنجوسی سے نفرت۔ وغیرہ وغیرہ

اور اب الحاج حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی مدیر اعلیٰ شمع کے ساتھ ہر روز کا اُٹھنا بیٹھنا ہے تو اُن کے فرمودات اور معمولات کا یہ اثر ہوا ہے کہ خدا سے ڈرو۔ محنت کرو اور ایمانداری کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ چنانچہ ان قدروں کی قدر افزائی کی گئی تو مالی حالت بہتر۔ کاروبار میں ترقی اور استحکام بازار میں ساکھ۔ گھریلو ذمہ داریوں کا احساس۔ بزرگوں کے مزارات پر حاضری۔ مسجد میں بلا ناغہ روزانہ حاضری۔ شراب سے نفرت۔ دوست کی بیماری کی عیادت کی اور خوشی کی شادی غمی میں شمولیت اور دلی احساس کے ساتھ خدمت۔

بقیہ:- شعر، شاعر اور شاعری

ایسا دیوانہ ہے جس کو سیلن کا حسن ابروئے مصر میں نظر آتا۔

مندرجہ بالا تعریحات سے ظاہر ہے کہ جملہ اقوال اپنی اپنی جگہ دل فریب و دلکش ہیں عام طور پر شاعری کا نمایاں وصف جذبات پر اثر پیدا کرنا ہے یعنی شعر سن کر دل انبساطی و انقباضی کیفیت سے متاثر ہوتا ہے اور وہ اثر ایک مدت تک باقی رہتا ہے یہ خصوصیت شاعری کو دوسرے علوم و فنون سے ممتاز کرتی ہے

القصہ قوتِ متخیلہ جوش میں آکر ایسے جذبات و حیات کا اظہار کرے جس سے دُنیا و مافیہا۔ مقصدِ حیات۔ مسرت و الم اور سوز و گداز کا عملی اصول معلوم ہو سکے۔ عنانِ قوتِ متخیلہ ہمارے ہاتھ میں ہو اور ہم اس کے ہاتھ میں۔ یہی شعر و شاعری کا مقصد ہے اور یہی شعر و شاعری کی غرض جو افراد اس اصول پر چلتے اور اسے اپنا شعار بناتے ہیں وہی حقیقی شاعر کے تاج ہیں اور وہی الشعراء تلامذۃ الرحمٰن کی تحت میں داخل ہیں ورنہ یوں چند الفاظ کے اشتراک اور اہم ترکیب دے لینے سے کوئی شاعر حقیقی معنوں میں شاعر نہیں ہو سکتا۔ فقط

انجمن افغان دوستاں

اجتماعی دُعا اور مجموعی کوشش سے کیا نہیں ہو سکتا؟

۲۶ جنوری ۱۹۸۲ء کو راشٹریہ پرارتھنا دوس (قومی یومِ دعائیہ) منائیے

مندروں، مسجدوں، گوردواروں، اور گرجا گھروں میں اجتماعی طور پر حسب ذیل (پرارتھنا) دعا کریں۔

۲۶ جنوری ۱۹۸۲ء کو قومی یومِ دُعائیہ (راشٹریہ پرارتھنا دوس) کے سلسلے میں ایک عظیم الشان اجتماع حیدرآباد میں ہو رہا ہے۔ اگر آپ اس عظیم الشان اجتماع میں شریک نہ ہو سکتے ہوں اور نہ ہی کسی عبادت گاہ میں اجتماعی طور پر دعا میں شرکت فرما سکتے ہوں تو اپنے گھر میں ہی بیٹھ کر اپنے معبود کے حضور دل کی گہرائیوں سے یہ دعا کیجئے۔

آزادی ایک نازک چیز ہے اور ایک کچے دھاگے سے لٹکی ہوئی ہے۔ خدایا ہمیں اس کی حفاظت کی طاقت دے اور وقتِ ضرورت اس کے لئے جان دینے کی توفیق عطا فرما۔

خدایا اس پُرشورش جہان میں اپنا امن قائم کر۔ ملکی اور بیرونی ستم پیشہ لوگوں کا خاتمہ کر اور غلامی کی زنجیروں میں بندھی ہوئی اپنی مخلوق کو آزادی عطا فرما۔

خدایا تیرے عالم کے اس مجروح خطے میں انسانی سماج خیانت، جہالت، اور بدعملی سے پریشان ہے۔ اسے اپنے دائمی دشمنوں کے مقابل متحد کر اور اسے امن و امان عطا فرما۔

نئے سال کے خیر مقدم اور نیک خواہشات کے ساتھ

امجد علی ایم پی	محمد حسن خان ایم پی	اچاریہ نریندر ناتھ	ایم ایس شاکر
(کلکتہ)	(خورجہ)	(رچھ پورا)	(حیدرآباد)

کالی داس گپتا رضا

تحقیق و تالیف

شاعری کی روشنی میں
(اور ادب)

مصنف :- ظفر ادیب

مرتب :- مانک ٹالا

کالی داس گپتا رضا ۔ ظفر ادیب اور مانک ٹالا

اردو ادب کے تحفظ کی یہ تثلیث

اس کی ضامن ہے کہ یہ کتاب اردو ادب میں بلاشبہ ایک اضافہ ہے

قیمت : ۳۵ روپے

ناشر :- جیوپیٹر پبلشرز ، بمبئی

تقسیم کار :- ساکار پبلشرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

107 - جولی بھون نمبر 1 - 10 - نیو میرین لائنز

بمبئی - 400020

گوشۂ عقیل صدیقی

مشاعرہ عرس حضرت شاہ ولایت بُڈھانہ

کریمی الاحسانی

آج ۳۰ مئی ۸۱ء ہے۔

حضرت شاہ ولایت علیہ الرحمۃ بڈھانہ (مظفر نگر) کی درگاہ کا لق و دق میدان ہے یہ مشاعرہ عرس کی تقریبات کے سلسلے میں منعقد ہو رہا ہے۔ بجلی غائب ہے۔ جنریٹر کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ درگاہ سے ملحق ایک مسجد ہے اور مسجد کے جانب شرق ہنڈن ندی نہ جانے کب سے چپ چاپ رواں دواں ہے اور کبھی طوفان بن کر غارت گری پر اتر آتی ہے۔ ادھر ہر لمحہ باد و باراں کا خطرہ بڑھ رہا ہے۔ کالی گھٹا لہرا رہی ہے۔ مائک کی خرابی کی وجہ سے مشاعرہ شروع کرانے میں کسی قدر دیر ہو گئی ہے اسی لئے بارہ بجا چاہتے ہیں۔ ادھر منتظمین مشاعرہ معدو جو پریشان اور متفکر ہیں۔ لیجئے خدا خدا کر کے مائک درست ہو گیا ہے اور اسی نگری کے مقبول مترنم شاعر تمنا جمالی صاحب صدارت کے لئے جناب مشیر جھنجھانوی کا اسم گرامی پیش کر رہے ہیں جس پر شعراء ہی نے نہیں بلکہ سامعین تک نے تائید کی پھر تمنا صاحب ملک زادہ منظور احمد صاحب منظور کو دعوتِ نظامت دے رہے ہیں۔ منظور صاحب فرما رہے ہیں:

صاحبو! شعرائے کرام اور خواتین حضرات۔

مجھے اس مشاعرہ میں آکر یوں خوشی ہوئی کہ یہ مشاعرہ ایک بزرگ کے مزار پر منعقد ہو رہا ہے۔ یہ مشاعرہ روایت سے ہٹا ہوا نہیں ہے۔ گنبد گنگ کے زیر سایہ اندر پلی اور شعری ادب پروان چڑھی۔ اندر واسس تا ابھی ہوئی تھی کہ یہ قبرستان میں دفن کر دی جاتی۔ یہ مشاعرہ بھی ایک قبرستان میں منعقد ہو رہا ہے۔ قبرستان میں بزرگوں اور شہیدوں کی قبریں بھی ہوتی ہیں اور بظاہر وہ مری ہوئی نظر آ رہی ہے لیکن شہیدوں کی طرح زندہ ہے ـــــ تالیاں ـــــ تمنا صاحب نے بہت کوشش کی ہے اور ملک کے شعراء کو مدعو کیا۔ اب میں مشاعرہ کا آغاز کرتا ہوں کیونکہ اب کافی دیر ہو چکی ہے۔ پھر موجود شعراء کے اسمائے گرامی سنا کر نعتِ غزل دے رہے ہیں اوم پرکاش نور رڑکی کو۔ نور صاحب مناسب ترنم سے غزل سرا ہیں ؎

مرا ہنسنا بھی اُن کو قبول نہیں
یہ زندگی کا یہ کوئی اصول نہیں

ہر قدم پہ ملے مجھ کو ایسی زمیں ـــ جس میں پتھر ہی پتھر ہوں پھول کہیں

نور صاحب جیسے آئے ویسے ہی پلٹ رہے ہیں اور اب کرانہ کے شاعر حافظ مشیت اللہ سے ایک شعر سنئے ؎

تمہاری بزم میں دیوانے آزاد ـ ہمارے پاؤں میں زنجیر کیوں ہے

اب امیر اشرف حسرت کھتولوی غزل سرا ہیں ؎

سلام آخری اہلِ قفس سے کہہ دینا
صبا اگر تو بہاروں کے درمیاں گزرے
حرم میں، دیر میں، میخانہ میں، کلیسا میں
تلاشِ یار میں حسرت کہاں کہاں گزرے

حسرت صاحب بھی داد لوٹتے ہوئے جا رہے ہیں اور اب بیتاب تمنائی فرما رہے ہیں ؎

راس مشکل سے آئے ہیں چھالے مجھے
اب نہ صحرا سے کوئی نکالے مجھے
پھول بکھرا ہوا یہ سوچ کر شاخ سے
کوئی زلفوں میں شاید سجا لے مجھے
اب جلایا ہے زنداں میں کس نے دیا
یاد بھی نہ رہے جب اُجالے مجھے

بیتاب صاحب آہ اور واہ کرا کر چلے گئے اور اب اپنے کریمی الاحسانی سے بھی سن لیجئے ؎

یہ بادۂ گلرنگ کب مانگ رہے ہیں

[illegible] جب مالک رہے ہیں
افسوس ہے ہم لوگوں کا شجرہ نہیں ملتا
ہم سے بھی وہ انساب ناکو نسب مالک ہے ہیں

پورا بھی نہ ہوا آج عزیزوں کو نصیب
یہ تو مجبوری میں خالی ہاتھ چھوڑ کر نکلے
آئیے پھر ایک شگفتہ غزل [illegible] جمالی سے سنئے یہ

شب غم کی تیرگی سے کبھی تنگ آ کے روئے
کبھی دن کی روشنی میں غم دل چھپا کے روئے
اسی کشمکش میں گزری یہ حیات چند روزہ
کبھی دور رہ کے روئے کبھی پاس آ کے روئے
انھیں یہ خبر ہی کب تھی کہ جلے گی ساری بستی
مرا گھر جلانے والے مرا گھر جلا کے روئے

آہ اور واہ کا ایک دھماکہ ہوا ہے کئی بار دہرا کر اسی سج دھج
سے آپ تو محفل کو لوٹنے چلے ہیں سے

یہ خزاں ہی مستقل ہے نہ بہار جاوداں ہے
کبھی رو کے مسکرائے کبھی مسکرا کے روئے

میرے سامنے والے نوجوان زیادہ اچھل کود کر رہے ہیں اور تمنا
[illegible] داد و تحسین پا کر ایک اور ایک اور کے شور میں تنی
ان سنی کرتے [illegible] آ رہے ہیں ادھر اوپندر کمار اشک رڑکوی
الاپ رہے ہیں

درد دل اور [illegible] تر — چاہیئے وہ دوا چارہ گر
ہو کوئی پیار کی [illegible] نظر — ہم رہے دیکھتے عمر بھر
ذکر جب بھی وفا کا ہوا — جھک گئی آپ کی کیوں نظر

اشک صاحب مناسب داد وصول کر کے پلٹ رہے ہیں
اور اب اس مشاعرہ کے سرگرم منتظم جناب شہاب تیمی پھلواروی
بامر ارتمام آ کر غزل سرا ہیں سے

شام آئے گی مے و جام سے باتیں ہوں گی
پھر ذرا گردش ایام سے باتیں ہوں گی

دوسرے مصرعے پر داد ملی ہے تو دے سکوت کے بعد ابھی
بانکپن سے مقطع کو گنگنا رہے ہیں سے

خواب کی طرح ملاقات کے لمحے [illegible]
سوچتے ہی رہے آرام سے باتیں ہوں گی
دن کا یہ شور غنیمت کہ بہلتا ہے دل
رات آئی تو در و بام سے باتیں ہوں گی

شہاب صاحب داد پا کر اپنی جگہ جا کر پھر انتظام میں آ
گئے ہیں اور سرو قد خوش گلو خوش رو شاعر نواز ملیح
غزل سرا ہیں سے

کیوں ستم گار ہاتھ کے روز گار کرو
اپنا دامن ہی تار تار کرو
خود شناسی بہت ضروری ہے

ایسا لگتا ہے دوسرا مصرعہ سنا نہیں جائے گا کئی بار
ارشاد ہوا ہے سے آئینوں کا نہ اعتبار کرو
آہ اور واہ کا شور خوشگوار کم ہوا تو اسی سج دھج سے
لوٹ رہے ہیں سے

اپنی خوشیاں عیاں کرو سب پر — غم کسی پر نہ آشکار کرو
آپ بھی دل نواز کہلاؤ — ہم سے انداز اختیار کرو

پھر نواز صاحب ایک گیت سنا کر کامراں جا رہے ہیں
اور اب شہزادہ گلریز رام پوری پر وقار انداز سے
فرما رہے ہیں سے

خواب جاگی ہوئی آنکھوں میں سجاتے کیوں ہو
جیب خالی ہے تو بازار میں آتے کیوں ہو

داد بیداد ہو کر رہ گئی اور آپ اسی طرح گرج رہے ہیں

نہ جانے کس لئے تلوار پھینک دی اس نے
میں اس کی فتح کا اعلان کرنے والا تھا

پھر داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ فرما رہے ہیں سے

تمام گھر کو کہانی سنا کے سوتے ہیں
ہمارے عہد کے بچے بزرگ ہوتے ہیں
بجائے سینے کے آنکھوں میں دل دھڑکتا ہے
یہ انتظار کے لمحے عجیب ہوتے ہیں

گلریز صاحب بھی داد سمیٹے پلٹ رہے ہیں اور اب
حفیظ رڑکوی غزل سرا ہیں سے

نکھرو خلوص سے لفظوں کا انتخاب کر کے
چلا گیا کوئی پھولوں سے آشنا کر کے
ہمیں تو آپ سے اس بات کا گلہ ہی رہا
گلے ملے نہ کبھی دل کو آئینہ کر کے
حفیظ آپ کو خود ہو گئی پشیمانی
ستم ظریفیٔ احباب کا گلہ کر کے

حفیظ صاحب بھی واہ واہ کیا کہنا سبحان اللہ کرا کے آ رہے ہیں اور اب ٹھاکر ویر درد یوں گرج رہے ہیں ؎

بھریگا نکہتیں گلشن میں انتظار کا پھول
کھلا کے دیکھو کبھی دل میں ایک پیار کا پھول
ذرا تو دیکھو انھیں شبنمی نگاہوں سے
کھلے گا غنچہ و گل میں وہیں نکھار کا پھول
وہ جہد جس سے تھا نظم چمن بہبودی
بکھر رہا ہے کہیں بن کے رہگزار کا پھول

ٹھاکر صاحب گرج اور برس کر داد وصول کر کے چلتے بنے اور اب شاعرہ کل شبنم چوہدری مائک پر آکر محفل کا جائزہ لیکر فرما رہی ہیں ؎

چھپائے پھرتے ہیں پرچھائیاں تلک اپنی
اُلٹیں یہ شکل کے چہرے اُتار لایا ہے
یہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا ہے جو ایک آئینہ
تمام شہر کے چہرے اُتار لایا ہوں

داد خوب خوب دی جا رہی ہے اور آپ یوں سحر کاری کرنے چلی ہیں ؎

اب تو تمہارا شہر دلہن کا سا سنور گیا
لیکن وہ بستیوں کے گھروندے کیا ہوئے
قاتل کی سیاستیں جنہیں بارود دے گئیں
وہ پیڑ جن کے سائے گھنیرے تھے کیا ہوئے
پہچان بھی شناخت کی محتاج ہو گئی
آنگن کے وہ اوٹ بھرے سے کیا ہوئے

شبنم صاحبہ محفل کو گرما کر مائک سے جدا ہو رہی ہیں اُدھر ایک غزل کی فرمائش پر آپ پھر اسی بانکپن سے محفل کو لوٹنے چلی ہیں سماعت فرمایئے ؎

دیا وفا کا جلانا ہے دیکھئے کیا ہو
خلاف سارا زمانہ ہے دیکھئے کیا ہو
یہ جبر دیکھئے جس کے خلوص پر شک ہے
اسی کو راز بتانا ہے دیکھئے کیا ہو
بہار بیچنے نکلے ہیں خود چمن والے
خزاں تو صرف بہانا ہے دیکھئے کیا ہو

شبنم صاحبہ تشنگی بکھیر کر کامراں اپنی جگہ آ رہی ہیں اور اب رنگ محفل بدلنے کے لئے ہلال سیوہاروی آکر حسب عادت یوں گرج رہے ہیں ؎

میں سمجھتا تھا کہ انسان خدا تھا پہلے
دیوتا تھا کوئی بھوت بلا تھا پہلے
آج کے دور میں لیڈر کو جو دیکھا میں نے
تو یہ سمجھا ہوں کہ انسان گدھا تھا پہلے

ہاؤ ہو اور ایک ہلڑ بازی ہے پھر نہ جانے کتنے قطعات اور ایک طویل نظم سنا کر ایک اور ایک اور کے شور میں معذرت کر کے پلٹ رہے ہیں اور ڈاکٹر امیر اعظم کھتولوی فرما رہے ہیں ؎

کبھی مہر و ماہ و نجوم سے کبھی کہکشاں سے گزر گیا
تری جستجو میں آخرش حدِ لامکاں سے گزر گیا
کبھی شہرِ حسنِ خیال سے کبھی دستِ غربت و ملال سے
ترے عشق میں ترے پیار میں میں کہاں کہاں سے گزر گیا
تری رہگذر مری رہگذر مری رہگذر تری رہگذر
تو جہاں جہاں سے گزر گیا میں وہاں وہاں سے گزر گیا

ڈاکٹر صاحب بھی خوب خوب داد و تحسین پاکر جا رہے ہیں اور اب ڈاکٹر منظور احمد منظور عطا کر رہے ہیں ؎

نہ خوف برق نہ خوفِ شرر لگے ہے مجھے
خود اپنے باغ کے پھولوں سے ڈر لگے ہے مجھے
عجیب درد کا رشتہ ہے ساری دنیا میں
کہیں ہو جلتا مکاں اپنا گھر لگے ہے مجھے
میں ایک جام ہوں کس کس کے ہونٹ تک پہنچوں

خشب کی پیاس لئے ہر شجر لگتے ہے مجھے

ڈاکٹر حنظلہ صاحب داد پاکر اپنی جگہ آگئے زحمت غزل دے رہے ہیں جواں فکر جواں سال خوش گفتار عزیز اطہر ضیائی رامپوری کو۔ اطہر صاحب کا نام سنکر تالیاں بجا دی گئی ہیں اور آپ یوں محفل کو لوٹنے چلے ہیں ؂

غزل کے دل ربا لہجے میں بولوں
وہ آجائے تو میں پھولوں میں تولوں

تری آنکھیں نہیں کیا میری آنکھیں
تری آنکھوں سے میں کچھ دیر سولوں

جسے کھویا ہے میں نے قہقہوں میں
وہ مل جائے تو میں جی بھر کے رولوں

مزا دینے لگے جب خود کلامی
تو پھر کیا ہے کہ میں تجھ تجھ سے بولوں

اطہر صاحب ہر شعر پہ داد و تحسین پاکر کامراں و شاداں پلٹ رہے ہیں اور اس عالم میں نور تقی نور میرٹھی اپنے فن ترنم کا پورا مظاہرہ کرنے چلے ہیں ؂

چشم نمناک میں اک شکل سجا رکھی ہے
ہم نے پانی پہ بھی تصویر بنا رکھی ہے

داد مطلع ہی سے شروع ہو گئی ہے اور میں (غالب) پروین شاکر کے اس منفرد مطلع سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔

وہ عکس بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

اور آپ فرما رہے ہیں ؂

آپ روئیں نہ مری بے سر و سامانی پہ
میں نے اس حال میں بھی عزت تو بچا رکھی ہے
پھول برسا کے تمہیں جیتنا ہے لیکن
زندگی ہم نے تو آئینہ بنا رکھی ہے

نور صاحب خوب خوب ترنم کاری دکھا کر جا رہے ہیں اور اب صدر مشاعرہ مشیر جھنجھانوی تالیوں کی جھنکار میں اٹھ کر سنجیدگی اور متانت سے عطا کر رہے ہیں ؂

آنکھوں نے کب راز چھپایا دل نے کب غم خواری کی
ہم کو تو افسوس یہی ہے اپنوں نے غداری کی
دن کا سمندر جان کے ہم نے رات کو موتی بخشے ہیں
تہمت پھر بھی ہم پہ لگا دی کرنوں نے بیکاری کی
کل ہی تو ہم گاؤں سے اپنے شہر میں آئے ہیں
ہم کیا جانیں جھوٹ ہے کیسا بات ہے کیا عیاری کی
ایسے سکے میری نظر میں حد سے زیادہ کھوٹے ہیں
جن سکوں پہ مہر لگی ہے نخوت کی زرداری کی

قبلہ مشیر صاحب ہر شعر پر داد و تحسین وصول کئے اپنی جگہ آرہے ہیں اور آپ کے ساتھ ہی ۳ بجے پہلا دور ختم ہوکر دوسرے دور میں خوب خوب شعراء نے فرمائشیں پوری کیں۔ شبنم جی سنا رہی تھیں کہ چار بجے قریب کی مسجد سے اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی اور شبنم صاحبہ ٹھہر گئی ہیں۔ مجمع پر مکمل سکوت طاری ہے اذان کے بعد شبنم صاحبہ اور ہلال وغیرہ نے کلام سنایا اور میں نے اللہ اکبر اور حی علی الصلوٰۃ پہ لبیک کہکر مسجد کا رخ کیا۔ پونے پانچ تک یہ مشاعرہ اسی طرح جاری رہا اگر نماز کا وقت نہ ہوتا تو آج یہ مشاعرہ نہ جانے کب تک اسی طرح دلجمعی اور دلچسپی سے سنا جاتا آج سامعین نہ جانے کیوں بادل نخواستہ محفل سے اٹھ کر جا رہے ہیں۔ اس مشاعرہ کی کامیابی کے مستحق داد جناب تمنا جمالی۔ مسٹر شہاب شمیمی۔ کامریڈ یٰسین انصاری۔ جناب حکیم جلیل احمد ہاشمی اور مسٹر نریندر سنگھ کوتوال مٹھانہ وغیرہ ہیں جن کی مساعی جمیلہ اور مسلسل جد و جہد سے یہ مشاعرہ کامیاب ہوا اور سامعین بھی لائق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس مشاعرہ کو کامیاب بنا کر یادگار بنا دیا۔

—— خدا حافظ

نہ جانے صبح کے دامن میں کیا دھوپ ہو کہ دھواں
دعا نہ کیجئے محفل کے برہمی کے لئے

صرف

اب آپ کی بچتوں پر
اور بھی زیادہ سُود

چھ برسوں میں
اپنی رقم کو دوگنی سے بھی زیادہ کیجئے
قومی بچت سرٹیفکیٹ (چھٹے اجراء) میں لگا کر

اس نئے سیریز میں 100 روپے 6 برسوں میں 201.50 روپے ہو جاتے ہیں جس میں 12 فیصد سالانہ کی شرح سے ششماہی مرکب سُود بھی شامل ہے۔

ایک نیا ساتواں اجراء بھی ہے جس میں 12 فیصد سالانہ سود ششماہی قابلِ ادا ہوگا اور اصل زر 6 سال بعد واپس کیا جائے گا۔

دونوں سیریز کو 3 سال کے بعد بھنایا جا سکتا ہے۔ رقم لگانے کی کوئی حد نہیں، نامزدگی، شناختی پرچی اور منتقلی کی سہولیات۔

انکم ٹیکس کے مقاصد کے لئے سرٹیفکیٹ ڈاک گھروں سے بلا معاوضہ جاری کئے جاتے ہیں۔ ایک لاکھ 50 ہزار روپے تک دولت ٹیکس سے چھوٹ 000 3 روپے سالانہ تک سود بمعہ دیگر متعینہ سرمایہ کاریوں پر سُود کے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ۔ یہ سرٹیفکیٹ ڈاک گھروں سے انفرادی یا مشترکہ طور پر یکم مئی 1981ء سے دستیاب ہیں۔

مزید تفصیلات کے لئے ان سے رُجوع کیجئے:

- کسی مجاز ایجنٹ
- ڈسٹرکٹ سیونگز افسر
  معرفت ڈسٹرکٹ کلکٹریٹ
- قومی ڈاک گھر
- ریجنل آفیسر نیشنل سیونگز آرگنائزیشن
  (ریاستی / مرکزی سرکار)

یا لکھئے:

قومی بچت ادارہ

12، سیمینری ہلز، ناگپور 440006

davp 81/30

نیکی کا نتیجہ

(ڈاکٹر اُدے سری ارمان بلاری)

"دس جی۔ ایف۔ یو۔" ایک نوجوان مسافر اے نے ابھی ابھی ریل گاڑی سے اتری ایک برقع پوش عورت کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک چھاتہ دھاری مسافر بی سے کہا نہ تو تیز دھوپ پڑ رہی تھی اور نہ بارش ہی ہو رہی تھی پھر بھی مسافر بی چھاتا تانے کھڑا تھا۔ پلیٹ فارم پر کھڑے سبھی لوگوں نے یہ دیکھا مگر کسی کو کیا پڑی تھی جو اس سے بلا وجہ چھاتا تاننے کی وجہ پوچھتا جیسے کسی جوان لڑکی کو منی میکسی پہنے ہوئے بازار میں گھومتے ہوئے دیکھ کر کوئی معترض نہیں ہوتا — معترض بھی ہو تو تُک نہیں ہے۔

"ٹی یو ایس" قریب آ کر چھاتا بند کرتے ہوئے مسافر بی نے کہا اور مسافر اے ریل گاڑی میں جا بیٹھا۔ مسافر بی اس برقعہ پوش حسینہ کے چاروں طرف منڈلاتا رہا۔ سیلاب زدہ ندی میں بہتے تیز رو پانی کی بے تاب .... لہروں کی طرح مسافر بھیڑ میں اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ ایسے ہنگامے میں لوگوں کو خود اپنا ہی ہوش نہیں رہتا۔ دوسروں پر کون دھیان دے۔ برقع پوش عورت اور اس کا شوہر پلیٹ فارم سے باہر نکل کر مسافر خانہ میں ایک بنچ پر جا بیٹھے مسافر بی بھی بے تابی سے بنچ کے اردگرد گھوم پھر رہا تھا۔ پلک جھپکتے ہی ایک دوسری عورت جو جدید فیشن کے برقع میں تھی پُروقار انداز سے چلتے ہوئے اسی بنچ پر پہلی عورت کو تھوڑا سا سرکا کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور اپنے روتے بچے کو چُپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر بچہ برابر رو رہا تھا۔ وہ جتنا اسے بہلانے کی کوشش کرتی بچہ اتنا ہی زیادہ رونے چلا جا رہا تھا کیوں کہ دراصل بچے کو بہلانے کی کوشش محض دکھاوا تھا۔ وہ دانستہ بچے کو رلا رہی تھی تاکہ پاس بیٹھے ہوئے میاں بیوی اس کی طرف متوجہ ہوں اور ہوا بھی یہی۔ پہلی عورت نے ترس کھا کر کہا۔

"ارے دودھ پلا دو بہن یہ بھوک کا معلوم ہوتا ہے"

"پلا کہاں سے دوں یہ میرا پیتا نہیں اُوپر کا لانا بھول گئی مگر شہد کا پَنل بھی تو جلدی جلدی میں گھر ہی رہ گیا۔"

"چائے والے کی دکان سے لیکر پلا دو"

"وہاں لوگوں کی بھیڑ لگی ہے مجھے تو شرم آتی ہے غیروں سے بولتے ہوئے"

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی لاؤ شیشی نکالو میں اپنے میاں سے منگائے دیتی ہوں"

"ہاں ہاں لائیے کیا حرج ہے میں ابھی لائے دیتا ہوں یوں بھی تو بیکار بیٹھا ہوں" پہلی خاتون کے شوہر نے بنچ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ بچے والی عورت کا یہی منشا تھا۔ کہ یہ مرد وہاں سے ہٹے۔

اس نے فوراً شیشی نکال کر دیتے ہوئے کہا "آپ تو بہت اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ خاندانی آدمی اسی وضع کے ہوتے ہیں۔" مرد نے شیشی لیتے ہوئے ایک نظر اس کے ہاتھ پر ڈالی جو گورا چٹا تھا اور سیاہ برقع میں اس طرح معلوم ہو رہا تھا جیسے سُنار کی گھڑیا میں پھونک سے نوتر چمک کر لمبی ہو جاتی ہے۔ وہ شیشی لے کر چلا گیا تو بچے والی نے پہلی عورت سے پوچھا "کہاں کے رہنے والے ہیں آپ؟"

"غریب خانہ نجیب آباد ہے۔ میرے شوہر جوڑیوں کے کارخانہ میں بھٹی کا تاؤ دیکھنے پر ملازم ہیں سولہ سو روپے ملتے ہیں" ہندستانی عورت کی ذہنیت کے مطابق بن پوچھے ہی اس نے بتا دیا۔

"بھٹی کا تاؤ دیکھنا بھی ایک ہنر ہے [illegible] کہ یہاں کہاں جانا ہے؟"

"خوش نگر لکھنؤ کا [illegible]"

صاحب کے گھر اُن کی لڑکی کے ساتھ میرے دیور کا رشتہ طے ہو رہا ہے۔ آج اسے دیکھنے کا پروگرام ہے ہم نے بارہ بجے آنے کا لکھا تھا مگر یہاں دس بجے ہی آگئے گاڑی کے وقت کے بارے میں غلط فہمی رہی اب وہ لوگ تو ہمیں اسٹیشن پر لینے پروگرام کے مطابق بارہ بجے ہی آئیں گے۔ اس لئے سوچا کہ یہیں وقت بتائیں اُن کا پتہ تو معلوم ہے مگر گھر تو نہیں دیکھا ہے ڈھونڈنے والا بھی نہ جانے کہاں سے کہاں لئے پھرے گا۔ یوں تھوڑا کریں کھانے سے بھی کیا فائدہ نقاب اُٹھا کے پیچھے ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

" کیا نام ہے آپ کا ؟ "

" روشن آرا "

" صحیح نام رکھا ہے آپ کے والدین نے " اس کے حسین چہرے پر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے مزاحیہ انداز میں کہا " شوہر کا کیا نام ہے "

ذرا ہچکچاتے ہوئے بولی " عمران علی " عورتیں شوہر کا نام لیتے ہوئے اس طرح ہچکچاتی ہیں جیسے پنڈت جی چقندر کی سبزی کھاتے ہوئے۔

" ماشاءاللہ کیا خوب نام ہے روشن آرا " تم نقاب ڈال لو قسم خدا کی تم خود ہی کو اتنی حسین لگ رہی ہو تو دوسروں کا کیا کہنا نظر لگ جائے گی دوسری عورت مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ تمہیں ایک ایسی خوشی کی بات سُناتی ہوں بالکل ایسی خوشی کی بات سُناؤں گی کہ تم حیرت زدہ رہ جاؤ گی؟

یہ سُن کر روشن آرا بولی " کیا خوشی کی بات سُناؤ گی؟ "

" یہی کہ ہم ہی تو تم کو لینے آئے ہیں۔ میرے میاں عمران علی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے " اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس عورت نے پیچھے سے برقع سنبھالنے کے بہانے چاک سے بنچ کی پشت پر لکھا ہوا پڑھ لیا جس کا پہلی عورت کو کچھ پتہ نہیں چلا " یہ لو وہ بھی آگئے " سامنے آتے ہوئے سجیلے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا

" بھئی تم یہاں کہاں بیٹھ گئیں جس کام سے آئے ہیں اُس کا بھی خیال ہے "

" الحمدللہ جس کام کے لیے ہم آئے تھے وہ ہو گیا یہ تو ہیں جنہیں ہم لوگ لینے کے لیے آئے ہیں ان کے میاں دودھ لینے کے لیے گئے ہیں۔ آپ یہیں بیٹھیں جب وہ آجائیں تو انہیں باہر کار تک لیتے آنا۔ میں انہیں لے کے چلتی ہوں۔ ہمارے رشتہ دار یہاں بنچ پر بیٹھے رہیں کیا یہ اچھا لگے گا؟

وہ آدمی دوسری عورت کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اور بنچ کی پشت پر لکھا ہوا پڑھ کر اُسے مٹا کے بولا " کیا دودھ لینے عمران علی ہی گئے ہیں۔۔۔ "

" ہاں! وہی تو گئے ہیں "

" اچھا تو روشن آرا کو لے جا کر کار میں بٹھا۔ میں عمران بھائی کو لے کر آتا ہوں " اپنے شوہر کا اور اپنا نام غیر آدمی کی زبان سے سُن کر اُسے یقین ہو گیا کہ یہ ضرور حاجی جی کے ہی گھر سے آئے ہیں۔ یہ یقین روشن آرا کے دماغ میں اُبھرا اور وہ فوراً پیچھے والی عورت کے ساتھ کار کی طرف چل پڑی۔ وہ آدمی وہیں بیٹھ گیا جیسے ہی یہ دونوں بنچ سے ہٹ گئیں تو وہ وہاں سے چلا بنا اور چائے والے کی دکان کے راستے میں دودھ لانے والے کو تلاش کرنے لگا جونہی اُس نے ایک شخص کے ہاتھ میں دودھ کی شیشی دیکھی تو اس نے فوراً کہا " اسلام علیکم عمران بھائی آؤ پان کھا لو "

عمران اجانک غیر آدمی کے منہ سے اپنا نام سُن کر حیرت میں پڑ گیا " آپ کون ہیں بھائی صاحب، میں آپ کو پہچانتا نہیں۔ "

" اگر یہی الفاظ آپ اپنے گھر میں مجھ سے کہتے تو میں بُرا مان جاتا۔ مگر اب بُرا نہیں مانوں گا کیونکہ یہ پلیٹ فارم ہے بیٹھو سب بات بتاتا ہوں ایک پان بنوا لاؤں " کہہ کے وہ چلا گیا اور عمران علی کھڑا چائے والے کی دکان سے دُور کھڑا تمام باتیں سوچتا رہا۔ بہت دیر ہو گئی تب وہ پان لے کر آیا " لو پان کھاؤ۔ بنچ پر چلو، میں پیشاب کر کے ابھی آتا ہوں " یوں کہہ کر وہ چلا گیا اور اسے طرح طرح کے خیالات میں اُلجھا گیا۔ عمران بنچ کے پاس آیا تو وہاں صرف برقعہ پوش خاتون کو دیکھا جسے اس نے اپنی بیوی سمجھتے ہوئے (کیونکہ وہ ویسا ہی برقعہ اوڑھے ہوئے تھی جیسا کہ عمران علی کی بیوی نے اوڑھ رکھا تھا) پوچھا کہ

"وہ نیچے والی عورت کہاں گئی"

برقعہ پوش عورت نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ چلی گئی۔" جانے وہ ایسی عورتیں جو بغیر مردوں کے سفر کرتی ہیں کیسی نہیں ہوتی ہیں۔ عورت عالم ہو یا ناضل۔ طاقت ور ہو یا کمزور اسے تنہا کبھی نہیں جانا چاہیئے۔ عورت کو مرد کے سہارے کی ہر جگہ ضرورت ہوتی ہے

عمران علی نے اپنی دھن میں یہ سب کچھ کہتے ہوئے مسکا کہا چلو! باہر ہوٹل پر چائے پئیں گے۔ وہیں بیٹھیں گے ابھی کچھ وقت اور یہیں بتانا ہے دودھ اور چائے راستے میں سے یاد سے" اس آدمی کا ذکر کیے بغیر ہی عمران نے اس عورت کو اپنی بیوی سمجھتے ہوئے کہا۔ تو اس برقعہ پوش عورت نے پاؤں سے سینڈل اتار کر چار پانچ عمران علی کے دھر دیں۔ اور لگی "پولیس، پولیس" چلانے

سپاہی آس پاس ہی گھوم رہے تھے۔ مار دھاڑ دیکھ کر فوراً آدھمکے اور عمران کو دبوچ لیا۔ "کیا بات ہے" عورت سے پوچھا۔ تو برقعہ پوش عورت نے بگڑ کر کہا۔ "کہ جان نہ پہچان یہ صاحب مجھے ہوٹل پر چائے پینے پلانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اور مجھے چھیڑ رہا تھا۔ سپاہی نے عمران کے پانچ چھ تھپڑ مارے اور مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر تھانے کی طرف چل پڑا۔

بے چارہ عمران چیختا رہا کہ میں نے اپنی بیوی کے دھوکے میں اس عورت سے ایسا کہا کیونکہ میری بیوی بھی ایسا ہی برقع پہنے ہوئے تھی۔"

مگر پولیس والوں نے ایک نہ سنی، آس پاس بیٹھے مسافروں نے بھی یہی کہا کہ "اپنی بیوی کو پہچاننے میں دھوکا کیسے ہو سکتا ہے۔" "یہ مکار ہے۔ [illegible] ہے، غنڈہ ہے اس کی خوب مرمت ہونی چاہیئے" حالانکہ عمران کی بیوی اترا کر جا چکی تھی۔

عمران [illegible] نوٹنکی [illegible] بلاتے حوالات میں ڈال دیا گیا اور کسی نے کچھ نہ سنی جیسے ذبح کیے جانے والے جانور کی کوئی نہیں سنتا۔

اُدھر جیپ دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ چار آدمیوں نے روشن آراء کو جیپ میں چاقو کی نوک کے زور پر لٹا رکھا تھا وہ تو نہ معلوم اس بے چاری کے ساتھ کیا کیا جاتا۔ وہ تو قدرت نے خیر کی کہ ریلوے کراسنگ کا پھاٹک بند تھا۔ [illegible] جیپ کی [illegible] چابی ہوتی ہے

وہ شنوط رستے نکال دیتا ہے۔ جیپ پھاٹک پر رکی تو غنڈے گھبرا گئے اور انہوں نے روشن آراء کے منہ میں رومال ٹھونس دیا۔ اور سارا زیور اتار کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور روشن آراء جو منہ میں رومال ٹھونسے جانے سے نڈھال پڑی تھی اس کو ریلوے لائن پر ڈال دینے کی اسکیم سوچی گئی۔ غنڈوں کے ایک ساتھی نے اس کی مخالفت کی۔ مگر باقی تین ہم خیال تھے اور اسے اٹھا کر لے گئے

چوتھا بے چارہ ساتھی دیکھتا رہا۔ اور جیسے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ زیور چھین لینے کے بعد اس حسینہ کو مارنا نہیں چاہیئے۔ اور دل ہی دل میں نادم ہوتے ہوئے خدا کے حضور دعا کر رہا تھا کہ اے کل جہاں کے مالک یا اللہ میں اس جرم میں ان ظالموں کا ساتھی ہوں۔ مگر میرے مولا تو اس مظلوم عورت کی جان بچا لے وہ دل ہی دل میں اس ہولناک منظر کا تصور کر رہا تھا جب ریل کے وزنی پہیئے اس حسین عورت کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے۔ وہ اس خوفناک تصور سے کانپ رہا تھا۔ اور اپنے مولا سے دل ہی دل میں گڑگڑا کر کہہ رہا تھا کہ اے سب کو بچانے والے کوئی فرشتہ بھیج کہ اس عورت کی جان بچا لے اتنے میں اس کے تینوں ساتھی اس عورت اور اس بچے کو عین پٹڑی کے درمیان رکھ کر واپس آ چکے تھے۔ اور دور سے ریل گاڑی کے انجن کا دھواں بتا رہا تھا کہ بہت کم وقت میں گاڑی آیا ہی چاہتی ہے جیپ اسٹارٹ ہو گئی اور بیک گیر ڈالی کر اُسے پیچھے کی طرف کر کے کسی دوسرے راستے سے بھاگ نکلے۔ ریلوے کراسنگ کا چوکیدار اپنے کیبن سے بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ آ رہی گاڑی کو ہری جھنڈی دکھاتا وہ بھاگ کر گیا اور ریل کی پٹڑی میں پڑی ہوئی اس عورت کو اٹھا کر اپنے کیبن میں لے آیا۔ غنڈوں کا چوتھا ساتھی جیپ میں مڑ مڑ کے دیکھتا جاتا تھا۔ اس نے چوکیدار کو حسینہ کو ریلوے لائن سے اٹھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جس سے اُسے دلی خوشی ہوئی۔ زیور میں حصہ ملنے یا خیریت سے بھاگ نکلنے کی نہیں بلکہ اپنی دعا مقبول ہو جانے کی اور اس حسینہ کی جان بچنے کی۔ چوکیدار نے عورت کو کیبن میں رکھنے کے بعد ہری جھنڈی دکھائی اور آنے والی گاڑی آناً فاناً میں پاس ہو گئی۔ تبھی گشت سے واپس آ رہے کچھ سپاہی اس کے کیبن پر [illegible] گئے۔ "کیوں بھئی تم نے ہری جھنڈی دکھاتے دکھاتے اندر کیبن رکھ دی تھی اگر کوئی ایکسی ڈینٹ ہو جاتا

جاناتو کیا ہوا۔ کس کے حکم سے تم نے ایسا کیا ہے؟"

" اس عورت کو لائن پر سے اٹھا کے لایا ہوں۔ یہ زندہ ہے کچھ غنڈے اسے لائن پر ڈال کر بھاگ گئے ہیں"۔ عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

" جھوٹ بولتے ہو تم نے اس عورت کو کیبن میں بند کر لیا ہے اور اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا ہے تاکہ یہ شور نہ مچا سکے۔ اور تم اچھی طرح مار کر اسکو اور اس کو لائن پر ڈال دو۔ ہمیں بہکاتے ہو" ایک سپاہی نے کہا اور اس کو پکڑ کر لے گئے۔

عورت کی ڈاکٹری ہوئی۔

چوکی دار کو حوالات میں ڈال دیا گیا۔

عمران علی اور سنگھ لیلے

دونوں کے بیچ والات کی صرف ایک ہی دیوار تھی

غزل

فرحت قادری

کترا گئی ہے گردشِ دوراں کبھی کبھی
کام آ گیا ہے یوں غمِ جاناں کبھی کبھی

پہنچا ہے ایک جست میں تا حدِ لامکاں
یوں بھی جنوں ہوا ہے پرافشاں کبھی کبھی

دنیائے بے ثبات کی یہ بھی حیات ہی
خود بن گئی ہے موت کا عنواں کبھی کبھی

انساں کی خود فریبی پیہم کو دیکھ کر
خود رک گئی ہے عمرِ گریزاں کبھی کبھی

گلہائے ناز پر ستمِ روزگار سے!
شبنم ہوئی ہے شعلہ بداماں کبھی کبھی!

فرحت ملالِ دردِ مسلسل نہ کیجئے
بنتا ہے درد آپ ہی درماں کبھی کبھی

غزل

صابر ابوہری

ہلاہل پی کے بھی لہرا رہا ہوں
رموزِ عاشقی سمجھا رہا ہوں
ہوئی ہے جب سے کچھ پہچان اپنی
سراپا ناز بنتا جا رہا ہوں

سرورِ آگہی ہے یا جنوں ہے
انا الحق کا ترانہ گا رہا ہوں!
تری خوشبو بسی ہے ہر نفس میں
مثالِ گل مہکتا جا رہا ہوں

مجھے بخشی گئی غم کی امانت!
عطائے خاص پر اترا رہا ہوں
فرشتوں کی رسائی سے پرے ہے
مقامِ آدمی سمجھا رہا ہوں

ہر اک شے میں تجھے وہ ترجلوہ آرا
میں خود ہی آنکھ کا پردہ رہا ہوں
نہیں آتا جنہیں مرنا بھی صابر
انہیں جینا سکھاتا جا رہا ہوں

شعر، شاعر اور شاعری

(شعر) شعر بالکسر ... دریافتن۔ دانستن و در اصطلاح سخن کلام موزوں مقفی کہ قائل بہ قصد موزونی آں کردہ باشد (غیاث اللغات)

گویا شعر کے معنی لغت میں جاننے کے ہیں اور اصطلاح میں اُس کلام موزوں کا نام ہے جو مقفیٰ ہو اور بالقصد موزوں کیا گیا ہو۔

مولانا یوسف شرح نصاب میں لکھتے ہیں کہ شعر بمعنی معرفت چیزے است باریک است، و حالا بہ نظم مخصوص شدہ "محققین و ماہرین فن سخن نے شعر و شاعری کی حقیقت، ماہیت کا اظہار اپنے جذبات و خیالات کے مطابق مندرجہ ذیل مختلف صورتوں میں کیا ہے۔

۱۔ موسیقی، جب الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہے تو شعر کہلاتی ہے۔

۲۔ کلام موزوں ہو اور متکلم نے بالارادہ اُسے موزوں کیا ہو تو شعر کہلاتا ہے۔

۔ مسٹر ڈیٹس کا قول ہے کہ شاعر جب کسی منظر یا منظر کو دیکھتا ہے تو اُس کے دل میں اس چیز کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ پھر وہ اُس نقشے پر بار بار غور کرتا ہے۔ تو اُس کے اندر ایک حقیقت آشکار ہوتی ہے جو کہ وہ شعر کے لباس میں جلوہ گر کرتا ہے۔

۴۔ یورپ کے ایک محقق کا قول ہے کہ بلا جرا انہماک مشاغل دنیوی جو قوتیں سو جاتی ہیں شعر اُن کو بیدار کرتا ہے۔ وہ ہم کو فسوسات کے دائرے سے نکال کر گذشتہ اور آئندہ حالات کو ہمارے موجودہ حال پر غالب کر دیتا ہے۔ شعر کا اثر محض عقل کے ذریعے سے نہیں بلکہ زیادہ تر ذہن اور ادراک کے ذریعے سے معلوم ہوتا ہے۔ ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاقِ ذا نفسلہ اکتساب کرتی ہے یہی سبب ہے۔ دُنیا کی نظروں میں شعراء قابلِ احترام ہوتے ہیں۔

شعراء کے حسنِ قبول کی نسبت مولانا حالی مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں کہ: "تاریخ میں ایسی مثالیں بے شمار ملتی ہیں کہ شعراء نے اپنی جادو بیانی سے لوگوں کے دل پر فتح نمایاں حاصل کی ہے۔ بعض اوقات شاعر کا کلام جمہور کے دل پر ایسا تسلط کرتا ہے کہ شاعر کی ہر ایک چیز، یہاں تک کہ اُس کے عیب بھی خلقت کی نظر میں مستحسن معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور لوگ اس بات میں کوشش کرتے ہیں کہ آپ بھی ان عیوب سے متصف ہو کر دکھائیں۔"

بائرن کی نسبت مشہور ہے کہ لوگ اس کی تصویر نہایت شوق کے ساتھ خریدتے تھے اور اس کی نشانیاں اور یادگاریں حفاظت سے سینت کر رکھتے تھے

۵۔ مندرجہ تصریحات سے صاف عیاں ہے کہ شعر کلام موزوں و مخیل کا نام ہے جو در حقیقت۔ فطرت۔ عادت، اور اصلیت پر مبنی اور مقتضائے حال کے مطابق ہو۔

(شعر کی تاثیر)

شعر کی تاثیر مسلمہ ہے سامعین کو شعر سُن کر

مسرت یا الم۔ جوش یا افسردگی ضرور پیدا ہوتی ہے۔ شعر میں وہ سحر بھرا ہوا ہے جس کے اثر سے سلطنتیں الٹ گئیں کئی ملکی اور نزاعی معاملات محض شعر کی بدولت حل ہوئے۔

چنانچہ تاریخ صفحات میں مذکور ہے کہ جب امیر نصر بن احمد سامانی نے خراسان کو فتح کیا اور ہرات کی فرحت بخش آب و ہوا اس کو پسند آئی تو وہیں ڈیرے ڈال دیئے اپنا اصلی دارالسلطنت بخارا دل سے فراموش ہو گیا۔ لشکر کے سردار اور اعیان امراء ہرات میں رہتے رہتے اکتا گئے اور اہل ہرات بھی سپاہ کے زیادہ دیر ٹھہرنے سے گھبرا اٹھے۔ سب نے ایران کے مشہور شاعر رودکی سے یہ درخواست کی کہ کسی طرح امیر کو بخارا کی طرف مراجعت کرنے کی ترغیب دی جائے۔ رودکی نے ایک قصیدہ لکھا اور عین اس وقت بادشاہ کے سامنے پڑھا جب وہ شراب اور راگ رنگ میں محو تھا۔ اس قصیدے نے امیر کے دل پر ایسا اثر کیا کہ بھی جاتی محفل چھوڑ کر اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بغیر موزہ پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر سمیت بخارا کو روانہ ہو گیا۔ اور دوسرے کو سرا پر جا کر اپنی منزل لی۔

تاریخ شاہد ہے کہ ایتھنز اور میگارا والوں میں جزیرہ سلیمس کی بابت مدت تک جنگ جاری رہی اور ایتھنز والوں کو برابر شکستیں ہوتی رہیں تو وہ مایوس ہو کر لڑائی سے دست بردار ہو گئے۔ یہ دیکھ کر وہاں کا مشہور شاعر سولن ایک بلند مقام پر کھڑا ہو کر حب الوطن بھرپور اشعار ایسے درد انگیز اور ولولہ خیز انداز سے پڑھنے لگا کہ ایتھنز والے ہتھیار سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے اور سولن کو اپنا سردار مقرر کر کے سلیمس پر چڑھ گئے اور فتح یاب ہوئے۔

شعر کہنے کا وقت

فطری جذبہ ہی شعر کا محرک ہوتا ہے زود تاسیلیم اور موزونی طبع کے زیر اثر شعر کی شکل میں رونما ہو کر اپنی تجلیاں دکھاتا ہے۔ کسی دباؤ۔ زور۔ فرمائش۔ امید یا وقت کی پابندی کو یہاں چنداں دخل نہیں کیفیت اس وقت راہ پاتی ہے جب وہ آزاد ہو کر اپنے دیگر جذبات کے طوفان میں بہہ نکلے۔ اور اپنے احساسات کو بیدار کر کے کتاب فطرت کا عمیق مطالعہ کرے۔ فی الحقیقت اس میدان کی منازل ہفت خواں کو طے کرنے کے لیے انتہائی کد و کاوش کی ضرورت ہے

امیر مینائی فرماتے ہیں کہ "کسی حکیم کا قول ہے کہ وحشی مضامین کو رام کرنے کے لیے آب رواں۔ تنہائی اور بلند نشیمن سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔"

لیکن تحقیق یہ ہے کہ فکر شعر کے لیے کوئی موقع یا محل اس سے بہتر نہیں کہ کسی مضمون کا جوش۔ اپج یا امنگ شاعر کے دل میں خود بخود طوفانی رو کی طرح پیدا ہو۔ ایسے عالم میں گلزار یا خارزار۔ صبح یا شام۔ دریا یا صحرا یکساں ہوتا ہے۔

عرب کے مشہور شاعر کثیر سے لوگوں نے پوچھا کہ تو نے شعر کہنا کیوں چھوڑ دیا۔ کہنے لگا "جوانی جس سے دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی گزر گئی۔ عزہ جو دل کو گرماتی تھی مر گئی اور عبد العزیز جس سے صلہ کی توقع تھی وہ بھی نہ رہا۔ اب کون سی چیز ہے جو شعر کہلوائے" اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعر کہنے کے لیے جوش، ولولہ اور حاضری طبع سکون قلب۔ امنگ اور تمناؤں کا شباب ضروری ہے

فرزدق کہا کرتا تھا کہ "میں پاس و امید کی حالت میں اشعر الناس ہوں لیکن بعض اوقات میرا یہ حال ہوتا ہے کہ دانت کو مسوڑے سے اکھاڑنا مجھے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے بہ نسبت شعر کہنے کے" اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بغیر مقتضائے طبیعت اور دلی جوش کے شعر سرانجام نہیں ہو سکتا۔

فراق گورکھپوری لکھتے ہیں کہ "سچ پوچھئے تو شعر کہنے کا شوق دماغ میں تو ممکن ہے شوق ہی رہا ہو۔ لیکن جب سے جوان ہو کر زندگی کی تلخیوں کو بعض لمحے کے گھونٹ کو شیر و شکر کر کے اتارنا پڑا تب سے شاعری گویا زندگی کی تلاش کا ایک ذریعہ بن گئی۔ شاید زندگی

کو شعر میں تحلیل کرنا اور شعر کو زندگی کا آئینہ بنانا مقصدِ زندگی ہو، کون جانے"۔

آنند نرائن ملا لکھتے ہیں کہ "کبھی شعر کہنے کی نیت سے بیٹھ کر آج تک شعر نہیں کہا۔ جو کچھ کہا ہے وہ چلتے پھرتے۔ اُٹھتے بیٹھتے کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی لکھ کر کچھ نہیں کہا۔ بڑی سے بڑی نظمیں اوّل سے آخر تک دماغ میں منظم ہوئیں۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ایک غزل کہتے کہتے دو چار طبع زاد غزلیں تیار ہو گئیں۔

ناطق گلاؤٹھی فرماتے ہیں کہ "ممالکِ متوسط کے غیر موزوں ماحول کی بدولت مدّت دراز سے مشقِ سخن غائب ہے۔ عرصے سے یہ ہو رہا ہے کہ کوئی سال ایسا نہیں آیا کہ جس میں پانچ سے زیادہ غزلیں کہنے کا اتفاق ہوا ہو اور ایسے بھی کئی سال گزرے ہیں جن میں ایک غزل بھی نہیں کہی۔

افسر میرٹھی کا ارشاد ہے کہ "غزل کہنے کا طرز ہمیشہ یہ رہا کہ کسی واقعہ سے متاثر ہو کر ایک شعر کہا اور پھر غزل مکمل کر لی"۔

بعضوں کی رائے یہ ہے کہ "دن کو طعام چاشت سے پہلے اور رات کو سونے سے پہلے طبیعت شعر میں زیادہ راہ دیتی ہے"۔

چنانچہ حضرتِ دل شاہجہان پوری اپنی غزل گرمی کے موسم میں صبح کے وقت اور سرما میں رات کے وقت دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر کہا کرتے تھے۔

مولانا عبدالباری آسی لکھتے ہیں کہ "میری شاعری کی ابتدا کسی ترغیب، تشویق کی ممنونِ احسان نہیں بلکہ اس وقت سے جبکہ میں انشائے خلیفہ و مادھورام وغیرہ پڑھتا تھا، شوق کی آگ دل میں لگی ہوئی تھی۔ تا اینکہ ایک روز کہیں جاتے ہوئے یہ شعر خود بہ خود موزوں ہو گیا ؎

یہ کیا تم نے زخمی کیا دل ہمارا
بڑا تیر مارا بڑا تیر مارا

اس کے قریب قریب ہر روز شعر کہا۔

مندرجۂ بالا شواہد سے واضح ہوتا ہے کہ طبیعت کی روانی ماحول کی تاثیر۔ احساسات کی بیداری۔ حالات کی موافقت۔ ذوقِ صحیح۔ طبعِ سلیم۔ اور جذبات کی ہنگامہ آرائی ہی شعر کو وجود میں لاتی ہے۔ حقیقی جوش و دلی امنگ کی کامیابی شاعر کی ہر طرح کی آزادی پر موقوف ہے۔ کیونکہ کسی قسم کی پابندی بھی بعض اوقات جذبات کا خون کر دیتی ہے۔ اور شاعر اپنے خیالات کو کماحقہٗ ادا کرنے یا زورِ [illegible] سے قاصر رہ جاتا ہے چنانچہ سید انشا جب تک آزاد رہے ایک عالم میں اپنے کمال کا سکہ جما دیا۔ اُن کی حاضر جوابی، ان کی ظرافت نواب سعادت علی خاں کو ایسی اچھی معلوم ہوتی تھی کہ ایک دم بھی اپنے سے جدا رکھنا پسند نہ کرتے تھے لیکن جب نواب نے پابندی لگا دی کہ ہر روز دو لطیفے ایسے سنایا کرو جو نہ دیکھے ہوں اور نہ سنے ہوں۔ تو سید انشا گھبرا گئے۔ راہ چلتوں سے بھی پوچھتے پھرتے کہ بھئی کوئی نئی بات سناؤ۔ اس پر ستم یہ ٹوٹا کہ نواب نے ایک اور کر لگا دی کہ ہمارے سوا کسی اور کے ہاں نہ جایا کرو اور دربار میں بغیر بلائے نہ آیا کرو۔ یہ نظر بندی، انشا کے لیے قیدِ بے زنجیر بن گئی بہت سٹ پٹائے۔ اور آخر کار مخبوط الحواس ہو گئے۔ ایک نوجوان لڑکا بھی آنکھوں کے سامنے چل بسا۔ زندگی برباد ہو گئی۔ وہ شان [illegible] وہ جوش وہ ولولے خواب و فسانہ بن کر رہ گیے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اطمینانِ قلب بھی شعر گوئی کا ایک رکنِ اعظم ہے۔ شعر گوئی کے لیے جگہ یا وقت کا تعین تو نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ پُر فضا منظر۔ لبِ دریا۔ بھیگی ہوئی ہوائیں۔ صبحِ صادق۔ رات کا سناٹا اور سکونِ قلب جذبات کو موجزن کرنے اور طبیعت کو راہ دینے کے لیے اہم ترین ذرائع ہیں۔

شاعر: شاعر کے معنی ہیں جاننے والا۔ عاقل

کرنے والا فخر کرنے والا - فی الحقیقت شاعر کی آنکھ ایک دیوانی گردش میں عرش سے زمین اور زمین سے عرش تک دیکھتی ہے اور یوں ہی تخیّل ان اشیا کو پیدا کرتا ہے جن کی شکلیں غیر مرئی تھیں۔ شاعر کا قلم ان کو لباسِ ہستی پہناتا ہے اور عدم کو وجود کر دکھاتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن فرماتے ہیں کہ "شاعر کے لیے کوئی شے بے کار نہیں ہے۔ کائنات میں جتنی خوب صورت، مسرت خیز، ولولہ انگیز اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیزیں ہیں قوتِ متخیلہ اُن سب سے آشنا ہے۔ باغوں میں درخت جنگلوں میں حیوانات۔ زمین میں معدنیات۔ آسمان کے شہاب شاعر کے دماغ میں صدہا خیالات جمع کرتے ہیں۔ ہر خیال اخلاقی یا مذہبی صداقت کی تصریح یا زینت ہے اور اپنی آغوش میں معلومات کی وسیع دنیا لیے ہے۔ وہ مختلف مناظر کو مختلف انداز میں بیان کر سکتا ہے۔"

ہیلی کہتا ہے کہ "شاعر خیالات پیدا نہیں کر سکتا بلکہ خیالات کی نشو و نما خود بخود ہوتی ہے۔ جیسے دشت و دمن میں گل خود رو خود بخود کھلتے ہیں۔ شاعر کا دل اور اُس کی روح نیچر سے وابستہ ہے۔ اس کے صفحۂ دل پر کائنات کے نقش سنہری حروف میں منقوش ہیں۔"

شاعری کا مدار جذبات پر ہے جب تک جذبات کی نشو و نما خاص طور پر شاعر کے دل و دماغ میں نہ ہو اُس وقت تک شاعری نہیں جنمتی۔ گویا شاعر کے جذبات صادق۔ بلند۔ صالح اور پاک جذبہ ہونے چاہییں۔ شاعر اگر صحیح معنوں میں شاعر ہے تو اُسے سامعین کے مذاق کی پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ اپنے گرد و پیش سے متاثر ہو کر ایسے ارفع تخیلات پیش کرتا ہے کہ سامعین پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔

شاعر کی دنیا اُس ظاہری دنیا سے الگ ہے وہ ایک قطرہ میں دریا اور ایک ذرّہ میں آفتاب دیکھتا ہوا جزو میں کل کا تماشا کرتا ہے۔ جہاں شاعر کی آواز قوم و وطن کے لیے پیامِ زندگی ہے وہاں شاعر کی پرواز عرش سے گزر کر حریمِ قدس تک پہنچتی ہے۔

اس کی دُور رس نگاہیں بحرِ زخار کی تہ سے دُرِ شاہوار نکال لاتی ہیں۔ زندگی کو موت کے سانچے میں ڈھال کر موت کا خاکا اُڑانا۔ بربط اندوہ و غم پر وجد کرنا۔ اپنے نغماتِ شیریں سے قالبِ انسانیت میں نئی روح پھونک دینا۔ نظامِ زمین و زمان یہاں تک کہ پیامِ قضا کو بدل دینا ایک نقطۂ موہوم میں عالمِ علوی و سفلی کی سیر کرنا۔ رعنائی مستور کی برق پاش تجلیات کو بے نقاب کرنا۔ زمینِ شعر پر عالی شان اور سر بفلک عمارتیں کھڑی کرنا۔ ہر راہِ ناہموار کو ہموار کر دکھانا۔ فلسفی کے خیالات اور منطقی کی دلائل کو باطل کر دینا۔ رموزِ زندگی کی ترجمانی اور جبرئیلِ امیں کی ہم زبانی کا دعویٰ کرنا۔ دم زدن میں تحت الثریٰ سے اوجِ ثریا پر جلوہ گر ہونا۔ چرخِ ہفتم کے اُچھلتے، ڈوبتے تارے توڑ لانا یہاں تک کہ ناممکن کو ممکن کر دکھانا شاعر کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ شاعر جہاں کانِ جواہر ہے۔ وہاں رہبرِ کامل بھی ہے۔ جہاں خلّاقِ معانی ہے۔ وہاں نقّاشِ مناظر بھی ہے۔ وہ مذہب و ملّت کی حدود سے بالاتر نہ مومن ہے نہ کافر ہے۔ بلکہ ایک حقیقی انسان ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ معلّم بھی ہے۔ محقّق بھی۔ مفسّر بھی ہے مصوّر بھی۔ فلسفی بھی ہے، منطقی بھی۔ حکیم بھی ہے اور موجد بھی۔ خلیق بھی ہے اور شفیق بھی۔ دنیا اس کے لیے اور وہ دنیا کے لیے ہے۔ سارے جہاں کا درد اس کے دل میں پنہاں ہے۔ وہ مصائب و آلام کو راحت و آرام کا پیش خیمہ سمجھتا ہے۔ فنا سے بقا کی جھلک پیدا کر کے نیستی سے ہستی کو وجود میں لاتا ہے۔ آگاہِ فنا ہو کر رموزِ زندگی کو آشکارا کرتا ہے اور حقیقت آشنا ہو کر سرِ منزل جا پہنچتا ہے۔

شاعری

نقادانِ فنِ سخن نے شاعری کی نسبت اپنے اپنے خیال کے مطابق یوں خامہ فرسائی فرمائی ہے۔

۱۔ شاعری صرف ایک جذبہ ہے کیوں کہ وہ عمیق ترین تاثرات کی جستجو کرتی ہے اور یہی جذبہ کا کام ہے۔

۲۔ شاعری جذبۂ صداقت ہے کیونکہ صداقت کے بغیر

تاثرات یا تو پُرفریب ہیں یا ناقص

۳۔ شاعری جذبۂ عشق ہے کیونکہ اس کا فعل یہ ہے کہ مسرت سے اس میں چار چاند لگائے اور عشق ہی مسرت کا بہترین مظہر ہے

۴۔ شاعری جذبۂ قوت ہے کیونکہ قوت دراصل تاثرات کی کامیابی کا نام ہے۔

۵۔ شاعری کی دُنیا وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں اہلِ فن اور اہلِ علم کی پرواز اپنی سُرعتِ رفتار کے کرشمے دکھا کر رُک جاتی ہے۔

۶۔ شاعری محسوسات کی دُنیا ہے۔ حسیات اور شعور ہی پر شعر کی عمارت قائم ہے۔

۷۔ شاعری حقیقت نہیں بلکہ حقیقتوں کا اظہار ہے صداقت نہیں بلکہ صداقتوں کی تعبیر ہے۔ خود کوئی کیفیت نہیں بلکہ کیفیت کا ایک بیان ہے اور تعبیر و بیان کا اختلاف فطرتِ انسانی ہے۔

۸۔ مقدماتِ متخیلہ کا ایک اچھی ترتیب کے ساتھ پیش کرنا اور غیر دل کش مناظر کی تصویر اس انداز سے کھینچنا کہ اس میں ایک حُسن پیدا ہو جائے شاعری ہے۔

۹۔ جذباتِ محبت و نفرت کو دل فریب انداز سے برانگیختہ کرنا شاعری ہے۔

۱۰۔ مخفی نسبتوں اور متعلقات کا بہ طریق مُناسب ظاہر کرنا شاعری ہے۔

۱۱۔ جذبات و احساسات کا موثر پیرایہ استدلال و استشہاد کی حدود میں لانا شاعری ہے۔

۱۲۔ جس کلام سے جذبات برانگیختہ ہوں اور شاعر اپنا مخاطب آپ ہی ہو وہ شاعری ہے

۱۳۔ شاعری ایک مصوری یا ایک نقالی ہے۔

۱۴۔ قوتِ متخیلہ کا بذریعہ الفاظ و استعارات جوش میں لانا شاعری ہے۔

لی ہنٹ کا قول ہے کہ "شاعری صداقت و حُسن و قوت کے جذبہ کا اظہار ہے جو تخیل اور تصور کی مدد سے اپنے معتقداتِ شعری کو محسوس کر دکھاتی ہے"۔

ڈبلیو۔ بی ایٹس شاعری کی تعریف کرتا ہے کہ "شاعری مجاز و حقیقت کی تزویج ہے"۔

فریڈرک رابرٹسن کا قول ہے کہ "جذبات کی زبان کا نام شاعری ہے یعنی شاعری تخیل کی تصنیف ہے جس کو قوتِ متخیلہ جامۂ ہستی سے آراستہ کرتی ہے"۔

مسٹر چسٹر کی رائے ہے کہ "بہت سے نازک اور پاکیزہ جذبات جو مثل فرشتوں کے وجود کے ہماری باطنی دنیا میں پائے جاتے ہیں اور جسمانی لباس میں نمایاں نہیں ہوتے اور بہت سے خوب صورت اور خوش رنگ پھول ایسے ہیں جن کے بیج نہیں ہوتے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ نظم ایجاد ہوئی جس کی بدولت وہ وجود عرصۂ ہستی میں نظر آتے ہیں۔ اور ان پھولوں کی خوشبو سے ہمارے دل و دماغ معطر ہوتے ہیں"۔

الیسٹرلنگ کا قول ہے کہ "شاعری فی نفسہٖ ایک قوت اور مسرت ہے"۔

کولرج کہتا ہے کہ "سرکارِ شاعری سے مجھ کو بڑے بڑے انعام ملے۔ شاعری نے میرے زخموں پر مرہم لگایا ہے۔ میری مسرتوں میں اضافہ کیا ہے اور ان پر صیقل کی ہے۔ گوشۂ تنہائی سے مجھے موانست ہے اور یہ صفت مجھ میں شاعری کی بدولت ہے کہ جو اپنے قریب یا دُور دیکھتا ہوں اس میں خوبی بہتری اور خوب صورتی نظر آتی ہے"۔

شیلے کہتا ہے کہ "شاعری حُسنِ مستور کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے۔ اس کی بدولت ہم ان خط و خال اور نقش و نگار کو دیکھتے ہیں جو آنکھ سے اوجھل ہوتے ہیں"۔

شیکسپیر کا قول ہے کہ "دیوانہ عاشق اور شاعر قوتِ متخیلہ سے مرکب ہیں ایک اس قدر شیطان نظر آتا ہے کہ جس کی وسیع دوزخ میں بھی گنجائش نہیں دوسرا

(باقی صفحہ پر)

شعری آہنگ میں نئی فکر اور تنوع کی ضرورت

ڈاکٹر [illegible]، [illegible] کالج، پٹیالہ

شمس الرحمان صاحب فاروقی نے اپنی کتاب "عروض آہنگ اور بیان" میں جس عنوان کے تحت سب سے پہلے عروض سیفی، شبلی اور [illegible] کے اقوال سے بحث کی ہے۔

فاروقی صاحب شبلی کے اس جملے (لفظ ایک قسم کا سر ہوتا ہے) کے مضمرات پر غور کرتے تو شاید اسے قلمزد کر ڈالتے کیوں کہ ان کے خیال کو اگر پھیلایا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نثر المعنی کے علاوہ شعر المنثور بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ اور یہ تصور ایسا ہے جو [illegible] نہیں ہوتا ہے۔

شمس الرحمان صاحب کو یہ کہنے سے پہلے کہ شبلی اپنے قول کو قلمزد کر دیتے، ان مضمرات کی طرف اشارہ کرنا چاہیے تھا جن کے تحت وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ شعر المنثور سے فاروقی صاحب کا کیا مطلب ہے اور [illegible] کو اس کے قبول نہ کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہیں؟

علم العروض کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ "ہمارے عام اساتذہ تنقید فکر کے پھیلانے میں اس طرح گرفتار ہیں کہ ان باتوں کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں جو عروضی مجتہدوں ہی نے اشارۃً یا صراحتاً کہی ہیں۔ وہ ان تحریروں کو شعر ماننے سے انکار کرتے ہیں جو مقررہ اوزان میں نہ ہوں۔"

یعنی شمس الرحمان صاحب نے نجمی کو ایک کامل عروضی سمجھ کر ان کے قول سے بحث کی ہے حالانکہ عروض میں نجمی کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یاد رہے کہ عروض صرف بحور، مدار حافات سے بحث کرتا ہے۔ دیگر علوم سے نہیں۔

بہر حال کے جملہ مزاحفات اوزان کا ذکر عروض کی کسی بھی کتاب میں [illegible] ہے۔ عروض نے ایک قاعدہ وضع کر دیا

اس کے مطابق ہر شخص نئے اوزان تحقیق کر سکتا ہے۔ ان تحقیق شدہ اوزان کو ہرگز نئی ایجاد نہیں کہا جا سکتا۔ جب ایسے اوزان جن کا عروضی کتابوں میں ذکر نہیں بقاعدۂ عروض تحقیق کیے جا سکتے ہیں تو ایسے کلام موزوں کو جو ان سے تقطیع ہو سکتا ہے ناموزوں نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا نہ موزونیت سے انحراف ہوا اور نہ اس سے انکار کہ ہر لفظ کا ایک وزن ہوتا ہے۔

نثری عبارت کے ہر لفظ کو مختلف ارکان پر فٹ کیا جا سکتا ہے۔ مگر کسی نثری عبارت کو مختلف ارکان سے تقطیع کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اس کو شعر کی تعریف میں لے لیا جائے۔ قصد اور قافیہ کی قید فضول ہے۔

نثری عبارت کی تقطیع جب قاعدۂ عروض کے تحت عمل میں آ ہی نہیں سکتی تو اس کا آسانی سے یا مشکل سے پہچاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کسی شعر کو موزوں یا ناموزوں قرار دینے کا حق صرف ایک ایسے عروضی کو ہے جو قاعدۂ عروض پر مکمل دسترس رکھتا ہو۔ جو لوگ وجدان یا موزونیٔ طبع کا سہارا لے کر اس قسم کے فتاوے صادر فرماتے ہیں ان کے اقوال اس لیے قابل وثوق نہیں ہوتے کہ ان کے پاس درک بدیہی کا آلہ (یعنی عروض) نہیں ہوتا۔ اس قسم کی باتیں کہ ایک لفظ بڑھا ہوا سا لگتا ہے، یا یہ وزن فلاں کتاب میں نہیں صرف وہی لوگ کہا کرتے ہیں جو قاعدۂ عروض سے کما حقہٗ واقفیت نہیں رکھتے۔

اگر کسی شخص نے کسی نئے وزن میں جو قاعدۂ عروض سے درست ہے کوئی کلام منضبط کر لیا تو اس کو یہ کہہ کر کہ

ہی مروجہ وزن میں نہیں، قبول نہ کرنا اپنی عروض دانی کے
یوالیہ پن ظاہر کرنے کے علاوہ کوئی جاندار قول نہیں۔

فاروقی صاحب نے ذوق کے جس قصیدے کا ذکر کیا
ہے " جس ہاتھ میں خاتم صل کی ہے گر اُس میں زلفِ سرکش
ہو " کو بحر متدارک یا غریب محذوف مقطوع مثمن مضاعف
بتایا ہے۔

ہمیں تعجب ہے کہ فاروقی صاحب عروض سے بحث
کر رہے ہیں جب کہ صحیح اصطلاحی نام کا تعین بھی نہیں کر سکے
بحر متدارک میں زحاف " حذف " وارد ہی نہیں ہوتا۔
زحاف " قطع " کا عمل صدر و ابتدا اور حشوین میں
بالکل غلط ہے یعنی فاروقی صاحب کا تجویز کردہ یہ
وزن سراسر مہمل اور گمراہ کن ہے۔ یہ مصرع بحر متدارک
مخبون مضاعف میں ہے۔ فعِلُن بحرکت عین کو
فعْلُن، بسکونِ عین کر لینا از روئے عروض صحیح ہے۔

غیر مروجہ اوزان اگر بقاعدۂ عروض صحیح ہیں تو
ان میں موزوں کردہ شعر خواہ عظمت اللہ کا ہو یا کسی اور
کا وہ ہر طرح موزوں ہے۔ اس کو غلط نہیں کہا جا سکتا
یہ بات اور ہے کہ اس وزن میں دوسرے لوگ طبع آزمائی
کرتے ہیں یا نہیں۔

خلیل اور طوسی نے جتنے بھی زحافات ایجاد فرمائے
ہیں اور جس زحاف کو جس بحر یا جس رکن سے جس مقام کے
لئے مخصوص کیا ہے وہ ہر طرح ایک مشینی نظام کے تحت
اور ایسے مزاحف اوزان سے تقطیع ہونے والے ہر لفظ
کا آہنگ دوسرے لفظ کے آہنگ کی تکمیل کرتا ہے۔

بحر اور وزن کا تعین طرحی کلام۔ رُباعی۔ تضمین اور
مستزاد میں موضوعِ شعر سے پہلے موجود ہوتا ہے لیکن جہاں
موضوعِ شعر پہلے سے موجود ہوتا ہے وہاں بحر کا تعین شعر کی
تخلیق کے بعد ہی ہوتا ہے۔

الفاظ کے وزن کی ہیئت صرف اشباع۔ وصل یا
کسی حرف کو گرانے ہی کی صورت میں بدلتی ہے اور ارکان کی
ہیئت زحافات کے عمل کے بعد ہی تبدیل ہوتی ہے شعر

کی تقطیع کرتے وقت ہر مکتوبی حرف کو شمار میں نہیں لیا جاتا
بلکہ ملفوظی صورت ہی پر انحصار ہوتا ہے۔ تقطیع کرتے وقت
حروف ساکن اور متحرک کی ترتیب نہایت اہم ہے۔

اشباع۔ وصل۔ تخفیف۔ تسکین۔ تسبیغ۔ اسالہ اور
کسی حرف کو گرانے یا ساکن کرنے کی صورت صرف وہیں
جائز ہے جہاں اس کی اجازت ہے۔ اسی لئے ہمارا عروض
دوسری زبانوں کے عروض کے مقابلہ میں زیادہ جامع
ہے۔ تقطیع حقیقی اور غیر حقیقی سمجھنے کے لئے عروض سے
واقفیت کی ضرورت ہے۔

فاروقی صاحب کا یہ عروضی وزن (صفحہ ۲۲) " فاعلاتن
مفاعلن فع لن " املا کے اعتبار سے غلط ہے۔ اس کو اس کو
اس طرح لکھنا چاہئیے: " فاعلاتن مفاعِلُن فعْلُن " آخری رکن
" فعلن " کی اصل ہیئت فعِلُن بحرکت عین ہے۔ جو زحاف
تسکین کے عمل سے فعْلن، بسکونِ عین بن گیا ہے اور ایسا
کرنے سے شعر ناموزوں نہیں ہوتا۔

فاروقی صاحب نے اکثر مقامات پر " موکد اور غیر موکد "
الفاظ کی بحث چھیڑی ہے اور تاکیدی آہنگ کے تحت عروض
پر پیش کئے اشعار کے مصرعے چھوٹے بڑے بتائے ہیں یعنی
ان کے نزدیک بہ اعتبار تاکیدی آہنگ وہ مصرع ناموزوں ہیں۔
فاروقی صاحب کے خیال میں چونکہ خلیل کا عروض الفاظ کے آہنگ
کو جامد کرتا ہے اور اس میں موکد اور غیر موکد سالموں کی تنظیم کا
کوئی ایسا نمونہ نہیں ملتا ہے جس کی روشنی میں موزونیت کا معیار
وضع کیا جا سکے لہذا سراسر بیکار ہے۔

ہم کسی شخص پر اپنا عروض لادنا بھی نہیں چاہتے۔ لیکن جو
لوگوں سے جاپانی طرز کی موزونیت (عروض) کو صحیح قرار
دیتے ہیں یہ سمجھنے میں حق بجانب ضرور ہیں کہ وہ اپنے وضع
کردہ اصول کو اس طرح سمجھائیں کہ وہ ہماری سمجھ میں بھی
آ سکے۔ جس طرح خلیل نے عروض کا ایک مخصوص قاعدہ
سامنے رکھا۔ بحور کی تشکیل کی زحافات تراشے اور ان کو مستعمل
کرنے کا قاعدہ وضع کیا۔ اسی طرح اگر " الفاظ کے آہنگی
عروض " کا قاعدہ وضع کیا جائے گا تو ضرور قابلِ قبول ہوگا

بخلاف اس کے خواہ مخواہ کی بحث محض تقطیع اوقات کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اگر کسی شعر کا وزن کسی صاحب کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کی ذمہ داری ہرگز شاعر پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ لوگ اگر خواہ مخواہ ایک ہی بحر کے اچھے بھلے اشعار کو ناموزوں اور دوسری بحر کے شعر کہنا شروع کر دیں تو تخلیق کار شاعر کا کوئی قصور نہیں محض ان لوگوں کی ذہنیت ہے جن کی معلومات عروض کے معاملہ میں صفر کے برابر ہیں۔ اور ایسے لوگوں کے کسی فتوے کی کوئی قیمت نہیں۔

بعض اوقات نثر سے ایسے اشعار بھی موزوں ہو جاتے ہیں جو صنعت توشیح میں ہوتے ہیں اور شاعر کے تحت الشعور میں یہ بات نہیں ہوتی اگر ایسے اشعار کے متعلق کوئی صاحب دوسری بحر کا تعین کرتا ہے تو اس کے پاس عروضی جواز کا ہونا لازم ہے۔

ایک عروض ہی کیا کوئی بھی علم آسمانی نہیں اور ہر علم میں تبدیلیوں کی گنجائش ہے مگر کسی قاعدہ سے اور منظم ڈھنگ سے۔

فاروقی صاحب نے صفحہ ۱۴۱ پر مندرجہ ذیل خودساختہ چار مصرعے دیئے ہیں اور فرمایا ہے کہ کتابی عروض یعنی خلیل کے عروض کے اعتبار سے یہ سب مصرعے ناموزوں ہیں۔

۱۔ روشن گل پہ ہے کیا رنگ پھیلا
۲۔ رند پیالہ نوش پیے دو آتشہ
۳۔ لفظ وہی ایک ہے مطلب بہت بہت
۴۔ کیا رہم نے یہاں کیوں دل لگایا

ہم ان مصرعوں کو دیکھ کر حیران ہیں کہ فاروقی صاحب ایک طرف تو عروضی بحث چھیڑ رہے ہیں اور دوسری طرف اپنے عروضی دیوالیہ پن کا ثبوت دے رہے ہیں۔ چاروں مصرعے باعتبار بحور و زحافات صحیح بالکل درست ہیں۔

کسی کلام کو موزوں یا ناموزوں قرار دینے کے لئے قاعدہ عروض پر حتی الوسع اور جامع استدلال کی ضرورت ہے۔ ان مصرعوں کے اوزان مع زحافات ذیل میں دیکھیے۔

۱۔ روشن گل | پہ ہ کا | رنگ پھیلا — بحر مدید
فعلاتن (مخبون)، فعلن (مخبون)، فاعلاتن (سالم)

۲۔ رند پیالہ | نوش پی | نے دو آتشہ — بحر رجز
مفتعلن (مطوی)، فاعلن (مرفوع)، مفاعلن (مخبون)

۳۔ لفظ | وہی ایک | ہ مطلب | بہت بہت — بحر طویل
فعل (اثرم)، مفاعیل (مکفوف)، فعولن (مقبوض)، فاعلن (مقبوض)

۴۔ کیا رہم | نے یہاں | کو دل لگا | یا
مفاعلن (مخبون)، فاعلن (مرفوع)، مستفعلن (سالم)، فع (مقطوع محذوف)
یا
کیا رہم | نے یہاں | کو دل لگا | یا
مفاعلن (مخبون)، فعلن (مرفوع مخبون)، مستفعلن (سالم)، (مقطوع محذوف)
(بحر رجز)

زحاف خرم کا تعلق نہ کسی بحر سے ہے اور نہ کسی رکن سے۔ اس کے علاوہ اس پر زحاف کی تعریف بھی صادق نہیں آتی۔ یہ زحاف عرب کے دور جاہلیت کا منعقد ہے۔ خلیل نے تازیوں کے کچھ اشعار دیکھے جو کے شروع میں ایک سے چار حروف تک زائد تھے۔ جب یہ اشعار کسی بھی بحر میں غوطہ نہ کھا سکے تو خلیل اس زحاف کی ایجاد پر مجبور تھا۔ اب تو عرب والے بھی اس کو غیر طبع ترنم ہونے کے سبب استعمال نہیں کرتے (میں حیران ہوں کہ فاروقی صاحب یہ کہہ کر کہ کتابی جواز تو ہے ہی اس زحاف کو پھر سے استعمال کرنے کی سفارش فرما رہے ہیں۔ کتابی جواز کے پیش نظر تو تمام غلط اوزان کو جن سے عروض کی کتب بھری پڑی ہیں ماننا پڑے گا۔ اور یہ سراسر عروض کی گردن پر کلہاڑا چلانے کے مترادف ہوگا)

زحافات کی تنسیخ کا سوال۔ ایک خرم ہی پر کیا موقوف عروض میں اور بھی کئی زحاف ایسے ہیں جن کی قطعاً ضرورت نہیں اور بعض سبب شیطان کی آنت بنے ہوئے ہیں۔ جب آج کی شاعری کا کوئی پیمانہ ہی نہیں اور عروض سے انحراف ہی مقصود ہے تو چاہے کتنے ہی الفاظ گھٹائیں یا بڑھائیے

یا کہتے ہیں غیر حقیقی اوزان تراشیں کوئی نہ پوچھنے والا ہے اور نہ روکنے والا۔ لیکن بہتر یہ ہوگا کہ اس قسم کی بغاوت کسی قاعدے کے تحت ہی اختیار کی جائے یہ نہیں کہ کہیں عروض کا سہارا لے لیا جائے اور کہیں موکد اور غیر موکد الفاظ کی بحث چھیڑی جائے۔ جب تک اس ضمن میں کوئی ٹھوس قاعدہ تشکیل نہیں پائے گا ہر قسم کی بحث فضول اور بے معنی ہی رہے گی۔

جو زحاف جس بحر سے مخصوص ہیں وہ اسی بحر کی نظم میں آسانی سے استعمال کئے جا سکتے ہیں مگر سلیقہ شرط ہے۔ یہ نہیں کہ عروض و ضرب کا زحاف صدر و ابتدا میں اور صدر و ابتدا کا زحاف عروض و ضرب میں رکھ دیا جائے

اس قسم کی ترتیب کو جس کا ایک مصرع " فعولن فعولن فعَل " دوسرا مصرع " فعولن فعولن فعولن فعولن " تیسرا مصرع " فعولن فعولن فع فعولن " (جو کوئی وزن نہیں) اور چوتھا مصرع فعولن فَعَل فعولن (جو کوئی وزن نہیں) پر ہو اس کو ہرگز شعر نہیں کہا جا سکتا۔ اور اگر اس قسم کی ترتیب کو شعر کہا جائے گا تو ہر نثر کے ٹکڑے کرکے ہر ٹکڑے کو کسی نہ کسی رکن سالم یا مزاحف پر فٹ کیا جا سکتا ہے۔ نثر کی صورت بگاڑنے کا نام شاعری نہیں۔ شعر کے دونوں مصرع برابر کے ہونا ضروری ہیں عروض کا نظام بالکل ریاضی کے نظام کی طرح ہے جس طرح ایک پہاڑہ لکھتے یا پڑھتے وقت اس کی ترتیب ضروری ہے اسی طرح کسی بھی وزن میں مزاحف یا سالم ارکان کی ترتیب کا خیال رکھنا پڑے گا۔ اور اگر اس ترتیب سے انحراف کیا جائے گا تو محض چوں چوں کا مربہ ہی کہا جائے گا۔

عروض نے کہیں بھی اس قسم کی بے راہ روی کی اجازت نہیں دی۔ ہمارے عروض نے جہاں بھی اس قسم کے اشارے چھوڑے ہیں وہ عروض سے انحراف نہیں کیونکہ از روئے عروض اس قسم کی تبدیلیاں جائز ہیں اور مشینی نظام کے تحت ہیں۔

درحقیقت یہ سب بحث اس لئے ہے کہ آج کا جدید شاعر عروض میں دخل نہیں رکھتا اور وہ اس قسم کی باتیں کرنے پر مجبور ہے عروض یا وزن از روئے عروض جو درست ہے وہ بکثرت نظر آئے بلحاظ خال بالکل صحیح ہے۔

غالب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے یہ دو وزن دیئے ہیں۔

۱۔ مفاعلن فعِلاتن مفاعلن فعلاتن
۲۔ مُفتعِلن فاعلات مُفتعِلن فع

دونوں اوزان کا املا غلط ہے۔ پہلا وزن بحر مجتث سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا بحر منسرح سے املا یوں چاہئے۔

۱۔ مفاع لن فعِلاتن مفاع لن فعِلاتن
۲۔ مفتعِلن فاع لات مفتعِلن فع

اگر کوئی شاعر قاعدۂ عروض میں رہ کر نئے اوزان پر طبع آزمائی کرتا ہے تو یہ قدم مستحسن سمجھا جائے گا۔ مگر عروض سے انحراف کرتے ہوئے غیر حقیقی اوزان کو مستحسن سمجھ لینا ہرگز پسندیدہ نہیں۔ ہاں اگر کوئی ٹھوس عروضی جواز موجود ہے تو ہر قسم کی تکنیک پر غور کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ وزن ہی شعر کی مناسب ہیئت ہے اور وزن کے بغیر شعر عیب دار اور غیر تکمیلی رہ جاتا ہے۔ عروض تغیر و تنوع کا ہرگز مخالف نہیں اسی لئے مختلف قسم کی رعایتیں اس میں موجود ہیں۔ لیکن بے معنی انحراف اور تلون کاریوں کو ہرگز برداشت نہیں کرتا عروض پر اگر قاعدہ سے توجہ ہوگی تو مزید اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔ مگر غیر مدلل انحراف صرف تعبیر پرستی میں دھکیلنے کے علاوہ کوئی خاص جدت کا حامل نہیں ہوگا۔

پرانی روایتوں کے تعلق سے نئی جدت یعنی نئے اوزان کو برآمد کرنا ایک مستحسن قدم کہا جائے گا۔ اور اگر اسی جذبہ کے تحت قوانین عروض کا احترام کیا جا سکے گا تو عروض پر ایک بہت بڑا احسان ہوگا۔

من کہ مکتوب الیہ

گوپال متل
(مدیر تحریک دہلی)

شانِ ہند کے تازہ شمارے میں جناب کالیداس گپتا رضا کے بارے میں نثار احمد فاروقی صاحب کے اعتراض[1] کے بارے میں آپ کی تحریر اور رضا صاحب کے پاکستانی دوست کا خط میں نے پڑھا۔ آپ نے اسے ہندو ادیبوں کے خلاف مسلمانوں کی مخاصمت قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ صحیح نہیں نثار احمد فاروقی صاحب مسلمان ہیں لیکن جس پاکستانی کا خط آپ نے شائع کیا ہے وہ بھی تو مسلمان ہے آپ کی اطلاع[2] کے لئے عرض ہے کہ یہ مسلمان کالیداس گپتا رضا پر پی ایچ ڈی کے لئے تھیسس بھی لکھ رہا ہے۔ رضا صاحب نے چکبست پر ہی نہیں غالب پر بھی کام کیا ہے۔ اس کا اعتراف سب ہی نے کیا ہے۔ ہندوؤں نے بھی اور مسلمانوں نے بھی۔ علاوہ ازیں ملتی رہی ہے۔ پیسے کی انہیں ضرورت نہیں۔

یہ بات بھی صحیح نہیں کہ چکبست کی قدر افزائی نہیں ہوئی ممتاز مسلم ارباب علم نے جی کھول کر ان کے کلام اور ان کی تشریح کی تعریف کی ہے۔ اگر ان پر بار بار نہیں لکھا جا رہا ہے تو اس کی وجہ تعصب نہیں ہے۔ ان دنوں جتنے بھی جلسے اور تقاریب منعقد ہوتے ہیں اگر کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے جو چکبست کی سالگرہ ہر برس منانا چاہتے ہوں تو ضرور منائی جائے گی۔ اپنے طور پر اردو میں کچھ نہیں ہوتا۔

یہ صحیح نہیں کہ مسلمان ہندو ادیبوں کے خلاف مجموعی طور پر کوئی معاندانہ رویہ رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پذیرائی اور عدم پذیرائی کا سوال گروہ بندی کا ہے۔ جو شخص اپنے گرد گروہ جمع کر لے یا جس مرحوم شخصیت کے گرد گروہ جمع ہو جائے اس کا سلسل بول بالا ہوتا رہتا ہے۔ اور جن ادیبوں اور شاعروں کو یہ گروہ میسر نہیں آتا یا انہیں اس قسم کا گروہ پیدا کرنے کی فرصت نہیں ملتی ان کی شہرت دوسرے ادیبوں کے مقابلے میں ماند رہتی ہے۔ اگر شہرت یا عدم شہرت کا انحصار مذہب پر ہوتا تو زیادہ پذیرائی انہیں کی ہونی چاہئے تھی۔ غالب کی نہیں جو اپنے آپ کو نصف مسلمان کہتا تھا۔ پھر موجودہ دور میں جو شاعر سب سے زیادہ مشہور ہے وہ فراق ہے جو مسلمان نہیں ہندو ہے۔

کالیداس گپتا رضا صاحب کی خدمات کا اعتراف بھی کیجئے اور باقی ہندو شاعروں اور ادیبوں کی خدمات کا بھی لیکن ان میں سے اگر کسی کو زیادہ شہرت نہیں ملی تو ان میں فرقہ پرستی تلاش نہ کیجئے۔ اردو شعر و ادب اور صحافت سے میرا تعلق قریب قریب نصف صدی کا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بربنائے مذہب میرے ساتھ کبھی تعصب نہیں برتا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جتنا تعصب میرے ساتھ برتا گیا ہے وہ شاید ہی کسی اور کے ساتھ برتا گیا ہو۔ یہ تعصب گروہ بندی اور سیاست کی بنا پر تھا۔ اور جھوٹ کیوں بولوں میں نے بھی اپنے مخالفوں کو کبھی بخشا نہیں۔

● چندی گڑھ
۲۳ نومبر ۸۰ء

قابل صد احترام سرور صاحب　　　تسلیم

شانِ ہند کے ستمبر کے شمارے میں آپ نے مجھ سے

---

[1] اعتراض نہیں بہتان کہئے۔　　[2] یہ اطلاع بھی غالباً آپ کو نثار احمد فاروقی صاحب نے دی ہے جو قطعاً غلط ہے۔

اختلافات کا اظہار کیا ہے جس سے میرے دل میں آپ کی توقیر میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ آپ نے سردار دیوان سنگھ مفتون اور آغا شورش کاشمیری کی روایات کو تازہ کر دیا ہے کہ راہِ حق میں دوستوں اور عزیزوں کے لئے بھی رعایت کی گنجائش نہیں ہے اور انصاف کی تلوار کی طرح صحافت کی دو دھاری تلوار جب چلتی ہے تو نہیں دیکھتی کہ گلا اپنوں کا کٹتا ہے یا پرایوں کا۔ آپ مردِ صف شکن ہیں۔ آپ نے ہمیشہ قلم سے شمشیرِ بے نیام کا کام لیا ہے اور لشکرِ غنیم کا اس شجاعت کے ساتھ مقابلہ کیا ہے کہ وقت کے نمرود اور شداد زیر ہو کر گر پڑے ہیں۔

مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا ہے کیوں کہ جو کچھ آپ نے لکھا وہ آپ کا حق ہے اور مجھ پر تو یہ حق آپ کو ہمیشہ حاصل رہے گا۔ استاد اور مرشد کے سامنے زبان کھولنا دلائل پیش کرنا یا براہین میں الجھنا میرے نزدیک سعادت مندی کی دلیل نہیں ہے۔ فرمانبرداری کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے میں جانتا ہوں کہ آپ کا دل شیشے کے مانند صاف ہے۔ آپ نے جناب سلامت علی مہدی کے سخت خلاف لکھا لیکن ان کی علالت کے دنوں میں آپ سے ملا تو آپ ان کے لئے فکر مند تھے۔ آپ نے انجمن ترقی اردو ہند کی بعض پالیسیوں کے خلاف کئی اداریے تحریر فرمائے لیکن مجھے علم ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب سے آپ کے مراسم دوستانہ ہی نہیں برادرانہ ہیں۔ آپ نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پر کبھی تنقید کی لیکن پھر بھی آپ ان کے اور وہ آپ کے بہت قریب ہیں۔ نظریاتی اختلافات کو آپ ذاتی تعلقات میں حائل نہیں ہونے دیتے۔ ۳۱ برس کی طویل رفاقت میں آپ میرے لئے لعل شب تاب ہی ثابت ہوئے۔ آپ کی مسلسل کرم فرمائیوں کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے فخر محسوس ہوتا ہے۔ آپ کی نیک خواہشات کے طفیل میں زندگی کی تاریک راہوں میں بھٹکنے سے بچ جاتا ہوں۔ لیل و نہار کی کوئی گردش آپ کے تئیں میری بندگی اور عقیدت میں فرق نہیں ڈال سکتی۔

میں عمر میں آپ سے چھوٹا ہوں۔ میرا حق آپ کو دعا دینا ہے کہا ہے پھر بھی میری دعا ہے کہ خدا آپ کو چاند ستاروں سے لمبی عمر دے کہ آپ مظلوموں کی زبان غریب سہاروں کے دل کی دھڑکن اور محروموں کے گھر کا چراغ ہیں۔ آج اردو کے کتنے صحافی ہیں جو اتنی جرأت اور بے باکی کے ساتھ لکھتے ہیں؟ واقعی آپ آزاد صحافت کی آبرو ہیں۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

خاکسار

وشوا ناتھ طاؤس

غزل

شاہد رتلامی

یہ ترک محبت کا امتحان لگتا ہے
مجھ سے میرا سایہ بھی بدگمان لگتا ہے

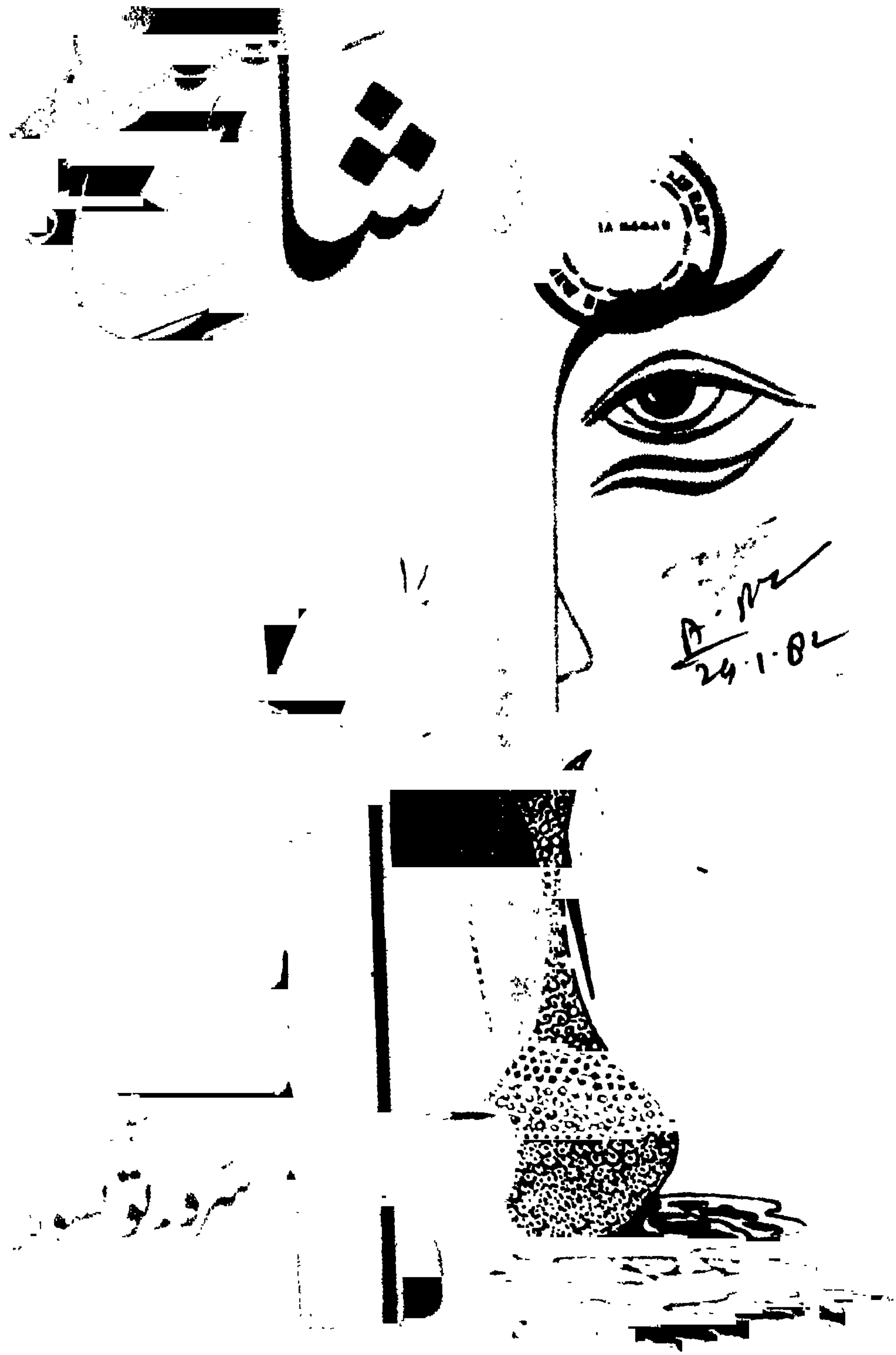
گردش زمانہ کی دھوپ بھی مجھے اب تو
سر پہ تیری یادوں کا سائبان لگتا ہے

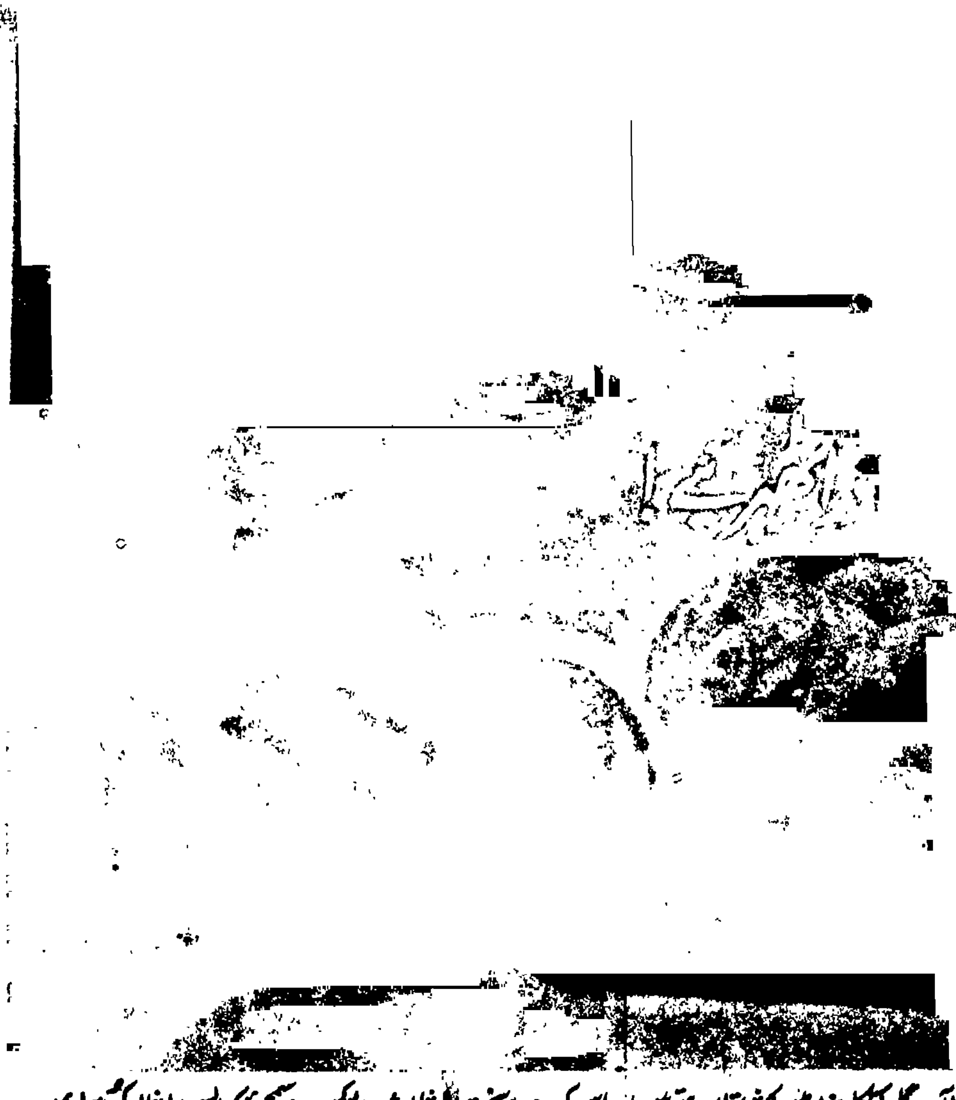
زندگی ترستی ہے کھل کے سانس لینے کو
آج قبر کے مانند ہر مکان لگتا ہے

یہ ترک محبت میں کونسا مقام آیا
مبتلائے غم مجھ کو کل جہان لگتا ہے

وہ بچھڑ گیا مجھ سے پر یہی یوں لگے جیسے
اس زمیں سے وابستہ آسمان لگتا ہے

شعر کے یوں سلیقے کیف و غزل ہر شاہد
لفظ لفظ ہستی کا ترجمان لگتا ہے


24.1.82



ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ — رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷ — رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۴۰/۳۷

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
(فیاض گوالیاری)

ایڈیٹر
سرور تونسوی

شانِ ہند نئی دہلی

زرِ سالانہ ۱۵/- روپے
فی پرچہ ۱/۵۰ روپے

جلد نمبر ۴۲ | دسمبر ۱۹۸۱ء | شمارہ نمبر ۱۲

دیا پرکاش سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو گرافک نجات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی میں چھپوائے اور سرورق ایلٹ پریس سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند، فلیٹ نمبر ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

اُردو کے حرام خور دانشور: عام طور پر اُردو پرستوں کی طرف سے خطوط میں یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ اُردو کے جو دانشور اُردو کی بقا و حیات کے لئے بظاہر کوشاں ہیں اور اپنی تقریروں اور تحریروں میں دعوے کرتے ہیں کہ ہم اُردو کے لئے جان دے دیں گے۔ کیا واقعی یہ حضرات اُردو کے لئے ایسا قدم اُٹھا سکتے ہیں؟ یعنی اگر اُردو کی بقا و حیات کے لئے جان دینے تک کی نوبت آئے تو آپ کے خیال میں یہ حضرات اس امتحان میں پورے اُتریں گے؟

اب آپ ایک سچا واقعہ بھی سُن لیجئے جس کے راوی شمع گروپ کے بانی الحاج حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی ہیں۔ آپ کا فرمان ہے کہ عرصہ ہوا ایک بستی نظام کی ایک مسجد کے لئے "امام مسجد" کی خدمات انجام دینے کے لئے ایک نوجوان نے اس یقین دہانی کے ساتھ درخواست کی کہ وہ اپنی ڈیوٹی پوری ایمانداری سے نبھائے گا اور مسجد کی صفائی وغیرہ کو اولین توجہ دے گا۔ چنانچہ اس نوجوان کو مسجد کی امامت کے لئے تنخواہ پر رکھ لیا گیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے قول کے مطابق نہایت ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا اور مسجد کو وہ اس قدر صاف شفاف رکھتا تھا کہ اس کی تعریف کئے بغیر نہ بنتی تھی۔ یہ نوجوان مسجد کے آس پاس چار پانچ گھروں سے حسب ضرورت ایک ایک روٹی گھر لاتا اور ضرورت سے زیادہ نہیں لیتا تھا۔

اس نوجوان کے وطن کے ایک دیندار غائب درزی کی دوکان بھی مسجد کے قریب ہی تھی اور یہ نوجوان فرصت کے وقت اس دوکان پر آجاتا اور ادھر اُدھر کی باتوں میں اپنا وقت کاٹ لیتا۔ ایک دن درزی نے اس نوجوان سے کہا کہ بھائی جہاں تو اپنے لئے چار پانچ روٹیاں گھروں سے لاتا ہے ہمارے لئے بھی کچھ روٹیاں لے آیا کرو تو ہم از خود روٹی پکانے سے بچ جائیں۔

اس نوجوان نے جواب میں کہا کہ بھائی روٹیاں تو میں تمہیں ہر روز جتنی چاہو مانگ کر لادوں گا مگر میرے بھائی ان روٹیوں کے کھانے کے بعد یہ جو تم کام دھندا کر رہے ہو یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ کیوں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ جس دن سے میں نے یہ خیرات کی روٹیاں کھانی شروع کی ہیں رفتہ رفتہ اپنی جملہ صلاحیتوں کو کھو بیٹھا اور اب مجھ سے مسجد کی صفائی تک نہیں ہوتی۔ اور کچھ ہی دنوں میں یہ نوجوان مسجد کی امامت کو خیر باد کہہ کر چلا گیا۔

تو حضور اس ایک مثال سے ہی آپ کو اپنے اس سوال کا جواب مل گیا ہوگا کہ حکومت کی طرف سے پھینکے ہوئے لقمہ ہائے تر جن اُردو دانشوروں کے پیٹ میں گئے ہیں۔ ان سے آپ ایسی اُمید ہرگز نہ رکھئے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ان کتابوں پر انعامات کی بارش کی جاتی ہے جنہیں بازار میں کوئی خریدتا ہی نہیں۔ جس قدر کلام مہمل اور اسقام سے پُر ہوگا اس پر اتنا ہی زیادہ انعام دیا جائے گا۔ اندھا بانٹے ریوڑیاں اور اپنوں کو ہی دے والا معاملہ ہے۔ بھائی بھتیجہ واد۔ دوستوں کی سفارشات۔ خاندانی دباؤ۔ کئی ایسے ادیب ہیں جو سرکاری نوکری اور اُردو کے سرگرم کارکنوں کے پیٹ میں سرکاری لقمہ پہنچا تو ان کی غیرت ختم ہوگئی۔ تمام دانشوری بھول کر انعام کے سلاموں میں لگ گئے اور مبارک بادیں بٹنے لگیں اور بے چاری اُردو بے یار و مددگار ہو کر رہ گئی۔ لیجئے ان حرام خور دانشوروں کو بھی دیکھ لیجئے۔

اس لئے آپ اردو کے حرام خور دانش وروں (جن کو دانش ور کہتے اور لکھتے ہوئے دانشوری کی بھی توہین ہوتی ہے) پر قطعاً یقین نہ کیجئے۔ اور یہ سمجھ لیجئے کہ اردو کے جس بھی دانشور کے پیٹ میں سرکاری لقمہ یا تر کا اگر ایک بھی نوالہ گیا ہے وہ اردو کے لئے کچھ نہ کر سکے گا۔

اُتر پردیش میں اردو کو ثانوی زبان کا درجہ

غیر مسلم اردو رائٹرز کانفرنس لکھنؤ میں جب بہار کے وزیر اعلیٰ جناب جگن ناتھ مشرا نے بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیئے جانے کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی تو اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں یہ وعدہ فرمایا تھا کہ یو۔ پی میں بھی اردو کو دوسری زبان اس سال کے آخر تک قرار دے دیا جائے گا۔ ویسے جو کچھ ہمارے ہمسایہ صوبہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کے بعد اردو کے لئے جو مراعات دی جا رہی ہیں وہ تو ہمارے صوبہ میں اس وقت بھی ہیں۔ یہ وعدہ وزیر اعلا اتر پردیش نے اسی روز انجمن ترقی اردو کے استقبالیہ اور میرا اکاڈمی کے جلسۂ تقسیم انعامات میں بھی دہرایا تھا اور اس کے بعد انھوں نے کئی جلسوں میں اس وعدہ کی تجدید بھی فرمائی۔

ہمارے پاس وزیر اعلیٰ یو پی کی ان تقاریر کا ٹیپ موجود ہے انھوں نے ہر بار یہی کہا کہ اردو کو اتر پردیش کی دوسری زبان قرار دیا جائیگا۔ "دوسری سرکاری زبان" نہیں کہا۔

جیسا کہ شانِ ہند میں کئی بار ادارتی کالموں میں لکھا گیا ہے کہ اتر پردیش کے وزیر اعلےٰ کی کئی دشواریاں انھیں اپنا یہ وعدہ پورا کرنے میں آڑے آ رہی ہیں۔ اور ان دشواریوں میں سب سے زیادہ اڑچن اُن کی پارٹی بلکہ اُن کی کابینہ کے کچھ ممبر ہیں جو اس امر کی مخالفت کر رہے ہیں کہ اردو کو یہ مقام دیا جائے۔ حالانکہ یہ ممبران کانگریس (آئی) کے اس منشور کے طفیل ہی منتخب ہوئے تھے جس میں اردو کا یہ حق تسلیم کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا وزیر اعلےٰ اتر پردیش اپنی پارٹی کی اندرونی گروہ بندی کے باعث کافی پریشان تھے۔

شانِ ہند میں غیر مسلم اردو رائٹرز کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال لکھتے وقت یہ بھی یقین سے کہا گیا تھا۔ کہ جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ اگر اپنے اس وعدہ کو پورا نہ کر سکے تو یقیناً وہ وزارت اعلےٰ سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ کیوں کہ ان میں سیاسی حرام زدگیوں کی بجائے قول و فعل میں یگانگت اور شرافت نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔

لہٰذا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کو اتر پردیش کابینہ نے اس ریاست میں اردو کو دوسری زبان کی حیثیت میں مخصوص طور پر منظوری دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اردو والے احساسِ کمتری کا اس درجہ شکار ہیں کہ اس اعلان سے دو دن پہلے سنبھل اردو کانفرنس میں جو حضرات یہ کہہ رہے تھے کہ اگر اردو کو یہ درجہ نہ دیا گیا تو وہ سخت قدم اٹھائیں گے وہی حضرات وزیر اعلےٰ اتر پردیش کو مبارک باد کے تار دے رہے ہیں۔ اور پھر چار دنوں بعد جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ اس اعلان کے مطابق کچھ ہی اضلاع میں اردو کو یہ مقام حاصل ہوا ہے یا دوسری سرکاری زبان کی بجائے "دوسری زبان" کہا گیا ہے تو پھر ان حضرات نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔

ہم اردو دوستوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اتر پردیش کابینہ کے اس اعلانیہ کے الفاظ پر نہ جائیں اور نہ ہی اس فیصلے کو غیر تشفی بخش قرار دیں۔ ہم سب کو وزیر اعلےٰ اتر پردیش کا ساتھ دینا چاہئے نہ کہ ان کے لئے مشکلات پیدا کرنی چاہئیں ہمیں سرکار اور کانگریس (آئی) کے مقصد اور منشا نیز موجودہ فضا کو بھی اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔ اور جو کچھ دیئے جانے کا اعلان کیا گیا ہے اس پر پوری طرح عمل کرانا چاہئے اور جو کچھ نہیں ملا اس کے لئے مطالبہ جاری رکھئے۔

اردو کو محض مسلمانوں کی زبان نہ سمجھئے اور نہ سمجھئے

اگر آپ نے اس زاویۂ نظر کو تسلیم کرلیا تو یاد رکھئے ایسا کرنے والوں کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اور اردو اپنے ان دشمنوں کو کبھی معاف نہ کرے گی جو کسی بھی ایسی سرکاری یا غیر سرکاری تحریک کا ساتھ دیں گے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ حکومت کی طرف سے لقمہ ہائے تر پھینکے جانے پر جھولیاں کھولنے والوں کی بکواس پر مت جائیے کیونکہ یہ ذاتی مفاد کی خاطر اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان تسلیم کرنے اور کرانے کا خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں۔

اس لئے مت بھولئے کہ اب بہت سے ہندی والے بھی یہ مانتے ہیں اور برسرِ عام کہتے ہیں کہ اردو اس ملک کی زبان اور تہذیبی ورثہ ہے جس کو بچانے اور بڑھانے سے ہندوستانی تہذیب کی ترقی ہوگی۔ اس نظریہ کو وسعت دینے میں کوشاں رہئے اور اردو کو مسلمانوں کی زبان کی بجائے ہم سب کی زبان کہئے۔ پھر دیکھئے اردو کے لئے سب دروازے کس سرعت کے ساتھ کھلتے جائیں گے۔

پنجاب سندھ بینک کے نئے چیرمین

پنجاب سندھ بینک کے چیرمین ڈاکٹر اندرجیت سنگھ ۲۳ سال کی قابلِ رشک اور قابلِ تعریف خدمات کے بعد اپنے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوگئے۔ ملک کی معاشی حالی اور کمزور طبقوں کی امداد کے لئے اس بینک نے جو عملی تعاون دیا اس کی تعریف بینک کے دشمنوں نے بھی کی۔ پچھلے بیس برسوں میں اس بنک کی ترقی کی نمایاں کارکردگی کا ہی یہ ثبوت ہے کہ جہاں اس بنک کی شاخوں کی تعداد بارہ سے بڑھ کر پانچ صد اکہتر (۵۷۱) ہوگئی ہے وہاں اس کا سرمایہ بھی ایک کروڑ ۸۸ لاکھ سے بڑھ کر اب ۴۰ کروڑ روپے ہوگیا ہے۔

ہم دل کی گہرائیوں سے جناب ڈاکٹر اندرجیت سنگھ کو عزت و احترام اور اعلیٰ کارکردگی کے بعد اپنے عہدہ سے ریٹائر ہونے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اب بینک کے نئے چیرمین جناب ایس مہندر سنگھ نے چارج سنبھال لیا ہے۔ بینکنگ کی دنیا میں جو چند ہستیاں ماہرین کا درجہ رکھتی ہیں جناب مہندر سنگھ کا شمار ان میں ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ جناب مہندر سنگھ اپنے پیش رو کی طرح اس بینک کو ایک مثالی بینک بنائیں گے۔ اور اس کی ترقی میں اضافہ ہوگا۔

"پھر وہی ہنگامہ"
نیو ایریا پر دوردرشن کا مایوس کن پروگرام

دوردرشن پر بار بار اعلان کیا جارہا تھا کہ "پھر وہی ہنگامہ" دیکھئے۔ چنانچہ وقتِ مقررہ پر سب سے پہلے ایک چلبلی مٹکتی اناؤنسر بغیر کسی تعارف کے دندنانے لگیں جنہیں نہ معلوم اپنے آپ پر حسین ہونے کا گمان کس غلط فہمی کی بنا پر تھا۔ حالانکہ دوردرشن دہلی پر کچھ ایسی لیڈی اناؤنسرز ہیں جن پر دوردرشن فخر کرسکتا ہے۔ پھر دامنی اشوک کمار سے لگاتار پرانی فلموں کے تین گانے گوائے گئے۔ جس سے ان کا سانس پھولنے لگا۔ حالانکہ ان سے صرف ایک ہی گانا جھک جھک والا گوایا جاتا تو نہ صرف دادا منی کو ہوکنا پڑتا بلکہ ان کا آئٹم خوشگوار رہتا۔ صبا افغانی کا کلام "میرے محبوب نہ جا" جانی بابو قوال نے سنایا۔ جیسے کئی بار سنا ہوا ہے اور اس بار جانی بابو پہلے جیسی دلنوازی نہ دکھا سکے۔ پھر رہی سہی کسر رام رکھ منہر کے پرانے اور بوسیدہ بلکہ بدبودار لطیفوں نے پوری کردی۔ اور اس پر انہوں نے اپنا کلام سنا کر مزید بے لطفی میں اضافہ فرمایا۔ دالنجے رام نے تین ملکوں کے گانے گاکر حق ادا کردیا۔ خصوصاً "پیا سے ملن کیسے جاؤں گوری" انہوں نے بہت اچھا گایا۔ پھر سلم ارمان والی اوشا اتھپ نے ڈسکو گانا "چھپ کے کون آیا ہے" گایا۔ حالانکہ وہ لندن میں رہا ہو رہا ہے گا کر خاصی شہرت پاچکی ہیں مگر یہاں پھسپھسی رہیں۔ پھر سریندر شرما آئے اور انہوں نے کالو (کالو) نام کی کویتا سنائی جو پہلے دوردرشن پیش کرچکا ہے نظم اچھی مزاحیہ ہے مگر نیو ایریا پر باسی پروگرام پیش کرنا

سی تعریف کا حامل نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک قیامت آگ سے کھیلتی ہوئی نمودار ہوئیں۔ جو کبھی اپنی سیمیں جسم کے حصوں کو آگ میں جھلساتیں تو کبھی آگ کو چاٹتیں۔ اس کے بعد سنیل دت نے نئے سال کی مبارک باد دیتے ہوئے پنجاب کے ایک جاٹ کو فینسی ڈریس میں پیش کیا اور حاضرین سے پوچھا کہ انھیں پہچانئے۔ یہ پارلیمنٹ کے اسپیکر جناب بلرام جاکھڑ تھے۔ پھر مینا کماری کو پیش کیا جو کرن بیدی ڈپٹی کمشنر پولیس نکلیں۔ ان کا میک اپ واقعی قابل تعریف تھا۔ پھر جنوبی ہند کے ایک صاحب فرضی نام کے سُبرامنیم نمودار ہوئے جو سونل مان سنگھ تھے۔ پھر جوگا ڈاکو کے بھیس میں سردار ہنونت سنگھ اور فنا در کرسمس کے روپ میں ہر ہنس رسنا تھ جیٹو یاد آگئے۔ پھر پھول سونگھتے ہوئے جب اٹھیر آئے جو حکومت ہند کے وزیر نشریات و اطلاعات وسنت ساٹھے تھے۔ یہ آئٹم نئی تھی اور بہت اچھی تھی۔ خدا خدا کر کے منا منگیشکر آئیں اور نام نہ جانے دعام نہ جانے گا کا نا انتہائی بیدلی سے گا کر چلی گئیں۔ بھوپندر نے فلم موسم کا گانا دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن۔ اور فلم آخری خط کا گانا۔ رُت جواں گایا جنہیں فلموں کے علاوہ ریڈیو پر ہزاروں بار سنا ہوا تھا۔ اس کے بعد انتہائی لچر اور بے ہنگم پروگرام اوسیا پیش کیا گیا جسے کچھ غیر ملکی اداکار عجیب و غریب ڈراونی شکلوں یا میک اپ سے کر رہے تھے۔ یہ ۲۵ منٹ کا پروگرام ایسا تھا کہ دیکھنے والوں کو کئی دنوں تک خواب میں بھی یہ ڈراونی شکلیں نظر آتی رہی ہوں گی۔ ہاں ان بیرونی کلاکاروں نے رگھوپتی راگھو راجہ رام اور کیرتن کر کے نئے سال کا آغاز بھگوان کے نام سے کیا خواہ وہ بھدے سروں میں ہی تھا۔

یہ سارا پروگرام بہ حیثیت مجموعی انتہائی مایوس کن رہا کاش کہ دوردرشن کے ذمہ دار حکام کو اسی کا احساس ہوتا کہ عوام ان سے اس پروگرام کے بارے میں بہت اچھی توقعات لگائے ہوئے تھے۔

شانِ ہند کے زرِ سالانہ میں اضافہ

کاغذ کی گرانی اپنی حدیں پار کر چکی ہے۔ کاتبوں کی اُجرت میں بھی گرانی کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی نہیں بلکہ دوگنا زائد ہو رہی ہے۔ طباعت کا بھی یہی حال ہے کہ بائنڈر سلام کا جواب تک نہیں دیتے۔ ان حالات میں رسائل و جرائد کی قیمتیں کئی بار بڑھ چکی ہیں مگر شانِ ہند ایک طویل عرصہ سے ان حالات کا مقابلہ کر رہا تھا اور ہماری خواہش اب بھی یہی ہے کہ شانِ ہند کی قیمت نہ بڑھائی۔ مگر گزشتہ دو تین ماہ میں کتابت کی اُجرت میں ڈیوڑھا۔ چھپائی میں سوایا اضافہ ہو چکا ہے اور کاغذ کے نرخ میں تو ہر صبح اضافہ ہونا روزمرہ بن کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ اب ہمارے لئے بھی ناگزیر ہو گیا ہے کہ شانِ ہند کی قیمت میں معمولی سا اضافہ کیا جائے اور ہم جو اضافہ کر رہے ہیں وہ روز بروز بڑھتی ہوئی گرانی کے مقابلہ میں کچھ بھی وقعت نہیں رکھتا۔ تاہم اسے اضافہ تو کہا ہی جائیگا۔

اب شانِ ہند کا زرِ سالانہ جنوری کی اشاعت سے اٹھارہ روپیہ اور ایک پرچے کی قیمت دو روپیہ ہوگی۔ امید ہے کہ آپ اسے بخوشی قبول فرمائیں گے۔

فن و شخصیت کا فیض احمد فیض نمبر

فن و شخصیت کے آپ بیتی۔ غزل۔ کملیشور، مہندر ناتھ اور جاں نثار اختر نمبروں کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ اُردو حلقوں سے پوشیدہ نہیں۔ حال ہی میں فن و شخصیت کا فیض احمد فیض نمبر شائع ہوا ہے۔ جو اپنی افادیت۔ نوعیت اور مستند حیثیت کے لحاظ سے ویسا ہی ایک یادگاری خاص نمبر ہے جیسی کہ فن و شخصیت کے خاص نمبروں کی روایات ہیں۔ فیض نمبر کی سول ایجنسی دہلی کیلئے ماہنامہ شانِ ہند کے پاس ہے۔ لہٰذا اپنی پہلی فرصت میں فیض نمبر حاصل کر کے اپنی ذاتی لائبریریوں میں اس یادگاری خاص نمبر کا اضافہ کیجئے۔ فیض نمبر کی قیمت ستر روپیہ ہے۔ اور رجسٹری محصول ڈاک چار روپے پچاسی پیسے۔

سرور تونسوی

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے
سامنے پہلی بار حاضری دی تو روضۂ مبارک کی جالیوں کے
ر جہاں خواتین کھڑی اپنی عقیدت کا اظہار نہایت خضوع
خوع سے کر رہی تھیں، سیاہ برقعے سے دو ہاتھ دُعا مانگتے ہوئے
آئے۔ ہاتھ کیا تھے جیسے صانع قدرت نے اپنی تمام کاریگری
کر کے رکھ دی ہو۔ میں نے اپنی عمر میں کسی عورت کے ایسے خوبصورت
ڈ اور مخروطی انگلیاں نہیں دیکھی تھیں۔ قتیل شفائی نے اپنے
شعر میں محبوبہ کے جسم کو سونے کا جسم لکھا ہے۔ خدا جانے
ل شفائی کی محبوبہ یا مفروضہ کا جسم سونے کا تھا نہیں مگر
اکے لیے اُٹھے ہوئے ہاتھ سونے کو بھی شرما رہے تھے۔

اس وقت میری عمر ۳۵ سال کی تھی۔ آجکل تو اس عمر
پہنچتے پہنچتے لوگ اپنی جوانی کا نوحہ پڑھتے نظر آتے ہیں مگر
رے دَور کے اس وقت میں اس عمر میں جوانی کو اصل جوانی
نا جاتا تھا۔ لہذا عمر کا تقاضا نیز فطری طور پر حُسن پرست
تھے ہی چنانچہ دل ہی میں سوچا کہ جس کے ہاتھ ایسے جان لیوا ہیں
ن کا رُخِ روشن کیسا ہوگا۔ چنانچہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اندازہ
نا لیا کہ اگر فلاں جگہ جا کر کھڑے ہو جائیں تو وہاں سے
شعلۂ جوالا کا رُخِ انور صاف نظر آنے لگے گا۔ چنانچہ اپنے
یہ پلان کے تحت بیوی سے کہا آئیے اُدھر کھڑے ہوتے ہیں

چنانچہ شوقِ نظارہ میں دل کی بے تابی کو چھپائے جونہی
ماں کشاں اس مینارہ نور کو دیکھنے کے لئے قدم اُٹھایا
مور پنکھوں کی تیلیوں سے بنے ہوئے جھاڑو سے صحن کو صاف
رتے ہوئے جاروب کش کی بے خیالی سے جھاڑو کی ایک تیلی
ہیں آنکھ میں ایسی لگی جیسے آنکھ کا ڈیلا ابھی باہر نکل آئے گا۔ اور
ب دونوں ہاتھوں سے آنکھ کو دباتے ہوئے درد سے بیحال
بیٹھ گیا۔ بیوی نے سراسیمگی کے عالم میں پوچھا کیا ہوا!
کے کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟ جب آدھ پون گھنٹے
میں ہوش سنبھلے اور آنکھ کے درد میں کچھ کمی ہوئی تو آنکھ کو
جھپک کر اندازہ لگایا کہ بینائی باقی ہے یا نہیں؟ آنکھ سے
پانی بہہ رہا تھا مگر نظر آ رہا تھا۔ بیوی تھامتے ہوئے جب
قیام گاہ پر لے گئی تو قبلہ صولت صاحب فرمانے لگے یا اللہ خیر کیا
بات ہے بیٹی سرور نے آنکھ پر رومال کیوں رکھا ہوا ہے اور
اس کے ہوش کیوں گم ہیں۔ بیوی نے جو ظاہری معاملہ
اُسے معلوم ہوا تھا کہہ سُنایا۔ مگر رات کو جب حالت
کافی سُدھر چکی تھی تو میں نے بیوی کی موجودگی میں قبلہ
صولت صاحب سے سارا واقعہ من و عن کہہ سُنایا تو صولت
صاحب قہقہے پر قہقہے لگانے لگے۔ اور بیوی کہنے لگی اچھا
تو اصل بات یہ تھی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا تو وہیں بیٹھے رہنے
دیتی۔ آنکھ میں چھ ماہ تک درد کی کسک رہی مگر یہ ایک حقیقت
ہے کہ وہ مینارۂ نور، دل و دماغ سے ایسا محو ہوا کہ پھر کبھی
اس کا خیال تک نہیں آیا۔

اس واقعہ کو قریباً تیس سال ہوگئے اجمیر شریف
کئی بار حاضری کا شرف حاصل ہوا اور ہر بار میرا سر ندامت
سے جُھک جُھک گیا اور میں نے ہر بار غریب نواز سے
دست بستہ معافی چاہی ہے۔ اور کھلے بندوں یہ
اعتراف بھی اسی لیے ہے کہ خدا اور حضرت غریب نوازؒ
میرے اس قصور کو معاف کر دیں۔

میرے کرم فرما اور حبیب لبیب اندر ناتھ ماہوترہ
(مرحوم) سلزا بورڈ ملز رتلام کے جنرل منیجر تھے۔ ان کی چھوٹی
صاحبزادی شیل کو شادی کے دس سال بعد بھی
کوئی اولاد نہ ہوئی تو لڑکی کے سسرال کی بے چینی بیٹی کے

والدین کے لئے سوہانِ روح بن گئی۔ لڑکی کے سسرال نے طبی طور پر لڑکی کے بارے میں ہر ممکن تحقیق اور تشخیص کرائی جو سو فیصد لڑکی کے حق میں تھی اور ہر طبی رپورٹ اس کی مظہر تھی کہ لڑکی میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے۔

ملہوترہ صاحب نے اپنے داماد کو (جو کہ دہلی میں محکمہ بجلی میں اچھے عہدہ پر تھے اور آج کل ہندوستان سے باہر ہیں) کو ترغیب دی کہ وہ کچھ روز چھٹی لے کر رتلام میں رہیں اور شبِ مالوہ کا لطف اٹھائیں۔ چنانچہ سسر کے اصرار پر داماد نے ایک ماہ کی رخصت لی اور اپنی بیوی کے ساتھ رتلام میں سسرال کی مہمانی میں خوب لطف اٹھایا

دراصل ملہوترہ صاحب کا درپردہ داماد کو رتلام میں کچھ دنوں مہمان رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے دوست سول سرجن رتلام سے داماد کا معائنہ کرا سکیں کہ آیا ان میں تو کچھ نقص نہیں ہے کیونکہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لڑکے والے لڑکی میں ہی کیڑے نکالتے رہتے ہیں حالانکہ ان کا لختِ جگر ہی اصل قصوروار ہوتا ہے۔

ملہوترہ صاحب نے رتلام کے سول سرجن کو سکھا رکھا تھا کہ وہ از خود ایسا انتظام کریں کہ ان کا داماد جملہ تحقیق و تشخیص کے مراحل سے خوشی خوشی اس طرح گزر جائے کہ اس کی دانست میں جیسے ملہوترہ صاحب کو کچھ علم ہی نہیں۔ اور ہوا بھی ایسا کہ کلب میں دو چار دنوں میں ہی سول سرجن صاحب نے گلاسوں کی کھنک میں ملہوترہ صاحب کے داماد سے اچھے خاصے دوستانہ تعلقات بنالئے۔ سول سرجن نے ملہوترہ صاحب کی فیملی کو کھانے پر گھر بلایا تو دوسرے دن ملہوترہ صاحب نے سول سرجن کی فیملی کو گھر پر کھانے پر بلایا۔ اور باتوں باتوں میں سول سرجن نے مہمان سے براہِ راست یہ سوال کر دیا کہ فیملی پلاننگ ایک آدھ بچے کی پیدائش کے بعد کی ہوتی مگر آپ نے تو شروع میں اس پر عمل پیرا ہو کر کمال کر دیا اور دس سال تک بچہ نہ ہونے دیا۔ ملہوترہ صاحب کی بیوی نے لقمہ دیا کہ ڈاکٹر صاحب ہم تو ہماری تو سمبندھن اور سمبندھی بھی ترس رہے ہیں کہ شیل کی گود ہری ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے حیران سے پوچھا کہ تو پھر اڑچن کیا ہے۔ اس کے جواب میں ملہوترہ صاحب کی بیوی نے اپنی لڑکی کی تشخیص کے بارے میں مفصل روداد سنائی جس پر ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے یہ معمولی بات ہے بچہ ہو سکتا ہے۔

شراب میں لاکھ عیب سہی مگر پینے والوں میں دوستی اور رازداری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے چار پانچ دنوں کے بعد ہی ملہوترہ صاحب سے کہا کہ آپ کا داماد بالکل ٹھیک ہے میں نے ہر طرح سے اس کا معائنہ کر لیا ہے۔

ملہوترہ صاحب کی بیٹی اور داماد کے اعزاز میں جناب اکبر علی (رئیس و ممبر میونسپل کمیٹی رتلام) نے اپنے گھر پر دعوت دی اور باتوں باتوں میں انھوں نے فرمایا کہ ملہوترہ صاحب آپ شیل اور اس کے شوہر کو اجمیر شریف غریب نوازؒ کی درگاہ پر لے جائیے اور وہاں اُن کے ہاں اولاد ہونے کی منت مانگئے۔ دیکھئے خدا کیا دکھاتا ہے۔

ملہوترہ صاحب بڑے ہی فعال اور دُھن کے پکے تھے۔ کہنے لگے اکبر علی صاحب صبح ہی اجمیر شریف چلنا ہے اور بذریعہ کار چلنا ہے اور آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ چنانچہ اکبر علی صاحب کی قیادت میں یہ قافلہ اجمیر پہنچا اور اکبر علی صاحب نے حضرت غریب نوازؒ کے مزارِ مبارک پر اُن سے منت منوائی۔

کرنا خدا کا دس ماہ بعد ہی شیل کو چاند سی بیٹی پیدا ہوئی اور دو سال بعد پھر اس نے بیٹی کو جنم دیا۔ اب تو ملہوترہ صاحب کا اعتقاد ایسا جما کہ کسی نہ کسی بہانے اجمیر شریف جانے کا پروگرام بنا ہی لیتے تھے۔ اور وہ اپنی نواسیوں کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے فخریہ کہتے تھے کہ یہ خواجہ غریب نوازؒ کی دی ہوئی ہیں۔ •••

گوشۂ عقیل صدیقی

سرور تونسوی

یوم برق کا مشاعرہ

مصرع طرح ع زندگی نے لوٹا ہے موت کے بہانے سے

• جب تک طالب دہلوی حیات تھے ہر سال وہ اپنے استاد مرحوم برق کی یاد میں یوم برق مناتے تھے اور ایک طرحی مشاعرہ اس تقریب کی اہم کڑی ہوتا تھا۔ افسوس ہے کہ اب دہلی میں یوم برق منانے والا کوئی رہا ہی نہیں۔

یوم برق ہمیشہ ماہ دسمبر میں منایا جاتا تھا اس لئے ہم دسمبر کے شمارہ میں یوم برق ۱۹۵۳ء کے طرحی مشاعرہ کی ایک جھلک پیش کر رہے ہیں تاکہ اور کچھ نہیں تو اس ڈھنگ سے ہی یوم برق کی کمی کو دور کیا جا سکے۔

تقریباً تیس سال پہلے کا یہ مشاعرہ پڑھئے اور سوچئے کہ آج کے مشاعروں میں اور اس وقت کے مشاعروں میں کیا فرق تھا؟

اس مشاعرہ میں شریک اکثر و بیشتر شعرائے کرام انتقال فرما چکے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ جہاں یوم برق کی یاد تازہ کی جا رہی ہے وہاں ان شعرائے کو بھی خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہے۔ جو اب اس دنیا میں نہیں باقی ہے نام اللہ کا۔

(ادارہ)

آج ۲۷ دسمبر ۱۹۵۳ء سنیچر وار ہے۔ شری چترگپت سبھا دہلی کی گولڈن جوبلی کا مشاعرہ جو یوم برق کے طور پر شری چترگپت سبھا میں منعقد ہو رہا ہے میں شمولیت کے لئے ۴½ بجے شام سبھا کے ہال میں پہنچا۔ تو جناب گن پرشاد شیدا ماتھر بہت دنوں بعد نظر آئے ان سے علیک سلیک کے بعد دوسرے شعراء سے خوش گپیاں ہو رہی تھیں کہ مائیک پر جناب طالب دہلوی نے جلسہ کی کارروائی شروع کرنے کا اعلان کر دیا ہے اور صدر منتخب جناب منور لکھنوی سے مسند صدارت پر تشریف لانے کی گزارش کی گئی ہے۔ ایک صاحب کی تائید کے بعد جناب منور مسند صدارت پر تشریف لے آئے ہیں حاضری بہت کم ہے البتہ وہ شعراء کافی نظر آ رہے ہیں جنہیں سال بھر کے بعد صرف یوم برق کے مشاعرہ میں ہی پڑھنا نصیب ہو سکتا ہے حالانکہ ان میں سے بعض کی قسمت اس مرتبہ یاوری نہیں کرے گی۔ کیونکہ طالب صاحب نے اے کلاس اور بی کلاس کی لسٹیں پہلے ہی مرتب کر لی ہیں۔ اے کلاس کا مطلب یہ ہے کہ اس فہرست کے شعراء کو ضرور پڑھوانا اور بی کلاس کے شعراء کا پڑھوانا لازمی نہیں ہے طالب صاحب نے شری کالی چرن صاحب آثر سے گزارش کی ہے وہ حسب معمول افتتاحی نظم پڑھیں۔ آثر صاحب نے برق صاحب سے متعلق نظم سنائی ہے اور اب اعلان ہوا ہے کہ ونستہ پرشاد فدا لاہوری مقالہ پڑھیں گے جن بعض لوگوں کا بھرم تقسیم ملک کے بعد ختم ہو گیا ہے ان میں سے ایک صاحب بھی ہیں۔ خبر نہیں لاہور میں ان کی کیا حالت تھی دہلی آکر تو انھوں نے مشاعروں وغیرہ میں سوائے سامعین کو بور کرنے اور ان کا وقت ضائع کرنے کے علاوہ اردو کی اور کوئی خدمت انجام نہیں دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دفعہ طالب صاحب نے بھی اس تقریب کو بے رونق کرنے کی ٹھان لی ہے جو مقالہ فدا صاحب سے پڑھوا رہے ہیں حالانکہ پروگرام یہ تھا کہ اگر جناب آل احمد سرور صاحب نے لکھنؤ سے مقالہ نہ بھجوایا تو فدا صاحب کو نہایت مختصر

مقالہ پڑھنے دیا جائے اور وہ بھی اس لئے کہ فدا صاحب نے ازخود مقالہ پڑھنے کی خواہش فرمائی تھی ۔ فدا صاحب مقالہ پڑھ رہے ہیں اور سامعین تہہِ درویش بر جان درویش کی تفسیر بنے سُن رہے ہیں ۔ بے ربط جملوں، مبہم اشاروں اور عبری طرزِ ادا کا مجموعہ یہ مقالہ قریباً بیس منٹ تک سامعین کے صبر کا امتحان لیتا رہا اور نہ معلوم سامعین میں کون سا بھلا آدمی بیٹھا تھا جس کی دُعا سے یہ مقالہ ختم ہوا اور سامعین نے دلوں ہی دلوں میں خُدا کا شکر ادا کیا اور فدا صاحب کے حق میں دعائے خیر ؛

اب طالب صاحب فرمانے لگے کہ جناب لطیف احمد صاحب سُرور سامعین میں سے کئی حضرات بول اُٹھے لطیف احمد نہیں آلِ احمد سُرور ۔ اس پر طالب صاحب معذرت کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ جناب آلِ احمد سُرور نے کمال مہربانی سے اپنا مقالہ بھجوا دیا ہے مگر یہ مقالہ بدقسمتی سے اس قدر شکستہ خط میں ہے کہ پڑھنے میں یقیناً وقت ہوگی کیونکہ یہ مقالہ آج ہی دوپہر کو موصول ہوا ہے اس لئے میں اسے پڑھ بھی نہ سکا تاہم کوشش کروں گا کہ آپ کو اچھی طرح سُنا سکوں اس پر آزاد صاحب فرمانے لگے کہ مقالے کا لُطف اس طرح جاتا رہے گا ۔ اسے ٹائپ کرا لیتے ہیں اور بہتر ہے کہ اسے سالِ آئندہ پڑھا جائے اس پر سامعین نے ہنس دیئے ہیں اور طالب صاحب نے مقالہ پڑھنا شروع کر دیا ہے اور پندرہ منٹ میں بمشکل تمام ایک صفحہ پڑھ پائے تھے کہ صاحب صدر کے مشورہ سے یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مقالہ طویل ہے اور صاف لکھا ہوا بھی نہیں لہٰذا جگن ناتھ صاحب آزاد کی تجویز پر عمل کیا جاتا ہے اور یہ مقالہ آئندہ یوم ترقی میں پڑھا جائے گا ۔ مقالہ کی تمہید سے ہی پتہ چل رہا تھا کہ آلِ احمد سُرور نے یہ مقالہ کس محنت اور تحقیق کے بعد لکھا ہے ۔ ماسٹر جگت سنگھ ایڈیٹر رہنمائے تعلیم طالب سے فرمانے لگے کہ یہ مقالہ انھیں اشاعت کے لئے دیدیا جائے اس پر طالب صاحب فرمانے لگے یہ مقالہ آجکل ۔ میں شائع ہوگا ۔ اور اس کا حق اشاعت محفوظ ہے ۔

اب صاحب صدر نے خطبۂ صدارت پڑھنا شروع کر دیا ہے اور خطبۂ صدارت کی طوالت نے سامعین کے چہروں سے بیزاری کا اظہار ہونا شروع ہو گیا ہے ۔ لہٰذا صاحب صدر بھی محفل کو بھانپ گئے ہیں اور انھوں نے خطبۂ صدارت کہیں کہیں سے پڑھنا شروع کر دیا ہے اور اس تیز رفتاری سے پڑھ رہے ہیں کہ ایک لفظ بھی پوری طرح کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا ۔ طالب صاحب اگر آئندہ یوم ترقی میں صرف ایک ہی مقالہ رکھا کریں تو سامعین پر یقیناً مہربانی کریں گے ۔

صاحب صدر کے صدارتی خطبہ کے بعد طالب صاحب نے طرحی مشاعرہ شروع کرنے کا اعلان کیا ہے اور طرحی مصرع ۔ زندگی نے لوٹا ہے موت کے بہانے سے ۔ سُنا کر حسب معمول سب سے پہلے اپنی غزل سُنانی شروع کر دی ہے ۔ مطلع ارشاد فرمایا ہے ؎

شاعری عبارت ہے داغ کے گھرانے سے
لُٹ رہی ہے یہ دولت اس بھرے خزانے سے

مطلع پر خوب داد دی گئی ہے اور طالب صاحب ایک اچھا شعر سنا رہے ہیں ؎

غم نہیں خدا مجھ کو غرقِ بحر ہونے کا
کتنی کشتیاں اُبھریں میرے ڈوب جانے سے

اس شعر پر بھی اچھی داد دی گئی ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

صبح مُسکراتی ہے شام مُسکراتی ہے
تیرے مُسکرانے سے میرے مُسکرانے سے

اب انھیں کہاں ڈھونڈیں اب انھیں کہاں پائیں
ہائے داغ دے کر جو اُڑ گئے زمانے سے

موت سے شکایت کیوں موت سے گلہ کیسا
زندگی نے لوٹا ہے موت کے بہانے سے

طالب صاحب ابھی داد پا رہے ہیں اور اوپر گیلری کی طرف نظریں اُٹھا کر ارشاد فرما رہے ہیں ؎

عمر اک گزاری ہے ہم نے صحنِ گلشن میں
جائیں تو کہاں جائیں اُڑ کے آشیانے سے

معلوم ہوتا ہے کہ اوپر گیلری میں طالب صاحب کی بیگم صاحبہ

تشریف فرما ہیں اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ان سے کہہ رہے
ہیں کہ دیکھو تو مجھے کس قدر داد مل رہی ہے تم ذکر میں یونہی
کھوئی رہتی ہو کہ یہ شاعری کا روگ کیا پال رکھا ہے۔ دو شعر
مزید سنانے کے بعد طالب صاحب فرما رہے ہیں سہ

یہ اندھیری راتوں میں اور بھی فروزاں ہے
نہیں ہیں تاروں کو میرے مسکرانے سے
زندگی کی منزل میں اب قدم نہیں اٹھتے
نیند آ گئی ہے یہیں موت کے بہانے سے

اس شعر پر مشاعرہ میں زندگی آ گئی ہے اور طالب صاحب پھر
گیلری کی طرف نگاہیں اٹھا کر ارشاد فرما رہے ہیں سہ

اندمال جن کا ہے عقبت سے بھی ناممکن
زخم چند ایسے بھی کھا چکے ہیں زمانے سے
ایک بھی نہ بر آئی اپنی زندگانی میں
کیسی کیسی امیدیں ہم کو تھیں زمانے سے

غزل کا سولہواں شعر جو کہ مقطع ہے ارشاد فرماتے ہیں سہ

مرگ و زیست میں طالب کیا خبر کسے معلوم
کس نے کس کو لوٹا ہے اور کس بہانے سے

ثاقب دہلوی نے غزل سنانے کے بعد اعلان کیا ہے کہ اب
طالب پانی پتی کلام سنائیں گے ایک آواز آئی ہے کہ ان کے بعد
طالب چکوالی کو بھی پڑھوا ڈالیے۔ لیجیے شری نرائن داس طالب
پانی پتی مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور مطلع ارشاد کیا ہے

اشتیاق بڑھتا ہے غم کا غم اٹھانے سے
اور تیز ہوتی ہے آگ یہ بجھانے سے

طالب صاحب کا یہ مطلع خاموشی سے سنا گیا ہے اور آپ مطلع
ثانی فرما رہے ہیں سہ

دل کو گیسوؤں نے ل سینہ چاک شانے سے
اور بھی ہوئی الجھن سلسلہ بڑھانے سے

"انجمن کی" وجہ سے یہ شعر شعراء کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس شانے
کے سینہ چاک ہونے پر ایک صاحب فرما رہے ہیں کہ یا قیامت
ہی آ گئی [illegible] کے بعد شانے بھی سینہ چاک ہونے لگے ہیں دوسرے
صاحب فرما رہے ہیں کہ حالی صاحب کی روح بھی داد دے رہی ہو

جگہ تیر [illegible] طالب [illegible]
[illegible] فرمایا ہے سہ

دشت میں بہا [illegible] ہیں
[illegible] آتا ہے کہ [illegible]

اس شعر پر داد ملی ہے اور آپ فرما رہے ہیں سہ

ہم سے کیا شکایت ہے اپنے [illegible] پوچھ
کس پہ حرف آتا ہے کس پہ حرف لانے سے

اس شعر پر بھی داد ملی ہے اور طالب صاحب نے دو مزید
[illegible] شعر سنانے کے بعد ارشاد فرمایا ہے سہ

جو ہے یاد کے قابل اس کو یاد رکھتا ہوں
سو غم کہیں بہتر عشق کے ترانے سے

اس کے بعد طالب صاحب فرمانے لگے یہ شعر زبان میں کہا ہے ذرا
غور سے سنیے گا۔ ایک صاحب فرما رہے ہیں کیا پہلے کچھ مدت
منہ میں [illegible] ذرا آپ بھی زبان کا یہ شعر سن لیجیے سہ

آپ پر کبھی تہمت ہم نے تو نہیں رکھی
آپ خود کہلاتے کس کا دل چرانے سے

اور اس کے بعد غیر زبان کا شعر جو مقطع ہے وہ بھی سن لیجیے [illegible]
ہوا ہے سہ

امن کے تحفظ کی آڑ لے کے اے طالب
جنگ کی ہے تیاری اک نئے بہانے سے

طالب صاحب اس غیر زبان کے شعر پر داد پانے کے بعد اپنی
جگہ پر چلے گئے ہیں اور ثاقب دہلوی اعلان فرما رہے ہیں کہ اب
جناب دیا ساگر صاحب ساگر اپنا کلام سنائیں گے۔ ایک صاحب
کہنے لگے کہ لو صاحب اب "رمل نمبر ۲" والے شعراء شروع ہو گئے
لیجیے ساگر صاحب نے مطلع فرمایا ہے سہ

خاک اڑ رہی ہے اب ان کے آشیانے سے
پھول لہلہاتے تھے جن کے مسکرانے سے

مطلع ثانی ارشاد ہوا ہے سہ

[illegible] بھی کر دے کوئی آشیانے سے
روک کون سکتا ہے ہم کو چہچہانے سے

یہ شعر قابل داد ہے مگر ساگر صاحب کو شعر [illegible] ساگر

صاحب خود آواز میں شعر شستہ سنانے کے بعد ارشاد فرما رہے ہیں ؎

دل کی دھڑکنوں میں لطفِ زندگی حاصل
منتشر ہے شیرازہ ملا کے تنکے جانے سے

اس پر کچھ داد ملی ہے اور ساگر صاحب مقطع فرما رہے ہیں ؎

جذبۂ اسیری کا یہ بھلا ہو ساگر
ہم ہیں آشیانے میں دور آشیانے سے

ساگر صاحب مقطع پر بھی داد لے سکے ہیں اور اب طالب دہلوی اعلان فرما رہے ہیں کہ جناب پریم چند گپتا پریم غزل فرمائیں گے یہ صاحب بھی فصل کے فصل یعنی صرف یوم ترقی پر ہی نظر آتے ہیں سنئے مطلع ارشاد ہوا ہے ؎

چھوٹتا تھا ہر پتہ جن کے چھپانے سے
چل دیئے وہ کس جانب اپنے آشیانے سے

پریم صاحب ترنم کے باوجود مطلع پر داد نہ لے سکے اس لئے حلق کو ذرا صاف کر کے مطلعِ ثانی فرما رہے ہیں ؎

ہے اسے کہاں فرصت اپنے مسکرانے سے
چھوڑیئے زمانے کو کیا کہیں زمانے سے

مطلعِ ثانی پر پریم صاحب کو داد ملی ہے اور تیسرے مطلع پر خاموشی رہی ہے۔ اس کے بعد پریم صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

زندگی بھی کافی ہے عشق تو اضافی ہے
ہستیاں مٹانے کو موت کیسے بہانے سے

عشق کی عقیدت ہے حسن کی عبادت ہے
آستاں کی زینت ہے میرے سر جھکانے سے

ان دونوں اشعار پر پریم صاحب کو اچھی داد ملی ہے ایک شعر مزید سنانے کے بعد ارشاد ہوا ہے ؎

زندگی کے کشمکش میں وہ بھی وقت گزرا ہے
برق جب لرزتی تھی میرے آشیانے سے

یہ شعر بھی خوب رہا ہے اس کے بعد پریم صاحب نے پھر دو چھپے شعر سنانے کے بعد ارشاد فرمایا ہے ؎

زندگی کی تلخی کا اس کو کیا مزہ آئے
زندگی سے جو بھاگے موت کے بہانے سے

اس شعر پر اچھی داد ملی ہے اور پریم صاحب فرما رہے ہیں کہ اب جو شعر عرض کر رہا ہوں وہ بہت حد تک طالب دہلوی کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ اس پر طالب دہلوی فرما رہے ہیں ارے چھوڑیئے صاحب شعر سنایئے ارشاد ہوا ہے ؎

آہنی ارادوں نے اک کوششِ مسلسل نے
بارہا بدلوا دیں کروٹیں زمانے سے

ملک صاحب فرما رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مصرع پریم صاحب کا ہے اور دوسرا طالب صاحب کا، دوسرے صاحب فرما رہے ہیں کہ اس لئے کہ ہر مصرع کہنے والوں کی جسامت کے مطابق ہے اس پر ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا اور پریم صاحب مقطع ارشاد فرما رہے تھے ؎

نامرادیاں اپنی پریم مایۂ دل ہیں
لٹ نہ جائے یہ دولت عشق کے خزانے سے

پریم صاحب کے بعد جناب ڈگمبر پرشاد گوہر دہلوی سے کلام سنانے کی درخواست کی گئی ہے۔ دیکھئے گوہر صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور حسبِ سابق اپنے استاد آغا شاعر قزلباش کے دو شعر تبرکاً سنائے ہیں اور پھر اپنی غزل کا مطلع ارشاد فرمایا ہے ؎

عشق نے جلا پائی حسن کے فسانے سے
زندگی چمک اٹھی تیرے مسکرانے سے

گوہر صاحب کو مطلع پر داد ملی ہے اور آپ نے حسنِ مطلع سنا کر ارشاد فرمایا ہے ؎

زلف کی گھٹاؤں میں زندگی غزل خواں ہے
لوٹ لے بہارِ نو حسن کے خزانے سے

رات کی خموشی میں دھڑکنیں مرے دل کی
اور بھی فزوں تر تھیں تیرے یاد آنے سے

انقلاب تعمیری اک عمارتِ تازہ ہے
زندگی نکھرتی ہے انقلاب آنے سے

اچھی داد پانے کے بعد گوہر صاحب نے ایک شعر پڑھا ہے جس کے دوسرے مصرع میں "بے رحم زمانے سے" آیا ہے۔ جناب انہوں نے یہ شعر دوبارہ پڑھوایا ہے اور پھر رعنا صاحب نے

تیسری بار گوہر صاحب داد سمیٹ کر شعر بار بار پڑھ رہے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے رم کو غلط تلفظ سے پڑھ کر مصرع کے وزن کو ٹھیک رکھا ہے۔ صاحب صدر نے اس بے داد کو سمجھ لیا ہے اور انھوں نے گوہر صاحب سے کہا ہے کہ وہ اگلا شعر پڑھیں اور ہاتھ کے اشارے سے رعنا کو منع کر دیا ہے۔ سنئے گوہر صاحب فرما رہے ہیں ؎

گوہر سخنور ہی یادگار شاعر ہے
برق کو بھی نسبت ہے داغ کے گھرانے سے

گوہر صاحب اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر آگئے ہیں اور طالب صاحب نے اعلان کیا ہے کہ اب جناب کامل نظامی صاحب اپنا کلام سنائیں گے۔ لیجئے کامل صاحب نے اپنے مخصوص ترنم سے ارشاد فرمایا ہے ؎

مل بھی جائے گی راحت منحرف زمانے سے
سوچتا بھی ہے پہلے آشیاں بنانے سے
اس لئے محبت میں راحتوں کا منکر ہوں
زندگی نہ مٹ جائے نقش غم مٹانے سے

کامل صاحب کو ہر شعر پر خوب داد مل رہی ہے اور مشاعرہ میں جان پڑ گئی ہے سنئے ارشاد ہوا ہے ؎

گلستاں میں کیا ڈالیں وہ بنائے نشیمن کی
لاگ بجلیوں کو ہے جن کے آشیانے سے
داغ دل کی افزائش روکش گلستاں ہے
ہر بہار شرمندہ اس بہار خانے سے
آج بربط دل پر کون یہ غزل خواں ہے
زندگی الفت کی نبض ہے ٹھکانے سے

کامل صاحب کو ہر شعر پر خوب داد دی جا رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

مستقل خدا رکھے کاوشیں ان بہاروں کو
زندگی مہک اٹھی تیرے مسکرانے سے
میکدے بھی اے کامل ہیں شعر پہ کس درجہ
لے چلے ہیں زاہد کو وعظ کے بہانے سے

کامل صاحب بہت ہی اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں۔ صاحب صدر طالب صاحب کے کانوں میں کہہ رہے ہیں کہ شرم صاحب کا پڑھوانا نہ بھول جانا اور طالب صاحب نے اعلان کیا ہے کہ اب [illegible] رام چند صاحب طالقی سے غزل سنئے۔ ایک آواز آرہی ہے کہ [illegible] کا پیشنٹ شاعر۔ طالب صاحب مسکرا دیئے ہیں اور غافل صاحب نے ارشاد فرمایا ہے ؎

بے نیاز [illegible] ہے، بے خبر زمانے سے
جاؤں [illegible] جہاں اٹھ کر تیرے آستانے سے
بدگماں ہے اک عالم عشق کے فسانے سے
کیا کروں زمانے کو کیا کہوں زمانے سے

غافل صاحب [illegible] داد سے رہے ہیں ارشاد فرمایا ہے ؎

اٹھ گئی [illegible] لیا یارب کس قدر زمانے سے
تیرا غم [illegible] بیگانہ تیرے آستانے سے
گوشۂ قفس میں بھی ہے وہی نوا سنجی
کچھ تو ساتھ لایا ہوں اپنے آشیانے سے
موت [illegible] کو کہتے ہیں شاہکار قدرت ہے
زندگی [illegible] عبارت ہے اک اسی فسانے سے

غافل صاحب [illegible] ہر شعر پر داد مل رہی ہے اور آپ نہایت اچھے اشعار فرما رہے ہیں ؎

زندگی ازل سے ہے زندگی ابد تک ہے
زندگی کو کیا نسبت موت کے فسانے سے
خود [illegible] کیا غافل جب فسانۂ ہستی
زندگی نے کروٹ لی موت کے بہانے سے

غافل صاحب کے بعد طالب صاحب نے جناب منوہر لال صاحب طالب چکوالی [illegible] سے کلام سنانے کی درخواست کی ہے۔ سنئے طالب چکوالی صاحب نے کس قدر اچھا مطلع فرمایا ہے ؎

میں قفس میں آیا ہوں اٹھ کے آشیانے سے
دام و دانہ قسمت بن گئے بہانے سے

مطلع پر طالب صاحب کو اچھی داد ملی ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

ضبط درد ہی سے تو دل کی قدر و قیمت ہے
درد ہی نہ مٹ جائے داغ دل دکھانے سے
خود کو بھولنا آسان اُن کو بھولنا مشکل
خواب کی سی باتیں تھیں بن گئے فسانے سے

طالب صاحب کو ان اشعار پر داد مل رہی ہے اور آپ نے تین شعر مزید سناکر ارشاد فرمایا ہے ؎

رات ہے ابھی باقی صبح وقت پر ہوگی
صبح ہو نہیں سکتی آشیاں جلانے سے
اپنا بھید بھی کھولا اپنی بات بھی کھوئی
کیا ملا تجھے طالبؔ حالِ دل سنانے سے

ایک صاحب فرما رہے ہیں اس دفعہ تو طالب صاحب نے مہاشہ کرشن کی پیروی نہیں کی اور غزل اردو میں ہی کہی ہے اب اعلان ہوا ہے کہ جناب سلطان نظامی رام پوری اپنا کلام سنائیں گے۔ لیجئے سلطان صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں۔ حضرت نے مطلع پڑھا ہے تو ایک لفظ کو بار بار غلط پڑھ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ غزل خود نہیں کہی بلکہ اپنے استاد حضرت ہجر کنتوری سے کہلوا کر پڑھ رہے ہیں۔ جو شخص اپنا لکھا ہوا صحیح نہیں پڑھ سکتا وہ شعر کیا کہہ سکتا ہوگا۔ دوسرا شعر پڑھا تو بجلیاں چمکیں بجلیاں چمکیں پڑھ رہے ہیں اور اختر صاحب جو کہ استاد شاگرد رشتہ کے قائل ہیں کانوں پر چین بجبیں ہو رہے ہیں۔ اختر صاحب کو چاہیئے کہ اول تو شاگردوں کو خود کہہ کر نہ دیا کریں اور اگر کوئی مجبوری آن پڑی ہو تو پھر پہلے اچھی طرح سے پریکٹس کرا دیا کریں تاکہ ان کا مضمون نہ بن سکے۔ سلطان صاحب غلط سلط پڑھ کر اور ایک اچھی غزل کا ستیاناس کر کے اپنی جگہ پر چلے گئے ہیں۔ اور طالب صاحب نے اعلان فرمایا ہے کہ اب لالہ دھرم پال صاحب گپتا وفاؔ غزل فرمائیں گے۔ لیجئے وفا صاحب مائک پر تشریف لے آئے ہیں اور ارشاد فرمایا ہے ؎

ربط و ضبط جاری ہے برق کا زمانے سے
لاگ ہے نہ جانے کیوں میرے آشیانے سے
آج تک نہیں سمجھا رازِ ایزدی کوئی
رزق ہے دینے سے موت ہے بہانے سے

وفا صاحب کو خوب داد مل رہی ہے اور آپ ارشاد فرما رہے ہیں ؎

یوں بھی کم نہیں تھا کچھ عشق کا ہمیں سودا
اور بڑھ گئی وحشت فصلِ گل کے آنے سے

پھر کوئی شگفتہ رنگ نما نہ ہو جائے
پھر لرز گیا شبنم گل کے مسکرانے سے
لے رہی ہے کروٹ کیوں دل میں آتشِ پنہاں
پھر دھواں اٹھے شاید میرے آشیانے سے

وفا صاحب کو داد نہایت مناسب مل رہی ہے اور آپ مقطع فرما رہے ہیں ؎

ہم وفا کے بندے ہیں نام ہے وفاؔ اپنا
اس لئے روش اپنی ہے جدا زمانے سے

وفا صاحب مقطع پر بہت اچھی داد پا کر اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور طالب صاحب نے جناب برج لال صاحب جگی رعنا سے کلام سنانے کی التجا کی ہے۔ رعنا صاحب فرما رہے ہیں ؎

عشق کا تعلق ہے اس قدر زمانے سے
جس قدر حقیقت کا ربط ہے فسانے سے
عشق رنگ لاتا ہے دل پہ چوٹ کھانے سے
آگ یہ بھڑکتی ہے اور بھی دبانے سے
آرزو کی شدت نے دل پر کر دیا جادو
گونجتے ہیں کانوں میں ان سنے ترانے سے

رعنا صاحب کو داد مناسب مل رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

لاکھ ناؤ ٹوٹی ہو لاکھ سخت طوفاں ہو
ڈوبتا ہے انساں تو دل کے ڈوب جانے سے

اس شعر پر رعنا صاحب کو بہت زیادہ داد دی گئی ہے اور آپ ارشاد فرما رہے ہیں ؎

اے چمن کے متوالو کچھ خبر بھی ہے تم کو
گلستاں تک آ پہنچی آگ آشیانے سے
آندھیاں بھی اٹھتی ہیں بجلیاں بھی گرتی ہیں
باز رہ نہیں سکتے پھول مسکرانے سے
درد کو سمجھتا ہے کوئی درد والا ہی
تیر کیا ہے یہ پوچھو تیر کے نشانے سے

رعنا صاحب ان اشعار پر اچھی داد پانے کے بعد اور تین اشعار مزید سنانے کے بعد مقطع فرما رہے ہیں ؎

آدمی کی مجبوری کچھ نہ پوچھئے رعنا بے بسی برستی ہے موت بھی بہانے سے

رعنا صاحب کے بعد جناب بسمل شاہجہاں پوری کو کلام سنانے کے لئے کہا گیا ہے۔ لیجئے بسمل صاحب ڈاڑھی کھجاتے ہوئے مائیک پر تشریف لائے ہیں اور مشاعرہ کو اکھاڑ دینے کے موڈ میں دکھائی دیتے ہیں۔ بسمل صاحب بڑی مدت کے بعد دہلی کے مشاعرہ میں نظر آرہے ہیں۔ کیونکہ اب منتظمینِ مشاعرہ ان کی شاعرانہ "قابلیت" سے کما حقہ طور پر واقف ہو گئے ہیں۔ بیچارے طالب دہلوی وضع دار آدمی ہیں اس لئے بسمل صاحب کو بھی دعوت نامہ بھجوا دیا۔ ورنہ بسمل صاحب کو آجکل انہی مشاعروں میں بلایا جاتا ہے جہاں کے سننے والے قوالی کے دلدادہ ہو گئے ہیں۔ ہاں تو بسمل صاحب اپنے مخصوص پٹھانی اور معشوقانہ ملے جلے انداز میں فرما رہے ہیں، صرف دو شعر کہہ سکا ہوں مطلع ہو نہیں سکا۔ ایک صاحب فرما رہے ہیں امن صاحب سے لکھوا لیا ہوتا اس پر ایک ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا اور بسمل صاحب اپنے گلے کو حد امکان تک پھاڑتے ہوئے ارشاد فرما رہے ہیں ؎

ان کے حسن کا عالم اے ندیم کیا ہو گا ٭ جنبشیں سنورتی ہیں جن کے مسکرانے سے

اس شعر پر داد تو خیر کیا ملنی تھی لیکن سننے والوں کو بغیر مائیک کے ہی سننے کا مزہ آگیا اور سامعین قائل ہو گئے کہ ایک پٹھان بھی اچھا گا سکتا ہے۔ بسمل صاحب دوسرا شعر سنانے سے پہلے فرما رہے ہیں کہ مجھ پر جو بیتی ہے وہ عرض کر رہا ہوں ارشاد ہوا ہے ؎

جز ہلاکتِ فطرت جز تباہیِ ایماں
کیا ملا تمہیں بسمل اُن کے دوستانے سے

ایک صاحب فرما رہے ہیں کہ پٹھان تو احسان فراموش نہیں ہوتے مگر بسمل صاحب ہیں کہ پٹھان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے محسن کا شکوہ سرِ عام کر رہے ہیں۔ دوسرے صاحب فرما رہے ہیں کہ جس قدر شاعر ہیں اتنے ہی پٹھان بھی ہیں بسمل صاحب نے اس شعر میں جس مخلص ہستی کی شان میں یہ جھک ماری ہے سمجھنے والوں نے اسے محسوس کیا ہے اور اسے بسمل صاحب کی کم ظرفی قرار دے رہے ہیں۔ اب اعلان ہوا ہے کہ یہاں ایک شاعر پاکستان سے بھی تشریف فرما ہیں لہٰذا اس معزز مہمان جناب مظفر شاداں صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ جناب منور طالب صاحب سے آہستگی سے کہہ رہے ہیں شرم صاحب کو پڑھوانا نہ بھولئے گا۔ اور طالب صاحب اپنے کلاس کی فہرست میں شرم صاحب کا نام منور صاحب کو دکھا رہے ہیں۔ لیجئے مظفر شاداں صاحب مائیک پر تشریف لائے ہیں اور ارشاد فرمایا ہے ؎

کیا سکوں ملے آخر باغباں کے جلنے سے
بجلیاں تو ہیں نزدیک اب بھی آشیانے سے

شاداں صاحب کو مطلع پر اچھی داد دی گئی ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

ہر قدم پہ کعبہ تھا ہر قدم پہ بتخانہ
سر نہ اٹھ سکا لیکن تیرے آستانے سے

اس شعر پر تو مظفر صاحب نے بہت داد پائی ہے اور تین بار یہ شعر سنانے کے بعد ارشاد فرمایا ہے ؎

باوجودِ ضبطِ غم اشکِ غم اُبھر آئے
راز کھل گیا آخر بات کے چھپانے سے
حسرتیں کے طوفاں میں حسرتِ سکوں شاداں
کیا اُمید ہے ہم کو ایسے وفا زمانے سے

شاداں صاحب اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور طالب صاحب نے خان غازی کابلی کو سامعین کا وقت ضائع کرنے کے لئے کلام سنانے کو کہا ہے ایک صاحب نے طالب صاحب سے دریافت کیا ہے کہ حضور یہ کیا حماقت فرمائی ہے آپ نے، تو طالب صاحب کہنے لگے کہ اسے پڑھا دینے سے "پرتاپ" میں مشاعرہ کی خبر خاصی لمبی چوڑی چھپ جاتی ہے اس پر ایک ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا ہے اور اتنے میں خان کابلی صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور فرمانا شروع کیا ہے کہ شاعروں کو مصرعِ طرح میں باندھنے کی کوشش کی گئی ہے اور میں شعر کہتے ہوئے کبھی کسی بحر میں اور کبھی کسی بحر میں چلا گیا (ایک صاحب فرما رہے ہیں کہ بڑے بے شرم ہو جو کسی بحر میں ڈوب نہ سکے) اور اب بھی پتہ نہیں کہ ٹھیک شعر ہوئے ہیں یا نہ چونکہ یہ علاقہ ہے ہی ترازو والوں کا لہٰذا اگر کوئی کمی بیشی ہو تو خود ہی پورا کر لیں۔ اس کے بعد جناب نے مطلع فرمایا ہے جس کے دونوں مصرعے الگ الگ بحروں میں ہیں، ایک سکتہ تو ہر دو لفظ کے بعد پڑتا ہے اس پر جناب ابر گنوری صاحب فرمانے لگے کیا رواں مطلع فرمایا ہے جس

پبلک قہقہہ بلند ہوا ہے اور خان غازی کابلی ہیں کہ بے تحاشا بالکل لغو اور غلط اشعار پڑھے جا رہے ہیں۔ نہ معلوم اس قسم کے بر خود غلط شاعر اپنا اور سامعین کا وقت ضائع کرنا کیوں پسند کرتے ہیں۔ بہتر ہے کہ خان غازی صاحب آئندہ ورنہ "پرتاپ" میں ہی مشق ناز فرماتے رہا کریں اور شاعری کو اپنی لغویت سے پاک رہنے دیا کریں۔ اب اعلان ہوا ہے کہ جناب انسر آذری صاحب کلام سنائیں گے لیجئے انسر صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور ارشاد فرمایا ہے ؎

بیٹیاں کسانوں کی، انقلاب کی روحیں
لمبی لمبی پلکوں پہ موتیوں کے دانے سے
گول گول باہوں میں چوڑیاں سسکتی سی
گورے گورے جسموں پر چیتھڑے پرانے سے

انسر صاحب کو اس قطعہ پر خاصی داد دی گئی ہے اور آپ نے غزل سنانی شروع کی ہے ارشاد ہوا ہے ؎

سازِ غم بدلنے سے، سوزِ دل بڑھانے سے
انقلاب آئے گا انقلاب لانے سے
آندھیوں کی یورش سے اس کو کیا ڈراتے ہو
بجلیاں لرزتی ہیں جس کے آشیانے سے
انقلاب کی دختر، جنتوں کی پروردہ
زندگی جہنم ہے تیرے روٹھ جانے سے

انسر صاحب ہر شعر پر خوب داد لے رہے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں ؎

رقصِ زہرہ پروین اس سے مختلف ہوگا
چاند ڈھل کے نکلے گا جب شراب خانے سے
کہہ دیا کہ کل آنا آج ہوں بہت مصروف
میں نے موت کو ٹالا کس حسیں بہانے سے
کیوں خلوص پر اپنے مجھ کو شک گزرتا ہے
آپ کے نہ ملنے پر آپ کے نہ آنے سے

انسر آذری کو میں نے پہلی بار آج مشاعرہ میں کامیاب ہوتے دیکھا ہے ہر شعر پر داد پا کر انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بعض ترقی پسند شعراء بھی طرح طرح کی خار زار سے بھی گزر

خوبی پار کر لیتے ہیں۔ اب طالب صاحب نے اعلان کیا ہے کہ قبلہ حضرت مولانا آبر احسنی گنوری کلام بلاغت نظام عطا فرمائیں گے اس پر تمام شعراء نے احتجاج کیا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے لہٰذا آبر صاحب کو ان کے مقام پر ہی بلایا جائے۔ اور پھر طالب صاحب نے گلزار دہلوی سے گزارش کی ہے کہ وہ مائیک پر تشریف لے آئیں۔ لیجئے جناب گلزار صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور ارشاد فرمایا ہے ؎

کہ ہواندھیوں کو جب اس کے آشیانے سے
پھر چمن میں حاصل کیا مشتِ پر کے کھلنے سے

گلزار صاحب یہ شعر پڑھنے کے بعد خاموش بیٹھ گئے ہیں کیونکہ محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ سٹیج پر ہیں سامعین نے گلزار صاحب سے کہا ہے کہ ارشاد فرمائیے تو گلزار صاحب فرمانے لگے کہ پہلے یہ میٹنگ ختم ہولے پھر سناؤں گا اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے اور محترمہ حمیدہ سلطان نے طالب صاحب سے بات چیت بند کر دی ہے اور گلزار صاحب نے ارشاد فرمایا ہے ؎

آپ کا تبسم بھی زندگی کا حاصل ہے
فیض ہے یہاں جاری داغ کے گھرانے سے
نغمہ سنج ہیں بیخود، جوش و ناز خوش الحان
یہ زبان ٹکسالی ہے جدا زمانے سے
لکھ سکے نہ ہم مقطع بحر کے تقید سے
رہ سکے نہ ہم پھر بھی حالِ دل سنانے سے

گلزار صاحب کو بہت اچھی داد ملی ہے اور آپ اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں۔ اب ایک صاحب از خود اٹھ کر مائیک کے سامنے آبیٹھے ہیں اور سامعین حیران ہیں کہ طالب صاحب نے تو کسی شاعر کو کلام سنانے کے متعلق نہیں کہا اور یہ صاحب خود بخود کیسے سٹیج پر تشریف لاکر مائیک سنبھال کر بیٹھ گئے ہیں ایک صاحب فرما رہے ہیں ابھی یہ بیچارے بھی کیا کریں شاعروں کی اس کھیپ میں کیا جانے ان کی باری آئے یا نہ اس لئے یہ از خود اٹھ کر مائیک پر آ گئے ہیں اتنے میں طالب صاحب نے اعلان کیا کہ جناب پریم بہاری لال صاحب رواں سے کلام سنئے لیجئے رواں صاحب کلام ارشاد فرما رہے ہیں ؎

طبّی علاج گھر کے پاس

دلی انتظامیہ لوک نایک جے پرکاش نارائن اسپتال، گرو دند بلبھ پنت اسپتال اور سلم و نوآبادکاری کالونیوں اور جھگی جھونپڑی کالونیوں جیسے کم آمدنی والے علاقوں کے باشندگان کے لیے قائم کی گئیں ایلوپیتھک و ہومیوپیتھک علاج و معالجے کی حامل ۱۱۰ ڈسپنسریوں کے توسط سے طبّی سہولیات مہیا کر رہا ہے۔

دلّی انتظامیہ اپنے ادویہ کنٹرول محکمے کے توسط سے نہ صرف ادویہ کی تیاری اور فروخت پر سخت نگرانی رکھتا ہے بلکہ خوردنی اشیاء میں ملاوٹ کے انسداد کے محکمے کے توسط سے خوردنی اشیاء میں ملاوٹ کی روک تھام کے اقدامات بھی کرتا ہے۔

عام لوگوں کو ان کی دہلیز پر جامع اور خصوصی طبّی خدمات مہیا کرنے کے لیے چھٹے پنجسالہ منصوبے میں طبّی سہولیات اور صحت عامہ کی اسکیموں کے لئے ۵۹/۹۰، ۳۷ لاکھ روپے وقف کیے گئے ہیں۔

خصوصیات

* ایک ۵۰۰ بستروں والا اسپتال ہری نگر میں اور ایک اسپتال بمعہ طبّی کالج شاہدرہ میں زیر تعمیر ہے۔
* آنکھوں کے خصوصی اور مکمل علاج کے لئے لوک نایک جے پرکاش اسپتال کے گرونانک آئی سینٹر کے ۲۰۰ بستروں والے وارڈ کی تعمیر جاری ہے۔
* منگول پوری و کھچڑی پور کی نوآبادکاری کالونیوں اور جعفر پور گاؤں میں تین سو سو بستروں والے اسپتال زیر تعمیر ہیں۔ منگول پوری اسپتال کی تعمیر جلد شروع ہو رہی ہے۔
* نوآبادکاری کالونیوں میں قائم دس ڈسپنسریوں کا درجہ بڑھا دیا گیا ہے اور ڈاکٹروں و اسٹاف کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔
* یکی طریق علاج والی دو ڈسپنسریاں موتی نگر اور تلک نگر میں طبّی خدمات انجام دے رہی ہیں اور ایسی ہی تین ڈسپنسریاں مارچ ۱۹۸۲ء تک جہانگیر پوری، کھچڑی پور اور دکھشن پوری میں کام کرنا شروع کر دیں گی۔
* اسکولی طلبا کی صحت کی دیکھ بھال و طبّی جانچ کی اسکول ہیلتھ اسکیم مغربی دلّی میں بھی نافذ کر دی گئی ہے۔ اس کے تحت ۶۰ ہزار طلبا فیضیاب ہوں گے۔ چھٹے پنجسالہ منصوبے کے دوران سبھی اسکولی طلبا کو یہ سہولت میسر ہوگی۔
* دلّی کو پیدائش و اموات اور بچوں کی اموات کے ضمن میں سب سے کم شرح کیلئے امتیاز حاصل ہے۔ یہاں کنبہ بہبودی ماہ منایا گیا اور بیحد کامیاب رہا۔ * خوردنی اشیاء میں ملاوٹ کی روک تھام کی کوششوں کو اور تیز کر دیا گیا ہے۔

جاری کردہ:۔ محکمہ اطلاعات و اشاعت، دلّی انتظامیہ دلّی

آشیاں جلانے سے بجلیاں گرانے سے
ہم نہیں کہ ڈر جائیں باغباں ڈرانے سے
فائدہ بھی کیا لب تک دل کی بات لانے سے
ان کو جانتا ہوں میں اور اک زمانے سے

اس شعر پر رواں صاحب کو خوب داد ملی ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

لاکھ مشکلیں آئیں لاکھ آسماں ٹوٹیں
ہم نہیں کہ گھبرائیں بارِ غم اٹھانے سے
اشک تھم ہی جائیں گے یہ تو ٹھیک ہے لیکن
دل کا حال کیا ہوگا آپ کے نہ آنے سے
عشق میں رواں آخر وہ بھی وقت آئے گا
ان کو بیکلی ہوگی رازِ دل چھپانے سے

رواں صاحب ان اشعار پر داد حاصل کر چکے ہیں اور غزل سنانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں۔ اب طالب صاحب نے جناب گوپال متل صاحب ایڈیٹر "تحریک" سے کلام سنانے کی گزارش کی ہے۔ متل صاحب نے غیر طرحی غزل سنائی ہے۔ جو کافی داد لے سکی۔ آپ کے بعد جناب رتن موہن صاحب خار دہلوی مائیک پر تشریف لاتے ہیں۔ اور مطلع ارشاد فرمایا ہے ؎

چھوڑ کر زمانے کو چھوٹ کر زمانے سے
ہم بتا کہاں جائیں تیرے آستانے سے

خار صاحب مشاعروں سے کچھ الگ سے ہو گئے ہیں اور غالباً یوم سیرت کے بعد آج انہیں مشاعرہ میں دیکھا گیا ہے۔ آپ خوب سمجھ کر کہتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ سنئے کس قدر پختہ کلام ہے آپ کا ارشاد فرما رہے ہیں ؎

کوئی پوچھے کیا پایا زندگی گنوانے سے
ان بتوں کی الفت میں لگ گئے ٹھکانے سے

لفظ "ٹھکانے" نے شعر کو چمکا دیا ہے اور داد ہے کہ جی بھر کے دی جا رہی ہے۔ یہ شعر آپ کو تین بار سنانا پڑا ہے اس کے بعد ارشاد ہوا ہے ؎

دل میں کیا گماں آتے کیا کہیں شب وعدہ
تیرے وعدہ کرنے سے اور پھر نہ آنے سے

ان کو بھی یقیں آئے دل کو بھی قرار آئے
لیکے آ انہیں قاصد تو کسی بہانے سے

خار صاحب کو اس قدر داد مل رہی ہے کہ اس سے پہلے اس مشاعرہ میں کسی شاعر کو اتنی داد نہیں ملی سنئے کتنا اچھا شعر فرما رہے ہیں ؎

بے وفا کہا میں نے ہاں کہا زمانے کو
آپ تو خدا رکھے ہیں الگ زمانے سے

یہ شعر کئی بار پڑھوایا گیا ہے اور داد بھی بے انتہا دی گئی ہے سنئے خار صاحب کتنے اچھے شعر سنا رہے ہیں ؎

شکر ہے شکایت کیا اس سے بڑھ کے راحت کیا
راہ و رسم تو قائم ہے تیرے ستانے سے
رنج و غم الم پیہم آہ و نالہ و شیون
خار ہم تو باز آئے ایسے دل لگانے سے"

خار صاحب کو بے انتہا داد ملی ہے اور یقیناً ان کی غزل حاصل مشاعرہ کہے جانے کی مستحق ہے، اب طالب صاحب نے جناب دوشن دہلوی کو کلام سنانے کی گزارش کی ہے۔ لیجئے موجودہ دور کا یہ اکبر مائیک پر ارشاد فرما رہا ہے ؎

کیا خبر ہے کیا باعث چھپتے نکلتے ہیں
ہم غریب خانے سے وہ زنانہ خانے سے

ہنسی اور داد کا ملا جلا شور ہے کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا اور دوشن صاحب فرما رہے ہیں ؎

گیسوؤں سے اندازہ عمر کا سمجھ لیجئے
اب جو بال نکلتی ہیں کھو پڑی کھجانے سے
سیدھی جی تو ہیں ٹھنڈے استری ہے بجلی کی
تار مل نہیں سکتے اب بٹن دبانے سے

اس شعر پر تو بس ہنسی اور داد کی انتہا کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں لفظ "استری" کے ذو معنی استعمال نے شعر میں جان ڈال دی ہے اور دوشن صاحب کو یہ شعر تین مرتبہ سنانا پڑا ہے۔ اب ارشاد ہوا ہے ؎

دوسروں کے کندھوں پر موت کی ریہرسل کی
غیر جب مجھے لائے کل شراب خانے سے

اس شعر پر محفل ہنسی ہی نہیں خوب داد بھی دی گئی ہے سنیئے روشن صاحب نے دہلی کے گول ڈاک خانے کو کس طرح نواز رہے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

لوٹ کیوں نہ آئیں خط گول ہے زمیں اور پھر
واسطہ پڑا اپنا گول ڈاک خانے سے
یوں پکار ہے گو پہ چل مشاعرے روشن
حاضری کی آوازیں پڑ رہی ہے تھانے سے

روشن صاحب کو خوب داد ملی ہے اور آپ مذاحیہ کلام سنانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور طالب صاحب نے ایک طویل تعارف اور تعریف کے بعد اعلان کیا ہے کہ اب جناب صوفی بلند شہری اپنا کلام سنائیں گے یہ متین اور بظاہر سوجھ بوجھ رکھنے والے حضرت مائیک پر تشریف لاتے ہیں اور جناب نے مطلع ارشاد فرمایا ہی تھا کہ سارا بھرم کھل گیا کلام خان غازی کا بلی کے معیار کا اور ترنم حضرت ملّا لکھنوی سے بھی بدتر، دونوں مصرعے الگ الگ بحر میں ہیں اور حضرت صوفی ہیں کہ بلند شہر کی روایات کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور بے بحرے سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں راقم، حضرت اثر اور دوسرے سمجھدار شعرا آنکھوں ہی آنکھوں میں طالب صاحب کی تعریف اور صوفی صاحب کے کلام کا موازنہ فرما رہے ہیں، قبلہ منوّر صاحب نے محترمہ شرم صاحبہ کے متعلق طالب صاحب کو پھر یاد دہانی کرائی اور طالب صاحب فرما رہے ہیں کہ صوفی صاحب کے بعد محترمہ کا کلام سنوایا جائے گا، لیجئے صوفی صاحب اپنا کلام معرفت" سنا کر اپنی جگہ پہ چلے گئے ہیں اور طالب صاحب نے اعلان کیا ہے کہ اب کالی چرن صاحب اثر دہلوی پہلے محترمہ شرم لکھنوی زوجہ محترمہ جناب منوّر لکھنوی کا کلام سنائیں گے اور اس کے بعد اپنا اس اعلان کے بعد شعرا میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی ہیں ایک ساٹھ سالہ بزرگ فرما رہے ہیں، کبھی یہ چوچلے تو نوجوانوں کے ہوتے ہیں منوّر صاحب کو اس پچپن برس کی عمر میں یہ کیا سوجھی کہ یکایک اپنی شریکِ حیات کو شاعرہ بنا ڈالا ہے اس سے پہلے تو ہم نے کبھی شرم صاحبہ کا کلام نہ سنا نہ پڑھا حالانکہ سالہا سال سے دہلی میں رہتے ہیں اور ہزاروں مشاعرے سن ڈالے ہیں اس پر دوسرے صاحب فرما رہے ہیں کہ ہم نے تو ایک بار اس سے پہلے بھی محترمہ کا کلام یومِ برق کے مشاعرہ میں ہی سنا تھا اس پر ایک خرنار بھی شاعر فرمانے لگے کہ جی ہیں، پانچ سال تو یوم برق کے مشاعروں میں شمولیت کرتے ہو گئے ہیں مگر ہم نے تو کبھی محترمہ کا کلام نہیں سنا اس پر پہلے صاحب فرمانے لگے کہ پارٹیشن سے پہلے ایک مرتبہ یوم برق کے مشاعرہ میں محترمہ کا کلام سنوا گیا تھا، اتنے میں اثر صاحب محترمہ شرم صاحبہ کا کلام ارشاد فرما رہے ہیں ؎

نقش اس کا مٹنا ہے اک نہ اک بہانے سے
زندگی مشابہ ہے خواب سے فسانے سے
داد لالہ کاری کی جب ملے زمانے سے
باز آئیں کیوں آنکھیں اشک خوں بہانے سے
یہ تو شرط رندی ہے اس پر معترض کیوں ہو
باز آ نہیں سکتے پاؤں لڑکھڑانے سے

ایک صاحب فرما رہے ہیں اس شعر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ منوّر صاحب گھر میں چھپ کر پیتے بھی ہیں، تبھی تو محترمہ پاؤں لڑکھڑانے کا تجزیہ فرما رہی ہیں، سنیئے محترمہ کس قدر اچھے شعر کہہ گئی ہیں ؎

محفلِ محبت میں خود نظر بتا دے گی
کس کو ہے پریشانی کس کا ذکر آنے سے
جو مری کہانی ہے وہ مری کہانی ہے
آپ کیوں ملاتے ہیں اس کو ہر فسانے سے
صبح کے تبسم نے حوصلہ بڑھایا ہے
باز آئیں گی کلیاں اب نہ مسکرانے سے
اس زمیں میں کہنے سے لطف بے حد آیا ہے
شعر شرم کہتی ہیں یوں تو اک زمانے سے

محترمہ شرم صاحبہ کے مندرجہ بالا اشعار پر خوب داد دی گئی ہے اور اب جناب کالی چرن صاحب اثر اپنی غزل فرما رہے ہیں ؎

زخم مسکراتے ہیں دل پہ چوٹ کھانے سے
ہے طبیعت اپنی کچھ مختلف زمانے سے

دل شگفتہ ہو جائے اشک خون بہانے سے
ہم نبھاتے جائیں گے ہر طرح زمانے سے

ایک بار جھک جائے جس کے آستانے پر
پھر نہ سر اٹھے ہرگز اس کے آستانے سے

اثر صاحب کے اشعار خوب ہیں مگر پڑھتے یہ بھی کچھ ایسا ویسا سا ہی ہیں لہٰذا جس قدر داد انھیں ملنی چاہیئے وہ نہیں مل رہی ہے ان کے دو شعر اور بھی سنیئے ارشاد فرماتے ہیں ؎

موت چیخ رہی ہے اب ہر طرف زمانے میں
زندگی کی اہمیت اٹھ گئی زمانے سے

خونِ دل اثر اک دن رنگ لائے گا آخر
سرخیاں جھلکتی ہیں زیست کے فسانے سے

جناب اثر غزل سنا کر اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور اب اعلان ہوا ہے کہ جناب منشی گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی ڈپٹی سپیکر دہلی سٹیٹ اپنا کلام فرمائیں گے حضرت امن مائیک پر تشریف لا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ صرف ایک ہی شعر کہا ہے اور اس کا بھی ایک مصرع موزوں ہے اور ایک ناموزوں اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے

خامکاری ہمت عجز ناخن تدبیر
ہے گلہ مقدر کا شکوہ ہے زمانے سے

حضرت امن کے بعد قبلہ مولانا ابر احسنی گنوری نگران رسالہ احسن رام پور سے گذارش کی گئی ہے کہ اپنے کلامِ بلاغت نظام سے محظوظ فرمائیں۔ سنیئے قبلہ مطلع فرما رہے ہیں ؎

آج تک نہیں بیٹھے ہم کہیں ٹھکانے سے
کس گھڑی کے اٹھے ہیں تیرے آستانے سے

مطلع پر اچھی داد دی گئی ہے اور مولانا فرما رہے ہیں ؎

غیر جلیاں کب ہیں جیسے گلستاں اپنا
ہم نہ باز آئیں گے آشیاں بنانے سے

اس شعر پر بہت زیادہ داد دی گئی ہے۔ اور قبلہ فرما رہے ہیں ؎

داستاں قیامت کی دبے ہی دی گئی ترتیب
لیجیے کچھ ورق میری زیست کے فسانے سے

آندھیوں سے کھیلو نگاہری کے قدم لو نگا
پہلے سوچ رکھا ہے آشیاں بنانے سے

اہل جان سر شاید بخشو دی گئیں مجھ کو
گردشیں زمانے کی چھین کر زمانے سے

جناب ابر کو ان اشعار پر بہت زیادہ داد ملی ہے اور فی الحقیقت مولانا کی غزل آج کی بہترین غزلوں میں سے ہے سنیئے محترم کتنے اچھے شعر فرما رہے ہیں ؎

پیار آ بھی جاتا ہے لغزشوں پہ رحمت کو
مل بھی جاتی ہے منزل پاؤں ڈگمگانے سے

داغِ عشق کا مٹنا چارہ گر نہیں ممکن
سو چراغ جلتے ہیں اک دیا بجھانے سے

اس شعر پر تو خوب داد دی گئی ہے اور ابر صاحب فرما رہے ہیں ؎

کیوں مری پکار اس کے کان تک نہیں جاتی
میں نکل گیا آگے غالبؔ زمانے سے

تم ہی تم ہویدا ہو تم ہی میں نمایاں ہوں
داستانِ ایمن سے دار کے فسانے سے

خون رو رہا ہے دل اور ہنس رہا ہوں میں
غم کی شان بڑھتی ہے ابر مسکرانے سے

قبلہ بہت زیادہ داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئے ہیں اور اب جناب پنڈت ولستہ پرشاد صاحب فدا کلام سنانے مائیک پر تشریف لا رہے ہیں۔ فدا صاحب نے غزل نہیں دو غزلہ کہا ہے چونکہ فدا یہ عمر رسیدہ ہوتے جا رہے ہیں کلام میں حسن و عشق اور رنگینی کے جذبات زیادہ نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ پڑھتے ترنم سے ہیں جو ان کے کلام سننے والوں کے لئے اور بھی ناقابل برداشت ہوتا ہے اس دو غزلہ میں سے صرف دو تین شعر پیش کئے جا رہے ہیں فرماتے ہیں ؎

ہم سفر نہ تو گھبرا، ہو کے منتشر سے
ناؤ ڈگمگائے گی تیرے ڈگمگانے سے
عارضی سی رونق پر بھولنا نہیں اچھا
لے نہ کچھ گیا کوئی اس طلسم خانے سے
اے خدا حرارت ہے خون میں نہ جنبش ہے
ولولے جوان کے ہو گئے فسانے سے

ندا صاحب کے بعد جناب احقؔ لکھنؤی سے گذارش کی گئی ہے کہ چند حضرات ان کا غیر طرحی کلام سننا چاہتے ہیں لہٰذا وہ تشریف لے جانے سے پہلے اپنا غیر طرحی کلام سنا کر ممنون فرمائیں، اس کے بعد قبلہ احسن صاحب نے دو غیر طرحی غزلیں سنائی ہیں اور خوب داد پائی ہے اور آپ کے بعد جناب واقف امروہوی نے کچھ قطعات اور اپنی مشہور نظم "قومی زبان" سنائی ہے واقف صاحب نظم سنا رہے تھے کہ بچہ نے رونا شروع کر دیا ہے اس پر واقف صاحب فرمانے لگے کہ یہ بیک گراؤنڈ میوزک بند کرا دیجیے۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور بچہ نے اس قہقہہ کے بعد رونا بند کر دیا ہے جناب واقف امروہوی کے بعد جناب حکیم خلیل الرحمٰن صاحب نازؔ میونسپل کمشنر مائیک پر تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں ؎

چرخ کو کہاں فرصت بجلیاں گرانے سے
لاگ اس کو رہتی ہے میرے آشیانے سے
آندھیاں ہوں طوفاں ہوں بجلیاں ہوں باراں ہوں
یہ اڑا نہیں سکتے مجھ کو آشیانے سے
دشمنوں کو شکوہ کیا دوست بھی ہیں مطلب کے
تنگ کے اب کہاں جاؤں ہائے اس زمانے سے
جو عدو تھا کل وہ آج دوست نا ممکن
میں غلط جو کہتا ہوں پوچھ لو زمانے سے

جناب نازؔ صاحب کو مناسب داد ملی ہے اور آپ کلام سنا کر اپنی جگہ پر آگئے ہیں اور اعلان ہوا ہے کہ جناب راوت ارمان صاحب اپنا کلام سنائیں گے۔ راوت ارمان صاحب مائیک کے سامنے بیٹھے ہی تھے کہ ایک صاحب نے دریافت کیا جناب کا اسم گرامی آپ نے فرمایا ہے کہ ایس بی راوت ارمان۔ نام پوچھنے والے صاحب نے دوبارہ دریافت کیا کہ ایس بی کیا ہوا پورا نام کیا ہے۔ ارمان صاحب عجیب نخرے سے فرمانے لگے جی یہی میرا نام ہے اس پر پہلے تو کچھ جھنجھلا گئے ہیں اور کہنے لگے سردار صاحب انگریز تو چلا گیا مگر اپنے پیچھے ایس بی راوت صاحب کو چھوڑ گیا ہے میں نے جواباً عرض کیا ہے حضور بلکہ یوں کہیے کہ ڈائن چلی گئی ہے مگر دانت چھوڑ گئی ہے اس پر پاس بیٹھے ہوئے شعراء میں قہقہہ بلند ہوا ہے اور ارمان صاحب فرما رہے ہیں ؎

زندگی تھی وابستہ اپنی حبس خانے سے
یاس کی نظر نے وہ کہہ دیا زمانے سے

مطلع پر کچھ داد ملی ہے اور اس کے بعد ارمان صاحب نے تین شعر معمولی سے سنانے کے بعد فرمایا ہے ؎

اتنی ہی نشیمن کی یاد آئے جاتی ہے
جس قدر بھی ہوتا ہوں دور آشیانے سے
گھوم پھر کے آپہنچا ابتدائے جادہ پر
تنگ پا بہ منزل ہوں راہ خود بنانے سے
زندگی اسی کی ہے بندگی اسی کی ہے
جس کے سر کو نسبت ہے تیرے آستانے سے
کس قدر تھی بے چینی زندگی کی شورش میں
ہو گئی مجھے فرصت موت کے بہانے سے

ارمان صاحب کا نام دریافت کرنے والے صاحب فرما رہے ہیں سردار صاحب ارمان شکل سے ہندو معلوم ہوتے ہیں، نام انگریزوں کا سا بتاتے ہیں اور کلام مسلمانوں کا سا ہے میں نے جواباً عرض کیا ہے کہ "سہ آتشہ" نسبتاً اچھی ہوتی ہے اس پر شعراء میں خوب قہقہہ پڑا ہے اور ارمان صاحب مقطع سنا کر اپنی جگہ پر تشریف لے جا رہے ہیں اور گلزار صاحب اعلان فرما رہے ہیں کہ اب جناب پروفیسر تلوک چند صاحب محروم اپنا کلام سنائیں گے۔ محترم محروم صاحب مائیک پر تشریف

نے گئے ہیں۔ اور ایک رُباعی سُنائی ہے چونکہ محروم صاحب ترنم سے پڑھنے والے نہیں اس لئے بسمل صاحب نے التجا کی ہے کہ حضور شرف مجھے بخشا ہوتا تو بہتر تھا اس پر محروم صاحب نے غزل بسمل شاہجہاں پوری کے حوالے کر دی ہے اور آتے ہیں کہ وہ ریہرسل کر لیں لہٰذا جناب بابو رام صاحب شریف سے غیر طرحی کلام سُنا گیا ہے اور اتنے میں بسمل صاحب محترم محروم صاحب کی غزل کو دو چار مرتبہ پڑھ کر اور سُر تال کو ٹھیک کر کے مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور گلزار صاحب نے اعلان کیا ہے کہ بسمل صاحب قبلہ محروم صاحب کا کلام سُنائیں گے۔ اس پر بسمل صاحب چمک اُٹھے اور کہہ رہے ہیں کہ میں بیشک مفلس سہی اور میں عرض کرتا ہوں کہ افلاس سب سے زیادہ پستی ہے، اور بلندی بھی، مفلسی سے دبا ہوا ہوں۔ دگر نہ بہت سے اُستاد بھی دیکھے ہیں، گلزار صاحب کہہ رہے ہیں کہ بسمل صاحب نے نہایت بے موقع اور بے محل بات کہی ہے ایک صاحب فرما رہے ہیں کہ یہ پہلے کونسی بامعنی بات کیا کرتے تھے۔ جواب کرتے، سُنئے بسمل صاحب محترم محروم صاحب کا کلام سُنا رہے ہیں ؎

جب سے تو ہوئی رُخصت اے وفا زمانے سے
اہلِ دل اُٹھا۔ بیٹھے ہاتھ دل لگانے سے
اس شراب خانے سے دُور ہے بہت مسجد
شیخ جی یہاں پہنچے آپ کس بہانے سے

بسمل صاحب کافی ریہرسل کے باوجود محروم صاحب کے شعر غلط پڑھ رہے ہیں جس سے سارا لطف ختم ہو جاتا ہے محترم محروم صاحب بار بار اصلاح کرتے ہیں اس کے بعد بسمل قبلہ کا کلام فرماتے ہیں ؎

کیا خطا گلستاں کی ہم کہیں بنا لیتے
برقِ بے اماں کو تھی لاگ آشیانے سے

زندگی سے ترساں ہے موت اب تلک شاید
مُنہ چھپا کے آتی ہے ورنہ کیوں بہانے سے

مقطع میں محروم کی بجائے قبلہ نے تلوک کو مخفف کر کے تلک بجائے تخلص باندھا ہے۔ در اصل طالب صاحب مصرع ہی اب تجویز کیا ہے۔ جس میں کافی قباحتیں ہیں۔ محروم صاحب کے کلام کے بعد جناب ابر احسنی گنوری سے گزارش کی گئی ہے کہ وہ غیر طرحی کلام سُنائیے چنانچہ قبلہ ابر صاحب نے غیر طرحی غزل سُنائی ہے اور اتنی وجہ ہی ہے کہ شاید اس مشاعرہ میں کسی مصرعہ طرح کرنے کی ہمت نہ ہوئی جبکہ غیر طرحی کلام کے بعد جناب صدر قبلہ منوّر لکھنوی سے کلام سنانے کی گزارش کی گئی ہے۔ اور آپ نے فرمایا ہے۔

زخم زخم گلشن ہے کس کے مسکرانے سے
پھول بن گئے کانٹے دل میں ٹوٹ جانے سے

مطلع پر داد دی گئی ہے اور آپ نے فرمایا ہے

رنگ و بُو کی دُنیا میں سیر کے بہانے سے
مُرغِ روح نکلا ہے اپنے آشیانے سے

کیسے آندھیاں آئیں کیسے بجلیاں ٹوٹیں
دیکھتا رہا سب کچھ میں یہ آشیانے سے

اس شعر پر منوّر صاحب کو خوب داد دی گئی ہے اور قبلہ فرماتے ہیں ؎

آگہی کے جلوؤں میں ظلمتیں پریشاں ہیں
دُور ہر اندھیرا ہے روشنی میں آنے سے

گلستاں سے بھی بڑھ کر خواہ اس میں راحت ہو
دُور ہی قفس رکھئے میرے آشیانے سے

اس میں خلوتیں بھی ہیں اس میں جلوتیں بھی ہیں
ہے دلِ حسیں بہتر ہر نگار خانے سے

منوّر صاحب بہت اچھی داد پا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں ؎

ظلمتوں میں گم ہو کر خود فسانہ بن جائے
دُور کیوں حقیقت ہو التفات پانے سے

زندگی کو دیکھو تو کتنے رُخ بدلتی ہے
اک قفس کے آنے سے اک قفس کے جانے سے

اک نہ اک بہانہ خود جان ڈھونڈ لیتی ہے
جان کو تو جانا ہے اک نہ اک بہانے سے

خاک میں ملاؤں کیا اس کی آبرو ہمدم
سر کو قدر و قیمت ہے جس کے آستانے سے

اہلِ باغ گلشن میں اب یہ کہہ نہیں سکتے
پہلے آگ پھیلی تھی کس کے آشیانے سے

کس لئے منور تم وقفِ ناامیدی ہو
کیا تمہیں توقع تھی آخر اس زمانے سے

منور صاحب نے خوب داد پائی ہے اور اب طالب صاحب شعراء اور سامعین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہتے ہیں کیونکہ سبھا والوں سے یہ وعدہ تھا کہ ۹ بجے مشاعرہ ختم کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اس کے بعد یہاں قوم کی مشقوں کے لئے ایک ڈرامہ کھیلا جانا ہے لہٰذا ہم مشاعرہ اس مجبوری کے باعث اب ختم کر رہے ہیں ـــ ـــ ـــ ـــ

شاعرِ نغمہ سے

توصیف علی عاصی کیرانوی

اے شاعرِ نغمہ نگت اے شاعرِ سحر البیان
اے خوش نوا خوش گلو اے بلبلِ شیریں بیاں

تو ترنم ساز بھی ہے اور خوش آواز بھی
تو نے پایا ہے گلے میں سوز بھی اور ساز بھی

آج شعر و شاعری کی شان کہلاتا ہے تو
محفلِ داد و سخن کی جان کہلاتا ہے تو

لحنِ داؤدی میں جب پڑھتا ہے تو اپنی غزل
ہر طرف کھل اٹھتے ہیں رنگیں مزاجوں کے کنول

تیرے دم سے آج ہے پُر نور ہر بزمِ سخن
تجھ سے ہی رنگین ہے ہر شاعری کی انجمن

جھوم اٹھتا ہے زمانہ جب تری آواز پر
فخر ہوتا ہے تجھے اپنے ہر اک انداز پر

تو سمجھتا ہے کہ میں ہوں داغ بھی اور میر بھی
آج کا مومن بھی ہوں اور غالبِ دلگیر بھی

تجھ کو ہے لیکن خبر بھی اب ہے ترا افسانہ کیا
کہتی ہے خلقِ خدا تجھ کو یہ غائبانہ کیا

کھنچ رہی ہے آج دنیا میں تری تصویر کیا
ہے زمانہ کی نگاہوں میں تیری توقیر کیا

ہو گیا ہے دیکھ دامن تیرا کتنا داغدار
"پیشہ ور فنکار" میں ہونے لگا تیرا شمار

"بزمِ موسیقی" بنا دی تو نے ہر بزمِ سخن
تو نے رسوا کر دیا ہے شعر گوئی کا چلن

تو کیا کرتا ہے جس طرح سے سودے بازیاں
اس سے ہوتی ہیں ادب کی بے طرح رسوائیاں

اک غزل پر آج کرتا ہے تو ہزاروں کی بات
اور وہ بھی اک غزل ہوتی ہے جو تیری کائنات

تو نے خود داری لٹا دی چند سکوں کے لئے
بیچ ڈالا تو نے فن کا تقدس ٹکوں کے لئے

تو بنا پھرتا ہے جس اردو زباں کا پیشوا
کس قدر خوں تو نے اس کی آبیاری میں دیا

کتنے سینچے ہیں لہو سے تو نے اس کے لالہ زار؟
حق سمجھتا ہے تو اپنا جس کی ہر رنگیں بہار

تو نے اس کے غم میں کیا آنسو بہایا ہے کوئی؟
اس کے زخموں پر کوئی پھاہا چڑھایا ہے کوئی؟

کتنے طوفانوں میں تو اس کا بڑھا لے کر علم؟
تو نے اس کی منزلوں میں کتنے رکھے ہیں قدم

جاں نثاری تو نے کی ہے کتنی اردو کے لئے
کتنے تحفے تو نے اس کو اپنی کاوش سے دیئے

کیا اسی کا نام رکھ چھوڑا ہے اردو دوستی
اک غزل پڑھ دی ہزاروں بار بھی کہہ کر نئی

کیا یہی اردو نوازی ہے ذرا کچھ سوچئے
خوش گلوئی کے سہارے عمر بھر جیتے رہے

کیا یونہی پائے گی یہ اردو زباں اپنا مقام
کیا یہی دنیا کو ہے اردو کی عظمت کا پیام؟

کیا یہی اردو ادب کی ہیں روایاتِ قدیم
کیا یہی شعر و سخن کے ہیں نشاناتِ عظیم

فخر کرتا ہے تو اپنے آج جن اشعار پر
کیا کبھی تولا ہے ان کو فن کے بھی معیار پر

تو نے سمجھا ہے کبھی یہ کھیل ہے آواز کا
کچھ کرشمہ سوز کا ہے کچھ کرشمہ ساز کا

جب کہ مرجھا جائیں گے یہ خوش گلوئی کے کنول
کون پوچھے گا جہاں میں پھر ترے رنگیں غزل

نام آئے گا نہ پھر تاریخ کے صفحات پر
ہو کے گم رہ جائے گا بکھرے ہوئے ذرات میں

اِمتحان

ڈاکٹر اوصے ٹرن آرمان (بلندی)

"ابا جان آپ اپنے چمن سے کسی کو بھی پھول توڑنے نہیں دیتے مگر ابھی ابھی جو پنڈت جی گئے ہیں اُن کو آپ نے منع کیوں نہیں کیا جب کہ وہ ہر روز پھول توڑ کر لے جاتے ہیں"۔ ڈاکٹر افتخار حسین کے لڑکے نے شکایتی لہجے میں اپنے باپ سے کہا۔

"بیٹے اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ہمارے پڑوسی ہیں دوسرے وہ صرف پانچ ہی پھول توڑتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اُن پھولوں کو وہ ایک مقدس کام کے لئے لے جاتے ہیں"۔

"کون سے مقدس کام کے لئے"؟

"مندر میں بھگوان کو چڑھاتے ہیں"۔

"کیا پھولوں کے بغیر پوجا نہیں ہو سکتی"؟

"اُن کا ایسا ہی خیال ہے"۔

"جب دُنیا میں پھول نہیں تھے تو یہ لوگ کیسے پوجا کرتے تھے"؟

"پھول ہی دُنیا میں پہلے پیدا ہوئے انسان بہت بعد میں"۔

"اچھا ابا جان یہ بتائیے میں نے کہیں پڑھا ہے کہ بھاگیرتھ جی نے پوجا کر کے گنگا جی کو آسمان سے اُتارا تھا۔ پر وہ شیو جی کی جٹاؤں میں سما گئی تھیں۔ بعد میں اُن کی بھی پوجا کی گئی تو شیو جی نے جٹائیں نچوڑ دیں اور گنگا بہنے لگیں۔۔۔" ابھی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ باہر آواز آئی۔

"ڈاکٹر صاحب آج ٹہلنے نہیں چلنا ہے"؟ وہ اُن کے بے تکلف دوست تھے قدرت اللہ۔

"آج بچے کی وجہ سے دیر ہو گئی، معاف کیجئے گا"۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا اور چلتے چلتے انہیں اپنے بیٹے کی تمام باتیں سُنا دیں۔

"بچے تو کبھی کبھی بڑی بڑی عجیب باتیں پوچھ لیتے ہیں۔ کل میرا لڑکا اخبار پڑھتے پڑھتے بولا "ابو گاؤں والوں کو شہر والے گنوار کیوں کہتے ہیں"؟

"کیوں کہ شہری لوگ اپنے آپ کو دیہاتیوں سے زیادہ مہذب تعلیم یافتہ، ہوشیار اور چالاک سمجھتے ہیں"۔ میں نے بیٹے کو جواب دیا تو وہ بے ساختہ بولا "آپ نے آج تک کسی بھی گاؤں میں ہندو مسلم فساد کا کوئی قصہ اخبار میں پڑھا یا کسی سے سُنا"؟

"کبھی نہیں" میں نے کہا

"کیا کبھی کسی گاؤں میں کرفیو لگتے سُنا"؟

"بالکل نہیں بیٹے"۔ میری بات سنتے ہی وہ اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے بولا "اس پر بھی یہ شہری لوگ اپنے آپ کو مہذب کہتے ہیں"۔ ڈاکٹر صاحب اپنے لڑکے سے یہ باتیں سُن کر میں تو بالکل خاموش رہ گیا کوئی جواب ہی نہ بن پڑا مجھ سے"۔

دونوں باتیں کرتے کرتے اُس دُکان پر پہنچ جہاں سے وہ صبح سویرے پان کھا کر ہی ٹہلنے نکلتے تھے۔ "ہاں بھئی رام نواس"۔ ڈاکٹر صاحب کے اس ادھورے جملے کا پورا مطلب سمجھتے ہوئے رام نواس نے عاجزی کے ساتھ کہا "جی حضور ابھی بناتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اُس نے جلدی جلدی ہاتھ چلانے شروع کر دیئے۔

"ویشنو ہوٹل کا کیا مطلب ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب"؟ سامنے ہوٹل پر لگے سائن بورڈ کو پڑھتے ہوئے قدرت اللہ نے پوچھا۔

"ایسا ہندو ہوٹل جس میں مانس واس نہیں پکتا ہو"۔

"مگر میں نے تو دیکھا ہے کہ گوشت خوروں کے لئے یہ دوسرے ہوٹل سے گوشت لا کر سرو کر دیتے ہیں"۔

"یہ دُکان داری کی باتیں ہیں"۔ سامنے سے آتی ہوئی ایک حسینہ کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے قدرت اللہ کو ہنس کر ٹال دیا۔ قدرت اللہ بھی ٹھٹھکا وہ بھی اُدھر ہی دیکھنے لگا۔ لیکن اُس نے ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس طرف سے ہٹانے کے لئے چٹکی بھی لی۔ "ڈاکٹر صاحب اس پنواڑی کی دُکان پر جو ہندو کا فوٹو لگا ہے یہ اُس سے زیادہ حسین ہے"۔

"ہاں ہاں مگر آپ لوگ تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھتے ہیں"۔ اسی دوران میں حسینہ قریب آ گئی اور آن کی آن میں آگے بڑھ گئی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر صاحب۔ ابھی تو برسوں اس

پیشنٹ کو اندر لے گئے تو پھر کافی دیر تک باہر نہ آئے۔"

"کون سا پیشنٹ؟"

"جس کی گود میں چھوٹا سا ایک بچہ تھا۔ جب وہ باہر نکلی تو مسکرا رہی تھی۔ تم بھی بہت خوش تھے یاد آیا؟"

"دیکھو قدرت بھائی ویسے تو سب آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر نظر نظر میں فرق ہوتا ہے۔ وہ عورت اپنے بیمار بچے کو لائی تھی میں نے اسے مناسب دوا دے دی اور کچھ دوائیں بازار سے خریدنے کو بھی لکھ دیں جو اس وقت میرے پاس نہیں تھیں۔ اور کہہ دیا جب کل تم آؤ تو یہ دوائیں بھی لیتی آنا۔ میں اُن کا طریقۂ استعمال سمجھا دوں گا جب وہ صبح کو آئی میں نے ترکیبِ استعمال سمجھاتے سمجھاتے جو اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو مجھے اُس کی ناک بغیر پھول کے دکھائی دی جب کہ اس کی ناک میں کل سونے کا پھول تھا۔ آج اس کی جگہ جلد پر گورا گورا پھول کے برابر نشان تھا جو پھول کے نیچے ڈھکا رہتا تھا اور ایسے لگ رہا تھا جیسے پتے ہوئے اُپلے کے نیچے سے دوب گھاس نکل آئی ہو۔ میں کئی باتیں سوچتا رہا کہیں کھو گیا یا کسی نے چھین لیا مگر میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا اور میں یہ جاننا بھی چاہتا تھا کہ وہ پھول کہاں گیا۔ آخر کار میں اُسے اندر لے گیا اور اس سے بولا "بیٹی تو مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھ اور جیسے ایک بیٹی اپنے باپ سے کچھ نہیں چھپاتی ہے تو بھی مت چھپانا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ سونے کا پھول کہاں گیا؟" یہ سُن کر اس نے بڑے معصوم انداز سے میری طرف دیکھا اور نظر جھکا کر بولی "اُسے سَو روپے میں گروی رکھ کے دوائیں لے آئی۔"

یہ سُن کر میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا "بیٹی یہ تو تُو نے ٹھیک ہی کیا جو غریبی میں زیور گروی رکھ کر کام چلا لیا اور قرض کی دیکھ سے بچ گئی اب ایک کام کر" میں نے سَو روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ لے اور ادھر جاتے ہوئے اُس پھول کو چھڑا لینا۔ کل جب دوا لینے آئے تو پھول پہن کر آنا سونی ناک اچھی نہیں لگتی ہے۔ سہاگ کی نشانیوں کو جسم سے الگ نہیں کرتے ہیں" یہ سُن کر وہ جھجکی اور ہاتھ پیچھے کھینچ لیا یہ اُس کی شرافت اور خودداری کی علامت تھی میں نے اُسے سمجھایا "بیٹی بچے کو اپنے باپ سے جو کچھ ملے خوشی سے لینا چاہیے اُسے لینے کا حق بھی ہوتا ہے یہ ساری باتیں اپنے گھر جا کر اپنے شوہر سے بھی بتا دینا تاکہ تم دونوں کے بیچ کسی قسم کا شک نہ جنم لے۔"

یہ سُن کر وہ مسکرائی، میرے پیر چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر نوٹ لے کر مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی میں بھی اسی لئے خوش تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ کسی ضرورت مند کی مدد کرنے میں دل کو خوشی ہوتی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جو میں نے رمضان کے مبارک میں ایک اچھا کام کیا۔"

"سمجھ گیا ڈاکٹر صاحب، معافی چاہتا ہوں میں نے ناحق آپ پر بدگمانی کی۔۔ رام نواس پان بن گئے کیا؟" قدرت اللہ نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی دیتا ہوں صاحب، میں آپ لوگوں کی باتوں میں بنانا ہی بھول گیا تھا۔"

"تمہیں ہماری باتوں میں کیا مل رہا تھا۔ تم دکان داری ہو باتوں سے کیا لینا... رام نواس! آج تک ہم نے تمہاری ٹانگ بابت کچھ نہیں پوچھا کہ یہ کیسے کٹی۔"

"ڈاکٹر صاحب یہ پوچھ کر کیا کرو گے اس کی بڑی دُکھ بھری کہانی ہے" وہ پان لگاتے ہوئے بولا "ایک بار میرے گھر ڈکیتی پڑی تھی ٹانگ پر گولی لگ گئی۔ تمام جمشید پور میں دکھایا کسی سے علاج نہیں ہوا۔ آخر کار آل انڈیا میڈیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہلی میں داخل ہوا اور وہیں سے مجھے لنگڑے کا خطاب ملا یعنی میری ٹانگ کاٹ دی گئی۔ اُس وقت میں ابھی پڑھ رہا تھا اور شادی شدہ تھا۔ اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو آج اتنی محنت مشقت کرنی نہ پڑتی۔"

"تب تو اچھا ہوا تمہاری شادی ہو گئی تھی ورنہ نکمے بن جاتے" یہ سُن کر وہ مسکرا دیا "تم کون سی کلاس میں پڑھتے تھے؟"

"بارہویں کلاس کا امتحان دیا تھا ڈاکٹر صاحب جب میرا نتیجہ آیا تو میری ٹانگ مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے کالج میں ممتاز حیثیت پائی تھی۔ سب مجھے شاباش دے رہے تھے اور میں تھا کہ رو رہا تھا۔"

"کیوں کہ تمہاری ٹانگ کٹ گئی تھی۔" قدرت اللہ نے کہا

"لنگڑے لولے کیا پڑھتے نہیں ہیں۔ ملال یہ تھا کہ میری ڈاکٹری کا خواب مٹی میں مل گیا تھا"

"کیا تمہارے پاس بھی بایولوجی تھی؟"

"جی"۔ ظلم نواز ست ہوکر بولا۔

ڈاکٹر صاحب پان کا بیڑا ہاتھ میں لئے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کھڑے کھڑے سوچ رہے تھے کہ اتنے ہونہار تو وہ بھی نہیں تھے۔ قدرت اور قسمت بھی منہ دیکھ کر انصاف کرتی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے۔ پان منہ میں رکھتے ہوئے چل دیئے۔

"ڈاکٹر صاحب ذرا ٹھہریئے۔ یہ لیتے جایئے"۔ ظلم نواز نے کہا

"کیا ہے"؟ ڈاکٹر صاحب نے متعجب ہو کر کہا۔

"بہرحال جس لڑکی کو آپ نے منو کا خون دیا تھا وہ میری بیوی تھی۔ اُس نے آپ کی شرافت اور انسانیت کا سارا قصہ مجھے سنا دیا تھا اچھا ہوا اس وقت آپ آگئے ورنہ میں اُسی کے ہاتھ یہ روپے آپ کے اسپتال میں بھجوا دیتا آپ کی غریب پروری کا بہت شکریہ"

"غریبی کوئی مصیبت نہیں ہے جو اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے جائیں یہ تو ایک امتحان ہے اور ایمان والے اس کا مقابلہ کرتے ہیں برکت اپنی ہی کمائی میں ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب"۔

غزل

مخترِ افغانی
بالس واڑہ

پھول کے آس پاس ہیں کانٹے
پھر بھی کتنے اُداس ہیں کانٹے

گُل کھِلے تو اُداس ہیں کانٹے
کتنے موسم شناس ہیں کانٹے

ہے ابھی موسمِ بہار مگر
جانے کیوں بے لباس ہیں کانٹے

ہم سے پھولوں کی گفتگو نہ کرو
ہم کو گلشن میں راس ہیں کانٹے

کوئی پھولوں کو چھو نہیں پائے
اس لئے آس پاس ہیں کانٹے

پیشِ گلچیں محبتِ گل میں
پیکرِ التماس ہیں کانٹے

آئے جیو نکر خیالِ گل مخترؔ
جب قرینِ قیاس ہیں کانٹے

غزل

[ڈاکٹر پرکاش چندر بنسل پرکاشؔ (ایمفلائی)

["ڈاکٹر پرکاش چندر بنسل ہندی اور انگریزی میں اچھی خاصی دسترس رکھتے ہیں۔ ان کا ہندی کلام اس دور کی ہندی شاعری کا بہترین پرتو کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے اردو لکھنا پڑھنا سیکھا اور کچھ ہی عرصہ میں انہوں نے اپنی طبع موزوں کو اردو شاعری کی راہ پر گامزن کیا اور اچھی خاصی غزلیں کہنے لگے ہیں۔ ذیل کی غزل ڈاکٹر پرکاشؔ نے اپنے قلم سے اردو میں لکھ کر برائے اشاعت بھجوائی ہے جسے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے"۔ (ادارہ)]

یہ کرشمہ ہے ہمارے نالۂ شب گیر کا
صبحِ رنگیں رنگ اُڑا لائی تری تصویر کا

چاک ہیں جیب و گریباں پاؤں میں زنجیر ہے
حال اب بھی پوچھتے ہو عاشقِ دلگیر کا

صبح ہونے کو ہے نیند آنے لگی بیمار کو
رُخ بدلتا جا رہا ہے زیسنک تصویر کا

اب سبکدوشی غمِ دنیا سے حاصل ہو گئی
سر پہ یہ احسان ہے قاتل تری شمشیر کا

نفرتوں کی آگ میں جلنے لگے دَیر و حرم
دیکھ لیں شیخ و برہمن شعبدہ تقریر کا

آج میرے ساتھ واعظ میکدے میں چل ذرا
تجھ کو منظر میں دکھا دوں وادیٔ کشمیر کا

جی میں آتا ہے کہ بیعِ جارت دن کرتا رہوں
کیسا عالم ہے خدا جانے تری تصویر کا

حکمِ شیریں سے رواں ہے تیشۂ فرہاد یوں
جوئے خوں پر بھی گماں ہوتا ہے جوئے شیر کا

اب دلِ بے تاب اپنے پرکاشؔ قابو میں نہیں
ہر نشانہ ہے خطا اُن کی نظر کے تیر کا

غزلیات

لکشمی نارائن فارغ (جے پور)

دل اگر مائلِ مسرت ہے
خوگرِ کیفِ غم طبیعت ہے
اس کا حل ہے نہ ہے کوئی تغیر
زندگی قاعدۂ مشیت ہے
اس جہانِ خراب کی رونق
فتنۂ زیست کی بدولت ہے
کیوں نہ بت سے مجھے عقیدت ہو
بت بھی تو مظہرِ حقیقت ہے
مجھ کو اس فتنۂ قیامت سے
کوئی شکوہ نہ اب شکایت ہے
مہرِ خاموشیٔ لبِ اظہار
شدتِ درد کی علامت ہے
ہائے تبدیلیٔ مزاجِ حیات
زیست آزردۂ مسرت ہے
کارفرما مری رگ و پے میں
اب بھی ہنگامۂ محبت ہے
نوجوانی اگر قیامت تھی
عہدِ پیری بھی اک مصیبت ہے
نوجوانی کی آبرو فارغ
جذبۂ عشق کی بدولت ہے

حکیم تسخیر فہمی

راجپوتانہ یونانی طبی کالج - جے پور

کسی کا غم ہے پریشاں مری تلاش میں ہے
مری حیات کا عنواں مری تلاش میں ہے

بس اس خطا پہ کہ شیوہ ہے میرا حق گوئی
صلیب تاک میں۔ زنداں مری تلاش میں ہے

مری حیات کی محرومیو! خدا حافظ
متاعِ عالمِ امکاں مری تلاش میں ہے

تمہارے غم کی پناہیں مجھے میسر ہیں
بلا سے گردشِ دوراں مری تلاش میں ہے

خود اپنے حسن میں گم ہو چکا ہوں میں جب سے
تمام شہرِ نگاراں مری تلاش میں ہے

مرے بغیر وہ رنگینیاں کہاں فہمی
کسی کی بزم ہے ویراں مری تلاش میں ہے

اخلاق سہسوانی

جب بھی دنیا کے ہنگاموں سے گھبراتا ہے دل
غالباً تیرے ستم میں کوئی خامی رہ گئی
رنج و غم ہو یا سرور و شادمانی کچھ بھی ہو
میں نے تجھ اس طرح دئیے ہیں وفاؤں کے فریب
اک وہ عالم تھا کہ ہر دن دل کو بہلاتا تھا میں
دل کو اب تابِ مسرت ہے نہ تابِ رنج و غم

آپ کے غم کی پناہوں میں چلا جاتا ہے دل
ورنہ غم کی لذتوں میں کیوں کبھی بہلتا ہے دل
پڑ گئی ہے ایک عادت سی کہ گھبراتا ہے دل
اب وفا کا نام سن کر بھی تڑپ جاتا ہے دل
اک یہ عالم ہے کہ ہر دن مجھ کو بہلاتا ہے دل
ہائے اب فطرت بھی اپنی بھولتا جاتا ہے دل

دیکھ اے اخلاق یہ ہے احترامِ بندگی!
جب خیالِ سنگِ در آتا ہے جھک جاتا ہے دل

بابِ انتقاد (ادارہ)

نئی اُردو قواعد

ترقی اُردو بیورو نے زیرِ نظر کتاب شائع کر کے عملی ثبوت دیا ہے کہ واقعی وہ ترقی اُردو بیورو ہے۔ کیوں کہ بقول مصنف "اردو پڑھے لکھے طبقے میں یہ غلط فہمی افسوسناک حد تک عام ہے کہ اہلِ زبان کے لئے اپنی ہی زبان کی قواعد کا مطالعہ تضیعِ اوقات کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ کسی زبان کی قواعد کا مطالعہ صرف اُن لوگوں کے لئے ضروری ہے جو یہ زبان سیکھنا چاہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ طلباء کو اپنی زبان میں صحیح جملے لکھنے کی مشق کرانے کے لئے قواعد کا علم جس قدر ضروری ہو بس اُسی سے کام لیتے ہوئے انہیں چند اصطلاحیں بتا دینا کافی ہے اس سے زیادہ نہیں۔"

اس قول کی تصدیق اکثر یوں ہوتی سکتی ہے کہ اردو لکھے پڑھے طبقے میں پچانوے فی صد لوگ اُردو کی صرف و نحو سے ناواقف ہیں چنانچہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے اُردو طالب علم صحیح طور پر چار سطریں غلط نہیں لکھ سکتے۔ اور ہمارے شعرائے کرام کی وافر تعداد ایسی ہے جو صرف و نحو کے لفظی معنوں سے بھی نا آشنا ہے۔

جناب عصمت جاوید یقیناً مبارکباد کے اہل ہیں جو متواتر تین سال تک اس کام میں لگے رہے اور یہ نئی اُردو قواعد ترتیب دی۔ مولوی عبدالحق کی قواعدِ اردو کو منظرِ عام پر آئے نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے اس کے بعد جو بھی درسی قواعدیں شائع ہو گئیں وہ تمام نے مولوی عبدالحق صاحب والی قواعدِ اردو سے ہی تراش لیں۔ اب بزیرِ نظر اردو قواعد ایسی کہی جا سکتی ہے جو تفصیلی طور پر لکھی گئی ہے اور اگر کوئی اسے بغور پڑھ لے تو وہ مولوی عبدالحق بن سکتا ہے۔

یہ کتاب سرکاری طور پر ہر ایسے اسکول میں لگائی جانی چاہیئے جہاں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ یہ کتاب ہر اردو مصنف کے مطالعہ کے لئے از حد ضروری ہے اور بلا شک و شبہ اس کتاب کے مصنف کو ساہتیہ اکاڈمی کے انعام سے نوازا جانا چاہیئے۔ کاش کہ ہمارے ملک میں کتابوں پر انعام کتاب کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ لگا کر دیئے جاتے نہ کہ کتاب کے مصنف کی ذاتی ضروریات یا دوست نوازی کے تحت دیئے جاتے۔

ہم مسٹر کے۔ کے۔ کھلر ڈائریکٹر ترقی اُردو بیورو کے ممنون ہیں کہ انہوں نے یہ کتاب شائع کر کے واقعی اُردو زبان کی خدمت کی ہے۔ ترقی اردو بیورو کی سابقہ روایات کے عین مطابق یہ کتاب ۲۴۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کی قیمت ساڑھے تین روپیہ ہے۔ ترقی اردو بیورو۔ ویسٹ بلاک ۸۔ آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی ۲۲ سے یا دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۶ سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

راست اور متبادل کرنٹ

از ڈاکٹر عبدالرشید انصاری۔ یہ کتاب بھی ترقی اُردو بیورو کی شائع کردہ ہے جو سائنس اور تکنیکی علوم پر مبنی ہے۔ سائنس کے طلباء اور برقی توانائی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب خاصی واقفیت اور مختلف طریقوں کا خزانہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ بلا شک و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ ترقی اُردو بیورو کے روایتی سائز کے ۲۹۰ صفحات کی یہ کتاب پندرہ روپیہ میں ناشر یا دفتر شانِ ہند سے دستیاب ہے۔

اُتر پردیش کے لوک گیت

ترقی اُردو بیورو کی یہ ایک اور قابلِ ذکر اور دلچسپ کتاب ہے جس کے مرتب اظہر علی فاروقی ہیں۔ ۲۳۲ صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب کو چار حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ حصہ اول عمومی جائزہ۔ لوک گیت، حصہ دوم طرزِ معاشرت، حصہ سوم تقریباتی (سنسکار) گیت اور حصہ چہارم پیشہ ور ذاتوں کے گیت پر مشتمل ہے۔ مگر اپنی بات میں فاروقی صاحب نے جس دلچسپ پیرائے میں اپنے اس کارِ نمایاں پر روشنی ڈالی ہے اُسے پڑھ لینے سے ہی کتاب کی

قیمت وصول ہوجاتی ہے۔ کتاب کے آخر میں "ان کا احسان میری گردن پر" بھی مطالعہ کی چیز ہے۔

الہٰ آباد کے فاروقی صاحب سے ایک مدت سے راقم الحروف کے نیازمندانہ تعلقات ہیں۔ اور ذاتی طور پر اس کا علم ہے کہ فاروقی صاحب ارادے کے پکے، دھن کے پکے اور عزم بالجزم کے لغوی معنی ہیں۔ ایسے لوگ گیت اور اس طرح تقریباً بیاسی گیت جمع کر لینا واقعی بقول مرتب یا تو ان کی ہمت ہے یا بے حیائی۔ اگر لفظ تحقیق کے اصل معنی جاننے کی ضرورت ہو تو اس کتاب کو پڑھیئے۔ آپ کو پتہ چل جائے گا کہ تحقیق کس مصیبت کا نام ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شارب ردولوی صاحب کے عہد میں ترقی اردو بیورو نے بہت ہی اچھی، کارآمد اور قابل تعریف کتابوں کو اشاعت کے لئے منتخب کیا جن میں ایک یہ زیر نظر کتاب بھی ہے۔ دیویندر ستیارتھی اور اسی قماش کے دوسرے حضرات جنہوں نے لوک گیتوں کی فراہمی میں دلچسپی لی فاروقی صاحب کی اس تالیف کی موجودگی میں سب بونے نظر آتے ہیں۔ اتر پردیش اردو اکادمی کے ذمہ دار ارکان اگر سفارشی دباؤ اور احباب نوازی سے اوپر اٹھ سکیں تو فاروقی صاحب یقیناً تین ہزار روپیے کے انعام کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب انتیس روپیے پچیس پیسے میں اردو ترقی بیورو یا دفتر شان ہند سے منگائی جا سکتی ہے۔

"قدیم لکھنؤ کی آخری بہار"

اس کتاب کے مؤلف مرزا جعفر حسین صاحب اپنی اس تالیف کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "ایک مدت دراز سے قدیم لکھنؤ کی آخری بہار کو معرض تحریر میں لانے کے لئے ہر چہار جانب سے مطالبے ہو رہے تھے اور جب کبھی کسی میگزین کے کسی شمارے میں اس موضوع سے متعلق میرا کوئی مضمون شائع ہو جاتا تھا تو ان تقاضوں میں بہتات اور شدت ہو جاتی تھی۔ جس کی غالباً واحد وجہ یہ تھی کہ قدیم تہذیب کے علم برداروں میں یہی حقیر زندگی کا ناقابل برداشت بوجھ اپنے کاندھوں پر اب تک سنبھالے ہوئے ہے"۔

مرزا جعفر حسین زیر تبصرہ کتاب میں پھر فرماتے ہیں "میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے صرف وہی حالات و واقعات قلم بند کروں گا جن کا میں خود شاہد ہوں۔ جو میرے لڑکپن میں گزر چکے تھے یا پھر انہیں حامی روایات و بیانات نیز سماجی شہادتوں سے تحقیق کے بعد درج کیا ہے۔ پھر بھی جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اس زمانہ کی معاشرت کا اندازہ کر لینے کے لئے کافی ہے"۔

[illegible] جانوروں کی پرورش کرنے والا [illegible] کی زبانی سنا

چنانچہ آنکھوں دیکھے اور مستند طور پر سنے ہوئے واقعات پر یہ کتاب چودہ حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے:-

(۱) لکھنؤ کی آبادکاری اور متفرق حالات (۲) رؤسا و امراء اور ان کی معاشرت (۳) شرفاء اور ان کا طرز زندگی (۴) عوام و خواص کے تفریحی مشاغل (۵) طوائف بازی (۶) فنون لطیفہ (۷) علمی ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں (۸) ادبی اور ثقافتی اجتماعات (۹) قدیم عزاداری (۱۰) فن کاریاں اور صنعت کاریاں (۱۱) علماء کی زندگی (۱۲) شادی غمی کی تقاریب (۱۳) پست طبقہ کے عوام (۱۴) انحطاط و زوال اور اس کے اسباب۔ ان چودہ ابواب کو چھیاسٹھ ذیلی عنوانات میں پھیلا دیا گیا ہے اور ہر موضوع پر اس تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ کتاب کو پڑھنا شروع کیجئے تو ختم کئے بغیر چین نہیں پڑتا۔ پانچویں باب میں طوائف بازی کے تحت زنان خانگی۔ زنان بازاری اور ڈیرے دار طوائفوں کے بارے میں جو واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے وہ طوائف کا ایک مستند مقام متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔

۵۶۰ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب اردو میں اچھی کتابیں پڑھنے والوں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جسے ترقی اردو بیورو نے اپنی شاندار اور مستند روایات کے مطابق شائع کیا ہے۔ کاش کہ کتاب کی پروف ریڈنگ کسی سفارشی کے بجائے کسی پڑھے لکھے سے کرائی جاتی۔ قیمت ستائیس روپے [illegible]۔ ناشر یا دفتر شان ہند سے طلب فرمایئے۔

"اُصول تعلیم اور عمل تعلیم"

مصنف ڈی۔ ایس۔ گورڈن۔ مترجم ڈاکٹر خلیل الرحمٰن سیفی پریمی۔ ناشر ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی۔ ضخامت ۲۳۶ صفحات۔ قیمت سولہ روپئے پچہتر پیسے۔

مترجم کے الفاظ میں مصنف کا کہنا ہے کہ یہ کتاب زیر تربیت اساتذہ اور ان اساتذہ کے لئے لکھی گئی ہے جو نظری اور عملی تعلیم کی جدید ترین تحقیقات سے باخبر رہنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔ فی الحال ہندوستان کے تربیتی

بقیہ صفحہ ۳۳ پر

انداز میں بولا:

"ارے میاں! اب تو گھر بسانے کی فکر کرو۔ آخر اس لاابالی پن سے سوائے تکلیف کے تمہیں ملتا ہی کیا ہے؟"

پھر اس کی گراں بہا صدری کے کپڑے کو ہاتھ میں لیکر اپنی انگلیوں کے ساتھ ملتے ہوئے کہنے لگا۔

"چھی چھی چھی، ارے یہ کیا پہنے ہوئے ہو؟ اس صدری کا رواج تو کب کا ختم ہو چکا ہے۔ جب اس سے تمہارا جی بھر جائے اور تم اسے بیچنا چاہو تو میں بڑے اچھے داموں خرید لوں گا۔"

اس کی یہ بات سن کر داش آکل کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اس کو جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ اپنی جیب سے پیسے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھے اور چپ چاپ باہر چلا گیا۔

رات بھیگ چلی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک عجیب سی شوریدگی تھی۔ اس شوریدگی کے ہاتھوں اس کے لئے اس کا سر وبالِ دوش بنا ہوا تھا اور جسم بخار سے پھنک رہا تھا۔ ابرِ بہاری کی تراوش سے شہر کے تمام گلی کوچے نمناک تھے اور ان میں خس و خاشاک اور نارنگیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو ابھی تک رچی ہوئی تھی۔ اس رومان پرور فضا میں اس کو اپنے پندار کا صنم کدہ ویران ہونے کی مطلق پروا نہ تھی اور اس کا دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جانے کے لئے مچلنے لگا۔ مرجان ایک بار پھر اپنے تمتماتے ہوئے رخساروں غزالی آنکھوں اور لمبی لمبی پلکوں کے ساتھ پیشانی پر بل کھاتی ہوئی لٹ ڈالے ہوئے مجسم اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی مگر اس نے یہ سوچ کر کہ اب وہ کسی اور کی امانت ہے خوشا بجا اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے خیالات کا تند و تیز دھارا اپنے اس ماضی کی طرف موڑ دیا جب ابھی مرجان اس کی زندگی میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ اس کے عہدِ شباب کی تلخ و شیریں یادیں مجسم ہو کر ایک ایک کر کے اس کی چشمِ تخیل کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ ماضی کی تلخ یادوں کے ساتھ ساتھ کسی وقت اس کے ذہن میں میٹھی شیریں یادیں بھی در آئیں جو باباکوہی اور سعدیہ جیسی حسن خیز اور عشق انگیز بیگمات میں اس کے دوستوں کی معیت میں سیر و تفریح کے پُر لطف اور لذت بخش لمحات سے عبارت تھیں اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس دل کے ویرانے میں چپکے سے بہار آ گئی ہو یا اس کے قلبِ بیمار کو بے وجہ قرار آ گیا ہو۔ اس قسم کی سوچوں میں ڈوبا ہوا وہ چلتا جا رہا تھا۔ کبھی تو اس کے ہونٹوں پر ایک سوگوار سی مسکراہٹ پھیل جاتی اور کبھی اس کے چہرے سے ایک عجیب سا کرب جھلکنے لگتا۔

آج اسے اپنے گھر جاتے ہوئے ایک انجانا سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ آج اس کے گھر کی تنہائی اسے مار ہی ڈالے گی۔ آج اس کے دل کا درد سوا تھا۔ شاید اس لئے کہ آج اس کا دل اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کہیں دور چلا جائے، دور بہت دور۔ اتنی دور کہ جہاں مرجان کی یاد اس کا تعاقب نہ کر سکے۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ آج رات جی بھر کے شراب پئے اور مرجان کے خیال کو عرقِ مے ناب کر دے مگر پھر اسے خیال آیا کہ وہ یہ حربہ کئی بار پہلے بھی آزما چکا ہے۔ مگر یہ کبھی کارگر نہ ہو سکا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اپنی دکھ بھری زندگی ہی کو ختم کر ڈالے مگر یہ سوچ کر رہ گیا کہ آخر مر کے بھی چین نہ پایا تو؟ زندگی اس کے لئے اپنا مفہوم کھو چکی تھی اور بے معنی ہو کر رہ گئی تھی ایک بے نام سی بے چینی تھی جو اسے ہلکان کئے دے رہی تھی۔ افکار کی یلغار سے گھبرا کر اس نے شعر و نغمہ کا سہارا لیا اور زیرِ لب گنگنانے لگا:

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

پھر اسے ایک اور شعر یاد آیا جو اس نے ذرا اونچی آواز میں گنگنایا:

دل لیا ہے تو جان بھی لے لو
ہم سے بے دل جیا نہیں جاتا

اس نے یہ شعر کچھ ایسے درد بھرے لہجے میں گنگنائے کہ اس کے دل کا درد دو چند ہو گیا۔ جب اس سے بھی دل نہ بہلا تو اسے چپ سی لگ گئی ایک گہری اور پُر اسرار سی چپ۔ اسی طرح چپ چاپ

ہمارا نام لکھ کر لکھ دیا ہے اس نے نام اپنا
ہمیں یہ کہہ دیا ہے کہ نبھانا پڑیگا احترام اپنا
ڈاکٹر مخمور عزر گکورا کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے

راہزن اہل ہوس اور ستم گر نکلے
شہر میں آج کئی طرح کے لشکر نکلے
اب مہکتے ہوئے جسموں سے جو ڈرتا ہے
جانے کس شوخ کے ملبوس سے خنجر نکلے

پھر آہ اور واہ کا ایک دھماکہ ہوا ہے آپ اسی سنجیدگی
سے محفل کو لوٹتے چلے ہیں۔

لائے ہو آج تم بھی مجھے زلزلوں کے بیچ
تم لکھو نہ اپنی زباں سے نکل چلو
خود ہی ہوا کہ جل اٹھا تمام شہر

اختر صاحب خوب خوب سنے گئے اور اس عالم میں مظفر
رزمی نے غزل چھیڑی ہے

چراغ امن و محبت بجھا دیئے کس نے
ہر ایک راہ میں شعلے سجا دیئے کس نے
گماں یہ ہے کوئی حادثہ نہ گزرا ہو
ہمیں وفا کے سلیقے سکھا دیئے کس نے
یہ زلزلہ ہے نہ طوفاں ہے نہ آندھی ہے
تو پھر یہ پیڑ اچانک گرا دیئے کس نے

رزمی صاحب بھی داد سمیٹے آ رہے ہیں اور سلیم شیرازی
فرما رہے ہیں۔

زمیں سے درد کی کس کو خبر تھی
نظر ہر شخص کی آکاش پر تھی
مقدر مہرباں ہوتا تو کیسے
ہماری بے سوالی ہم سفر تھی
جلا کر گھر ہمارے اس نے لکھا
تمہاری بے گناہی معتبر تھی۔
کنارے لگ گئے بہتے بہتے
ندی اب کے کچھ ایسی بااثر تھی

سلیم صاحب بھی داد لوٹ کے چلتے بنے اور صاحب خالد عزت

میر مشتاق فرما رہے ہیں۔

ہم سے خفا ہیں لیکن وہ اس کا گلا نہیں
کیوں بے وفا کہیں انہیں وہ بے وفا نہیں
یہ بھی ہے کیا کہ اس سے کوئی واسطہ نہیں
کیا بات کہیں پھر بھی ہوا اسے برا نہیں

ڈاکٹر صاحب سنا سب واہ واہ کر بیٹھے ہیں اب
سبو دکار ساقی صاحب علی داؤدی میں غزل سرا ہیں

اپنے دروازہ پہ ہمدردوں کا میلہ دیکھا
میں نے کل رات بھیانک سا سپنا دیکھا

حسین مطلع دلکش ترنم سامعین خوش فہم ہنڈا دار نے ایک ہنگامہ
کا روپ دھار لیا ہے کئی بار ڈیہر کر اسی بانکپن سے محفل کو چھ
چٹکا نے اور لوٹتے چلے ہیں۔

کیسے دشمن کو ... مقدر یہ اسے
مانگنے والے کا سر کو دوبارہ دیکھا
جب مزاج کو شناسائی کی سمجائی کی
سننے والوں میں تماشا ہم نے دیکھا
میری دنیا میں تعصب کی کمی ہے شاید
اپنوں بیگانوں کا شخص ایک ہی جیسا دیکھا

ساقی صاحب ایک عالم کے سے شعر کو نظر انداز کرکے
مائک سے کھسک آئے ہیں اور محمد علی ... سنانے کے لیے
پر تول رہے ہیں — پہلے لطیفہ — ایک آواز — سیٹی ہی بجے
ہی خلاف شرع — مولانا گئے — دوسری آواز
اسی افریح میں ... صاحب غزل چھیڑ رہے ہیں۔

سبھی تارے سب ہی جگنو میرے
اب وہ آنچل ہیں اور آنسو میرے
کاش ایسا ہو کہ تتلی ہی کسی
ہاتھ آجائے وہ خوشبو میرے
سب کی آنکھوں میں اک ... تھی مری
کس نے کھیلے ہیں بازو میرے

اسٹیج سے داد نہیں مل رہی ہے — ایک آواز —
ایک آواز — اسٹیج سے داد ملتی ہی کب ہے اسٹیج کی